

معارف القرآن

مدرسہ اسلامیہ دارالافتاء
کونوٹی، لاہور



(Quranic Studies Publishers)

فہرست مضامین معارف القرآن جلد چہارم

| صفحہ | مضمون | صفحہ | مضمون | صفحہ | مضمون |
|------|---|------|---|------|--|
| ۶۲ | موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا کلام | ۴۴ | آیات نمبر ۱۳۳ تا ۱۳۶ فارسلنا علیہم الطوفان | ۱۱ | بقیہ سورۃ اعراف از آیت ۹۴ |
| ۶۲ | دار الفاسقین کے دو معنی | ۴۶ | ساحروں کے مقابلہ کے بعد بیس سال حضرت موسیٰؑ مصر میں مصروف تبلیغ رہے اور نو معجزات اور سر عطا ہوئے | ۱۳ | انبیاء سابقین اور ان کی قوموں کی تاریخ قرآنی اسلوب میں |
| ۶۳ | آیات نمبر ۱۴۶ تا ۱۵۱ سآھر عن آیاتی الذین | ۴۹ | آیات نمبر ۱۴۱ تا ۱۴۱ واورثنا القوا الذین کانوا | ۱۴ | برکت کے معنی اور اس کی حقیقت |
| ۶۶ | تکبر انسان کو فہم سلیم اور عوام اہلیہ سے محروم کر دیتا ہے | ۵۱ | قرعونیوں کے انجام بد اور بنی اسرائیل کی فتح و کامرانی کا ذکر | ۱۵ | قہر بصورت مہر |
| ۶۷ | سامری کا زیورات سے بچھڑا ہوا اور قوم موسیٰؑ کا اس کو خدا ماننا | ۵۵ | آیت نمبر ۱۴۲ و وعدنا موسیٰ ثلاثین لیلۃ | ۱۶ | آیات ۱۰۰ تا ۱۰۳ اولم یہد للذین یرثون الارض |
| ۶۸ | القار کے معنی اور اس پر ایک سوال کا جواب | ۵۶ | تیس راتوں پر دس کا اضافہ کرنے میں حکمت | ۱۸ | لا یفہقون کی بجائے لا یسمعون فرمانے میں حکمت |
| ۶۹ | آیات نمبر ۱۵۲ تا ۱۵۶ ان الذین اتخذوا العجل | ۵۷ | مسلل تیس رات دن روزے رکھنے پر ایک سوال اور اس کا جواب | ۲۱ | آیات نمبر ۱۰۳ تا ۱۱۰ ثم بعثنا من بعدہم موسیٰ بایاتنا |
| ۷۳ | بعض گناہوں کی کچھ سزا دنیا میں بھی ملتی ہے | ۵۷ | عبادات میں قمری حساب معتبر نہ دنیوی معاملات میں شمسی حساب کی گنجائش ہے | ۲۴ | لا ٹھی کا سانپ بن جانا معجزانہ طور پر تھا |
| ۷۳ | نثر جمال بنی اسرائیل کا انتخاب اور ان کی ہلاکت کا واقعہ | ۵۸ | اصلاح نفسی میں چالیس دن رات کو خاص دخل ہے | ۲۵ | معجزہ اور جادو میں فرق |
| ۷۵ | رحمت خداوندی کا غضب پر سابق ہونا | ۵۸ | انسان کو اپنے سب کاموں میں بتدریج اور آہستگی کی تعلیم ضرورت کے وقت ناظم امور کو اپنا قائم مقام تجویز کرنا | ۲۶ | آیات نمبر ۱۱۱ تا ۱۲۲ قالوا ارجعنا |
| ۷۷ | آیت نمبر ۱۵۷ الذین یتبعون الرسول البنیٰ | ۵۹ | آیات نمبر ۱۳۳ تا ۱۳۵ ولما جاء موسیٰ لمیقاتنا وکلمہ | ۳۲ | آیات نمبر ۱۲۳ تا ۱۳۷ قال فرعون امنتکم بہ |
| ۷۸ | خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کے مخصوص صفات و فضائل | ۶۰ | آیات نمبر ۱۳۳ تا ۱۳۵ ولما جاء موسیٰ لمیقاتنا وکلمہ | ۳۴ | فرعونی جاد و گروں میں مسلمان ہوتے ہی یکدم انقلاب عظیم عطا اور یہ بیضلے بھی بڑا معجزہ تھا |
| ۸۰ | تورات و انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور علامات | ۶۱ | دنیا میں رویت باری کا عقلاً ممکن اور ممتنع الوقوع ہونا | ۳۷ | فرعون پر حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کی ہیبت |
| ۸۴ | امرا المعروہ اور بنی عن المنکر کو حضور کی صفات مخصوص میں شمار کر سکی وجہ اور اس کی صفات | | | ۳۸ | آیات نمبر ۱۳۸ تا ۱۴۲ قال موسیٰ لقومہ استعینوا |
| | | | | ۴۱ | مشکلات و مصائب نجات کا نسخہ اکسیر |
| | | | | ۴۲ | حکومت و سلطنت حکمران طبقہ کا امتحان ہے |

| صفحہ | مضمون | صفحہ | مضمون | صفحہ | مضمون |
|------|---|------|---|------|---|
| ۱۴۲ | واقعہ متعلق سورۃ انفال | ۲۲۸ | کفر و انکار کے علاوہ تین جسم | ۲۵۹ | آیات ۵۰ تا ۵۳ ولوتریٰ از یتوفی الذین کفروا الملائکہ |
| ۱۴۴ | لفظ انفال کی تحقیق | ۲۳۱ | کاسبب عذاب ہونا | ۲۶۲ | عطاء نعمت خداوندی کی بنا پر اور بقا نعمت نیک اعمال کی وجہ ہوتی ہے |
| ۱۴۶ | اتفاق اتحاد کی بنیاد خوف خدا پر ہے | ۲۳۶ | آیات ۳۹ تا ۴۰ وقالتوہم حتی لا تمکون فتنہ | ۲۶۳ | آیات ۵۲ تا ۵۸ کذاب آل فرعون والذین من قبلہم |
| ۱۴۸ | مومن کی مخصوص صفات | ۲۳۷ | آیت ۴۱ واعلموا انما ختمت من شیء | ۲۶۷ | اسلامی سیاست کا پہلا قدم اسلامی قومیت ہے |
| ۱۸۱ | آیات ۵ تا ۶ کذا خرج ربک الخ غزوہ بدر کا تفصیلی واقعہ | ۲۳۷ | لفظ غنیمت کی تحقیق اور خصوصیت | ۲۶۸ | اسلامی سیاست کا دوسرا قدم معاہدہ یہود |
| ۱۸۸ | آیات ۷ تا ۱۰ واذا قدمکم الشدائد اطاعتن | ۲۳۸ | امت اور اس کے احکام | ۲۶۹ | معاہدہ صلح کو ختم کرنیکی صورت |
| ۱۹۳ | آیات ۱۱ تا ۱۳ از یغیثکم النعاس امنۃ منہ | ۲۳۹ | خمس کے پانچ مصارف کا بیان | ۲۷۰ | ایفاء عہد کا ایک واقعہ |
| ۱۹۴ | آیات ۱۵ تا ۱۹ یا ایہا الذین آمنوا اذا القیتکم الذین کفروا | ۲۴۰ | تقسیم خمس بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | ۲۷۱ | آیات ۵۹ تا ۶۲ ولا یحبسن الذین کفروا سبقوا |
| ۲۰۳ | آیات ۲۰ تا ۲۴ یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا رسولہ | ۲۴۱ | خمس ذوی لہ تسربنی فائدہ | ۲۷۲ | یوم بدر کو یوم الفرقان کہنے کی حکمت |
| ۲۰۶ | سننے کے چار درجات | ۲۴۲ | یوم بدر کو یوم الفرقان کہنے کی حکمت | ۲۷۳ | آیات ۲۲ تا ۲۴ واذا انتم بالعدۃ |
| ۲۰۷ | انسان کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہونی کا معیار | ۲۴۳ | یوم بدر کو یوم الفرقان کہنے کی حکمت | ۲۷۴ | جہاد کیلئے اسلحہ اور سامان حرب کی تیاری فرمیں ہے |
| ۲۰۸ | ایک منطقی شبہ اور اس کا جواب | ۲۴۴ | یوم بدر کو یوم الفرقان کہنے کی حکمت | ۲۷۵ | صلح کے احکام اور اس کے متعلق کا بیان |
| ۲۰۸ | لما یحییکم میں حیات سے کیا مراد ہے | ۲۴۵ | یوم بدر کو یوم الفرقان کہنے کی حکمت | ۲۷۶ | آیات ۶۳ تا ۶۶ والفق بین قلوبہم |
| ۲۱۰ | آیات ۲۵ تا ۲۸ واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا | ۲۴۶ | یوم بدر کو یوم الفرقان کہنے کی حکمت | ۲۷۷ | مسلمانوں کا باہمی اتفاق اطاعت خداوندی پر موقوف ہے |
| ۲۱۳ | مسلمانوں کو کچھ پسند و نصیحت | ۲۴۷ | یوم بدر کو یوم الفرقان کہنے کی حکمت | ۲۷۸ | آیات ۶۷ تا ۶۹ ما کان للنبی ان یشعل لہ اسریٰ |
| ۲۱۴ | فتنہ کے معانی کا بیان | ۲۴۸ | یوم بدر کو یوم الفرقان کہنے کی حکمت | ۲۷۹ | رحمۃ للعالمین کی خاص شان چند مسائل |
| ۲۱۵ | وان اللہ عندہ اجر عظیم کا شان نزول | ۲۴۹ | یوم بدر کو یوم الفرقان کہنے کی حکمت | ۲۸۰ | جنگی قیدیوں کے بارے میں چار اختیارات |
| ۲۱۶ | آیات ۲۹ تا ۳۳ یا ایہا الذین آمنوا ان تتقوا اللہ | ۲۵۰ | یوم بدر کو یوم الفرقان کہنے کی حکمت | ۲۸۱ | آیات ۷۰ تا ۷۱ یا ایہا الذین آمنوا |
| ۲۱۸ | تقویٰ کے صلہ میں تین انعامات | ۲۵۱ | یوم بدر کو یوم الفرقان کہنے کی حکمت | ۲۸۲ | آیات ۷۲ تا ۷۳ ان یشعل لہ اسریٰ |
| ۲۲۰ | دارالندہ میں قریشی سرداروں کا اجتماع اور ابلیس لعین | ۲۵۲ | یوم بدر کو یوم الفرقان کہنے کی حکمت | ۲۸۳ | آیات ۷۴ تا ۷۵ ان یشعل لہ اسریٰ |
| ۲۲۵ | آیات ۳۴ تا ۳۸ وما لہم الا عذہم | ۲۵۳ | یوم بدر کو یوم الفرقان کہنے کی حکمت | ۲۸۴ | آیات ۷۶ تا ۷۷ ان یشعل لہ اسریٰ |

| صفحہ | مضمون | صفحہ | مضمون | صفحہ | مضمون |
|------|---|------|---|------|--|
| ۳۲۲ | آیات ۲۵ تا ۲۷ لفظ نصر کم اللہ فی مواطن کثیرہ | ۲۹۴ | پرقائم رہنے اور ان کے متعلق مبالغہ آمیز مکی پرہیز کرنے کی تعلیم | ۳۰۲ | ہجرت کے وہ احکام جن کا تعلق مہاجر مسلمانوں کی وراثت سے ہے |
| ۳۲۳ | غزوہ حنین کے متعلق چند واقعات | ۳۰۰ | اسلامی برادری میں داخل ہونے کی تین شرطیں | ۳۰۳ | قانون میراث کا ایک جامع ضابطہ |
| ۳۲۹ | حنین کی فتح اور ہوازن وثقیف کے سرداروں کا مسلمان ہو کر حاضر ہونا اور قیدیوں کی واپسی | ۳۰۳ | آیات ۱۲ تا ۱۶ وان نکثوا ایہم من بعد عہدہم | ۳۰۴ | سورۃ توبہ |
| ۳۵۰ | حقوق کے معاملہ میں رعائے معلوم کرنے کیلئے عوامی جلسوں کی آوازیں کافی نہیں ہر ایک علیحدہ رائے معلوم کرنی چاہئے | ۳۰۵ | دارالاسلام میں غیر مسلم ذمیوں کو اسلام پر علمی تنقید کی تو اجازت ہے مگر طعن و تشنیع کی نہیں | ۳۰۵ | آیات ۱ تا ۵ برارۃ من اللہ رسولہ الی الذین عاہدتم سورۃ برارۃ کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ |
| ۳۵۱ | احکام و مسائل | ۳۰۶ | آیات ۱۷ تا ۱۸ ما کان للمشکین ان یعمر و امسا جدام اللہ | ۳۰۶ | چند واقعات متعلقہ شان نزول |
| ۳۵۲ | مفتوح کفار کے اموال میں عدل و انصاف اور احتیاط | ۳۰۶ | مخلص مسلمان کی دو علامتیں | ۳۰۹ | فتح مکہ پر مغلوب دشمنوں کے ساتھ کریمانہ سلوک |
| ۳۵۳ | آیت ۲۸ یا ایہا الذین آمنوا انما المشرکون نجس | ۳۰۷ | کسی غیر مسلم کو ہزار دوست بنانا درست نہیں | ۳۰۹ | فتح مکہ کی وقت مشرکین کی چار قسمیں |
| ۳۵۴ | مشرکین کو مسجد حرام میں داخلہ کی ممانعت | ۳۰۷ | مسجد حرام اور دوسری مساجد کو عبادات باطلہ سے پاک کرنا | ۳۱۱ | کفار سے معاہدات ختم ہو جانے پر بھی انکو جہالت کی کڑی کریمانہ سلوک |
| ۳۵۹ | آیت ۲۹ تا ۳۰ قالوا اللہین لایؤمنون باللہ | ۳۰۸ | بعض مسائل متعلقہ آیت | ۳۱۱ | کفار سے معاہدہ ختم کیا جائے تو اعلان عام اور سب کو ہوشیار |
| ۳۶۰ | آیت ۳۱ تا ۳۵ اتخذوا اجازا و رہبنا ہنم | ۳۰۹ | آیات ۱ تا ۳ جعلتم سفاۃ الحج | ۳۱۱ | خبردار کئے بغیر ان کے خلاف کوئی عمل درست نہیں |
| ۳۶۱ | یہود و نصاریٰ کے علماء و زہاد کی گمراہی | ۳۱۰ | آیات کا شان نزول اور متعلقہ واقعات | ۳۱۲ | مذکورہ پانچ آیات کے متعلق چند مسائل اور فوائد |
| ۳۶۲ | زکوٰۃ نکالنے کے بعد جو مال باقی رہے اس کا جمع کرنا کوئی گناہ نہیں | ۳۱۱ | ذکر اللہ جہاد سے افضل ہے | ۳۱۳ | کفار سے عفو و درگزر کے ساتھ ان کے شر سے احتیاط |
| ۳۶۳ | آیات ۳۶ تا ۳۷ ان عدلہ شور | ۳۱۲ | عمل کی افضلیت حال کے تابع ہوتی ہے | ۳۱۳ | آیات ۱ تا ۱۱ وان احد من مشرکین استجارک |
| ۳۶۴ | عند اللہ اثنا عشر جاہلیت کی رویم سے اجتناب کی ہدایت | ۳۱۳ | چند فوائد اور مسائل | ۳۱۵ | حقانیت اسلام کو دلائل کیساتھ سمجھانا علماء دین کا فرض ہے |
| ۳۶۵ | احکام و مسائل | ۳۱۴ | اصل رشتہ اسلام و ایمان کا رشتہ ہے | ۳۱۸ | غیر ملکی غیر مسلم کو ضرورت سے زائد دارالاسلام میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی جائے |
| ۳۶۶ | احکام و مسائل | ۳۱۵ | نسبی و طنی تعلق سب اس پر قربانی ہیں | ۳۱۹ | کفار کے مقابلہ میں بھی سچائی |
| ۳۶۷ | احکام و مسائل | ۳۱۸ | آیت ۲۲ قل ان کان آباکم و ابنایکم و اخوانکم | | |
| ۳۶۸ | احکام و مسائل | ۳۱۹ | آیت کا شان نزول | | |
| ۳۶۹ | احکام و مسائل | ۳۲۰ | مسائل متعلقہ ہجرت | | |
| ۳۷۰ | احکام و مسائل | ۳۲۱ | اللہ کی اور رسول کی محبت کا سامنا | | |
| ۳۷۱ | احکام و مسائل | ۳۲۲ | دنیا کی محبت زیادہ ہو یا شرط ایمان ہو | | |

| صفحہ | مضمون | صفحہ | مضمون | صفحہ | مضمون |
|------|---|------|--|------|--|
| ۳۴۳ | آیات ۳۸ تا ۴۲ یا ایہا الذین آمنوا ما کم اذا قیل لکم غزوۃ تبوک کا بیان اور متعلقہ احکام و ہدایات | ۳۴۳ | آیات ۶۱ تا ۶۶ و منہم الذین یؤذون النبی | ۳۴۳ | آیات ۹۳ تا ۹۶ یعذررون الیکم اذا رجعتہ |
| ۳۴۴ | غزوۃ تبوک کا بیان اور متعلقہ احکام و ہدایات | ۳۴۶ | منافقین کے یہودہ اعتراضات | ۳۴۴ | تین احکام کا ذکر |
| ۳۴۵ | کلمہ پڑھنے والوں کے حالات | ۳۴۷ | آیات ۶۷ تا ۷۰ المنفقون و المنفقت بعضہن من بعض | ۳۴۵ | آیات ۹۷ تا ۹۹ الاعراب شد کفر و نفاقاً |
| ۳۴۸ | دنیا کی محبت اور آخرت سے غفلت تمام جرائم کی بنیاد ہے۔ | ۳۵۰ | آیات ۷۱ تا ۷۳ المؤمنون المؤمنات بعضہم اولیاء بعضہ | ۳۴۸ | آیۃ ۱۰۰ و الشیقون الاولون من المهاجرین |
| ۳۵۱ | آیات ۳۲ تا ۵۲ عفا اللہ عنک لم اذنت لہم | ۳۵۱ | مؤمنین مخلصین کے حالات اور ان کے درجات | ۳۴۹ | صحابہ کرام سب کے سب جنتی ہیں |
| ۳۵۲ | منافقین کے اعذار اور متعلقہ احکام و مسائل | ۳۵۲ | تنبیہ | ۳۵۰ | تنبیہ |
| ۳۵۳ | عذر معقول اور نامعقول میں امتیاز اعتقاد تقدیر استعمال تدبیر کے ساتھ ہونا چاہیے۔ | ۳۵۳ | آیات ۷۴ تا ۷۸ یحلفون باللہ ما قالو | ۳۵۱ | آیۃ ۱۰۱ و من حوکم الی |
| ۳۵۴ | آیات ۵۳ تا ۵۹ قل انفقوا طوعاً و کرہاً | ۳۵۴ | آیت کا شان نزول | ۳۵۱ | آیات ۱۰۲ تا ۱۰۶ و اخرون اعترفوا الی |
| ۳۵۵ | کیا صدقات کا مال کا فرو دیا جائی سکتا آیت ۶۰ انما الصدقات للفقراء والمساکین | ۳۵۵ | فائدہ مسئلہ | ۳۵۲ | نیک بد ملے چلے عمل کیا حق |
| ۳۵۶ | مصارف الصدقات | ۳۵۵ | آیات ۷۹ تا ۸۰ الذین یزرون المطوعین | ۳۵۵ | اچھے برے مخلوط عمل والے |
| ۳۵۷ | زکوٰۃ غیر مسلموں کو دینی جائز نہیں (فائدہ) عامل اور موجودہ دور کے مدارس کے سفیر میں فرق | ۳۵۶ | آیات ۸۱ تا ۸۳ فرح المخلصون بمقعدہم | ۳۵۵ | سب اسی میں داخل ہیں |
| ۳۵۸ | ایک اور سوال، عبادت پر اجرت ایک عظیم فائدہ | ۳۵۷ | منافقین کا نام مجاہدین اسلام کی فہرست سے خارج کر دینا | ۳۵۵ | مسلمانوں کے صدقات زکوٰۃ وغیرہ وصول کرنا اور ان کے مصروف پر خرچ کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ |
| ۳۵۹ | فی الرقاب کی تفسیر میں اختلاف مدارس و مساجد کی تعمیر زکوٰۃ سے نہیں ہو سکتی۔ مسئلہ تملیک | ۳۵۸ | آیۃ ۸۴ و لا تصل علی اعدائہم واقعہ مذکورہ پر چند اشکالات اور ان کے جواب | ۳۵۶ | زکوٰۃ حکومت کا ٹیکس نہیں بلکہ عبادت ہے |
| ۳۶۰ | آیات ۸۵ تا ۸۹ و لا تعجبک | ۳۵۹ | چند مسائل | ۳۵۶ | ایک سوال اور اس کا جواب |
| ۳۶۱ | اموالہم و اولادہم | ۳۶۰ | آیات ۹۰ تا ۹۳ لیس علیہن عفا | ۳۵۷ | آیات ۱۰۷ تا ۱۱۰ و اتخذوا مسجداً |
| ۳۶۲ | آیۃ و جاء المعذرون من الاعراب | ۳۶۱ | ربط آیات و شان نزول | ۳۵۸ | مسجد اضراراً |
| ۳۶۳ | مخلصین مومنین کا ذکر جو حقیقت معذور تھے | ۳۶۲ | آیات ۱۱۱ تا ۱۱۲ ان اللہ اشتری | ۳۶۱ | ابو عامر راہب کی سازش |
| ۳۶۴ | آیات ۹۴ تا ۹۶ لیس علیہن عفا | ۳۶۳ | ربط آیات و شان نزول | ۳۶۲ | مسئلہ فائدہ |
| ۳۶۵ | آیات ۱۱۳ تا ۱۱۴ یا ایہا الذین آمنوا | ۳۶۴ | ربط آیات و شان نزول | ۳۶۳ | فائدہ |
| ۳۶۶ | آیات ۱۱۵ تا ۱۱۶ یا ایہا الذین آمنوا | ۳۶۵ | ربط آیات و شان نزول | ۳۶۴ | فائدہ |

| صفحہ | مضمون | صفحہ | مضمون | صفحہ | مضمون |
|------|--|------|--|------|------------------------------|
| ۴۷۱ | شان نزول آیہ مبارکہ | ۵۰۳ | ضیاء اور نور کے معانی کی تحقیق | ۵۲۵ | فائدہ |
| ۴۷۲ | آیات ۱۱۵ تا ۱۱۶ و ماکان اللہ | ۵۰۴ | قری حساب کا باقی رکھنا مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ | ۵۲۶ | آیات ۶۲ تا ۶۴ والا ان |
| ۴۷۳ | لیفضل قوماً | ۵۰۸ | چند اہم باتوں کا بیان | ۵۲۷ | اولیاء اللہ الخ |
| ۴۷۴ | آیات ۱۱۹ تا ۱۲۰ لقد تاب اللہ | ۵۱۱ | اولیاء اللہ کے بارے میں | ۵۲۸ | ولایت خا کے درجہ بشمار میں |
| ۴۷۵ | علی النبی والمہاجرین | ۵۱۳ | درجہ دلالت حاصل کرنے کے | ۵۲۹ | تین اجزاء |
| ۴۷۶ | سوال و جواب | ۵۲۰ | اولیاء کی علامت اور پہچان | ۵۳۰ | آیات ۶۵ تا ۶۶ ولایحز نک |
| ۴۷۷ | حضرت کعب بن مالک کا جہاد | ۵۲۱ | آیات ۶۷ تا ۶۸ قولہم ان العزۃ للہ | ۵۳۱ | آیات ۶۹ تا ۷۰ ہوا الذی جعل |
| ۴۷۸ | تخلف اور اس سلسلہ میں احادیث صحیحہ | ۵۲۲ | کلم الیل لتسکنا فیہ | ۵۳۲ | آیات ۷۱ تا ۷۲ و اوحینا الی |
| ۴۷۹ | فوائد متعلقہ حدیث مذکور | ۵۲۳ | غوغۃ موت کو شاووقت مراد | ۵۳۳ | آیات ۷۳ تا ۷۴ و اوحینا الی |
| ۴۸۰ | آیات ۱۲۱ تا ۱۲۲ ماکان لاهل | ۵۲۴ | متعلقہ احکام | ۵۳۴ | آیات ۷۵ تا ۷۶ و اوحینا الی |
| ۴۸۱ | المدينة ومن حولہم | ۵۲۵ | دار السلام رکھنا درست نہیں | ۵۳۵ | آیات ۷۷ تا ۷۸ و اوحینا الی |
| ۴۸۲ | آیہ ۱۲۳ و ماکان المؤمنون الخ | ۵۲۶ | مسائل و فوائد | ۵۳۶ | آیات ۷۹ تا ۸۰ و اوحینا الی |
| ۴۸۳ | طلب علم دین کا فرض ہونا مع آداب | ۵۲۷ | آیات ۸۱ تا ۸۲ و اوحینا الی | ۵۳۷ | آیات ۸۳ تا ۸۴ و اوحینا الی |
| ۴۸۴ | علم دین کے فرض عین اور فرض | ۵۲۸ | آیات ۸۵ تا ۸۶ و اوحینا الی | ۵۳۸ | آیات ۸۷ تا ۸۸ و اوحینا الی |
| ۴۸۵ | کفایہ کی تفصیل | ۵۲۹ | آیات ۸۹ تا ۹۰ و اوحینا الی | ۵۳۹ | آیات ۹۱ تا ۹۲ و اوحینا الی |
| ۴۸۶ | علم تصوف بھی فرض عین میں داخل ہے۔ | ۵۳۰ | آیات ۹۳ تا ۹۴ و اوحینا الی | ۵۴۰ | آیات ۹۵ تا ۹۶ و اوحینا الی |
| ۴۸۷ | فرض کفایہ اور علم دین کا نصاب | ۵۳۱ | آیات ۹۷ تا ۹۸ و اوحینا الی | ۵۴۱ | آیات ۹۹ تا ۱۰۰ و اوحینا الی |
| ۴۸۸ | علم دین حاصل کرنے کے بعد عالم کے فرائض | ۵۳۲ | آیات ۱۰۱ تا ۱۰۲ و اوحینا الی | ۵۴۲ | آیات ۱۰۳ تا ۱۰۴ و اوحینا الی |
| ۴۸۹ | آیات ۱۲۳ تا ۱۲۴ یا ایہا الذین | ۵۳۳ | آیات ۱۰۵ تا ۱۰۶ و اوحینا الی | ۵۴۳ | آیات ۱۰۷ تا ۱۰۸ و اوحینا الی |
| ۴۹۰ | آمنوا قاتلوا الذین یؤنکم | ۵۳۴ | آیات ۱۰۹ تا ۱۱۰ و اوحینا الی | ۵۴۴ | آیات ۱۱۱ تا ۱۱۲ و اوحینا الی |
| ۴۹۱ | قریبی کفار پہلے جہاد کیا جائے | ۵۳۵ | آیات ۱۱۳ تا ۱۱۴ و اوحینا الی | ۵۴۵ | آیات ۱۱۵ تا ۱۱۶ و اوحینا الی |
| ۴۹۲ | آیات ۱۲۸ تا ۱۲۹ لقد جارکم | ۵۳۶ | آیات ۱۱۷ تا ۱۱۸ و اوحینا الی | ۵۴۶ | آیات ۱۱۹ تا ۱۲۰ و اوحینا الی |
| ۴۹۳ | رسول من انفسکم | ۵۳۷ | آیات ۱۲۱ تا ۱۲۲ و اوحینا الی | ۵۴۷ | آیات ۱۲۳ تا ۱۲۴ و اوحینا الی |
| ۴۹۴ | سورۃ یونس | ۵۳۸ | آیات ۱۲۵ تا ۱۲۶ و اوحینا الی | ۵۴۸ | آیات ۱۲۷ تا ۱۲۸ و اوحینا الی |
| ۴۹۵ | آیات ۱ تا ۳ انزلناک آیت | ۵۳۹ | آیات ۱۲۹ تا ۱۳۰ و اوحینا الی | ۵۴۹ | آیات ۱۳۱ تا ۱۳۲ و اوحینا الی |
| ۴۹۶ | الکتاب الحکیم | ۵۴۰ | آیات ۱۳۳ تا ۱۳۴ و اوحینا الی | ۵۵۰ | آیات ۱۳۵ تا ۱۳۶ و اوحینا الی |
| ۴۹۷ | حروف مقطعات کی معانی کی تحقیق | ۵۴۱ | آیات ۱۳۷ تا ۱۳۸ و اوحینا الی | ۵۵۱ | آیات ۱۳۹ تا ۱۴۰ و اوحینا الی |
| ۴۹۸ | خدا تعالیٰ کی صفات ید، وجہ، | ۵۴۲ | آیات ۱۴۱ تا ۱۴۲ و اوحینا الی | ۵۵۲ | آیات ۱۴۳ تا ۱۴۴ و اوحینا الی |
| ۴۹۹ | اور ساق وغیرہ کی تحقیق | ۵۴۳ | آیات ۱۴۵ تا ۱۴۶ و اوحینا الی | ۵۵۳ | آیات ۱۴۷ تا ۱۴۸ و اوحینا الی |
| ۵۰۰ | آیات ۶ تا ۷ ہوا الذی جعل | ۵۴۴ | آیات ۱۴۹ تا ۱۵۰ و اوحینا الی | ۵۵۴ | آیات ۱۵۱ تا ۱۵۲ و اوحینا الی |

| صفحہ | مضمون | صفحہ | مضمون | صفحہ | مضمون |
|------|---|------|--|------|---|
| ۵۷۸ | آیات ۱۰۱ تا ۱۰۳ قل انظروا الخ | ۶۲۳ | آیات ۳۱ تا ۳۴ وقال اركبوا الخ | ۵۷۹ | آیات ۱۰۳ تا ۱۰۷ قل یا ایھا الناس الخ |
| ۵۸۰ | آیات ۱۰۸ و ۱۰۹ قل یا ایھا الناس الخ | ۶۲۵ | کشتیوں اور دوسری سواریوں پر سوار ہونے کے آداب | ۵۸۱ | سورۃ ھود |
| ۵۸۲ | آیات ۱ تا ۵ انزل کتباً حکمت الخ | ۶۲۵ | ہر سواری کا چلنا اور پھرنے کا | ۵۸۲ | آیات ۶ تا ۸ وما من واثبة الخ |
| ۵۸۸ | آیات ۶ تا ۸ وما من واثبة الخ | ۶۲۸ | اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہے | ۵۹۰ | رزق کی عذائی ذمہ داری پر ایک سوال اور جواب |
| ۵۹۰ | رزق کی عذائی ذمہ داری پر ایک سوال اور جواب | ۶۳۱ | کافر اور ظالم کیلئے دعا برا ہے | ۵۹۱ | وما من واثبة کاشان نزل |
| ۵۹۱ | وما من واثبة کاشان نزل | ۶۳۱ | مؤمن و کافر میں رشتہ اخوت نہیں | ۵۹۲ | ساری مخلوق کو رزق رسائی کا عجیب غریب نظام |
| ۵۹۲ | ساری مخلوق کو رزق رسائی کا عجیب غریب نظام | ۶۳۳ | کی تعمیر اصول اسلام سے بغاوت ہو | ۵۹۳ | آسمان و زمین اور رات دن سے مراد اور انکو تدبیر بنانے میں حکمت |
| ۵۹۳ | آیات ۵۰ تا ۶۸ والی عاد و ثمود | ۶۳۴ | حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت | ۵۹۴ | آیات ۹ تا ۱۳ اولین اذ قنا الخ |
| ۶۰۱ | آیات ۱۵ تا ۱۷ امن کان یرید الخ | ۶۳۵ | دین کی تین اصولی باتیں | ۶۰۲ | آیات ۱۸ تا ۲۳ ومن اعظم الخ |
| ۶۰۲ | آیات ۱۸ تا ۲۳ ومن اعظم الخ | ۶۳۶ | دعوت و نصیحت اور دعوت دین پر اجرت | ۶۰۸ | آیات ۲۵ تا ۳۵ ولقد ارسلنا الخ |
| ۶۰۸ | آیات ۲۵ تا ۳۵ ولقد ارسلنا الخ | ۶۳۷ | آیات ۶۹ تا ۷۳ ولقد جارت رسولنا ابراهیم بالبشری | ۶۱۳ | حضرت نوح علیہ السلام اور انکی قوم کا مکالمہ |
| ۶۱۳ | حضرت نوح علیہ السلام اور انکی قوم کا مکالمہ | ۶۳۸ | حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ | ۶۱۷ | آیات ۳۶ تا ۴۰ وادھی الی نوح |
| ۶۱۷ | آیات ۳۶ تا ۴۰ وادھی الی نوح | ۶۳۹ | احکام و مسائل | ۶۲۰ | نوح علیہ السلام کو کشتی سازی کی تعلیم |
| ۶۲۰ | نوح علیہ السلام کو کشتی سازی کی تعلیم | ۶۴۰ | سنّت اسلام | ۶۲۱ | تمام ضروری صنعتوں کی ابتداء وحی سے |
| ۶۲۱ | تمام ضروری صنعتوں کی ابتداء وحی سے | ۶۴۱ | ہمائی اور جہان داری کے چند اصول | ۶۲۲ | لفظ تنور کی تحقیق |
| ۶۲۲ | لفظ تنور کی تحقیق | ۶۴۲ | اختلاف محمود و مذموم | | |
| | | ۶۴۳ | تسمیٰ | | |

خلاصہ تفسیر کے متعلق ضروری تنبیہ

”معارف القرآن“ میں خلاصہ تفسیر سیدی حکیم الامتہ تھانوی قدس سرہ کی تفسیر ”بیان القرآن“ سے بیچنے لیا گیا ہے، لیکن اس کے بعض مواقع میں خالص علی اصطلاحات آئی ہیں جن کا سمجھنا عوام کے لئے مشکل ہے، احقر نے برعایت عوام اکثر ایسے الفاظ کی تہہیل کر کے لکھ دیے ہیں، اور جو مضمون بھی خالص علی تھا اس کو ”معارف و مسائل“ کے عنوان میں لکھ سہل انداز میں لکھ دیا ہے۔ واللہ المستعان

بندہ محمد شفیع



معارف القرآن جلد چہارم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بقیہ سورۃ اعراف

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ وَ

اور ہمیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی کہ نہ پکڑا ہو ہم نے وہاں کے لوگوں کو سختی اور

الضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَضُرَّعُونَ ﴿۹۳﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ

تکلیف میں تاکہ وہ گڑ گڑائیں پھر بدل دی ہم نے برائی کی جگہ بھلائی

حَتَّىٰ عَفَّوْا وَقَالُوا قَدْ مَسَّ آبَاءَنَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ فَأَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً

یہاں تک کہ وہ بڑھ گئے اور کہنے لگے کہ پہنچتی رہی ہے ہمارے باپ دادوں کو بھی تکلیف اور خوشی پھر پکڑا ہم نے

وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۹۵﴾ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا فَتَحْنَا

ان کو ناگہاں اور ان کو خبر نہ تھی اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم کھول دیتے

عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُمْ

اُن پر نعمتیں آسمان اور زمین سے لیکن جھٹلایا انہوں نے پس پکڑا ہم نے ان کو

بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۹۷﴾ أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا

ان کے اعمال کے بدلے ابا کیا بے ڈر ہیں بستیوں والے اس سے کہ آہنچے ان پر آفت ہماری

بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿۹۹﴾ أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا

راتوں رات جب سوتے ہوں یا بے ڈر ہیں بستیوں والے اس بات سے کہ آہنچے ان پر عذاب ہمارا

ضَحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿۱۰۱﴾ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ

دن چڑھے جب کھیلتے ہوں کیا بے ڈر ہو گئے اللہ کے داند سے، سو بے ڈر نہیں ہوتے اللہ کے

إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۱۰۲﴾

داؤ سے مگر خرابی میں پڑنے والے -

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے (ان مذکورہ اور ان کے علاوہ اور بھی دوسری بستیوں میں سے) کسی بستی میں

کوئی نبی نہیں بھیجا کہ وہاں کے رہنے والوں کو (اس نبی کے نہ ماننے پر اول اول تنبیہ نہ کی ہو اور تنبیہ کی غرض سے ان کو) ہم نے محتاجی اور بیماری میں نہ پکڑا ہوتا کہ وہ ڈھیلے پڑجائیں (اور اپنے کفر و تکذیب سے توبہ کریں) پھر جب اس سے متنبہ نہ ہوئے تو استدراجاً یا اس غرض سے کہ مصیبت کے بعد جو نعمت ہوتی ہے اس کی زیادہ قدر ہوتی ہے اور نعمت دینے والے کی آدمی بالطبع اطاعت کرتے لگتا ہے) ہم نے اس بد حالی کی جگہ خوش حالی بدل دی یہاں تک کہ ان کو (غنی اور صحت کے ساتھ مال و اولاد میں) خوب ترقی ہوئی اور (اس وقت براہ کج فہمی) کہنے لگے کہ (وہ پہلی مصیبت ہم پر کفر و تکذیب کے سبب نہ تھی ورنہ پھر خوش حالی کیوں ہوتی بلکہ یہ اتفاقات زمانہ سے ہے چنانچہ) ہمارے آباؤ اجداد کو بھی (یہ دو حالتیں کبھی) تنگی اور (کبھی) راحت پیش آئی تھیں (اسی طرح ہم پر یہ حالتیں گزر گئیں جب وہ اس بھول میں پڑ گئے) تو (اس وقت) ہم نے ان کو دفعۃً عذاب مہلک میں) پکڑ لیا اور ان کو (اس عذاب کے آنے کی) خبر بھی نہ تھی (یعنی گو ان کو انبیاء نے خبر کی تھی مگر چونکہ وہ اس خبر کو غلط سمجھتے تھے اور عیش و آرام میں بھولے ہوئے تھے اس لئے ان کو گمان نہ تھا) اور ہم نے جو ان کو عذاب مہلک میں پکڑا تو اس کا سبب صرف ان کا کفر اور مخالفت تھی ورنہ اگر ان بستیوں کے رہنے والے (پیغمبروں پر) ایمان لے آتے اور (ان کی مخالفت سے) پرہیز کرتے تو ہم (بجائے ارضی و سماوی آفات کے) ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے (یعنی آسمان سے بارش اور زمین سے پیداوار ان کو برکت کے ساتھ عطا فرماتے اور گو اس ہلاکت سے پہلے ان کو خوش حالی ایک حکمت کے لئے دی گئی لیکن اس خوش حالی میں اس لئے برکت نہ تھی کہ آخر وہ وبال جان ہو گئی بخلاف ان نعمتوں کے جو ایمان و اطاعت کے ساتھ ملتی ہیں کہ ان میں یہ خیر و برکت ہوتی ہے کہ وہ وبال کبھی نہیں ہوتیں نہ دنیا میں نہ آخرت میں، حاصل یہ کہ اگر وہ ایمان و تقویٰ اختیار کرتے تو ان کو بھی یہ برکتیں دیتے) لیکن انہوں نے تو (پیغمبروں کی) تکذیب کی تو ہم نے (بھی) ان کے اعمال (بد) کی وجہ سے ان کو عذاب مہلک میں پکڑ لیا (جس کو اوپر آخِزْ نَفْسًا بَعَثْنَا سے تعبیر فرمایا ہے آگے کفار موجودین کو عبرت دلاتے ہیں) کیا (ان قصص کو سن کر) پھر بھی ان (موجودہ) بستیوں کے رہنے والے (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت میں موجود ہیں) اس بات سے بے فکر ہو گئے ہیں کہ ان پر بھی) ہمارا عذاب شب کے وقت آپڑے جس وقت وہ پڑے سوتے ہوں اور کیا ان (موجودہ) بستیوں کے رہنے والے (باوجود کفر و تکذیب کے جو کہ کفار سابقین کے ہلاک کا سبب تھا) اس بات سے بے فکر ہو گئے ہیں کہ (انہی سابقین کی طرح) ان پر ہمارا عذاب دن دوپہر آپڑے جس وقت کہ وہ اپنے لالچوں میں مشغول ہوں (مراد اس سے دنیوی کاروبار ہیں) ہاں تو کیا اللہ تعالیٰ کی اس (ناگہانی) پکڑ سے (جس کا ادب پر بیان ہوا ہے) بے فکر ہو گئے سو (سمجھ رکھو کہ) خدا تعالیٰ

کی پکڑ سے بجز ان کے جن کی شامت ہی آگئی ہو اور کوئی بے فکر نہیں ہوتا۔

مَعَارِفُ وَمَسَائِلُ

پہلے انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی تاریخ اور ان کے عبرتناک حالات و واقعات سے جن کا سلسلہ کئی رکوع پہلے سے چل رہا ہے، یہاں تک پانچ حضرات انبیاء کے قصص کا بیان ہوا ہے، چھٹا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل کا ہے جو تفصیل کے ساتھ نو آیتوں کے بعد آنے والا ہے۔

یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ قرآن کریم تاریخ عالم اور اقوام عالم کے حالات بیان کرتا ہے مگر اسلوب بیان یہ رہتا ہے کہ عام تاریخی کتابوں اور قصے کہانیوں کی کتابوں کی طرح کسی قصہ کو ترتیب اور تفصیل کے ساتھ لانے کے بجائے ہر مقام کے مناسب کسی قصہ کا ایک حصہ بیان کیا جاتا ہے اس کے ساتھ اس سے حاصل ہونے والے عبرت آموز نتائج ذکر کئے جاتے ہیں، اسی طریق پر یہاں ان پانچ قصوں کے بیان کے بعد ان آیات میں جو اوپر لکھی گئی ہیں کچھ تنبیہات مذکور ہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ قوم نوح علیہ السلام اور عاد و ثمود کے ساتھ جو واقعات پیش آئے وہ کچھ ان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ شانہ کی عام عادت یہی ہے کہ قوموں کی ہدایت اور ان کی صلاح و فلاح کے لئے انبیاء علیہم السلام کو بھیجتے ہیں، جو لوگ ان کی نصیحت پر کان نہیں دھرتے تو اول ان کو دنیا کی مصائب و تکالیف میں مبتلا کر دیا جاتا ہے تاکہ تکلیف و مصیبت ان کا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیں کیونکہ انسان کو فطرۃً مصیبت کے وقت خدا ہی یاد آتا ہے، اور یہ ظاہری تکلیف و مصیبت درحقیقت رحمت و رحیم کی رحمت و عنایت ہوتی ہے جیسا مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے۔
خلق را با تو چنین بد خو کنند تا ترا ناچار رو آ نسو کنند

آیت مذکورہ میں اخذنا اھلہا بالنساء و الضراء لعلھم یتذرعون کا یہی مطلب ہے، بؤس اور بآساء کے معنی فقر و فاقہ اور ضرر و ضرراء کے معنی بیماری و مرض کے آتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ جا بجا اسی معنی میں آیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کے یہی معنی بیان فرمائے ہیں بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ بؤس اور بآساء مالی نقصان کے لئے بولا جاتا ہے اور ضرر و ضرراء جانی نقصان کے لئے، اس کا حاصل بھی یہی ہے۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ جب کبھی ہم کسی قوم کی طرف اپنے رسول بھیجتے ہیں اور وہ ان کی بات نہیں مانتے تو ہماری عادت یہ ہے کہ اول ان کو دنیا ہی میں مالی اور جانی تنگی و بیماری وغیرہ میں مبتلا کرتے ہیں تاکہ وہ کچھ ڈھیلے ہو جائیں اور انجام پر نظر کر کے اللہ کی طرف رجوع ہوں۔ اس کے بعد دوسری

آیت میں فرمایا ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتَّىٰ عَفَّوْا، اس میں سیئہ سے مراد وہ فقر و فاقہ یا بیماری کی بد حالی ہے جس کا ذکر اوپر آیا اور حَسَنہ سے مراد اس کے بالمقابل مال میں سعت و فراخی اور بدن میں صحت و سلامت ہے اور لفظ عَفَّوْا، عَفْو سے بنا ہے جس کے ایک معنی بڑھنے اور ترقی کرنے کے بھی ہیں، کہا جاتا ہے عَفَا النَّبَاتُ لَمَّا سَیَّدَتْ بِرَحْمَتِ بَرِّهِ كُنَّ، عَفَا الشَّجَرُ وَالْوَبْرُ جانور کی چربی اور بال بڑھ گئے، اسی معنی سے اس جگہ عَفَّوْا کے معنی ہیں بڑھ گئے اور ترقی کر گئے۔

مطلب یہ ہے کہ پہلا امتحان ان لوگوں کو فقر و فاقہ اور بیماری وغیرہ میں مبتلا کر کے لیا گیا تھا جب اس میں ناکامیاب ہوئے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہ ہوئے تو دوسرا امتحان اس طرح لیا گیا کہ ان کے فقر و فاقہ کے بجائے مال و دولت کی وسعت اور بیماری کے بجائے صحت و سلامت ان کو عطا کر دی گئی یہاں تک کہ وہ خوب بڑھ گئے اور ہر چیز میں ترقی کر گئے، اس امتحان کا حاصل یہ تھا کہ مصیبت کے بعد راحت اور دولت ملنے پر وہ شکر گزار ہوں اور اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں لیکن یہ غفلت شعار مادی راحتوں میں اور لذتوں میں بدست اس سے بھی ہوشیار نہ ہوئے بلکہ یہ کہنے لگے کہ وَقَالُوا أَكُنَّا عِبَادًا لِلَّهِ أَتَىٰ الْبَرِّ وَالشِّرَآءُ، یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں اور نہ یہ کسی اچھے یا بُرے عمل کا نتیجہ ہے بلکہ زمانہ کی عادت ہی یہی ہے کہ کبھی راحت کبھی رنج کبھی بیماری کبھی صحت کبھی تنگی کبھی فراخی ہوا ہی کرتی ہے ہمارے باپ دادوں کو بھی ایسے ہی حالات پیش آئے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ پہلا امتحان تکلیف و مصیبت کے ذریعہ کیا گیا اس میں ناکام ہوئے، دوسرا امتحان راحت و دولت سے کیا گیا اس میں ناکام رہے اور کسی طرح اپنی گمراہی سے باز نہ آئے تب اچانک عذاب میں پکڑے گئے، فَآخَذْنَا لَهُم بِغَتَّةٍ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ، بَغَتَّة کے معنی اچانک۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ لوگ دونوں قسم کی آزمائشوں میں ناکام رہے اور ہوش میں نہ آئے تو پھر ہم نے اُن کو اچانک اس طرح عذاب میں پکڑ لیا کہ ان کو اس کی خبر بھی نہ تھی۔

تیسری آیت میں ارشاد فرمایا وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْبُقْعَةِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ، یعنی اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور نافرمانی سے پرہیز کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کو ان کے اعمال کی وجہ سے پکڑ لیا۔

برکت کے لفظی معنی زیادتی کے ہیں، آسمان اور زمین کی برکتوں سے مراد یہ ہے کہ ہر طرح کی بھلائی ہر طرف سے ان کے لئے کھول دیتے، آسمان سے پانی ضرورت کے مطابق وقت پر پرتا، زمین سے ہر چیز خواہش کے مطابق پیدا ہوتی، پھر ان چیزوں سے نفع اٹھانے اور راحت حاصل کرنے کے سامان جمع کر دیے جاتے کہ کوئی پریشانی اور فکر لاحق نہ ہوتی جس کی وجہ سے بڑی سے بڑی نعمت مکدر ہو جاتی

ہے، ہر چیز میں برکت یعنی زیادتی ہوتی۔

پھر برکت کا ظہور دنیا میں دو طرح سے ہوتا ہے کبھی تو اصل چیز واقع میں بڑھ جاتی ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں ایک معمولی برتن کے پانی سے پورے قافلہ کا سیراب ہونا، یا تھوڑے سے کھانے سے ایک مجمع کا شکم سیر ہو جانا روایات صحیحہ میں مذکور ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگرچہ ظاہری طور پر اس چیز میں کوئی زیادتی نہیں ہوتی مقدار اتنی ہی رہی جتنی تھی لیکن اس سے کام اتنے نکلے جتنے اس سے دو گنی چو گنی چیز سے نکلتے، اور اس کا مشاہدہ عام طور سے کیا جاتا ہے کہ کوئی برتن کپڑا گھریا گھر کا سامان ایسا مبارک ہوتا ہے کہ اس سے عمر بھر آدمی راحت اٹھاتا ہے اور وہ پھر بھی قائم رہتا ہے، اور مرض پھیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ بناتے ہی ٹوٹ گئیں یا سالم بھی رہیں مگر ان سے نفع اٹھانے کا موقع ہاتھ نہ آیا یا نفع بھی اٹھایا لیکن پھر نفع نہ اٹھا سکے۔

اور یہ برکت انسان کے مال میں بھی ہوتی ہے جان میں بھی، کام میں بھی اور وقت میں بھی، بعض مرتبہ ایک لقمہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی قوت و صحت کا سبب بن جاتا ہے اور بعض اوقات بڑی سے بڑی طاقتور غذا اور دوا کام نہیں دیتی، اسی طرح بعض وقت میں برکت ہوتی ہے تو ایک گھنٹہ میں اتنا کام ہو جاتا ہے کہ دوسرے اوقات میں چار گھنٹوں میں بھی نہیں ہوتا، ان سب صورتوں میں اگرچہ مقدار کے اعتبار سے نہ مال بڑھا ہے نہ وقت مگر برکت کا ظہور اس طرح ہوا کہ اس سے کام بہت نکلے۔ اس آیت نے یہ بات واضح کر دی کہ آسمان اور زمین کی کل مخلوقات و موجودات کی برکات ایمان اور تقویٰ پر موقوف ہیں ان کو اختیار کیا جائے تو آخرت کی فلاح کے ساتھ دنیا کی فلاح و برکات بھی حاصل ہوتے ہیں اور ایمان و تقویٰ کو چھوڑنے کے بعد ان کی برکات سے محرومی ہو جاتی ہے، آج کی دنیا کے حالات پر غور کیا جائے تو یہ بات ایک محسوس حقیقت بن کر سامنے آ جاتی ہے کہ آج کل ظاہری طور پر زمین کی پیداوار یہ نسبت پہلے کے بہت زائد ہے اور استعمالی اشیاء کی بہتات اور نئی نئی ایجادات تو اس قدر ہیں کہ کچھلی نسلوں کو ان کا تصور بھی نہ ہو سکتا تھا، مگر اس تمام ساز و سامان کی بہتات اور فراوانی کے باوجود آج کل انسان سخت پریشان، بیمار، تنگ دست نظر آتا ہے، آرام و راحت اور امن و اطمینان کا کہیں وجود نہیں، اس کا سبب اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ سامان سارے موجود اور بکثرت موجود ہیں مگر ان کی برکت مٹ گئی ہے۔ یہاں ایک بات بھی قابل نظر ہے کہ سورہ انعام کی ایک آیت کے اندر کفار و فجّار کے بارے میں آیا ہے فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ، یعنی جب ان لوگوں نے احکام خداوندی کو بھلا دیا تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے، اور پھر اچانک ان کو عذاب میں پکڑ لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز کے دروازے کسی پر کھل جانا کوئی حقیقی انعام نہیں بلکہ وہ ایک طرح کا قہر الہی بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہاں یہ بتلایا گیا ہے کہ اگر ایمان و تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکات کھول

دیتے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ برکاتِ آسمان و زمین اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اس کی رضا کی علامات ہیں۔ بات یہ ہے کہ دنیا کی نعمتیں اور برکتیں کبھی گناہوں اور سرکشی میں حد سے گزر جانے پر ان کے جہم کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے محض عارضی چند روزہ ہوتی ہیں وہ تہر و غضب کی علامت ہوتی ہیں اور کبھی رحمت و عنایت سے دائمی صلاح و فلاح کے لئے ہوتی ہیں وہ ایمان و تقویٰ کا نتیجہ ہوتی ہیں، صورت کے اعتبار سے ان میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ انجام اور عاقبت کا حال کسی کو معلوم نہیں مگر اہل اللہ نے علامات کے ذریعہ پہچان بتلائی ہے کہ جب مال و دولت اور عیش و آرام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے شکر و عباد کی اور زیادہ توفیق ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ یہ رحمت ہے اور اگر مال و دولت اور عزت و راحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اعراف اور گناہوں کی کثرت بڑھے تو یہ علامت اس کی ہے کہ یہ استدراج یعنی قہر الہی کی ایک صورت ہے، اَعَاذُ اللہ منہ پوچھی آیت میں پھر دنیا کی سب قوموں کو تنبیہ کرنے کے لئے ارشاد فرمایا کہ ان بستیوں کے بسنے والے اس بات سے بے فکر ہو بیٹھے کہ ہمارا عذاب ان کو اس حالت میں آپکڑے جب کہ وہ رات کو سو رہے ہوں اور کیا یہ بستی والے اس سے بے خوف ہو گئے کہ ہمارا عذاب ان کو اس حالت میں آپکڑے جب کہ وہ دن پرٹھے اپنے اہو و لعب میں مشغول ہوں، کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر و تقدیر سے مطمئن ہو بیٹھے، سو خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر و تقدیر سے بے فکر وہی قوم ہو سکتی ہے جو خسارہ میں پڑی ہوئی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ جو دنیا کی عیش و راحت میں مست ہو کر خدا تعالیٰ کو بھلا بیٹھتے ہیں ان کو اس بات سے بے فکر نہ ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ان پر رات کے وقت یا دن کے وقت کسی بھی حالت میں آسکتا ہے جیسا کہ پچھلی قوموں کے واقعات عذاب کا ذکر اوپر آچکا ہے، عقلمند کا کام یہ ہے کہ دوسروں کے حالات سے عبرت حاصل کرے اور جو کام دوسروں کے لئے ہلاکت و بربادی کا سبب بن چکے ہیں ان کے پاس جانے سے بچے۔

أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصْبَنَهُمُ

کیا ہمیں ظاہر ہوا ان لوگوں پر جو وارث ہوئے زمین کے وہاں کے لوگوں کے ہلاک ہونے کے بعد کہ اگر ہم چاہیں تو

يَذُوبُهُمْ وَنُطْبِعُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۝۱۰۰ تِلْكَ الْقُرَى نَقُصُّ

ان کو پکڑ لیں ان کے گناہوں پر اور ہم نے مہر کر دی ہے ان کے دلوں پر سو وہ نہیں سنتے، یہ بستیاں ہیں کہ سناتے ہیں ہم

عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِهَا ۚ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا

تجھ کو ان کے کچھ حالات، اور بیشک ان کے پاس پہنچ چکے ان کے رسول نشانیاں لے کر، پھر ہرگز نہ ہو کہ ایمان لائیں

بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ۝۱۰۱ ۚ وَقَاوَجَدْنَا

اس بات پر جس کو پہلے بھٹلا چکے تھے، یوں مہر کر دیتا ہے اللہ کافروں کے دل پر، اور وہ پایا

لَا كَثْرَهُمْ مِنْ عَهْدٍ وَإِنْ وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَسِيقِينَ ﴿۱۰۲﴾

ان کے اکثر لوگوں میں ہم نے عہد کا نباہ ، اور اکثر ان میں پائے نافرمان ۔

خلاصہ تفسیر

آگے اس کی علت بتلاتے ہیں کہ ان کو عذاب سے کیوں ڈرنا چاہئے، اور وہ علت ان کا اُمم سابقہ کے ساتھ جرم کفر میں شریک ہونا ہے یعنی، اور ان (گزشتہ) زمین پر رہنے والوں کے بعد جو لوگ (اب) زمین پر بجائے ان کے رہتے ہیں کیا ان واقعات مذکورہ نے ان کو یہ بات (مہنوز) نہیں بتلائی کہ اگر ہم چاہتے تو ان کو (بھی) مثل اُمم سابقہ کے، ان کے جرائم (کفر و تکذیب) کے سبب ہلاک کر ڈالتے (کیونکہ اُمم سابقہ ان ہی جرائم کے سبب ہلاک کی گئیں) اور واقعی یہ واقعات تو ایسے ہی ہیں کہ ان سے سبق لینا چاہئے تھا لیکن اصل یہ ہے کہ ہم ان کے دلوں پر بند لگاتے ہوئے ہیں اس سے وہ حق بات کو دل سے، سنتے (بھی) نہیں (اور مانتا تو درکنار واپس اس بند لگانے سے ان کی قساوت بڑھ گئی کہ ایسے عبرت خیز واقعات سے بھی عبرت نہیں ہوتی اور اس بند لگانے کا سبب انہی کا ابتداء میں کفر کرنا ہے، لقولہ تعالیٰ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ آگے شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کے لئے سارے مضمون مذکور کا خلاصہ ہے کہ، ان (مذکورہ) بستیوں کے کچھ کچھ قصے ہم آپ سے بیان کر رہے ہیں اور ان سب (بستیوں میں رہنے والوں) کے پاس ان کے پیغمبر معجزات لے کر آئے تھے (مگر) پھر (بھی) ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی یہ کیفیت تھی کہ جس چیز کو انہوں نے اول (دہلہ) میں (ایک بار) جھوٹا کہہ دیا یہ بات نہ ہوتی کہ پھر اس کو مان لیتے (اور جیسے یہ دل کے سخت تھے، اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کے دلوں پر بند لگا دیتے ہیں اور ان میں سے بعضے لوگ مصیبتوں میں ایمان لانے کا عہد بھی کر لیتے تھے لیکن) اکثر لوگوں میں ہم نے دفائے عہد نہ دیکھا (یعنی زوال مصیبت کے بعد پھر ویسے کے ویسے ہی ہو جاتے تھے، اور ہم نے اکثر لوگوں کو ربا و بوار سال رسل و اظہار معجزات و نزول بیانات و توثیق معاہدات) بے حکم ہی پایا (پس کفار ہمیشہ سے ایسے ہی ہوتے رہے ہیں، آپ بھی غم نہ کیجئے)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں بھی پچھلی قوموں کے واقعات و حالات سُنا کر موجودہ اقوام عرب و عجم کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ ان واقعات میں تمہارے لئے بڑا درس عبرت ہے کہ جن کاموں کی وجہ سے پچھلے لوگوں پر اللہ کا غضب اور عذاب نازل ہوا ان کے پاس نہ جائیں اور جن کاموں کی وجہ سے انبیاء

علیہم السلام اور ان کے متبعین کو کامیابی حاصل ہوئی ان کو اختیار کریں، چنانچہ پہلی آیت میں ارشاد ہے اَوْ لَعْنَةُ اللَّهِ لِلَّذِينَ يَرْتَابُونَ اَلْاٰمْرَ مِنْۢ بَعْدِ اٰهْلِهَا اِنَّ لَوْ تَشَاءُوْا صَبْتُمْ اٰمُرُكُمْ بِذٰلِكَ تُؤْبَهُوْا، ہدای، تہذیب کے معنی نشان دہی کرنے اور بتلانے کے آتے ہیں، اس جگہ اس کا فاعل وہ واقعات ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، معنی یہ ہیں کہ موجودہ زمانہ کے لوگ جو پچھلی قوموں کے ہلاک ہونے کے بعد ان کی زمینوں مکانوں کے وارث بنے یا آئندہ بنیں گے کیا ان کو پچھلے عبرتناک واقعات نے یہ نہیں بتلایا کہ کفر و انکار اور احکام خداوندی کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں جس طرح ان کے مورث اعلیٰ (یعنی پچھلی قومیں) ہلاک و برباد ہو چکی ہیں اسی طرح اگر یہ بھی انہیں جرائم کے مرتکب رہے تو ان پر بھی اللہ تعالیٰ کا قہر و عذاب آسکتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا وَ نَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ، طبع کے معنی چھاپنے اور مہر لگانے کے ہیں، اور معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ واقعات ماضیہ سے بھی کوئی عبرت اور ہدایت حاصل نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غضب الہی سے ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے پھر وہ کچھ نہیں سنتے، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک نقطہ سیاہی کا لگ جاتا ہے، دوسرا گناہ کرتا ہے تو دوسرا اور تیسرا گناہ کرتا ہے تو تیسرا نقطہ لگ جاتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ برابر گناہوں میں بڑھتا گیا تو بہ نہ کی تو یہ سیاہی کے نقطے اس کے سارے قلب کو گھیر لیتے ہیں اور انسان کے قلب میں اللہ تعالیٰ نے جو فطری مادہ بھلے بُرے کی پہچان اور برائی سے بچنے کا رکھا ہے وہ فنا یا مغلوب ہو جاتا ہے، اور اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ اچھی چیز کو بُرا اور بُری کو اچھا، مفید کو مضر اور مضر کو مفید خیال کرنے لگتا ہے، اسی حالت کو قرآن میں ذٰن یعنی قلب کے زنگ سے تعبیر فرمایا ہے، اور اسی حالت کا آخری نتیجہ وہ ہے جس کو طبع یعنی مہر لگانے سے اس آیت میں اور بہت سی دوسری آیات میں تعبیر کیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ دل پر مہر لگ جانے کا نتیجہ تو عقل و فہم کا معدوم ہو جانا ہے، کانوں کی سماعت پر تو اس کا کوئی اثر عادیہ نہیں ہوا کرتا، تو اس آیت میں موقع اس کا تھا کہ اس جگہ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ فرمایا جاتا یعنی وہ سمجھتے نہیں، مگر قرآن کریم میں یہاں فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ آیا ہے یعنی وہ سنتے نہیں۔ سبب یہ ہے کہ سننے سے مراد اس جگہ ماننا اور اطاعت کرنا ہے جو نتیجہ ہوتا ہے سمجھنے کا، مطلب یہ ہے کہ دلوں پر مہر لگ جانے کے سبب وہ کسی حق بات کو ماننے پر تیار نہیں ہوتے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسان کا قلب اس کے تمام اعضاء و جوارح کا مرکز ہے جب قلب کے افعال میں خلل آتا ہے تو سارے اعضاء کے افعال مختل ہو جاتے ہیں، جب دل میں کسی چیز کی بھلائی یا برائی سما جاتی ہے تو پھر ہر چیز میں اس کو آنکھوں سے بھی وہی نظر آتا ہے کانوں سے بھی وہی سنائی دیتا ہے۔

چشم بداندیش کہ برکندہ باد عجب نماید ہنرش و نظر

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا تِلْكَ الْقُرْآنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ مَا كَانَتْ مِنْ قَبْلُ، یعنی ان سب لوگوں کے انبیاء و رسل ان کے پاس معجزات لے کر پہنچے جن کے ذریعہ حق و باطل کا فیصلہ ہو جاتا ہے، مگر ان کی صدا اور ہٹ و دھرمی کا یہ عالم تھا کہ جس چیز کے متعلق ایک مرتبہ ان کی زبان سے یہ نکل گیا تھا کہ یہ غلط اور بھوٹ ہے پھر اس کے حق و صدق ہونے پر کتنے ہی معجزات، دلائل اور حجتیں سامنے آگئیں مگر وہ اس کی تصدیق و اقرار کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔

اس آیت سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ معجزات تمام انبیاء و رسل کو عطا فرمائے گئے ہیں جن میں سے بعض انبیاء کے معجزات کا قرآن میں ذکر آیا ہے، بہت سوں کا نہیں آیا، اس سے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ جن کے معجزات کا ذکر قرآن میں نہیں آیا ان سے کوئی معجزہ ثابت ہی نہیں، اور سورۃ ہود میں جو حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کا یہ قول مذکور ہے کہ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ یعنی آپ کوئی معجزہ نہیں لائے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان کا یہ قول محض عناد اور ہٹ و دھرمی کی بنا پر تھا یا یہ کہ ان کے معجزات کو معمولی سمجھ کر ایسا کہا۔

دوسری بات یہ قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں ان لوگوں کا جو حال بتلایا گیا ہے کہ غلط بات زبان سے نکل گئی تو اس کی سخت پروری کرتے رہے، اس کے خلاف کتنے ہی واضح دلائل آجائیں، اپنی بات کی تصحیح کرتے رہے، یہ خدا کی منکر اور کافر قوموں کا حال ہے جس میں بکثرت مسلمان بلکہ بعض علماء و خواص بھی مبتلا پائے جاتے ہیں کہ کسی چیز کو اول و ہلہ میں غلط یا بھوٹ کہہ دیا تو اب اس کی سچائی کے ہزاروں دلائل بھی سامنے آجائیں تو اپنی غلط بات کی پیروی کرتے رہیں، یہ حالت قہر خداوندی اور غضب الہی کا موجب ہے، (از مسائل السلوک) اس کے بعد فرمایا كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الْكَافِرِينَ، یعنی جس طرح ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، اسی طرح عام کافر و منکر لوگوں کے دلوں پر اللہ تعالیٰ مہر لگا دیتے ہیں کہ پھر نیکی قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔

تیسری آیت میں ارشاد فرمایا وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ، یعنی ان میں سے اکثر لوگوں کو ہم نے ایفائے عہد کرنے والا نہ پایا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ عہد سے مراد عہد الست ہے جو ازل میں تمام مخلوقات

کے پیدا کرنے سے پہلے ان سب کی روحوں کو پیدا فرما کر لیا گیا تھا، جس میں حق تعالیٰ نے فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ یعنی کیا میں تمہارا پروردگار نہیں، اس وقت تمام ارواح انسانی نے اقرار اور عہد کے طور پر جواب دیا بلی یعنی ضرور آپ ہمارے رب ہیں، دنیا میں اگر اکثر لوگ اس عہد ازل کو بھول گئے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر مخلوق پرستی کی لعنت میں گرفتار ہو گئے اس لئے اس آیت میں فرمایا کہ ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں میں عہد نہ پایا، یعنی عہد کی پاسداری اور ایفاء نہ پایا۔ (کبیر)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ عہد سے مراد عہدِ ایمان ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا اَلَا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا، اس میں عہد سے عہدِ ایمان و طاعت مراد ہے، تو آیت کا حاصل مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر نے ایمان و طاعت کا عہد ہم سے باندھا تھا پھر اس کی خلاف ورزی کی، عہد باندھنے سے مراد یہ ہے کہ عموماً انسان جب کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اس وقت کتنا ہی فاسق فاجر ہو اس کو بھی خدا ہی یاد آتا ہے اور اکثر دل یا زبان سے عہد کرتا ہے کہ اس مصیبت سے نجات مل گئی تو اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت میں لگ جاؤں گا نافرمانی سے بچوں گا جیسا کہ قرآن کریم میں بہت سے لوگوں کا یہ حال ذکر کیا گیا ہے، لیکن جب ان کو نجات ہو جاتی ہے اور آرام و راحت ملتی ہے تو پھر ہوی و ہوس میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس عہد کو بھول جاتے ہیں۔

آیت مذکورہ میں لفظ اکثر سے اس کی طرف اشارہ بھی پایا جاتا ہے، کیونکہ بہت سے لوگ تو ایسے شقی ہوتے ہیں کہ مصیبت کے وقت بھی انہیں خدا یاد نہیں آتا اور اس وقت بھی وہ ایمان و طاعت کا عہد نہیں کرتے تو ان سے بد عہدی کی شکایت کے کوئی معنی نہیں، اور بہت سے لوگ وہ بھی ہیں جو عہد کو پورا کرتے ہیں، ایمان و طاعت کے حقوق ادا کرتے ہیں اس لئے فرمایا وَمَا وَجَدْنَا لَاکُمْ عَهْدًا یعنی ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں میں ایفلے عہد نہ پایا اس کے بعد فرمایا وَاِنْ اَکْثَرُهُمْ لَفٰسِقٰیْنِ یعنی ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں کو اطاعت و فرماں برداری سے خارج پایا۔

یہاں تک پچھلے انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے پانچ واقعات کا بیان کر کے موجودہ لوگوں کو ان سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کے لئے تنبیہات فرمائی گئی ہیں۔

اس کے بعد چھٹا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تفصیل کے ساتھ بیان ہوگا، جس میں واقعات کے ضمن میں سینکڑوں احکام و مسائل اور عبرت و نصیحت کے بے شمار مواقع ہیں، اور اسی لئے قرآن کریم میں اس واقعہ کے احسناء بار بار دہرائے گئے ہیں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَظَلَمُوا

پھر بھیجا ہم نے ان کے پیچھے موسیٰؑ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس

بِمَاءٍ فَأَنْظَرُ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۰﴾ وَقَالَ مُوسَىٰ

پس کفر کیا انہوں نے ان کے مقابلہ میں، سو دیکھ کیا انجام ہوا مفسدوں کا، اور کہا موسیٰؑ نے

يَفِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۱﴾ حَقِيقٌ عَلَىٰ أَنْ لَا

اے فرعون میں رسول ہوں پروردگار عالم کا، قائم ہوں اس بات پر کہ نہ کہوں

أَقُولُ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقُّ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ فَأَرْسِلْ

اللہ کی طرف سے مگر جو سچ ہے، لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی سو بھیج دے

مَعِيَ بَنِي إِسْرَءِيلَ ﴿۱۲﴾ قَالَ إِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِآيَةٍ فَأْتِ بِهَا

میرے ساتھ بنی اسرائیل کو، بولا اگر تو آیا ہے کوئی نشانی لے کر تو لا اس کو

إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۳﴾ فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ

اگر تو سچا ہے، تب ڈال دیا اس نے اپنا عصا تو اسی وقت ہو گیا اڑدھیا

مُبِينٌ ﴿۱۴﴾ وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّظِيرِينَ ﴿۱۵﴾ قَالَ الْمَلَأُ

صریح، اور نکالا اپنا ہاتھ تو اسی وقت وہ سفید نظر آنے لگا دیکھنے والوں کو، بولے سردار

مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَذَا السِّحْرُ عَلِيمٌ ﴿۱۶﴾ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِّنْ

فرعون کی قوم کے یہ تو کوئی بڑا داقف جادوگر ہے، نکالنا چاہتا ہے تم کو تمہارے

أَرْضِكُمْ هَٰذَا تَأْمُرُونَ ﴿۱۷﴾

ملک سے، اب تمہاری کیا صلاح ہے۔

خلاصہ تفسیر

پھر ان (مذکورہ پیغمبروں) کے بعد ہم نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنے دلائل (یعنی معجزات) دے کر فرعون کے اور اس کے امراء کے پاس (ان کی ہدایت و تبلیغ کے لئے) بھیجا سو جب موسیٰ علیہ السلام نے وہ دلائل ظاہر کئے تو ان لوگوں نے ان (معجزات) کا بالکل حق ادا نہ کیا (کیونکہ ان کا حق اور مقتضایہ تھا کہ ایمان لے آتے، سو دیکھتے ان مفسدوں کا کیا (برا) انجام ہوا جیسا اور جبکہ ان کا غرق اور ہلاک ہونا مذکور ہے۔ یہ تو تمام قصہ کا اجمال

تھا آگے تفصیل ہے یعنی، اور موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون کے پاس بحکم الہی جا کر فرمایا کہ میں رب العالمین کی طرف سے تم لوگوں کی ہدایت کے واسطے، پیغمبر (مقرر ہوا) ہوں (جو مجھ کو کاذب بتلائے اس کی غلطی ہے کیونکہ) میرے لئے یہی شایان ہے کہ بجز سچ کے خدا کی طرف کوئی بات منسوب نہ کروں (اور میں رسالت کا خالی دعویٰ ہی نہیں کرتا بلکہ) میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑی دلیل (یعنی معجزہ) بھی لایا ہوں (جو طلب کے وقت دکھلا سکتا ہوں) سو جب میں رسول مع الدلیل ہوں تو میں جو کہوں اس کی اطاعت کر چنانچہ منجملہ ان امور کے ایک یہ کہتا ہوں کہ) تو بنی اسرائیل کو (اپنی بیگاری سے خلاصی دے کر) میرے ساتھ (ملک شام کو جو ان کا اصلی وطن ہے) بھیج دے فرعون نے کہا کہ اگر آپ (من جانب اللہ) کوئی معجزہ لے کر آئے ہیں تو اس کو اب پیش کیجئے اگر آپ (اس دعویٰ میں) سچے ہیں، بس آپ نے (فوراً) اپنا عصا (زمین پر) ڈال دیا سو دفعۃً وہ صاف ایک اڑدھا بن گیا (جس کے اڑدھا ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا تھا) اور (دوسرا معجزہ یہ ظاہر کیا کہ) اپنا ہاتھ (گریبان کے اندر بغل میں دبا کر) باہر نکال لیا سو وہ یکایک سب دیکھنے والوں کے روبرو بہت ہی چمکتا ہوا ہو گیا (کہ اس کو بھی سب نے دیکھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو یہ معجزات عظیمہ ظاہر ہوئے تو فرعون نے اہل دربار سے کہا کہ یہ شخص بڑا جادوگر ہے اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اپنے جادو سے تم لوگوں پر غالب آکر یہاں کا رئیس ہو جائے اور تم کو یہاں آباد نہ رہنے دے سو اس بارے میں تمہارا کیا مشورہ ہے چنانچہ سورۃ شعراء میں یہ قول فرعون کا منقول ہے اس کو سن کر جیسا کہ مصاحبین سلاطین کی عادت ان کی ہاں میں ہاں ملانے کی ہوتی ہے فرعون کے قول کی تصدیق و موافقت کے لئے، قوم فرعون میں جو سردار (اور اہل دربار) لوگ تھے انہوں نے (ایک دوسرے سے) کہا کہ واقعی جیسا ہمارے بادشاہ کہتے ہیں کہ (یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے) (ضرور) یہ (ہی) چاہتا ہے کہ (اپنے جادو کے زور سے خود مع بنی اسرائیل کے رئیس ہو جائے اور) تم کو (بوجہ اس کے کہ بنی اسرائیل کی نظر میں خاں ہو) تمہاری (اس) سرزمین سے باہر کر دے سو تم لوگ (جیسا کہ بادشاہ دریافت کر رہے ہیں) کیا مشورہ دیتے ہو۔

معارف و مسائل

اس سورت میں جتنے قصص اور واقعات انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے ذکر کئے گئے ہیں یہ ان میں سے چھٹا قصہ ہے، اس کو زیادہ تشریح و تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا

سبب یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بہ نسبت دوسرے انبیاء سابقین کے تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور قوت ظہور میں بھی۔ اسی طرح اس کے بالمقابل ان کی قوم بنی اسرائیل کی جہالت اور ہٹ دھرمی بھی پچھلی امتوں کے مقابلہ میں زیادہ اشد ہے اور یہ بھی ہے کہ اس قصہ کے ضمن میں بہت سے معارف و مسائل اور احکام بھی آئے ہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ ان کے بعد یعنی نوح اور ہود اور صالح اور لوط اور شعیب علیہم السلام کے یا ان کی قوموں کے بعد ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات دے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ آیات سے مراد تورات کی آیات بھی ہو سکتی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی۔ اور فرعون اس زمانہ میں ہر بادشاہ مصر کا لقب ہوتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے فرعون کا نام قابوس بیان کیا جاتا ہے (قرطبی)

فَظَلَمُوا بِهَآئِی ضَمِیرِ مَحْرُورِ آیات کی طرف راجع ہے، معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں نے ہماری آیات پر ظلم کیا، اور آیات الہیہ پر ظلم کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے آیات الہیہ کی قدر نہ پہچانی، ان پر شکر کے بجائے ناشکری اقرار کے بجائے انکار، ایمان کے بجائے کفر اختیار کیا۔ کیونکہ ظلم کے اصلی معنی ہی یہ ہیں کہ کسی چیز کو اس کے محل اور موقع کے خلاف استعمال کرنا۔

پھر فرمایا فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ، یعنی دیکھو تو سہی کہ پھر ان فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔ مراد یہ ہے کہ ان کے حالات اور انجام بد پر غور کرو اور عبرت حاصل کرو۔

دوسری آیت میں فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ میں ربِّ العالمین کا رسول ہوں، میرے حال اور منصب نبوت کا تقاضا یہی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی بات بجز سچ کے منسوب نہ کروں، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو جو پیغام حق تعالیٰ کی طرف سے دیئے جاتے ہیں وہ ان کے پاس خدائی امانت ہوتے ہیں، اس میں اپنی طرف سے کی بیشی کرنا خیانت ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام خیانت اور ہر گناہ سے پاک اور معصوم ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ تم لوگوں کو میری بات پر اس لئے یقین کرنا چاہیے کہ میری سچائی تم سب کے سامنے ہے، میں نے کبھی نہ جھوٹ بولا ہے اور نہ بول سکتا ہوں، اس کے علاوہ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَیِّنَةٍ مِّنْ رَبِّکُمْ فَادْسِلْ مَعِیْ بَیِّنِیْ اسْرَآئِیلَ، یعنی صرف یہی بات نہیں کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا بلکہ میرے دعوے پر دلیل میرے معجزات بھی ہیں۔ اس لئے ان سب چیزوں کا تقاضا یہ ہے کہ آپ میری بات سنیں اور مانیں، بتی

اسرائیل کو مصنوعی غلامی سے نجات دے کر میرے ساتھ کر دیں۔ فرعون نے اور کسی بات پر تو کان نہ دھرا، معجزہ دیکھنے کا مطالبہ کرنے لگا اور کہا اِنْ كُنْتَ بِآيَةٍ قَاتِبَهَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ، یعنی اگر تم واقعی کوئی معجزہ لائے ہو تو پیش کرو اگر تم سچ بولنے والوں میں سے ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے مطالبہ کو مانتے ہوئے اپنی لالٹھی زمین پر ڈال دی وہ اڑدھا بن گئی فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ، ثعبان بڑے اڑدھا کو کہا جاتا ہے اور اس کی صفت مُبِينٌ ذکر کر کے بتلادیا کہ اس لالٹھی کا سانپ بن جانا کوئی ایسا واقعہ نہ تھا کہ کسی اندھیرے یا گوشہ پردہ میں واقع ہوا ہو جس کو کوئی دیکھے کوئی نہ دیکھے، جیسے عموماً شعیبہ بازوں یا بھادوگروں کا طرز ہوتا ہے، بلکہ یہ واقعہ بھرے دربار میں سب کے سامنے پیش آیا۔

بعض تاریخی روایات میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ اس اڑدھانے فرعون کی طرف منہ پھیلایا تو گھبرا کر تخت شاہی سے کود کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پناہ لی اور دربار کے ہزاروں آدمی اس کی دہشت سے مر گئے (تفسیر کبیر)

لالٹھی کا سچ مچ سانپ بن جانا کوئی ناممکن یا محال چیز نہیں، ہاں عادت عامہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے حیرت انگیز اور قابلِ تعجب ضرور ہے، اور معجزہ و کرامت کا منشاء ہی یہ ہوتا ہے کہ جو کام عام آدمی نہ کر سکیں وہ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاری کر دیا جاتا ہے تاکہ عوام سمجھ لیں کہ ان کے ساتھ کوئی خدائی طاقت کام کر رہی ہے اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لالٹھی کا سانپ بن جانا کوئی قابلِ تعجب انکار نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد فرمایا وَ تَزَعُ يَدَكَ فَاِذَا هِيَ بَيْضَةٌ لِلنَّظْرِ، تَزَعُ کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں سے کسی قدر سختی کے ساتھ نکالنے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ اپنے ہاتھ کو کھینچ کر نکالا، یہاں یہ مذکور نہیں کہ کس چیز میں سے نکالا۔ دوسری آیات میں دوسری چیزیں مذکور ہیں، ایک جگہ اَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ اَيَا هِيَ جَسَدٌ اَمْ عِظًا اَمْ نَجَسٌ، یعنی یہ ہیں کہ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو۔ دوسری جگہ وَ اَخْضَمْ يَدَكَ اِلَى جَنَائِكَ، مذکور ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنا ہاتھ اپنے بازو کے نیچے ڈالو۔ ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ ہاتھ کا نکالنا گریبان کے اندر سے یا بازو کے نیچے سے ہوتا تھا۔ یعنی کبھی گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالنے سے اور کبھی بازو کے نیچے دبا کر نکالنے سے یہ معجزہ ظاہر ہوتا تھا کہ فَاِذَا هِيَ بَيْضَةٌ لِلنَّظْرِ، یعنی وہ ہاتھ

چمکنے والا ہو جاتا ہے دیکھنے والوں کے لئے۔

بَيْضَاءُ کے لفظی معنی سفید کے ہیں اور ہاتھ کا سفید ہو جانا کبھی برص کی بیماری کے سبب بھی ہوا کرتا ہے، اس لئے ایک دوسری آیت میں اس جگہ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ہاتھ کی سفیدی کسی بیماری کے سبب نہ تھی۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفیدی بھی معمولی سفیدی نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ روشنی ہوتی تھی جس سے ساری فضا روشن ہو جاتی تھی۔ (قرطبی)

اس جگہ لَفْظُ لِلنَّازِلِينَ بڑھا کر اس روشنی کے عجیب و غریب ہونے کی طرف اشارہ فرمادیا گیا ہے کہ یہ ایسی عجیب روشنی تھی کہ اس کے دیکھنے کے لئے ناظرین جمع ہو جاتے تھے۔

اس وقت فرعون کے مطالبہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دو معجزے دکھلائے، ایک لاشٹھی کا اثر دھابن جانا دوسرے ہاتھ کو گریبان یا بغل میں ڈال کر نکالنے سے اس میں روشنی پیدا ہو جانا۔ پہلا معجزہ مخالفین کی ترہیب اور ڈرانے کے لئے، اور دوسرا معجزہ ان کی ترغیب اور قریب کرنے کے لئے ہے، جس میں اشارہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم ایک نور ہدایت رکھتی ہے اس کا اتباع باعثِ فلاح ہے۔

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ، لَفْظُ فَلَا کسی قوم کے با اثر سرداروں کے لئے بولا جاتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ قوم فرعون کے سردار یہ معجزات دیکھ کر اپنی قوم کو خطاب کر کے کہنے لگے کہ یہ تو بڑا ماہر جادوگر ہے وجہ یہ تھی کہ وہ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

ان بیچاروں کو خدائے تعالیٰ اور اس کی قدرتِ کاملہ کی کیا خبر تھی جنہوں نے ساری عمر فرعون کو اپنا خدا اور جادوگروں کو اپنا رہبر سمجھا اور جادوگروں کے شعوڑوں ہی کو دیکھا تھا، وہ اس حیرت انگیز واقعہ کو دیکھ کر اس کے سوا کہہ ہی کیا سکتے تھے کہ یہ بھی کوئی بڑا جادو ہے لیکن ان لوگوں نے بھی یہاں سَاحِرٌ کے ساتھ عَلِيمٌ کا لفظ بڑھا کر یہ ظاہر کر دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کے متعلق یہ احساس ان کو بھی ہو گیا تھا کہ یہ کام عام جادوگروں کے کام سے ممتاز اور مختلف ہے اسی لئے اتنا اقرار کیا کہ یہ بڑے ماہر جادوگر ہیں۔

معجزہ اور حبادو | اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات کو اسی انداز سے ظاہر میں منسرق فرماتے ہیں کہ اگر دیکھنے والے ذرا بھی غور کریں اور ہٹ دھرمی اختیار نہ کریں تو معجزہ اور سحر کا فرق خود بخود سمجھ لیں۔ سحر کرنے والے عموماً ناپاکی اور گندگی میں رہتے ہیں اور جتنی زیادہ گندگی اور ناپاکی میں ہوں اتنا ہی ان کا جادو زیادہ کامیاب ہوتا ہے، بخلاف

انبیاء علیہم السلام کے کہ طہارت و نفاقت ان کی طبیعتِ ثانیہ ہوتی ہے، اور یہ بھی کھلا ہوا فرق من جانب اللہ ہے کہ نبوت کا دعویٰ کرنے کے ساتھ کسی کا جادو چلتا بھی نہیں۔

اور اہل بصیرت تو اصل حقیقت کو جانتے ہیں کہ جادو سے جو چیزیں ظاہر کی جاتی ہیں وہ سب دائرہ اسبابِ طبعیہ کے اندر ہوتی ہیں، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اسباب عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتے، بلکہ مخفی اسباب ہوتے ہیں، اس لئے وہ یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ یہ کام بغیر کسی ظاہری سبب کے ہو گیا، بخلاف معجزہ کے کہ اس میں اسبابِ طبعیہ کا مطلق کوئی دخل نہیں ہوتا، وہ براہِ راست قدرتِ حق کا فعل ہوتا ہے، اسی لئے قرآن کریم میں اس کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، وَلَکِنَّ اللّٰہَ رَءٰی۔

اس سے معلوم ہوا کہ معجزہ اور سحر کی حقیقتیں بالکل مختلف اور متباین ہیں، حقیقت شناس کے لئے تو کوئی التباس کی وجہ ہی نہیں، عوام کو التباس ہو سکتا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس التباس کو دور کرنے کے لئے بھی ایسے امتیازات رکھ دیئے ہیں کہ جس کی وجہ سے لوگ دھوکہ سے بچ جائیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قوم فرعون نے بھی موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کو اپنے جادو گروں کے افعال سے کچھ ممتاز و مختلف پایا، اس لئے اس پر مجبور ہوئے کہ یہ کہیں کہ یہ بڑا ماہر جادوگر ہے کہ عام جادوگر اس جیسے کاموں کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔

یُرِیدُ اَنْ یَّخْرِجَکُمْ مِنْ اَرْضِکُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ، یعنی یہ ماہر جادوگر یہ چاہتا ہے کہ تم کو تمہارے ملک سے نکال دے، تو اب بتلا دو کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا مشورہ دیتے ہو؟

قَالُوا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِی الْمَدَآئِنِ حَاشِرَیْنِ ۝۱۲۱

بولے ڈھیل دے اس کو اور اس کے بھائی کو اور بھیج پرگنوں میں جمع کرنے والوں کو،

یَا تُوْكَ بِکُلِّ سِحْرِ عَلَیْمٍ ۝۱۲۲ وَجَاءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْا

کہ جمع کر لائیں تیرے پاس جو ہو کاہل جادوگر اور آئے جادوگر فرعون کے پاس، بولے

اِنَّ لَنَا لَآجْرًا اِنْ کُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِیْنَ ۝۱۲۳ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّکُمْ

ہمارے لئے کچھ مزدوری ہے اگر ہم غالب ہوئے، بولا ہاں اور بیشک تم

لِیْمَنِ الْمُقَرَّبِیْنَ ۝۱۲۴ قَالُوْا یٰمُوسٰی اِنَّمَا اَنْ تُلْقٰی وَرَاْمَا اَنْ

مقرب ہو جاؤ گے بولے اے موسیٰ یا تو تو ڈال اور یا ہم

تَكُونُ نَحْنُ الْمُلْقِينَ ﴿١١٥﴾ قَالَ أَلْقُوا فَلَمَّا أَلْقَوْا سَحَرُوا

ڈالتے ہیں ، کہا ڈالو پھر جب انہوں نے ڈالا ، باندھ دیا لوگوں کی

أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ وَجَاءُوا بِسِحْرِ عَظِيمٍ ﴿١١٦﴾ وَ

آنکھوں کو اور ان کو ڈرا دیا اور لائے بڑا جادو ، اور ہم نے

أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَلِقَ عَصَاكَ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا

حکم بھیجا موسیٰ کو کہ ڈال دے اپنا عصا سو وہ جی بھی لگا نکلنے جو سانگ

يَا فِكُونُ ﴿١١٧﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١١٨﴾ فَغُلِبُوا

انہوں نے بنایا تھا ، پس ظاہر ہو گیا حق اور غلط ہو گیا جو کچھ انہوں نے کیا تھا ، پس ہار گئے

هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوا صَغِيرِينَ ﴿١١٩﴾ وَأَلْقَى السَّحَرَةُ سِجِّدِينَ ﴿١٢٠﴾

اس جگہ اور لوٹ گئے ذلیل ہو کر ، اور گر پڑے جادوگر سجدہ میں ،

قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٢١﴾ رَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿١٢٢﴾

بولے ہم ایمان لائے پروردگار عالم پر ، جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا ۔

خلاصہ تفسیر

(غرض مشورہ طے کر کر اگر) انہوں نے (فرعون سے) کہا کہ آپ ان (موسیٰ علیہ السلام) کو اور ان کے بھائی کو جہلت دیجئے اور (اپنی حد و قلم فرمائی) شہروں میں (گرد آوروں کو یعنی) چیرا سیدوں کو (سکھ نامے دے کر) بھیج دیجئے کہ وہ (سب شہروں سے) سب ماہر جادو گروں کو (جمع کر کے) آپ کے پاس لا کر حاضر کر دیں اپنا پنچہ ایسا ہی انتظام کیا گیا) اور وہ جادوگر فرعون کے پاس حاضر ہوئے (اور) کہنے لگے کہ اگر ہم (موسیٰ علیہ السلام پر) غالب آئے تو (کیا) ہم کو کوئی بڑا صلہ (اور انعام) ملے گا ، فرعون نے کہا کہ ہاں (انعام بھی بڑا ملے گا) اور (مزید برآں یہ ہو گا کہ) تم (ہمارے) مقرب لوگوں میں داخل ہو جاؤ گے (غرض موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی جانب سے اس کی اطلاع دی گئی اور مقابلہ کے لئے تاریخ معین ہوئی اور تاریخ پر سب ایک میدان میں جمع ہوئے اس وقت) ان ساحروں نے (موسیٰ علیہ السلام سے) عرض کیا کہ اے موسیٰ (ہم آپ کو اختیار دیتے ہیں) خواہ آپ (اول اپنا عصا میدان میں) ڈالنے (جس کو آپ اپنا معجزہ بتلاتے ہیں) اور یا (آپ کہیں تو) ہم ہی (اپنی رسیاں اور لاٹھیاں میدان میں) ڈالیں ، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ تم ہی (پہلے) ڈالو جب انہوں نے

ر اپنی رسیوں اور لٹھیوں کو، ڈالا تو (جادو سے دیکھنے والے) لوگوں کی نظر بندی کر دی جس سے وہ لٹھیاں اور رسیاں سانپ کی شکل میں لہراتی نظر آتے لگیں، اور ان پر مہیت غالب کر دی اور ایک طرح کا بڑا جادو دکھلایا اور (اس وقت) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (وحی کے ذریعہ سے) حکم دیا کہ آپ اپنا عصا ڈال دیجئے (جیسا ڈالا کرتے ہیں) سو عصا کا ڈالنا تھا کہ اس نے (اژدھان کر) ان کے سارے بنے بنائے کھیل کو نکلنا شروع کیا پس (اس وقت) حق (کا حق ہونا) ظاہر ہو گیا اور انہوں نے (یعنی ساحروں نے) جو کچھ بتایا و نایا تھا سب آتا جاتا رہا پس وہ لوگ (یعنی فرعون اور اس کی قوم) اس موقع پر ہار گئے اور خوب ذلیل ہوئے (اور اپنا سامنے لے کر رہ گئے) اور وہ جو ساحر تھے وہ سجدہ میں گر گئے، (اور پکار پکار کر) کہنے لگے کہ ہم ایمان لے آئے رب العالمین پر جو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کا بھی رب ہے۔

معارف و مسائل

ان آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بقیہ قصہ مذکور ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کھلا معجزہ دیکھا کہ لٹھی کا سانپ بن گیا اور پھر جب اس کو ہاتھ میں پکڑا تو پھر لٹھی بن گئی اور ہاتھ کو گریبان میں ڈال کر نکالا تو چمکنے لگا، اس آیت قدرت کا عقلی تقاضا یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا مگر جیسا اہل باطل کا عام طرز ہے کہ حق پر پردہ ڈالنے اور منکرانے کے لئے صحیح چیز کو غلط عنوان دیا کرتے ہیں، فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں نے بھی لوگوں سے یہی کہا کہ یہ بڑے ماہر جادوگر ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے ملک پر قبضہ کر کے تمہیں نکال دیں تو اب تم بتلاؤ کیا کرنا چاہئے؟

قوم فرعون نے یہ سن کر جواب دیا اَرْجُوْا اَنْحَاكَ وَاَسْرِىْ فِي الْمَدَائِنِ خَشِرَيْنَّ يَا تُؤْتِكُمْ كُلَّ شَيْءٍ عَلَيْهِمْ، اس میں لفظ اَرْجُوْا امر بجاؤ سے مشتق ہے جس کے معنی ڈھیل دینے اور امید دلانے کے آتے ہیں اور مَدَائِن، مَدِيْنَتُہ کی جمع ہے جو ہر بڑے شہر کے لئے بولا جاتا ہے، خَشِرَيْنَّ، خَاشِرُوْا کی جمع ہے جس کے معنی ہیں اٹھانے اور جمع کرنے والا، مراد اس سے سپاہی ہیں جو اطراف ملک سے جادوگروں کو جمع کر کے لائیں۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ قوم کے لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ اگر یہ جادوگر ہے اور جادو کے ذریعہ ہمارا ملک فتح کرنا چاہتا ہے تو اس کا مقابلہ ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں، ہمارے ملک میں بڑے بڑے ماہر جادوگر ہیں اس کو اپنے جادو سے شکست دے دیں گے، کچھ سپاہی ملک کے

اطراف میں بھیج دیجئے جو ہر شہر کے جادوگروں کو بلالائیں۔

وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں جادو، سحر کا رواج عام تھا اور عام لوگوں پر جادوگروں کا اقتدار تھا اور شاید حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضیہ کا معجزہ اسی لئے عطا فرمایا کہ جادوگروں سے مقابلہ ہو اور معجزہ کے مقابلہ میں جادو کی رسوائی سب لوگ آنکھوں سے دیکھ لیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی قدیم عادت بھی یہی ہے کہ ہر زمانہ کے پیغمبر کو اس زمانہ کے مناسب معجزات عطا فرماتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں حکمت یونانی اور طب یونانی اپنے عروج پر تھی تو ان کو معجزہ یہ دیا گیا کہ مادر زاد اندھوں کو بینا بنادیں اور جذامی کو ٹہیوں کو تندرست کر دیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عرب کا سب سے بڑا کمال فصاحت و بلاغت تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن بنایا گیا جس کے مقابلہ سے سارا عرب و عجم عاجز ہو گیا۔

وَجَاءَ السَّحَرَةُ فَوَعَنُونَ قَالُوا إِنَّا لَنَآخِزُكَم بِالْعِلْيَيْنِ، قَالَ نَعَمْ وَمَا نَكُومُ بِهِ مِنَ الْمَقْدَرَيْنِ، یعنی لوگوں کے مشورہ کے مطابق ملک بھر سے جادوگروں کے جمع کرنے کا انتظام کیا گیا، اور یہ جادوگر فرعون کے پاس پہنچ گئے تو انہوں نے فرعون سے پوچھا کہ اگر ہم موسیٰ پر غالب آگئے تو ہمیں اس کی کچھ اجرت اور انعام بھی ملے گا؟ فرعون نے کہا کہ ہاں اجرت بھی ملے گی اور اس پر مزید یہ انعام ہو گا کہ تم سب ہمارے مقربین میں داخل ہو جاؤ گے۔

یہ جادوگر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لئے ملک بھر سے جمع کئے گئے تھے، ان کی تعداد میں تاریخی روایات مختلف ہیں۔ نوسو سے لے کر تین لاکھ تک کی روایات ہیں۔ ان کے ساتھ لاٹھیوں اور رسیوں کا ایک انبار تھا جو تین سو اونٹوں پر لاد کر لایا گیا تھا (طبری) فرعون جادوگروں نے آتے ہی پہلی بات سودا بازی کی شروع کی کہ ہم مقابلہ کریں اور غالب آجائیں تو ہمیں کیا ملے گا۔ وجہ یہ تھی کہ اہل باطل کے سامنے صرف دنیا کے فوائد ہوتے ہیں اس لئے کوئی بھی کام کرنے سے پہلے معاوضہ اور اجرت کا سوال سامنے آتا ہے، بخلاف انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائبین کے کہ وہ ہر قدم پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ

إِنْ أَجِزْتُمْ إِلَّا عَلَىٰ رِبِّ الْعَالَمِينَ، یعنی ہم جو پیغام حق تمہارے فائدہ کے لئے تمہیں پہنچاتے ہیں اس پر تم سے کسی معاوضہ کے طالب نہیں، بلکہ ہمارا معاوضہ صرف رب العالمین نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ فرعون نے ان کو بتلایا کہ تم لوگ اجرت چاہتے ہو، ہم اجرت بھی دیں گے اور اس سے بڑھ کر یہ بھی کہ تمہیں شاہی دربار کا مقرب بنالیں گے۔

فرعون سے یہ گفتگو کرنے کے بعد ساحروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کی

جگہ اور وقت کا تعین کرایا۔ چنانچہ ایک کھلا میدان اور عید کے دن آفتاب بلند ہونے کے بعد کا وقت اس کام کے لئے تجویز ہوا جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات میں ہے، قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمَ الزَّيْتَةِ وَأَنْ يَلْحَقَنَّ النَّاسُ مُصْحًى۔

بعض روایات میں ہے کہ اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساحروں کے سردار سے گفتگو فرمائی کہ اگر میں تم پر غالب آگیا تو کیا تم مجھ پر ایمان لے آؤ گے؟ اُس نے کہا کہ ہمارے پاس ایسے جادو ہیں کہ ان پر کوئی غالب آ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے ہمارے مغلوب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا، اور اگر بالفرض تم غالب آ گئے تو ہم علی الاعلان فرعون کی نظروں کے سامنے تم پر ایمان لے آئیں گے۔ (منظہری و قرطبی)

قَالُوا يٰمُوسٰى اِنَّمَا اَنْتَ نَذِيْقٌ وَاَمَّا اَنْتَ تَكُوْنُ نَحْنُ الْمُلٰقِيْنَ۔ لائق کے معنی ڈالنے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ جب میدان مقابلہ میں پہنچے تو جادو گروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ یا تو آپ پہلے ڈالیں یا ہم پہلے ڈالنے والوں میں سے ہو جائیں۔ جادو گروں کا یہ کہنا اپنی بے فکری اور بڑائی جتانے کے لئے تھا کہ ہمیں اس کی پرواہ نہیں کہ ابتدا ہماری طرف سے ہو، کیونکہ ہم ہر حالت میں اپنے فن پر اطمینان رکھتے ہیں۔ ان کے اندازہ بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ چاہتے تو یہی تھے کہ پہلا وار ان کا ہو مگر اظہار قوت کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا کہ پہل آپ کرتا چاہتے ہو یا ہم کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے منشاء کو محسوس کر کے اپنے معجزہ پر مکمل اطمینان ہونے کے سبب پہلا موقعہ ان کو دے دیا اور فرمایا اَلْقُوا یعنی تم ہی پہلے ڈالو۔

اور ابن کثیر نے فرمایا کہ جادو گروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ادب و احترام کا معاملہ کیا کہ پہلا موقعہ ان کو دینے کی پیش کش کی، اُسی کا یہ اثر تھا کہ ان کو ایمان کی توفیق ہو گئی۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اول تو جادو خود ہی ایک حرام فعل ہے، پھر جب کہ وہ کسی پیغمبر کو شکست دینے کے لئے استعمال کیا جائے تو بلاشبہ کفر ہے، پھر موسیٰ علیہ السلام نے کیسے ان لوگوں کو اس کی اجازت دینے کے لئے فرمایا اَلْقُوا یعنی تم ڈالو۔ لیکن حقیقت حال پر غور کرنے سے یہ سوال ختم ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں تو یقینی تھا کہ یہ لوگ اپنا سحر مقابلہ پر ضرور پیش کریں گے، گفتگو صرف پہلے اور پیچھے کی تھی، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اولوالعزمی کا ثبوت دینے کے لئے ان کو ہی موقعہ عطا فرمایا، اس کے علاوہ اس میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ پہلے جادو گر اپنی لالچیلوں اور رسیوں کے سانپ بنالیں تو پھر عصا

موسیٰ کا معجزہ، صرف یہی نہیں کہ وہ بھی سانپ بن جائے بلکہ اس طرح ظاہر ہو کہ وہ جادو کے سارے سانپوں کو نگل بھی جائے تاکہ جادوگری کی کھلی شکست پہلے ہی قدم پر سامنے آجائے (بیان القرآن)

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد ان کو جادوگری کرنے کی اجازت کے لئے نہیں بلکہ ان کی رسوائی کو واضح کرنے کے لئے تھا کہ اچھا تم ڈال کر دیکھو کہ تمہارے جادو کا کیا انجام ہوتا ہے۔

فَكَمًا أَتَوْا مُتَعَدِّينَ أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْتَبَوْهُمْ وَمَكَدُوا بِسِحْرِ عَظِيمٍ، یعنی جب جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں ڈالیں تو لوگوں کی نظر بندی کر دی اور ان پر ہیبت غالب کر دی اور بڑا جادو دکھلایا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا جادو ایک قسم کی نظر بندی اور تخیل تھی جس سے دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑ رہے ہیں حالانکہ وہ واقع میں اسی طرح لاٹھیاں اور رسیاں ہی تھیں، سانپ نہیں بنے تھے۔ یہ ایک قسم کا مسمریزم تھا جس کا اثر انسانی خیال اور نظر کو مغلوب کر دیتا ہے۔

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سحر صرف اسی قسم میں منحصر ہے سحر کے ذریعہ انقلابِ ماہیت نہیں ہو سکتا، کیونکہ کوئی شرعی یا عقلی دلیل اس کی نفی پر قائم نہیں ہے بلکہ سحر کی مختلف اقسام واقعات سے ثابت ہیں۔ کہیں تو صرف ہاتھ کی چالاکی ہوتی ہے جس کے ذریعہ دیکھنے والوں کو مغالطہ لگ جاتا ہے، کہیں صرف تخیل اور نظر بندی ہوتی ہے جیسے مسمریزم سے۔ اور اگر کہیں قلبِ ماہیت بھی ہو جاتا ہو کہ انسان کا پتھر بن جائے تو یہ بھی کسی شرعی یا عقلی دلیل کے خلاف نہیں۔

وَإِذْ حِثَّنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَلْقِ عَصَاكَ فَلَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ، یعنی ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنا عصا ڈال دو، وہ زمین پر گرتے ہی سب سے بڑا سانپ بن کر ان تمام سانپوں کو نگلنے لگا جو جادوگروں نے جادو سے ظاہر کئے تھے۔

تاریخی روایات میں ہے کہ ہزاروں جادوگروں کی ہزاروں لاٹھیاں اور رسیاں جب سانپ بن کر دوڑنے لگیں تو سارا میدان سانپوں سے بھر گیا اور ایک عجیب ہیبت سارے مجمع پر مسلط ہو گئی تھی، لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی ایک بڑے اژدھہ کی صورت میں سامنے آئی تو ان سب سانپوں کو نگل کر ختم کر دیا۔

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ، یعنی حق ظاہر ہو گیا اور جو کچھ ساجروں نے

بنایا تھا وہ سب باطل اور ہوا ہو گیا۔

فَعَلِبُؤُا هٰذَا لَکَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرٰتِنَ ، یعنی اس موقع پر وہ سب ہار گئے اور خوب رُسوا ہوئے۔

وَالْقٰی السَّحَرٰةُ سٰجِدٰتِنَ ، قَالُوْا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ، رَبِّ مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ، یعنی جادوگر سجدے میں ڈال دیئے گئے اور کہنے لگے کہ ہم رب العالمین یعنی رب موسیٰ و ہارون پر ایمان لے آئے۔

سجدے میں ڈال دیئے گئے فرما کر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر یہ لوگ کچھ ایسے مبہوت اور مجبور ہو گئے کہ بے اختیار سجدہ میں گر گئے۔ اور اس کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرما کر ان کو سجدہ میں ڈال دیا۔ اور ”رب العالمین“ کے ساتھ ”رب موسیٰ و ہارون“ بڑھا کر اپنی بات کو فرعون کے مقابلہ میں واضح کر دیا کیونکہ وہ بے وقوف تو اپنے آپ ہی کو رب العالمین کہتا تھا، اس لئے رب موسیٰ و ہارون کہہ کر اس کو تباہ دیا کہ ہم تیری خدائی کے قائل نہیں رہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُ بِہٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَکُمْ ؕ

بولا فرعون کیا تم ایمان لے آئے اس پر میری اجازت سے پہلے ،

اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مِّکَکُمْ مَّکْرٌ مُّوْہٌ فِی الْمَدِیْنَةِ لِتُخْرِجُوْا

یہ تو مکر ہے جو بنایا تم سب نے اس شہر میں تاکہ نکال دو اس شہر سے

مِنْہَا اٰہْلَہَا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۲۳ لَا قُطْعَۃً اَیْدِیْکُمْ

اس کے رہنے والوں کو، سو اب تم کو معلوم ہو جائے گا میں ضرور کاٹوں گا تمہارے ہاتھ

وَاَرْجُلَکُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَا تُصَلِّیْکُمْ اٰجْمَعِیْنَ ۝۱۲۴

اور دوسری طرف کے پاؤں ، پھر سولی پر چڑھاؤں گا تم سب کو ،

قَالُوْا اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝۱۲۵ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّا اِلَّا

وہ بولے ہم کو تو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہی ہے اور تجھ کو ہم سے یہی دشمنی ہے کہ

اَنْ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَنَا رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلٰیْنَا

مان لیا ہم نے اپنے رب کی نشانیوں کو جب وہ ہم تک پہنچیں اے ہمارے رب ! دکانے کھول دے

صَبْرًا وَتَوَقَّنَا مُسْلِمِينَ ﴿۱۲۷﴾ وَقَالَ الْمَلَأُمِنْ قَوْمِ

ہم پر صبر کے اور ہم کو مار مسلمان ، اور بولے سردار قوم فرعون کے ، کیوں

فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَى وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ

پھوڑتا ہے تو موسیٰ اور اس کی قوم کو کہ دھوم مچائیں ملک میں ،

وَيَذَرُكَ وَالِهَتِكَ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَ

اور موقوف کر دے تجھ کو اور تیرے بتوں کو ، بولا اب ہم مار ڈالیں گے ان کے بیٹوں کو اور

نَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿۱۲۸﴾

زندہ رکھیں گے ان کی عورتوں کو ، اور ہم ان پر زور آور ہیں

خلاصہ تفسیر

فرعون (بڑا گھبرایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری رعایا ہی مسلمان ہو جائے تو ایک مضمون گھر کر ساحروں سے) کہنے لگا کہ ہاں تم موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لائے ہو بدون اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں بیشک (معلوم ہوتا ہے کہ) یہ (جو کچھ جنگ زرگری کے طور پر ہوا ہے) ایک کارروائی تھی جس پر تمہارا عمل درآمد ہوا ہے اس شہر میں (خفیہ سازش ہو گئی ہے کہ تم یوں کرنا ہم یوں کریں گے پھر اس طرح ہار جیت ظاہر کریں گے اور یہ کارروائی ملی بھگت اس لئے کی ہے) تاکہ تم سب (بلکہ) اس شہر سے وہاں کے رہنے والوں کو باہر نکال دو (پھر بفراغ خاطر سب مل کر یہاں ریاست کرو) سو (بہتر ہے) اب تم کو حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے (اور وہ یہ ہے کہ) میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کا ٹوں گا پھر تم سب کو سولی پر ٹانگ دوں گا (تاکہ اوروں کو عبرت ہو) انہوں نے جواب دیا کہ (کچھ پرواہ نہیں) ہم مرکز (کسی برے ٹھکانے تو نہ جائیں گے بلکہ) اپنے ملک ہی کے پاس جائیں گے (جہاں ہر طرح امن و راحت ہے سو ہمارا نقصان ہی کیا ہے) اور تو نے ہم میں کوئی عیب دیکھا ہے (جس پر اس قدر شور و غل ہے) بجز اس کے کہ ہم اپنے رب کے احکام پر ایمان لے آئے (سو یہ کوئی عیب کی بات نہیں پھر اس سے اعراض کر کے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ) اے ہمارے رب! ہمارے اوپر صبر کا فیضان فرما (کہ اگر سختی کئے تو مستقل رہیں) اور ہماری جان حالت اسلام پر نکالنے (کہ اس کی سختی سے پریشان ہو کر کوئی بات ایمان کے خلاف نہ ہو جائے) اور (جب موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ عظیمہ منظر عام پر ظاہر

ہوا اور ساحرین ایمان لے آئے اور بعضے اور لوگ بھی آپ کے تابع ہو گئے اس وقت اقوام فرعون کے سرداروں نے (جو کہ اعیان سلطنت تھے یہ دیکھ کر کہ بعض آدمی مسلمان ہو چلے فرعون سے) کہا کہ کیا آپ موسیٰ (علیہ السلام) کو اور ان کی قوم (تابعین) کو یوں ہی (مخلی بالبطیع و مطلق العنان آزاد) رہنے دیں گے کہ وہ ملک میں فساد کرتے پھریں (فساد یہ کہ اپنا مجمع بڑھائیں جس کے اخیر میں اندیشہ بغاوت ہے) اور وہ (یعنی موسیٰ علیہ السلام) آپ کو اور آپ کے (تجویز کئے ہوئے) معبودوں کو ترک کئے رہیں (یعنی ان کے معبود ہونے کے منکر رہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی قوم بھی ایسا ہی کرے یعنی آپ اس کا انتظام کیجئے) فرعون نے کہا کہ (سردست یہ انتظام مناسب معلوم ہوتا ہے کہ) ہم بھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کرنا شروع کر دیں تاکہ ان کا زور نہ بڑھنے پائے) اور (چونکہ عورتوں کے بڑھنے سے کوئی اندیشہ نہیں نیز ہم کو اپنے کار و خدمت کے لئے بھی ضرورت ہے اس لئے) عورتوں کو زندہ رہنے دیں اور ہم کو ہر طرح کا ان پر زور ہے (اس انتظام میں کوئی دشواری نہ ہوگی)

معارف و مسائل

ان سے پہلی آیات میں مذکور تھا کہ فرعون نے اپنی قوم کے سرداروں کے مشورہ سے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لئے جن ساحروں کو پورے ملک سے جمع کیا تھا وہ میدان مقابلہ میں ہار گئے۔ اور صرف یہی نہیں کہ اپنی ہار مان لی بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔

تاریخی روایات میں ہے کہ جادو گروں کے سردار مسلمان ہو گئے تو ان کو دیکھ کر قوم فرعون کے چھ لاکھ آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور اعلان کر دیا۔

اس مقابلہ اور مناظرہ سے پہلے تو صرف دو حضرات موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون کے مخالف تھے۔ اس وقت سب سے بڑے جادوگر جو قوم میں اقتدار کے مالک تھے اور ان کے ساتھ چھ لاکھ عوام مسلمان ہو کر ایک بہت بڑی طاقت مقابلہ پر آ گئی۔

اس وقت فرعون کی پریشانی اور سراسیمگی بیجانہ تھی مگر اُس نے اس کو چھپا کر ایک چالاک ہوشیار سیاست دان کے انداز میں پہلے تو جادو گروں پر یہ باغیانہ الزام لگایا کہ تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خفیہ سازش کر کے یہ کام اپنے ملک و ملت کو نقصان پہنچانے کے لئے کیا ہے اِنَّ هٰذَا الْمَكْرُ الْمُكْرَّمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ یعنی یہ ایک سازش ہے جو تم نے میدان مقابلہ میں آنے سے پہلے شہر کے اندر آپس میں کر رکھی تھی۔ اور پھر جادو گروں کو خطاب کر کے کہا اَمْنَتُمْ بِہِ

قَبْلَ أَنْ أَذِّنَ لَكُمْ یعنی کیا تم نے میری اجازت سے پہلے ہی ایمان قبول کر لیا۔ یہ استفہام انکاری بطور زجر و تنبیہ کے تھا۔ اور اپنی اجازت سے پہلے ایمان لانے کا ذکر کر کے لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ ہم خود بھی یہی چاہتے تھے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کا حق پر ہونا واضح ہو جائے تو ہم بھی ان کو مانیں اور لوگوں کو بھی اجازت دیں کہ وہ مسلمان ہو جائیں لیکن تم لوگوں نے جلد بازی کی اور حقیقت کو سوچے سمجھے بغیر ایک سازش کے شکار ہو گئے۔

اس چالاکی سے ایک طرف تو لوگوں کے سامنے موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ اور جادوگروں کی تسلیم کو ایک سازش قرار دے کر اُن کو قدیم گمراہی میں مبتلا رکھنے کا انتظام کیا اور دوسری طرف سیاسی چالاکی یہ کی کہ موسیٰ علیہ السلام کا عمل اور جادوگروں کا اسلام جو خالص فرعون کی گمراہی کو کھولنے کے لئے تھا، قوم اور عوام سے اُس کا کوئی تعلق نہ تھا اُس کو ایک ملکی اور سیاسی مسئلہ بنانے کے لئے کہا، لَتُخْرِجُوا مِنْهَا أَهْلَهَا یعنی تم لوگوں نے یہ سازش اس لئے کی ہے کہ تم چاہتے ہو کہ ملک مصر پر تم غالب آ جاؤ اور اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال دو، ان چالاکوں کے بعد ان سب پر اپنی ہیبت اور حکومت کا رعب و خوف جمانے کے لئے جادوگر کو دھمکیاں دینی شروع کیں، اول تو مبہم انداز میں کہا، فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ یعنی تم ابھی دیکھ لو گے کہ تمہاری اس سازش کا کیا انجام ہوتا ہے، اس کے بعد اُس کو واضح کر کے بتلایا، لَا قُطْعَنَ آيِسَ يَكْمُرُ وَأَمْرٌ بِجَدِّكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَا صَلْبَ تَكْمُرُ أَجْمَعِينَ، یعنی میں تم سب کے ہاتھ پر مختلف جانبوں کے کاٹ کر تم سب کو سونی پر چڑھا دوں گا مختلف جانبوں سے کاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ دایاں ہاتھ اور بایاں پر جس سے دونوں جانبیں زخمی اور بد ہیئت اور بیکار ہو جائیں۔

فرعون نے اس بد حالی پر قابو پانے اور اپنے درباریوں اور عوام کو قابو میں رکھنے کی کافی تدبیر کر لی تھی اور اس کی ظالمانہ سزائیں پہلے سے مشہور اور لوگوں کو لرزہ بر اندام کر دینے کے لئے کافی تھیں۔

لیکن اسلام والہ ایمان ایک ایسی زبردست قوت ہے کہ جب وہ کسی دل میں گھر کر لیتی ہے تو پھر انسان ساری دنیا اور اس کے وسائل کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

یہ جادوگر جواب سے چند گھنٹے پہلے فرعون کو اپنا خدا مانتے اور اسی گمراہی کی لوگوں کو تلقین کرتے تھے، چند منٹ میں کلمہ اسلام پڑھتے ہی ان میں کیا چیز پیدا ہو گئی تھی کہ وہ فرعون کی ساری دھمکیوں کے جواب میں کہتے ہیں۔

إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ، یعنی اگر تو ہمیں قتل کر دے گا تو مضائقہ نہیں، ہم اپنے رب کے پاس

چلے جائیں گے، جہاں ہم کو ہر طرح کی راحت ملے گی۔ جادوگر چونکہ فرعون کی سطوت و جبروت سے ناواقف نہ تھے اس لئے یہ نہیں کہا کہ ہم تیرے قابو میں نہیں آئیں گے یا ہم مقابلہ کریں گے بلکہ اس کی دھمکی کو صحیح مان کر یہ جواب دیا کہ یہ مانا کہ تو ہمیں ہر قسم کی سزا دینے پر دنیا میں قادر ہے مگر ہم دنیا کی زندگی ہی کو ایمان لانے کے بعد کوئی چیز نہیں سمجھتے، دنیا سے گزر جائیں گے تو اس زندگی سے بہتر زندگی ملے گی اور اپنے رب کی ملاقات نصیب ہوگی۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اس زندگی میں جو تیرا دل چاہے کر لے، آخر کار ہم اور تم سب رب العالمین کے سامنے پیش ہوں گے اور وہ ظالم سے مظلوم کا انتقام لیں گے اس وقت اپنے اس عمل کا نتیجہ تیرے سامنے آجائے گا۔ چنانچہ ایک دوسری آیت میں اس موقع پر ان جادوگروں کے یہ الفاظ منقول ہیں،

فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا، یعنی جو تیرا جی چاہے ہمارے بارے میں حکم دے دے، بس اتنا ہی تو ہے کہ تیرا حکم ہماری اس دنیوی زندگی پر چل سکتا ہے اور تیرے غصہ کے نتیجے میں وہ زندگی ختم ہو سکتی ہے مگر ایمان لانے کے بعد ہماری نظر میں اس دنیوی زندگی کی وہ اہمیت ہی باقی نہیں رہی جو ایمان لانے سے پہلے تھی کیونکہ ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہ زندگی راحت یا کلفت کے ساتھ گزر ہی جائے گی، فکر اس زندگی کی کرنا چاہئے جس کے بعد موت نہیں اور جس کی راحت بھی دائمی ہے اور کلفت بھی۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ لوگ جو کل تک بدترین کفر میں مبتلا تھے کہ فرعون جیسے بیہودہ انسان کو خدا مانتے تھے، خدا تعالیٰ کی شان و عظمت سے بالکل نا آشنا تھے، ان میں بیکبارگی ایسا انقلاب کیسے آگیا کہ اب پچھلے سب عقائد و اعمال سے یکسر تائب ہو کر دین حق پر اتنے پختہ ہو گئے کہ اس کے لئے جان تک دینے کو تیار نظر آتے ہیں، اور دنیا سے رخصت ہونے کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس چلے جائیں۔

اور صرف یہی نہیں کہ ایمان کی قوت اور جہاد فی سبیل اللہ کی ہمت ان میں پیدا ہو گئی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی علم و معرفت کے دروازے ان پر کھل گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ فرعون کے مقابلہ میں اس جرأت مندانہ بیان کے ساتھ یہ دعا بھی کرنے لگے۔

رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الدُّنْيَا صَبْرًا ۖ وَأُتَوَفَّتْ مُسْلِمِينَ

یعنی اے ہمارے پروردگار ہمیں کامل صبر عطا فرما اور مسلمان ہونے کی حالت میں ہمیں وفات دے۔

اس میں اشارہ اس معرفت کی طرف ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو انسان کا عزم و ہمت کچھ کام نہیں آتا، اس لئے اسی سے ثابت قدمی کی دعا کی گئی۔ اور یہ دعا جیسے معرفت حق کا

ثمرہ اور نتیجہ ہے اسی طرح اس مشکل کے حل کا بہترین ذریعہ بھی ہے جس میں یہ لوگ اس وقت مبتلا تھے، کیونکہ صبر اور ثبات قدمی ہی وہ چیز ہے جو انسان کو اپنے حریف کے مقابلہ میں کامیاب کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

یورپ کی پچھلی جنگ عظیم کے اسباب و نتائج پر غور کرنے والے کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ مسلمان جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں، یہی وہ قوم ہے جو میدان جنگ میں سب سے زیادہ بہادر اور مصیبت و مشقت پر صبر کرنے میں سب سے آگے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس وقت جرمنی اقوام میں فنون حرب کے ماہرین اس کی تائید کرتے تھے کہ فوج میں دینداری اور خوفِ آخرت پیدا کرنے کی سعی کی جائے کیونکہ اس سے جو قوت حاصل ہوتی ہے وہ کسی دوسری چیز سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ (تفسیر المنار)

افسوس ہے کہ آج مسلمان اور مسلم حکومتیں اپنے آپ کو قوی بنانے کے لئے ساری ہی تدبیریں اختیار کر رہے ہیں مگر اس گروہ کو بھول بیٹھے ہیں جو قوت اور وحدت کی روح ہے۔ فرعونی

ساحروں میں ایمانی انقلاب
موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ بھلا
وید بیضاء سے بھی بڑا تھا۔

جادو گروں نے بھی اول مرحلہ میں اس کو سمجھ لیا تھا، اور عمر بھر کے خدا ناشناس منکر کافروں کو دم بھرنے نہ فقط مسلمان بلکہ ایک عارف کابل اور مجاہد و غازی بنادینے کا یہ معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ عصا اور ید بیضاء سے کچھ کم نہ تھا۔

فرعون پر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی ہیبت کا اثر۔
فرعون کی چالاکی اور سیاسی جھوٹ نے اس کی جاہل قوم کو اس کے ساتھ قدیم گمراہی میں مبتلا رہنے کا کچھ سامان تو کر دیا مگر یہ اُسجوبہ ان کے لئے بھی ناقابل فہم تھا کہ فرعون کے غصہ کا سارا زور جادو گروں

پر ختم ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام جو اصل مخالف تھے ان کے بارے میں فرعون کی زبان سے کچھ نہ نکلا، اس پر ان کو کہنا پڑا۔

أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ، یعنی کیا آپ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دیں گے کہ وہ آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ کر ہمارے ملک میں فساد کرتے پھریں۔

اس پر مجبور ہو کر فرعون نے کہا، سَنَقَاتِلُ أَبْنَاءَهُ هُمُ الَّذِينَ تَسْتَعِينُ ۖ نُسَاءَهُمْ هُنَّ أُمَّاتُكُمْ وَأَشْقَاتُكُمْ هُنَّ لَكُمْ رَحْمَةٌ ۖ وَيَهْتَدُنَّ إِلَى الْكُفْرَانِ، یعنی ان کا معاملہ ہمارے لئے کچھ قابل فکر نہیں، ہم ان کے لئے یہ کام کریں گے کہ ان میں بولٹ کا پیدا ہوگا اس کو قتل کر دیں گے صرف لڑکیوں کو رہنے دیں گے، جس کا نتیجہ کچھ عرصہ میں یہ ہو جائے گا کہ ان کی قوم مردوں سے خالی ہو کر صرف عورتیں رہ جائیں

گی جو ہماری خدمت گار باندیاں بنیں گی۔ اور ہم تو ان سب پر پوری قدرت رکھتے ہیں جو چاہیں کریں یہ ہمارا کچھ نہیں بنا سکتے۔

علماء مفسرین نے فرمایا کہ قوم کے اس طرح بھنجوڑنے پر بھی فرعون نے یہ تو کہا کہ ہم بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے، لیکن حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے بارے میں اس وقت بھی اس کی زبان پر کوئی بات نہ آئی۔ وجہ یہ ہے کہ اس معجزہ اور واقعہ نے فرعون کے قلب و دماغ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سخت ہدیت بٹھلا دی تھی۔

حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ فرعون کا یہ حال ہو گیا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو دیکھتا تو پیشاب خطا ہو جاتا تھا، اور یہ بالکل صحیح ہے، ہدیت حق کا یہی حال ہوتا ہے۔

ہدیت حق است این از خلق نیست

اور مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید ترسدا ز دے جن و انس و ہر کہ دید

یعنی جو اللہ سے ڈرتا ہے ساری مخلوق اس سے ڈرنے لگتی ہے۔

اس جگہ قوم فرعون نے جو یہ کہا کہ موسیٰ علیہ السلام آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ کر فساد کرتے پھریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرعون اگرچہ اپنی قوم کے سامنے خود خدائی کا دعویدار تھا اور اَنَا رَبُّكُمْ اَدْعٰی کہتا تھا، لیکن خود بتوں کی پوجا پاٹ بھی کیا کرتا تھا۔

اور بنی اسرائیل کو کمزور کرنے کے لئے یہ ظالمانہ قانون کہ جو لڑکا پیدا ہو اسے قتل کر دیا جائے یہ اب دوسری مرتبہ نافذ کیا گیا، اس کا پہلا نمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہو چکا تھا، جس کے ناکام ہونے کا مشاہدہ یہ اس وقت تک کر رہا تھا، مگر جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو رسوا کرنا چاہتے ہیں اس کی تدبیریں ایسی ہی ہو جایا کرتی ہیں جو انجام کار ان کے لئے تباہی کا سامان کر دیتی ہیں، چنانچہ آگے معلوم ہوگا کہ فرعون کا یہ ظلم و جور آخر کار اُس کو اور اس کی قوم کو لے ڈوبا۔

قَالَ مُوسٰی لِقَوْمِهٖ اسْتَعِیْذُوا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ

موسیٰ نے کہا اپنی قوم سے مدد مانگو اللہ سے اور صبر کرو، بیشک

الْاَرْضُ لِلّٰهِ تَعٰلٰی یَوْمَیْنِهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ

زمین ہے اللہ کی، اس کا وارث کر دے جس کو وہ چاہے اپنے بندوں میں، اور

الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۱۳۸﴾ قَالُوا أَوْزَيْنَا مِنْ قَبْلُ أَنْ تَأْتِيَنَا

آخر میں بھلائی ہے ڈرنے والوں کے لئے ، وہ بولے ہم پر تکلیفیں رہیں تیرے آنے سے پہلے ،

وَمِنْ أَعْدٍ مَا جِئْتَنَا قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ

اور تیرے آنے کے بعد ، کہا نزدیک ہے کہ تمہارا رب ہلاک کر دے

عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ

تمہارے دشمن کو اور خلیفہ کر دے تم کو ملک میں ، پھر دیکھے تم کیسے

تَعْمَلُونَ ﴿۱۳۹﴾ وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَ

کام کرتے ہو ، اور ہم نے فیکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں اور

نَقْصٍ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذْكُرُونَ ﴿۱۴۰﴾ فَإِذَا

میوؤں کے نقصان میں تاکہ وہ نصیحت مانیں ، پھر جب

جَاءَتْهُمْ الْحَسَنَةُ قَالُوا النَّاهِذَةُ وَإِنْ تُصِيبَهُمْ سَيِّئَةٌ

پہنچی ان کو بھلائی کہنے لگے یہ ہے ہمارے لائق ، اور اگر پہنچی برائی

يَظُنُّوْا بِمُوسَىٰ وَمَنْ مَّعَهُ إِلَّا إِنَّمَا طَائِرُهُمْ عِنْدَ

تو نحوست بتلاتے موسیٰ کی اور اس کے ساتھ والوں کی ، سن لو ان کی شومی تو اللہ

اللَّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۴۱﴾ قَالُوا مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ

کے پاس ہے پر اکثر لوگ نہیں جانتے ، اور کہنے لگے جو کچھ تو لائے گا

مِنْ آيَةٍ لِّتَسْحَرَنَّا بِهَا فَمَا نَخْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿۱۴۲﴾

ہمارے پاس نشانی کہ ہم پر اس کی وجہ سے جادو کرے ، سو ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائیں گے ۔

خلاصہ تفسیر

اس مجلس کی گفتگو کی خبر جو بنی اسرائیل کو پہنچی

تو بڑے گھبرائے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چارہ جوئی کی تو موسیٰ (علیہ السلام) نے

اپنی قوم سے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کا سہارا رکھو اور مستقل رہو (گھبراؤ مت) یہ زمین اللہ کی ہے

جس کو چاہیں مالک (اور حاکم) بنائیں اپنے بندوں میں سے (سو چند روز کے لئے فرعون کو

دے دی ہے) اور اخیر کامیابی ان ہی کو ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں (سو تم ایمان و تقویٰ پر قائم رہو، انشاء اللہ تعالیٰ یہ سلطنت تم ہی کو مل جائے گی، تھوڑے دنوں انتظار کی ضرورت ہے) قوم کے لوگ (غایت حسرت و حزن سے جس کا طبعی اقتضا، تکرار شکوہ ہے) کہنے لگے کہ (حضرت) ہم تو ہمیشہ مصیبت ہی میں رہے آپ کی تشریف آوری کے قبل بھی (کہ فرعون بیگار لیتا تھا اور مدتوں ہمارے لڑکوں کو قتل کرتا رہا) اور آپ کی تشریف آوری کے بعد بھی (کہ طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی جا رہی ہیں یہاں تک کہ اب پھر قتل اولاد کی تجویز پھری ہے) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا (گھبراؤ مت) بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دیں گے اور بجائے ان کے تم کو اس زمین کا حاکم بنادیں گے پھر تمہارا طرزِ عمل دیکھیں گے (کہ شکر و قدر و طاعت کرتے ہو یا بے قدری اور غفلت و معصیت، اس میں ترغیب ہے طاعت کی اور تحذیر ہے معصیت سے) اور (جب فرعون اور اس کے تابعین نے انکار و مخالفت پر کمر باندھی تو) ہم نے فرعون والوں کو (مع فرعون کے حسبِ عادت مذکورہ رکوع اول پارہ ہذا، ان بلیات میں) مبتلا کیا (۱)، قحط سالی میں اور (۲) پھلوں کی کم پیداواری میں تاکہ وہ (حق بات کو) سمجھ جائیں (اور سمجھ کر قبول کر لیں) سو (وہ پھر بھی نہ سمجھے بلکہ یہ کیفیت تھی کہ) جب ان پر خوشحالی (یعنی ارزانی و پیداواری) آجاتی تو کہتے کہ یہ تو ہمارے لئے ہوتا ہی چاہئے (یعنی ہم مبارک طالع ہیں یہ ہماری خوش بختی کا اثر ہے، یہ نہ تھا کہ اس کو خدا کی نعمت سمجھ کر شکر بجالاتے اور اطاعت اختیار کرتے) اور اگر ان کو کوئی بدحالی (جیسے قحط و کم پیداواری مذکور) پیش آتی تو موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے (کہ یہ ان کی نحوست سے ہوا، یہ نہ ہوا کہ اس کو اپنے اعمال بد کفر و تکذیب کی شامت اور سزا سمجھ کر تائب ہو جاتے حالانکہ یہ سب ان کی شامتِ اعمال تھی، جیسا کہ فرماتے ہیں کہ) یاد رکھو کہ ان کی (اس) نحوست (کا سبب) اللہ کے علم میں ہے (یعنی ان کے اعمال کفریہ تو اللہ کو معلوم ہیں یہ نحوست انہی اعمال کی سزا ہے) لیکن (انہی بے تمیزی سے) ان میں اکثر لوگ (اس کو) نہیں جانتے تھے اور (بلکہ اوپر سے) یوں کہتے (کہ خواہ) کیسی ہی عجیب بات ہمارے سامنے لاؤ کہ اس کے ذریعہ سے ہم پر جا دو چلاؤ جب بھی ہم تمہاری بات ہرگز نہ مانیں گے۔

معارف و مسائل

فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں شکست کھانے کے بعد بنی اسرائیل پر اس طرح غصہ اتارا کہ ان کے لڑکوں کو قتل کر کے صرف عورتوں کو باقی رکھنے کا قانون بنادیا تو بنی اسرائیل

گھبراتے کہ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے جو عذاب فرعون نے ان پر ڈالا تھا وہ پھر آگیا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس کو محسوس فرمایا تو پیغمبرانہ شفقت اور حکمت کے مطابق اس بلاء سے نجات حاصل کرنے کے لئے ان کو دو چیزوں کی تلقین فرمائی، ایک دشمن کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا۔ دوسرے کثرتِ کار تک صبر و ہمت سے کام لینا۔ اور یہ بھی بتلادیا کہ اس نسخہ کا استعمال کرو گے تو یہ ملک تمہارا ہے تمہیں غالب آؤ گے۔ یہی مضمون ہے پہلی آیت کا جس میں فرمایا ہے، اَسْتَعِیْزُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا یعنی اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر کرو۔ اور پھر فرمایا اِنَّ الْاٰمِرَہٗنَّ لِلّٰہِ یُوْذِرُہُنَّ مِّنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَالْعَاقِبَۃُ لِلّٰہِ یُتَّقِیْنَ، یعنی ساری زمین اللہ کی ہے وہ جس کو چاہے اس کو اس زمین کا وارث و مالک بنائے گا۔ اور یہ بات متعین ہے کہ انجام کار کامیابی متقی پر ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اگر تم نے تقویٰ اختیار کیا جس کا طریقہ اوپر مذکور ہوا ہے کہ استعانت باللہ اور صبر کا التزام کیا جائے تو انجام کار تم ہی ملک مصر کے مالک و قابض ہو گے۔

مشکلات و مصائب سے نجات کا نسخہ اکبر

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جو حکیمانہ نسخہ دشمن پر غالب آنے کے لئے تلقین فرمایا تھا، غور کیا جائے تو یہی وہ نسخہ اکبر ہے جو کبھی خطا نہیں ہوتا، جس کے بعد کامیابی یقینی ہوتی ہے، اس نسخہ کا پہلا جز استعانت باللہ ہے، جو اصل رُوح ہے اس نسخہ کی۔ وجہ یہ ہے کہ خالق کائنات جس کی مدد پر ہو تو ساری کائنات کا رخ اس کی مدد کی طرف پھر جاتا ہے، کیونکہ ساری کائنات اُس کے تابع و فرمان ہے۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے اسباب خود بخود مہیا ہوتے چلے جاتے ہیں اس لئے دشمن کے مقابلہ میں کوئی بڑی سے بڑی قوت انسان کے لئے اتنی کارآمد نہیں ہو سکتی جتنی اللہ تعالیٰ سے امداد کی طلب، بشرطیکہ طلب صادق ہو، محض زبان سے کچھ کلمات بولنا نہ ہو۔

دوسرا جز اس نسخہ کا صبر ہے۔ صبر کے معنی اصل لغت کے اعتبار سے خلافت طبع چیزوں پر ثابت قدم رہنے اور نفس کو قابو میں رکھنے کے ہیں۔ کسی مصیبت پر صبر کرنے کو بھی اسی لئے صبر کہا جاتا ہے کہ اُس میں رونے پیٹنے اور واویلا کرنے کے طبعی جذبہ کو دبایا جاتا ہے۔ ہر تجربہ کار عقلمند جانتا ہے کہ دنیا میں ہر بڑے مقصد کے لئے بہت سی خلافت طبع محنت و مشقت برداشت کرنا لازمی ہے، جس شخص کو محنت و مشقت کی عادت اور خلاف طبع

چیزوں کی برداشت حاصل ہو جائے وہ اکثر مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ حدیث میں رسولِ کرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صبر ایسی نعمت ہے کہ اس سے زیادہ وسیع تر نعمت کسی کو نہیں ملی (ابوداؤد)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس حکیمانہ نصیحت اور اس پر مرتب ہونے والی فتح و نصرت کا اجمالی وعدہ کجروی کی خوگر بنی اسرائیل کی سمجھ میں کیا آتا، یہ سب کچھ سن کر بول اُٹھے اُوذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیْنَا وَ مِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا، یعنی آپ کے آنے سے پہلے بھی ہمیں ایندلس دی گئیں اور آپ کے آنے کے بعد بھی۔

مطلب یہ تھا کہ آپ کے آنے سے پہلے تو اس امید پر وقت گزارا جاسکتا تھا کہ کوئی پیغمبر ہماری گلو خلاصی کے لئے آئے گا، اب آپ کے آنے کے بعد بھی یہی ایندلس کا سلسلہ رہا تو ہم کیا کریں گے۔

اس لئے پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حقیقت امر کو واضح کرنے کے لئے فرمایا، عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَذُوْكُمْ وَ یَسْتَخْلِفَ کُمْ فِی الْاَرْضِ، یعنی یہ بات دور نہیں کہ اگر تم نے ہماری نصیحت کو مانا تو بہت جلد تمہارا دشمن ہلاک و برباد ہوگا اور ملک پر تم کو قبضہ و اقتدار ملے گا مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا، فَاَیَنْتَظِرُ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ۔ جس میں بتلادیا کہ اس دنیا میں کسی زمین کی حکومت و سلطنت خود کوئی مقصد نہیں بلکہ زمین میں عدل و انصاف قائم کرنے اور اللہ تعالیٰ کی بتلانی ہوئی نیکی کو پھیلانے اور بدی کو روکنے کے لئے کسی انسان کو کسی ملک کی حکومت دی جاتی ہے، اس لئے جب تم کو ملک مصر پر اقتدار حاصل ہو تو ہوشیار رہو، ایسا نہ ہو کہ تم بھی حکومت و اقتدار کے نشہ میں اپنے سے پہلے لوگوں کے انجام کو بھلا بیٹھو۔

اس آیت میں خطاب اگرچہ خاص بنی اسرائیل کو ہے لیکن اللہ جل شانہ نے ہر حکمران طبقہ کو اس میں یہ تنبیہ فرمادی ہے کہ درحقیقت حکومت و سلطنت اللہ تعالیٰ کا حق ہے، انسان کو بحیثیت خلیفہ کے وہی حکومت دیتا ہے اور

حکومت و سلطنت
حکمران طبقہ کا
امتحان ہے۔

جب چاہتا ہے پھین لیتا ہے، تَوُوْثِی الْاَمْلٰکَ مِنْ تَشَاوَدٍ وَ تَنْزِعُ الْاَمْلٰکَ مِنْ مَنْ تَشَاوَدُ، کا یہی مطلب ہے۔ نیز یہ کہ جس کو کسی زمین پر حکومت عطا کی جاتی ہے وہ درحقیقت حکمران فرد یا حکمران جماعت کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ مقصد حکومت یعنی قیام عدل و انصاف اور اقامت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو کس حد تک پورا کرتا ہے۔

تفسیر بحر محیط میں اس جگہ نقل کیا ہے کہ بنی عباس کے دوسرے خلیفہ منصور کے پاس خلافت ملنے سے پہلے ایک روز عمرو بن عبیدہ پہنچے تو یہ آیت پڑھی، عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ

عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفُكُمْ فِي الْأَمْصَالِ، جس میں ان کے لئے خلافت ملنے کی بشارت تھی، اتفاقاً اس کے بعد منصور خلیفہ بن گئے اور پھر عمرو بن عبید ان کے یہاں پہنچے تو منصور نے اُن کی پیشین گوئی جو آیت مذکورہ کے تحت اس سے پہلے فرمائی تھی یا د ولای تو عمرو بن عبید نے خوب جواب دیا کہ ہاں خلیفہ ہونے کی پیشین گوئی تو پوری ہو گئی مگر ایک چیز باقی ہے معنی قَتِیْنُظَرُ کَیْفَ تَعْمَلُونَ، مطلب یہ تھا کہ ملک کا خلیفہ و امیر بن جانا کوئی فخر و مسرت کی چیز نہیں کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خلافت و حکومت میں اس کا رویہ کیا اور کیسا رہا، اب اس کے دیکھنے کا وقت ہے۔

اس کے بعد آیت مذکورہ کے وعدہ کا ایفاء اور قوم فرعون کا طرح طرح کے عذابوں میں گرفتار ہونا اور بالآخر غرق دریا ہو کر ختم ہو جانا کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے، جس میں سب سے پہلا عذاب قحط اور اشیاء کی کمیابی اور گرانی کا تھا جو قوم فرعون پر مسلط ہوا۔ تفسیری روایات میں ہے کہ یہ قحط ان پر سات سال مسلسل رہا، اور آیت میں جو اس قحط کے بیان میں دو لفظ آئے ہیں، ایک سِنِیْن، دوسرے نقص ثمرات۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور قتادہؓ وغیرہ نے فرمایا کہ قحط اور خشک سالی کا عذاب تو گاؤں والوں کے لئے تھا اور پھلوں کی کمی شہر والوں کے لئے، کیونکہ عموماً دیہات میں غلہ کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے اور شہروں میں پھلوں کے باغات ہوتے ہیں تو اشارہ اس طرف ہوا کہ نہ غلہ کے کھیت باقی رہے نہ پھلوں کے باغات۔ لیکن جب کسی قوم پر اللہ تعالیٰ کا قہر ہوتا ہے تو صحیح بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، قوم فرعون بھی اسی قہر میں مبتلا تھی، عذاب کے اس ابتلائی جھٹکے سے بھی ان کو کوئی تنبیہ نہ ہوئی بلکہ اس کو اور ہر آنے والی مصیبت کو یہ کہنے لگے کہ یہ نحوست حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی ہے، فَاِذَا جَاءَهُمْ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَئِنْ هَذِهِ إِلَّا تَنْصِبُكُمْ سَيِّئَةٌ يَّظُنُّوْنَ اِنَّهُمْ مُّوسٰی وَ مَنْ مَّعَهُ، یعنی جب ان لوگوں کو کوئی بھلائی اور راحت و آرام ملتا تو یہ کہتے تھے کہ یہ ہمارا حق ہے ہمیں ملنا ہی چاہئے، اور جب کوئی مصیبت اور برائی پیش آتی تو کہتے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کے اثر سے ہے، حق تعالیٰ نے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا اَلَا اِنَّهَا ظِلُّهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

لفظ ظایر کے لغوی معنی پرندے جانور کے ہیں۔ عرب پرندہ جانوروں کے دہنی بائیں جانب اترنے سے اچھی بری فالیں لیا کرتے تھے، اس لئے مطلقاً قال کو بھی "ظایر" کہنے لگے، اس آیت میں ظایر کے یہی معنی ہیں۔ اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ ان کی فال اچھی یا بری جو کچھ بھی ہو وہ سب اللہ تعالیٰ کے پاس ہے جو کچھ اس عالم میں ظاہر ہوتا ہے سب اللہ تعالیٰ کی قدرت

و مشیت سے عمل میں آتا ہے، نہ اس میں کسی کی نحوست کا دخل ہے نہ برکت کا، یہ سب ان کی خام خیالی اور جہالت ہے جو پرندوں کے داہنے یا بائیں اڑ جانے سے اچھی بُری فالیں لے کر اپنے مقاصد اور عمل کی بنیاد اس پر رکھتے ہیں۔

اور بالآخر قوم فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تمام معجزات کو سحر کہہ کر نظر انداز کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ مَہِمَّاتِ اِتِّتَا بِہِ مِنْ اٰیَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِہَا فَمَا نَحْنُ لَکَ یٰمُؤْمِنِیْنَ، یعنی آپ کتنی ہی علامتیں اپنی نبوت کی پیش کر کے ہم پر اپنا جادو چلانا چاہیں تو سن لیجئے ہم کبھی آپ پر ایمان لانے والے نہیں۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْہِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ

پھر ہم نے بھیجا ان پر طوفان اور ٹنڈی اور چچڑی اور ینڈک

وَالدَّمَ اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ ﴿۱۳۶﴾

اور خون بہت سی نشانیاں جدی جدی، پھر بھی تکبر کرتے رہے اور تھے وہ لوگ گنہگار،

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَیْہِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا یٰمُوسٰی اَدْعُ کُنَّا مَرَبِّکَ بِہَا

اور جب پڑتا ان پر کوئی عذاب تو کہتے اے موسیٰ دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب جیسا کہ

عٰہِدَ عِنْدَکَ لَیِّنٌ کَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَ بِکَ لَکَ

اس نے بتا رکھا ہے تجھ کو اگر تو نے دور کر دیا ہم سے یہ عذاب تو بیشک ہم ایمان لے آئیں گے تجھ پر

وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِیَّۤیْسُرَ اٰیٰتٍ ۚ فَلَمَّا کَشَفْنَا عَنْہُمْ

اور جانے دیں گے تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو پھر جب ہم نے اٹھایا ان سے

الرِّجْزَ اِلٰی اَجَلٍ ۙ ہُمْ بِالْغُوۡۃِ اِذَا ہُمْ یَنْکُثُوۡنَ ﴿۱۳۷﴾

عذاب ایک مدت تک کہ ان کو اس مدت تک پہنچنا تھا اسی وقت عہد توڑ ڈالتے،

فَاَنْتَقَمْنَا مِنْہُمْ فَاَعْرَقْنٰہُمْ فِی الْیَمِّ بِاَہْمُ کَذَّبُوۡا

پھر ہم نے بدلہ لیا ان سے سو ڈبو دیا ہم نے ان کو دریا میں اس وجہ سے کہ انہوں نے جھٹلایا

بِاٰیٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْہَا غٰفِلِیْنَ ﴿۱۳۸﴾

ہماری آیتوں کو اور ان سے متعافل کرتے تھے

خلاصہ تفسیر

(جب ایسی سرکشی اختیار کی تو) پھر ہم نے ان دو بلاؤں کے علاوہ یہ بلائیں مسلط کیں کہ (۱۳) ان پر اکثر بارش کا (طوفان بھیجا) جس سے مال و جان تلف ہونے کا اندیشہ ہو گیا، اور (اس سے گھبرائے تو موسیٰ علیہ السلام سے عہد و پیمان کیا کہ ہم سے یہ بلا دور کرائیے تو ہم ایمان لائیں اور جو آپ کہیں اطاعت کریں پھر جب وہ بلا دور ہوئی اور دل خواہ غلہ وغیرہ نکلا پھر بے فکر ہو گئے کہ اب تو جان بھی بچ گئی مال بھی خوب ہو گا اور بدستور اپنے کفر و طغیان پر اڑے رہے تو ہم نے ان کے کھیتوں پر (۱۴) مٹدیاں (مسلط کیں) اور (جب پھر کھیتوں کو تباہ ہوتے دیکھا تو گھبرا کر پھر ویسے ہی عہد و پیمان کئے اور پھر جب آپ کی دعا سے وہ بلا دور ہوئی اور غلہ وغیرہ تیار کر کے اپنے گھر لے آئے پھر بے فکر ہو گئے کہ اب تو غلہ قابو میں آگیا اور بدستور اپنے کفر و مخالفت پر جے رہے تو ہم نے اس غلہ میں (۱۵) گھن کا کیرا (پیدا کر دیا) اور (جب گھبرا کر پھر اسی طرح عہد و پیمان کر کے دعا کرائی اور وہ بلا بھی دور ہوئی اور اس سے مطمئن ہو گئے کہ اب پیس کوٹ کر کھائیں پیس گے، پھر وہی کفر اور وہی مخالفت، تو اس وقت ہم نے ان کے کھانے کو یوں بے لطف کر دیا کہ ان پر (۱۶) مینڈک (مجموع کر کے ان کے کھانے کے برتنوں میں ہنڈیوں میں گرنا شروع ہوئے جس سے سب کھانا غارت ہوا اور ویسے بھی گھر میں بیٹھنا مشکل کر دیا اور پیتائیوں بے لطف کر دیا کہ (۱۷) ان کا پانی) خون (ہو جاتا، منہ میں لیا اور خون بنا، عرض ان پر یہ بلائیں مسلط ہوئیں) کہ یہ سب (موسیٰ علیہ السلام کے) کھلے کھلے معجزے تھے (کہ ان کی تکذیب و مخالفت پر ان کا ظہور ہوا اور یہ ساتوں عصا اور ید بیضا، بلا کر آیات تسعہ کہلاتے ہیں) سو چاہتے تھے کہ ان معجزات و آیات قہر کو دیکھ کر ڈھیلے پڑ جاتے مگر وہ (پھر بھی) تکبر (ہی) کرتے رہے اور وہ لوگ کچھ تھے ہی جرائم پیشہ (کہ اتنی سختی پر بھی باز نہ آتے تھے) اور جب ان پر کوئی عذاب (مذکورہ بلاؤں میں سے) واقع ہوتا تو یوں کہتے، اے موسیٰ! ہمارے لئے اپنے رب سے اس بات کی دعا کر دیجئے جس کا آپ نے آپ سے عہد کر رکھا ہے (وہ بات قہر کا دور کر دینا ہے ہمارے باز آجانے پر، سو ہم اب وعدہ کرتے ہیں کہ) اگر آپ اس عذاب کو ہم سے ہٹا دیں (یعنی دعا کر کے ہٹا دیں) تو ہم ضرور ضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور ہم بنی اسرائیل کو بھی رہا کر کے آپ کے ہمراہ کر دیں گے پھر جب (برکت دعائے موسیٰ علیہ السلام) ان سے اس عذاب کو ایک خاص وقت تک کہ ان کو پہنچنا تھا ہٹا دیتے تو وہ فوراً ہی عہد شکنی کرنے لگتے (جیسا اوپر بیان ہوا) پھر (جب ہر طرح دیکھ لیا کہ وہ اپنی شرارت سے باز ہی نہیں آتے تب اس وقت) ہم نے ان سے (پورا) بدلہ لیا یعنی ان کو

دریا میں غرق کر دیا (جیسا دوسری جگہ ہے) اس سبب سے کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل ہی بے توجہی کرتے تھے (اور تکذیب و غفلت بھی ایسی ویسی نہیں بلکہ اصرار و عناد کے ساتھ کہ اطاعت کا وعدہ کر لیں اور توڑ دیں)۔

مَعَارِف وَمَسَائِل

آیات متذکرہ میں قوم فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا باقی قصہ مذکور ہے کہ فرعون کے جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ہار گئے اور ایمان لائے، مگر قوم فرعون اسی طرح اپنی سرکشی اور کفر پر جمی رہی۔

اس واقعہ کے بعد تاریخی روایات کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام بیسٹ سال مصر میں مقیم رہ کر ان لوگوں کو اللہ کا پیغام سناتے اور حق کی طرف دعوت دیتے رہے، اور اس عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نو معجزات عطا فرمائے، جن کے ذریعہ قوم فرعون کو متنبہ کر کے راستہ پر لانا مقصود تھا، قرآن کریم میں وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ میں انہی نو معجزات کا بیان ہے۔

ان نو معجزات میں سے سب سے پہلے دو معجزے، عصا اور ید بیضا، کا ظہور فرعون کے دربار میں ہوا اور انہی دو معجزوں کے ذریعہ جادوگروں کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام نے فتح حاصل کی، اس کے بعد ایک معجزہ وہ تھا جس کا ذکر اس سے پہلی آیات میں آچکا ہے کہ قوم فرعون پر ان کی خدا اور کجروی کے سبب قحط مسلط کر دیا گیا، ان کی زمینوں اور یاغوں میں پیداوار بہت گھٹ گئی جس سے یہ سخت پریشان ہوئے اور بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قحط رفع ہونے کے لئے دعا کرائی، مگر جب قحط رفع ہو گیا تو پھر اپنی سرکشی میں مبتلا ہو گئے اور لگے یہ کہنے کہ یہ قحط تو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کے سبب ہوا تھا، اب جو قحط رفع ہوا یہ ہمارے حال کا تقاضا ہے، باقی چھ آیات و معجزات کا بیان مذکورہ آیتوں میں ہے :

فَاَمْرٌ سَكَنَّا عَلَيْهِمُ الظُّلُوفَانِ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ، یعنی پھر ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیاں اور گھسن کا کیرا اور مینڈک اور خون۔

اس میں قوم فرعون پر مسلط ہونے والے پانچ قسم کے عذابوں کا ذکر ہے اور ان کو اس آیت میں آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ فرمایا ہے جس کے معنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق یہ ہیں کہ ان میں سے ہر عذاب ایک معین وقت تک رہا پھر موقوف ہو گیا، اور کچھ مہلت دی گئی اس کے بعد دوسرا اور تیسرا عذاب، اسی طرح الگ الگ ہو کر ان پر آیا، اسی کو ترجمہ شیخ الحدادؒ میں خستیا رکھا گیا ہے۔

ابن منذر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ان میں سے ہر عذاب قوم فرعون پر سات روز تک مسلط رہتا تھا، ہفتہ کے دن شروع ہو کر دوسرے ہفتہ کے دن رفع ہو جاتا اور پھر تین ہفتے کی مہلت ان کو دی جاتی تھی۔

امام بغوی نے بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ جب پہلی مرتبہ قوم فرعون پر قحط کا عذاب مسلط ہوا، اور موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے رفع ہو گیا مگر یہ لوگ اپنی سرکشی سے باز نہ آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! یہ ایسے سرکش لوگ ہیں کہ عذاب قحط سے بھی متاثر نہ ہوئے اور معاہدہ کر کے پھر گئے، اب ان پر کوئی ایسا عذاب مسلط فرما دیجئے جو ان کے لئے دردناک ہو، اور ہماری قوم کے لئے ایک وعظ کا کام دے اور بعد میں آنے والوں کے لئے درس عبرت بنے، تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ان پر طوفان کا عذاب بھیج دیا، مشہور مفسرین کے نزدیک طوفان سے مراد پانی کا طوفان ہے، قوم فرعون کے سب گھروں اور زمینوں کو پانی کے طوفان نے گھیر لیا نہ کہیں بیٹھنے لیٹنے کی جگہ رہی نہ زمین میں کچھ کاشت وغیرہ کرنے کی، اور عجیب بات یہ تھی کہ قوم فرعون کے مکانات اور زمینوں کے ساتھ ہی بنی اسرائیل کے مکانات اور زمینیں تھیں، بنی اسرائیل کے مکانات اور زمینیں سب بدستور خشک تھیں کہیں طوفان کا پانی نہ تھا اور قوم فرعون کے سارے گھر اور زمین اس طوفان سے لبریز تھے۔

اس طوفان سے گھبرا کر قوم فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے التجا کی کہ اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ یہ عذاب ہم سے دور فرمادیں تو ہم ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو آزاد کر دیں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ طوفان دور ہوا۔ اور اس کے بعد ان کی کھیتیاں پہلے سے زیادہ ہری بھری ہو گئیں، تو اب یہ کہنے لگے کہ درحقیقت یہ طوفان کوئی عذاب نہیں تھا بلکہ ہمارے فائدے کے لئے آیا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری زمینوں کی پیداوار بڑھ گئی، اس لئے موسیٰ علیہ السلام کا اس میں کچھ دخل نہیں اور یہ کہہ کر سب عہد و پیمان نظر انداز کر دیئے۔

اس طرح یہ لوگ ایک ہیمنہ امن وعافیت سے رہتے رہے، اللہ نے ان کو غور و فکر کی مہلت دی مگر یہ ہوش میں نہ آئے تو اب دوسرا عذاب ٹنڈیوں کا ان پر مسلط کر دیا گیا، ٹنڈیوں نے ان کی ساری کھیتوں اور باغوں کو کھا لیا، بعض روایات میں ہے کہ لکڑی کے دروازوں اور چھتوں کو اور گھر یو سب سامان کو ٹنڈیاں کھا گئیں اور اس عذاب کے وقت بھی موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ سامنے تھا کہ یہ سارا ٹنڈیوں کے دل صرف قبطی یعنی قوم فرعون کے باغوں، کھیتوں، گھروں پر چھایا ہوا تھا، پاس ملے ہوئے اسرائیلیوں کے مکانات، زمینیں، باغ سب اس سے محفوظ تھے۔ اس وقت پھر قوم فرعون چلا اٹھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اس

مرتبہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کر دیں یہ عذاب ہٹ جائے تو ہم پختہ وعدہ کرتے ہیں کہ ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو آزاد کر دیں گے، موسیٰ علیہ السلام نے پھر دعا کی اور یہ عذاب ہٹ گیا، مگر عذاب کے ہٹنے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ہمارے پاس اب بھی اتنا ذخیرہ غلہ کا موجود ہے کہ ہم سال بھر کھا سکتے ہیں تو پھر سرکشی اور عہد شکنی پر آمادہ ہو گئے، نہ ایمان لائے نہ بنی اسرائیل کو آزاد کیا۔

ایک مہینہ پھر اللہ تعالیٰ نے مہلت دی، اس مہلت کے بعد تیسرا عذاب قتل کا مسلط ہوا، لفظ قتل اس جوں کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو انسان کے بالوں اور کپڑوں میں پیدا ہوتی ہے، اور اس کیڑے کو بھی کہتے ہیں جو غلہ میں لگ جاتا ہے جس کو گھٹن بھی کہا جاتا ہے۔ قتل کا یہ عذاب ممکن ہے کہ دونوں قسم کے کیڑوں پر مشتمل ہو کہ غلوں میں گھٹن لگ گیا اور انسانوں کے بدن اور کپڑوں میں جوؤں کا طوفان اٹھ آیا۔

غلوں کا حال اس گھٹن نے ایسا کر دیا کہ وہ سیر گریہوں پیسنے کے لئے نکالیں تو اُس میں تین سیر آٹا بھی نہ نکلے، اور جوؤں نے ان کے بال اور پلکیں اور بھوئیں تک کھالیں۔

آخر پھر قوم فرعون بلبلہ اٹھی اور موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی کہ اب کی مرتبہ ہم ہرگز وعدہ سے نہ پھریں گے آپ دعا کر دیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ عذاب بھی ٹل گیا، مگر جن بد نصیبوں کو ہلاک ہی ہونا تھا وہ کہاں عہد کو پورا کرتے، پھر عافیت ملتے ہی سب کچھ بھول گئے اور منکر ہو گئے۔

پھر ایک ماہ کی مہلت ایسی آرام و راحت کے ساتھ ان کو دی گئی مگر اس مہلت سے بھی کوئی فائدہ نہ اٹھایا تو چوتھا عذاب مینڈکوں کا ان پر مسلط کر دیا گیا، اور اس کثرت سے مینڈک ان کے گھروں میں پیدا ہو گئے کہ جہاں بیٹھتے تو ان کے گلے تک مینڈکوں کا ڈھیر لگ جاتا، سونے کے لئے لیٹتے تو سارا بدن ان سے دب جاتا کروٹ لینا ناممکن ہو جاتا، پکتی ہوئی ہنڈیا میں رکھے ہوئے کھانے میں آٹے میں اور ہر چیز میں مینڈک بھر جاتے، اس عذاب سے عاجز آکر سب رونے لگے اور پہلے سے پختہ وعدوں کے ساتھ معاہدہ کیا تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ عذاب بھی رفع ہو گیا۔

مگر جس قوم پر قہر الہی مسلط ہو اس کی عقل اور ہوش و حواس کام نہیں دیتے، اس واقعہ کے بعد بھی عذاب سے نجات پا کر یہ پھر اپنی ہٹ دھرمی پر جم گئے اور کہنے لگے کہ اب تو ہمیں اور بھی یقین ہو گیا، موسیٰ علیہ السلام بڑے جادوگر ہیں یہ سب ان کے جادو کے کرشمے ہیں رسول نبی کچھ نہیں۔

پھر ایک ماہ کی مہلت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی مگر اس مہلت سے بھی کوئی کام نہ لیا تو پانچواں عذاب خون کا مسلط کر دیا گیا کہ ان کے ہر کھانے اور پینے کی چیز خون بن گئی، کنویں سے، حوض سے، جہاں کہیں سے پانی نکالیں خون بن جائے، کھانا پکانے کے لئے رکھیں خون بن جائے اور ان سب عذابوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ مسلسل تھا کہ ہر عذاب سے اسرائیلی حضرات بالکل مامون و محفوظ تھے، خون کے عذاب کے وقت قوم فرعون کے لوگوں نے بنی اسرائیل کے گھروں سے پانی مانگا جب وہ ان کے ہاتھ میں گیا تو خون ہو گیا، ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر قبلی اور اسرائیلی کھانا کھاتے تو جو لقمہ اسرائیلی اٹھاتا وہ اپنی حالت پر کھانا ہوتا اور جو لقمہ یا پانی کا گھونٹ قبلی کے مُنہ میں جاتا خون بن جاتا، یہ عذاب بھی بدستور سابق سات روز رہا یا لا پھر یہ بدکار بد عہد قوم چلا اٹھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی اور پہلے سے زیادہ موثق وعدے کئے، دعا کی گئی عذاب ہٹ گیا مگر یہ لوگ اپنی اُسی ہٹ دھرمی پر جمے رہے، اس طرح یہ پانچ عذاب مسلسل ان پر آتے رہے مگر یہ لوگ اپنی گمراہی پر قائم رہے اسی کو قرآن کریم نے فرمایا:

فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا بُحْرًا مِّنَ، یعنی ان لوگوں نے تکبر سے کام لیا اور یہ لوگ بڑے عادی مجرم تھے۔

اس کے بعد ایک چھٹے عذاب کا ذکر بعد کی آیت میں راجز کے نام سے آیا ہے، یہ لفظ اکثر طاعون کے لئے بولا جاتا ہے، چیچک وغیرہ وبائی امراض کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے تفسیری روایات میں ہے کہ ان لوگوں پر طاعون کی وبا، مسلط کر دی گئی، جس میں ان کے ستر ہزار آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس وقت پھر ان لوگوں نے فریاد کی اور پھر دعا کرنے پر یہ عذاب ہٹا اور پھر بدستور ان لوگوں نے عہد شکنی کی، اتنی مسلسل آزمائشوں اور مہلتوں کے بعد جب ان میں کوئی احساس پیدا ہی نہ ہوا تو اب آخری عذاب آگیا کہ سب کے سب اپنے مکان زمینیں سامان کو چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں نکلے اور بالآخر دریائے قلزم کا لقمہ بن گئے، فَاغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ يَا نَحْمُ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ۔

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضَعُونَ مَشَارِقَ

اور وارث کر دیا ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین کے

الْأَرْضِ وَمَغَارِبِهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ

مشرق اور مغرب کا کہ جس میں برکت رکھی ہے ہم نے اور پورا ہو گیا نیکی کا

رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِيْ اِسْرَآءِیْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ۚ وَ

وعدہ تیرے رب کا بنی اسرائیل پر . بسبب ان کے صبر کرنے کے . اور

دَمَرْنَا مَا كَانْ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوْا

خواب کر دیا ہم نے جو کچھ بنایا تھا فرعون اور اس کی قوم نے اور جو اونچا کر کے

یَعْرِشُوْنَ ۝۱۳۷ وَجَاوَرْنَا بِبَنِيْ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ

پھرایا تھا ، اور پار اتار دیا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے

فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ؕ قَالُوْا یٰمُوسٰی

تو پہنچے ایک قوم پر جو پوجنے میں لگ رہے تھے اپنے بتوں کے کہنے لگے اے موسیٰ

اَجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا كَمَا لِهٰٓئِهِ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَحْمِلُوْنَ ۝۱۳۸

بنادے ہماری عبادت کے لئے بھی ایک بت جیسے ان کے بت ہیں ، کہا تم لوگ تو جہل کرتے ہو ،

اِنَّ هُوَ لَاۤ اِلٰهٌ مُّتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَبِطِلٌ مَّا كَانُوْا

یہ لوگ ، تباہ ہونے والی ہے وہ چیز جس میں وہ لگے ہوئے ہیں اور غلط ہے جو وہ

یَعْمَلُوْنَ ۝۱۳۹ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْكُمْ اِلٰهًا وَهُوَ

کر رہے ہیں ، کہا ، کیا اللہ کے سوا ڈھونڈو تمہارے واسطے کوئی اور معبود ، حالانکہ

فَضَّلَكُمْ عَلٰی الْعٰلَمِیْنَ ۝۱۴۰ وَاِذْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ اِل

اس نے تم کو بڑائی دی تمام جہان پر اور وہ وقت یاد کرو جب نجات دی ہم نے تم کو

فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ

فرعون والوں سے کہ دیتے تھے تم کو بڑا عذاب کہ مار ڈالتے تھے تمہارے بیٹوں کو

وَلِیَسْتَحْیُوْنَ نِسَاءَكُمْ ط وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَاۤءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ۝۱۴۱

اور جیتا رکھتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں احسان ہے تمہارے رب کا بڑا ۔

خلاصہ تفسیر

اور (فرعون اور اہل فرعون کو غرق کر کے) ہم نے ان لوگوں کو جو کہ بالکل کمزور شمار کیے جاتے تھے (یعنی بنی اسرائیل) اُس سرزمین کے پورے کچھم (یعنی تمام حدود) کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی ہے (ظاہری برکت کثرت پیداوار سے اور باطنی برکت ذی فضائل و مدفن و مسکن

انبیاء علیہم السلام ہونے سے، اور آپ کے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہو گیا (جس کا حکم انہیں دیا گیا تھا اَصْبِرُوا) اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں کو اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بنواتے تھے سب کو درہم برہم کر دیا اور جس دریا میں فرعون کو غرق کیا گیا، ہم نے بنی اسرائیل کو (اس) دریا سے پار اتار دیا (جس کا قصہ سورۃ شعراء میں ہے) پھر (پار ہونے کے بعد) ان لوگوں کا ایک قوم پر گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کو لگے بیٹھے تھے (یعنی ان کی پوجا پاٹ کر رہے تھے) کہنے لگے اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایک (مجسم) معبود ایسا ہی مقرر کر دیجئے جیسے ان کے یہ معبود ہیں، آپ نے فرمایا واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے، یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں (یہ من جانب اللہ بھی) تباہ کیا جائے گا (جیسا کہ عادۃ اللہ ہمیشہ سے جاری ہے کہ حق کو باطل پر غالب کر کے اس کو درہم برہم کر دیتے ہیں) اور ان کا یہ کام محض بے بنیاد ہے (کیونکہ شرک کا بطلان یقینی و بدیہی ہے) اور فرمایا کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو تمہارا معبود بتادوں حالانکہ اس نے تم کو (بعض نعمتوں میں) تمام دنیا جہاں والوں پر فوقیت دی ہے اور (اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے قول کی تائید کے لئے ارشاد فرمایا کہ) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں (کے ظلم و ایذا) سے بچا لیا جو تم کو بڑی سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے کہ تمہارے بیٹوں کو بکثرت قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو اپنی بیگاری اور خدمت کے لئے زندہ پھوڑ دیتے تھے اور اس (واقعہ) میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی بھاری آزمائش تھی۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں قوم فرعون کی مسلسل سرکشی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف عذابوں کے ذریعہ ان کی تنبیہات کا بیان تھا، مذکورہ آیات میں ان کے انجام بد اور بنی اسرائیل کی فتح و کامرانی کا ذکر ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہے وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِینَ کَاوُوا یَسْتَضْعِفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِی بَدَّلْنَا فِیْهَا، یعنی جس قوم کو کمزور ضعیف سمجھا جاتا تھا ان کو ہم نے اُس زمین کے مشرق و مغرب کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکات رکھی ہیں۔

الفاظ قرآن میں غور کیجئے، یہ نہیں فرمایا کہ جو قوم ضعیف و کمزور تھی بلکہ یہ فرمایا کہ جس کو قوم فرعون نے ضعیف و کمزور سمجھا تھا، اشارہ اس کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ جس قوم کی مدد پر ہوں وہ حقیقت میں کبھی کمزور و ذلیل نہیں ہوتی گو کسی وقت اس کے ظاہر حال سے دوسرے لوگ دھوکہ کھائیں اور

ان کو کمزور سمجھیں مگر انجام کار پر سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کمزور و ذلیل نہ تھے، کیونکہ درحقیقت قوت و عزت حق تعالیٰ شانہ کے قبضہ میں ہے، تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ۔

اور زمین کا مالک بنادینے کے لئے لفظ أَوْثَرْنَا ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان کو وارث بنادیا، اس میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ جس طرح وارث ہی اپنے مورث کے مال کا مستحق ہوتا ہے، باپ کی حیات ہی میں ہر شخص یہ جان لیتا ہے کہ اس کے مال و جائداد کی مالک آخر کار اس کی اولاد ہے اسی طرح علم الہی میں بنی اسرائیل پہلے ہی سے قوم فرعون کے ملک و مال کے مستحق تھے۔

مَشَارِقَ مَشْرِقٍ کی جمع ہے اور مَغَارِبَ مَغْرِبٍ کی، سردی گرمی کے مختلف موسموں میں مغرب و مشرق کے بدلنے کی وجہ سے جمع کا لفظ لایا گیا، اور زمین سے مراد اس جگہ جمہور مفسرین کے قول کے مطابق ملک شام اور مصر کی سرزمین ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو قوم فرعون اور قوم عمالقہ کے ہلاک ہونے کے بعد قبضہ اور حکومت عطا فرمائی۔

اور آگئی بَرَكَاتٍ فِيهَا سے یہ بتلادیا کہ ان زمینوں میں اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے اپنی برکات نازل فرمائی ہیں، ملک شام کے بارے میں تو قرآن کریم کی متعدد آیات میں محل برکات ہونے کا ذکر ہے، الَّتِي بَرَكَتْنَا حَوْلَهَا میں اسی کا بیان ہے، اسی طرح ارض مصر کے بارے میں بھی محل برکات و ثمرات ہونا متعدد روایات سے نیز مشاہدات سے ثابت ہے، حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ مصر کا دریائے نیل سَيِّدُ الْأَنْهَارِ یعنی دریاؤں کا سردار ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ برکات کے دس حصوں میں سے نو مصر میں ہیں اور باقی ایک پوری زمین میں (بحر محیط) خلاصہ یہ ہے کہ جس قوم کو غرور و پندار کے نشہ والوں نے اپنی کوتاہ فطری سے ذلیل و کمزور سمجھ رکھا تھا، ہم نے اسی کو ان متکبرین کی دولت و سلطنت اور ملک و مال کا مالک بنا کر دکھلادیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کا وعدہ سچا ہوتا ہے، ارشاد فرمایا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحَسَنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَآئِيلَ یعنی آپ کے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہو گیا۔

اس اچھے وعدے سے مراد یا تو وہ وعدہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کیا تھا، عَلَىٰ رَبِّكُمْ أَنِّي أَخْلِقُ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَبِطِنُ فِي الْأَرْضِ یعنی قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور ان کی زمین کا تمہیں مالک بنادے۔ اور یا وہ وعدہ ہے جو قرآن کریم میں دوسری جگہ خود حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا ہے:

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضِعُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ وَنُكَلِّمُ فِي الْأَرْضِ وَنُرِي فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ، یعنی ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس قوم پر احسان کریں جن کو اس ملک میں کمزور و ذلیل سمجھا گیا ہے، اور

ان کو ہی سرور اور حکام بناویں اور ان کو ہی اس زمین کا وارث قرار دیں اور اس زمین پر تصرفات کرنے کا حق دیں اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ چیز واقع کر کے دکھلا دیں جس کے ڈر سے وہ موسیٰ علیہ السلام کے خلاف طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں وعدے ایک ہی ہیں، اللہ تعالیٰ کے وعدے ہی کی بناء پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے وعدہ کیا تھا، اس آیت میں اس وعدہ کا پورا ہونا لفظ تَکْمِیْل سے بیان کیا گیا، کیونکہ وعدہ کا اتمام و تکمیل اُسی وقت ہوتی ہے جب وہ پورا ہو جائے۔

اس کے ساتھ ہی بنی اسرائیل پر اس انعام و احسان کی وجہ بھی بیان فرمادی بِمَا صَبَرُوا یعنی اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے اللہ کے راستہ میں تکلیفیں برداشت کیں اور ان پر ثابت قدم رہا، اس میں اشارہ کر دیا کہ ہمارا یہ احسان و انعام کچھ بنی اسرائیل ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ ان کے عمل صبر و ثابت قدمی کا نتیجہ تھا جو شخص یا جو قوم اس عمل کو اختیار کرے ہمارا انعام ہر جگہ ہر وقت اُس کے لئے موجود ہے۔

فضائے بذر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب نصرت الہی کا وعدہ اپنی قوم سے کیا تھا اس وقت بھی انہوں نے قوم کو یہی بتلایا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنا اور مصائب و آفات کا ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہی کلید کامیابی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جیسا انسان کا مقابلہ کسی ایسے شخص یا جماعت سے ہو جس کا دفاع کرنا اس کی قدرت میں نہ ہو تو ایسے وقت کامیابی اور فلاح کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ مقابلہ نہ کرے بلکہ صبر کرے، انہوں نے فرمایا کہ جب کوئی آدمی کسی کی ایذا کا مقابلہ اس کی ایذا سے کرتا ہے یعنی اپنا انتقام خود لینے کی فکر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اسی کے حوالے کر دیتے ہیں کامیاب ہو یا ناکام، اور جب کوئی شخص لوگوں کی ایذا کا مقابلہ صبر اور نصرت الہی کے انتظار سے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے راستے کھول دیتے ہیں۔

اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے صبر و ثابت قدمی پر یہ وعدہ فرمایا تھا کہ ان کو دشمن پر فتح اور زمین پر حکومت عطا کریں گے اسی طرح امت محمدیہ سے بھی وعدہ فرمایا ہے جو سورۃ نور میں مذکور ہے، وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ، اور جس طرح بنی اسرائیل نے وعدہ خداوندی کا مشاہدہ کر لیا تھا، امت محمدیہ نے ان سے زیادہ واضح طور پر اللہ تعالیٰ کی مدد کا مشاہدہ کیا کہ پوری زمین پر ان کی حکومت و سلطنت عام ہو گئی (روح البیان)

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بنی اسرائیل نے تو صبر سے کام نہیں لیا، بلکہ جب موسیٰ علیہ السلام نے صبر کی تلقین فرمائی تو خفا ہو کر کہنے لگے اَوْذَيْنَا، وہیہ ہے کہ اول تو ان کا صبر بمقابلہ فرعون کی ایذا کے اور ایمان پر ثابت قدم رہنا مسلسل ثابت ہے اگر ایک دفعہ لفظ شکایت نکل بھی گیا تو اس پر نظر نہیں کی گئی، دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ قول بطور شکایت نہ ہو بلکہ بطور اظہارِ رنج و غم کے ہو۔

آیت متذکرہ میں اس کے بعد فرمایا وَدَمَرْنَا مَا كَانُوا يَفْضَحُونَ فِرْعَوْنَ وَ قَوْمَهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ، یعنی ہم نے تباہ و برباد کر دیا ان سب چیزوں کو جو فرعون اور اس کی قوم بنایا کرتی تھی اور ان عمارتوں یا درختوں کو جن کو وہ بلند کیا کرتی تھی۔ فرعون اور قوم فرعون کی بتائی ہوئی چیزوں میں ان کے مکانات و عمارات اور گھریلو ضرورت کے سامان، نیز وہ مختلف قسم کی تدبیریں جو وہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لئے کرتے تھے، سب داخل ہیں، اور وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ، یعنی جس کو وہ بلند کرتے تھے، اس میں بلند محلات و مکانات بھی داخل ہیں اور بلند درخت اور وہ انگوڑ کی بلیں بھی جن کو چھتوں پر چڑھایا جاتا ہے۔

یہاں تک قوم فرعون کی تباہی کا ذکر تھا، آگے بنی اسرائیل کی فتح و کامرانی کے بعد ان کی سرکشی اور جہالت اور کج روی کا بیان شروع ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی بیشمار نعمتوں کے مشاہدہ کے باوجود ان لوگوں سے سرزد ہوئی، جس کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ پچھلے انبیاء نے اپنی امت کے ہاتھوں کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائی ہیں، ان کو سامنے رکھنے سے موجودہ کشرلوں کی ایذا، ہلکی ہو جائے گی۔

وَبَاذَيْنَا بَنِي إِسْرَآئِيلَ الْبَحْرَ، یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتار دیا، بنی اسرائیل کو قوم فرعون کے مقابلہ میں معجزانہ کامیابی حاصل ہوئی اور اطمینان ملا تو اُس کا وہی اثر ہوا جو عام قوموں پر عیش و عشرت اور عزت و دولت کا ہوا کرتا ہے کہ ان میں جہلانہ چیزیں پیدا ہونا شروع ہوئیں۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ یہ قوم ابھی ابھی اعجازِ موسوی کے ساتھ دریا سے پار ہوئی اور پوری قوم فرعون کے غرقِ دریا ہونے کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ذرا آگے بڑھی تو ایک قبیلہ پر گزر ہوا جو مختلف بتوں کی پرستش میں مبتلا تھا، بنی اسرائیل کو کچھ ان کا ہی طریقہ پسند آنے لگا، اور موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ جیسے ان لوگوں کے بہت سے معبود ہیں آپ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی معبود بنا دیجئے کہ ہم بھی ایک محسوس چیز کو سامنے رکھ کر عبادت کیا کریں، اللہ تعالیٰ کی ذات تو سامنے نہیں، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، اِنَّكُمْ قَوْمٌ يَّتَهَمَلُونَ، یعنی تم لوگوں

میں بڑی جہالت ہے، یہ لوگ جن کے طریقہ کو تم نے پسند کیا ان کے اعمال سب ضائع و برباد ہیں یہ باطل کے پیرو ہیں تمہیں ان کی حرص نہ کرنا چاہئے، کیا میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کسی کو معبود بنادوں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہی تم کو تمام جہاں والوں پر فضیلت بخشی ہے، مراد اُس وقت کے اہل عالم ہیں کہ اُس وقت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے ہی دوسرے سب لوگوں سے افضل و اعلیٰ تھے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کو ان کی بچپلی حالت یاد دلانی گئی کہ وہ فرعون کے ہاتھوں میں ایسے مجبور و مقہور تھے کہ ان کے لڑکوں کو قتل کیا جاتا تھا صرف لڑکیاں اپنی خدمت کے لئے رکھی جاتی تھیں، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی برکت و دعا سے اس عذاب سے نجات دی، کیا اس احسان کا اثر یہ ہونا چاہئے کہ تم اسی رب العالمین کے ساتھ دنیا کے ذلیل ترین پتھروں کو شریک ٹھہراؤ، یہ کیسا ظلم عظیم ہے، اس سے توبہ کرو۔

وَوَعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتَمَّمْنَاهَا بِعَشْرِ قَتْمٍ مِّيقَاتٍ

اور وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا اور پورا کیا ان کو اور دس سے پس پوری ہو گئی مدت

سَرَبِّهِ ۖ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ

تیرے رب کی چالیس راتیں اور کہا موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے

اخْلُقْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ ﴿١٢٢﴾

کہ میرا خلق فرما میری قوم میں اور اصلاح کرتے رہنا اور مت چلنا مفسدوں کی راہ۔

خلاصہ تفسیر

اور جب بنی اسرائیل سب پریشانیوں سے مطمئن ہو گئے تو موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اب ہم کو کوئی شریعت ملے تو اس پر اطمینان کے ساتھ عمل کریں، موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے درخواست کی، حق تعالیٰ اس کا قصہ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ، ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے تیس راتوں کا وعدہ کیا کہ طور پر آکر اہتکاف کریں تو آپ کو شریعت اور کتاب تورات دی جائے گی، اور دس راتیں مزید ان تیس راتوں کا تمہ بنادیا (یعنی تورات دے کر ان میں دس راتیں عبادت کے لئے اور بڑھادیں جس کی وجہ سورۃ بقرہ میں مذکور ہو چکی ہے)، اس طرح ان کے پروردگار کا (مقرر کیا ہوا) وقت (سب مل کر) پوری چالیس راتیں ہو گیا اور موسیٰ (علیہ السلام) کو وہ طور آنے لگے

تو چلتے وقت، اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) سے کہہ دیا تھا کہ میرے بعد ان لوگوں کا انتظام رکھنا اور اصلاح کرتے رہنا اور بد نظم لوگوں کی رائے پر عمل نہ کرنا۔

معارف و مسائل

اس آیت میں موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا وہ واقعہ مذکور ہے جو غرقِ فرعون اور بنی اسرائیل کے مطمئن ہونے کے بعد پیش آیا کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اب ہم مطمئن ہیں، اب ہمیں کوئی کتاب اور شریعت ملے تو ہم بے فکری کے ساتھ اس پر عمل کریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے دعا کی۔

اس میں لفظ **وَاعْذُنَا** وعدہ سے مشتق ہے، اور وعدہ کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کو منفع پہنچانے سے پہلے اس کا اظہار کر دینا کہ ہم تمہارے لئے فلاں کام کریں گے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر اپنا کلام نازل کرنے کا وعدہ فرمایا اور اس کے لئے یہ شرط لگائی کہ تیس راتیں کوہِ طور پر اعتکاف اور ذکر اللہ میں گزار دیں اور پھر ان تیس پر اور دس راتوں کا اضافہ کر کے چالیس کر دیا۔

لفظ **وَاعْذُنَا** کے اصلی معنی دو طرف سے وعدے اور معاہدے کے آتے ہیں، یہاں بھی حضرت حق جلّ شانہ کی طرف سے عطا کردہ تورات کا وعدہ تھا اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے تیس چالیس راتوں کے اعتکاف کا، اس لئے بجائے **وَاعْذُنَا** کے **وَاعْذُنَا** فرمایا۔

اس آیت میں چند مسائل اور احکام قابلِ غور ہیں:

اول یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہی یہ تھا کہ اعتکاف چالیس راتوں کا کرایا جائے تو پہلے تیس اور بعد میں دس کا اضافہ کر کے چالیس کرنے میں کیا حکمت تھی، پہلے ہی چالیس راتوں کے اعتکاف کا حکم دے دیا جاتا تو کیا حرج تھا، سوال اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ تو کون کر سکتا ہے، بعض حکمتیں علماء نے بیان کی ہیں۔

تفسیر روح البیان میں ہے کہ اس میں ایک حکمت درج اور آہستگی کی ہے کہ کوئی کام کسی کے ذمہ لگایا جائے تو اول ہی زیادہ مقدار کام کی اس پر نہ ڈالی جائے تاکہ وہ آسانی سے برداشت کرے، پھر مزید کام دیا جائے۔

اور تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس طرز میں حکام اور اولوالامر کو اس کی تعلیم دینا ہے کہ اگر کسی کو کوئی کام ایک معین وقت میں پورا کرنے کا حکم دیا جائے اور اس معین معاد میں وہ پورا نہ کر سکے تو اس کو مزید مہلت دی جائے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں پیش آیا کہ تیس راتیں پوری کرنے

کے بعد جس کیفیت کا حاصل ہونا مطلوب تھا وہ پوری نہ ہوئی اس لئے مزید دس راتوں کا اضافہ کیا گیا کیونکہ ان دس راتوں کے اضافہ کا ہو واقعہ مفسرین نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ تیس راتوں کے احتکاف میں موسیٰ علیہ السلام نے حسب قاعدہ تیس روزے بھی مسلسل رکھے بیچ میں افطار نہیں کیا، تیسواں روزہ پورا کرنے کے بعد افطار کر کے مقررہ مقام طور پر حاضر ہوئے تو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ روزہ دار کے منہ سے جو ایک خاص قسم کی راتھ معدہ کی تیج سے پیدا ہو جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، آپ نے افطار کے بعد مسواک کر کے اس راتھ کو زائل کر دیا، اس لئے مزید دس روزے اور رکھئے تاکہ وہ راتھ پھر پیدا ہو جائے۔

اور بعض روایات تفسیر میں جو اس جگہ یہ منقول ہے کہ تیسویں روزہ کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے مسواک کر لی تھی جس کے ذریعہ وہ راتھ صوم زائل ہو گیا تھا، اس سے اس بات پر استدلال نہیں ہو سکتا کہ روزہ دار کے لئے مسواک کرنا مکروہ یا ممنوع ہے کیونکہ اول تو اس روایت کی کوئی سند مذکور نہیں، دوسرے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے متعلق ہو عام لوگوں کے لئے نہ ہو یا شریعت موسوی میں ایسا ہی حکم سب کے لئے ہو کہ روزہ کی حالت میں مسواک نہ کی جائے، لیکن شریعت محمدیہ میں تو بحالت روزہ مسواک کرنے کا معمول حدیث سے ثابت ہے جس کو بیہقی نے بروایت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، **يَحْيُوْكُمْ خَصَائِلُ الصَّائِمِ الْيَوْمَانِ** یعنی روزہ دار کا بہترین عمل مسواک ہے۔ اس روایت کو جامع صغیر میں نقل کر کے حسن فرمایا ہے۔

قائدہ | اس روایت پر ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب تلاشِ خضر میں سفر کر رہے تھے تو آدھے دن بھوک پر صبر نہ ہو سکا اور اپنے ساتھی سے فرمانے لگے **اَيُّنَا عَدُوٌّ لِّاَيُّنَا** لَقَدْ لَقَيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا یعنی ہمارا ناشتہ لاؤ کیونکہ اس سفر نے ہم کو تکان میں ڈال دیا، اور کوہ طور پر مسلسل تیس روزے اس طرح رکھے کہ رات کو بھی افطار نہیں، یہ عجیب بات ہے؟ تفسیر روح البیان میں ہے کہ یہ فرق ان دونوں سفروں کی نوعیت کے سبب سے تھا، پہلا سفر مخلوق کے ساتھ مخلوق کی تلاش میں تھا، اور کوہ طور کا سفر مخلوق سے علاحدہ ہو کر ایک ذات حق سبحانہ کی جستجو میں، اس کا یہی اثر ہونا تھا کہ بشری تقاضے نہایت مضحک ہو گئے، کھانے پینے کی حاجت اتنی گھٹ گئی کہ تیس روز تک کوئی تکلیف محسوس نہیں فرمائی۔

عبادات میں قمری حساب معتبر ہے، ایک اور مسئلہ اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے دنیوی معاملات میں شمسی حساب کی گنجائش ہے۔
شرائع میں تاریخ کا حساب رات سے ہوتا ہے، کیونکہ اس آیت میں بھی تیس دن کے بجائے تیس راتوں کا ذکر فرمایا ہے، وجہ یہ ہے کہ شرائع انبیاء میں مہینے قمری

معتبر ہیں اور قمری مہینہ کا شروع چاند دیکھنے سے ہوتا ہے، وہ رات ہی میں ہو سکتا ہے اس لئے مہینہ رات سے شروع ہوتا ہے پھر اسکی ہر تاریخ غروب آفتاب سے شمار ہوتی ہے۔ جتنے آسمانی مذہب ہیں ان سب کا حساب اسی طرح قمری مہینوں سے اور شروع تاریخ غروب آفتاب سے اعتبار کی جاتی ہے۔

قرطبی نے بحوالہ ابن عربی نقل کیا ہے کہ

حِسَابُ الشَّمْسِ لِلْمَنَافِعِ وَحِسَابُ الْقَمَرِ لِلْمَنَاسِكِ یعنی شمسی حساب دنیوی منافع کے لئے ہے اور قمری حساب ادا عبادات کے لئے۔

اور یہ تیس راتیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق ماہ ذی القعدہ کی راتیں تھیں اور پھر ان پر دس راتیں ذی الحجہ کی بڑھائی گئیں، اس سے معلوم ہوا کہ تورات کا عطیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یوم النحر (یعنی عید الاضحیٰ) کے دن ملا (قرطبی)

ایک مسئلہ، اس آیت کے اشارہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چالیس راتوں کو باطنی حالات کی اصلاح میں کوئی خاص دخل ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص چالیس روز اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب سے حکمت کے چشمے جاری فرما دیتے ہیں۔ (روح البیان)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اہم کاموں کے لئے ایک خاص میعاد مقرر کرنا، اور سہولت و تدریج سے انجام دینا سنت الہیہ ہے، عجلت اور جلد بازی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

سب سے پہلے خود حق تعالیٰ نے اپنے کام معنی پیدائش عالم کے لئے ایک میعاد چھ روز کی متعین فرما کر یہ اصول بتا دیا ہے، حالانکہ حق تعالیٰ کو آسمان زمین اور سارے عالم کو پیدا کرنے کے لئے ایک منٹ کی بھی ضرورت نہیں جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنے کے لئے فرمادیں کہ ہو جا وہ فوراً ہوتی ہے مگر اس خاص طرز عمل میں مخلوق کو یہ ہدایت دینا تھی کہ اپنے کاموں کو غور و فکر اور تدریج کے ساتھ انجام دیا کریں، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی تو اس کے لئے بھی ایک میعاد مقرر فرمائی اس میں اسی اصول کی تعلیم ہے۔ (قرطبی)

اور یہی وہ اصول تھا جس کو نظر انداز کر دینا بنی اسرائیل کی گمراہی کا سبب بنا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سابق حکم خداوندی کے مطابق اپنی قوم سے یہ کہہ کر گئے تھے کہ تیس روز کے لئے چار ہا ہوں یہاں جب وہ رات کی مدت بڑھ گئی تو اپنی جلد بازی کے سبب لگے یہ کہنے کہ موسیٰ علیہ السلام

تو کہیں گم ہو گئے، اب ہمیں کوئی دوسرا پیشوا بنالینا چاہئے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سامری کے دام میں پھنس کر "گوسالہ" پرستی شروع کر دی، اگر غور و فکر اور اپنے کاموں میں تدریج و تامل کے عادی ہوتے تو یہ نوبت نہ آتی (قرطبی)

آیت کے دوسرے جملہ میں ارشاد ہے وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ، اس جملہ سے بھی چند مسائل اور احکام نکلتے ہیں۔

ضرورت کے وقت ناظم امور کو اپنا قائم مقام تجویز کرنا۔
 اول یہ کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق کوہ طور پر جا کر اعتکاف کرنے کا ارادہ کیا تو اپنے ساتھی حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي یعنی میرے پیچھے آپ میری قوم میں میری قائم مقامی کے فرائض انجام دیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص کسی کام کا ذمہ دار ہو وہ اگر کسی ضرورت سے کہیں جائے تو اس پر لازم ہے کہ اُس کام کا انتظام کر کے جائے۔

نیز یہ ثابت ہوا کہ حکومت کے ذمہ دار حضرات جب کہیں سفر کریں تو اپنا قائم مقام اور خلیفہ مقرر کر کے جائیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت یہی تھی کہ جب کبھی مدینہ سے باہر جانا ہوا تو کسی شخص کو خلیفہ بنا کر جاتے تھے، ایک مرتبہ حضرت علی مرتضیٰؓ کو خلیفہ بنایا، ایک مرتبہ عبداللہ بن ام مکتوم کو اسی طرح مختلف اوقات میں مختلف صحابہ کو مدینہ میں خلیفہ بنا کر باہر تشریف لے گئے۔ (قرطبی)
 موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کے وقت ان کو چند ہدایات دیں اس سے معلوم ہوا کہ جس کو قائم مقام بنایا جائے اس کی سہولت کار کے لئے ضروری ہدایات دے کر جائے، ان ہدایات میں پہلی ہدایت یہ ہے کہ اصْلِحْ، اس میں اصْلَحْ کا مفعول ذکر نہیں فرمایا کہ کس کی اصلاح کرو، اس سے اشارہ اس عموم کی طرف ہے کہ اپنی بھی اصلاح کرو اور اپنی قوم کی بھی، یعنی جب ان میں کوئی بات فساد کی محسوس کرو تو ان کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرو، دوسری ہدایت یہ دی کہ لَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ یعنی فساد کرنے والوں کے راستہ کا اتباع نہ کرو، ظاہر ہے کہ ہارون علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، ان سے فساد میں مبتلا ہونے کا تو خطرہ نہ تھا اس لئے اس ہدایت کا مطلب یہ تھا کہ مفسدین کی مدد یا ہمت افزائی کا کوئی کام نہ کرو۔

چنانچہ حضرت ہارون علیہ السلام نے جب قوم کو دیکھا کہ سامری کے پیچھے چلنے لگے یہاں تک کہ اس کے کہنے سے گوسالہ پرستی شروع کر دی تو قوم کو اس بے ہودگی سے روکا اور سامری کو ڈانٹا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے واپسی کے بعد جب یہ خیال کیا کہ ہارون علیہ السلام نے میرے

پیچھے اپنے فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی تو ان سے مواخذہ فرمایا۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہئے جو بد نظمی اور
بے فکری ہی کو سب سے بڑی بزرگی سمجھتے ہیں۔

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أَرِنِي

اور جب پہنچا موسیٰ ہمارے وعدہ پر اور کلام کیا اس سے اس کے رب نے بولالے میرے رب تو مجھ کو

اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تُرِنِّي وَلٰكِنْ اَنْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنْ

دکھا کہ میں تجھ کو دیکھوں فرمایا تو مجھ کو ہرگز نہ دیکھے گا لیکن تو دیکھتا رہ پہاڑ کی طرف اگر وہ

اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تُرِنِّي ؕ فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ

اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو تو مجھ کو دیکھ لے گا پھر جب تجلی کی اس کے رب نے پہاڑ کی طرف

جَعَلَهُ دَكَّآ وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ

کر دیا اس کو ڈھاکر برابر اور گر پڑا موسیٰ بے ہوش ہو کر پھر جب ہوش میں آیا بولا تیری ذات پاک ہے،

تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۳۶ قَالَ يٰمُوسَىٰ اِنِّیْ

میں نے توہ کی تیری طرف اور میں سب سے پہلے یقین لایا ، فرمایا اے موسیٰ میں نے

اصْطَفَيْتُكَ عَلٰی النَّاسِ بِرِسَالَتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۚ فَخُذْ مَا

تجھ کو امتیاز دیا لوگوں سے اپنے پیغام بھیجنے کا اور اپنے کلام کرنے کا سولے جو

اَتَيْتُكَ وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِيْنَ ۝۱۳۷ وَكَتَبْنَا لَهُ فِی الْوَاحِی

میں نے تجھ کو دیا اور شاکر رہ اور لکھ دی ہم نے اس کو تختیوں پر

مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ

ہر قسم کی نصیحت اور تفصیل ہر چیز کی سو پکڑ لے ان کو زور سے

وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوْا بِأَحْسَنِهَا سَأُوْرِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۱۳۸

اور حکم کر اپنی قوم کو کہ پکڑ لے ان کی بہتر باتیں عنقریب میں تم کو دکھلاؤں گا گھرنا فرمانوں کا۔

خلاصہ تفسیر

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) اس واقعہ میں ہمارے وقت (موعود) پر آئے (تھے جس کا قہقہہ
بیان ہوتا ہے) اور ان کے رب نے ان سے (بہت سی لطف و عنایت کی) باتیں کیں تو (شدت

انفساط سے دیدار کا اشتیاق پیدا ہوا، عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں، ارشاد ہوا کہ تم مجھ کو (دنیا میں) ہرگز نہیں دیکھ سکتے، (کیونکہ یہ آنکھیں تاب جمال نہیں لاسکتیں، کما فی المشکوٰۃ عن مسلم لاحرقہ سبحات وجہہ) لیکن (تمہاری تشفی کے لئے یہ تجویز کرتے ہیں کہ) تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو (ہم اس پر ایک جھلک ڈالتے ہیں) سو اگر یہ اپنی جگہ برقرار رہا تو (خیر) تم بھی دیکھ سکو گے (عرض موسیٰ علیہ السلام اس کی طرف دیکھنے لگے) پس ان کے رب نے جو اس پر تجلی فرمائی تو تجلی نے اس (پہاڑ) کے پرچے اڑا دیئے اور موسیٰ (علیہ السلام) بیہوش ہو کر گر پڑے، پھر جب افادہ میں آئے تو عرض کیا بیشک آپ کی ذات (ان آنکھوں کی برداشت سے) منزہ (اور بلند) ہے میں آپ کی جناب میں (اس مشتاقانہ درخواست سے) معذرت کرتا ہوں اور (جو کچھ حضور کا ارشاد ہے کہ لَنْ تَرٰنِیْ) سب سے پہلے میں اس پر یقین کرتا ہوں، ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ! (یہی بہت ہے کہ) میں نے (تم کو) اپنی (طرف سے) پیغمبری (کا عہدہ دے کر) اور اپنے (ساتھ) ہم کلامی (کا شرف بخش کر اس) سے اور لوگوں پر تم کو امتیاز دیا ہے تو اب (جو کچھ تم کو میں نے عطا کیا ہے) رسالت و ہم کلامی و توریت، اس کو لو اور شکر کرو اور ہم نے چند تختیوں پر ہر قسم کی (ضروری) نصیحت اور (احکام ضروریہ کے متعلق) ہر چیز کی تفصیل ان کو لکھ کر دی (یہی تختیاں تورات ہیں، پھر حکم ہوا کہ جب یہ تختیاں ہم نے دی ہیں) تو ان کو کوشش کے ساتھ (خود بھی) عمل میں لاؤ اور اپنی قوم کو (بھی) حکم کرو کہ ان کے اچھے اچھے احکام پر (یعنی سب پر کہ سب ہی اچھے ہیں) عمل کریں میں اب بہت جلد تم لوگوں کو (یعنی بنی اسرائیل کو) ان بے حکموں کا (یعنی فرعونوں کا یا عمارتہ کا) مقام دکھلاتا ہوں (اس میں بشارت اور وعدہ ہے کہ مصر یا شام پر عنقریب تسلط ہو اچھا ہوتا ہے، مقصود اس سے ترغیب دینا ہے اطاعت کی کہ اطاعت احکام الہیہ کے یہ برکات ہیں)

معارف و مسائل

لَنْ تَرٰنِیْ، (یعنی آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے) اس میں اشارہ ہے کہ رویت ناممکن نہیں مگر مخاطب بحالت موجودہ اس کو برداشت نہیں کر سکتا، ورنہ اگر رویت ممکن ہی نہ ہوتی تو لَنْ تَرٰنِیْ کے بجائے لَنْ اُرٰی کہا جاتا کہ میری رویت نہیں ہو سکتی (منظری) اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار دنیا میں بھی عقلاً ممکن تو ہے مگر اس آیت سے اس کا ممتنع الوقوع ہونا بھی ثابت ہو گیا اور یہی مذہب ہے جمہور اہل سنت کا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ

کی رویت عقلاً ممکن ہے مگر شرعاً ممتنع، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے لن یرى احدٌ منکم ربہ حتی یموت، یعنی تم میں سے کوئی شخص مرنے سے پہلے اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتا۔

وَلٰكِنْ اَنْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ، اس میں اس امر کی شہادت ہے کہ بحالت موجودہ مخاطب رویت الہی کو برداشت نہیں کر سکتا اس لئے پہاڑ پر ادنیٰ سی جھلک ڈال کر بتلادیا گیا کہ وہ بھی برداشت نہیں کر سکتا، انسان تو ضعیف الخلق ہے وہ کیسے برداشت کرے۔

فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ، تجلّی کے معنی عربی لغت میں ظاہر اور منکشف ہونے کے ہیں، اور صوفیہ کرام کے نزدیک تجلّی کے معنی کسی چیز کو بالواسطہ دیکھنے کے ہیں، جیسے کوئی چیز بواسطہ آئینہ کے دیکھی جائے، اسی لئے تجلی کو رویت نہیں کہہ سکتے، خود اسی آیت میں اس کی شہادت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رویت کی توفیق فرمائی اور تجلی کا اثبات۔

امام احمد، ترمذی، حاکم نے بروایت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کیا ہے اور اس کی سند کو ترمذی و حاکم نے صحیح قرار دیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرما کر ہاتھ کی چھوٹی انگلی (خنصر) کے سرے پر انگوٹھا رکھ کر اشارہ فرمایا کہ اللہ جل شانہ کے نور کا صرف اتنا سا حصہ ظاہر کیا گیا تھا جس سے پہاڑ کے ٹکڑے اڑ گئے، یہ ضروری نہیں کہ سارے پہاڑ کے ٹکڑے ہو گئے ہوں بلکہ جس حصہ پر حق تعالیٰ نے یہ تجلی فرمائی وہ حصہ ہی اس سے متاثر ہوا ہو۔

موسىٰ علیہ السلام سے اتنی بات تو قرآن کے واضح الفاظ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اللہ تعالیٰ کا کلام۔

موسىٰ علیہ السلام سے بلا واسطہ کلام فرمایا، پھر اس کلام میں بھی ایک تو وہ ہے جو اول عطاء نبوت کے وقت ہوا تھا، دوسرا کلام یہ ہے جو عطاء تورات کے وقت ہوا اور جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ آیت کے الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس دوسرے کلام کو بہ نسبت پہلے کے کچھ مزید خصوصیت حاصل تھی، لیکن حقیقت اس کلام کی کیا اور کس طرح تھی اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا، اُس میں جتنے احتمالات عقلیہ ایسے ہوں جو شریعت کے کسی حکم کے خلاف نہ ہوں سب کی گنجائش ضرور ہے مگر ان احتمالات میں کسی ایک کو متعین کرنا بلا دلیل درست نہیں، اور سلف صالحین صحابہ و تابعین ہی کا مسلک اس معاملہ میں اسلم ہے کہ اس معاملہ کو حوالہ خدا کیا جائے، احتمالات نکالنے کی فکر میں نہ پڑیں (بیان القرآن)

سَاَوْرٰیكُمْ اِذَا الْفٰسِقِیْنَ، اس جگہ دار الفاسقین سے کیا مراد ہے، اس میں دو قول ہیں، ایک ملک مصر، دوسرا ملک شام، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فتح کرنے سے پہلے مصر پر فرعون اور اس کی قوم حکمران اور غالب تھی اس کی وجہ سے مصر کو دار الفاسقین، اور ملک شام پر عمالقہ کا قبضہ تھا وہ بھی کافر فاسق تھے اس لئے اُس وقت شام بھی دار الفاسقین

تھا، ان دونوں میں سے اس جگہ کو نسا ملک مراد ہے، اس میں اختلاف اس بنیاد پر ہے کہ غرق فرعون کے بعد بنی اسرائیل مصر میں واپس چلے گئے تھے یا نہیں، اگر اس وقت مصر میں واپس گئے اور مملکت مصر پر قابض ہوئے جیسا کہ آیت ذَاوَرٰثِنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ سے اس کی تائید ہوتی تو مصر پر قبضہ اور غلبہ اس واقعہ تجلی طور سے پہلے ہو چکا ہے اس میں سَاوَرٰثِیْکُمْ ذَاوَرِثِیْنَ کا مفہوم ملک شام متعین ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس وقت واپس نہیں گئے تو دونوں ملک مراد ہو سکتے ہیں۔

وَکَتَبْنَا لَهُ فِی الْاَلْوَاخِ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات کی تختیاں لکھی لکھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کی گئی تھیں، انہی تختیوں کے مجموعہ کا نام توکلات ہے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیَتِیَ الَّذِیْنَ یَتَكَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ

میں پھیر دوں گا اپنی آیتوں سے ان کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق

الْحَقِّ وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَةٍ لَا یُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ یَّرَوْا

اور اگر دیکھ لیں ساری نشانیاں ایمان نہ لائیں ان پر اور اگر دیکھیں

سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ

رستہ ہدایت کا تو نہ ٹھہرائیں اس کو راہ اور اگر دیکھیں رستہ

الْغٰیِّ یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ کَذَّبُوْا بِاٰیَتِنَا وَا

گراہی کا تو اس کو ٹھہرائیں راہ یہ اس لئے کہ انہوں نے جھوٹ جانا ہماری آیتوں کو اور

کَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ ﴿۴۶﴾ وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیَتِنَا وَلِقَاءِ

لہجہ ان سے بے خبر اور جنہوں نے جھوٹ جانا ہماری آیتوں کو اور آخرت کی

الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کَانُوْا

علاقت کو برباد ہوئیں ان کی محنتیں وہی بدلہ پائیں گے جو کچھ

یَعْمَلُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰی مِنْۢ بَعْدِہٖ مِنْ حُلِیَّتِہُمْ

عمل کرتے تھے اور بنا لیا موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیور سے

عِجْلًا جَسَدًا اَلًا خَوَارِطَ اَلَمْ یَرَوْا اَنَّہٗ لَا یُکَلِّمُہُمْ وَلَا

بھڑا ایک بدن کہ اس میں گائے کی آواز تھی، کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ ان سے بات بھی نہیں کرتا اور

تفلا

يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا مَّا اخَذُوا وَكَانُوا ظَالِمِينَ ﴿١٣٨﴾ وَلَمَّا

نہیں بتلاتا رستہ معبود بنالیا اس کو اور وہ تھے ظالم اور جب

سُقِطَ فِيْ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا فَتَالُوْا

تپختمائے اور سمجھے کہ ہم بیشک گمراہ ہو گئے تو کہنے لگے

لَیِّنٌ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿١٣٩﴾

اگر نہ رحم کرے ہم پر ہمارا رب اور نہ بخشتے ہم کو تو بیشک ہم تباہ ہوں گے

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰی اِلٰی قَوْمِهٖ غَضِبَانَ اَيْسَفًا قَالَ بِسْمِ

اور جب لوٹ آیا موسیٰ اپنی قوم میں غصہ میں بھرا ہوا افسوسناک بولا کیا بُری

خَلَفْتُمْوْنِیْ مِنْۢ بَعْدِیْۙ اَتَجِیْلُكُمْۙ اَمْرَ رَبِّکُمْۙ وَآلَقٰی

نیابت کی تم نے میری میرے بعد کیوں جلدی کی تم نے اپنے رب کے حکم سے اور ڈال دیں

اَلْاَلْوَاخَ وَاَخَذَ بِرَاسِ اَخِيْهِ یَجْرُّہٗ اِلَیْہِ ط قَالَ ابْنَ اُمَّ

وہ تختیاں اور پکڑا سر اپنے بھائی کا لگا کھینچنے اس کو اپنی طرف وہ بولا اے میری ماں کے

اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضَعُّوْۤنِیْ وَكَادُوْۤا یَقْتُلُوْۤنِیْۙ فَلَا تَشِیْءْ

بچنے لوگوں نے مجھ کو کمزور سمجھا اور قریب تھے کہ مجھ کو مار ڈالیں سو مت ہنسنا

بِیْ الْاَعْدَاۤءِ وَلَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظَّٰلِمِیْنَ ﴿١٤٠﴾ قَالَ

مجھ پر دشمنوں کو اور نہ بلا مجھ کو گنہگار لوگوں میں بولا

رَبِّ اَغْفِرْ لِّیْ وَاِخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِکَؕ وَاَنْتَ

اے میرے رب معاف کر مجھ کو اور میرے بھائی کو اور داخل کر ہم کو اپنی رحمت میں اور تو

اَمْرَحْمُ الرَّحِیْمِ ﴿١٤١﴾

سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

خلاصہ تفسیر

(اب ترغیب اطاعت کے بعد ترہیب مخالفت کے لئے ارشاد ہے کہ) میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں (احکام ماننے سے) تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں (کیونکہ اپنے کو بڑا سمجھنا حق اس کا ہے جو واقع میں بڑا ہو، اور وہ ایک

۱۵۱

خدا کی ذات ہے، اور (برگشتگی کا ان پر یہ اثر ہوگا کہ) اگر تمام (دنیا بھر کی) نشانیاں (بھی) دیکھ لیں تب بھی (غایت قساوت سے) ان پر ایمان نہ لاویں اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا طریقہ نہ بنائیں اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو اپنا طریقہ بنالیں (یعنی حق کے قبول نہ کرنے سے پھر دل سخت ہو جاتا ہے اور برگشتگی اس حد تک پہنچ جاتی ہے) یہ (اس درجہ کی برگشتگی) اس سبب سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو (تکبر کی وجہ سے) جھوٹا بتلایا اور ان (کی حقیقت میں غور کرنے) سے غافل رہے (یہ سزا تو دنیا میں ہوئی کہ ہدایت سے محروم رہے) اور (آخرت میں یہ سزا ہوگی کہ) یہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو اور قیامت کے پیش آنے کو جھٹلایا ان کے سب کام (جن سے ان کو توقع نفع کی تھی) غارت گئے (اور انجام اس جہنم کا ہے) ان کو وہی سزا دی جائے گی جو کچھ یہ کرتے تھے اور (جب موسیٰ علیہ السلام) طور پر تورات لانے تشریف لے گئے تو (موسیٰ علیہ السلام) کی قوم (یعنی بنی اسرائیل) نے ان کے (جہانے کے) بعد اپنے (مقبوضہ) زبوروں کا (جو کہ قبیلوں سے مصر سے نکلتے وقت یہ بہانہ شادی کے مانگ لیا تھا) ایک بچھڑا (بنا کر جس کا قصہ سورۃ طہ میں ہے، اس کو معبود) ٹھہرایا جو کہ (صرف اتنی حقیقت رکھتا تھا کہ) ایک قالب تھا جس میں ایک آواز تھی (اور اس میں کوئی کمال نہ تھا، جس سے کسی عاقل کو اس کی معبودیت کا شبہ ہو سکے) کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ (اس میں آدمی کے برابر بھی تو قدرت نہ تھی چنانچہ وہ ان سے بات تک نہیں کرتا تھا اور نہ ان کو (دنیا یا دین کی) کوئی راہ بتلاتا تھا) اور خدا کی سی صفات تو اس میں کیا ہوتیں، غرض یہ کہ (اس (بچھڑے) کو انہوں نے معبود قرار دیا اور (چونکہ اس میں اصلاً کوئی شبہ کی وجہ نہ تھی اس لئے انہوں نے) بڑا بے ڈھنگا کام کیا اور (بعد جوع موسیٰ علیہ السلام کے جس کا قصہ آگے آتا ہے ان کے تنبیہ فرمانے سے) جب (متنبہ ہوئے اور اپنی اس حرکت پر) نادم ہوئے اور معلوم ہوا کہ واقعی وہ لوگ گمراہی میں پڑ گئے تو (ندامت سے بطور معذرت) کہنے لگے کہ اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے اور ہمارا (یہ) گناہ معاف نہ کرے تو ہم بالکل گئے گزرے (چنانچہ خاص طریقہ سے ان کو تکمیل توبہ کا حکم ہوا جس کا قصہ سورۃ بقرہ آیت فَاَقْبِلُوْا اَنْفُسَكُمْ میں گزرا ہے) اور (موسیٰ علیہ السلام کو متنبہ فرمانے کا قصہ یہ ہوا کہ) جب موسیٰ (علیہ السلام) اپنی قوم کی طرف (طور سے) واپس آئے غصہ اور رنج میں بھرے ہوئے (کیونکہ ان کو وحی سے یہ معلوم ہو گیا تھا، طہ میں ہے قَالَ فَاِذَا قَدْ فَتَنَّا الْاٰمِلِيْنَ) تو (اول قوم کی طرف متوجہ ہوئے) فرمایا کہ تم نے میرے بعد یہ بڑی نامعقول حرکت کی، کیا اپنے رب کے حکم (آنے سے پہلے ہی تم نے) (ایسی) جلد بازی کرنی (میں تو احکام ہی لینے گیا تھا اس کا انتظار تو کیا ہوتا) اور (پھر حضرت ہارون علیہ السلام

کی طرف متوجہ ہوئے اور دینی حمیت کے جوش میں (جلدی سے (توریت کی) تختیاں (تو) ایک طرف رکھیں (اور جلدی میں ایسے زور سے رکھی گئیں کہ دیکھنے والے کو اگر غور نہ کرے تو شبہ ہو کہ جیسے کسی نے پٹک دی ہوں) اور ہاتھ خالی کر کے) اپنے بھائی (ہارون علیہ السلام) کا سر (یعنی بال) پکڑ کر ان کو اپنی طرف گھسیٹنے لگے (کہ تم نے کیوں پورا انتظام نہ کیا اور چونکہ غلبہ غضب میں ایک گونہ بے اختیاری ہو گئی تھی اور غضب بھی دین کے لئے تھا اس لئے اس بے اختیاری کو معتبر قرار دیا جائے گا اور اس اجتہادی لغزش پر اعتراض نہ کیا جائے گا) ہارون (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے ماں جائے (بھائی میں نے اپنی کوشش بھر بہت روکا لیکن) ان لوگوں نے مجھ کو بے حقیقت سمجھا اور (بلکہ نصیحت کرنے پر) قریب تھا کہ مجھ کو قتل کر ڈالیں تو تم مجھ پر سختی کر کے (دشمنوں کو مت ہنسواؤ اور مجھ کو (دیر تاؤ سے) ان ظالم لوگوں کے ذیل میں مت شمار کرو) کہ ان کی سی ناخوشی مجھ سے بھی برتنے لگو (موسیٰ علیہ السلام) نے (اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور) کہا کہ اے میرے رب میری خطا (گو وہ اجتہادی ہو) معاف فرما دے اور میرے بھائی کی بھی (کو تا ہی) جو ان مشرکین کے ساتھ معاملہ متارکت میں شاید ہو گئی ہو جیسا اس قول سے معلوم ہوتا ہے، مَا مَنَعَكَ إِذْ تَرَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا أَلَّا تَتَّبِعَنِ الْاٰیۃِ) اور ہم دونوں کو اپنی رحمت (خاص) میں داخل فرمائیے اور آپ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں (اس لئے ہم کو قبول دعا کی امید ہے)

معارف و مسائل

پہلی آیت میں جو ارشاد فرمایا کہ ”میں پچھیر دوں گا اپنی آیتوں سے ان لوگوں کو جو بڑے بننے میں زمین میں بغیر حق کے“

اس میں بغیر حق سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تکبر کرنے والوں کے مقابلہ میں تکبر کرنا حق ہے وہ بُرا اور گناہ نہیں، کیونکہ وہ صرف صورت کے اعتبار سے تکبر ہوتا ہے حقیقت کے اعتبار سے نہیں ہوتا، جیسا کہ مشہور ہے التَّكْبَرُ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّكِبِينَ تَوَاضَعُ (مسائل السلوک) تکبر انسان کو فہم سلیم اور علوم اور تکبر کرنے والوں یعنی بڑے بننے والوں کو اپنی آیتوں سے پچھیر دینے الہیہ سے محروم کر دیتا ہے کا مطلب یہ ہے کہ اُن سے آیات الہیہ کے سمجھنے اور ان سے فائدہ

اٹھانے کی توفیق سلب ہو جاتی ہے، اور آیات الہیہ بھی اس جگہ عام مراد ہو سکتی ہیں، جن میں آیات منزلہ تورات و انجیل کی یا قرآن کریم کی بھی داخل ہیں اور آیات تکوینیہ جو تمام زمین و آسمان اور اُن کی مخلوقات میں پھیلی ہوئی ہیں، اس لئے خلاصہ مضمون آیت کا یہ ہوا کہ تکبر یعنی اپنے آپ

کو دوسروں سے بڑا اور افضل سمجھنا ایسی مذموم اور منحوس خصلت ہے کہ جو شخص اس میں مبتلا ہوتا ہے اس کی عقل و فہم سلیم نہیں، اسی لئے وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کے سمجھنے سے محروم ہو جاتا ہے نہ اس کو قرآنی آیات صحیح سمجھنے کی توفیق باقی رہتی ہے اور نہ آیات قدرت میں غور و فکر کر کے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے میں اس کا ذہن چلتا ہے۔

روح البیان میں ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ تکبر اور نخوت ایک ایسی بُری خصلت ہے جو علوم ربانیہ کے لئے حجاب بن جاتی ہے کیونکہ علوم ربانیہ صرف اس کی رحمت سے حاصل ہوتے ہیں اور رحمت خداوندی تواضع سے متوجہ ہوتی ہے، مولانا رومی نے خوب فرمایا ہے۔
ہر کجا پستی ست آب آنجا رود ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

پہلی دو آیتوں میں یہ مضمون ارشاد فرمانے کے بعد پھر موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا باقی قصہ اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ :

جب موسیٰ علیہ السلام تورات حاصل کرنے کے لئے کوہ طور پر متکف ہوئے اور شروع میں تیس دن رات کے اعتکاف کا حکم تھا اور اس کے مطابق اپنی قوم سے کہہ گئے تھے کہ تیس دن بعد لوٹیں گے، وہاں حق تعالیٰ نے اس پر دس روز کی میعاد اور بڑھادی تو اسرائیلی قوم جسکی جلد بازی اور کج روی پہلے سے معروف تھی، اس وقت بھی طرح طرح کی باتیں کرنے لگے، ان کی قوم میں ایک شخص سامری نام کا تھا، جو اپنی قوم میں بڑا اور چودھری مانا جاتا تھا، مگر کچھ عقیدہ کا آدمی تھا اس نے موقع پا کر یہ حرکت کی کہ بنی اسرائیل کے پاس کچھ زیورات قوم فرعون کے لوگوں کے رہ گئے تھے ان سے کہا کہ یہ زیورات تم نے قبطنی لوگوں سے مستعار طور پر لیے تھے اب وہ سب غرق ہو گئے اور زیورات تمہارے پاس رہ گئے، یہ تمہارے لئے حلال نہیں، کیونکہ کفار سے جنگ کے وقت حاصل شدہ مال غنیمت بھی اس زمانہ میں مسلمانوں کے لئے حلال نہیں تھا، بنی اسرائیل نے اس کے کہنے کے مطابق سب زیورات لا کر اس کے پاس جمع کر دیئے، اس نے اس سونے چاندی سے ایک بچھڑے یا گائے کا مجسمہ بنایا، اور جبریل امین کے گھوڑے کے سم کے نیچے کی مٹی جو اس نے کہیں پہلے سے جمع کر رکھی تھی اس مٹی میں اللہ تعالیٰ نے حیات و زندگی کا خاصہ رکھا تھا، اس نے سونا چاندی آگ پر پگھلانے کے وقت یہ مٹی اس میں شامل کر دی اس کا یہ اثر ہوا کہ اس گائے کے مجسمہ میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے اور اس کے اندر سے گائے کی سی آواز نکلنے لگی، اس جگہ آیت میں عجلہ کی تفسیر جسدا لکھ خوار فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے۔

سامری کی یہ حیرت انگیز شیطانی ایجاد سامنے آئی تو اس نے بنی اسرائیل کو اس کفر کی

دعوت دنیا شروع کر دی کہ یہی خدا ہے، موسیٰ علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے کے لئے کوہ طوہ پر گئے ہیں اور اللہ میاں (معاذ اللہ) خود یہاں آگئے موسیٰ علیہ السلام سے بھولی ہو گئی بنی اسرائیل میں اس کی بات پہلے سے مانی جاتی تھی اور اس وقت تو یہ شعبہ بھی اس نے دکھلا دیا تو اور بھی معتقد ہو گئے اور اسی گائے کو خدا سمجھ کر اس کی عبادت میں لگ گئے۔

مذکورہ تیسری آیت میں اس مضمون کا بیان اختصار کے ساتھ آیا ہے، اور قرآن کریم میں دوسری جگہ اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

چوتھی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ کے بعد بنی اسرائیل کے نادیم ہو کر توبہ کرنے کا ذکر ہے، اس میں سَقَطَ فِيْ اَيِّدِیْہُمْ کے معنی عربی محاورہ کے موافق نادیم ٹھہرنا ہونے کے ہیں۔

پانچویں آیت میں اس واقعہ کی تفصیل ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے تورات لے کر واپس آئے اور قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھا تو اگرچہ قوم کی اس گمراہی کی خبر حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور ہی پر کر دی تھی، لیکن سننے اور دیکھنے میں فرق ہوتا ہے جب ان لوگوں کو دیکھا کہ گائے کی پوجا پاٹ کر رہے تو غصہ کی انتہا نہ رہی۔

پہلے اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا بِسْمِہَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ بَعْدِیْ یعنی تم نے میرے بعد یہ بڑی نامعقول حرکت کی ہے اِنۡجَلْتُمْ اَمْرًا دَیۡکُمۡ کیا تم نے اپنے رب کا حکم آنے سے جلد بازی کی، یعنی اللہ کی کتاب تورات کے آنے کا انتظار تو کر لیتے، تم نے اُس سے جلد بازی کر کے یہ گمراہی اختیار کر لی، اور بعض مفسرین نے اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ کیا تم نے جلد بازی کر کے یہ قرار دے لیا تھا کہ میری موت آگئی۔

اس کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے کہ ان کو اپنا خلیفہ بنا کر گئے تھے انہوں نے اس گمراہی سے ان لوگوں کو کیوں نہ روکا، اُن کی طرف ہاتھ بڑھانے کے لئے ہاتھ کو خالی کرنے کی فکر ہوئی تو تورات کی تختیاں جو ہاتھ میں لئے ہوئے تھے جلدی سے رکھ دیں اسی کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا وَ اَلْقٰی الْاَلْوَاحَ ، اَلْقَاءَ کے لغوی معنی ڈال دینے کے ہیں، اور اَلْوَاح ، نُوح کی جمع ہے جس کے معنی ہیں تختی، یہاں لفظ اَلْقَاءَ سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غصہ کی حالت میں تورات کی تختیوں کی بے ادبی کی کہ اُن کو ڈال دیا۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ الواح تورات کو بے ادبی کے ساتھ ڈال دینا گناہ عظیم ہے اور انبیاء علیہم السلام سب گناہوں سے معصوم ہیں، اس لئے مراد آیت کی یہی ہے کہ اصل مقصود حضرت

ہارون علیہ السلام کو پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ خالی کرنا تھا اور غصہ کی حالت میں جلدی سے ان کو رکھا، جس سے دیکھنے والا یہ سمجھے کہ ڈال دیا، اس کو قرآن کریم نے بطور تنبیہ کے ڈالنے کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ (بیان القرآن)

اس کے بعد اس خیال پر کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنے فرائض قائم مقامی میں کوتاہی کی ہے ان کے سر کے بال پکڑ کر کھینچنے لگے تو حضرت ہارونؑ نے عرض کیا کہ میرا قصور نہیں قوم نے میرا کوئی اثر نہ لیا اور میری بات نہ سنی بلکہ قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر ڈالتے اس لئے آپ میرے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے میرے دشمن خوش ہوں اور آپ مجھے ان گمراہوں کے ساتھ نہ سمجھیں، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ فرو ہوا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاٰخِيْ وَادْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّحِيْمِيْنَ، یعنی اے میرے پروردگار مجھے بھی معاف فرمادیجئے اور میرے بھائی کو بھی اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل فرمادیجئے اور آپ تو سب رحمت کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں۔

اس میں اپنے بھائی ہارون کے لئے تو اس بنا پر دعائے مغفرت کی کہ شاید ان سے کوئی کوتاہی قوم کو گمراہی سے روکنے میں ہوئی ہو اور اپنے لئے دعائے مغفرت یا تو اس بنا پر کہ جلدی کے ساتھ الواح تورات کو رکھ دینا جس کو قرآن کریم نے ڈال دینے سے تعبیر کر کے ایک غلطی پر متنبہ فرمایا ہے اس سے مغفرت طلب کرنا مقصود تھا۔ اور یا یہ کہ دعاء کا ادب ہی یہ ہے کہ دوسرے کے لئے دعا کرے تو اپنے آپ کو بھی اس میں شامل کرے تاکہ اس کا استغفار محسوس نہ ہو یعنی یہ کہ یہ اپنے آپ کو دعاء کا محتاج نہیں سمجھتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ

البتہ جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا ان کو پہنچے گا غضب ان کے رب کا

وَذٰلِكَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ط وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿٥٧﴾ وَ

اور ذلت دنیا کی زندگی میں اور یہی سزا دیتے ہیں ہم بہتان باندھنے والوں کو اور

الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَامْنُوْا اِنَّ

جنہوں نے کئے برے کام پھر توبہ کی اس کے بعد اور ایمان لائے تو بیشک

رَبُّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٥٨﴾ وَلَهَا سَكَنٌ

تیرا رب توبہ کے پیچھے البتہ بخشنے والا مہربان ہے اور جب عہم گیا موسیٰ کا

مُّوْسٰى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ فِيْ سُخْتِهَآ هٰدًى وَّ

غصہ تو اس نے اٹھالیا تختیوں کو اور جوان میں لکھا ہوا تھا اس میں ہدایت اور

سَرَحْمَةً لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ﴿۵۴﴾ وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ

رحمت تھی ان کے واسطے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور چن لئے موسیٰ نے اپنی قوم

سَبْعِينَ سَرَجَلًا لِّمِيقَاتِنَا ۖ فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ ۖ وَقَالَ

میں سے ستر مرد ہمارے وعدہ کے وقت پر لانے کو، پھر جب ان کو زلزلہ نے پکڑا تو بولا

رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُم مِّن قَبْلُ وَإِنِّي أَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ

اے رب میرے اگر تو چاہتا تو پہلے ہی ہلاک کر دیتا ان کو اور مجھ کو کیا ہم کو ہلاک کرتا ہے اس کا پر

السُّفَهَاءُ مِمَّا إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ ۖ تُضِلُّ بِهَا مَن تَشَاءُ ۚ وَ

جو کیا ہماری قوم کے احمقوں نے یہ سب تیری آزمائش ہے بچلاوے اس میں جس کو تو چاہے اور

تَهْدِي مَن تَشَاءُ ۚ أَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ۚ وَأَنْتَ

سیدھا رکھے جس کو چاہے تو ہی ہے ہمارا بھائی والا سو بخش دے ہم کو اور رحمت کر ہم پر اور تو

خَيْرُ الْغَافِرِينَ ﴿۵۵﴾ وَكَتُبْنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً ۚ وَ

سب سے بہتر بخشنے والا ہے اور لکھ دے ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی اور

فِي الْآخِرَةِ إِنَّا هَذَا نَا إِلَيْكَ ۖ قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَن

آخرت میں ہم نے رجوع کیا تیری طرف فرمایا میرا عذاب ڈالتا ہوں میں اس کو جس پر

أَشَاءُ ۚ وَسَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَاكْتُبُهَا لِّلَّذِينَ

چاہوں اور میری رحمت شامل ہے ہر چیز کو سو اس کو لکھ دوں گا ان کے لئے

يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ﴿۵۶﴾

جو ڈر رکھتے ہیں اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور جو ہمارے باتوں پر یقین رکھتے ہیں -

خلاصہ تفسیر

پھر حق تعالیٰ نے ان کو سالہ پرستوں کے متعلق موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ جن لوگوں نے گو سالہ پرستی کی ہے (اگر اب بھی توبہ نہ کریں گے تو) ان پر بہت جلد ان کے رب کی طرف سے غضب اور ذلت اس دنیاوی زندگی ہی میں پڑے گی اور (کچھ ان ہی کی تخصیص نہیں) ہم (تو) افسر پر دازوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں (کہ دنیا ہی میں مغضوب اور ذلیل ہو جاتے ہیں گو کسی عارض سے اس ذلت کا گاہے ظہور نہ ہو یا دیر میں ہو، چنانچہ سامری نے جو توبہ نہ کی، اس پر غضب اور ذلت کا نزول ہوا جس کا قصہ سورۃ طہ میں ہے، قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ الْآيَةِ) اور جن لوگوں نے گناہ کے کام کئے (مثلاً گو سالہ پرستی ان

سے سرزد ہو گئی مگر پھر وہ ان (گناہوں) کے (کرنے کے) بعد توبہ کر لیں اور (اس کفر کو چھوڑ کر) ایمان لے آئیں، تمہارا رب اس توبہ کے بعد (ان کے) گناہ کا معاف کر دینے والا (اور ان کے حال پر) رحمت کرنے والا ہے (گو تکمیل توبہ کے لئے اَقْتُلُواْ اَنْفُسَكُمْ کا بھی حکم ہوا ہو کیونکہ اصل رحمت آخرت کی ہے چنانچہ تائبین کی خطا اسی طرح معاف ہوئی) اور جب ر ہارون علیہ السلام کی یہ معذرت سن کر (موسیٰ علیہ السلام) کا غصہ فرو ہوا تو ان تختیوں کو اٹھا لیا اور ان (تختیوں) کے مضامین میں ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرتے تھے ہدایت اور رحمت تھی (مراد احکام ہیں کہ ان پر عمل کرنے سے موصوف بہ ہدایت اور موعود برحمت ہوتا ہے) اور جب گوسالہ کا قصہ تمام ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے اطمینان سے تورات کے احکام سنا، ان لوگوں کی عادت تھی ہی شبہات نکالنے کی، چنانچہ اس میں بھی شبہ نکالا کہ ہم کو کیسے معلوم ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں، ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں تو یقین کیا جائے، آپ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا، وہاں سے حکم ہوا کہ ان میں کے کچھ آدمی جن کو یہ لوگ معتبر سمجھتے ہوں منتخب کر کے ان کو کوہ طور پر لے آؤ ہم خود ان سے کہہ دیں گے کہ یہ ہمارے احکام ہیں اور اس لانے کے لئے ایک وقت معین کیا گیا چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ستر آدمی اپنی قوم میں سے ہمارے وقت معین پر لانے کے لئے منتخب کئے (چنانچہ وہاں پہنچ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا تو اس میں ایک شاخ نکالی اور کہنے لگے کہ خدا جانے کون بول رہا ہوگا ہم تو جب یقین لائیں کہ خدا تعالیٰ کو کھلم کھلا اپنی آنکھ سے دیکھ لیں، لِقَوْلِهِ تَعَالٰی لَنْ تُؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی نَرٰی اللّٰہَ جَهْرَةً، خدا تعالیٰ نے اس گستاخی کی سزا دی نیچے سے زلزلہ شدید شروع ہوا اوپر سے ایسی کڑک بجلی ہوئی کہ سب وہاں ہی رہ گئے) سو جب ان کو زلزلہ (وغیرہ) نے آپکڑا تو موسیٰ علیہ السلام ڈرے کہ بنی اسرائیل جاہل اور بدگمان تو ہیں ہی، یوں سمجھیں گے کہ کہیں لے جا کر کسی طریق سے ان سب کا کام تمام کر دیا ہے گھبرا کر) عرض کرنے لگے کہ اے میرے پروردگار (یہ تو مجھ کو یقین ہے کہ ان لوگوں کو محض سزا دینا منظور ہے خاص ہلاک کرنا مقصود نہیں کیونکہ) اگر آپ کو یہ منظور ہوتا تو آپ اس کے قبل ہی ان کو اور مجھ کو ہلاک کر دیتے (کیونکہ ان کا اس وقت ہلاک ہونا بنی اسرائیل کے ہاتھوں میرا ہلاک ہونا ہے سو اگر آپ کو یہ مقصود ہوتا تو آپ پہلے بھی ایسا کر سکتے تھے مگر جب ایسا نہیں کیا تو معلوم ہو گیا کہ ان کو بھی ہلاک کرنا مقصود نہیں کیونکہ اس سے میری ہلاکت بھی ہے اور بدنامی کے ساتھ، آپ سے امید ہے کہ مجھ کو بدنام نہ کریں گے اور بھلا) کہیں آپ ہم میں کے چند بے وقوفوں کی حرکت پر سب کو ہلاک کر دیں گے (کہ بے وقوفی تو کریں یہ لوگ کہ ایسی گستاخی کریں اور ساتھ میں بنی اسرائیل کے ہاتھ سے ہلاک ہوں میں بھی، آپ سے امید ہے کہ آپ ایسا نہ کریں گے

پس ثابت ہوا کہ یہ واقعہ (رجفہ اور صاعقہ کا) محض آپ کی طرف سے ایک امتحان ہے، ایسے امتحانات سے جس کو آپ چاہیں گمراہی میں ڈال دیں کہ حق تعالیٰ کی شکایت اور ناشکری کرنے لگے، اور جس کو آپ چاہیں ہدایت پر قائم رکھیں کہ اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھتا ہے سو میں آپ کے فضل و کرم سے آپ کے حکیم ہونے کا علم رکھتا ہوں لہذا اس امتحان میں مطمئن ہوں اور آپ ہی تو ہمارے خبر گیراں ہیں ہم پر مغفرت اور رحمت فرمائیے اور آپ سب معافی دینے والوں سے زیادہ ہیں (سوان کی گستاخی بھی معاف کر دیجئے چنانچہ وہ لوگ صحیح سالم اٹھ کھڑے ہوئے، سورۃ بقرہ میں تفصیل ملاحظہ ہو) اور اس دُعا کے ساتھ آپ نے تفصیل رحمت کے لئے یہ بھی دُعا کی کہ ہم لوگوں کے نام دنیا میں بھی نیک حالی لکھ دیجئے اور (اسی طرح) آخرت میں بھی (کیونکہ ہم آپ کی طرف (خلوص و اطاعت کے ساتھ) رجوع کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دُعا قبول کی اور فرمایا کہ اے موسیٰ اول تو مطلقاً میری رحمت میرے غضب پر سابق ہے چنانچہ میں اپنا عذاب (اور غضب) تو اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں (گو مستحق عذاب ہر نافرمان ہوتا ہے لیکن پھر بھی سب پر واقع نہیں کرتا بلکہ ان میں سے خاص خاص لوگوں پر واقع کرتا ہوں جو غایت درجہ کبرکش اور متکبر ہوتے ہیں) اور میری رحمت (ایسی عام ہے کہ) تمام اشیاء کو محیط ہو رہی ہے (باوجودیکہ ان میں بہت سی مخلوق مثلاً سرکش و معاند لوگ اس کے مستحق نہیں مگر ان پر بھی ایک گونہ رحمت ہے گو دنیا ہی میں سہی، پس جب میری رحمت غیر مستحقین کے لئے بھی عام ہے، تو وہ رحمت ان لوگوں کے نام تو (کامل طور پر) ضرور ہی لکھوں گا جو کہ (اس کے حسب وعدہ مستحق بھی ہیں بوجہ اس کے کہ وہ اطاعت کرتے ہیں چنانچہ) خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں (جو منجملہ اعمالِ قلب سے ہے) اور زکوٰۃ دیتے ہیں (جو کہ اعمالِ جوارح سے ہے) اور جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں (جو کہ عقائد میں سے ہے، تو ایسے لوگ تو پہلے سے مستحق رحمت ہیں گو آپ درخواست بھی نہ کرتے اور اب تو آپ درخواست بھی کر رہے ہیں اِذْ حَمْنَا وَ اَكْتَبْنَا لَنَا، پس ہم بشارت قبول دیتے ہیں کیونکہ آپ تو ایسے ہی ہیں اور آپ کی قوم میں بھی جو موردِ رحمت بننا چاہے وہ ایسے ہی اوصاف اختیار کرے کہ مستحق ہو جائے)

معارف و مسائل

یہ سورۃ اعراف کا انیسواں رکوع ہے، اس کی پہلی آیت میں گو سالہ پرستی کرنے والے اور اُس پر قائم رہنے والے بنی اسرائیل کے انجامِ بد کا ذکر ہے کہ آخرت میں ان کو رب العالمین کے غضب سے سابقہ پڑے گا جس کے بعد کہیں پناہ کی جگہ نہیں اور دنیا میں اس کو ذلت و خواری

نصیب ہوگی۔

بعض گناہوں کی کچھ سزا
 دنیا میں بھی ملتی ہے
 جیسے سامری اور اس کے ساتھیوں کا حال ہے کہ انہوں نے گوسالہ پرستی
 سے صحیح توبہ نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا میں ہی خوار و ذلیل کر دیا کہ اس
 کو موسیٰ علیہ السلام نے یہ حکم دے دیا کہ وہ سب لوگوں سے الگ رہے نہ وہ کسی کو ہاتھ لگائے نہ کوئی
 اس کو ہاتھ لگائے، چنانچہ وہ عمر بھر اسی طرح جانوروں کے ساتھ پھرتا رہا کوئی انسان اس کے
 پاس نہ آتا تھا۔

تفسیر قرطبی میں بروایت قتادہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ عذاب مسلط کر دیا تھا
 کہ جب کوئی اس کو ہاتھ لگائے یا وہ کسی کو ہاتھ لگائے تو فوراً دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا (قرطبی)
 اور تفسیر روح البیان میں ہے کہ یہ خاصیت اس کی نسل میں بھی آج تک باقی ہے، اور
 آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ یعنی جو لوگ اللہ پر افتراء کرتے ہیں
 ان کو ایسی ہی سزا دی جاتی ہے، سفیان بن عیینہ نے فرمایا کہ جو لوگ دین میں بدعت اختیار کرتے ہیں
 وہ بھی اس افتراء علی اللہ کے مجرم ہو کر اس سزا کے مستحق ہوتے ہیں (منظہری)

امام مالکؒ نے اسی آیت سے استدلال کر کے فرمایا کہ دین میں اپنی طرف سے بدعات ایجاد کرنے
 والوں کی یہی سزا ہے کہ آخرت میں غضب الہی کے مستحق ہوں گے اور دنیا میں ذلت کے (قرطبی)
 دوسری آیت میں ان لوگوں کا حال مذکور ہے جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ کے
 بعد اپنے اس جرم سے توبہ کر لی اور توبہ کے لئے جو کڑی شرط اللہ تعالیٰ کی طرف سے لگائی گئی تھی
 کہ یہ سب لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کریں تب ان کی توبہ قبول ہوگی، یہ لوگ حکم بجالائے
 تو موسیٰ علیہ السلام نے حکم خداوندی ان کو بلایا کہ تم سب کی توبہ قبول ہوگئی، اس قتل عام میں جو
 لوگ مارے گئے وہ شہید ہوئے جو باقی رہے ان کی مغفرت ہوگئی، اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ
 جو لوگ برے اعمال کے مرتکب ہوں، خواہ کیسے ہی بڑے گناہ کفر و معصیت کے ہوں اگر وہ اس
 کے بعد توبہ کر لیں اور ایمان کو درست کر لیں معنی مقتضائے ایمان کے مطابق اپنے اعمال کی اصلاح
 کر لیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی رحمت سے معاف فرما دیں گے، اس لئے انسان کو چاہئے کہ جب
 کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کی طرف رجوع کرے۔

تیسری آیت میں اس کا بیان ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ فرو ہوا تو تورات
 کی تختیاں جو چلدری سے رکھ دی تھیں پھر اٹھالیں، اور اس کے نسخہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں
 کے لئے ہدایت اور رحمت تھی۔

لفظ نُسَخَہ اس تحریر کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی کتاب وغیرہ سے نقل کی جائے، بعض

روایات میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات کی تختیاں جلدی سے رکھیں تو وہ ٹوٹ گئی تھیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو کسی دوسری چیز میں لکھا ہوا عطا فرمایا، اس کو نسخہ کہا گیا ہے ستر بنی اسرائیل کا انتخاب ہو تھی آیت میں ایک خاص واقعہ کا ذکر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اوران کی ہلاکت کا واقعہ جب اللہ تعالیٰ کی کتاب تورات لا کر بنی اسرائیل کو دی تو اپنی کج روی اور حیلہ جوئی کی وجہ سے کہنے لگے کہ ہمیں یہ کیسے یقین آئے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے، ممکن ہے آپ اپنی طرف سے لکھ لائے ہوں، ان کو اطمینان دلانے کے لئے موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی تو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد ہوا کہ اس قوم کے منتخب آدمیوں کو آپ کو وہ طور پر لے آئیں تو ہم ان کو بھی خود اپنا کلام سنا دیں گے جس سے ان کو یقین آجائے، موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا اور کوہ طور پر لے گئے، حسب وعدہ انہوں نے اپنے کالوں اللہ تعالیٰ کا کلام سن لیا، مگر جب یہ حجت بھی پوری ہو گئی تو کہنے لگے ہمیں کیا معلوم یہ آواز اللہ تعالیٰ ہی کی ہے یا کسی اور کی، ہم تو جب یقین کریں جب کھلم کھلا اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں، ان کا یہ سوال چونکہ ہٹ دھرمی اور جہالت پر مبنی تھا، اس پر غضب الہی متوجہ ہوا، اُن کے نیچے سے زلزلہ آیا اور اوپر سے بجلی کی کڑک آئی جس سے یہ بیہوش ہو کر گر گئے اور بظاہر مردہ ہو گئے، سورۃ بقرہ میں اس جگہ صاعقہ کا لفظ آیا ہے اور یہاں رجفہ کا، صاعقہ کے معنی بجلی کی کڑک اور رجفہ کے معنی زلزلہ کے ہیں، اس میں کوئی بعد نہیں کہ دونوں چیزیں جمع ہو گئی ہوں۔

بہر حال یہ لوگ ایسے ہو کر گر گئے جیسے مردے ہوتے ہیں خواہ حقیقتہً مر ہی گئے ہوں یا ظاہر میں مردہ نظر آتے ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس واقعہ سے سخت صدمہ پہنچا، اول تو اس لئے کہ یہ لوگ اپنی قوم کے منتخب لوگ تھے، دوسرے اس لئے کہ اب اپنی قوم میں جا کر کیا جواب دیں گے وہ یہ تہمت لگائیں گے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان سب کو کہیں لے جا کر قتل کر دیا ہے اور اس تہمت کے بعد یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ لوگ مجھے قتل کر ڈالیں گے، اس لئے اللہ جل شانہ سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں جانتا ہوں کہ اس واقعہ سے آپ کا مقصود ان کو ہلاک کرنا نہیں کیونکہ اگر یہ مقصود ہوتا تو اب سے پہلے بہت سے واقعات تھے جن میں یہ ہلاک کئے جاسکتے تھے، فرعون کے ساتھ غرق کر دیئے جاتے یا گوسالہ پرستی کے وقت سب کے سامنے ہلاک کر دیئے جاتے اور آپ چاہتے تو مجھے بھی ان کے ساتھ ہلاک کر دیتے مگر آپ نے یہ نہیں چاہا تو معلوم ہوا کہ اس وقت بھی ان کا ہلاک کرنا مقصود نہیں بلکہ سزا دینا اور تنبیہ کرنا مقصود ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ہم سب کو چند بے وقوفوں کے عمل کی وجہ سے ہلاک کر دیں۔ اس جگہ اپنے آپ کو ہلاک کرنا اس لئے ذکر کیا کہ ان ستر آدمیوں کی اس طرح غائبانہ ہلاکت کا نتیجہ یہی تھا کہ موسیٰ علیہ السلام

اپنی قوم کے ہاتھوں ہلاک کئے جائیں۔

پھر عرض کیا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ محض آپ کا امتحان ہے جس کے ذریعہ آپ بعض لوگوں کو گمراہ کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی شکایت و ناشکری کرنے لگیں، اور بعض کو ہدایت پر قائم رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں، میں بھی آپ کے فضل سے آپ کے حکیم ہونے کا علم رکھتا ہوں لہذا اس امتحان میں مطمئن ہوں اور آپ ہی تو ہمارے خبر گیراں ہیں، ہم پر مغفرت اور رحمت فرمائیے اور آپ سب معافی دینے والوں سے زیادہ معافی دینے والے ہیں اس لئے ان کی اس گستاخی کو بھی معاف کر دیجئے، چنانچہ وہ سب لوگ صحیح سالم اٹھ کھڑے ہوئے اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ ستر آدمی جن کا ذکر اس آیت میں ہے وہ نہیں جنہوں نے اَرِنَا اللّٰہَ جَهَنَّمَ کی درخواست کی تھی اور اس پر صاعقہ کے ذریعہ ہلاک کئے گئے تھے بلکہ یہ وہ لوگ تھے جو خود تو گوسالہ پرستی میں شریک نہ تھے مگر قوم کو اس حرکت سے روکنے کی کوئی کوشش بھی نہ کی تھی اس کی سزا میں ان پر زلزلہ آیا اور بیہوش ہو گئے، واللہ اعلم۔ بہر حال یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے زندہ ہو کر کھڑے ہو گئے۔

پانچویں آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کا تکرار یہ بھی مذکور ہے، وَ اٰتٰنَا لَكَ اِنَّا هٰذَا نَا اَلَيْكَ، یعنی اے ہمارے پروردگار آپ ہمارے لئے اس دنیا میں بھی نیک حالی لکھ دیجئے اور آخرت میں بھی، کیونکہ ہم آپ کی طرف خلوص و اطاعت سے رجوع کرتے ہیں۔

اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا عَذَابِيْٓ اُصِيبُ بِہٖ مَنۡ اَشَاءُ وَاَوْزَجُہُیْ وَبِعَثۡ کُلِّ شَیْءٍ فَاَسَا کُتِبَہَا لِلَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ وَاَیُّوۡنَ الزَّکٰوٰۃَ وَالَّذِیۡنَ ہُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوۡنَ یعنی اے موسیٰ اول تو میری رحمت مطلقاً میرے غضب پر سابق ہے چنانچہ میں اپنا عذاب اور غضب تو صرف اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اگرچہ مستحق عذاب ہر نافرمان ہوتا ہے لیکن پھر بھی سب پر عذاب واقع نہیں کرتا، بلکہ ان میں سے خاص خاص لوگوں پر عذاب واقع کرتا ہوں جو انتہائی سرکش اور متمرد ہوتے ہیں، اور میری رحمت ایسی عام ہے کہ سب اشیاء کو محیط ہو رہی ہے باوجودیکہ ان میں سے بہت سے لوگ مثلاً سرکش اور نافرمان اس کے مستحق نہیں مگر ان پر بھی ایک گونہ رحمت ہے گو دنیا ہی میں سہی، پس جب میری رحمت سب غیر مستحقین کے لئے بھی عام ہے تو وہ رحمت ان لوگوں کے لئے تو کامل طور پر ضرور ہی لکھ دوں گا جو حسب وعدہ اس کے مستحق بھی ہیں بوجہ اس کے کہ اطاعت کرتے ہیں چنانچہ خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، تو یہ لوگ پہلے ہی سے مستحق رحمت ہیں اس لئے آپ کو قبول

دُعا کی بشارت دیتے ہیں۔

اس جواب کی تقریر میں حضرات مفسرین کے مختلف اقوال ہیں کیونکہ یہاں صاف لفظوں میں قبولیت دُعا مذکور نہیں، جیسے دوسرے مواقع میں صاف فرمادیا گیا قَدْ اُذِنَتْ لَكَ يٰمُوسٰی یعنی اے موسیٰ آپ کا سوال پورا کر دیا گیا، اور دوسری جگہ ارشاد ہے اُجِيبَتْ دَعْوٰیْکُمْ اِلٰی اَیّٰی مَوسٰی وَ هَارُونَ اَیّٰی اَیّٰی دُعا قبول کر لی گئی، یہاں اس طرح کی کوئی صراحت نہیں، اس لئے بعض حضرات نے ان آیات کا مفہوم یہ قرار دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی یہ درخواست اپنی امت کے بارے میں تو قبول نہ ہوئی البتہ امت محمدیہ کے حق میں قبول کر لی گئی جن کا ذکر بعد کی آیات میں وضاحت کے ساتھ آ رہا ہے، مگر تفسیر روح المعانی میں اس احتمال کو بعید قرار دیا ہے، اس لئے جواب کی صحیح تقریر یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے دو جز تھے ایک یہ کہ جن لوگوں پر عتاب و عذاب ہوا ہے ان کو معافی دی جائے اور ان پر رحمت کی جائے، دوسرا یہ کہ میرے لئے اور میری پوری قوم کے لئے دنیا و آخرت کی بھلائی مکمل لکھ دی جائے، پہلی دُعا کا جواب اس آیت میں مذکور ہے اور دوسری دعا کا جواب دوسری آیت میں مذکور ہے، پہلی آیت کا حاصل یہ ہے کہ میری عادت ہی یہ ہے کہ میں ہر گناہ گار پر عذاب نہیں کرتا بلکہ صرف ان پر جن کو میں (بوجہ انتہائی سرکشی کے) عذاب ہی دینا چاہتا ہوں اس لئے ان لوگوں کو بھی عذاب نہ دیا جائے گا آپ بے فکر رہیں، رہی رحمت کی درخواست سو میری رحمت تو ہر چیز پر حاوی اور محیط ہے انسان ہو یا غیر انسان، مؤمن ہو یا کافر، فرماں بردار ہو یا نافرمان، بلکہ جن کو دنیا میں کوئی عذاب و تکلیف دی جاتی ہے وہ بھی رحمت سے خالی نہیں ہوتے کم از کم یہ کہ جس مصیبت میں مبتلا ہیں اس سے بڑی مصیبت ان پر نہیں ڈالی گئی حالانکہ اللہ تعالیٰ کو اس پر بھی قدرت تھی۔

استاذ محترم حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے فرمایا کہ وسعت رحمت کے یہ معنی ہیں کہ رحمت کا دائرہ کسی سے تنگ نہیں، اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر چیز مرحوم ہے جیسا ابلیس ملعون نے کہا کہ میں بھی ایک شئی ہوں اور ہر شئی مرحوم ہے لہذا میں بھی مرحوم ہوں، قرآن کریم کے الفاظ میں اس طرف اشارہ موجود ہے کہ یوں نہیں فرمایا کہ ہر شئی پر رحمت کی جائے گی بلکہ یہ فرمایا کہ صفت رحمت تنگ نہیں وسیع ہے جس پر اللہ تعالیٰ رحمت فرمانا چاہیں فرما سکتے ہیں، قرآن کریم میں اس کی شہادت دوسری جگہ اس طرح آئی ہے فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبِّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسْعَیْ وَلَا تُؤْذُوا بَأْسًا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِ، یعنی اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو ان سے فرما دیجئے کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت والا ہے مگر مجرمین سے ان کے عذاب کو کوئی نہیں ٹال سکتا، اس میں بتلادیا کہ وسعت رحمت مجرمین پر عذاب کے منافی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی یہ دُعا ان لوگوں کے حق میں بلا کسی شرط کے قبول کر لی گئی یعنی مغفرت و معافی کی بھی اور رحمت کی بھی۔

اور دوسری دُعا رحیمیں دُنیا و آخرت کی مکمل بھلائی ان کے لئے لکھ دینے کی درخواست تھی اس کے متعلق چند شرائط لگائی گئیں، مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں تو ہر مؤمن و کافر پر رحمت عام ہو سکتی ہے مگر عالم آخرت اچھے بُرے کے امتیاز کا مقام ہے یہاں رحمت کے مستحق صرف وہ لوگ ہوں گے جو چند شرائط کو پورا کریں، اول یہ کہ وہ تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کریں، یعنی تمام واجباتِ شرعیہ کو ادا کریں اور ناجائز کاموں سے دُور رہیں، دوسرے یہ کہ وہ اپنے اموال میں سے اللہ تعالیٰ کے لئے زکوٰۃ نکالیں، تیسرے یہ کہ ہماری سب آیات پر بلا کسی استثناء اور تاویل کے ایمان لائیں، یہ موجودہ لوگ بھی اگر یہ صفات پوری اپنے اندر پیدا کر لیں تو ان کے لئے بھی دُنیا و آخرت کی مکمل بھلائی لکھ دی جائے گی۔

لیکن اس کے بعد کی آیت میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ ان صفات کو پوری جامعیت کے ساتھ حاصل کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو ان کے بعد آخر زمانہ میں آئیں گے اور نبیؐ احمی کا اتباع کریں گے، اور اس کے نتیجہ میں وہ مکمل فلاح کے مستحق ہوں گے۔

حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ جب آیت وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ نازل ہوئی تو ابلیس نے کہا کہ میں اس رحمت میں داخل ہوں، لیکن بعد کے جملوں میں بتلا دیا کہ رحمتِ آخرت ایمان وغیرہ کی شرائط کے ساتھ مشروط ہے، اس کو سن کر ابلیس مایوس ہو گیا، مگر یہود و نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ ہم میں تو یہ صفات بھی موجود ہیں یعنی تقویٰ اور ادا زکوٰۃ اور ایمان، مگر اس کے بعد جو شرطِ نبیؐ احمی پر ایمان لانے کی بیان ہوئی تو اس سے وہ یہود و نصاریٰ نکل گئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے۔

غرض اس اسلوبِ بدیع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبولیتِ دُعا کا بیان بھی ہو گیا اور امتِ محمدیہؐ کے مخصوص فضائل کا ذکر بھی۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ

وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی احمی ہے کہ جس کو پاتے ہیں

مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ

لکھا ہوا اپنے پاس تورات اور انجیل میں وہ حکم کرتا ہے ان کو نیک کام کا

وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ

منع کرتا ہے بُرے کام سے اور حلال کرتا ہے ان کے لئے سب پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر

الْخَبِيثَاتِ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ

ناپاک چیزوں اور اتارتا ہے ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ قیدیں جو ان پر تھیں

فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي

سو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کی رفاقت کی اور اس کی مدد کی اور تابع ہوئے اس نور کے جو

أُنْزِلَ مَعَهُ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٥٧﴾

اس کے ساتھ اُترتا ہے وہی لوگ پہنچے اپنی مراد کو ۔

خلاصہ تفسیر

جو لوگ ایسے رسول نبی اُمی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں (جن کی صفت یہ بھی ہے کہ) وہ ان کو نیک کاموں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتلاتے ہیں (گو وہ پہلی شرائع میں حرام تھیں) اور گندی چیزوں کو (بدستور) ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو (پہلے شرائع میں) بوجھ اور طوق (لدے ہوئے) تھے (یعنی سخت اور شدید احکام جن کا ان کو پابند کیا ہوا تھا) ان کو دور کرتے ہیں (یعنی ایسے سخت احکام ان کی شریعت میں منسوخ ہو جاتے ہیں) سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے (یعنی قرآن) ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں (کہ ابدی عذاب سے نجات پائیں گے)

معارف و مسائل

خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم | پچھلی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے جواب اور ان کی ائمت کے مخصوص صفات فضائل میں ارشاد ہوا تھا کہ یوں تو اللہ کی رحمت ہر چیز ہر شخص کے لئے وسیع ہے آپ کی موجودہ ائمت بھی اس سے محروم نہیں لیکن مکمل نعمت و رحمت کے مستحق وہ لوگ ہوں گے جو ایمان و تقویٰ اور زکوٰۃ وغیرہ کی مخصوص شرائط کو پورا کریں ۔

اس آیت میں ان لوگوں کا پتہ دیا گیا ہے کہ ان شرائط پر پورے اترنے والے کون لوگ ہوں گے اور بتلایا کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو رسول اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کریں، اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند خصوصی فضائل و کمالات اور علامات کا بھی ذکر فرما کر آپ پر حق ایمان لانے کا نہیں بلکہ آپ کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ فلاح آخرت کے لئے

ایمان کے ساتھ اتباع شریعت و سنت ضروری ہے۔

الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأَتَمِّ اس جگہ رسول اور نبی کے دو لقبوں کے ساتھ آپ کی ایک تیسری صفت اتمی بھی بیان کی گئی ہے، اتمی کے لفظی معنی اُن پڑھ کے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو، عام قوم عرب کو قرآن میں اُمّیین اسی لئے کہا گیا ہے کہ ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا اور اتمی ہونا کسی انسان کے لئے کوئی صفتِ مدح نہیں بلکہ ایک عیب سمجھا جاتا ہے، مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم و معارف اور خصوصیات اور حالات و کمالات کے ساتھ اتمی ہونا آپ کے لئے بڑی صفتِ کمال بن گئی ہے، کیونکہ اگر علمی عملی اخلاقی کمالات کسی لکھے پڑھے آدمی سے ظاہر ہوں تو وہ اس کی تعلیم کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن ایک اتمی محض سے ایسے پیش بہا علوم اور بے نظیر حقائق و معارف کا صدور اس کا ایک ایسا کھلا ہوا معجزہ ہے جس سے کوئی پرلے درجے کا معاند و مخالف بھی انکار نہیں کر سکتا، خصوصاً جب کہ آپ کی عمر شریف کے چالیس سال مکہ مکرمہ میں سب کے سامنے اس طرح گزرے کہ کسی سے نہ ایک حرف پڑھا نہ سیکھا ٹھیک چالیس سال کی عمر ہونے پر یکایک آپ کی زبان مبارک پر وہ کلام جاری ہوا جس کے ایک پھوٹے سے ٹکڑے کی مثال لانے سے ساری دنیا عاجز ہو گئی، تو ان حالات میں آپ کا اتمی ہونا آپ کے رسول من جانب اللہ ہونے اور قرآن کے کلام الہی ہونے پر ایک بہت بڑی شہادت ہے اس لئے اتمی ہونا اگرچہ دوسروں کے لئے کوئی صفتِ مدح نہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بہت بڑی صفتِ مدح و کمال ہے، جیسے متکبر کا لفظ عام انسانوں کے لئے صفتِ مدح نہیں بلکہ عیب ہے مگر حق تعالیٰ شانہ کے لئے خصوصیت سے صفتِ مدح ہے۔

آیت میں جو تھی صفت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگ آپ کو تورات و انجیل میں لکھا ہوا پائیں گے، یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ قرآن کریم نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ کی صفات و حالات کو لکھا ہوا پائیں گے بلکہ یَحِیْ وَنَا کا لفظ اختیار کیا گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو لکھا ہوا پائیں گے، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تورات و انجیل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات ایسی تفصیل و وضاحت کے ساتھ ہوں گی کہ ان کو دیکھنا ایسا ہوگا جیسے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا، اور تورات و انجیل کی تخصیص یہاں اس لئے کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل انھیں دو کتابوں کے قائل ہیں ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و صفات کا ذکر زبور میں بھی موجود ہے۔

آیت مذکورہ کے اصل مخاطب موسیٰ علیہ السلام ہیں جس میں اُن کو بتلایا گیا ہے کہ دنیا و آخرت کی مکمل فلاح آپ کی امت کے ان لوگوں کا حصہ ہے جو نبی اتمی خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ و

السلام کا اتباع کریں جن کا ذکر وہ تورات و انجیل میں لکھا ہوا پائیں گے۔

تورات و انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور علامات کے سبب قابلِ اعتماد نہیں رہی، اس کے باوجود اب بھی ان میں ایسے کلمات موجود ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پتہ دیتے ہیں، اور اتنی بات بالکل واضح ہے کہ جب قرآن کریم نے یہ اعلان کیا کہ خاتم الانبیاء کی صفات و علامات تورات و انجیل میں لکھی ہوئی ہیں، اگر یہ بات واقعہ کے خلاف ہوتی تو اس زمانہ کے یہود و نصاریٰ کے لئے تو اسلام کے خلاف ایک بہت بڑا ہتھیار ہاتھ آجاتا کہ اس کے ذریعہ قرآن کی تکذیب کر سکتے تھے کہ تورات و انجیل میں کہیں نبی اٹھی کے حالات کا ذکر نہیں، لیکن اس وقت کے یہود و نصاریٰ نے اس کے خلاف کوئی اعلان نہیں کیا، یہ خود اس پر شاہد ہے کہ اُس وقت تورات و انجیل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات و علامات واضح طور پر موجود تھیں جس نے ان لوگوں کی زبانوں پر مہر لگا دی۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات تورات و انجیل میں لکھی تھیں ان کا کچھ بیان تو قرآن کریم میں بحوالہ تورات و انجیل آیا ہے اور کچھ روایات حدیث میں ان حضرات سے منقول ہے جنہوں نے اصلی تورات و انجیل کو دیکھا اور ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک پڑھ کر ہی وہ مسلمان ہوئے۔

بیہقی نے دلائل النبوة میں نقل کیا ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا وہ اتفاقاً بیمار ہو گیا تو آپ اس کی بیمار پرسی کے لئے تشریف لے گئے تو دیکھا کہ اس کا باپ اس کے سر ہانے کھڑا ہوا تورات پڑھ رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا کہ اے یہودی میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی ہے کہ کیا تو تورات میں میرے حالات اور صفات اور میرے ظہور کا بیان پاتا ہے؟ اس نے انکار کیا تو بیٹا بولا یا رسول اللہ یہ غلط کہتا ہے، تورات میں ہم آپ کا ذکر اور آپ کی صفات پاتے ہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ اب یہ مسلمان ہے انتقال کے بعد اس کی تجہیز و تکفین مسلمان کریں، باپ کے حوالہ نہ کریں (ظہری) اور حضرت علی رضیؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ایک یہودی کا قرض تھا، اس نے آکر اپنا قرض مانگا آپؐ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں کچھ مہلت دو، یہودی نے شدت کے ساتھ مطالبہ کیا اور کہا کہ میں آپ کو اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب

تک میرا قرض ادا نہ کر دو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تمہیں اختیار ہے میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں گا، چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ بیٹھ گئے اور ظہر، عصر، مغرب، عشاء کی اور پھر اگلے روز صبح کی نماز یہیں ادا فرمائی، صحابہ کرامؓ یہ ماجرا دیکھ کر رنجیدہ اور غصینا ہو رہے تھے اور آہستہ آہستہ یہودی کو ڈرا دھمکا کر یہ چاہتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پھوڑ دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تاڑ لیا اور صحابہؓ سے پوچھا یہ کیا کرتے ہو؟ تب انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ہم اس کو کیسے برداشت کریں کہ ایک یہودی آپ کو قید کرے، آپ نے فرمایا کہ ”مجھے میرے رب نے منع فرمایا ہے کہ کسی معاہدہ وغیرہ پر ظلم کروں“ یہودی یہ سب ماجرا دیکھ اور سن رہا تھا۔

صبح ہوتے ہی یہودی نے کہا، اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اس طرح مشرف باسلام ہو کر اس نے کہا کہ یا رسول اللہ میں نے اپنا آدھا مال اللہ کے راستہ میں دے دیا، اور قسم ہے خدا تعالیٰ کی کہ میں نے اس وقت جو کچھ کیا اس کا مقصد صرف یہ امتحان کرنا تھا کہ تورات میں جو آپ کی صفات بتلائی گئی ہیں وہ آپ میں صحیح طور پر موجود ہیں یا نہیں میں نے تورات میں آپ کے متعلق یہ الفاظ پڑھے ہیں :

”محمد بن عبد اللہ، ان کی ولادت مکہ میں ہوگی اور ہجرت طیبہ کی طرف اور ملک ان کا شام ہوگا، نہ وہ سخت مزاج ہوں گے نہ سخت بات کرنے والے نہ بازاروں میں شور کرنے والے، فحش اور بے حیائی سے دور ہوں گے“

اب میں نے ان تمام صفات کا امتحان کر کے آپ میں صحیح پایا، اس لئے شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں، اور یہ میرا آدھا مال ہے آپ کو اختیار ہے جس طرح چاہیں خرچ فرمائیں، اور یہ یہودی بہت مالدار تھا، آدھا مال بھی ایک بڑی دولت تھی، اس روایت کو تفسیر مظہریؒ میں بحوالہ دلائل النبوةؒ بہت ہی نقل فرمایا ہے۔ اور امام بغویؒ نے اپنی سند کے ساتھ کعب احبارؒ سے نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا کہ تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ لکھا ہوا ہے کہ

”مُحَمَّدٌ اللّٰهُ کے رسول اور منتخب بندے ہیں، نہ سخت مزاج ہیں نہ بیہودہ گو، نہ بازاروں میں شور کرنے والے، بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتے بلکہ معاف فرمادیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں، ولادت آپ کی مکہ میں اور ہجرت طیبہ میں ہوگی، ملک آپ کا شام ہوگا اور امت آپ کی حمادینؒ ہوگی، یعنی راحت و کلفت دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد و شکر ادا کرے گی، ہر بلندی پر چڑھنے کے وقت وہ تکبیر کہا کرے گی

وہ آفتاب کے سیالوں پر نظر رکھے گی تاکہ اس کے ذریعہ اوقات کا پتہ لگا کر نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھا کرے، وہ اپنے نچلے بدن پر تہبند استعمال کریں گے اور اپنے ہاتھ پاؤں کو وضو کے ذریعہ پاک صاف رکھیں گے، اُن کا اذان دینے والا فضا میں آواز بلند کرے گا، جہاد میں ان کی صفیں ایسی ہوں گی جیسے نماز جماعت میں، رات کو ان کی تلاوت اور ذکر کی آوازیں اس طرح گونجیں گی جیسے شہد کی مکھیوں کا شور ہوتا ہے (منظری)

ابن سعد اور ابن عساکر نے حضرت سہل مولیٰ نخشمہ سے سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت سہل نے فرمایا کہ میں نے خود انجیل میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفات پڑھی ہیں کہ

”وہ نہ پست قد ہوں گے نہ بہت دمازد، سفید رنگ دوزخوں والے ہوں گے ان کے دونوں شانوں کے درمیان ایک مہر نبوت ہوگی، صدقہ قبول نہ کریں گے، حمار اور اونٹ پر سوار ہوں گے، بکریوں کا دودھ خود دودھ لیا کریں گے، پیوند زدہ کرتے استعمال فرمادیں گے اور جو ایسا کرتا ہے وہ تکبر سے بری ہوتا ہے، وہ اسماعیل علیہ السلام کی ذریت میں ہوں گے، ان کا نام احمد ہوگا۔“

اور ابن سعد نے طبقات میں، دارمی نے اپنے مستدرک میں، بیہقی نے دلائل نبوت میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے روایت نقل کی ہے، جو یہود کے سب سے بڑے عالم اور تورات کے ماہر مشہور تھے، انہوں نے فرمایا کہ تورات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ الفاظ مذکور ہیں،

اے نبی! ہم نے آپ کو بھیجا ہے سب امتوں پر گواہ بنا کر اور نیک عمل کرنے والوں کو بشارت دینے والا، بُرے اعمال والوں کو ڈرانے والا بنا کر اور اُمّیّین یعنی عرب کی حفاظت کرنے والا بنا کر، آپ میرے بندے اور رسول ہیں، میں نے آپ کا نام مُتَوَكَّل رکھا ہے، نہ آپ سخت مزاج ہیں نہ جھگڑالو اور نہ بازاروں میں شور کرنے والے، برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ معاف کر دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اس وقت تک وفات نہ دیں گے جب تک ان کے ذریعہ طبرہ طبرہ قوم کو سیدھا نہ کر دیں یہاں تک کہ وہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کے قائل ہو جائیں اور اندھی آنکھوں کو کھول دیں، اور ہرے کانوں کو سنتے کے قابل بنادیں اور بندھے ہوئے دلوں کو کھول دیں۔“

اس جیسی ایک روایت بخاری میں بروایت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ بھی مذکور ہے۔

اور کتب سابقہ کے بڑے ماہر عالم حضرت وہب بن منبہ سے بیہقی نے دلائل النبوة میں نقل کیا ہے کہ

"اللہ تعالیٰ نے زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف یہ وحی فرمائی کہ اے داؤد! آپ کے بعد ایک نبی آئیں گے جن کا نام احمد ہوگا، میں ان پر کبھی ناراض نہ ہوں گا اور وہ کبھی میری نافرمانی نہ کریں گے اور میں نے ان کے لئے سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی ہیں، ان کی امت امت مرحومہ ہے، میں نے ان کو وہ نوافل دیئے ہیں جو انبیاء کو عطا کی تھیں اور ان پر وہ فرائض عائد کئے ہیں جو پچھلے انبیاء پر لازم کئے گئے تھے، یہاں تک کہ وہ محشر میں میرے سامنے اس حالت میں آئیں گے کہ ان کا نور انبیاء علیہم السلام کے نور کی مانند ہوگا، اے داؤد میں نے محمد اور ان کی امت کو تمام امتوں پر فضیلت دی ہے، میں نے ان کو چھ چیزیں خصوصی طور پر عطا کی ہیں جو دوسری امتوں کو نہیں دی گئیں، اول یہ کہ خطا و نسیان پر ان کو عذاب نہ ہوگا، جو گناہ ان سے بغیر قصد کے صادر ہو جائے اگر وہ اس کی مغفرت مجھ سے طلب کریں تو میں معاف کر دوں گا، اور جو مال وہ اللہ کی راہ میں بطیب خاطر خرچ کریں گے تو میں دنیا ہی میں ان کو اس سے بہت زیادہ دے دوں گا، اور جب ان پر کوئی مصیبت پڑے اور وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ کہیں تو میں ان پر اس مصیبت کو صلوة و رحمت اور جنت کی طرف ہدایت بنا دوں گا، وہ جو دعا کریں گے میں قبول کروں گا، کبھی اس طرح کہ جو مانگا ہے وہی دے دوں اور کبھی اس طرح کہ اس دعا کو ان کی آخرت کا سامان بنا دوں۔ (روح المعانی)

سینکڑوں میں سے یہ چند روایات تورات، انجیل، زبور کے حوالہ سے نقل کی گئی ہیں پوری روایات کو محدثین نے مستقل کتابوں میں جمع کیا ہے۔

تورات و انجیل میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت مرحومہ کے خاص فضائل و صفات اور علامات کی تفصیل پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اس آخری دور میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اظہار الحق میں اس کو بڑے شرح و بسط اور تفصیل و تحقیق کے ساتھ لکھا ہے، اس میں موجودہ زمانے کی تورات و انجیل جس میں بے انتہا تحریفات ہو چکی ہیں ان میں بھی بہت سی صفات و فضائل کا ذکر موجود ہونا ثابت کیا ہے، اس کا عربی سے اردو میں ترجمہ حال میں شائع ہو چکا ہے، قابل دید ہے۔

سابقہ آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان صفات و علامات کا تفصیلی بیان تھا جو تورات و انجیل اور زبور میں لکھی ہوئی تھیں، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ مزید

صفات بھی مذکور ہیں۔

جن میں پہلی صفت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، ”معروف“ کے لفظی معنی جانا پہچانا ہوا، اور منکر کے لغوی معنی اوپرا، اجنبی جو پہچانا نہ جاتے، اس جگہ معروف سے وہ نیک کام مراد ہیں جو شریعت اسلام میں جانے پہچانے ہوئے ہیں اور منکر سے وہ برے کام جو دین و شریعت سے اجنبی ہیں۔

اس جگہ اچھے کاموں کو معروف کے لفظ سے اور بُرے کاموں کو منکر کے لفظ سے تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ دین میں نیک کام صرف اس کو سمجھا جائے گا جو قرن اول کے مسلمانوں میں رائج ہوا اور جانا پہچانا گیا اور جو ایسا نہ ہو وہ منکر کہلائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ و تابعین نے جس کام کو نیک نہیں سمجھا وہ خواہ کتنا ہی بھلا معلوم ہو از روئے شریعت وہ بھلا نہیں، احادیث صحیحہ میں اسی لئے ان کاموں کو جن کی تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کی طرف سے نہیں پائی جاتی ان کو محدثات الامور اور بدعت فرما کر گمراہی قرار دیا ہے، معنی آیت کے اس جملہ کے یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نیک کاموں کا حکم کریں گے اور بُرے کاموں سے منع فرما دیں گے۔

یہ صفت اگرچہ تمام انبیاء علیہم السلام میں عام ہے اور ہونا ہی چاہئے کیونکہ ہر نبی اور رسول اسی کام کے لئے بھیجے جاتے ہیں کہ لوگوں کو نیک کاموں کی طرف ہدایت کریں اور بُرے کاموں سے منع کریں، لیکن اس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات کے موقع پر اس کا بیان کرنا اس کی خبر دیتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صفت میں دوسرے انبیاء علیہم السلام سے کوئی خاص امتیاز اور خصوصیت حاصل ہے اور وہ امتیاز کئی وجہ سے ہے، اول اس کام کا خاص سلیقہ، کہ ہر طبقہ کے لوگوں کو ان کے مناسب حال طریق سے فہمائش کرنا جس سے بات ان کے دل میں اتر جائے اور بھاری نہ معلوم ہو، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں غور کیا جائے تو اس کا مشاہدہ ہوگا کہ آپ کو حق تعالیٰ نے اس میں خصوصی اور امتیازی سلیقہ عطا فرمایا تھا، عرب کے بدوی جو اونٹ اور بکری چرانے کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے ان سے ان کے اندازِ فہم پر گفتگو فرماتے اور رفیق علمی مضامین کو ایسے سادہ الفاظ میں سمجھا دیتے تھے کہ ان پڑھ لوگوں کی بھی سمجھ میں آجائے، اور قصور و کسری اور دوسرے ملوکِ عجم اور ان کے بھیجے ہوئے ذی علم و فہم سفراء سے ان کے انداز کے مطابق گفتگو ہوتی تھی اور بلا استثناء سب ہی اس گفتگو سے متاثر ہوتے تھے، دوسرے آپ کی اور آپ کے کلام کی خداداد مقبولیت اور دلوں میں تاثیر بھی ایک معجزانہ انداز رکھتی ہے بڑے سے بڑا دشمن بھی جب آپ کا کلام سنتا تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔

اُوپر بحوالہ تورات جو صفات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی گئی تھیں ان میں یہ بھی تھا کہ آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اندھی آنکھوں کو بینا اور بہرے کانوں کو سننے والا بنادے گا اور بند دلوں کو کھول دے گا، یہ اوصاف شاید اسی خصوصیت کا نتیجہ ہوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے صفت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا امتیازی سلیقہ عطا فرمایا تھا۔

دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے لئے پاکیزہ اور پسندیدہ چیزوں کو حلال فرمادیں گے اور گندی چیزوں کو حرام، مراد یہ ہے کہ بہت سی پاکیزہ اور پسندیدہ چیزیں جو بنی اسرائیل پر بطور سزا کے حرام کر دی گئی تھیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی حرمت کو ختم کر دیں گے مثلاً حلال جانوروں کی چربی وغیرہ جو بنی اسرائیل کی بدکاریوں کی سزا میں ان پر حرام کر دی گئی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حلال قرار دیا، اور گندی چیزوں میں خون اور مردار جانور، شراب اور تمام حرام جانور داخل ہیں اور تمام حرام ذرائع آمدنی بھی مثلاً سود، رشوت جوا وغیرہ، (السراج المنیر) اور بعض حضرات نے بُرے اخلاق و عادات کو بھی گندی چیزوں میں شمار فرمایا ہے۔

تیسری صفت یہ بیان فرمائی گئی وَیَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہٹا دیں گے لوگوں سے اس بوجھ اور بند کو جو ان پر مسلط تھی۔

لفظ إِصْر کے معنی بارگراں کے ہیں جو آدمی کو حرکت کرنے سے روک دے اور آغْلَال غُل کی جمع ہے، اس ہتکڑی کو غُل کہتے ہیں جس کے ذریعہ مجرم کے ہاتھوں کو اس کی گردن کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور وہ بالکل بے اختیار ہو جاتا ہے۔

إِصْر اور آغْلَال یعنی بارگراں اور قید سے مراد اس آیت میں وہ احکام شاقہ اور دشوار و اجبات ہیں جو اصل دین میں مقصود نہ تھے بلکہ بنی اسرائیل پر بطور سزا کے لازم کر دیئے گئے تھے، مثلاً کپڑا ناپاک ہو جائے تو پانی سے دھو دینا بنی اسرائیل کے لئے کافی نہ تھا بلکہ یہ واجب تھا کہ جس جگہ نجاست لگی ہے اس کو کاٹ دیا جائے، اور کفار سے جہاد کر کے جو مال غنیمت ان کو ہاتھ آئے، ان کے لئے حلال نہیں تھا بلکہ آسمان سے ایک آگ آکر اس کو جلا دیتی تھی، ہفتہ کے دن شکار کھیلنا ان کے لئے حرام تھا، جن اعضاء سے کوئی گناہ صادر ہو ان اعضاء کو کاٹ دینا واجب تھا، کسی کا قتل خواہ عمدہ ہو یا خطا، دونوں صورتوں میں قصاص یعنی قاتل کا قتل کرنا واجب تھا، انہیں دینے کا قانون نہ تھا۔

ان احکام شاقہ کو جو بنی اسرائیل پر نافذ تھے قرآن میں إِصْر اور آغْلَال فرمایا اور یہ خبر دی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سخت احکام کو منسوخ کر کے سہل احکام جاری فرمادیں گے۔

اسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ میں نے تم کو ایک سہل اور آسان شریعت پر چھوڑا ہے جس میں نہ کوئی مشقت ہے نہ گمراہی کا اندیشہ۔
ایک حدیث میں ارشاد ہے **الَّذِينَ يُسَبِّحُونَ** یعنی دین آسان ہے، قرآن کریم نے فرمایا، **وَمَا جَعَلْ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَزَجٍ** یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی تنگی نہیں ڈالی۔

نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص صفات کمال بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا، **فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ لَا أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ** یعنی تورات و انجیل میں نبی آخر الزمان کی واضح صفات و علامات بتلا دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی تعظیم کریں اور مدد کریں اور اس نور کا اتباع کریں جو آپ کے ساتھ بھیجا گیا ہے یعنی قرآن عظیم تو یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔ یہاں فلاح پانے کے لئے چار شرطیں ذکر کی گئی ہیں، اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان دوسرے آپ کی تعظیم و تکریم، تیسرے آپ کی امداد، چوتھے قرآن کریم کا اتباع۔

تعظیم و تکریم کے لئے اس جگہ لفظ **عَزَّرُوهُ** لایا گیا ہے جو تعزیر سے مشتق ہے، تعزیر کے اصلی معنی شفقت کے ساتھ منع کرنے، حفاظت کرنے کے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے **عَزَّرُوهُ** کے معنی تعظیم و تکریم کرنے کے بتلائے ہیں اور مُبَشِّر دے کہا کہ اعلیٰ درجہ کی تعظیم کو تعزیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کے ساتھ آپ کی تائید و حمایت اور مخالفین کے مقابلہ میں آپ کی مدد کریں وہ مکمل فلاح پانے والے ہیں، زمانہ نبوت میں تو یہ تائید و نصرت آپ کی ذات کے ساتھ متعلق تھی اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی شریعت اور آپ کے دین کی تائید و نصرت ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و نصرت کا مصداق ہے۔
قرآن کریم کو اس آیت میں نور سے تعبیر کیا گیا ہے، وجہ یہ ہے کہ جس طرح نور کے نور ہونے پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں، نور خود اپنے وجود کی دلیل ہوتا ہے، اسی طرح قرآن کریم خود اپنے کلام ربانی اور کلام حق ہونے کی دلیل ہے کہ ایک انجی شخص کی زبان سے ایسا اعلیٰ و ابلغ کلام آیا جس کی مثال لاتے سے ساری دنیا عاجز ہو گئی، یہ خود قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کی دلیل ہے۔

تیز جس طرح نور خود بھی روشن ہوتا ہے اور دوسرے اندھیر یوں میں بھی ابلا کر دیتا ہے اسی طرح قرآن کریم نے اندھیر یوں میں پھنسی ہوئی دنیا کو تاریکیوں سے نکالا۔

قرآن کے ساتھ سنت کا اتباع بھی فرض ہے | اس آیت کے شروع میں **يَتَّبِعُونَ النُّورَ**

الْاٰمِیْنَ فَرِیَا تَحٰ اٰخِرِیْنَ وَاتَّبِعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَهُ فَرِیَا -

ان میں سے پہلے جملہ میں نبی امی کے اتباع کا حکم ہے اور آخری جملہ میں قرآن کے اتباع کا۔ اس سے ثابت ہوا کہ نجات آخرت کتاب اور سنت دونوں کے اتباع پر موقوف ہے کیونکہ نبی امی کا اتباع ان کی سنت ہی کے اتباع کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

رسول کا صرف اتباع بھی کافی نہیں، اور ان دونوں جملوں کے درمیان عَزَّوَجَلَّ وَنَصْرُوْهُ فَرِیَا کہ ادب و احترام اور محبت بھی فرض ہے اس طرف اشارہ کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا ایسا اتباع مقصود نہیں جیسے عام دنیا کے حکام کا اتباع جبڑا قہرا کرنا پڑتا ہے بلکہ وہ اتباع مقصود ہے جو عظمت و محبت کا نتیجہ ہو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت دل میں اتنی ہو کہ اس کی وجہ سے آپ کے احکام کے اتباع پر مجبور ہو، کیونکہ امت کو اپنے رسول سے مختلف قسم کے تعلقات ہوتے ہیں، ایک یہ کہ وہ امیر و حاکم ہے اور امت محکوم و رعیت، دوسرے یہ کہ رسول محبوب ہے اور پوری امت ان کی محبت۔

ایک یہ کہ رسول اپنے کمالات علمی، عملی، اخلاقی کی بنا پر صاحبِ عظمت ہے، اور ساری امت ان کے مقابلہ میں لپست اور عاجز۔

ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں سب شانیں درجہ کمال میں پائی جاتی ہیں اس لئے امت پر لازم ہے کہ ہر شان کا حق ادا کریں، بحیثیت رسول کے ان پر ایمان لائیں، بحیثیت امیر و حاکم کے ان کے احکام کی پیروی کریں، بحیثیت محبوب ہونے کے ان کے ساتھ گہری محبت رکھیں اور بحیثیت کمالات نبوت ان کی تعظیم و تکریم بجالائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع تو امت پر فرض ہوتا ہی چاہئے تھا کیونکہ انبیاء کے بھیجنے کا مقصد ہی اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا، لیکن حق تعالیٰ نے ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صرف اسی پر اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ امت پر آپ کی تعظیم و توقیر اور احترام و ادب کو بھی لازم قرار دیا ہے اور قرآن کریم میں جا بجا اس کے آداب سکھائے گئے ہیں۔

اس آیت میں تَوْعِزُّوْهُ وَنَصْرُوْهُ کے الفاظ سے اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے اور ایک دوسری آیت میں بھی وَتُعِزُّوْهُ وَتُنْفِزُوْهُ آیا ہے، اور کئی آیتوں میں اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایسی بلند آواز سے بات نہ کریں کہ آپ کی آواز سے بڑھ جائے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَا تَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَرَمُوْهُ یَعْنِی اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول سے پیش قدمی نہ کرو، یعنی جس مجلس میں حضور تشریف

فرما ہوں اور کوئی معاملہ پیش آئے تو آپ سے پہلے کوئی نہ بولے۔

حضرت سہل بن عبد اللہ نے اس آیت کے معنی یہ بتلائے ہیں کہ آپ سے پہلے نہ بولیں اور جب آپ کلام کریں تو سب خاموش ہو کر سنیں۔

ایک آیت قرآن میں اس کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنے کے وقت ادب کا لحاظ رکھیں اس طرح نہ پکاریں جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارا کرتے ہیں لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَمَا دُعَاءُ بَعْضِكُمْ بَعْضًا، آخر آیت میں اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اس کے خلاف کوئی کام بے ادبی کا کیا گیا تو سارے اعمال جبط اور برباد ہو جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین باوجودیکہ ہر وقت ہر حال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک کار رہتے تھے اور ایسی حالت میں احترام و تعظیم کے آداب ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن ان کا یہ حال تھا کہ آیت مذکورہ کے نازل ہونے کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ عرض کرتے تو اس طرح بولتے تھے جیسے کوئی پوشیدہ بات کو آہستہ کہا کرتا ہے، یہی حال حضرت فاروق اعظمؓ کا تھا۔ (شفاء)

حضرت عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی مجھے دنیا میں محبوب نہ تھا اور میرا یہ حال تھا کہ میں آپ کی طرف نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکتا تھا، اور اگر کوئی مجھ سے آپ کا علیہ مبارک دریافت کرے تو میں بیان کرنے پر اس لئے قادر نہیں کہ میں نے کبھی آپ کو نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں۔

ترمذی نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ مجلس صحابہؓ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تھے تو سب نیچی نظریں کر کے بیٹھتے تھے، صرف صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ آپ کی طرف نظر کرتے اور آپ ان کی طرف نظر فرما کر تسم فرماتے تھے۔

عروہ بن مسعود کو اہل مکہ نے جاسوس بنا کر مسلمانوں کا حال معلوم کرتے کے لئے مدینہ بھیجا اس نے صحابہ کرام کو پروانہ وار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر گرتا اور قدامت ہوا دیکھ کر واپسی میں یہ رپورٹ دی کہ میں نے کسری و قیصر کے دربار بھی دیکھے ہیں اور ملک نجاشی سے بھی ملا ہوں مگر جو حال میں نے اصحاب محمدؐ کا دیکھا وہ کہیں نہیں دیکھا، میرا خیال یہ ہے کہ تم لوگ ان کے مقابلہ میں ہرگز کامیاب نہ ہو گے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی حدیث میں ہے کہ جب آپ گھر میں تشریف فرما ہوتے تھے تو صحابہ کرامؓ باہر سے آواز دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلانا بے ادبی سمجھتے تھے دروازہ پر دستک بھی صرف ناخن سے دیتے تھے تاکہ زیادہ کھڑکا اور شور نہ ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی صحابہ و تابعین کا معمول یہ تھا کہ مسجد نبویؐ میں کبھی بلند آواز سے بات کرنا تو درکنار کوئی وعظ تقریر بھی زیادہ بلند آواز سے پسند نہ کرتے تھے، اکثر حضرات کا عالم یہ تھا کہ جب کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لیا تو رونے لگے اور ہیبت زدہ ہو گئے۔

اسی تعظیم و توقیر کی برکت تھی کہ ان حضرات کو کمالات نبوت سے خاص حصہ ملا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو انبیاء کے بعد سب اونچا مقام عطا فرمایا۔

قُلْ يَٰ أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي

تو کہہ اے لوگو! میں رسول ہوں اللہ کا تم سب کی طرف جس کی

لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ص

حکومت ہے آسمانوں اور زمین میں کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا وہی چلاتا ہے اور مارتا ہے

فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ

سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو کہ یقین رکھتا ہے اللہ پر اور

كَلِمَتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٨﴾ وَمِنْ قَوْمِ مُوسَى

اس کے سب کلاموں پر اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہ پاؤ اور موسیٰ کی قوم میں ایک

أُمَّةٌ يَهْتَدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿١٥٩﴾

گروہ ہے جو راہ بتلاتے ہیں حق کی اور اسی کے موافق انصاف کرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ اے (دنیا جہان کے) لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا (پیغمبر) ہوں جس کی بادشاہت ہے تمام آسمانوں اور زمین میں، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے وہی موت دیتا ہے، اس لئے اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی امی پر (بھی ایمان لاؤ) جو کہ (خود بھی) اللہ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں (یعنی جب باوجود اس رتبہ عظیمہ کے ان کو اللہ اور سب رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے سے عاز نہیں تو تم کو اللہ و رسول پر ایمان لانے سے کیوں انکار ہے) اور ان (نبی) کا اتباع کرو تاکہ تم راہ (راست) پر آجھاؤ اور (اگرچہ بعض لوگوں نے آپ کی مخالفت کی لیکن) قوم موسیٰ میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو دین حق (یعنی

اسلام کے موافق (لوگوں کو) ہدایت بھی کرتے ہیں اور اسی کے موافق (اپنے اور غیروں کے معاملات میں) انصاف بھی کرتے ہیں (مراد اس سے عبداللہ بن سلام وغیرہ ہیں)

معارف و مسائل

اس آیت میں اسلام کے اصولی مسائل میں سے مسئلہ رسالت کے ایک اہم پہلو کا بیان ہے کہ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت دنیا کے تمام جن و بشر کے لئے اور ان میں بھی قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے عام ہے۔

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعلان عام کر دینے کا حکم ہے کہ آپ لوگوں کو بتلادیں کہ میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، میری بعثت و رسالت پچھلے انبیاء کی طرح کسی مخصوص قوم یا مخصوص خطہ زمین یا خاص وقت کے لئے نہیں بلکہ پوری دنیا کے انسانوں کے لئے دنیا کے ہر خطہ ہر ملک ہر آبادی کے لئے اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے قیامت تک کے واسطے عام ہے، اور انسانوں کے علاوہ جنات بھی اس میں شریک ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تمام عالم کھلنے والی تھی۔ یہی اصلی راز ہے مسئلہ ختم نبوت کا، کیونکہ جب آنحضرت تاقیامت ہے، اسی لئے آپ پر نبوت ختم ہے صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قیامت تک آنے والی سب

نسلوں کے لئے عام ہے تو پھر کسی دوسرے رسول اور نبی کے مبعوث ہونے کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش، اور یہی راز ہے امت محمدیہ کی اس خصوصیت کا کہ اس میں ارشاد نبوی کے مطابق ہمیشہ ایک ایسی جماعت قائم رہے گی جو دین میں پیدا ہونے والے سارے فتنوں کا مقابلہ اور دینی معاملات میں پیدا ہونے والے سارے رخنوں کا انسداد کرتی رہے گی، کتاب و سنت کی تعبیر و تفسیر میں جو غلطیاں رائج ہوں گی یہ جماعت ان کو بھی دور کرے گی اور حق تعالیٰ کی خاص نصرت و امداد اس جماعت کو حاصل ہوگی جس کے سبب یہ سب پر غالب آکر رہے گی، کیونکہ درحقیقت یہ جماعت ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض رسالت ادا کرنے میں آپ کی قائم مقام ہوگی۔

امام رازی نے آیت کو تواتر مع الصدیقین کے تحت میں بتلایا ہے کہ اس آیت میں یہ اشارہ موجود ہے کہ اس امت میں صادقین کی ایک جماعت ضرور باقی رہے گی ورنہ دنیا کو صادقین کی معیت و صحبت کا حکم ہی نہ ہوتا اور اسی سے امام رازی نے ہر دور میں اجماع امت کا حجت شرعیہ ہونا ثابت کیا ہے، کیونکہ صادقین کی جماعت کے موجود ہوتے ہوئے کسی غلط بات یا گمراہی پر سب کا اجماع و اتفاق نہیں ہو سکتا۔

امام ابن کثیر نے فرمایا کہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین اور آخری

پیغمبر ہونے کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ جب آپ کی بعثت و رسالت قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے اور پورے عالم کے لئے عام ہوئی تو اب کسی دوسرے جدید نبی و رسول کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اسی لئے آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو وہ بھی اپنی جگہ اپنی نبوت پر برقرار ہونے کے باوجود شریعت محمدی پر عمل کریں گے، جیسا کہ صحیح روایات حدیث سے ثابت ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و رسالت ساری دنیا اور قیامت تک کے لئے عام ہونے پر یہ آیت بھی بہت واضح ثبوت ہے، اس کے علاوہ قرآن کریم کی متعدد آیات اس پر شاہد ہیں، مثلاً ارشاد ہے: **وَأَوْحَىٰ إِلَيْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ لِتَشِيرَ بِهِ وَهَدَىٰ بَلَدًا**، یعنی یہ قرآن مجھے پر ہدایت دیا گیا ہے تاکہ میں تم کو اللہ کے عذاب سے ڈراؤں اور ان لوگوں کو بھی جن کو میرے بعد یہ قرآن پہنچے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ابن کثیر نے بحوالہ مسند احمد سند قوی کے ساتھ روایت کیا ہے کہ غزوہٴ چنداہم خصوصیات

تبوک کے موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز تہجد میں مشغول تھے صحابہ کرام کو خوف ہوا کہ کوئی دشمن حملہ نہ کر دے اس لئے آپ کے گرد جمع ہو گئے، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ آج کی رات مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی رسول و نبی کو نہیں ملیں اول یہ کہ میری رسالت و نبوت کو ساری دنیا کی کل اقوام کے لئے عام کیا گیا ہے اور مجھ سے پہلے جتنے انبیاء آئے ان کی دعوت و بعثت صرف اپنی اپنی قوم کے ساتھ مخصوص ہوتی تھی، دوسری بات یہ ہے کہ مجھے میرے دشمن کے مقابلہ میں ایسا رعب عطا کیا گیا ہے کہ وہ مجھ سے ایک مہینہ کی مسافت پر ہو تو میرا رعب اس پر چھا جاتا ہے، تیسرے یہ کہ میرے لئے کفّار سے حاصل شدہ مال غنیمت حلال کر دیا گیا حالانکہ پچھلی امتوں کے لئے حلال نہ تھا بلکہ اس کا استعمال کرنا گناہ عظیم سمجھا جاتا تھا، ان کے مال غنیمت کا صرف یہ مصرف تھا کہ آسمان سے ایک بجلی آئے اور اس کو جلا کر خاک کر دے، چوتھے یہ کہ میرے لئے تمام زمین کو مسجد اور پاک کرنے کا ذریعہ بنادیا کہ ہماری نماز زمین پر ہر جگہ ہو جاتی ہے مسجد کے ساتھ مخصوص نہیں بخلاف پہلی امتوں کے کہ ان کی عبادت صرف ان کے عبادت خانوں کے ساتھ مخصوص تھی اپنے گھروں میں یا جنگل وغیرہ میں ان کی نماز و عبادت نہ ہوتی تھی، نیز یہ کہ جب پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو، خواہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے یا کسی بیماری کے سبب تو وضو کے بجائے مٹی سے تیمم کرنا اس امت کے لئے طہارت و وضو کے قائم مقام ہو جاتا ہے، پچھلی امتوں کے لئے یہ آسانی نہ تھی، پھر فرمایا: اور پانچویں چیز کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں وہ خود ہی اپنی نظیر ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول

کو ایک دعا کی قبولیت ایسی عطا فرمائی ہے کہ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا اور ہر رسول و نبی نے اپنی اپنی دعا کو اپنے خاص خاص مقصدوں کے لئے استعمال کر لیا وہ مقصد حاصل ہو گئے مجھ سے یہی کہا گیا کہ آپ کوئی دعا کریں، میں نے اپنی دعا کو آخرت کے لئے محفوظ کر دیا، وہ دعا تمہارے اور قیامت تک جو شخص لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی شہادت دینے والا ہوگا اس کے کام آئے گی۔

نیز امام احمد کی ایک روایت حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میرا مبعوث ہونا سنے خواہ وہ میری امت میں ہو یا یہودی نصرانی ہو اگر وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے گا تو جہنم میں جائے گا۔

اور صحیح بخاری میں اسی آیت کے تحت میں بروایت ابو درداءؓ نقل کیا ہے کہ ابو بکر عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان کسی بات میں اختلاف ہوا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ناراض ہو کر چلے گئے، یہ دیکھ کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی ان کو منانے کے لئے چلے مگر حضرت عمرؓ نے نہ مانا، یہاں تک کہ اپنے گھر میں پہنچ کر دروازہ بند کر لیا، جبوزا صدیق اکبرؓ واپس ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے، ادھر کچھ دیر کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنے اس فعل پر ندامت ہوئی اور یہ بھی گھر سے نکل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے اور اپنا واقعہ عرض کیا، ابوالدرداءؓ کا بیان ہے کہ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو گئے، جب صدیق اکبرؓ نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ پر عتاب ہونے لگا تو عرض کیا یا رسول اللہ زیادہ قصور میرا ہی تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میرے ایک ساتھی کو اپنی ایندازوں سے چھوڑ دو، کیا تم نہیں جانتے کہ جب میں نے باذن خداوندی یہ کہا کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي مَرْسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا

تو تم سب نے مجھے جھٹلایا صرف ابو بکرؓ ہی تھے جنہوں نے پہلی بار میری تصدیق کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے اور ہر ملک ہر خطہ کے باشندوں کے لئے اور ہر قوم و برادری کے لئے رسول عام ہونا ثابت ہوا اور یہ کہ آپ کی بعثت کے بعد جو شخص آپ پر ایمان نہیں لایا وہ اگرچہ کسی سابق شریعت و کتاب کا یا کسی اور مذہب و ملت کا پورا پورا اتباع تقویٰ و احتیاط کے ساتھ بھی کر رہا ہو وہ ہرگز نجات نہیں پائے گا۔

آخر آیت میں بتلایا کہ میں اس ذات پاک کی طرف سے رسول ہوں جس کی ملک میں ہیں تمام آسمان اور زمین، وہ ہی زندہ کرتا ہے وہ ہی مارتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: فَأَمَّا مَن يُؤْمَلِكُ وَاللَّيْلِ النَّبِيِّ الْاَلَيْهِ الَّذِي يَوْمُنَ بِاَللّٰهِ وَكَلِمَتِهِ وَاَتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔

یعنی جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام اقوام عالم کے لئے رسول و نبی ہیں، ان کے اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہیں، تو ضروری ہے کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر جو خود بھی اللہ پر اور اس کے کلمات پر ایمان لاتے ہیں، اور ان کا اتباع کرو تا کہ تم صحیح راستہ پر قائم رہو۔

اللہ کے کلمات سے مراد اللہ تعالیٰ کی کتابیں تورات، انجیل، قرآن وغیرہ ہیں، ایمان کے حکم کے بعد پھر اتباع کا مزید حکم دے کر اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ محض ایمان لانا یا زبانی تصدیق کرنا آپ کی شریعت کا اتباع کرنے کے بغیر ہدایت کے لئے کافی نہیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ مخلوق پر اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچنے کے کل راستے بند ہیں بجز اس راستہ کے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم | دوسری آیت میں ارشاد فرمایا وَ مِنْ قَوْمِ مُوسٰی اُمَّةٍ يَّحْتَدُونَ
میں ایک حق پرست جماعت | بِالْحَقِّ وَ يَبْتَغِ الْكُوفَ، یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو خود بھی حق کا اتباع کرتی ہے اور اپنے نزاعی معاملات کے فیصلوں میں حق کے موافق فیصلے کرتی ہے۔

سابقہ آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی کجروی، کج بخشی اور گمراہی کا بیان ہوا تھا، اس آیت میں بتلایا گیا کہ پوری قوم بنی اسرائیل ایسی نہیں بلکہ ان میں کچھ لوگ اچھے بھی ہیں جو حق کا اتباع کرتے ہیں، اور حق فیصلے کرتے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے تورات و انجیل کے زمانہ میں ان کی ہدایات کے موافق پورا عمل کیا، اور جب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو تورات و انجیل کی بشارت کے موافق آپ پر ایمان لائے اور آپ کا اتباع کیا بنی اسرائیل کی اس حق پرست جماعت کا ذکر بھی قرآن میں بار بار آیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللّٰهِ اِنَّ الْاَيُّ الْيُسْ وَهُمْ يَتَّبِعُونَ، یعنی اہل کتاب میں ایک ایسی جماعت بھی ہے جو حق پر قائم ہے، اللہ کی آیات کو رات بھر تلاوت کرتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں، ایک جگہ ارشاد ہے الَّذِيْنَ اتَّخَذْتُمْ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ يُوْثِقُوْنَ يٰۤمُنُوْنَ یعنی وہ لوگ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کتاب (تورات و انجیل) دی گئی تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے ہیں۔

اور ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ نے اس جگہ ایک عجیب حکایت نقل کی ہے کہ اس جماعت

سے وہ جماعت مادی ہے جو بنی اسرائیل کی گمراہی اور بد اعمالیوں، قتلِ انبیاء وغیرہ سے تنگ آکر ان سے الگ ہو گئی تھی، بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے ایک قبیلہ تھا جنہوں نے اپنی قوم سے تنگ آکر یہ دُعا کی کہ یا اللہ ہمیں ان لوگوں سے دور کہیں اور بسا دیجئے تاکہ ہم اپنے دین پر نچستگی سے عمل کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ہلہ سے ان کو ڈیڑھ سال کی مسافت پر مشرق بعید کی کسی زمین میں پہنچا دیا جہاں وہ خالص عبادت میں مشغول رہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد بھی نیرنگ قدرت سے ان کے مسلمان ہونے کا یہ سامان ہوا کہ شبِ معراج میں جبریل امین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس طرف لے گئے وہ لوگ آپ پر ایمان لائے آپ نے ان کو کچھ قرآن کی سورتیں پڑھائیں اور ان سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے پاس ناپ تول کا کچھ انتظام ہے اور تم لوگوں کے معاش کا کیا سامان ہے؟ جواب دیا کہ ہم زمین میں غلہ بوٹے ہیں جب تیار ہو جاتا ہے کاٹ کر وہیں ڈھیر لگا دیتے ہیں ہر شخص کو جتنی ضرورت ہوتی ہے وہاں سے لے آتا ہے، ناپنے تولنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، آپ نے دریافت کیا کہ کیا تم میں کوئی شخص جھوٹ بھی بولتا ہے؟ عرض کیا کہ نہیں، کیونکہ اگر کوئی ایسا کرے تو فوراً ایک آگ آکر اسے جلا دیتی ہے، آپ نے دریافت کیا کہ تم سب کے مکانات بالکل یکساں کیوں ہیں؟ عرض کیا اس لئے کہ کسی کو کسی پر بڑائی جتانے کا موقع نہ ملے، پھر دریافت کیا کہ تم نے اپنے مکانات کے سامنے اپنی قبریں کیوں بنا رکھی ہیں؟ عرض کیا تاکہ ہمیں موت ہر وقت مستحضر رہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج سے واپس مکہ میں تشریف لائے تو یہ آیت نازل ہوئی وَمِنْ قَوْمٍ مُّوسَىٰ أُمَّةٌ يُّهَدُّونَ بِالنُّجَىٰ وَبِهِ يَعْزِدُونَ، تفسیر قرطبی نے اسی روایت کو اصل قرار دیا ہے اور دوسرے احتمالات بھی لکھے ہیں، ابن کثیر نے اس کو حکایت عجیبہ تو فرمایا مگر رد نہیں کیا، البتہ تفسیر قرطبی میں اس کو نقل کر کے کہا ہے کہ غالباً یہ روایت صحیح نہیں۔

بہر حال اس آیت سے یہ مفہوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک جماعت ایسی ہے جو ہمیشہ حق پر قائم رہی خواہ یہ وہ لوگ ہوں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر پا کر مشرف باسلام ہو گئے، یا وہ بنی اسرائیل کا بارہواں قبیلہ ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین کے کسی خاص حصہ میں رکھا ہوا ہے جہاں دوسروں کی رسائی نہیں۔ واللہ اعلم

وَقَطَّعْنَهُمْ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا أُمَمًا طَوَّأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ

اور جدا جدا کر دیئے ہم نے ان کو بارہ دادوں کی اولاد بڑی بڑی جماعتیں اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو

إِذَا سَأَلَكَ قَوْمٌ أَنْ تُضْرِبَ بِعَصَاكَ الْحَبَرَ ط

جب پانی مانگا اس سے اس کی قوم نے کہ مار اپنی لاٹھی اس پتھر پر

فَاَنْجَسَتْ مِنْهُ اشْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ط قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ

تو پھوٹ نکلے اس سے بارہ چشمے ، پہچان لیا ہر قبیلہ نے

مَشْرَبَهُمْ ط وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ

اپنا گھاٹ ، اور سایہ کیا ہم نے ان پر آبر کا اور اتارا ہم نے ان پر

الْمَنَ وَالسَّلَوٰی ط كُلُّوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا

من اور سلوای ، کھاؤ ستھری چیزیں جو ہم نے روزی دی تم کو ، اور

ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٠﴾ وَاِذْ قِيلَ

انہوں نے ہمارا کھنہ بگاڑا لیکن اپنا ہی نقصان کرتے رہے ، اور جب حکم ہوا

لَهُمْ اَسْكُنُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ

ان کو کہ بسو اس شہر میں اور کھاؤ اس میں جہاں سے چاہو

وَقُولُوا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ

اور کہو ہم کو بخش دے اور داخل ہو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے تو بخش دیں گے ہم تمہاری خطائیں

سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٦١﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ

البتہ زیادہ دیں گے تمہنکی کرنے والوں کو سو بدل ڈالا ظالموں نے ان میں سے

قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنْ

دوسرا لفظ اس کے ہوا جو ان سے کہہ دیا گیا تھا پھر بھیجا ہم نے ان پر عذاب آسمان

السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٢﴾

سے بسبب ان کی شرارت کے ۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے (ایک انعام بنی اسرائیل پر یہ کیا کہ انکی اصلاح و انتظام کے لئے) انکو بارہ خانہ اتوں

میں تقسیم کر کے سب کی الگ الگ جماعت مقرر کر دی (اور ہر ایک پر ایک سردار مقرر کیے

مقرر کر دیا جن کا ذکر مائتہ کے رکوع سوم میں ہوتا ہے) اُنہیں اُنہی غنیمتیں ، اور (ایک انعام یہ کیا کہ) ہم نے موسیٰ

(علیہ السلام) کو حکم دیا جبکہ انکی قوم نے ان سے پانی مانگا (اور انہوں نے حق تعالیٰ سے دعا کی، اس وقت یہ حکم ہوا

کہ اپنے اس عصا کو فلاں پتھر پر مارو (اس سے پانی نکل آویگا) پس (مارنے کی دیر تھی) فوراً اس سے بارہ چشمے (بعد ان

بارہ خانہ اتوں کے) پھوٹ نکلے (چنانچہ) ہر ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر لیا اور (ایک انعام یہ کیا کہ)

ہم نے اپنے ہر کو سایہ افکن کیا اور (ایک انعام یہ کیا کہ) انکو (خزانہ عید کے) ترنجبین اور بیڑیں پہنچائیں ،

(اور اجازت دی کہ) کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں (لیکن وہ لوگ اس میں بھی ایک بات غلام

کہ ہم لوگ اس آبادی میں جا کر رہوا در کھاؤ اس (کی چیزوں میں) سے جس جگہ تم رغبت کرو اور (یہ بھی حکم دیا گیا کہ جب اندر جانے لگو تو زبان سے یہ کہتے جانا کہ تو بہر تو بہر (عاجزی سے) مجھے جھکے دروازے میں داخل ہونا ہم تمہاری (پچھلی) خطائیں معاف کر دیں گے (یہ تو سب کیلئے ہو گا اور) جو لوگ نیک کام کریں گے ان کو مزید براں اور دیں گے، سو بدل ڈالا ان ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلافت تھا اس کلمہ کے جس (کے کہنے) کی ان سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے اُن پر ایک آفت سما دی تھی، اس وجہ سے کہ وہ حکم کو ضائع کرتے تھے۔

وَسَعَلَهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ مِإِذْ

اور پوچھ ان سے حال اس بستی کا جو تھی دریا کے کنارے جب

يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ

ہر سے بڑھنے لگے ہفتہ کے حکم میں جب آئے لگیں ان کے پاس مچھلیاں ہفتہ کے دن

شَرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَلِكَ نَبْلُوهُمْ بِمَا

پانی کے اوپر اور جس دن ہفتہ نہ ہو تو نہ آتی تھیں اس طرح ہم نے ان کو آزمایا اسلئے

كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿١٦٣﴾ وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لَمِ تَعْظُونَ قَوْمًا

کہ وہ نافرمان تھے اور جب بولا ان میں سے ایک فرقہ کیوں نصیحت کرتے ہو ان لوگوں کو

اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا قَالُوا مَعْذِرَةُ

جن کو اللہ چاہتا ہے کہ ہلاک کرے یا ان کو عذاب دے سخت وہ بولے الزام اتارنے کی غرض سے

إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٦٤﴾ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ

تمہارے رب کے آگے اور اس لئے کہ شاید وہ ڈریں پھر جب وہ بھول گئے اسکو جو ان کو سمجھایا تھا

أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ

تو نجات دی ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے بُرے کام سے اور پکڑا

ظَلَمُوا بِعَدَابِ بَيْسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿١٦٥﴾ فَلَمَّا

گنہگاروں کو بُرے عذاب میں بسبب ان کی نافرمانی کے پھر جب

عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً

بڑھنے لگے اس کام میں جس سے وہ روکے گئے تھے تو ہم نے حکم کیا کہ ہو جاؤ بندر

خَاسِرِينَ ﴿١٦٦﴾

ذلیل -

خلاصہ تفسیر

اور آپ ان (اپنے ہم عصر یہودی) لوگوں سے (بطور تنبیہ کے) اس بستی (والوں) کا جو کہ دریائے شور کے قریب آباد تھے (اور اس میں یہودی رہتے تھے جن کو ہفتہ کے روز شکار کرنا ممنوع تھا) اس وقت کا حال پوچھئے جب کہ وہ (وہاں کے بسنے والے) ہفتہ (کے متعلق جو حکم تھا اس) کے بارے میں حد (شرعی) سے نکل رہے تھے جب کہ ان کے ہفتہ کے روز تو ان (کے دریا) کی مچھلیاں (پانی سے سر نکال نکال) ظاہر ہو ہو کر (سطح دریا پر) ان کے سامنے آتی تھیں اور جب ہفتہ کا دن نہ ہوتا تو ان کے سامنے نہ آتی تھیں (بلکہ وہاں سے دور کہیں چلی جاتی تھیں اور وہ اس کی یہ تھی کہ) ہم ان کی اس طرح پر (شدید) آزمائش کرتے تھے (کہ کون حکم پر ثابت رہتا ہے کون نہیں رہتا اور یہ آزمائش) اس سبب سے (تھی) کہ وہ (پہلے سے) بے حکمی کیا کرتے تھے (اسی لئے ایسے سخت حکم سے ان کی آزمائش کی اور اہل طاعت کی آزمائش لطف اور توفیق اور تائید سے مقرون ہوا کرتی ہے) اور (اس وقت کا حال پوچھئے) جب کہ ان میں سے ایک جماعت نے (جو کہ ان کو نصیحت کرتے کرتے اثر و نفع ہونے سے مایوس ہو گئے تھے ایسے لوگوں سے جو اب بھی نصیحت کئے چلے جا رہے تھے اور اس قدر مایوس بھی نہ ہوئے تھے جیسا کہ **لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ** سے معلوم ہوتا ہے) یوں کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کئے جاتے ہو جن (سے قبول کی کچھ امید نہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان) کو اللہ تعالیٰ بالکل ہلاک کرنے والے ہیں یا (ہلاک نہ ہوئے تو) ان کو (کوئی اور طرح کی) سخت سزا دینے والے ہیں (یعنی ایسوں کے ساتھ کیوں دماغ خالی کرتے ہو) انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے (اور اپنے) رب کے روبرو عذر کرنے کے لئے (ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ اللہ کے روبرو کہہ سکیں کہ اے اللہ ہم نے تو کہا تھا مگر انہوں نے نہ سنا ہم معذور ہیں) اور (نیز) اس لئے کہ شاید ڈر جائیں (اور عمل کرنے لگیں مگر وہ کب عمل کرتے تھے) سو (آخر) جب وہ اس امر کے تارک ہی رہے جو ان کو سمجھایا جاتا تھا (یعنی نہ مانا) تو ہم نے ان لوگوں کو تو (عذاب سے) بچالیا جو اس بری بات سے منع کیا کرتے تھے (خواہ برابر منع کرتے رہے اور خواہ بوجہ عذر یا اس کے بیٹھ رہے) اور ان لوگوں کو جو کہ (حکم مذکور میں) زیادتی کرتے تھے ان کی (اس عدول حکمی کی وجہ سے) ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا یعنی جب وہ جس کام سے ان کو منع کیا گیا تھا اس میں حد سے نکل گئے (یہ تو تفسیر ہونی نسیان **مَا ذُكِّرُوا بِهِ** کی) تو ہم نے ان کو براہ قہر کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ (یہ تفسیر ہوئی عذاب سبکیں کی)

واقعات مندرجہ آیات مذکورہ بھی معارف القرآن جلد اول سورۃ بقرہ میں تفصیل و تشریح کے

ساتھ آچکے ہیں، اس کے متعلق ضروری باتیں وہاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لِيُبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ مَنْ

اور اس وقت کو یاد کرو جب خبر کر دی تھی تیرے رب نے کہ ضرور بھیجتا رہے گا یہود پر قیامت کے دن تک ایسے

يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ

شخص کو کہ دیا کرے ان کو بُرا عذاب ، بیشک تیرا رب جلد عذاب کرنے والا ہے ،

وَأِنَّكَ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۶۷﴾ وَقَطَّعْنَاهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا مِمَّنْهُمْ

اور وہ بخشنے والا مہربان ہے ، اور متفرق کر دیا ہم نے ان کو ملک میں فرقے فرقے ، بعضے ان میں

الصَّالِحُونَ وَمِنْهُمْ دُونَ ذَلِكَ وَبَلَوْنَاهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَ

نیک اور بعضے اور طرح کے اور ہم نے ان کی آزمائش کی خوبیوں میں اور

السَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۱۶۸﴾ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ

برائیوں میں تاکہ وہ پھر آئیں ، پھر ان کے پیچھے آئے ناخلف

وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ

ہو وارث بنے کتاب کے لئے لیتے ہیں اسباب اس ادنیٰ زندگانی کا اور کہتے ہیں کہ

سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَإِنَّا لَهُمْ عَرَضٌ مِّثْلَهُ يَأْخُذُوهُ ۚ أَلَمْ يُؤْخَذْ

ہم کو معاف ہو جائے گا اور اگر ایسا ہی اسباب ان کے سامنے پھر آئے تو اس کو لے لیوں کیا ان سے کتاب

عَلَيْهِمْ مِّثْلَ مَا قَالُوا الْكِتَابَ أَنْ لَا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَ

میں عہد نہیں لیا گیا کہ نہ بولیں اللہ پر سوا سچ کے اور

دَسَّ سُوا مَا فِيهِ ۚ وَالذَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۚ

انہوں نے پڑھا ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے ، اور آخرت کا گھر بہتر ہے ڈرنے والوں کے لئے

أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۶۹﴾

کیا تم نہیں سمجھتے ۔

خلاصہ تفسیر

اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے کہ جب آپ کے رب نے (انبیاء بنی اسرائیل کی معرفت) یہ بات بتلا دی کہ وہ ان یہود پر (ان کی گستاخیوں اور نافرمانیوں کی سزائیں) قیامت (کے قریب) تک ایسے (کسی نہ کسی) شخص کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سزائے شدید (ذلت و خواری و

محکومیت کی تکلیف پہنچاتا رہے گا (چنانچہ مدت سے یہودی کسی نہ کسی سلطنت کے محکوم و مقہور ہی چلے آتے ہیں) بلاشبہ آپ کا رب واقعی (جب چاہے) جلدی ہی سزا دے دیتا ہے اور بلاشبہ وہ واقعی (اگر باز آجاوے تو) بڑی مغفرت اور بڑی رحمت والا (بھی) ہے اور ہم نے دنیا میں ان کی متفرق جماعتیں کر دیں (چنانچہ بعضے ان میں نیک (بھی) تھے اور بعضے ان میں اور طرح کے تھے (یعنی بد تھے) اور ہم (نے ان بدوں کو بھی اپنی عنایت اور تربیت و اصلاح کے اسباب جمع کرنے سے کبھی مہمل نہیں چھوڑا بلکہ ہمیشہ) ان کو خوش حالیوں (یعنی صحت و غنا) اور بد حالیوں (یعنی بیماری و فقر) سے آزماتے رہے کہ شاید (اسی سے) باز آجائیں (کیونکہ گاہے حسنات سے ترغیب ہو جاتی ہے اور گاہے سیئات سے ترہیب ہو جاتی ہے، یہ حال تو ان کے سلف کا ہوا) پھر ان (سلف) کے بعد ایسے لوگ ان کے جانشین ہوئے کہ کتاب (یعنی تورات) کو (تو) ان سے حاصل کیا (لیکن اس کے ساتھ ہی حرام خورد ایسے ہیں کہ احکام کتاب کے عوض میں) اس دنیا کے دنی کا مال متاع (اگر ملے تو بے تکلف اس کو) لے لیتے ہیں اور بدیا ایسے ہیں کہ اس گناہ کو حقیر سمجھ کر) کہتے ہیں کہ ہماری ضرورت مغفرت ہو جاوے گی (کیونکہ ہم آئنا اللہ و احبنا اللہ ہیں ایسے گناہ ہماری مقبولیت کے روبرو کیا چیز ہیں) حالانکہ (اپنی بدیا کی اور استخفاف معصیت پر مُصر ہیں حتیٰ کہ) اگر ان کے پاس (پھر) ویسا ہی (دین فروشی کے عوض) مال متاع آنے لگے تو (اسی بے باکی کے ساتھ پھر) اس کو لے لیتے ہیں (اور استخفاف معصیت کا خود کفر ہے، جس پر مغفرت کا احتمال بھی نہیں، تاہم یقین چہ رسد، چنانچہ آگے یہی ارشاد ہے کہ) کیا ان سے اس کتاب کے اس مضمون کا عہد نہیں لیا گیا کہ خدا کی طرف بجز حق (اور واقعی) بات کے اور کسی بات کی نسبت نہ کریں (مطلب یہ ہے کہ جب کسی آسمانی کتاب کو مانا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم اس کے سب مضامین مانیں گے) اور (عہد بھی کوئی اجمالی عہد نہیں لیا گیا جس میں احتمال ہو کہ شاید اس مضمون خاص کا اس کتاب میں ہونا ان کو معلوم نہ ہوگا بلکہ تفصیلی عہد لیا گیا چنانچہ) انہوں نے اس کتاب میں جو کچھ (لکھا) تھا اس کو پڑھ (بھی) لیا (جس سے وہ احتمال بھی جاتا رہا پھر بھی یہ ایسی بڑی بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ باوجود استخفاف معصیت کے مغفرت کا اعتقاد کئے ہوئے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ پر محض تہمت ہے) اور (انہوں نے یہ سب قصہ دنیا کے لئے کیا، باقی) آخرت والا گھر ان لوگوں کے لئے (اس دنیا سے) بہتر ہے جو (ان عقائد و اعمالِ قبیحہ سے) پرہیز رکھتے ہیں پھر کیا (اے یہود) تم (اس بات کو) نہیں سمجھتے۔

مَعَارِفُ وَمَسَائِلُ

آیاتِ مذکورہ سے پہلی آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقیہ قصہ ذکر

کرنے کے بعد ان کی امت (یہود) کے غلط کار لوگوں کی مذمت اور ان کے انجام بد کا بیان آیا ہے، ان آیتوں میں بھی ان کی سزا اور مجزہ سے انجام کا ذکر ہے۔

پہلی آیت میں ان کی دوسراؤں کا بیان ہے جو دنیا ہی میں ان پر مسلط کر دی گئی ہیں اول یہ کہ قیامت تک اللہ تعالیٰ ان پر کسی ایسے شخص کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سخت سزا دیتا رہے اور ذلت و خواری میں مبتلا رکھے، چنانچہ اس وقت سے آج تک ہمیشہ یہود ہر جگہ مقہور و مغلوب اور محکوم رہے، آج کل کی اسرائیلی حکومت سے اس پر شبہ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ درحقیقت آج بھی اسرائیل کی نہ اپنی کوئی قوت ہے نہ حکومت، وہ روس اور امریکہ کی اسلام دشمن سازش کے نتیجہ میں انہیں کی ایک چھاؤنی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور آج بھی وہ بدستور انہیں کے محکوم و مقہور ہیں، جس دن جس وقت یہ دونوں اس کی امداد سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں اُسی روز اسرائیل کا وجود دنیا سے ختم ہو سکتا ہے۔

دوسری آیت میں یہودیوں پر ایک اور سزا کا ذکر ہے، جو اسی دنیا میں ان کو دی گئی، وہ یہ کہ ان کی آبادی دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر اور متفرق ہو گئی، کسی جگہ ایک ملک میں ان کا اجتماع نہ رہا، وَقَطَّعْنَهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا کَايَہی مطلب ہے، قَطَّعْنَا، مصدر تَقَطَّيْعٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دینا اور أُمَمٌ، اُمَّة کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایک جماعت یا ایک فرقہ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہود کی قوم کے ٹکڑے ٹکڑے زمین کے مختلف حصوں میں متفرق کر دیئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی قوم کا ایک جگہ اجتماع اور اکثریت خدا تعالیٰ کا انعام و احسان ہے اور اس کا مختلف جگہوں میں منتشر ہو جانا ایک طرح کا عذاب الہی مسلمانوں پر حق تعالیٰ کا یہ انعام ہمیشہ رہا ہے اور انشاء اللہ تا قیامت رہے گا کہ وہ جس جگہ رہے ان کی ایک زبردست اجتماعی قوت وہاں پیدا ہو گئی، مدینہ طیبہ سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور مشرق و مغرب میں اسی کیفیت کے ساتھ حیرت انگیز طریقہ پر پھیلا، مشرق بعید میں، پاکستان، انڈونیشیا وغیرہ مستقل اسلامی حکومتیں اسی کے نتیجہ میں بنیں، اس کے بالمقابل یہودیوں کا حال ہمیشہ یہ رہا کہ مختلف ملکوں میں منتشر رہے، مالدار کتنے بھی ہوں مگر اقتدار و اختیار ان کے ہاتھ نہ آیا۔

چند سال سے فلسطین کے ایک حصہ میں ان کے اجتماع اور مصنوعی اقتدار سے دھوکہ نہ کھایا جائے، اجتماع تو ان کا اس جگہ میں آخری زمانہ میں ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ صادق مصدوق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ میں قرب قیامت کے لئے یہ خبر دی گئی ہے کہ آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، نصاریٰ سب مسلمان ہو جائیں گے اور یہودیوں سے جہاد

کر کے ان کو قتل کریں گے، خدا کا مجرم وارنٹ اور پولیس کے ذریعہ پکڑ کر نہیں بلایا جاتا بلکہ وہ تکوینی اسباب ایسے جمع کر دیتے ہیں کہ مجرم اپنے پاؤں چل کر ہزاروں کوششیں کر کے اپنی قتل گاہ پر پہنچتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ملک شام دمشق میں ہونے والا ہے، یہودیوں کے ساتھ معرکہ بھی یہیں بننا ہے تاکہ عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ان کا قلع قمع کر دینا سہل ہو، قدرت نے دنیا کی پوری عمر میں تو یہودیوں کو مختلف ملکوں میں منتشر رکھ کر محکومیت اور بے قدری کا عذاب چکھایا اور آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آسانی کے لئے ان کو ان کے مقتل میں جمع فرمادیا اس لئے یہ اجتماع اس عذاب کے متافی نہیں۔

رہا ان کی موجودہ حکومت اور مصنوعی اقتدار کا قضیہ سو یہ ایک ایسا دھوکہ ہے جس پر آج کی مہذب دنیا نے اگرچہ بہت خوبصورت ملمع کا پردہ چڑھایا ہوا ہے لیکن کوئی دنیا کی سیاست سے باخبر انسان ایک منٹ کے لئے بھی اس سے دھوکہ نہیں کھا سکتا کیونکہ آج جس خطہ کو اسرائیلی مملکت کا نام دیا جاتا ہے وہ درحقیقت روس، امریکہ اور انگلینڈ کی ایک مشترک چھاؤنی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی وہ محض ان حکومتوں کی امداد سے زندہ ہے اور ان کے تابع فرمان رہتے ہی میں اس کے وجود کا راز مضمر ہے، ظاہر ہے کہ اس حقیقی غلامی کو مجازی حکومت کا نام دے دینے سے اس قوم کو کوئی اقتدار حاصل نہیں ہو جاتا، قرآن کریم نے ان کے بارے میں قیامت رسوائی اور خواری کے جس عذاب کا ذکر کیا ہے وہ آج بھی بدستور موجود ہے جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے، **وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ صَوتٌ مِّنْ سِوَاهُمُ**، یعنی جب کہ آپ کے رب نے بختہ ارادہ کر لیا کہ ان لوگوں پر کسی ایسی طاقت کو قیامت تک مسلط کر دے گا جو ان کو برا عذاب چکھائے۔ جیسا کہ اول سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ سے پھر بخت نصر کے ذریعہ اور آخر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے اور باقی ماندہ حضرت فاروق اعظمؓ کے ذریعہ ہر جگہ سے ذلت و خواری کے ساتھ ان کا نکالا جانا مشہور و معروف اور تاریخ کے مسلمات میں سے ہے۔

اس آیت کا دوسرا جملہ یہ ہے، **مِنْهُمْ الصَّالِحُونَ وَمِنْهُمْ دُونَ ذَلِكَ**، یعنی ان لوگوں میں کچھ لوگ نیک ہیں اور کچھ دوسری طرح کے، دوسری طرح سے مراد کفار فجّار بدکار لوگ ہیں مطلب یہ ہے کہ یہودیوں میں سب ایک ہی طرح کے لوگ نہیں، کچھ نیک بھی ہیں، مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو تورات کے زمانہ میں احکام تورات کے پورے پابند رہے، نہ ان کی نافرمانی میں مبتلا ہوئے نہ کسی تاویل و تحریف کے درپے ہوئے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ حضرات ہوں جو نزول قرآن کے بعد قرآن کے

تابع ہو گئے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے، اس کے بالمقابل وہ لوگ ہیں جنہوں نے تورات کو آسمانی کتاب ماننے کے باوجود اس کی خلاف ورزی کی یا اس کے احکام میں تحریف کر کے اپنی آخرت کو دنیا کی گندی چیزوں کے بدلہ میں بیچ ڈالا۔

آخر آیت میں ارشاد ہے وَبَلَّوْهُمْ بِالْاِحْسَانِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ، یعنی ہم نے اچھی بری حالتوں سے ان کا امتحان لیا تاکہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔ اچھی حالتوں سے مراد ان کو مال و دولت کے ذخیرے اور عیش و عشرت کے سامان دینا ہے، اور بری حالتوں سے مراد یا تو ذلت و خواری کے وہ واقعات ہیں جو ہر زمانہ میں مختلف صورتوں سے پیش آتے رہے اور یا کسی وقت کا قحط و افلاس جو ان پر ڈالا گیا وہ مراد ہے، بہر حال مطلب یہ ہے کہ انسان کی فرماں برداری یا سرکشی کا امتحان لینے کے دو ہی طریقے ہیں، دونوں استعمال کر لئے گئے ایک یہ کہ احسانات و انعامات کر کے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ احسان کرنے والے اور انعام دینے والے کے شکر گزار فرماں بردار ہوتے ہیں یا نہیں، دوسرے یہ کہ ان کو مختلف تکلیفوں اور پریشانیوں میں مبتلا کر کے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ اپنے رب کی طرف رجوع ہوتے اور اپنی بد اعمالیوں سے توبہ کرتے ہیں یا نہیں۔

لیکن قوم یہود ان دونوں امتحانوں میں قیل ہو گئی۔

جب اللہ تعالیٰ نے ان پر نعمت کے دروازے کھولے، مال و دولت کی فراوانی عطا فرمائی تو کہنے لگے اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَنَحْنُ اَغْنِيَاہُمْ یعنی (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ فقیر ہیں اور ہم غنی، اور جب ان کو افلاس و ناداری سے آزمایا گیا تو کہنے لگے يٰۤاَللّٰهُ مَغْلُوْبَةٌ یعنی اللہ کا ہاتھ تنگ ہو گیا۔

فوائد | اس آیت سے ایک فائدہ تو یہ حاصل ہوا کہ کسی قوم کا ایک جگہ اجتماع اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اس کا منتشر ہونا عذاب، دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اس دنیا کی راحت و کلفت اور خوشی و غم درحقیقت خداوندی امتحان کے مختلف پرچے ہیں جن کے ذریعے اس کے ایمان اور خدا پرستی کی آزمائش کی جاتی ہے، نہ یہاں کی تکلیف کچھ زیادہ رونے دھونے کی چیز ہے نہ کوئی راحت مسرور و مغرور ہو جانے کا سامان، عاقبت اندیش عقلمند کے لئے یہ دونوں چیزیں قابل توجہ نہیں۔

نہ شادی داد سامانے نہ غم اور نقصانے پیش ہمت ماہرچہ آمد بود مہانے

تیسری آیت میں ارشاد ہے فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِہُمْ خَلْفٌ وَرِثُوْا الْکِتٰبَ یَاۡخُذُوْنَ عَرَضَ ہٰذَا الَّذِیْ وَیَقُوْلُوْنَ سَیُعْظِرُّ لَنَا وَاِنَّ یَاۡتِیْہُمْ عَرَضٌ مِّثْلُہٗ یَاۡخُذُوْا، اس میں

یہ لفظ **خَلَفَ** مصدرِ خلافت سے مشتق ماضی کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں، قائم مقام اور خلیفہ ہو گئے، اور دوسرا لفظ **خَلْفٌ** مصدر ہے جو قائم مقام اور خلیفہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مفرد اور جمع دونوں کے لئے یکساں بولا جاتا ہے، لیکن **خَلَفَ** بسکون اللام اکثر برے خلیفہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اپنے بڑوں کے طرز کے خلاف برائیوں میں مبتلا ہو، اور **خَلَفَ** بفتح لام اس کے مقابل نیک اور قابل خلیفہ کو کہا جاتا ہے جو اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چلے اور ان کے مقصد کی تکمیل کرے، اس لفظ کا اکثری استعمال اسی طرح ہے کہیں کہیں اس کے خلاف بھی استعمال ہوا ہے۔

وَبِثَّ الْكِتَابَ وراثت سے مشتق ہے، وہ چیز جو مرنے والوں کے بعد زندہ رہنے والوں کو ملتی ہے اس کو میراث یا وراثت کہا جاتا ہے، معنی یہ ہیں کہ کتاب تورات ان لوگوں کو اپنے بڑوں سے وراثت میں مل گئی یعنی ان کے مرنے کے بعد ان لوگوں کے ہاتھ آئی۔

لفظ **عَرَضَ** سامان کے معنی میں بولا جاتا ہے جو نقد کے بدلہ میں خریدا جاتا ہے اور کبھی مطلقاً مال کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے خواہ نقد ہو یا سامان، تفسیر منظر ہی میں ہے کہ اس جگہ یہی عام معنی مراد ہیں، اور اس جگہ مال کو لفظ **عَرَضَ** سے تعبیر کرنے میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کا مال کتنا ہی ہو، ناپائیدار اور عارضی ہے کیونکہ **عَرَضَ** کا لفظ اصل میں جوہر کے بالمقابل ناپائیدار چیز کے لئے مستعمل ہوتا ہے جس کا اپنا کوئی مستقل وجود نہ ہو بلکہ وہ اپنے وجود میں دوسری کسی چیز کا تابع ہو، اسی لئے **عَرَضَ** کا لفظ بادل کے معنی میں آتا ہے کیونکہ اس کا وجود قائم رہنے والا نہیں، جلد زائل اور ختم ہو جاتا ہے، قرآن کریم میں **هَذَا عَارِضٌ مِّمَّنْ طَرُنَا** اسی معنی کے لئے آیا ہے۔

هَذَا الْآذِنِ میں لفظ **آذِنِ**، **دُنُوٌّ** بمعنی قرب سے بھی مشتق کہا جاسکتا ہے، اس صورت میں **آذِنِ** کے معنی **أَقْرَبَ** کے ہو جائیں گے، اسی کا مؤنث **دُنْيَا** ہے جس کے معنی قریب کے ہیں، آخرت کے مقابلہ میں یہ جہان انسان سے زیادہ قریب ہے اس لئے اس کو **آذِنِ** اور **دُنْيَا** کہا جاتا ہے، اور دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ لفظ **دَنَاؤَةٌ** بمعنی ذلت سے مشتق ہو تو اس کے معنی ذلیل و حقیر کے ہو جائیں گے، دنیا اور اس کے سبب سے ان بمقابلہ آخرت کے حقیر و ذلیل ہیں اس لئے اس کو **آذِنِ** اور **دُنْيَا** کہا گیا۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ پہلے دور کے یہودیوں میں تو دو قسم کے لوگ تھے کچھ نیک صالح، پابندِ شریعت تورات اور کچھ نافرمان گنہگار، مگر ان کے بعد جو لوگ ان کی نسل میں ان کے خلیفہ اور قائم مقام اور تورات کے وارث بنے، انہوں نے یہ حرکت اختیار کی کہ اللہ کی کتاب کو سوراگری

کا مال بنالیا کہ اہل غرض سے رشوت لے کر اللہ کے کلام میں تحریف کر کے ان کے مطلب کے موافق بنانے لگے۔

وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا، اس پر مزید جرات یہ کہ یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ ہم نے گناہ کیا ہے مگر یہ گناہ ہمارا بخش دیا جائے گا، حق تعالیٰ نے ان کی غلطی پر اگلے جملے میں اس طرح تنبیہ فرمائی وَإِنْ يَأْتِهِمْ عَرْضٌ مِّثْلُهَا يَأْخُذُوهُ، یعنی ان کا حال یہ ہے کہ اگر اس وقت بھی ان کو تحریف کلام اللہ کے بدلہ میں کوئی مال ملنے لگے تو یہ اب بھی مال لے کر تحریف کرنے سے باز نہ آئیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور بخشش بجا اور حق ہے مگر انہیں لوگوں کے لئے جو اپنے کئے پر نادم ہوں اور آئندہ اس کے چھوڑنے کا پختہ عزم کر لیں جس کا اصطلاحی نام توبہ ہے یہ لوگ اپنے جرم پر اصرار کے باوجود مغفرت کے امیدوار ہیں حالانکہ اس وقت ان کو پیسہ ملے تو تحریف کرنے میں کوتاہی نہ کریں، گناہ پر اصرار کرتے ہوئے مغفرت کی امید رکھنا خود فریبی سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

کیا ان لوگوں سے تورات میں یہ عہد نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے حق کے سوا کوئی بات نہ کہیں گے اور ان لوگوں نے اس معاہدہ کو تورات میں پڑھا پڑھایا بھی ہے، یہ سب ان کی عاقبت نااندیشی ہے، بات یہ ہے کہ دارِ آخرت ہی پر مہیزگاروں کے لئے بہترین لازوال دولت ہے کیا وہ اتنی بات کو نہیں سمجھتے۔

وَالَّذِينَ يُهَيِّجُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ط إِنَّا

اور جو لوگ خوب پکڑ رہے ہیں کتاب کو اور قائم رکھتے ہیں نماز کو، بیشک ہم

لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ۝۱۴۱ وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ

ضائع نہ کریں گے ثواب نیکی والوں کا، اور جس وقت اٹھایا ہم نے پہاڑ ان کے اوپر

كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ

مثل سائبان کے اور ڈرے کہ وہ ان پر گرے گا، ہم نے کہا پکڑو جو ہم نے تم کو دیا ہے

بِقُوَّةٍ وَادْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝۱۴۲

زور سے اور یاد رکھو جو اس میں ہے تاکہ تم بچتے رہو۔

خلاصہ تفسیر

اور ان میں سے جو لوگ کتاب (یعنی تورات) کے پابند ہیں (جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پر ایمان لانے کا بھی حکم ہے پس پابندی یہی ہے کہ مسلمان ہو گئے، اور عقائد کے ساتھ اعمال صالحہ کے بھی پابند ہیں چنانچہ نماز کی پابندی کرتے ہیں، ہم ایسے لوگوں کا جو اپنی (اس طرح، اصلاح کریں ثواب ضائع نہ کریں گے اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر چھپت کی طرح ان (بنی اسرائیل) کے اوپر (محاذات میں) معلق کر دیا اور ان کو یقین ہوا کہ اب ان پر گرے گا اور (اس وقت کہا کہ) (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی تورات اور) مضبوطی کے ساتھ (قبول کرو) اور یاد رکھو جو احکام اس (کتاب) میں ہیں، جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں ایک عہد و میثاق کا ذکر تھا جو خصوصی طور پر علماء بنی اسرائیل سے تورات کے متعلق لیا گیا تھا کہ اس میں کوئی تصرف و تغیر نہ کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف بھرتی اور صحیح بات کے کوئی چیز منسوب نہ کریں گے، اور یہ بات پہلے بیان ہو چکی تھی کہ ان علماء بنی اسرائیل نے عہد شکنی کی اور اہل غرض سے رشوتیں لے کر تورات کے احکام بدلے اور ان کی غرض کے مطابق کر کے بتلائے اب یہ آیت بھی اسی مضمون کا تکملہ ہے کہ علماء بنی اسرائیل سب کے سب ایسے نہیں، ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جنہوں نے تورات کے احکام کو مضبوطی سے تھاما، اور ایمان کے ساتھ عمل کے بھی پابند ہوئے، اور نماز کو پورے آداب کے ساتھ قائم کیا، ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے، تو جن لوگوں نے ایمان و عمل کے دونوں فرائض ادا کر کے اپنی اصلاح کر لی ان کا اجر ضائع نہیں ہو سکتا۔

اس آیت میں چند فوائد قابل غور ہیں، اول یہ کہ کتاب سے مراد اس میں وہی کتاب ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی تورات، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہر آسمانی کتاب تورات، انجیل، قرآن سب مراد ہوں۔

دوسرے یہ کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کی کتاب کو صرف اپنے پاس احتیاط اور تعظیم کے ساتھ رکھ لینے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے احکام کی پابندی مطلوب ہے شاید اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اس آیت میں کتاب کے لینے یا پڑھنے کا ذکر نہیں، ورنہ **يَا خُذُوا** یا **يَقْرَءُوا** کا لفظ ہوتا اس کی جگہ **يُمَسِّكُوا** کا لفظ اختیار کیا گیا جس کے معنی ہیں مضبوطی کے ساتھ پوری طرح تھامنا یعنی اس کے احکام کی تعمیل کرنا۔

تیسری بات قابل غور یہ ہے کہ یہاں احکام تورات کی تعمیل اور پابندی کا ذکر تھا اور احکام تورات سینکڑوں ہیں، ان میں سے اس جگہ صرف اقامت صلوٰۃ کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا، اس میں اشارہ

اس بات کی طرف ہے کہ کتاب اللہ کے احکام میں سب سے زیادہ اہم اور افضل و اعلیٰ نماز ہے نیز یہ کہ نماز کی پابندی احکام الہیہ کی پابندی کی خاص نشانی اور علامت بھی ہے کہ اس کے ذریعہ فرمان بردار اور نافرمان کی پہچان ہوتی ہے اور اس کی پابندی میں یہ خاصیت بھی ہے کہ جو نماز کا پابند ہو گیا اس کے لئے دوسرے احکام خداوندی کی پابندی بھی سہل ہو جاتی ہے اور جس نے نماز کی پابندی نہ کی اس سے دوسرے احکام کی پابندی بھی نہ ہو سکے گی، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نماز دین کا عمود ہے جس پر اس کی تعمیر کھڑی ہوئی ہے جس نے اس عمود کو قائم کر لیا اس نے دین کو قائم کر لیا اور جس نے اس کو منہدم کر دیا اس نے پورے دین کی عمارت منہدم کر دی۔

اسی لئے اس آیت میں وَالَّذِينَ يُهَيِّجُونَ يَدَايَهُمَا فِي الْكِتَابِ کے بعد وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ فرما کر یہ بتلادیا کہ کتاب سے تم شک کرنے والا اور اس کی پابندی کرنے والا صرف اسی کو سمجھا جائے گا جو نماز کو اس کے آداب و شرائط کے ساتھ پابندی سے ادا کرے، اور جو نماز میں کوتاہی کرے وہ کتنے ہی وظائف پڑھے یا مجاہدے کرے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کچھ نہیں اگرچہ اس سے کشف و کرامت کا صدور بھی ہوتا ہو۔

یہاں تک بنی اسرائیل کو ان کی عہد شکنی اور احکام تورات میں تحریف کرنے پر تنبیہ کا بیان تھا اس کے بعد دوسری آیت میں بنی اسرائیل ہی کے ایک خاص عہد کا ذکر ہے جو ان سے احکام تورات کی پابندی کے لئے ڈرا دھمکا کر گویا زبردستی لیا گیا تھا، جس کا ذکر سورۃ بقرہ میں بھی آچکا ہے۔

اس آیت میں لفظ نَتَقْنَا، نَتَّقُ سے مشتق ہے جس کے معنی کھینچنے اور اٹھانے کے ہیں، سورۃ بقرہ میں اسی واقعہ کا ذکر لفظ سَرَفَعْنَا سے کیا گیا ہے اس لئے یہاں بھی حضرت ابن عباسؓ نے نَتَقْنَا کی تفسیر سَرَفَعْنَا سے فرمائی ہے۔

اور لفظ ظِلٌّ بمعنی سایہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں سائبان، مگر لفظ سائبان عرف میں ایسی چیز کہ بولا جاتا ہے جس کا سایہ سر پر پڑتا ہو مگر وہ کسی عمود پر قائم ہو، اور اس واقعہ میں پہاڑ ان کے سر پر معلق کر دیا گیا تھا سائبان کی صورت میں نہ تھا اسی لئے اس کو حرف تشبیہ کے ساتھ ذکر کیا گیا۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ ہم نے بنی اسرائیل کے سروں پر پہاڑ کو اٹھا کر معلق کر دیا جس سے وہ سمجھنے لگے کہ اب ہم پر پہاڑ گرا چاہتا ہے، اس حالت میں ان سے کہا گیا خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ یعنی مضبوط پکڑو ان احکام کو جو ہم نے تمہیں دیئے ہیں

اور یاد رکھو تورات کی ہدایات کو تاکہ تم برے اعمال و اخلاق سے باز آجاؤ۔

واقعہ اس کا یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل کی خواہش اور فرمائش کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کتاب و شریعت مانگی اور حسب احکم اس سلسلہ میں چالیس راتوں کا اعتکاف کوہ طور پر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب ملی اور بنی اسرائیل کو سنائی تو اس میں بہت سے احکام ایسے پائے جو ان کی طبیعت اور سہولت کے خلاف تھے ان کو سن کر انکار کرنے لگے کہ ہم سے تو ان احکام پر عمل نہیں ہو سکتا، اس وقت حق تعالیٰ نے جبریل امین کو حکم دیا انہوں نے کوہ طور کو اس بستی کے اوپر معلق کر دیا جس میں بنی اسرائیل آباد تھے، اس کا رقبہ تاریخی روایتوں میں تین مربع میل بیان کیا گیا ہے، اس طرح ان لوگوں نے موت کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو سب سجدہ میں گر گئے اور احکام تورات کی پابندی کا عہد کر لیا، لیکن اس کے باوجود پھر بار بار خلاف ورزی ہی کرتے رہے دین میں جبر و اکراہ نہیں، یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن کریم کا عام اعلان ہے لَا اكْوَآةَ اس کا صحیح مطلب وہ شیعہ کا جواب فی الدین یعنی دین میں جبر و اکراہ نہیں کہ کسی کو زبردستی دین حق کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، اور اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو دین کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔

لیکن ذرا غور کیا جائے تو فرق کھلا ہوا ہے کہ کسی غیر مسلم کو اسلام کے قبول کرنے پر کبھی کہیں مجبور نہیں کیا گیا، لیکن جو شخص مسلمان ہو کر اسلامی عہد و میثاق کا پابند ہو گیا اس کے بعد وہ اگر احکام اسلام کی خلاف ورزی کرنے لگے تو اس پر ضرور جبر کیا جائے گا اور خلاف ورزی کی صورت میں سزا دی جائے گی، اسلامی تعزیرات میں بہت سی سزائیں ایسے لوگوں کے لئے مقرر ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ لَا اكْوَآةَ فی الدین کا تعلق غیر مسلموں سے ہے کہ ان کو بجز مسلمان نہیں بنایا جائے گا، اور بنی اسرائیل کے اس واقعہ میں کسی کو اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا گیا بلکہ ان لوگوں نے مسلمان ہونے کے باوجود احکام تورات کی پابندی سے انکار کر دیا، اس لئے ان پر جبر و اکراہ کر کے پابندی کرانا لَا اكْوَآةَ فی الدین کے خلاف نہیں۔

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي اٰدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ

اور جب تکلا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو

وَ اَشْهَدَ هُمْ عَلَىٰ اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلٰی ؕ

اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب بولے ہاں ہے

شَهِدْنَا ؕ اَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا

ہم اقرار کرتے ہیں، کبھی کہنے لگو قیامت کے دن ہم کو تو اس کی

غَفِلِينَ ﴿۱۴۲﴾ أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ

خبر نہ تھی یا کہنے لگو کہ شرک تو نکالا تھا ہمارے باپ دادوں نے ہم سے پہلے

وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ ۖ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ ﴿۱۴۳﴾

اور تم ہوئے ان کی اولاد ان کے پیچھے، تو کیا تو ہم کو ہلاک کرتا ہے اس کام پر جو کیا گمراہوں نے

وَكَذَلِكَ نَقُصُّكَ الْآيَاتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۱۴۴﴾

اور یوں ہم کھول کر بیان کرتے ہیں باتیں تاکہ وہ پھر آئیں -

خلاصہ تفسیر

اور (ان سے اس وقت کا واقعہ ذکر کیجئے) جب کہ آپ کے رب نے (عالم ارواح میں آدم علیہ السلام کی پشت سے تو خود ان کی اولاد کو اور) اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور (ان کو سمجھ عطا کر کے) ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے (اس عقلِ خداداد سے حقیقتِ امر کو سمجھ کر) جواب دیا کہ کیوں نہیں (واقعی آپ ہمارے رب ہیں، حق تعالیٰ نے وہاں جتنے ملائکہ اور مخلوقات حاضر تھے سب کو گواہ کر کے سب کی طرف سے فرمایا) ہم سب (اس واقعہ کے) گواہ بنتے ہیں (اور یہ اقرار اور شہادت سب اس لئے ہوا کہ) تاکہ تم لوگ (یعنی جو تم میں ترکِ توحید اور اختیارِ شرک پر سرپائیں) قیامت کے روز یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس (توحید) سے محض بے خبر تھے یا یوں کہنے لگو کہ (اصل) شرک تو ہمارے بڑوں نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد ان کے نسل میں ہوئے (اور عادۃً نسل عقائد و خیالات میں تابع اپنی اصل کے ہوتی ہے اس لئے ہم بے خطا ہیں پس ہمارے فعل پر تو ہم کو سزا ہو نہیں سکتی، اگر ہوگی تو لازم آتا ہے کہ ان بڑوں کی خطا میں ہم مانوڑ ہوں) سو کیا ان غلط راہ (نکالنے) والوں کے فعل پر آپ ہم کو ہلاکت میں ڈالے دیتے ہیں (سواب اس اقرار و شہاد کے بعد تم یہ عذر نہیں پیش کر سکتے پھر اس کے بعد ان سب سے وعدہ کیا گیا کہ یہ عہد تم کو دنیا میں پیغمبروں کے ذریعہ سے یاد دلایا جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا یہاں بھی اول میں اِذَا اخَذْنَا مِنْكُمْ آلَٰتٍ عَلٰی مَا تَعْلَمُوْنَ (آیات کو صاف ذکر کا حکم ہوا) اور (آخر میں بھی) اس یاد دہانی کو جملاتے ہیں کہ ہم اسی طرح (اپنی) آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں تاکہ ان کو اس عہد کا ہونا معلوم ہو جائے، اور تاکہ (معلوم ہونے کے بعد شرک وغیرہ سے) وہ باز آجائیں -

معارف و مسائل

عہد الست کی تفصیل و تحقیق | ان آیتوں میں اس عظیم الشان عالمگیر عہد و پیمان کا ذکر ہے جو خالق و

مخلوق اور عبد و مہبود کے درمیان اس وقت ہوا جب کہ مخلوق اس جہان کون و فساد میں آئی بھی نہ تھی، جسکو عہدِ ازل یا عہدِ الست کہا جاتا ہے۔

اللہ جلّ شأنہ سارے عالموں کا خالق و مالک ہے، زمین و آسمان اور ان کے درمیان اور ان کے مابین ہر کچھ ہے اس کی مخلوق اور ملک ہے، نہ اس پر کوئی قانون کسی کا چل سکتا ہے، نہ اس کے کسی فعل پر کسی کو کوئی سوال کرنے کا حق ہے۔

لیکن اس نے محض اپنے فضل و کرم سے عالم کا نظام ایسا بنایا ہے کہ ہر چیز کا ایک ضابطہ اور قانون ہے، قانون کے موافق چلنے والوں کے لئے ہر طرح کی دائمی راحت اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے ہر طرح کا عذاب مقرر ہے۔

پھر خلاف ورزی کرنے والے مجرم کو سزا دینے کے لئے اس کا ذاتی علم محیط کافی تھا جو عالم کے ذرہ ذرہ پر حاوی ہے اور اس کے لئے کھلے اور چھپے ہوئے تمام اعمال و افعال بلکہ دلوں میں پوشیدہ ارادے تک بالکل ظاہر ہیں اس لئے کوئی ضرورت نہ تھی کہ نگران مقرر کئے جائیں، اعمال نامے لکھے جائیں، اعمال تولے جائیں اور گواہ کھڑے کئے جائیں۔

لیکن اُسی نے خالص اپنے فضل و کرم سے یہ بھی چاہا کہ کسی کو اس وقت تک سزا نہ دیں جب تک دستاویزی ثبوت اور ناقابل انکار شہادتوں سے اس کا جرم اس کے سامنے اس طرح کھل کر نہ آجائے کہ وہ خود بھی اپنے مجرم ہونے کا اعتراف کر لے اور اپنے آپ کو مستحق سزا سمجھ لے۔

اس کے لئے ہر انسان کے ساتھ اس کے ہر عمل اور قول کو لکھنے والے فرشتے مقرر فرمادیئے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ یعنی کوئی کلمہ انسان کی زبان سے نہیں نکلتا جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نگرانی کرنے والا فرشتہ مقرر نہ ہو، اور فرمایا كُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُسْتَظَرٌّ یعنی انسان کا ہر چھوٹا بڑا کام لکھا ہوا ہے۔

پھر محشر میں میزانِ عدل قائم فرما کر انسان کے اعمال نیک و بد کو تولاجائے گا، اگر نیکیوں کا پلہ بھاری ہو گیا تو نجات پائے گا اور گناہوں اور جرائم کا پلہ بھاری ہو گیا تو گرفتار عذاب ہوگا۔

اس کے علاوہ جب حکم الحاکمین کا دربار عام محشر میں قائم ہوگا تو ہر ایک کے عمل پر شہادتیں بھی لی جائیں گی بعض مجرم گواہوں کی تکذیب کریں گے تو اس کے ہاتھ پاؤں اور اعضا و جوارح سے اور اس زمین و مکان سے جس میں یہ افعال کئے گئے گواہی لی جائے گی وہ سب بحکم خداوندی گویا ہو کر صحیح صحیح واقعات بتا دیں گے یہاں تک کہ مجرمین کو انکار و تکذیب کا کوئی

موقع باقی نہ رہے گا وہ اعتراف و اقرار کریں گے، فَاَعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ فَبِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ

پھر عوف و رحیم مالک نے اس نظام عدل و انصاف کے قائم کرنے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا، اور دنیا کی حکومتوں کی طرح نہ ایک ضابطہ اور قانون ان کو نہیں دے دیا بلکہ قانون کے ساتھ ایک نظام تربیت قائم کیا۔

جیسے بلا تشبیہ کے کوئی شفیق باپ اپنے گھریلو معاملات کو درست رکھنے اور اہل و عیال کو تہذیب و ادب سکھانے کے لئے کوئی گھریلو قانون اور ضابطہ بناتا ہے کہ جو شخص اس کے خلاف کرے گا اس کو سزا ملے گی، مگر اس کی شفقت و عنایت اس کو اس پر بھی آمادہ کرتی ہے کہ ایسا انتظام کرے جس کے سبب ان میں سے کوئی سزا کا مستحق نہ ہو بلکہ سب کے سب اس ضابطہ کے مطابق چلیں، بچے کے لئے اگر صبح کو اسکول جانے کی ہدایت اور اس کے خلاف کرنے پر سزا مقرر کر دی ہے تو باپ سویرے اس کی بھی فکر کرتا ہے کہ بچہ اس کام کے لئے وقت سے پہلے تیار ہو جائے۔

رب العالمین کی رحمت اپنی مخلوق پر ماں اور باپ کی شفقت و رحمت سے کہیں زائد ہے اس لئے اس نے اپنی کتاب کو محض قانون اور تعزیرات نہیں بنایا بلکہ ایک ہدایت نامہ بنایا ہے اور ہر قانون کے ساتھ ایسے طریقے بھی سکھائے ہیں جن کے ذریعہ قانون پر عمل سہل ہو جائے۔ اسی نظام ربوبیت کے تقاضے سے اپنے انبیاء بھیجے ان کے ساتھ آسمانی ہدایت نامے بھیجے، فرشتوں کی بہت بڑی تعداد نیکیوں کی طرف ہدایت کرنے اور مدد کرنے کے لئے مقرر فرمادی۔

اسی نظام ربوبیت کا ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ ہر قوم اور ہر فرد کو غفلت سے بیدار کرنے اور اپنے رب کریم کو یاد کرنے کے لئے مختلف قسم کے سامان پیدا کئے، زمین و آسمان کی تمام مخلوقات اور دن رات کے تغیرات اور خود انسان کے اپنے وجود کی کائنات میں اپنی یاد دلانے والی ایسی نشانیاں رکھ دیں کہ اگر ذرا بھی ہوش سے کام لے تو کسی وقت اپنے مالک کو نہ بھولے، وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ، وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ، یعنی زمین میں اہل بصیرت کے لئے ہماری نشانیاں ہیں، اور خود تمہارے وجود میں بھی، کیا کچھ بھی تم نہیں دیکھتے۔

اسی طرح غافل انسان کو بیدار کرنے اور عمل صالح پر لگانے کے لئے ایک انتظام رب العالمین نے یہ بھی فرمایا ہے کہ افراد اور جماعتوں اور قوموں سے مختلف اوقات اور حالات میں اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ عہد و پیمان لے کر ان کو قانون کی پابندی کے لئے تیار کیا گیا۔

قرآن مجید کی متعدد آیات میں بہت سے معاہدات و مواعینہ کا ذکر کیا گیا ہے جو مختلف جماعتوں سے مختلف اوقات و حالات میں لئے گئے، انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا گیا کہ جو کچھ ان کو حق تعالیٰ کی طرف سے پیغام رسالت ملے وہ اپنی اپنی امتوں کو ضرور پہنچا دیں گے، اس میں ان کے لئے کسی کا خوف اور لوگوں کی ملامت و توہین کا اندیشہ حائل نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کی اس مقدس جماعت نے اپنے اس معاہدہ کا پورا حق ادا کر دیا، پیغام رسالت کے پہنچانے میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

اسی طرح ہر رسول و نبی کی امت سے اس کا معاہدہ لیا گیا کہ وہ اپنے اپنے انبیاء کا اتباع کریں گے، پھر خاص خاص اہم معاملات میں خصوصیت کے ساتھ اس کے پورا کرنے میں اپنی پوری توانائی صرف کرنے کا عہد لیا گیا، جس کو کسی نے پورا کیا کسی نے نہیں کیا۔

انہی معاہدات میں سے ایک اہم معاہدہ وہ ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام سے ہمارے رسول کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لیا گیا کہ سب انبیاء نبی امی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کریں گے، اور جب موقع پائیں گے ان کی مدد کریں گے جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْنَاكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ

یہ تمام عہود و مواعینہ حق تعالیٰ کی رحمت کاملہ کے مظاہر ہیں اور مقصد ان کا یہ ہے کہ انسان جو کثیر النسیان ہے اکثر اپنے فرائض کو بھول جاتا ہے، اس کو بار بار ان معاہدات کے ذریعہ ہوشیار کیا گیا تاکہ وہ ان کی خلاف ورزی کر کے تباہی میں نہ پڑ جائے۔

بیعت لینے کی حقیقت | انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب علماء و مشائخ میں بھی جو بیعت لینے کا دستور رہا ہے وہ بھی اسی سنت الہیہ کا اتباع ہے، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے معاملات میں صحابہ کرام سے بیعت لی، جن میں سے بیعت رضوان کا تذکرہ قرآن کریم میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنْ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ يَعْنِي اللَّهُ رَاضِي ہو گیا ان لوگوں سے جنہوں نے ایک خاص درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

ہجرت سے پہلے انصار مدینہ کی بیعت عقبہ بھی اسی قسم کے معاہدات میں سے ہے۔ بہت سے صحابہ کرام سے ایمان اور عمل صالح کی پابندی پر بیعت لی۔ صوفیائے کرام میں جو بیعت مروج ہے وہ بھی ایمان اور عمل صالح کی پابندی اور گناہوں سے بچنے کے اہتمام کا عہد ہے اور اسی سنت اللہ اور سنت الانبیاء کا اتباع ہے، اسی وجہ سے اس میں خاص برکات ہیں کہ انسان کو گناہوں سے بچنے اور احکام شرعیہ بجالانے کی ہمت اور توفیق بڑھ جاتی ہے، بیعت کی حقیقت

معلوم ہونے سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جس طرح کی بیعت عام طور پر ناواقف جاہلوں میں رواج پاگئی ہے کہ کسی بزرگ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دینے ہی کو نجات کے لئے کافی سمجھ بیٹھتے ہیں، یہ سراسر جہالت ہے، بیعت ایک معاہدہ کا نام ہے، اس کا فائدہ جیسا ہے جب اس معاہدہ کو عملاً پورا کیا جائے ورنہ وبال کا خطرہ ہے۔

سورۃ اعراف کی گزشتہ آیات میں ان معاہدات کا ذکر تھا جو بنی اسرائیل سے احکام تورات کی پابندی کے سلسلے میں لئے گئے تھے، مذکورہ صدر آیات میں اس عالمگیر معاہدہ کا بیان ہے جو تمام اولادِ آدم سے اس عالم دنیا میں آنے سے بھی پہلے ازل میں لیا گیا جو عام زبانوں پر عہد الست کے نام سے معروف و مشہور ہے۔

وَلَاذِ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ
الآیۃ، ان آیتوں میں اولادِ آدم کے لئے لفظ ذریت استعمال فرمایا ہے، امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ یہ لفظ دراصل لفظ ذرء سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پیدا کرنے کے، قرآن کریم میں کئی جگہ یہ لفظ اس معنی کے لئے استعمال ہوا ہے وَلَقَدْ ذَرَأْنَا الْجَحْتُمْ كَثِيرًا، وغیرہ، اس لئے ذریت کا لفظی ترجمہ مخلوق کا ہوا، اس لفظ سے اشارہ کر دیا گیا کہ یہ عہد ان تمام لوگوں کے لئے عام و شامل تھا جو آدم علیہ السلام کے واسطے سے اس دنیا میں پیدا کئے جائیں گے۔

روایات حدیث میں اس عہدِ ازل کی مزید کچھ تفصیلات آئی ہیں :
امام مالک، ابوداؤد، ترمذی اور امام احمد نے بروایت مسلم بن یسار نقل کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت فاروقِ اعظمؓ سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کا مطلب پوچھا گیا تھا، آپ سے جو جواب میں نے سنا ہے وہ یہ ہے کہ

”اللہ تعالیٰ نے پہلے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، پھر اپنا دستِ قدرت ان کی پشت پر پھیرا تو ان کی پشت سے جو نیک انسان پیدا ہونے والے تھے وہ نکل آئے تو فرمایا کہ ان کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ جنت ہی کے کام کریں گے، پھر دوسری مرتبہ ان کی پشت پر دستِ قدرت پھیرا تو جتنے گناہ گار بدکردار انسان ان کی نسل سے پیدا ہونے والے تھے ان کو نکال کھڑا کیا اور فرمایا کہ ان کو میں نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ دوزخ میں جانے ہی کے کام کریں گے۔“

صحابہ میں سے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ جب پہلے ہی جنتی اور دوزخی

منتعین کر دیئے گئے تو پھر عمل کس مقصد کے لئے کرایا جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو جنت کے لئے پیدا فرماتے ہیں تو وہ اہل جنت ہی کے کام کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ کسی ایسے ہی کام پر ہوتا ہے جو اہل جنت کا کام ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کسی کو دوزخ کے لئے بناتے ہیں تو وہ دوزخ ہی کے کام میں لگ جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا خاتمہ بھی کسی ایسے ہی کام پر ہوتا ہے جو اہل جہنم کا کام ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ جب انسان کو معلوم نہیں کہ وہ کس طبقہ میں داخل ہے تو اس کو اپنی توانائی اور قدرت و اختیار ایسے کاموں میں خرچ کرنا چاہئے جو اہل جنت کے کام ہیں اور یہی امید رکھنا چاہئے کہ وہ انہی میں سے ہوگا۔

اور امام احمد کی روایت میں یہی مضمون بروایت حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ منقول ہے، اس میں اتنا اور زیادہ ہے کہ پہلی مرتبہ جو لوگ آدم علیہ السلام کی پشت سے نکلے وہ سفید رنگ کے تھے جن کو اہل جنت فرمایا، اور دوسری مرتبہ سیاہ رنگ کے تھے جن کو اہل جہنم قرار دیا۔ اور ترمذی میں یہی مضمون بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ منقول ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ اس طرح قیامت تک پیدا ہونے والی اولادِ آدم جو ظہور میں آئی ان میں سے ہر ایک کی پیشانی پر ایک خاص قسم کی چمک تھی۔

اب غور طلب یہ ہے کہ ان احادیث میں تو ذریت کو آدم علیہ السلام کی پشت سے لینے اور نکالنے کا ذکر ہے اور قرآن کریم کے الفاظ میں بنی آدم یعنی اولادِ آدم کی پشت سے نکالنا مذکور ہے۔ تطبیق اس کی یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی پشت سے ان لوگوں کو نکالا گیا جو بلا واسطہ آدم علیہ السلام سے پیدا ہونے والے تھے، پھر ان کی نسل کی پشت سے دوسروں کو اور اسی طرح جس ترتیب سے اس دنیا میں اولادِ آدم پیدا ہونے والی تھی اسی ترتیب سے ان کی پشتوں سے نکالا گیا۔

حدیث میں سب کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدم علیہ السلام سے ان کی اولاد کو پھر اس اولاد سے ان کی اولاد کو ترتیب وار پیدا کیا گیا۔

قرآن مجید میں اس سب ذریتِ آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لینے میں اس کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ ذریتِ آدم جو اس وقت پشتوں سے نکالی گئی تھی صرف ارواح نہیں تھیں بلکہ روح اور جسم کا ایسا مرکب تھا جو جسم کے لطیف ترین ذرات سے بنایا گیا تھا، کیونکہ ربوبیت اور تربیت کی ضرورت زیادہ تر وہیں ہوتی ہے جہاں جسم و روح کا مرکب ہو اور جس کو ایک حال سے دوسرے

حال کی طرف ترقی کرنا ہو، ارواح کی یہ شان نہیں وہ تو اول سے آخر تک ایک ہی حال پر رہتی ہیں، اس کے علاوہ احادیث مذکورہ میں ہوان کے رنگ سفید و سیاہ مذکور ہیں یا ان کی پیشانی کی چمک مذکور ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف روح بلا جسم نہیں تھی ورنہ روح کا تو کوئی رنگ نہیں ہوتا، جسم ہی کے ساتھ یہ اوصاف متعلق ہوتے ہیں۔

اور اس پر کوئی تعجب نہ کیا جائے کہ قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسان ایک جگہ میں کس طرح سما گئے، کیونکہ حضرت ابوالدرداءؓ کی حدیث مذکور میں اس کی بھی تصریح ہے کہ اس وقت جو ذریعہ پشتِ آدم علیہ السلام سے نکالی گئی تھی وہ اپنے اس ڈیل ڈول کے ساتھ نہیں تھی جس میں وہ دنیا میں آئیں گے بلکہ چھوٹی چیونٹی کے مجتہ میں تھی، اور سائنس کی اس ترقی کے زمانہ میں تو کسی سمجھ دار انسان کو کوئی اشکال اس میں ہونا ہی نہیں چاہئے کہ اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ایک چیونٹی کے مجتہ میں کیسے ظاہر ہوا، آج تو ایٹم کے اندر تمام نظام شمسی کے موجود ہونے کا تجربہ کیا جا رہا ہے، فلم کے ذریعہ بڑی سے بڑی چیز کو ایک نقطہ کی مقدار دکھلایا جاسکتا ہے، اس لئے یہ کیا مشکل ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عہد و میثاق کے وقت تمام بنی آدم کو بہت چھوٹے مجتہ میں وجود عطا فرمایا ہو۔

عہدِ ازل کے متعلق | اس عہدِ ازل کے متعلق چند چیزیں اور قابلِ غور ہیں :

چند سوال و جواب | اول یہ کہ عہد و اقرار کس جگہ اور کس وقت لیا گیا؟

دوسرے یہ کہ جب اقرار اس حال میں لیا گیا کہ آدم علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا انسان پیدا بھی نہ ہوا تھا تو ان کو یہ عقل و علم کیسے حاصل ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پہچانیں اور اس کے رب ہونے کا اقرار کریں، کیونکہ ربوبیت کا اقرار وہ کر سکتا ہے جس نے شانِ تربیت کا مشاہدہ کیا ہو اور یہ مشاہدہ اس دنیا میں پیدا ہونیکے بعد ہی ہو سکتا ہے؟

پہلا سوال کہ یہ عہد و اقرار کس جگہ اور کس وقت لیا گیا، اس کے متعلق مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جو روایت بسند قوی امام احمد، نسائی اور حاکم نے نقل کی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ عہد و اقرار اس وقت لیا گیا جب آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارا گیا، اور مقام اس اقرار کا وادی نعمان ہے جو میدانِ عرفات کے نام سے معروف و مشہور ہے۔ (تفسیر مظہری)

رہا دوسرا سوال کہ یہ نئی مخلوق جس کو ابھی وجود عنصری بھی پوری طرح عطا نہیں ہوا وہ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارا کوئی پیدا کرنے والا اور پروردگار ہے، ایسی حالت میں ان سے سوال کرنا بھی ایک قسم کی ناقابلِ برداشت تکلیف ہے، اور وہ جواب بھی کیا دے سکتے ہیں۔ اس کا

جواب یہ ہے کہ خالق کائنات جس کی قدرت کاملہ نے تمام انسانوں کو ایک ذرہ کی صورت میں پیدا فرمایا اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ اس نے ان کو عقل و فہم اور شعور و ادراک بھی اس وقت بقدر ضرورت دے دیا ہو، اور یہی حقیقت ہے کہ اللہ جل شانہ نے اس مختصر وجود میں انسان کے تمام قومی کو جمع فرمادیا تھا جن میں سب سے بڑی قوت عقل و شعور کی ہے۔

انسان کے اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ شانہ کی عظمت و قدرت کی وہ بے شمار نشانیاں ہیں جن پر ذرا بھی غور کرنے والا اللہ تعالیٰ کی معرفت سے غافل نہیں رہ سکتا، قرآن کریم کا ارشاد ہے، وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ، وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ، یعنی زمین میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لئے، اور خود تمہارے وجود میں بھی، کیا پھر بھی تم نہیں دیکھتے۔

یہاں ایک تیسرا سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ازلی عہد و پیمان کتنا ہی یقینی اور صحیح کیوں نہ ہو مگر کم از کم یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اس دنیا میں آنے کے بعد یہ عہد کسی کو یاد نہیں رہا تو پھر عہد کا فائدہ کیا ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو اسی نوع بنی آدم میں بہت سے ایسے افراد بھی ہیں جنہوں نے یہ اقرار کیا ہے کہ ہمیں یہ عہد پوری طرح یاد ہے، حضرت ذوالنون مصری نے فرمایا کہ یہ عہد و پیمان مجھے ایسا یاد ہے گویا اس وقت سن رہا ہوں، اور بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جس وقت یہ اقرار لیا گیا میرے آس پاس میں کون کون لوگ موجود تھے، ہاں یہ ظاہر ہے کہ ایسے افراد شاذ و نادر کے درجہ میں ہیں، اس لئے عالم لوگوں کے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو بالخاصہ اثر رکھتے ہیں، چاہے وہ کام کسی کو یاد رہے یا نہ رہے بلکہ اس کی خبر بھی نہ ہو مگر وہ اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں، یہ عہد و اقرار بھی ایسی ہی حیثیت رکھتا ہے کہ دراصل اس اقرار نے ہر انسان کے دل میں معرفت حق کا ایک بیج ڈال دیا جو پرورش پا رہا ہے چاہے اس کو خیر ہو یا نہ ہو، اور اسی بیج کے پھل پھول ہیں کہ ہر انسان کی فطرت میں حق تعالیٰ کی محبت و عظمت پائی جاتی ہے خواہ اس کا ظہور بت پرستی اور مخلوق پرستی کے کسی غلط پیرایہ میں ہو، وہ چند بد نصیب لوگ جن کی فطرت ہی مسخ ہو کر ان کا عقلی ذائقہ خراب ہو گیا اور میٹھے کڑوے کی پہچان جاتی رہی ان کے علاوہ باقی ساری دنیا کے اربوں انسان اللہ تعالیٰ کی دھن اور خیال اور عظمت سے خالی نہیں، پھر چاہے مادی خواہشات میں مبتلا ہو کر یا کسی گمراہ سوسائٹی میں پڑ کر وہ اس کو بھلا دیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ وَفِي بَعْضِ الرِّوَايَاتِ عَلَى هَذِهِ الْمِلَّةِ (اخراج البخاری و مسلم) یعنی ہر پیدا ہونے والا دین فطرت

یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو دوسرے خیالات میں مبتلا کر دیتے ہیں اور صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندوں کو خلیف یعنی ایک خدا کا ماننے والا پیدا کیا ہے پھر شیاطین ان کے پیچھے لگ گئے اور ان کو اس صحیح راستہ سے دُور لے گئے۔

اسی طرح بالخاصہ اثر رکھنے والے بہت سے اعمال و اقوال ہیں جو اس دنیا میں بھی انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے جاری ہیں جن کا اثر یہ ہے کہ ان کو کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اور یاد رکھے یا نہ رکھے وہ بہر حال اپنا کام کرتے اور اپنا اثر دکھلاتے ہیں۔

مثلاً بچہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت و تکبیر کہنے کی جو سنت، ہر مسلمان جانتا ہے اور بحمد اللہ پورے عالم اسلام میں جاری ہے، اگرچہ بچہ نہ کلمات کے معنی سمجھتا ہے نہ اس کو بڑا ہونے کے بعد یاد رہتا ہے کہ میرے کان میں کیا الفاظ کہے گئے تھے، اس کی حکمت یہی تو ہے کہ اس کے ذریعہ اس اقرارِ ازیلی کو قوت پہنچا کر کانوں کی راہ سے دل میں ایمان کی تخم ریزی کی جاتی ہے، اور اسی کا یہ اثر مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ بڑا ہونے کے بعد اگرچہ یہ اسلام اور اسلامیات سے کتنا ہی دور ہو جائے مگر اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اور مسلمانوں کی فہرست سے الگ ہونے کو انتہائی بُرا سمجھتا ہے، اسی طرح جو لوگ قرآن کی زبان نہیں جانتے ان کو بھی تلاوتِ قرآن کا حکم شاید اسی حکمت پر مبنی ہے کہ اس سے بھی کم از کم یہ محفی فائدہ ضرور پہنچ جاتا ہے کہ انسان کے قلب میں نورِ ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

اسی لئے آخر آیت میں ارشاد فرمایا اَنْ تَقُولُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ یعنی یہ اقرار ہم نے اس لئے لیا ہے کہ تم قیامت کے دن یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس سے غافل تھے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس ازیلی سوال و جواب سے تمہارے دلوں میں ایمان کی بنیاد ایسی قائم ہو گئی کہ ذرا بھی غور و فکر سے کام لو تو اللہ جل شانہ کی ربوبیت کے اعتراف کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ارشاد فرمایا، اَوْ تَقُولُوْا اِنَّمَا اَشْرَكْنَا اٰبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ اَفَنُهِّلُكُمَا بِمَا فَعَلِ الْمُظِلُّوْنَ، یعنی یہ اقرار ہم نے اس لئے بھی لیا ہے کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ عذر نہ کرنے لگو کہ شرک و بت پرستی تو دراصل ہمارے بڑوں نے اختیار کر لی تھی اور ہم تو ان کے بعد ان کی اولاد تھے، کھرے کھوٹے اور صحیح غلط کو نہیں پہچانتے تھے اس لئے بڑوں نے جو کچھ کیا ہم نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تو بڑوں کے جرم کی سزا ہمیں کیوں دی جائے۔ حق تعالیٰ نے بتلادیا کہ دوسروں کے فعل کی سزا تم کو نہیں دی گئی بلکہ خود تمہاری غفلت

کی سزا ہے کیونکہ اس اقرارِ ازیلی نے انسان میں ایک ایسی عقل و بصیرت کا تخم ڈال دیا تھا کہ ذرا بھی غور و فکر سے کام لیتا تو اتنی بات سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں تھا کہ یہ پتھر کے بت جن کو ہم نے اپنے ہاتھوں تراشا ہے، یا آگ اور پانی، اور درخت یا کوئی انسان، ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو کوئی انسان اپنا پیدا کرنے والا اور پروردگار یا حاجت روا مشکل کشا یقین کر سکے۔

تیسری آیت میں اسی مضمون کا بیان اس طرح آیا ہے، وَكَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ الْاٰیٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ، یعنی ہم اسی طرح اپنی نشانہوں کو کھول کھول کر بیان کیا کرتے ہیں تاکہ لوگ غفلت اور کج روی سے باز آجائیں، مراد یہ ہے کہ آیاتِ الہیہ میں ذرا بھی غور کریں تو وہ اس عہد و میثاق کی طرف لوٹ آئیں جو ازل میں کیا گیا تھا یعنی الشرحل شانہ کی ربوبیت کا اعتراف کرنے لگیں اور اس کے نتیجہ میں اس کی اطاعت کو لازم سمجھیں۔

وَ اٰثِلٌ عَلَيْهِمْ نَبَا الَّذِیْ ءَاْتٰیْنٰهُ ءَاٰیٰتِنَا فَاَنْسٰخَ مِنْهَا

اور سُنَادے ان کو حال اس شخص کا جس کو ہم نے دی تھیں اپنی آیتیں پھر وہ ان کو پھوڑ نکلا

فَاتَّبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۱۴۵﴾ وَلَوْ يَشَآءُنَا

پھر اس کے پیچھے لگا شیطان تو وہ ہو گیا گمراہوں میں اور ہم چاہتے

لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰیْہٖ

تو بلند کرتے اس کا رتبہ ان آیتوں کی بدولت، لیکن وہ تو ہو رہا زمین کا اور پیچھے ہو لیا اپنی خواہش کے

فَمِثْلُ كَمِثْلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْہٗ

تو اس کا حال ایسا ہے جیسے کُتّا، اس پر تو بوجھ لادے تو ہانپے اور پھوڑ دے

يَلْهَثُ ذٰلِكَ مِثْلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِآٰیٰتِنَا

تو ہانپے یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو

فَاَقْصِصْ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ سَاَءَ مَثَلًا

سو بیان کر یہ احوال تاکہ وہ دھیان کریں بری مثال ہے

الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِآٰیٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا

ان لوگوں کی کہ جھٹلایا انہوں نے ہماری آیتوں کو اور وہ اپنا ہی

يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

نقصان کرتے رہے۔

خلاصہ تفسیر

اور ان لوگوں کو (عبرت کے واسطے) اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیے کہ اس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں (یعنی احکام کا علم دیا) پھر وہ ان (آیتوں) سے بالکل ہی نکل گیا پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، سو وہ گمراہ لوگوں میں داخل ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کے مقتضایہ عمل کرنے کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے (یعنی اگر وہ ان آیتوں پر عمل کرتا جس کا وابستہ قضا و قدر ہونا امر معلوم ہے تو اس کا رتبہ قبول بڑھتا) لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا اور (اس میلان کے سبب) اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا (اور آیات و احکام پر عمل چھوڑ دیا) سو (آیات کو چھوڑ کر جو پریشانی اور ذلت دائمی اس کو نصیب ہوئی اس کے اعتبار سے) اس کی حالت کتنے کی سی ہو گئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے (اور مار کر نکال دے) تب بھی ہانپے یا اس کو (اس کی حالت) پر چھوڑ دے تب بھی ہانپے (کسی حالت میں اس کو راحت نہیں) اسی طرح یہ شخص ذلت میں تو کتنے کے مشابہ ہو گیا اور پریشانی میں کتنے کی اس صفت میں شریک ہوا پس جیسی اس شخص کی حالت ہوئی، یہی حالت (عام طور پر) ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو (جو کہ توحید و رسالت پر دال ہیں) جھٹلایا (کہ وضوح حق کے بعد محض ہوی پرستی کے سبب حق کو ترک کرتے ہیں) سو آپ اس حال کو بیان کر دیجئے شاید وہ لوگ (اس کو سن کر) کچھ سوچیں، (حقیقت میں) ان لوگوں کی حالت بھی بُری حالت ہے جو ہماری آیات (دالہ علی التوحید والرسالة) کو جھٹلاتے ہیں اور (اس تکذیب سے) وہ اپنا (بھی) نقصان کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں بنی اسرائیل کا ایک عبرت ناک قصہ مذکور ہے جس میں بنی اسرائیل کے ایک بڑے عالم اور مشہور مقتدر کا علم و معرفت کے اعلیٰ معیار پر ہونے کے بعد دفعۃً گمراہ و مردود ہو جانے کا واقعہ مع اس کے اسباب کے بیان کیا گیا ہے اور اس میں بہت سی عبرتیں ہیں۔

اور مناسبت اس واقعہ کی پچھلی آیتوں سے یہ ہے کہ ان میں عہد و میثاق کا ذکر تھا جو ازل میں حق تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اور پھر خاص خاص حالات میں خاص خاص اقوام یہود و نصاریٰ وغیرہ سے لئے تھے، اور مذکورہ آیات میں اس کا بھی ذکر آیا تھا کہ عہد کرنے والوں میں بہت سے لوگ اس عہد پر قائم نہیں رہے، جیسے یہود کہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس

دنیا میں تشریف لانے سے پہلے آپ کے آنے کا انتظار کرتے اور آپ کی صفات و شمائل لوگوں سے بیان کیا کرتے اور ان کی تصدیق کیا کرتے تھے، مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو دنیا کی ذلیل اغراض کی خاطر آپ پر ایمان لانے اور آپ کا اتباع کرنے سے باز رہے۔

بنی اسرائیل کے ایک عالم مقتدا کی گمراہی کا عبرتناک واقعہ اور مشہور پیشوا کا ایسا ہی حال عروج کے بعد تنزل اور ہدایت کے بعد گمراہی کا مذکور ہے کہ وسیع علم اور پوری معرفت حاصل ہونے کے باوجود، جب نفسانی اغراض اس پر غالب آئیں تو یہ سب علم و معرفت اور مقبولیت ختم ہو کر گمراہ اور ذلیل و خوار ہو گیا۔

قرآن کریم میں اس شخص کا نام اور کوئی شخص مذکور نہیں، ائمہ تفسیر صحابہ و تابعین سے اس کے بارے مختلف روایتیں مذکور ہیں، جن میں زیادہ مشہور اور جمہور کے نزدیک قابل اعتماد روایت وہ ہے جو حضرت ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ اس شخص کا نام بلعم بن باعوراء ہے یہ ملک شام میں بیت المقدس کے قریب کنعان کا رہنے والا تھا، اور ایک روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل میں سے تھا، اللہ تعالیٰ کی بعض کتابوں کا علم اس کو حاصل تھا، قرآن کریم میں جو اس کی صفت میں آئی ہے اَلَّذِي اَتَيْنَاهُ الْكِتَابَ فَرَّأَاہُ اس سے اسی علم کی طرف اشارہ ہے۔

جب غرق فرعون اور فتح مصر کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو قوم جبائین سے جہاد کرنے کا حکم ملا اور جبائین نے دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کا لشکر لے کر پہنچ گئے اور ان کے مقابل قوم فرعون کا غرق و غارت ہونا ان کو پہلے سے معلوم ہو چکا تھا تو ان کو فکر ہوئی اور جمع ہو کر بلعم بن باعوراء کے پاس آئے اور کہا کہ موسیٰ علیہ السلام سخت آدمی ہیں اور ان کے ساتھ بہت سے لشکر ہیں اور وہ اس لئے آئے ہیں کہ ہم کو ہمارے ملک سے نکال دیں، آپ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ ان کو ہمارے مقابلہ سے واپس کر دیں، و جہر یہ تھی کہ بلعم بن باعوراء کو اس عظیم معلوم تھا وہ اس کے ذریعہ جوڑ دعا کرتا تھا قبول ہوتی تھی۔

بلعم نے کہا افسوس ہے تم کیسی بات کہتے ہو، وہ اللہ کے نبی ہیں ان کے ساتھ اللہ کے فرشتے ہیں میں ان کے خلاف بد دعا کیسے کر سکتا ہوں حالانکہ ان کا مقام جو اللہ کے نزدیک ہے وہ بھی میں جانتا ہوں اگر میں ایسا کروں گا تو میرا دین دنیا دونوں تباہ ہو جائیں گے۔

ان لوگوں نے بے حد اصرار کیا تو اس پر بلعم نے کہا کہ اچھا میں اپنے رب سے اس معاملہ میں معلوم کر لوں کہ ایسی دعا کرنے کی اجازت ہے یا نہیں، اس نے اپنے معمول کے مطابق

معلوم کرنے کے لئے استخارہ یا کوئی عمل کیا، خواب میں اس کو بتلایا گیا کہ ہرگز ایسا نہ کرے، اس نے قوم کو بتلادیا کہ مجھے بددعا کرنے سے منع کر دیا گیا ہے، اس وقت قوم جبّارین نے باجم کو کوئی بڑا ہدیہ پیش کیا جو درحقیقت رشوت تھی، اس نے ہدیہ قبول کر لیا تو پھر اس قوم کے لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے کہ آپ ضرور یہ کام کر دو اور الحاح و اصرار کی حد نہ رہی، بعض روایات میں ہے کہ اس کی بیوی نے مشورہ دیا کہ یہ رشوت قبول کر لیں اور ان کا کام کر دیں، اس وقت بیوی کی رضا ہوئی اور مال کی محبت نے اس کو اندھا کر دیا تھا، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف بددعا کرنا شروع کی۔

اس وقت قدرت الہیہ کا عجیب کرشمہ یہ ظاہر ہوا کہ وہ جو کلمات بددعا کے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے لئے کہنا چاہتا تھا اس کی زبان سے وہ الفاظ بددعا خود اپنی قوم جبّارین کے لئے نکلے، وہ چلا اٹھے کہ تم تو ہمارے لئے بددعا کر رہے ہو، بلعم نے جواب دیا کہ یہ میرے اختیار سے باہر ہے میری زبان اس کے خلاف پر قادر نہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم پر بھی تباہی نازل ہوئی اور بلعم کو یہ سزا ملی کہ اس کی زبان اس کے سینہ پر لٹک گئی، اور اب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ میری تو دنیا و آخرت تباہ ہو گئی اب دُعا تو میری چلتی نہیں لیکن میں تمہیں ایک چال بتاتا ہوں جس کے ذریعہ تم موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر غالب آ سکتے ہو۔

وہ یہ ہے کہ تم اپنی حسین لڑکیوں کو مزین کر کے بنی اسرائیل کے لشکر میں بھیج دو اور ان کو یہ تاکید کر دو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ان کے ساتھ جو کچھ کریں کرنے دیں، رکاوٹ نہ بنیں، یہ لوگ مسافر ہیں، اپنے گھروں سے مارت کے نکلے ہوئے ہیں، اس تدبیر سے ممکن ہے کہ یہ لوگ حرام کاری میں مبتلا ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک حرام کاری انتہائی مبغوض چیز ہے جس قوم میں یہ ہو، اس پر ضرور قہر و عذاب نازل ہوتا ہے، وہ فاتح و کامران نہیں ہو سکتی۔ بلعم کی یہ شیطانی چال ان کی سمجھ میں آ گئی، اس پر عمل کیا گیا، بنی اسرائیل کا ایک بڑا آدمی اس چال کا شکار ہو گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اس و بال سے روکا مگر وہ باز نہ آیا، اور شیطانی چال میں مبتلا ہو گیا۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل میں سخت قسم کا طاعون پھیل گیا جس سے ایک روز میں ستر ہزار اسرائیلی مر گئے، یہاں تک کہ جس شخص نے برا کام کیا تھا اس جوڑے کو بنی اسرائیل نے قتل کر کے منظر عام پر ٹانگ دیا کہ سب لوگوں کو عبرت حاصل ہو، اور توبہ کی، اس وقت یہ طاعون رفع ہوا۔

قرآن مجید کی مذکور الصدر آیات میں اس کے متعلق فرمایا **فَأَتَسْتَخِفُّ مِنْهَا يَمْنًا** نے اپنی آیات اور ان کا علم و معرفت اس شخص کو عطا کیا تھا لیکن وہ اس سے نکل گیا، انسلاخ کا لفظ اصل میں جانور کے کھال کے اندر سے یا سانپ کا کیچلی کے اندر سے نکل جانے کے لئے بولا جاتا ہے، اس جگہ علم آیات کو ایک لباس یا کھال کے ساتھ تشبیہ دے کر یہ بتلایا گیا کہ یہ شخص علم و معرفت سے بالکل جدا ہو گیا، **فَأَتَسْتَخِفُّ الشَّيْطَانُ** یعنی پیچھے لگ گیا اس کے شیطان، مطلب یہ ہے کہ جب تک علم آیات اور ذکر اللہ اس کے ساتھ تھا، شیطان کا قابو اس پر نہ چل سکتا تھا جب وہ جانا رہا تو شیطان اس پر قابو یافتہ ہو گیا **فَكَانَ مِنَ الْغَوِينَ**، یعنی پھر ہو گیا وہ گمراہوں میں سے، مطلب یہ ہے کہ شیطان کے قابو میں آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہوں میں شامل ہو گیا۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا **وَكُوشِئْنَا لَمَّا رَقَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ**، یعنی اگر ہم چاہتے تو انہی آیات کے ذریعہ اس کو بلند مرتبہ کر دیتے، لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا اور نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے لگا، لفظ **أَخْلَدَ**، **إِخْلَادٌ** سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف میلان کے یا کسی جگہ کو لازم پکڑنے کے اور **أَرْضِ** کے اصلی معنی زمین کے ہیں، دنیا کی جتنی چیزیں ہیں وہ سب یا خود زمین ہے یا زمین سے متعلق گھر، جائیداد، کھیتی، باغ وغیرہ ہیں، یا زمین سے ہی پیدا ہونے والی کڑوٹوں چیزیں ہیں جو انسان کی زندگی اور عیش کا مدار ہیں، اس لئے لفظ **أَرْضِ** بول کر اس جگہ پوری دنیا مراد لی گئی ہے، اس آیت میں اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ آیات الہیہ اور ان کا علم ہی اصل میں سر بلندی اور ترقی کا سبب ہیں، لیکن جو شخص ان آیات کا احترام نہ کرے اور دنیا کی ذلیل خواہشات کو آیات الہیہ پر مقدم جانے اس کے لئے یہی علم ایک وبال بن جاتا ہے۔ اسی وبال کا ذکر آیت میں اس طرح کیا گیا ہے، **فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ**، لفظ **لَهَثَ** کے اصل معنی یہ ہیں کہ زبان نکال کر سختی کے ساتھ سانس لیا جائے۔

ہر جاندار اپنی زندگی میں اس کا محتاج ہے کہ اندر کی گرم اور زہریلی ہوا کو باہر پھینکے اور باہر سے تازہ ہوا خلق اور ناک کے راستہ سے اندر لے جائے، اسی پر جاندار کی زندگی کا مدار ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کیلئے اس اہم کام کو ایسا آسان کر دیا ہے کہ بلا ارادہ اور بلا محنت اس کی ناک کے نھنوں سے اندر کی ہوا باہر اور باہر کی تازہ ہوا اندر جاتی ہے، اس میں نہ اس کو کوئی زور لگانا پڑتا ہے نہ کسی اختیاری عمل کی ضرورت پڑتی ہے، قدرتی اور فطری طور پر یہ

کام مسلسل خود بخود ہوتا رہتا ہے۔

جانداروں میں صرف کتا ایسا جانور ہے جس کو اپنے سانس کی آمد و رفت میں زبان نکال کر زور لگانا اور محنت کرنی پڑتی ہے، اور دوسرے جانوروں کی یہ کیفیت صرف اس وقت ہوتی ہے جب کہ ان پر کوئی حملہ کرے یا وہ تھک جائیں یا کوئی اتفاقی محنت ان پر پڑ جائے۔ قرآن کریم نے اس شخص کی کتے کے ساتھ مثال دی، وجہ یہ ہے کہ محکم خداوندی کی جلا و رزی کرنے کی اس کو یہ سزا ملی تھی کہ زبان منہ سے نکل کر سینہ پر لٹک گئی تھی اور وہ برابر کتے کی طرح ہانپتا تھا خواہ کوئی اس پر حملہ کرے یا نہ کرے وہ ہر حال میں ہانپتا رہتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا، ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الّٰذِينَ كَذَّبُوْا بِآيَاتِنَا، یعنی یہی مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مراد اس سے اہل مکہ ہیں جو ہمیشہ سے یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ ان کے پاس کوئی ہادی اور رہبر آئے جو ان کو اللہ تعالیٰ کی طاعت کی طرف بلائے اور طاعت کے صحیح طریقے سکھائے، پھر جب وہ رہبر آگئے اور ایسی کھلی نشانیوں کے ساتھ آئے کہ ان کے صدق و حقانیت میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی تو ان کی تکذیب کرنے اور آیاتِ الہیہ سے روگردانی کرنے لگے۔

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں، جو بعثت نبوی سے پہلے آپ کی علامات و خصوصیات تورات میں پڑھ کر لوگوں کو بتلایا کرتے اور آپ کی تشریف آوری کا انتظار کیا کرتے تھے، مگر جب آپ تشریف لائے تو سب سے زیادہ دشمنی اور مخالفت انہی لوگوں نے کی اور تورات کے احکام سے ایسے صاف نکل گئے جیسے بلعم بن باعورا نکل گیا تھا۔

آخر آیت میں فرمایا فَاقْصِصْ الْقِصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ یعنی آپ اس شخص کا واقعہ ان لوگوں کو سنائی دیجئے، شاید یہ کچھ سوچیں اور اس کے واقعہ سے عبرت حاصل کریں۔ تیسری آیت میں فرمایا کہ آیاتِ الہیہ کو جھٹلانے والوں کا برا حال ہے اور یہ لوگ اپنی ہی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں اور کسی کا کچھ نہیں بگاڑتے۔

آیات مذکورہ اور ان میں بیان کئے ہوئے واقعہ میں اہل فکر کے لئے بہت سے فوائد اور عبرتیں اور نصیحتیں ہیں :-

اول یہ کہ کسی شخص کو اپنے علم و فضل اور زہد و عبادت پر ناز نہیں کرنا چاہئے، حالات بدلتے اور بگڑتے ہوئے دیر نہیں لگتی، جیسے بلعم بن باعورا، کاشتر ہوا، طاعت و عبادت کے ساتھ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر اور استقامت کی دعا اور اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کرنا چاہئے۔

دوسرے یہ کہ ایسے مواقع اور ان کے مقدمات سے بھی آدمی کو پرہیز کرنا چاہئے جہاں اس کو اپنے دین کی خرابی کا اندیشہ ہو، خصوصاً مال اور اہل و عیال کی محبت میں اس انجام بد کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔

تیسرے یہ کہ مفسد اور گمراہ لوگوں کے ساتھ تعلق اور ان کا ہدیہ یا دعوت وغیرہ قبول کرنے سے بھی پرہیز کرنا چاہئے، بلعم اس بلا میں ان کا ہدیہ قبول کرنے کے سبب مبتلا ہوا۔ چوتھے یہ کہ بے حیائی اور حرام کاری پوری قوم کے لئے تباہی اور بربادی کا سامان ہوتی ہے، جو قوم اپنے آپ کو بلاؤں اور آفتوں سے محفوظ رکھنا چاہے اس پر لازم ہے کہ اپنی قوم کو بے حیائی کے کاموں سے پورے اہتمام کے ساتھ روکے ورنہ خدا تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہوگا۔

پانچویں یہ کہ آیات الہیہ کی خلاف ورزی خود بھی ایک عذاب ہے اور اس کی وجہ سے شیطان اس پر غالب آکر ہزاروں خرابیوں میں بھی مبتلا کر دیتا ہے، اس لئے جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے علم دین عطا کیا ہو اس کو چاہئے کہ اس کی قدر کرے اور اصلاح عمل کی فکر سے کسی وقت فارغ نہ ہو۔

مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِیْ ۚ وَمَنْ يُضِلْ فَأُولَٰئِكَ

جس کو اللہ درست دے وہ ہی رستہ پاوے اور جس کو وہ بھلاوے سو وہی

هُمْ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ

پس ٹوٹے میں اور ہم نے پیدا کئے دوزخ کے واسطے بہت سے

الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَا یَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْیُنٌ

جن اور آدمی ، ان کے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں ، اور آنکھیں ہیں

لَا یُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اُذُنٌ لَا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ اُولَٰئِكَ

کہ ان سے دیکھتے نہیں ، اور کان ہیں کہ ان سے سنتے نہیں ، وہ ایسے ہیں

کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۚ اُولَٰئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ، وہی لوگ ہیں غافل ۔

خلاصہ تفسیر

جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت کرتا ہے سو ہدایت پانے والا وہی ہوتا ہے اور جس کو گمراہ

کردے سوائے ہی لوگ (ابدی) خسارہ میں پڑ جاتے ہیں (پھر ان سے توقع ہدایت کی کرنا اور ہدایت نہ ہونے سے منغمم ہونا بیکار) اور (جب وہ لوگ اپنے قومی مُدِر کے کام ہی نہیں لیتے تو ہدایت کہاں سے ہو، سوان کے نصیب میں تو دوزخ ہی ہے چنانچہ ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ (ہی میں رہنے) کے لئے پیدا کئے ہیں جن کے (نام کو تو) دل (ہیں مگر) ایسے ہیں جن سے (حق بات کو) نہیں سمجھتے (چونکہ اس کا ارادہ ہی نہیں کرتے) اور جن کے (نام کو تو) آنکھیں (ہیں مگر) ایسی ہیں جن سے (نظر استدلال کے طور پر کسی چیز کو) نہیں دیکھتے اور جن کے (نام کو تو) کان (ہیں مگر) ایسے ہیں جن سے (متوجہ ہو کر حق بات کو) نہیں سنتے (غرض) یہ لوگ (آخرت کی طرف سے بے توجہ ہونے میں) چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ (اس حیثیت سے کہ چوپایوں کو آخرت کی طرف متوجہ ہونے کا مکلف تو نہیں بنایا گیا سوان کا متوجہ نہ ہونا مذموم نہیں اور ان کو تو اس کا حکم ہے پھر بھی بے توجہی کرتے ہیں سوا اس اعتبار سے) یہ لوگ (ان چوپایوں سے بھی) زیادہ بے راہ ہیں (کیونکہ) یہ لوگ (باوجود توجہ دلانے کے آخرت سے) غافل ہیں (بخلاف چوپایوں کے، جیسا اوپر بیان ہوا)

معارف و مسائل

پہلی آیت کا مضمون یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے صحیح راستہ کی ہدایت کر دی وہ ہی ہدایت پانے والا ہے اور جن کو گمراہ کر دیا تو وہ ہی خسارے اور نقصان میں پڑنے والے ہیں۔ یہ مضمون قرآن مجید کی بہت سی آیات میں بار بار آیا ہے، جس میں بتلایا گیا ہے کہ ہدایت اور گمراہی اور ہر خیر و شر، اچھے بُرے کا خالق صرف اللہ جلّ شانہ ہے، انسان کے سامنے اچھے بُرے، صحیح غلط دونوں راستے کر دیئے گئے ہیں اور اس کو ایک خاص قسم کا اختیار دیا گیا ہے وہ اپنے اس اختیار کو اگر اچھے اور صحیح راستہ میں خرچ کرتا ہے تو ثواب اور جنت کا مستحق ہوتا ہے، بُرے اور غلط راستے میں لگاتا ہے تو عذاب اور جہنم میں ٹھکانا ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہدایت پانے والے کو بصیغہ مفرد ذکر کیا گیا اور گمراہی اختیار کرنے والوں کو بصیغہ جمع، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہدایت کا راستہ صرف ایک ہی دین حق ہے جو آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء علیہم السلام کا طریق رہا ہے، اصول سب کے مشترک اور ایک ہیں، اس لئے حق کی پیروی کرنے والے خواہ کسی زمانہ میں اور کسی نبی کی امت میں اور کسی دین و مذہب سے متعلق ہوں وہ سب ایک ہیں۔

اور گمراہی کے ہزاروں راستے الگ الگ ہیں اس لئے گمراہوں کو بصیغہ جمع قائلینک
ہم الخیرون فرمایا گیا۔

نیز اس آیت میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ گمراہی اختیار کرنے والوں کی توسل اور
انجام بد کا ذکر کیا گیا کہ وہ لوگ خسارہ میں پڑنے والے ہیں، اس کے بالمقابل ہدایت یافتہ
حضرات کی کسی خاص جزاء کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ وہ ہدایت یافتہ
ہیں۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ہدایت ایسی عظیم الشان نعمت ہے جو دین و
دنیا کی ساری نعمتوں اور رحمتوں پر حاوی ہے، دنیا میں حیات طیبہ اور آخرت میں جنت کی
لازوال نعمتیں سب ہدایت ہی کے ساتھ وابستہ ہیں، اس لحاظ سے ہدایت خود ایک بھاری
نعمت اور بہت بڑا انعام ہے جس کے بعد ان نعمتوں کے شمار کرنے کی ضرورت نہیں رہتی جو
ہدایت کے صلہ میں ملنے والی ہیں۔

اس کی مثال ایسی ہے کوئی بڑی حکومت و سلطنت کا مالک کسی شخص کو یہ کہہ دے کہ
تم ہمارے مقرب ہو ہم تمہاری بات سنیں اور مانیں گے تو ہر جانتے والا جانتا ہے کہ اس سے
بڑا کوئی عہدہ و منصب یا کوئی دولت اس کے لئے نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو ہدایت یافتہ کا خطاب دے دیا تو اس کو
دین و دنیا کی ساری نعمتیں حاصل ہو گئیں، اسی لئے بزرگان سلف نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر
و عبادت خود ہی اپنی جزاء اور اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان عطا ہے، جو شخص ذکر اللہ میں مشغول
ہے وہ اسی وقت اللہ تعالیٰ کا انعام نقد پارہا ہے، آخرت و جنت کا انعام دوسری نعمت
ہے، اسی سے قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم بھی سمجھ میں آجاتا ہے جس میں فرمایا جَزَاءُ مَنْ
مَرَّ بِكَ عَطَاءٌ کہ ایک ہی چیز کو جزاء بھی فرمایا گیا اور عطا بھی، حالانکہ دونوں چیزیں الگ
الگ ہیں، جزاء کسی عمل کا معاوضہ ہوتا ہے اور عطا بلا معاوضہ۔

اس میں جزاء و عطا کی حقیقت بتلا دی کہ جس چیز کو تم جزاء اور عمل کا بدلہ سمجھتے
ہو وہ بھی درحقیقت ہماری عطا و انعام ہی ہے کیونکہ جس عمل کا یہ بدلہ ملتا ہے وہ عمل خود ہمارا
انعام تھا۔

دوسری آیت میں بھی اسی مضمون کی مزید وضاحت ہے کہ ہدایت اور گمراہی دونوں
اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں جس کو ہدایت مل گئی اس سے سارے کام ہدایت ہی
کے مناسب مزد ہوتے ہیں۔

خرد چون دفتر تلقین کشاید زمن آن در وجود آید کہ باید

اور جو گمراہی میں پڑ گیا اس کے سارے کام اسی انداز کے ہوتے ہیں۔

اس لئے فرمایا وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ لَٰكِنَّ قُلُوبَهُمْ لَا تَفْقَهُونَ
بَيِّنَاتٍ وَلَهُمْ آغِیُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ اِذَا نُوا لَا يَسْمَعُونَ بِهَا یعنی ہم نے جہنم کے لئے پیدا
کیا ہے بہت سے جنات اور انسانوں کو جن کی علامات یہ ہیں کہ ان کے پاس سمجھنے کے لئے
قلوب اور دیکھنے کے لئے آنکھیں اور سننے کے لئے کان سب کچھ موجود ہیں، جن کو وہ صحیح استماع
کریں تو صراطِ ستقیم کو پالیں اور نفع نقصان کو سمجھ لیں، لیکن ان کا یہ حال ہے کہ نہ وہ قلوب
سے بات سمجھتے ہیں، نہ آنکھوں سے دیکھنے کی چیزوں کو دیکھتے ہیں اور نہ کانوں سے سننے کی
چیزوں کو سنتے ہیں۔

اس میں یہ بتا دیا کہ اگرچہ تقدیر الہی ایک رازِ سرِ بستہ ہے جس کا کسی کو اس دنیا میں علم
نہیں ہوتا لیکن اس کی علامات سے کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اہل جہنم کی علامت یہ ہے کہ وہ
خدا تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں کو ان کے صحیح کاموں میں نہ لگائیں، صحیح علم و معرفت کے لئے جو اللہ
جل شانہ نے عقل اور آنکھ کان عطا فرمائے ہیں ان کو وہ بے مصرف چیزوں میں لگاتے ہیں
اور اصل مقصد جس کے ذریعہ دائمی اور لازوال راحت و دولت مل سکتی تھی اس کی طرف
دھیان نہیں دیتے۔

آیت میں کافروں سے سمجھنے، دیکھنے، سننے کی نفی جو بظاہر مشاہدہ کے خلاف ہے،
کس حقیقت پر مبنی ہے؟

اس آیت میں ان لوگوں کی سمجھ بوجھ اور بینائی و شنوائی
سب چیزوں کی بالکل نفی کی گئی ہے کہ یہ نہ کچھ سمجھتے ہیں
نہ کوئی چیز دیکھتے ہیں نہ کوئی کلام سنتے ہیں، حالانکہ واقعہ
اور مشاہدہ یہ ہے کہ یہ لوگ نہ یا گل و دیوانے ہوتے ہیں جو کچھ نہ سمجھیں اور نہ نابینا ہوتے ہیں
کہ کچھ نہ دیکھیں اور نہ بہرے ہوتے ہیں کہ کچھ نہ سنیں، بلکہ مشاہدہ یہ ہے کہ دنیا کے کاموں میں
یہ اکثر لوگوں سے زیادہ چالاک اور ہوشیار نظر آتے ہیں۔

مگر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے ہر مخلوق کے اندر اس کی ضرورت
کے مطابق اور اس کے مقصدِ حیات کے مناسب عقل و شعور رکھا ہے، جن چیزوں کو ہم بے عقل
اور بے حس و شعور کہتے اور سمجھتے ہیں درحقیقت وہ بھی حس و ادراک اور عقل و شعور سے خالی
نہیں، البتہ یہ چیزیں ان میں اسی مقدار سے ہیں جو مقدار ان کے مقصدِ وجود کو پورا کرنے
کے لئے کافی ہو، سب سے کم عقل و شعور اور جس جمادات یعنی مٹی اور پتھر وغیرہ میں ہے،
جن کو نہ کچھ پڑھنا ہے نہ اپنی جگہ سے نکلنا اور چلنا پھرنا، وہ اتنی قلیل ہے کہ ان میں حیات
کے آثار کا پہچانا بھی بہت دشوار ہے، اُس سے کچھ زائد نباتات میں ہے جن کے مقصدِ وجود

میں بڑھنا، پھلنا پھولنا داخل ہے، اسی کے مناسب عقل و ادراک ان کو دے دیا گیا، اس کے بعد حیوانات کا نمبر ہے، جن کے مقصد وجود میں بڑھنا بھی داخل ہے چلنا پھرنے بھی اور چل پھر کر اپنی غذا حاصل کرنا بھی اور ضرر و مہلک چیزوں سے بچنا بھاگنا بھی اور نسل پیدا کرنا بھی، اس لئے ان کو جو عقل و شعور ملا وہ اوروں سے زیادہ ملا مگر اتنا ہی جس سے وہ اپنے کھانے پینے پیٹ بھرنے سونے جاگنے وغیرہ کا انتظام کر لیں اور دشمن سے اپنی جان بچالیں، سب کے بعد انسان کا نمبر ہے جس کا مقصد وجود سب چیزوں سے آگے یہ ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کو پہچانے، اس کی مرضی کے مطابق چلے، اس کی ناپسند چیزوں سے پرہیز کرے، ساری مخلوقات کے حقائق پر نظر ڈالے اور ان سے کام لے اور ہر چیز کے نتائج اور عواقب کو سمجھے، کھرے کھوٹے اچھے برے کو پرکھے، برائیوں سے بچے، اچھائیوں کو اختیار کرے، اسی نوع انسانی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کو ترقی کرنے کا بڑا میدان ملا ہے جو دوسری نوع کو حاصل نہیں، یہ جب ترقی کرتا ہے تو فرشتوں کی صف سے آگے مقام پاتا ہے، اسی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے اعمال و افعال پر جزاء و سزا ہے، اسی لئے اس کو عقل و شعور تمام انواع مخلوقات سے زائد ملا ہے تاکہ وہ عام حیوانات کی سطح سے بلند ہو کر اپنے مقصد وجود کے مناسب کاموں میں لگے، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مخصوص عقل و شعور اور اس کی بخشی ہوئی بینائی و شنوائی کو اسی کام میں صرف کرے۔

جب یہ حقیقت سامنے آگئی تو ایک انسان کا سمجھنا، دیکھنا، سننا دوسرے جانوروں کے سمجھنے، دیکھنے، سننے سے مختلف ہونا چاہئے اگر اس نے بھی صرف انہی چیزوں میں اپنی عقل اور بینائی و شنوائی کی طاقتوں کو لگا دیا جن میں دوسرے جانور لگاتے ہیں اور جو کام انسان کے لئے مخصوص تھا کہ ہر چیز کے نتائج و عواقب پر نظر رکھے اور برائیوں سے بچے بھلائیوں کو اختیار کرے، ان پر دھیان نہ دیا، اس کو باوجود عقل رکھنے کے بے عقل، باوجود بینا ہونے نابینا، باوجود سننے والا ہونے کے بہرا ہی کہا جائے گا، اسی لئے قرآن کریم نے دوسرے جگہ ایسے لوگوں کو صَہْمٌ بَکُمُ عَمٰیؕ، یعنی بہرے، گونگے، اندھے فرمایا ہے۔

اس میں اس کا بیان نہیں کہ وہ اپنے کھانے پینے، رہنے سہنے اور سونے جاگنے کی ضروریات کو سمجھتے نہیں، یا یہ کہ ان کے متعلق چیزوں کو دیکھتے سنتے نہیں بلکہ خود قرآن کریم نے ان لوگوں کے بارے میں ایک جگہ فرمایا، یَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ، یعنی یہ لوگ ظاہر حیات دنیا کو خوب جانتے ہیں مگر آخرت سے غافل و جاہل ہیں، اور فرعون و ہامان اور ان کی قوموں کے بارے میں فرمایا وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِیْنَ

یعنی یہ لوگ بڑے روشن خیال تھے، مگر چونکہ ان کی دانائی و بینائی کا سارا مصرف صرف اتنا ہی رہا جتنا عام جانوروں کا ہوتا ہے کہ اپنے تن بدن کی خدمت کر لیں، روح کی خدمت اور اس کی راحت کے متعلق کچھ نہ سوچا نہ دیکھا، اس لئے وہ ان معاشیات اور عمرانیات میں کتنی ہی ترقی کر لیں، چاند اور مریخ کو فتح کر لیں، مصنوعی سیاروں سے دنیا کی فضا کو بھریں لیکن یہ سب خدمت صرف تن بدن کے ڈھانچہ اور پیٹ ہی کی ہے، اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس لئے دائمی چین و راحت کا سامان بنے، اس لئے قرآن کریم ان کو اندھا بہرا کہتا ہے اور اس آیت میں انکے سمجھنے، دیکھنے، سننے کی نفی کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو سمجھنا چاہتے تھا وہ نہیں سمجھے جو دیکھنا چاہتے تھا وہ نہیں دیکھا جو سننا چاہتے تھا وہ نہیں سنا، اور جو کچھ سمجھا اور دیکھا اور سنا وہ عام حیوانات کی سطح کی چیزیں تھیں جن میں گدھا گھوڑا، بیل بکری سب شریک ہیں۔

اسی لئے آیت مذکورہ کے آخر میں ان لوگوں کے متعلق فرمایا، اُولَٰئِكَ كَانُوا لِنَعَامٍ کہ یہ لوگ پویاؤں کی طرح ہیں کہ بدن کے صرف موجودہ ڈھانچہ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، روٹی اور پیٹ ان کے فکر کی آخری معراج ہے، پھر فرمایا بَلْ هُمْ أَضَلُّ بَلْکہ یہ لوگ پویاؤں اور جانوروں سے بھی زیادہ بے وقوف ہیں، وجہ یہ ہے کہ جانور احکام شرعیہ کے مکلف نہیں، ان کے لئے جزا و سزا نہیں، ان کا مقصد اگر صرف موجودہ زندگی اور اس کے ڈھانچہ کی درستی تک رہے تو صحیح ہے، مگر انسان کو تو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور اس پر جزا و سزا ہونے والی ہے، اس لئے اس کا ان کاموں کو اپنا مقصد سمجھ بیٹھنا جانوروں سے زیادہ بے وقوفی ہے، اس کے علاوہ جانور اپنے آقا و مالک کی خدمت پوری بجالاتے ہیں اور نافرمان انسان اپنے رب اور مالک کی خدمت میں قصور کرتا ہے اس لئے وہ جانوروں سے زیادہ بے وقوف اور غافل ٹھہرا، اسی لئے فرمایا اُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔

وَاللّٰهُ اَسْمَاءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِهَا وَذُرُّوْا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ

اور اللہ کے لئے ہیں سب اچھے نام سو اس کو پکارو وہی نام کہہ کر اور چھوڑ دو ان کو جو کج راہ چلتے ہیں

فِیْ اَسْمَآئِهِۦ سَیْجَزُوْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

اس کے ناموں میں، وہ بدلہ پارہیں گے اپنے کئے کا

خلاصہ تفسیر

اور اچھے اچھے (مخصوص) نام اللہ ہی کے لئے (خاص) ہیں سو ان ناموں سے اللہ ہی

کو موسوم کیا کرو اور دوسروں پر ان ناموں کا اطلاق مت کیا کرو بلکہ، ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھو جو اس کے (مذکورہ) ناموں میں کج روی کرتے ہیں (اس طرح سے کہ غیر اللہ پر ان کا اطلاق کرتے ہیں جیسا وہ لوگ ان کو معبود اور الہ اعتقاد کے ساتھ کہتے تھے، ان لوگوں کو ان کے کئے کی ضرور سزا ملے گی۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں اہل جہنم کا ذکر تھا جنہوں نے اپنی عقل و حواس کو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے دیکھنے، سننے اور سمجھنے سوچنے میں صرف نہیں کیا اور آخرت کی دائمی اور لازوال زندگی کے لئے کوئی سامان فراہم نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہو گیا کہ وہ خدا داد عقل و بصیرت کو ضائع کر کے ذکر اللہ کے ذریعہ اپنے نفس کی اصلاح و فلاح سے غافل ہو گئے اور جانوروں سے زیادہ گمراہی اور بے وقوفی میں مبتلا ہو گئے۔

مذکورہ آیت میں ان کے مرض کا علاج اور درد کی دوا بتلائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا اور ذکر اللہ کی کثرت ہے، فرمایا **وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِهَا**، یعنی اللہ ہی کے لئے ہیں اچھے نام، تو تم پکارو اس کو انہی ناموں سے۔

اسماء حسنیٰ کی تشریح | اچھے نام سے مراد وہ نام ہیں جو صفات کمال کے اعلیٰ درجہ پر دلالت کرنے والے ہیں، اور ظاہر ہے کہ کسی کمال کا اعلیٰ درجہ جس سے اوپر کوئی درجہ نہ ہو سکے وہ صرف خالق کائنات جلّ و علا شأنہ ہی کو حاصل ہے اس کے سوا کسی مخلوق کو یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہر کامل سے دوسرا شخص اکمل اور فاضل سے افضل ہو سکتا ہے **فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ** کا یہی مطلب ہے کہ ہر ذی علم سے بڑھ کر کوئی دوسرا علیم ہو سکتا ہے۔

اسی لئے اس آیت میں ایسی عبارت اختیار کی گئی جس سے معلوم ہو کہ یہ اسماء حسنیٰ صرف اللہ ہی کی خصوصیت ہے دوسروں کو حاصل نہیں، **فَادْعُوْهُ بِهَا**، یعنی جب یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اسماء حسنیٰ ہیں اور وہ اسماء اسی کی ذات کے ساتھ خاص ہیں تو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو پکارو اور انہی اسماء حسنیٰ کے ساتھ پکارو۔

پکارنا یا بللانا دُعَا کا ترجمہ ہے، اور دُعَا کا لفظ قرآن میں دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک اللہ کا ذکر، اس کی حمد و ثنا تسبیح و تمجید کے ساتھ، دوسرے حاجات و مشکلات کے وقت اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت طلب کرنا اور مصائب و آفات سے نجات

اور مشکلات کی آسانی کی درخواست کرنا، اس آیت میں **فَاذْعُوهُ بِهَا** کا لفظ دونوں معنی کو شامل ہے تو معنی آیت کے یہ ہوئے کہ حمد و ثنا اور تسبیح کے لائق بھی صرف اسی کی ذات پاک ہے اور مشکلات و مصائب سے نجات اور حاجت روائی بھی صرف اسی کے قبضہ میں ہے، اس لئے حمد و ثنا کرو تو اسی کی کرو اور حاجت روائی، مشکل کشائی کے لئے پکارو تو اسی کو پکارو۔

اور پکارنے کا طریقہ بھی یہ بتلادیا کہ انہی اسماء حسنی کے ساتھ پکارو جو اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں۔

دُعَا کے بعض آداب | اس لئے اس آیت سے دو ہدایتیں امت کو ملیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ذات حقیقی حمد و ثنا یا مشکل کشائی اور حاجت روائی کے لئے پکارنے کے لائق نہیں، دوسرے یہ کہ اس کے پکارنے کے لئے بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو الفاظ چاہے اختیار کر لے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں وہ الفاظ بھی بتلادیئے جو اس کے شایاں ہیں اور ہمیں پابند کر دیا کہ انہی الفاظ کے ساتھ اس کو پکاریں، اپنی تجویز سے دوسرے الفاظ نہ بدلیں کیونکہ انسان کی قدرت نہیں کہ تمام پہلوؤں کی رعایت کر کے شایان شان الفاظ بنا سکے۔

بخاری و مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو شخص ان کو محفوظ کر لے وہ جنت میں داخل ہوگا، یہ ننانوے نام امام ترمذی اور حاکم نے تفصیل کے ساتھ بتلائے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے یہ ننانوے نام پڑھ کر جس مقصد کے لئے دعا کی جائے قبول ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے **اَدْعُونِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ** یعنی تم مجھے پکارو تو میں تمہاری دعا قبول کروں گا، حاجات و مشکلات کے لئے دعا سے بڑھ کر کوئی تدبیر ایسی نہیں جس میں کسی ضرر کا خطرہ نہ ہو اور نفع یقینی ہو، اپنی حاجات کے لئے اللہ جل شانہ سے دعا کرنے میں کسی نقصان کا تو کوئی احتمال ہی نہیں، اور ایک نفع نقد ہے کہ دعا ایک عبادت ہے، اس کا ثواب اس کے نامہ اعمال میں لکھا جاتا ہے، حدیث میں ہے **الدُّعَاءُ مُنْتَعِلُ الْعِبَادَةِ** یعنی دعا کرنا عبادت کا مغز ہے اور جس مقصد کے لئے اس نے دعا کی ہے اکثر تو وہ مقصد بعینہ پورا ہو جاتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس چیز کو اس نے اپنا مقصد بنایا تھا وہ اس کے حق میں مفید نہ تھی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی دعا کو دوسری طرف پھیر دیتے ہیں جو اس کے لئے مفید ہو، اور حمد و ثنا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا ایمان کی غذا ہے جس کے نتیجے میں انسان کی رغبت و

محبت اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہو جاتی ہے اور دنیا کی تکلیفیں اگر پیش بھی آویں تو حقیر اور آسان ہو جاتی ہیں۔

اسی لئے بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی کی صحیح احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو کوئی غم یا بے چینی یا مہم کام پیش آئے اس کو چاہئے کہ یہ کلمات پڑھے، سب مشکلات آسان ہو جائیں گی وہ کلمات یہ ہیں :

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْعَظِيمُ الْحَلِيمُ ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ،

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ

اور مستدرک حاکم میں بروایت انس رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہراءؓ سے فرمایا کہ تمہارے لئے اس سے کیا چیز مانع ہے کہ تم میری وصیت کو سن لو اور اس پر عمل کیا کرو، وہ وصیت یہ ہے کہ صبح شام یہ دعا کر لیا کرو :

يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيْثُ أَصْلِحْ لِي شَأْنِي كُلَّهُ وَلَا تَكِلْنِي إِلَى نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ ۔

یہ دعا بھی تمام حاجات و مشکلات کے لئے بے نظیر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ کے اس جملہ میں دو ہدایتیں اُمت کو دی گئیں، ایک یہ کہ حمد و ثنا اور مشکلات و حاجات کے لئے صرف اللہ تعالیٰ کو پکارو و مخلوقات کو نہیں، دوسرے یہ کہ اس کو انہی ناموں سے پکارو جو اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں، اس کے الفاظ نہ بدلو۔ آیت کے اگلے جملہ میں اسی کے متعلق ارشاد فرمایا وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ، یعنی چھوڑیئے ان لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں الحاد یعنی کجروی کرتے ہیں، ان کو ان کی کجروی کا بدلہ مل جائے گا، الحاد کے معنی لغت میں میلان اور درمیانی راہ سے ہٹ جانے کے آتے ہیں، اسی لئے قبر کی لحد کو لحد کہا جاتا ہے کیونکہ وہ درمیان سے ہٹتی ہوئی ہوتی ہے، قرآن کریم میں لفظ الحاد قرآن کریم کے صحیح معانی کو چھوڑ کر ادھر ادھر کی تاویل و تحریف کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ آپ ایسے لوگوں سے تعلق بھی چھوڑ دیں جو اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں الحاد یعنی تحریف اور کجروی سے کام لیتے ہیں۔

| | |
|-----------------------------------|--|
| اسماءِ الہیہ میں کج روی کی ممانعت | اسماءِ الہیہ میں تحریف یا کجروی کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ |
| اور اس کی مختلف صورتیں | سب اس آیت کے مضمون میں داخل ہیں :- |

اولیٰ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے وہ نام استعمال کیا جائے جو قرآن و حدیث میں اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت نہیں، علماء حق کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام اور صفات میں کسی کو یہ اختیار نہیں کہ جو چاہے نام رکھ دے یا جس صفت کے ساتھ چاہے اس کی حمد و ثنا کرے بلکہ صرف وہی الفاظ ہونا ضروری ہیں جو قرآن و سنت میں اللہ تعالیٰ کے لئے بطور نام یا صفت کے ذکر کئے گئے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کو کریم کہہ سکتے ہیں، سخی نہیں کہہ سکتے، نور کہہ سکتے ہیں بعض نہیں کہہ سکتے، شافی کہہ سکتے ہیں طبیب نہیں کہہ سکتے، کیونکہ یہ دوسرے الفاظ منقول نہیں اگرچہ انہی الفاظ کے ہم معنی ہیں۔

دوسری صورت اتحاد فی الاسماء کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو نام قرآن و سنت سے ثابت ہیں ان میں سے کسی نام کو نامناسب سمجھ کر چھوڑ دے، اس کا بے ادبی ہونا ظاہر ہے۔

کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کے مخصوص نام | تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص ناموں کو کسی سے موسوم یا مخاطب کرنا جائز نہیں | دوسرے شخص کے لئے استعمال کرے، مگر اس میں تفصیل

ہے کہ اسماء حسنیٰ میں سے بعض نام ایسے بھی ہیں جن کو خود قرآن و حدیث میں دوسرے لوگوں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے، اور بعض وہ ہیں جن کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لئے استعمال کرنا قرآن و حدیث سے ثابت نہیں، تو جن ناموں کا استعمال غیر اللہ کے لئے قرآن و حدیث سے ثابت ہے وہ نام تو اوروں کے لئے بھی استعمال ہو سکتے ہیں جیسے رحیم، رشید، علی، کریم، عزیز وغیرہ، اور اسماء حسنیٰ میں سے وہ نام جن کا غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا قرآن و حدیث سے ثابت نہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں ان کو غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا اتحاد مذکور میں داخل اور ناجائز و حرام ہے مثلاً رحمن، سبحان، رزاق، خالق، غفار، قدوس وغیرہ پھر ان مخصوص ناموں کو غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا اگر کسی غلط عقیدہ کی بناء پر ہے کہ اس کو ہی خالق یا رازق سمجھ کر ان الفاظ سے خطاب کر رہا ہے تب تو ایسا کہنا کفر ہے اور اگر عقیدہ غلط نہیں محض بے فکری یا بے سمجھی سے کسی شخص کو خالق، رزاق یا رحمن، سبحان کہہ دیا تو یہ اگرچہ کفر نہیں مگر مشرکانہ الفاظ ہونے کی وجہ سے گناہ شدید ہے۔

افسوس ہے کہ آج کل عام مسلمان اس غلطی میں مبتلا ہیں، کچھ لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے اسلامی نام ہی رکھنا چھوڑ دیئے، ان کی صورت و سیرت سے تو پہلے بھی مسلمان سمجھنا ان کا مشکل تھا، نام سے پتہ چل جاتا تھا، اب نئے نام انگریزی طرز کے رکھے جانے لگے، لڑکیوں کے نام خولین اسلام کے طرز کے خلاف خدیجہ، عائشہ، فاطمہ کے بجائے نسیم، شمیم، شہناز، نجمہ، پروین ہونے لگے، اس سے زیادہ افسوس ناک یہ ہے کہ جن لوگوں کے اسلامی نام ہیں، عبدالرحمن، عبدالخالق،

عبدالرزاق، عبدالغفار، عبدالقدوس وغیرہ، ان میں تخفیف کا یہ غلط طریقہ اختیار کر لیا گیا کہ صرف آخری لفظ ان کے نام کی جگہ پکارا جاتا ہے، رحمن، خالق، رزاق، غفار کا خطاب انسانوں کو دیا جا رہا ہے اور اس سے زیادہ غضب کی بات یہ ہے کہ قدرت اللہ کو اللہ صاحب اور قدرت خدا کو خدا صاحب کے نام سے پکارا جاتا ہے یہ سب ناجائز و حرام اور گناہ کبیرہ ہے، جتنی مرتبہ یہ لفظ پکارا جاتا ہے اتنی ہی مرتبہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہوتا ہے اور سننے والا بھی گناہ سے خالی نہیں رہتا۔

یہ گناہ بے لذت اور بے فائدہ ایسا ہے جس کو ہمارے ہزاروں بھائی اپنے شب و روز کا مشغلہ بناتے ہوئے ہیں اور کوئی فکر نہیں کرتے کہ اس ذرا سی حرکت کا انجام کتنا خطرناک ہے جس کی طرف آیت مذکورہ کے آخری جملہ میں تنبیہ فرمائی گئی ہے، سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ یعنی ان کو اپنے کئے کا بدلہ دیا جائے گا، اُس بدلہ کی تعیین نہیں کی گئی، اس ابہام سے عذاب شدید کی طرف اشارہ ہے۔

جن گناہوں میں کوئی دنیوی فائدہ یا لذت و راحت ہے ان میں تو کوئی کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں اپنی خواہش یا ضرورت سے مجبور ہو گیا، مگر افسوس یہ ہے کہ ہر مسلمان ایسے بہت سے فضول گناہوں میں بھی اپنی جہالت یا غفلت سے مبتلا نظر آتے ہیں جن میں نہ دنیا کا کوئی فائدہ ہے نہ ادنیٰ درجہ کی کوئی راحت و لذت ہے وجہ یہ ہے کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی طرف دھیان ہی نہ رہا۔ نعوذ باللہ منہ

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿۱۸۱﴾

اور ان لوگوں میں کہ جن کو ہم نے پیدا کیا ہے ایک جماعت ہے کہ راہ بتلاتے ہیں سچی اور اسی کے موافق انصاف کرتے ہیں

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ

اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے ایسی جگہ سے جہاں سے

لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۸۲﴾ وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿۱۸۳﴾ أَوَلَمْ

ان کو خبر بھی نہ ہوگی، اور میں ان کو ڈھیل دوں گا بیشک میرا داؤ پلکا ہے، کیا انہوں نے

يَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جَنَّةٍ إِنَّ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ

دھیان نہیں کیا کہ ان کے رفیق کو کچھ بھی جنوں نہیں، وہ تو ڈرانے والا ہے

مُبِينٌ ﴿۱۸۴﴾ أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

صاف، کیا انہوں نے نظر نہیں کی سلطنت میں آسمان اور زمین کی

وَمَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا وَأَنْ عَلَيَّ أَنْ يَكُونَ قَدِ

اور جو کچھ پیدا کیا ہے اللہ نے ہر چیز سے اور اس میں کہ شاید قریب آگیا ہو

اَقْتَرَبَ أَجَلُهُمْ ۖ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ ۙ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۸۵﴾

ان کا وعدہ، سو اس کے پیچھے کس بات پر ایمان لائیں گے۔

خلاصہ تفسیر

اور ہماری مخلوق جن و انس میں (سب گمراہ ہی نہیں بلکہ) ایک جماعت (ان میں) ایسی بھی ہے (جو دین) حق (یعنی اسلام) کے موافق (لوگوں کو) ہدایت (بھی) کرتے ہیں اور اسی کے موافق (اپنے اور غیروں کے معاملات میں) انصاف بھی کرتے ہیں اور جو لوگ ہماری آیات کو بھٹکتے ہیں ہم ان کو بتدریج جہنم کی طرف) لئے جا رہے ہیں اس طور کہ ان کو خبر بھی نہیں اور (دنیا میں عذاب نازل کر ڈالنے سے) ان کو مہلت دیتا ہوں، بیشک میری تدبیر بہت مضبوط ہے کیا ان لوگوں نے اس بات میں غور نہ کیا کہ ان کا جن سے سابقہ ہے ان کو ذرا بھی جہنم نہیں وہ تو صرف ایک صاف صاف (عذاب سے) ڈرانے والے ہیں (جو کہ اصالتہً پیغمبر کا کام ہوتا ہے) اور کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عالم میں اور (نیز) دوسری چیزوں میں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں (تاکہ ان کو توحید کا علم استدلالی حاصل ہو جاتا) اور اس بات میں بھی غور نہیں کیا کہ ممکن ہے کہ ان کی اہل قریب ہی پہنچی ہو (تاکہ احتمال عذاب سے ڈرتے اور اس سے بچنے کی فکر کرتے اور اس فکر سے دین حق مل جاتا اور امکان قرب اہل ہر وقت ہے اور جب قرآن جیسے موثر کلام سے ان کی فکر تک کو حرکت نہیں ہوتی تو) پھر قرآن کے بعد کو کسی بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں اہل جہنم کے حالات و صفات اور ان کی گمراہی کا یہ سبب بیان کیا تھا کہ انہوں نے خدا داد عقل و بصیرت اور فطری قوتوں کو ان کے اصلی کام میں نہ لگایا اور ضائع کر دیا پھر اس کے بعد ان کے مرض کا علاج اسماء اللہیہ اور ذکر اللہ کے ذریعہ بتلایا گیا تھا، مذکورہ آیات سے پہلی آیت میں ان کے بالمقابل اہل ایمان اور اہل حق کا ذکر ہے جنہوں نے عقل خدا داد سے کام لے کر صحیح راستہ اختیار کیا، ارشاد ہے، وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةً يَهْتَدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ یعنی جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا ہے ان میں ایک امت ایسی ہے جو حق

کے موافق ہدایت کرتے ہیں یعنی لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اور جب ان کے آپس میں کوئی نزاع یا مقدمہ پیش آئے تو اپنے جھگڑوں کا فیصلہ بھی حق یعنی قانونِ الہی کے ماتحت کرتے ہیں۔

امام تفسیر ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو تلاوت کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ امت جس کا ذکر اس آیت میں ہے، میری امت ہے، جو اپنے سب جھگڑوں کے فیصلے حق و انصاف یعنی قانونِ الہی کے مطابق کریں گے اور لینے دینے کے تمام معاملات میں حق و انصاف کو سامنے رکھیں گے۔

اور عبد بن حمید کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو خطاب کر کے فرمایا کہ یہ آیت تمہارے حق میں آئی ہے اور تم سے پہلے بھی ایک امت کو یہ صفات عطا ہو چکی ہیں، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی، وَمِنْ تَوْحِيدِ مَوْسَىٰ أُمَّةٍ يُهْدِي ذُرِّيَّةَ بَنِي إِسْرَءِيلَ يَتْلُو آيَاتِ رَبِّهِمْ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ ظُلُمَاتٍ إِلَىٰ نُورٍ وَيَهْدِيَهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ، مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں بھی ایک جماعت ان صفات کی حامل تھی کہ لوگوں کی رہنمائی میں اور باہمی جھگڑوں کے تصفیہ میں حق یعنی شریعتِ الہیہ کا مکمل اتباع کرتی تھی، اور امتِ محمدیہؐ کو بھی حق تعالیٰ نے ان صفات میں خصوصی امتیاز بخشا ہے۔

خلاصہ اس کا دو خصلتیں ہیں ایک یہ کہ دوسرے لوگوں کی قیادت اور رہنمائی یا مشورہ میں شریعت کا اتباع کریں، دوسرے یہ کہ اگر کوئی جھگڑا آپس میں پیش آجائے تو اس کا فیصلہ شریعت کے قانون کے مطابق کریں۔

غور کیا جائے تو یہی دو خصلتیں ہیں جو کسی قوم اور جماعت کی خیر و خوبی اور فلاح دنیا و آخرت کی ضامن ہو سکتی ہیں کہ صلح و جنگ اور دوستی اور عداوت کی ہر حالت میں ان کا نصب العین حق و انصاف ہی ہو، اپنے دوستوں اور رفیقوں کو جو طریقہ کار بتلائیں اس میں بھی حق کا اتباع ہو اور دشمنوں اور حریفوں کے جھگڑوں میں بھی حق کے آگے اپنے سارے خیالات و خواہشات کو ترک کر دیں جس کا خلاصہ ہے حق پرستی۔

امتِ محمدیہؐ کی دوسری تمام امتوں پر فضیلت اور فوقیت کا راز اور ان کا طعنائے امتیاز یہی حق پرستی ہے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی کو حق کے تابع بنایا، جس جماعت یا پارٹی کی قیادت اور رہنمائی کی وہ بھی خالص حق کے تقاضوں کے مطابق کی، اپنی ذاتی خواہشات اور خاندانی یا قومی رسوم کو اس میں مطلق دخل نہیں دیا، اور باہمی نزاعات میں بھی ہمیشہ حق کے سامنے گردن جھکا دی، صحابہ و تابعین کی پوری تاریخ اس کی آئینہ دار ہے۔

اور جب سے اس امت میں ان دو خصلتوں کے اندر خلل اور نقصان آیا اسی وقت سے اس کا تنزل و انحطاط شروع ہو گیا۔

نہایت رنج و افسوس کا مقام ہے کہ آج یہی حق پرست امت خالص ہوا پرست بنکر رہ گئی ہے، اس کی پارٹیاں اور جماعتیں بنتی ہیں تو وہ بھی خالص نفسانی انعراض اور دنیا کی حقیر و ذلیل منفعت کی بنیادوں پر بنتی ہیں، ایک دوسرے کو جن امور کی پابندی کی طرف دعوت دی جاتی ہے وہ بھی خالص اہوار نفسانی یا خاندانی رسوم ہوتی ہیں، کوئی ان کے خلاف کرنے لگے تو سب اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں، لیکن حق و شریعت کے مطابق چلنے کا نہ کہیں معاہدہ ہوتا ہے نہ کوئی اس کی پیروی کرنے کے لئے کسی کو کہتا ہے نہ اس کی خلاف ورزی کرنے سے کسی کی پیشانی پر بل آتا ہے۔

اسی طرح باہمی جھگڑوں اور نزاعی مقدمات میں دنیا کے چند روزہ موہوم نفع کی خاطر اللہ کے قانون کو چھوڑ کر طاعوتی قوانین کے ذریعہ فیصلہ کرانے پر راضی ہیں۔ اسی کا یہ انجام بد ہے جو ہر جگہ ہر ملک میں مشاہدہ میں آرہا ہے کہ یہ امت ہر جگہ ذلیل و خوار نظر آتی ہے، الا ماشاء اللہ، انہوں نے حق سے منہ موڑا، حق نے ان کی نصرت و امداد سے رخ پھیر لیا۔

حق پرستی کے بجائے ہوا پرستی اختیار کر کے شخصی طور پر کسی کسی فرد کو جو دنیوی منافع مل گئے وہ اس پر مگن ہیں، مگر پوری قوم و ملت کی تباہی ہو اس کا لازمی نتیجہ ہے اس کا کوئی دیکھنے سے نہ والا نہیں، اگر پوری امت کی فلاح و ترقی پیش نظر ہو تو اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ ان قرآنی اصول کو مضبوطی سے پکڑا جائے، خود بھی اس پر عمل کیا جائے اور دوسروں کو بھی اس کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے۔

دوسری آیت میں اس شبہ کا جواب ہے کہ جب قومی ترقی کا مدار حق پرستی اور حق و انصاف کی پیروی پر ہے تو دوسری غیر مسلم قومیں جو حق سے سراسر دور ہیں وہ کیوں دنیا میں پھلتی پھولتی نظر آتی ہیں، جواب یہ ہے وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَتَسْتَدِرُّ جُهُنَّ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ یعنی ہم اپنی آیات کے بھٹلانے والوں کو اپنی حکمت و رحمت کی بنا پر دفعہ نہیں پکڑتے بلکہ آہستہ آہستہ تدریجاً پکڑتے ہیں جس کی ان کو خبر بھی نہیں ہوتی، اس لئے دنیا میں کفار و فجار کی مالداری یا عزت و جاہ سے دھوکہ نہ کھایا جائے، کیونکہ وہ درحقیقت ان کے لئے کوئی بھلائی کا سامان نہیں، بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے استدراج ہے، استدراج کے معنی درجہ بدرجہ آہستہ آہستہ کوئی کام کرنے کے آتے ہیں، اصطلاح قرآن و سنت میں استدراج اس کو کہا جاتا ہے کہ بندہ کے

گناہ پر دنیا میں کوئی تکلیف و مصیبت نہ آئے بلکہ ہوں ہوں وہ گناہ میں آگے بڑھتا جائے، دنیاوی مال و اسباب اور بڑھتے جائیں، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنی بدکرداری پر کسی وقت تنبیہ نہیں ہوتی اور غفلت سے آنکھ نہیں کھلتی اور اپنے برے اعمال اس کو بُرے نظر نہیں آتے کہ وہ ان سے باز آنے کی فکر کرے۔

انسان کی یہ حالت اس مریض لا علاج کے مشابہ ہے جو بیماری ہی کو شفاء اور زہری کو تریاق سمجھ کر استعمال کرنے لگے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی تو دنیا میں ہی یہ شخص دفعۂ عذاب میں پکڑ لیا جاتا ہے اور کبھی موت تک یہ سلسلہ چلتا ہے بالآخر موت ہی اس کی مستی اور بے ہوشی کا خاتمہ کرتی ہے اور دائمی عذاب اس کا ٹھکانہ بن جاتا ہے۔

قرآن کریم نے مختلف سورتوں اور آیتوں میں اس استدراج کا ذکر فرمایا ہے، ارشاد ہے
فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۖ لَئِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً ۖ فِئَاذَهُمْ مَّبْلُتُونَ، یعنی جب یہ لوگ اس چیز کو بھلا بیٹھے جو ان کو یاد دلانی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ یہ اپنی ملی ہوئی نعمت و دولت پر اکر گئے تو ہم نے ان کو اچانک عذاب میں پکڑ لیا تو وہ خلاصی سے نا امید ہو کر رہ گئے۔

یہ استدراج کفار کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور مسلمان گناہگار کے ساتھ بھی، اسی لئے صحابہ اور سلف صالحین کو جب کبھی دنیا کی نعمت و دولت حق تعالیٰ نے عطا فرمائی تو غلبہ خوف کی وجہ سے استدراج سے ڈرا کرتے تھے کہ کہیں یہ دنیا کی دولت ہمارے لئے استدراج نہ ہو۔

تیسری آیت میں اسی استدراج کا بیان ہے وَآمَلُوا لَهُمْ اِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ یعنی میں ان گناہگاروں کو ہمت دیتا رہتا ہوں، میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔

چوتھی آیت میں کفار کے اس لغو خیال کی تردید ہے کہ معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنوں میں مبتلا ہیں، فرمایا اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِهِمْ قِنَ جَنَّةٍ اِنَّ هُوَ اِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ، یعنی کیا ان لوگوں نے غور و فکر نہیں کیا کہ ان کا جن سے سابقہ ہے ان کو ذرا بھی جنوں نہیں، ان کی عقل و حکمت کے سامنے تو ساری دنیا کے عقلا و حکماء حیران ہیں ان کے بارے میں جنوں کا گمان کرنا خود جنوں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو صاف صاف حقائق کو بیان کر کے آخرت اور عذاب خداوندی سے ڈرانے والے ہیں۔

پانچویں آیت میں ان کو دو چیزوں کی طرف دعوتِ فکر دی گئی ہے، اَوَّلُ الشَّعَالِ کی مخلوقات آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی بے شمار مصنوعات عجیبہ میں غور و فکر دوسرے

اپنی مدت عمر اور فرصت عمل پر نظر۔

مصنوعات قدرت میں ذرا بھی عقل و فہم کے ساتھ غور کیا جائے تو ایک موٹی سمجھ والے انسان کو بھی اللہ تعالیٰ کی شان قدرت کی معرفت اور نظارہ ہونے لگتا ہے، اور ذرا گہری نظر کرنے والے کے لئے تو عالم کا ذرہ ذرہ قادر مطلق اور حکیم مطلق کی حمد و ثنا کا تسبیح خوان نظر آنے لگتا ہے، جس کے بعد اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ایک فطری تقاضہ بن جاتا ہے۔

اور اپنی مدت عمر میں غور و فکر کا یہ نتیجہ ہے کہ جب انسان یہ سمجھ لے کہ موت کا وقت معلوم نہیں کب آجائے تو ضروری کاموں کے پورا کرنے میں غفلت سے باز آجاتا ہے، اور مستعدی سے کام کرنے لگتا ہے، موت سے غفلت ہی انسان کو تمام خرافات اور جرائم میں مبتلا کرتی ہے، اور موت کا استحضار ہی وہ چیز ہے جو انسان کو بہت سے جرائم سے بچنے پر آمادہ کرتی ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَكْثَرُ وَاذِكْرٍ هَٰذَا مِنَ الْمَوْتِ یعنی تم اس چیز کو کثرت سے یاد کیا کرو جو سب لذتوں کو ختم کر دینے والی ہے یعنی موت۔ اسی لئے آیت مذکورہ میں فرمایا گیا اَوْ لَعَلَّكُمْ يَنْظُرُونَ اِنِّیْ مَلَكُوتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ وَّاَنْ عَسٰی اَنْ یَّکُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُھُمْ ، لفظ مَلَكُوت ملک کے معنی میں مبالغہ کے لئے بولا جاتا ہے اس کے معنی ہیں ملک عظیم، معنی آیت کے یہ ہیں کہ ان منکرین نے کیا اللہ تعالیٰ کے ملک عظیم میں غور نہیں کیا جو آسمانوں اور زمینوں اور بشمار اشیاء پر محیط ہے، اور کیا اس پر نظر نہیں کی کہ یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی موت قریب ہو جس کے بعد ایمان و عمل کی فرصت ختم ہو جائے گی۔

آخر آیت میں فرمایا قِیَاسٌ بِمَا یَعْمَلُونَ ، یعنی جو لوگ قرآن کریم کی ایسی واضح نشانیوں سے بھی ایمان نہیں لاتے وہ اور کس چیز پر ایمان لائیں گے۔

مَنْ یُّضِلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَہٗ ط وَیَذَرُھُمْ فِی طَغٰیَانِھُمْ

جس کو اللہ بھلائے اس کو کوئی نہیں راہ دکھلانے والا، اور اللہ چھوڑے رکھتا ہے ان کو ان کی

یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ یَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مَرْسَلُھَا ط

شرارت میں سرگرداں، تجھ سے پوچھتے ہیں قیامت کو کب ہے اس کے قائم ہونے کا وقت،

قُلْ اِنَّمَا عَلِمْتُ مَا عِنْدَ رَبِّیْ ؕ لَا یَجْعَلِہَا لَوْ قِتْمًا اِلَّاھُوْا مَرَط

تو کہہ اس کی خبر تو میرے رب ہی کے پاس ہے، وہی کھول دکھائے گا اس کو اس کے وقت پر

ثَقُلْتُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِیْکُمْ اِلَّا بَغْثَۃً ط

وہ بھاری بات ہے آسمانوں اور زمین میں، جب تم پر آئے گی تو بے خبر آئے گی،

تَقَاتُوا

يَسْأَلُونَكَ كَانَتْ خَفِيَ عَنْهَا قُلُوبُ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللَّهِ

تجھ سے پوچھنے لگتے ہیں کہ گویا تو اس کی تلاش میں لگا ہوا ہے، تو کہہ دے اس کی خبر ہے خاص اللہ کے پاس

وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

لیکن اکثر لوگ - نہیں سمجھتے -

خلاصہ تفسیر

جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرے اس کو کوئی راہ پر نہیں لاسکتا (پھر نعم لا حاصل) اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کی گمراہی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیتا ہے (تاکہ ایک دفعہ ہی پوری سزا دے دے) لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا، آپ فرمادیتے کہ اس کا (یہ) علم (کہ کب واقع ہوگی) صرف میرے رب ہی کے پاس ہے (دوسرے کسی کو اس کی اطلاع نہیں) اس کے وقت پر اس کو سوا اللہ کے کوئی اور ظاہر نہ کرے گا (اور وہ ظاہر کرنا یہ ہوگا کہ اس کو واقع کر دے گا اس وقت سب کو پوری خبر ہو جائے گی اس کے قبل ویسے کسی کو بتلانے کے طور پر بھی اس کو ظاہر نہ کیا جائے گا کیونکہ وہ آسمانوں اور زمین میں بڑا بھاری حادثہ ہوگا (اس لئے) وہ تم پر محض اچانک (بے خبری میں) آپڑے گی (تاکہ وہ جس طرح اجسام پر ان کو متغیر و متفرق کر دینے میں بھاری ہے اسی طرح قلوب پر بھی اس کا بھاری اثر ہوگا اور پہلے سے بتلا دینے میں یہ بات نہیں رہتی اور پوچھنا بھی تو ان کا معمولی طور پر نہیں بلکہ وہ آپ سے اس طرح (اصرار و مبالغہ سے) پوچھتے ہیں جیسے گویا آپ اس کی تحقیقات کر چکے ہیں (اور تحقیقات کے بعد آپ کو اس کا پورا احاطہ ہو گیا ہے) آپ فرمادیتے کہ اس کا علم (مذکور) خاص اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ (اس بات کو) نہیں جانتے (کہ بعض علوم حق تعالیٰ نے اپنے خزانہ علم میں مکنون رکھے ہیں انبیاء کو بھی تفصیلاً اطلاع نہیں دی، پس اس کے نہ جاننے سے کسی نبی کے عدم اطلاع تعیین قیامت کو معاذ اللہ دلیل نفی نبوت کی سمجھتے ہیں، اس طرح سے کہ نبوت کے لئے یہ علم لازم ہے اور انتقام لازم مستلزم انتقام ملزوم ہے، حالانکہ پہلا مقدمہ محض غلط ہے)

معارف و مسائل

ان سے پہلی آیات میں کفار و منکرین کی ضد و بہت دھرمی اور کھلی ہوئی آیات قدرت کے ہوتے ہوئے ایمان نہ لانے کا ذکر تھا، یہ مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے

امت اور عام مخلوق کے ساتھ غایتِ شفقت و رحمت کی بناء پر انتہائی رنج و غم کا سبب ہو سکتا تھا، اس لئے متذکرہ تین آیات میں سے پہلی آیت میں آپ کو تسلی دینے کے لئے ارشاد فرمایا کہ

جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے اس کو کوئی راہ پر نہیں لاسکتا اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو گمراہ ہی میں بھٹکتے ہوئے پھوڑ دیتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی ہٹ دھرمی اور قبولِ حق سے اعراض پر آپ زنجیر نہ ہوں کیونکہ آپ کا فریضہ منصبی اتنا ہی تھا کہ حق بات کو صاف صاف مؤثر انداز میں پہنچا دیں وہ آپ پورا کر چکے، آپ کی ذمہ داری ختم ہو چکی اب کسی کا ماننا یا نہ ماننا یہ ایک تقدیری امر ہے جس میں آپ کو دخل نہیں پھر آپ غمگین کیوں ہوں۔

اس سورت کے مضامین میں سے تین مضمون بہت اہم تھے، توحید، رسالت، آخرت، اور یہی تین چیزیں ایمان اور اسلام کی اصل بنیادیں ہیں، ان میں سے توحید و رسالت کا مضمون پچھلی آیتوں میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے، مذکورہ آیتوں میں سے آخری دو آیتیں مضمونِ آخرت و قیامت کے بیان میں ہیں جن کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے جو امام تفسیر ابن جریر اور عبد بن حمید نے بروایت قتادہ نقل کیا ہے کہ قریش مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور استہزاء و تمسخر کے دریافت کیا کہ آپ قیامت کے آنے کی خبریں دیتے اور لوگوں کو اس سے ڈراتے ہیں اگر آپ سچے ہیں تو متعین کر کے بتلایئے کہ قیامت کس سن اور کس تاریخ میں آنے والی ہے تاکہ ہم اس کے آنے سے پہلے کچھ تیاری کر لیں، آپ کے اور ہمارے درمیان جو تعلقاتِ رشتہ داری ہیں ان کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ اگر آپ عام طور سے لوگوں کو بتلانا نہیں چاہتے تو کم از کم ہمیں بتلا دیجئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

يَسْتَوُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ ، الْآيَةُ

اس میں لفظ ساعۃ عربی لغت میں تھوڑے سے زمانہ کے لئے بولا جاتا ہے جس کی کوئی خاص تحدید لغت کے اعتبار سے نہیں ہے، اور اہل نجوم کی اصطلاح میں رات اور دن کے چوبیس حصوں میں سے ایک حصہ کا نام ساعۃ ہے جس کو اردو میں گھنٹہ کہا جاتا ہے، اور قرآن کی اصطلاح میں یہ لفظ اس دن کے لئے بولا جاتا ہے جو ساری مخلوقات کی موت کا دن ہوگا اور اس دن کے لئے بھی جس میں ساری مخلوقات دوبارہ زندہ ہو کر رب العالمین کے دربار میں حاضر ہوں گی۔ آیتان کے معنی کب اور مژدنی کے معنی ٹھہرنے اور قائم ہونے کے ہیں۔

لَا يُجَلِّيهَا، تَجْلِيهِ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کھولنے اور ظاہر کرنے کے،

بَعَثَہ کے معنی اچانک حَفِیّ کے معنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے عالم اور باخبر کے بیان کئے ہیں، اور اصل میں اس شخص کو حَفِی کہا جاتا ہے جو سوالات کر کے کسی معاملہ کی پوری تحقیق کر لے۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ وہ کب آئے گی، آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اس کی تعیین کا صحیح علم صرف میرے رب کے پاس ہے، نہ پہلے سے اور کسی کو معلوم ہے اور عین وقت پر بھی کسی کو پہلے معلوم نہ ہوگا، جب وقت مقدر آجائے گا تو خود اللہ تعالیٰ ہی اس کو ظاہر فرما دیں گے کوئی واسطہ درمیان میں نہ ہوگا، یہ حادثہ قیامت آسمانوں اور زمین پر بہت بھاری واقعہ ہوگا کہ ان کے ٹکڑے ہو کر اڑ جائیں گے اس لئے تقاضائے حکمت یہ ہے کہ ایسے شدید واقعہ کا اظہار پہلے سے نہ کیا جائے ورنہ یقین کرنے والوں کی زندگی تلخ ہو جائے گی اور منکرین کو مزید استہزاء و تمسخر کا موقع ملے گا، اس لئے فرمایا لَا تَأْتِيَكُمْ إِلَّا بَعَثَہ یعنی قیامت تمہارے پاس اچانک ہی آئے گی۔

بخاری و مسلم کی حدیث میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے دفعہ اور اچانک آنے کے متعلق یہ بیان فرمایا کہ لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہوں گے، ایک شخص نے گاہک کو دکھلانے کے لئے کپڑے کا تھکان کھولا ہوا ہوگا وہ ابھی معاملہ طے نہ کر پائیں گے کہ قیامت قائم ہو جائے گی، ایک شخص اپنی اونٹنی کا دودھ دوہ کر لے چلے گا اور ابھی اُس کو استعمال کرنے نہ پائے گا کہ قیامت آجائے گی، کوئی شخص اپنے کھانے کی مرمت کر رہا ہوگا اس سے فارغ نہ ہو پائے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی، کوئی شخص کھانے کا لقمہ ہاتھ میں اٹھائے گا ابھی منہ تک نہ پہنچے گا کہ قیامت برپا ہو جائے گی (روح المعانی) مقصد اس کا یہ ہے کہ جس طرح انسان کی شخصی موت کی تاریخ اور وقت کو غیر معین مبہم رکھنے میں بڑی حکمتیں ہیں اسی طرح قیامت کو جو پورے عالم کی اجتماعی موت کا نام ہے اس کو مخفی اور مبہم رکھنے میں بھی بڑی حکمتیں ہیں، اول تو یہی ہے کہ یقین کرنے والوں کے لئے اس صورت میں زندگی دو بھر اور دنیا کے کام مشکل ہو جائیں گے اور منکرین کو طویل میعاد سن کر استہزاء و تمسخر کا بہانہ ملے گا اور ان کی سرکشی میں اور اضافہ ہوگا۔

اس لئے بمقاضائے حکمت اس کی تاریخ کو مبہم رکھا گیا تاکہ لوگ اس کے ہولناک واقعات سے ہمیشہ ڈرتے رہیں اور یہ ڈر ہی انسان کو جرائم سے باز رکھنے کا سب سے زیادہ موثر علاج ہے، اس لئے ان آیات سے تعلیم یہ دی گئی کہ جب اس کا یقین ہے کہ قیامت کسی روز آئے گی اور رب العالمین کے سامنے سب کی پیشی ہوگی، ان کے عمر بھر کے چھوٹے بڑے

اچھے برے سب اعمال کا جائزہ لیا جائے گا، جس کے نتیجہ میں یا جنت کی ناقابل قیاس اور لازوال نعمتیں ملیں گی اور یا پھر معاذ اللہ جہنم کا وہ شدید عذاب ہوگا جس کے تصور سے بھی پتہ پانی ہونے لگتا ہے، تو پھر ایک عقلمند کا کام یہ نہیں ہونا چاہئے کہ فرصت عمل کے وقت کو ان بحثوں میں ضائع کرے کہ یہ واقعہ کب کس سن اور کس تاریخ میں ہوگا، بلکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ فرصت عمر کو غنیمت جان کر اس دن کے لئے تیاری میں مشغول ہو جائے، رب العالمین کے احکام کی خلاف ورزی سے ایسا ڈرے جیسے آگ سے ہر انسان ڈرتا ہے۔

آیت کے آخر میں پھر ان لوگوں کے سوال کا اعادہ کر کے فرمایا يَسْأَلُونَكَ كَاثًا كَافٍ عَنْهَا، پہلا سوال تو اس بات سے متعلق تھا کہ جب ایسا اہم واقعہ ہونے والا ہے تو ہمیں اس کا پورا پورا صحیح تاریخ اور وقت کے ساتھ علم ہونا چاہئے، جس کا جواب دے دیا گیا کہ یہ سوال بے عقلی اور بے وقوفی سے پیدا ہوا ہے، عقل کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ اس کی تعین کی کسی کو خبر نہ کی جائے تاکہ ہر عمل کرنے والا ہر وقت عذاب آخرت سے ڈر کر نیک عمل کے اختیار کرنے اور برے اعمال سے باز رہنے میں پوری توجہ دے۔

اور اس دوسرے سوال کا منشاء ان لوگوں کا یہ سمجھنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور قیامت کی صحیح تاریخ اور وقت معلوم ہے اور آپ نے اللہ تعالیٰ سے تحقیق کر کے اس کا علم ضرور حاصل کر لیا ہے مگر آپ کسی وجہ سے بتاتے نہیں، اس لئے اپنی قرابت و رشتہ داری کا واسطہ دیکر آپ سے سوال کیا کہ ہمیں قیامت کا پورا پتہ بتلا دیں، اس سوال کے جواب میں ارشاد ہوا، قُلْ اِنَّمَاعِلِمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

یعنی آپ لوگوں کو بتلا دیں کہ حقیقت یہی ہے کہ قیامت کی صحیح تاریخ کا سوائے اللہ جل شانہ کے کسی فرشتہ یا نبی کو بھی علم نہیں ہے، مگر بہت سے لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ بہت سے علوم اللہ تعالیٰ صرف اپنے لئے محفوظ رکھتے ہیں جن کا کسی فرشتہ یا پیغمبر کو بھی پتہ نہیں ہوتا، لوگ اپنی جہالت سے یہ سمجھتے ہیں کہ تاریخ قیامت کا علم نبوت و رسالت کے لئے لازمی ہے اور پھر اس کا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا پورا علم نہیں تو یہ علامت اس کی ہے کہ معاذ اللہ آپ نبی نہیں، مگر اوپر معلوم ہو چکا کہ یہ خیال سرے سے غلط ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایسے سوالات کرنے والے بڑے بے وقوف اور بے خبر ہیں، نہ ان کو مسئلہ کی حقیقت معلوم ہے نہ اس کی حکمت اور نہ سوال کرنے کا طریقہ۔

ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کی کچھ علامات کا علم دیا گیا تھا اور یہ کہ وہ اب

قریب ہے، اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی احادیث صحیحہ میں واضح طور پر بیان فرمادیا ہے، ارشاد فرمایا کہ میری بعثت اور قیامت اس طرح ملی ہوئی ہیں جیسے ہاتھ کی دو انگلیاں۔ (ترمذی)

اور بعض اسلامی کتابوں میں جو پوری دنیا کی عمر سات ہزار سال بتلائی ہے یہ کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں، بلکہ اسرائیلی روایات سے لیا ہوا مضمون ہے۔ علماء طبقات الارض نے جو نئی تحقیقات سے دنیا کی عمر لاکھوں سال بتلائی ہے یہ کسی قرآنی آیت سے ٹکراتی ہے نہ کسی حدیث صحیح سے، اسلامی روایات میں ایسی کچی بے سند باتوں کو داخل کر دینے کا مقصد ہی شاید اسلام کے خلاف بدگمانیاں پیدا کرنا ہو، جن کی تردید خود صحیح احادیث میں موجود ہے، ایک صحیح حدیث میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کو مخاطب کر کے ارشاد ہے کہ تمہاری مثال پچھلی امتوں کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے سیاہیل کے بدن پر ایک سفید بال ہو، اس سے ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظریں دنیا کی عمر کتنی دراز ہے کہ اُس کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے، اسی لئے حافظ ابن حزم اندلسی نے فرمایا کہ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ دنیا کی عمر کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا، اس کا صحیح علم صرف پیدا کرنے والے ہی کو ہے۔ (مراغی)

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ط وَلَوْ

تو کہہ دے کہ میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے کا اور نہ برے کا مگر جو اللہ چاہے، اور اگر

كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبِ لَا سِتْكُثْرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسْنِيَ

میں جان لیا کرتا غیب کی بات تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا، اور مجھ کو برائی

السُّوءُ إِنَّا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ع (۱۸۸)

کبھی نہ پہنچتی، میں تو بس ڈر اور خوشخبری سنانے والا ہوں ایماندار لوگوں کو

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا

وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک جان سے اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا

لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ

تاکہ اس کے پاس آرام پکڑے، پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانکا حمل رہا ہلکا سا حمل تو چلتی پھرتی رہی

بِهِ فَلَمَّا أَثْقَلَتْ دَعَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا

اس کے ساتھ پھر جب بو بھل ہو گئی تو دونوں نے پکارا اللہ اپنے رب کو کہ اگر تو ہم کو بخشنے چنگا مہیلا

لَتَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّا أَتَاهُمَا صَاحِبَا جَعَلَا

تو ہم تیرا شکر کریں ، پھر جب ان کو دیا چنگا بھلا تو بنانے لگے

لَهُ شُرَكَاءَ فِيهِمَا آلِهَةٌ قَالُوا قُلْ اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۱۹۰﴾

اس کے لئے شریک اس کی بخشی ہوئی چیزیں ، سو اللہ برتر ہے ان کے شریک بنانے سے

أَيُّ شُرَكَائِهِمْ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا

کیا شریک بناتے ہیں ایسوں کو جو پیدا نہ کریں ایک چیز بھی اور وہ پیدا ہوئے ہیں ، اور نہیں

يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا أَنْفُسُهُمْ يَنْصُرُونَ ﴿۱۹۲﴾ وَإِنْ

کر سکتے ہیں ان کی مدد ، اور نہ اپنی مدد کریں ، اور اگر

تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَى لَا يَتَّبِعُوكُمْ سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ

تم ان کو پکارو رستہ کی طرف تو نہ چلیں تمہاری پکار پر ، برابر ہے تم پر

أَدْعَوْتُكُمْ أَمْ أَنْتُمْ صَمِتُونَ ﴿۱۹۳﴾

کہ ان کو پکارو یا چپکے رہو

خلاصہ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لئے (بھی چاہئے کہ دوسرے کے لئے) کسی نفع (تکوینی کے حاصل کرنے) کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر (تکوینی کے دفع کرنے) کا (اختیار رکھتا ہوں) مگر اتنا ہی کہ جتنا خدا تعالیٰ نے چاہا ہو (کہ مجھ کو اختیار دے دیں اور جس امر میں اختیار نہیں دیا اس میں بعض اوقات منافع فوت ہو جاتے ہیں اور مضار واقع ہو جاتے ہیں ایک مقدمہ تو یہ ہوا) اور (دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ) اگر میں غیب کی باتیں (امور اختیار کے متعلق) جانتا ہوتا تو میں (اپنے لئے) بہت سے منافع حاصل کر لیا کرتا اور کوئی مضرت ہی مجھ پر واقع نہ ہوتی (کیونکہ علم غیب کے سبب معلوم ہو جاتا کہ فلاں امر میرے لئے یقیناً نافع ہوگا اس کو اختیار کر لیا کرتا اور فلاں امر میرے لئے یقیناً مضر ہوگا اس سے احتراز کرتا اور اب چونکہ علم غیب نہیں اس لئے بعض اوقات نافع کا علم نہیں ہوتا کہ اس کو اختیار کروں اسی طرح مضر کا علم نہیں ہوتا کہ اس سے بچوں بلکہ گاہے بالعکس نافع کو مضر اور مضر کو نافع سمجھ لیا جاتا ہے، حاصل استدلال کا یہ ہوا کہ علم غیب کے لئے نفع و ضرر کا مالک ہونا لازم تھا، یہ مقدمہ ذکر میں مؤخر ہے اور لازم منتفی ہے یہ مقدمہ ذکر میں مقدم ہے پس ملزوم یعنی علم غیب منتفی ہے اور یہ مطلوب ہے، غرض میں ایسے امور کا علم نہیں رکھتا، میں تو محض (احکام شرعیہ بتلا کر ثواب کی) بشارت دینے والا اور

(عذاب سے) ڈرانے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں (خلاصہ یہ کہ نبوت کا اصلی مقصود امور تکوینیہ کا احاطہ نہیں اس لئے ان امور کا علم جن میں تعین قیامت بھی داخل ہے نبی کو ملنا ضروری نہیں البتہ نبوت کا اصل مقصود امور تشرعیہ کا علم دانی ہے سو وہ مجھ کو حاصل ہے) وہ اللہ ایسا (تادور اور منعم) ہے جس نے تم کو ایک تن واحد (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا بوڑا بنایا (مراد ہوا جسکی کیفیت شروع تفسیر سورۃ نسا میں گزر چکی) تاکہ وہ اس اپنے بوڑے سے انس حاصل کرے (پس جب وہ خالق بھی ہے اور محسن بھی تو عبادت اسی کا حق ہے) پھر آگے ان کی اولاد بڑھی اور ان میں بھی میاں بی بی ہوئے لیکن ان میں بعض کی یہ حالت ہوئی کہ جب میاں نے بی بی سے قربت کی تو اس کو حمل رہ گیا (جو اول اول ہلکا سا رہا) سو وہ اس کو (پیٹ میں) لئے ہوئے (بے تکلف) چلتی پھرتی رہی پھر جب وہ حاملہ اس حمل کے بڑھ جانے سے بوجھل ہو گئی (اور دونوں میاں بی بی کو یقین ہو گیا کہ حمل ہے) تو اس وقت ان کو طرح طرح کے احتمالات و توہمات ہونے لگے جیسا کہ بعض حمل میں خطرات پیش آتے ہیں اس لئے) دونوں میاں بی بی اللہ سے جو کہ ان کا مالک ہے دعا کرنے لگے کہ اگر آپ نے ہم کو صحیح سالم اولاد دے دی تو ہم خوب شکر گزاری کریں گے (جیسا عام عادت ہے کہ مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ سے بڑے بڑے عہد و پیمان ہو کرتے ہیں) سو جب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو صحیح سالم اولاد دے دی تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیز میں وہ دونوں اللہ کے شریک قرار دینے لگے (مختلف طور پر کسی نے اعتقاد سے کہ یہ اولاد فلاں زندہ یا مردہ نے دی ہے کسی نے عمل سے کہ اس کے نام کی نذر و نیاز کرنے لگے یا بچہ کو لے جا کر اس کے سامنے اس کا ماتھا ٹیک دیا، یا قول سے کہ اس کی بندگی پر نام رکھ دیا جیسے عبد شمس یا بندہ علی وغیرہما، یعنی یہ حق تو تھا خدا کا جو کہ منعم اور خالق اور قادر و محسن ہے اور صرف کیا اس کو دوسرے معبودوں کے لئے) سو اللہ تعالیٰ پاک ہے ان کے شرک سے (یہاں تک تو حق تعالیٰ کی صفات مذکور تھیں جو مقتضی ہیں اس کے استحقاق معبودیت کو، آگے الہیہ باطلہ کے نقائص کا ذکر ہے جو مقتضی ہیں ان کے عدم استحقاق معبودیت کو پس فرماتے ہیں کہ) کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو بنا نہ سکیں اور (بلکہ) وہ خود ہی بنائے جاتے ہوں (چنانچہ ظاہر ہے کہ بت پرست خود ان کو تراشتے تھے) اور (کسی چیز کا بنانا تو بڑی بات ہے وہ) تو ایسے عاجز ہیں کہ اس سے آسان کام بھی نہیں کر سکتے مثلاً ان کو کسی قسم کی مدد (بھی) نہیں دے سکتے اور (اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ) وہ خود اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے (اگر کوئی حادثہ ان کو پیش آجائے مثلاً کوئی شخص ان کو توڑنے پھوڑنے ہی لگے) اور (اس سے بھی بڑھ کر سنو کہ)

اگر تم ان کو کوئی بات بتلانے کو پکارو تو تمہارے کہنے پر نہ چلیں (اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ تم ان کو پکارو کہ وہ تم کو کوئی بات بتلائیں تو تمہارا کہنا نہ کریں یعنی نہ بتلائیں اور دوسرے اس سے زیادہ یہ کہ تم ان کو پکارو کہ آؤ ہم تم کو کچھ بتلائیں تو تمہارے کہنے پر نہ چلیں یعنی تمہاری بتلائی ہوئی بات پر عمل نہ کر سکیں بہر حال) تمہارے اعتبار سے دونوں امر برابر ہیں خواہ تم ان کو پکارو (وہ جب نہیں سنتے) اور یا تم خاموش رہو (جب تو نہ سننا ظاہر ہی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جو کام سب سے سہل تر ہے کہ کوئی بات بتلانے کے لئے پکارے تو سن لینا وہ اسی سے عاجز ہیں تو جو اس سے مشکل ہے کہ اپنی حفاظت کریں اور پھر جو اس سے مشکل ہے کہ دوسروں کی امداد کرنا اور پھر ان سب سے جو دشوار تر ہے کہ کسی شے کو پیدا کرنا ان سے تو بدرجہ اولیٰ زیادہ تر عاجز ہوں گے پھر ایسے عاجز محتاج کب معبودیت کے لائق ہو سکتے ہیں)

معارف و مسائل

پہلی آیت میں مشرکین اور عوام کے اس غلط عقیدہ کی تردید ہے جو ان لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کے بارہ میں قائم کر رکھا تھا کہ وہ غیب دان ہوتے ہیں، ان کا علم اللہ تعالیٰ کی طرح تمام کائنات کے ذرہ ذرہ پر حاوی ہوتا ہے، نیز یہ کہ وہ ہر نفع اور نقصان کے مالک ہوتے ہیں جس کو جو چاہیں نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

اور اسی عقیدہ کے سبب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کی معین تاریخ بتلانے کا مطالبہ کرتے تھے جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں گزر چکا ہے۔

اس آیت نے ان کے اس مشرکانہ عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے بتلادیا کہ علم غیب اور تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم محیط صرف اللہ جل شانہ کی مخصوص صفت ہے اس میں کسی مخلوق کو شریک ٹھہرانا خواہ وہ فرشتہ ہو یا نبی و رسول بشرک اور ظلم عظیم ہے، اسی طرح ہر نفع نقصان کا مالک ہونا صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفت خاص ہے اس میں کسی کو شریک ٹھہرانا بھی شرک ہے، جس کے مٹانے ہی کے لئے قرآن نازل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔

قرآن کریم نے بے شمار آیات میں بار بار اس کو واضح فرما دیا ہے کہ علم غیب اور علم محیط جس سے کوئی ذرہ پھپھانہ رہے یہ صرف اللہ جل شانہ کی صفت خاص ہے اسی طرح قدرت مطلقہ کہ ہر نفع نقصان قبضہ میں ہو یہ بھی صفت خاص ہے حق تعالیٰ شانہ کی، ان صفتوں میں غیر اللہ کو شریک قرار دینا شرک ہے۔

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اس کا اعلان کر دیں کہ میں اپنے نفس کے لئے بھی نفع نقصان کا مالک نہیں، دوسروں کے نفع نقصان کا تو کیا ذکر ہے۔

اسی طرح یہ بھی اعلان کر دیں کہ میں عالم الغیب نہیں ہوں کہ ہر چیز کا علم ہونا میرے لئے ضروری ہو، اور اگر مجھے علم غیب ہوتا تو میں ہر نفع کی چیز کو ضرور حاصل کر لیا کرتا اور کوئی نفع میرے ہاتھ سے فوت نہ ہوتا، اور ہر نقصان کی چیز سے ہمیشہ محفوظ ہی رہتا اور کبھی کوئی نقصان مجھے نہ پہنچتا، حالانکہ یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، بہت سے کام ایسے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حاصل کرنا چاہا مگر حاصل نہیں ہوئے، اور بہت سی تکلیفیں اور فتنیں ایسی ہیں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بچنے کا ارادہ کیا مگر وہ مضرت و تکلیف پہنچ گئی غزوہ حدیبیہ کے موقع پر آپ صحابہ کرام کے ساتھ احرام باندھ کر عمرہ کا ارادہ کر کے حدود حرم تک پہنچ گئے مگر حرم میں داخلہ اور عمرہ کی ادائیگی اس وقت نہ ہو سکی سب کو احرام کھول کر واپس ہونا پڑا۔

اسی طرح غزوہ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زخم پہنچا اور مسلمانوں کو عارضی شکست ہوئی، اسی طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں معروف و مشہور ہیں۔

اور شاید ایسے واقعات کے ظاہر کرنے کا مقصد ہی یہ ہو کہ لوگوں پر عملاً یہ بات واضح کر دی جائے کہ انبیاء علیہم السلام اگرچہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مقبول اور افضل مخلوق ہیں مگر پھر بھی وہ خدائی علم و قدرت کے مالک نہیں تاکہ لوگ اس غلط فہمی کے شکار نہ ہو جائیں جس میں عیسائی اور نصرانی مبتلا ہو گئے کہ اپنے رسول کو خدائی صفات کا مالک سمجھ بیٹھے اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو گئے۔

اس آیت نے بھی یہ واضح کر دیا کہ انبیاء علیہم السلام نہ قادر مطلق ہوتے ہیں نہ عالم الغیب بلکہ ان کو علم و قدرت کا اتنا ہی حصہ حاصل ہوتا ہے جتنا من جانب اللہ ان کو دے دیا جائے۔ ہاں اس میں شک و شبہ نہیں کہ جو حصہ علم کا ان کو عطا ہوتا ہے وہ ساری مخلوقات سے بڑھا ہوا ہوتا ہے خصوصاً ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اولین و آخرین کا علم عطا فرمایا گیا تھا، یعنی تمام انبیاء علیہم السلام کو جتنا علم دیا گیا تھا وہ سب اور اس سے بھی زیادہ آپ کو عطا فرمایا گیا تھا، اور اسی عطا شدہ علم کے مطابق آپ نے ہزاروں غیب کی باتوں کی خبریں دیں جن کی سچائی کا ہر عام و خاص نے مشاہدہ کیا، اس کی وجہ سے یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو ہزاروں لاکھوں غیب کی چیزوں کا علم عطا کیا گیا تھا مگر اس کو اصطلاح قرآن میں علم غیب نہیں کہہ سکتے اور اس کی وجہ سے رسول کو عالم الغیب نہیں کہا جاسکتا۔ آخر آیت میں ارشاد فرمایا اِنَّ اَمَّا لَا نَشِيْرٌ وَبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی اعلان کر دیں کہ میرا فریضہ منصبی صرف یہ ہے کہ میں بدکاروں کو عذاب سے ڈراؤں اور نیک لوگوں کو ثواب عظیم کی خوشخبری سناؤں۔

دوسری آیت میں عقیدہ توحید کا ذکر ہے جو اسلام کا سب سے بڑا بنیادی عقیدہ ہے اور اس کے ساتھ شرک کے باطل اور نامعقول ہونے کا بیان کسی قدر تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔

شروع آیت میں حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کا ایک مظہر حضرت آدم وحواء کی پیدائش سے اس طرح بیان فرمایا هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا تَوْحِيْدًا لِّتَسْكُنَ اِلَيْهَا، یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے جس نے سارے بنی آدم کو ایک ذات آدم سے پیدا کیا اور انہیں سے ان کی بی بی حضرت حواء کو پیدا کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ آدم علیہ السلام کو ایک ہم جنس ہم دم کے ذریعہ سکون حاصل ہو۔

اللہ تعالیٰ کی اس صنعت عجیبہ کا تقاضہ یہ تھا کہ تمام اولاد آدم ہمیشہ اس کی شکر گزار رہتی اور کسی مخلوق کو اس کی صفات کاملہ میں شریک نہ ٹھہراتی، مگر غفلت شعار انسان نے معاملہ اس کے خلاف کیا جس کا بیان اسی آیت کے دوسرے جملہ اور بعد کی آیت میں اس طرح فرمایا گیا :

فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلٌ خَفِيْفًا فَهَمَزَتْ بِهٖ ۖ فَلَمَّا اَنْقَلَتْ دَعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَیْنِ اَسْتَمْتَنَا صَالِحًا لِّتُكُوْنَنَّ مِنَ الشَّكِرِيْنَ ۝ فَلَمَّا اَنْهَمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَاءَ فِیْهَا اَنْهَمَا فَعَلٰی اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝

یعنی اولاد آدم نے اپنی غفلت و ناشکری سے اس معاملہ میں عمل یہ کیا کہ جب زوادیہ کے باہمی اختلاط سے حمل قرار پایا تو شروع شروع میں جب تک حمل کا کوئی بوجھ نہ تھا عورت آزادی کے ساتھ چلتی پھرتی رہی پھر جب حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے تین اندھیریوں کے اندر اس حمل کی تربیت کر کے اس کو بڑھایا اور اس کا بوجھ محسوس ہونے لگا تو اب ماں باپ فکر میں پڑ گئے اور یہ خطرے محسوس کرنے لگے کہ اس حمل سے کیسی اولاد پیدا ہوگی کیونکہ بعض اوقات انسان ہی کے پیٹ سے عجیب عجیب طرح کی مخلوق بھی پیدا ہو جاتی ہے اور بعض اوقات ناقص الخلقیت بچہ پیدا ہو جاتا ہے، اندھایا بہرا یا گونگایا ہاتھ پیر سے معذور، ان خطرات کے

سبب ماں باپ یہ دعائیں مانگنے لگے کہ یا اللہ ہمیں صحیح سالم بچہ عنایت فرمائیے اگر صحیح سالم بچہ پیدا ہوا تو ہم شکر گزار ہوں گے۔

لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں سن لیں اور بچہ صحیح سالم عطا کر دیا تو اسب شکر گزاری کے بجائے شرک میں مبتلا ہو گئے اور یہ اولاد ہی ان کے شرک میں مبتلا ہونے کا سبب بن گئی، جس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، کبھی تو عقیدہ ہی فاسد ہوتا ہے، یوں سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ بیٹا کسی ولی یا بزرگ نے دیا ہے، کبھی یہ ہوتا ہے کہ عملاً اس بچہ کو کسی زندہ یا مردہ بزرگ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ان کے نام کی نذر و نیاز کرنے لگتے ہیں یا بچہ کو لے جا کر ان کے سامنے اس کا ماتھا ٹیک دیتے ہیں اور کبھی بچہ کا نام رکھنے میں مشرکانہ انداز اختیار کرتے ہیں، عبداللہات، عبدالعزہی یا عبدالشمس یا بندہ علی وغیرہ ایسے نام رکھ دیتے ہیں جن سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بچہ اللہ تعالیٰ کے بجائے ان بتوں یا ان بزرگوں کا پیدا کیا ہوا بندہ ہے یہ سب مشرکانہ عقائد و اعمال ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نعمت کے مقابلہ میں شکر کے بجائے ناشکری کی مختلف صورتیں ہیں۔

تیسری آیت کے آخر میں ان لوگوں کی بے راہی اور کج روی کو واضح کرنے کیلئے فرمایا فَتَعَلٰی اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ، یعنی پاک ہے اللہ تعالیٰ اس شرک سے جس کو ان لوگوں نے اختیار کیا۔

آیات مذکورہ کی اس تفسیر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس آیت کے پہلے جملہ میں حضرت آدم وحواء کا ذکر کر کے اولادِ آدم کو ان کے اتباع اور شکر گزاری کی تعلیم دی گئی ہے، اور آخری جملوں میں بعد کی آنے والی اولادِ آدم کی گمراہی اور کج روی کا بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے بجائے شکر گزاری کے شرک کو اختیار کر لیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ شرک اختیار کرنے والوں کے معاملہ کا تعلق حضرت آدم وحواء سے مطلق نہیں جس کے سبب حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت پر کوئی شبہ ہو، بلکہ اس کا تعلق بعد کی آنے والی نسلوں کے عمل سے ہے، اور یہ تفسیر جو ہم نے اختیار کی ہے تفسیر درمنثور میں بروایت ابن المنذر وابن ابی حاتم مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے۔ ترمذی اور حاکم کی روایات میں جو ایک قصہ حضرت آدم وحواء علیہما السلام کا اور شیطان کے فریب دینے کا مذکور ہے اس کو بعض نے اسرائیلی روایات قرار دے کر ناقابلِ اعتماد بتلایا ہے لیکن بہت سے محدثین نے اس کی توثیق بھی کی ہے، مذکورہ تفسیر پر اگر اس قصہ کی روایت کو صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی آیت کی تفسیر میں کوئی اشکال و شبہ باقی نہیں رہتا۔

اس آیت سے چند احکام و فوائد حاصل ہوئے :

اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے عورت و مرد کے جوڑے کو ہم جنس بنایا تاکہ طبعی موافقت اور پورا انس ایک دوسرے کے ساتھ حاصل ہو سکے اور ازدواجی زندگی سے جو تعمیر عالم کے فوائد وابستہ ہیں وہ پوری طرح انجام پاسکیں۔

دوسرے یہ کہ ازدواجی زندگی کے جتنے حقوق و فرائض زوجین پر عائد ہوتے ہیں ان سب کا خلاصہ اور اصل مقصد سکون ہے، دنیا کی نئی معاشرت اور نئی رسموں میں جو چیزیں سکون کو برباد کرنے والی ہیں وہ ازدواجی تعلق کی بنیادی دشمن ہیں، اور آج کی مہذب دنیا میں جو گھریلو زندگی عموماً تلخ نظر آتی ہے اور چار طرف طلاقیوں کی بھرمار ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ معاشرت میں ایسی چیزوں کو مستحسن سمجھ لیا گیا ہے جو گھریلو زندگی کے سکون کو سراسر برباد کرنے والی ہیں، عورت کی آزادی کے نام پر اس کی بے پردگی اور بے حیائی جو طوفان کی طرح عالمگیر ہوتی جاتی ہے اس کو ازدواجی سکون کے برباد کرنے میں بڑا دخل ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ جوں جوں یہ بے پردگی اور بے حیائی عورتوں میں بڑھتی جاتی ہے اسی رفتار سے گھریلو سکون و اطمینان ختم ہوتا جاتا ہے۔

تیسرے یہ کہ بچوں کے ایسے نام رکھنا جن سے مشرکانہ مفہوم لیا جاسکتا ہو، چاہے نام رکھنے والوں کی نیت یہ نہ ہو، وہ بھی ایک مشرکانہ رسم ہونے کے سبب گناہ عظیم ہے جیسے عبد الشمس عبد العزی وغیرہ نام رکھنا۔

چوتھے یہ کہ بچوں کے نام رکھنے میں بھی ادا شکر کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے نام اللہ و رسول کے ناموں پر رکھے جائیں، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد الرحمن، عبد اللہ وغیرہ کو زیادہ پسند فرمایا ہے۔

افسوس ہے کہ آج مسلمانوں میں سے یہ رہی سہی اسلامی رسم بھی ختم ہوتی جاتی ہے، اول تو نام ہی غیر اسلامی رکھے جاتے ہیں، اور جو کہیں ماں باپ نے اسلامی نام رکھ بھی دیئے تو ان کو بھی انگریزی کے مخفف حروف میں منتقل کر کے ختم کر دیا جاتا ہے، سیرت و صورت سے تو کسی کا مسلمان سمجھنا پہلے ہی مشکل ہو چکا تھا، ناموں کے اس نئے طرز نے اسلام کی اس آخری علامت کو بھی رخصت کر دیا، اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا فہم اور اسلام کی محبت عطا فرمائے، آمین

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَلُكُمْ

جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا وہ بندے ہیں تم جیسے

فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۹۸﴾

بھلا پکارو تو ان کو پس چاہئے کہ وہ قبول کروں تمہارے پکارنے کو اگر تم سچے ہو ،

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّهْمُشُونَ بِهَا اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُونَ بِهَا

کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلتے ہیں ، یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہیں ،

اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُونَ بِهَا اَمْ لَهُمْ اُذَانٌ يَّسْمَعُونَ بِهَا

یا ان کے آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے ہیں ، یا ان کے کان ہیں جن سے سنتے ہیں ،

قُلْ اَدْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ كِيدُوْنَ فَلَا تُنْظِرُوْنَ ﴿۱۹۹﴾ اِنْ

تو کہہ دے کہ پکارو اپنے شریکوں کو پھر برائی کرو میرے حق میں اور مجھ کو ڈھیل نہ دو میرا

وَلِيَّ اللّٰهِ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۰۰﴾

حمایتی تو اللہ ہے جس نے اتاری کتاب ، اور وہی حمایت کرتا ہے نیک بندوں کی ،

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَا

اور جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوا وہ نہیں کر سکتے تمہاری مدد اور نہ

اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ وَاِنْ تَدْعُوهُمْ اِلَى الْهُدٰى

اپنی جان بچا سکیں ، اور اگر تم ان کو پکارو رستہ کی طرف

لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

تو کچھ نہ سنیں ، اور تو دیکھتا ہے ان کو کہ تک رہے ہیں تیری طرف اور وہ کچھ نہیں دیکھتے ۔

خلاصہ تفسیر

(نعرض) واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے (الشرك) مملوک (بندے) ہیں (یعنی تم سے بڑھ کر نہیں خواہ گھٹے ہوئے ہوں) سو (ہم) تو تم کو سچا جب جانیں (کہ) تم (تو) ان کو پکارو (اور) پھر ان کو چاہئے کہ تمہارا کہنا کر دیں ، اگر تم (ان کے اعتقاد الوہیت میں) سچے ہو (اور وہ بیچارے تمہارا کہنا تو کیا کریں گے ، کہنا ماننے کے آلات تک ان کو نصیب نہیں ، دیکھ لو) کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہوں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے کسی چیز کو تھام سکیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہوں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں (جب ان میں تو ایسی فاعلہ تک نہیں تو کوئی فعل ان سے کیا صادر ہوگا اور) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (جس طرح وہ اپنے معتقدین کو نفع پہنچانے سے عاجز ہیں اسی طرح اپنے مخالفین کو ضرر بھی نہیں پہنچا سکتے) جیسا تم کہا کرتے ہو کہ ہمارے بتوں کی بے ادبی نہ کیا کرو ورنہ

وہ تم پر کوئی آفت نازل کر دیں گے اخرجہ فی الباب عن عبد الزہاق فی قوله تعالیٰ وَ یُخَوِّتُؤُنَّکَ بِالَّذِینَ مِنْ دُونِہِ اور اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ مجھ کو ضرر پہنچا سکتے ہیں تو تم (اپنا ارمان نکال لو اور) اپنے سب شرکار کو بلا لو پھر (سب مل کر) میری ضرر رسانی کی تدبیر کرو پھر (جب تدبیریں جائے تو) مجھ کو ذرا مہلت مت دو (بلکہ فوراً اس کو نافر د کر دو، دیکھو کیا ہوتا ہے اور خاک بھی نہیں ہوگا کیونکہ شرکار تو مہمل محض ہیں، رہ گئے تم جو کچھ ہاتھ پاؤں ہلا سکتے ہو تو تم میرا اس لئے کچھ نہیں کر سکتے کہ) یقیناً میرا مددگار اللہ تعالیٰ ہے جس کے مددگار اور رفیق ہونے کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ اس نے (مجھ پر) یہ کتاب (مبارک جامع خیر دارین) نازل فرمائی (اور اگر میرا رفیق و معین نہ ہوتا تو اتنی بڑی نعمت کیوں عطا فرماتا) اور (علاوہ اس دلیل خاص کے ایک عام قاعدہ سے بھی اس کا مددگار ہونا معلوم ہے وہ قاعدہ یہ ہے کہ) وہ (عموماً) نیک بندوں کی مدد کیا کرتا ہے (تو انبیاء تو ان نیک بندوں میں فرد کامل ہیں اور میں نبی ہوں تو میرا بھی ضرور مددگار ہوگا، غرض یہ کہ جن کے ضرر سے ڈراتے ہو وہ عاجز اور جو مجھ کو ضرر سے بچاتا ہے وہ قادر، پھر اندیشہ کا ہے کا، اور (گو ان کا عاجز ہونا اوپر باطل و جہو بیان ہو چکا ہے لیکن چونکہ وہاں بیان عجز مقصود بالغیر تھا اور مقصود بالذات نفی استحقاق معبودیت تھی اس لئے آگے مقصوداً بیان عجز کا فرماتے ہیں کہ) تم جن لوگوں کی خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ (تمہارے دشمن کے مقابلہ میں جیسا میں ہوں) تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے اور نہ (اپنے دشمن کے مقابلہ میں جیسا میں ہوں) اپنی مدد کر سکتے ہیں اور (مدد کرنا تو بڑی بات ہے) ان کو (تو) اگر کوئی بات بتلانے کو پکارو تو اس کو (بھی تو) نہ سنیں (اس کے بھی وہی مذکورہ بالا دونوں معنی ہو سکتے ہیں) اور جیسے ان کے پاس سننے کا آلہ نہیں اسی طرح دیکھنے کا آلہ بھی نہیں اور ان کی تصویر میں جو آنکھیں بنادی جاتی ہیں وہ محض نام ہی کی ہوتی ہیں کام کی نہیں چٹانچہ، اُن (بتوں) کو آپ دیکھتے ہیں کہ گویا وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں (کیونکہ شکل تو آنکھوں کی سی بنی ہوئی ہے) اور وہ (واقع میں) کچھ بھی نہیں دیکھتے (کیونکہ حقیقت میں تو وہ آنکھیں نہیں اسی پر دوسرے قوی قاعلم ایدری وار جل کی نفی سمجھ لینا چاہئے پس ایسے عاجز کا کیا ڈراوا دکھلاتے ہو)

مَعَارِفُ وَمَسَائِلُ

اِنَّ دَرِیْنَ اللّٰہِ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ وَهُوَ یَتَوَلٰی الصّٰلِحِیْنَ، یہاں ولی کے معنی محافظ و مددگار کے ہیں، اور کتاب سے مراد قرآن اور صالحین سے مراد بقول ابن عباسؓ وہ لوگ

ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی کو برابر نہ کہیں، اس میں انبیاء علیہم السلام سے لے کر عام نیک مسلمانوں تک سب داخل ہیں۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ مجھے تمہاری مخالفت کی اس لئے پرواہ نہیں کہ میرا محافظ و مددگار اللہ تعالیٰ ہے جس نے مجھ پر قرآن نازل کیا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی سب صفات میں سے قرآن نازل کرنے کو خصوصیت سے اس لئے ذکر کیا کہ تم جو میری عداوت و مخالفت پر جمے ہو، اس کی وجہ قرآن کی تعلیم و دعوت ہے جو میں تمہیں دیتا ہوں تو جس نے مجھ پر یہ قرآن نازل کیا ہے وہ ہی میرا مددگار و محافظ ہے اس لئے مجھے کیوں فکر ہو۔

اس کے بعد آخری جملے میں عام ضابطہ بتلادیا کہ انبیاء علیہم السلام کی تو بڑی شان ہے عام صالح اور نیک مسلمانوں کا بھی اللہ متولی اور کفیل ہوتا ہے، ان کی مدد کرتا ہے اس لئے ان کو کسی دشمن کی مخالفت اور دشمنی مضر نہیں ہوتی، اکثر اوقات تو دنیا ہی میں وہ ان پر غالب کر دیا جاتا ہے اور اگر کسی وقت بتقاضائے حکمت غالب بھی نہ ہو تو بھی اس کے اصل مقصد میں کوئی خلل نہیں پڑتا وہ ظاہر میں ناکام ہو کر بھی مقصد کے لحاظ سے کامیاب رہتی ہوتا ہے کیونکہ مومن صالح کا اصل مقصد ہر کام میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور اس کی اطاعت کرنا ہے، اگر وہ دنیا میں کسی وجہ سے ناکام بھی ہو جائے تو رضائے الہی کا اصل مقصد پھر بھی اس کو حاصل ہوتا ہے اور وہ کامیاب ہی ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ﴿۱۹۹﴾

عادت کر درگزر کی اور حکم کر نیک کام کرنے کا اور کنہارہ کر جاہلوں سے ،

وَأَمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّهُ

اور اگر ابھاسے تجھ کو شیطان کی پھیر تو پناہ مانگ اللہ سے ، وہی ہے

سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۰۰﴾ إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَافٌ

سننے والا جاننے والا ، جن کے دل میں ڈر ہے جہاں پڑ گیا ان پر شیطان کا

مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ ﴿۲۰۱﴾ وَإِخْوَانُهُمْ

گزر چونک گئے پھر اسی وقت ان کو سوچھ آجاتی ہے ، اور جو شیطانوں کے

يَهْدُوهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يَقْصِرُونَ ﴿۲۰۲﴾

بھائی ہیں وہ ان کو کھینچتے چلے جاتے ہیں گمراہی میں پھر وہ کمی نہیں کرتے ۔

خلاصہ تفسیر

لوگوں سے یہ بتاؤ رکھتے کہ ان کے اعمال و اخلاق میں سے (سرسری (نظر میں جو) برتاؤ (معقول و مناسب معلوم ہوں ان) کو قبول کر لیا کیجئے (ان کی برہ اور حقیقت کی تلاش نہ کیجئے بلکہ ظاہری نظر میں سرسری طور پر جو کام کسی سے اچھا ہو اس کو بھلائی پر محمول کیجئے، باطن کا حال اللہ کے سپرد کیجئے کیونکہ پورا اخلاص و نیز شرائط قبول کی جامعیت انھیں انھوں کا حصہ ہے، حاصل یہ کہ معاشرت میں سہولت رکھئے، تشدد نہ کیجئے، یہ برتاؤ تو اچھے کاموں میں ہے) اور (جو کام ظاہر نظر میں بھی بُرا ہو اس میں یہ برتاؤ رکھئے کہ اس باب میں) نیک کام کی تعلیم کر دیا کیجئے اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہو جایا کیجئے (اور ان کے بہت دپے نہ ہو جائے) اور اگر اتفاقاً ان کی جہالت پر، آپ کو کوئی دوسرے شیطان کی طرف سے (غصہ کا) آئے لگے (جس میں احتمال ہو کہ کوئی بات خلاف مصلحت کے صادر ہو جائے) تو (ایسی حالت میں فوراً) اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے (آپ کے استعاذہ کو سنتا ہے، آپ کے مقصود کو جانتا ہے وہ آپ کو اس سے پناہ دے گا اور جس طرح استعاذہ و توجہ الی اللہ آپ کے لئے نافع ہے اسی طرح تمام خدا ترس لوگوں کے لئے بھی نافع ہے چنانچہ) یقیناً (یہ بات ہے کہ) جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے (غصہ کا یا اور کسی امر کا) آجاتا ہے تو وہ (فوراً خدا کی) یار میں لگ جاتے ہیں (جیسے استعاذہ و دُعا اور خدا تعالیٰ کی عظمت و عذاب و ثواب کو یاد کرنا) سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں (اور حقیقت امر ان پر منکشف ہو جاتی ہے جس سے وہ خطرہ اثر نہیں کرتا) اور (برخلاف اس کے) بوشیا طین کے تابع ہیں وہ (شیاطین) ان کو گمراہی میں کھینچتے چلے جاتے ہیں پس وہ (تابعین گمراہی سے) باز نہیں آتے (نہ وہ استعاذہ کریں نہ محفوظ رہیں، سو وہ مشرکین تو شیطان کے تابع ہیں یہ کب باز آئیں گے اس لئے ان کے غم و غصہ میں پڑنا بے کار ہے)

معارف و مسائل

اخلاق قرآنی کا ایک جامع ہدایت نامہ ہے جس کے آیات مذکورہ قرآنی اخلاق فاضلہ کا ایک جامع ہدایت نامہ ہے جس کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کر کے آپ کو تمام اولین و آخرین میں صاحب خلق عظیم کا خطاب دیا گیا ہے۔

پچھلی آیتوں میں دشمنان اسلام کی کجروی، ہٹ دھرمی اور بد اخلاقیوں کا ذکر کرنے

کے بعد ان آیات میں اس کے بالمقابل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اخلاقِ فاضلہ کی ہدایت دی گئی ہے جس کے تین جملے ہیں، پہلا جملہ خُذِ الْعَفْوَ ہے، عربی لغت کے اعتبار سے لفظ عفو کے کئی معنی ہو سکتے ہیں اور اس موقع پر ہر معنی کی گنجائش ہے، اسی لئے علماء تفسیر کی مختلف جماعتوں نے مختلف معنی لئے ہیں، جمہورِ مفسرین نے جس کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ عفو کہا جاتا ہے ہر ایسے کام کو جو آسانی کے ساتھ بغیر کسی کلفت اور مشقت کے ہو سکے، تو معنی اس جملہ کے یہ ہوئے کہ آپ قبول کر لیا کریں اُس چیز کو جو لوگ آسانی سے کر سکیں یعنی واجباتِ شرعیہ میں آپ لوگوں سے اعلیٰ معیار کا مطالبہ نہ کریں بلکہ وہ جس پیمانہ پر آسانی سے عمل پیرا ہو سکیں اتنے ہی درجہ کو قبول کر لیا کریں، مثلاً نماز کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ ساری دنیا سے منقطع اور یکسو ہو کر اپنے رب کے سامنے ہاتھ باندھے ہوئے اس لئے کھڑا ہے کہ حمد و ثنا کے ساتھ اپنے معروضات کو بلا واسطہ بارگاہِ الہی میں خود پیش کر رہا ہے گویا وہ اس وقت براہِ راست حق تعالیٰ شانہ سے مخاطب ہے، اس کے جو آثارِ خشوع، خضوع ادب و احترام کے ہونا چاہئیں، ظاہر ہے کہ لاکھوں نمازیوں میں سے کسی کسی اللہ کے بندے کو نصیب ہوتے ہیں عام لوگ اس درجہ کو نہیں پاسکتے تو اس آیت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دی کہ آپ ان لوگوں سے اس اعلیٰ معیار کا مطالبہ ہی نہ رکھیں بلکہ جس درجہ کو وہ آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں وہ ہی قبول فرمائیں، اسی طرح دوسری عباداتِ زکوٰۃ، روزہ، حج اور عام معاملات و معاشرت کے واجباتِ شرعیہ میں جو لوگ پورا پورا حق ادا نہیں کر سکتے ان سے سرسری اطاعت و فرماں برداری ہی کو قبول کر لیا جائے۔

صحیح بخاری میں بروایت عبداللہ بن زبیرؓ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت کے یہی معنی نقل کئے گئے ہیں۔

اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نازل ہونے پر فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اعمال و اخلاق میں سرسری اطاعت قبول کرنے کا حکم دیا ہے، میں نے عزم کر لیا ہے کہ جب تک میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں ایسا ہی عمل کروں گا (ابن کثیر)

ائمہ تفسیر کی ایک بڑی جماعت حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، صدیقہ عائشہؓ اور مجاہد وغیرہ نے اس جملہ کے بھی یہی معنی قرار دیئے ہیں۔

دوسرے معنی عفو کے معافی اور درگزر کرنے کے بھی آتے ہیں، علماء تفسیر کی ایک

جماعت نے اس جگہ بھی معنی مراد لے کر اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ آپ گناہگاروں، خطاکاروں کے گناہ و قصور کو معاف کر دیا کریں۔

امام تفسیر ابن جریر طبری نے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل امین سے آیت کا مطلب پوچھا، جبریل امین نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کرنے کے بعد یہ مطلب بتلایا کہ اس آیت میں آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص آپ پر ظلم کرے آپ اس کو معاف کر دیں اور جو آپ کو کچھ نہ دے آپ اس پر بخشش کریں اور جو آپ سے تعلق قطع کرے آپ اس سے بھی ہٹا کریں۔

اس جگہ ابن مردویہ نے بروایت سعد بن عبادہ نقل کیا ہے کہ غزوہ اُحد میں جب آنحضرت کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کیا گیا اور بڑی بے دردی سے ان کے اعضاء کاٹ کر لاش کی بے حرمتی کی گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لاش کو اس ہیئت میں دیکھ کر فرمایا کہ جن لوگوں نے حمزہؓ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے میں ان کے ستر آدمیوں کے ساتھ ایسا معاملہ کر کے پھوڑوں گا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں آپ کو بتلایا گیا کہ آپ کا یہ مقام نہیں آپ کے شایان شان یہ ہے کہ عفو و درگزر سے کام لیں۔

اس مضمون کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام احمد نے عقبہ بن عامر کی روایت سے نقل کی ہے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مکارم اخلاق کی تعلیم دی وہ وہی تھی کہ جو شخص تم پر ظلم کرے اس کو معاف کر دو، جو تم سے قطع تعلق کر دے تم اس سے ہٹا کرو، جو تمہیں محروم کر دے تم اس کو بخشش دیا کرو۔

اور بیہقی نے بروایت علی مرتضیٰ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ میں تم کو اولین و آخرین کے اخلاق سے بہتر اخلاق کی تعلیم دیتا ہوں، وہ یہ ہے کہ جو شخص تم کو محروم کرے تم اس پر بخشش کرو، جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کر دو، جو تم سے تعلق قطع کرے تم اس سے بھی ہٹا کرو۔

لفظ عفو کے پہلے اور دوسرے معنی ہیں اگرچہ فرق ہے لیکن حاصل دونوں کا ایک ہی ہے کہ لوگوں کے اعمال و اخلاق میں سرسری اطاعت و فرماں برداری کو قبول فرمایا کریں، زیادہ تجسس اور تفتیش میں نہ پڑیں، اور ان سے اعلیٰ معیار کی اطاعت کا مطالبہ نہ کریں اور ان کی خطاؤں اور قصور سے درگزر فرمائیں، ظلم کا انتقام نہ لیں، چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اخلاق ہمیشہ اسی سانچے میں ڈھلے رہے، جس کا پورا مظاہرہ اس وقت ہوا جب مکہ فتح ہو کر آپ کے جانی دشمن آپ کے قبضہ میں آئے تو آپ نے سب کو

آزاد کر کے فرما دیا کہ تمہارے مظالم کا بدلہ لینا تو کیا ہم تمہیں پچھلے معاملات پر ملامت بھی نہیں کرتے۔

دوسرا جملہ اس ہدایت نامہ کا **وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ** ہے، **عُرْف** بمعنی معروف ہر اچھے اور مستحسن کام کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے ساتھ برائی اور ظلم سے پیش آئیں آپ ان سے انتقام نہ لیں بلکہ معاف کر دیں مگر ساتھ ہی ان کو نیک کام کی ہدایت بھی کرتے رہیں، گویا بدی کا بدلہ نیکی سے، ظلم کا بدلہ صرف انصاف ہی سے نہیں بلکہ احسان سے دیں۔

تیسرا جملہ **وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ** ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جاہلوں سے آپ کنارہ کش ہو جائیں، مطلب یہ ہے کہ ظلم کا انتقام چھوڑ کر آپ ان کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کریں اور نرمی کے ساتھ ان کو حق بات بتلائیں مگر بہت سے جاہل ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس شریفانہ معاملہ سے متاثر نہیں ہوتے، اس کے باوجود جہالت اور سختی سے پیش آتے ہیں تو ایسے لوگوں کے ساتھ آپ کا معاملہ یہ ہونا چاہئے کہ ان کے دکھرائی اور جاہلانہ کلام سے متاثر ہو کر انہیں جیسی سخت گفتگو نہ کریں بلکہ ان سے کنارہ کش ہو جائیں۔

امام تفسیر ابن کثیر نے فرمایا کہ کنارہ کش ہونے کا بھی مطلب یہ ہے کہ ان کی بُرائی کا جواب برائی سے نہ دیں، یہ معنی انہیں کہ ان کو ہدایت کرنا چھوڑ دیں کہ یہ وظیفہ رسالت و نبوت کے شایانِ شان نہیں۔

صحیح بخاری میں اس جگہ ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کی خلافت کے زمانہ میں عیینہ بن حصن مدینہ میں آیا اور اپنے بھتیجہ حُرّ بن قیسؓ کا مہمان ہوا، حضرت حُرّ بن قیسؓ اہل علم حضرات میں سے تھے جو حضرت فاروق اعظمؓ کی مجلس مشاورت میں شریک ہوا کرتے تھے، عیینہ نے اپنے بھتیجہ حُرّ بن قیسؓ سے کہا کہ تم امیر المؤمنین کے مقرب ہو میرے لئے ان سے ملاقات کا کوئی وقت لے لو، حُرّ بن قیسؓ نے فاروق اعظمؓ سے درخواست کی کہ میرا چچا عیینہ آپ سے ملنا چاہتا ہے، آپ نے اجازت دے دی۔

مگر عیینہ نے فاروق اعظمؓ کی مجلس میں پہنچ کر نہایت غیر مہذب اور غلط گفتگو کی کہ نہ آپ ہمیں ہمارا پورا حق دیتے ہیں نہ ہمارے ساتھ انصاف کرتے ہیں، فاروق اعظمؓ کو اس پر غصہ آیا تو حُرّ بن قیسؓ نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے **خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ**، اور یہ شخص بھی جاہلین میں سے ہے، یہ آیت

سنتے ہی فاروقِ اعظمؓ کا سارا غصہ ختم ہو گیا اور اس کو کچھ نہیں کہا، حضرت فاروقِ اعظمؓ کی یہ عادت معروف و مشہور تھی کہ کَانَ وَ قَائِلًا عِنْدَ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ یعنی کتاب اللہ کے احکام کے آگے گردن ڈالتے تھے۔

یہ آیت مکارمِ اخلاق کی جامع آیت ہے، بعض علماء نے اس کا خلاصہ یہ بیان فرمایا ہے کہ لوگ دو قسم کے ہیں ایک محسن یعنی اچھے کام کرنے والے، دوسرے بدکار ظالم، اس آیت نے دونوں طبقوں کے ساتھ اخلاق کریمانہ برتنے کی یہ ہدایت دی ہے کہ نیک کام کرنے والوں سے ان کی ظاہری نیکی کو قبول کر لو، زیادہ تفتیش و تجسس میں نہ پڑو، اور نیکی کے اعلیٰ معیار کا ان سے مطالبہ نہ کرو بلکہ جتنا وہ آسانی سے کر سکیں اس کو کافی سمجھو، اور بدکاروں کے معاملہ میں یہ ہدایت دی کہ ان کو نیک کام کھلاؤ اور نیکی کا راستہ بتلاؤ، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں اور اپنی گمراہی اور غلطی پر جتے رہیں اور جاہلانہ گفتگو سے پیش آئیں تو ان سے علحدہ ہو جائیں اور ان کی جاہلانہ گفتگو کا جواب نہ دیں، اس طرز سے یہ امید ہے کہ ان کو کسی وقت ہوش آئے اور اپنی غلطی سے باز آجائیں۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ، یعنی اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آنے لگے تو اللہ سے پناہ مانگ لیں، وہ سُنتے والا جاننے والا ہے۔

درحقیقت یہ آیت بھی پہلی آیت کے مضمون کی تکمیل ہے کیونکہ اُس میں جو ہدایت دی گئی ہے کہ ظلم کرنے والوں اور جہالت سے پیش آنے والوں کی خطا سے درگزر کریں، ان کی برائی کا جواب برائی سے نہ دیں، یہ بات انسانی طبیعت کے لئے سب سے زیادہ بھاری اور شاق ہے، خصوصاً ایسے مواقع میں شیطان اچھے بھلے انسان کو بھی غصہ دلا کر لڑنے بھگڑنے پر آمادہ کر ہی دیتا ہے، اس لئے دوسری آیت میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ اگر ایسے صبر آزما موقع میں غصہ کے جذبات زیادہ مُشتعل ہوتے نظر آئیں تو سمجھ لو کہ شیطان کی طرف سے ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ لو۔

حدیث میں ہے کہ دو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لڑ جھگڑ رہے تھے اور ایک شخص غصہ میں بے قابو ہو رہا تھا، آپ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ شخص وہ کلمہ کہہ لے تو اس کا یہ اشتعال جاتا رہے، فرمایا وہ کلمہ یہ ہے، اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، اس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر فوراً یہ کلمہ پڑھ لیا تو فوراً ہی سارا غصہ اور اشتعال ختم ہو گیا۔

فائدہ عجیب | امام تفسیر ابن کثیر نے اس جگہ ایک عجیب بات یہ لکھی ہے کہ پورے قرآن میں تین آیتیں اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم و تلقین کے لئے جامع آئی ہیں اور تینوں کے آخر میں شیطان سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے، ایک تو یہی سورۃ اعراف کی آیت ہے، دوسری سورۃ مؤمنون کی یہ آیت ہے، اِذْ قَعَّ بِاللَّيْلِ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةِ طَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ وَ قُلْ تَرَبُّواْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَٰذِهِ السَّيِّئَاتِ السَّيِّئَاتِ ، وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّخْضَرُوْا نِی (مؤمنون ۹۷) یعنی دفع کرو برائی کو بھلائی سے، ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ کہا کرتے ہیں اور آپ یوں دُعا کیجئے کہ اے میرے پروردگار میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے دباؤ سے اور اے میرے پروردگار میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ شیاطین میرے پاس آئیں۔

تیسری آیت سورہ حم سجدہ کی یہ ہے، وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِذْ قَعَّ بِاللَّيْلِ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلْقِيهَاۤ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْۤا۟ وَمَا يُلْقِيهَاۤ اِلَّا ذُوْ حِظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَلَا مَائِنُ غَنَّاكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْعٌ فَاَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ طَرَاۤئِقُهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝

یعنی نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی، آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کریں، پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جاوے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے اور یہ بات انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل مزاج ہیں، اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحبِ نصیب ہے، اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کچھ دوسرے آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا اور خوب جانتے والا ہے ان تینوں آیتوں میں غصہ دلانے والوں سے عفو و درگزر اور برائی کے بدلہ میں بھلائی کرنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ شیطان سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو انسانی جھگڑوں سے خاص دلچسپی ہے، جہاں جھگڑے کا کوئی موقع پیش آتا ہے شیاطین اس کو اپنی شکار گاہ بنا لیتے ہیں، اور بڑے سے بڑے بُردبار باوقار آدمی کو غصہ دلا کر حدود سے نکال دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس کا علاج یہ ہے کہ جب غصہ قابو میں نہ آتا دیکھیں تو سمجھ جائیں کہ شیطان مجھ پر غالب آ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اس سے پناہ مانگیں تب مکارمِ اخلاق کی تکمیل ہو سکے گی، اسی لئے بعد کی تیسری اور چوتھی آیت میں بھی شیطان سے پناہ مانگنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِآيَةٍ قَالُوا لَا اجْتَبَيْتَهَا قُلْ إِنَّمَا

اور جب تو نے نہ جاتے ان کے پاس کوئی نشانی تو کہتے ہیں کیوں نہ چھانٹ لایا تو اپنی طرف سے، تو کہہ دے

أَتَّبِعْ مَا يُوْحَىٰ إِلَىٰ مِنْ رَبِّي ۚ هَذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَ

میں تو چلتا ہوں اس پر جو حکم آئے میری طرف میرے رب سے، یہ سوچھ کی باتیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور

هُدًى وَرَحْمَةً لِّلْقَوْمِ يُؤْمِنُونَ ﴿٢٣﴾ وَإِذَا قُرِئَ

ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کو جو مؤمن ہیں، اور جب قرآن پڑھا جائے

الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٢٤﴾

تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔

خلاصہ تفسیر

اور جب آپ (ان کے) فرمائشی معجزات میں سے جن کی فرمائش براہِ عناد کرتے تھے کوئی معجزہ ان کے سامنے ظاہر نہیں کرتے (بوجہ اس کے کہ حق تعالیٰ اس معجزہ کو بمقتضائے حکمت پیدا نہیں کرتے) تو وہ لوگ (بقصد نفی رسالت آپ سے) کہتے ہیں کہ آپ (اگر نبی ہیں تو) یہ معجزہ کیوں نہ (ظہور میں) لائے، آپ فرمادیتے کہ (میرا کام معجزات باختیارِ خود لانا نہیں بلکہ میرا اصلی کام یہ ہے کہ میں اس کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے حکم بھیجا گیا ہے) (اس میں تبلیغ بھی آگئی البتہ نبوت کے اثبات کے لئے نفسِ معجزہ ضروری ہے سو ان کا وقوع ہو چکا ہے چنانچہ ان میں سب سے اعظم ایک یہی قرآن ہے جس کی شان یہ ہے کہ) یہ (بجائے خود) گویا بہت سی دلیلیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے (کیونکہ اس کی ہر مقدارِ سورت مثلاً ایک معجزہ ہے تو اس حساب سے مجموعہ قرآن کتنی دلیلیں ہوا اور اس کا یہ دلیل ہونا تو عام ہے، اور رہا اس کا نفع بالفعل تو وہ خاص ہے ماننے والوں کے ساتھ چنانچہ وہ) ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو (اس پر) ایمان رکھتے ہیں اور آپ ان سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ) جب قرآن پڑھا جایا کرے (مثلاً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تبلیغ فرمائیں) تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو (تاکہ اس کا معجزہ ہونا اور اس کی تعلیم کی خوبی سمجھ میں آئے جس سے) (مُتَبَدِّل ہے کہ تم پر رحمت ہو) (جدید یا مزید)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے کا ثبوت اور اس

پر مخالفین کے شبہات کا جواب اور ان دونوں کے ضمن میں چند احکام شرعیہ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

رسالت کے ثبوت کے لئے تمام انبیاء علیہم السلام کو معجزات دیئے جاتے ہیں، سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی مناسبت سے اتنے معجزات عطا کئے گئے جو پہلے انبیاء کے معجزات سے بہت زائد بھی ہیں اور واضح بھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات جو قرآن مجید اور صحیح روایات حدیث سے ثابت ہیں ان کی بڑی تعداد ہے، علماء نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب خصالہ کبریٰ دو ضخیم جلدوں میں اسی موضوع پر لکھی ہوئی مشہور و معروف ہے۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار معجزات سامنے آنے کے باوجود مخالفین اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے اپنی طرف سے متعین کر کے نئے نئے معجزات دکھانے کا مطالبہ کرتے رہتے تھے جس کا ذکر اسی سورت میں پہلے بھی آچکا ہے۔

متذکرہ دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں ان کا ایک اصولی جواب دیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر کا معجزہ اس کی رسالت کی ایک شہادت اور ثبوت ہوتا ہے اور جب مدعی کا دعویٰ کسی معتبر شہادت سے ثابت ہو جائے اور فریق مخالف نے اس پر کوئی جرح بھی نہ کی ہو تو اس کو دنیا کی کسی عدالت میں یہ حق نہیں دیا جاتا کہ وہ مدعی سے اس کا مطالبہ کرے کہ فلاں فلاں مخصوص لوگوں کی شہادت پیش کرے تو ہم مانیں گے موبودہ شہادت پر کوئی جرح پیش کئے بغیر ہم تسلیم نہیں کرتے، اس لئے بہت سے واضح معجزات کے دیکھنے کے بعد مخالفین کا یہ کہنا کہ فلاں قسم کا خاص معجزہ دکھائیے تو ہم آپ کو رسول مانیں۔ یہ ایک معاندانہ مطالبہ ہے جس کو کوئی عدالت صحیح تسلیم نہیں کر سکتی۔

چنانچہ پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ جب آپ ان لوگوں کا متعین کیا ہوا کوئی خاص معجزہ نہیں دکھلاتے تو یہ آپ کی رسالت کا انکار کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ آپ نے فلاں معجزہ کیوں نہیں دکھلایا، تو آپ ان کو یہ جواب دے دیجئے کہ میرا کام باختیار خود معجزات دکھلانا نہیں بلکہ میرا اصلی کام یہ ہے کہ میں ان احکام کا اتباع کروں جو میرے رب کی طرف سے بذریعہ وحی بھیجے جاتے ہیں جن میں تبلیغ بھی شامل ہے اس لئے میں اپنے اصلی کام میں مشغول ہوں اور رسالت کے لئے وہ دوسرے معجزات بھی کافی ہیں جو تم سب لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آچکے ہیں، ان کے دیکھنے کے بعد کسی خاص معجزہ کا مطالبہ ایک معاندانہ

مطالعہ ہے جو قابل التفات نہیں۔

اور جو معجزات دکھلائے گئے ہیں ان میں سے قرآن خود ایک عظیم معجزہ ہے جس نے ساری دنیا کو اپنا بلکہ اپنی ایک چھوٹی سی سورت کا مثل لانے کا کھلا چیلنج دیا اور ساری دنیا باوجود پوری کوششوں کے اس کا مثل لانے سے عاجز ہو گئی جو نہایت واضح علامت اس بات کی ہے کہ قرآن کسی بشر کا کلام نہیں بلکہ اللہ جل شانہ کا بے مثل کلام ہے۔

اس لئے فرمایا هَذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ یعنی یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے بہت سی دلیلوں اور معجزوں کا مجموعہ ہے، جن میں ادنیٰ غور کرنے والا یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ شانہ کا ہی ہے، کسی مخلوق کا اس میں کوئی دخل نہیں، اس کے بعد فرمایا وَهَدَىٰ ذَرْبَهُ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ، یعنی یہ قرآن دلیلِ حق تو سارے جہاں بکھلتے ہیں مگر مقصد تک پہنچانے والا اور رحمتِ حق تعالیٰ کا مستحق بنانے والا صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو اس پر ایمان لائیں۔

دوسری آیت میں بتلایا گیا کہ قرآن مجید مؤمنین کے لئے رحمت ہے مگر اس رحمت سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط و آداب ہیں جن کو خطابِ عام کے ساتھ اس طرح ذکر فرمایا، وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو تم اس پر کان لگاؤ اور خاموش رہو۔

اس آیت کے شان نزول میں روایات مختلف ہیں کہ یہ حکم نماز کی قرأت کے بارے میں آیا ہے یا خطبہ کے یا مطلقاً قرأتِ قرآن کے خواہ نماز یا خطبہ میں ہو یا دوسرے حالات میں، لیکن جمہور مفسرین کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ جس طرح الفاظِ آیت کے عام ہیں اسی طرح اس کا حکم بھی سب حالات کے لئے عام ہے بجز خاص استثنائی مواقع کے۔

اسی لئے خنفیہ نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو قرأت نہیں کرنا چاہئے، اور جن فقہاء نے مقتدی کو فاتحہ پڑھنے کی ہدایت کی ہے ان میں بھی بعض نے اس کی رعایت رکھی ہے کہ امام کے سکتے کے وقت فاتحہ پڑھی جائے یہاں اس بحث کا موقع نہیں، اس بحث میں علماء نے مستقل کتابیں چھوٹی بڑی بہت لکھی ہیں ان کا مطالعہ کیا جائے۔

اصل مضمون آیت کا یہ ہے کہ قرآن کریم جن لوگوں کے لئے رحمت قرار دیا گیا اس کی شرط یہ ہے کہ وہ قرآن کے ادب و احترام کو پہچانیں اور اس پر عمل کریں، اور بڑا ادب قرآن کا یہ ہے کہ جب وہ پڑھا جائے تو سننے والے اپنے کان اس پر لگائیں اور خاموش رہیں۔

کان لگاتے میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کو سنیں اور یہ بھی کہ اس کے احکام پر عمل کرنے کی جدوجہد کریں، (مظہری و قرطبی)، آخر آیت میں لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ قرآن کا رحمت ہونا اس کے مذکورہ آداب بجالانے پر موقوف ہے۔

تلاوت قرآن کے وقت خاموش رہ کر سننے کے متعلق چند ضروری مسائل اس کے بالمقابل یہ خود ظاہر ہے کہ اگر کسی نے اس کی خلاف ورزی کر کے قرآن کی بے حرمتی کی تو وہ رحمت کے بجائے قہر و غضب کا مستحق ہوگا۔

نماز کے اندر قرآن کی طرف کان لگانا اور خاموش رہنا تو عام طور پر مسلمانوں کو معلوم ہے گو عمل میں کوتاہی کرتے ہیں کہ بعض لوگوں کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ امام نے کونسی سورت پڑھی ہے، ان پر لازم ہے کہ وہ قرآن کی عظمت کو پہچانیں اور سننے کی طرف دھیان رکھیں، خطبہ جمعہ وغیرہ کا بھی شرعاً یہی حکم ہے، علاوہ اس آیت کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد خاص طور سے خطبہ کے متعلق یہ آیا ہے کہ

إِذَا خَرَجَ الْإِمَامُ فَلَا صَلَوةَ وَلَا كَلَامَ یعنی جب امام خطبہ کے لئے نکل آئے تو نہ نماز ہے نہ کلام۔

اور ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ اس وقت کوئی شخص دوسرے کو نصیحت کے لئے زبان سے یہ بھی نہ کہے کہ خاموش رہو (کرنا ہی ہو تو ہاتھ سے اشارہ کر دے) غرض دوران خطبہ میں کسی طرح کا کلام، تسبیح، درود یا نماز وغیرہ جائز نہیں۔

فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو حکم خطبہ جمعہ کا ہے وہی عیدین کے خطبہ کا اور نکاح وغیرہ کے خطبہ کا ہے کہ اس وقت کان لگانا اور خاموش رہنا واجب ہے۔

البتہ نماز اور خطبہ کے علاوہ عام حالات میں کوئی شخص بطور خود تلاوت کر رہا ہے تو دوسروں کو خاموش رہ کر اس پر کان لگانا واجب ہے یا نہیں، اس میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، بعض حضرات نے اس صورت میں بھی کان لگانے اور خاموش رہنے کو واجب اور اس کے خلاف کرنے کو گناہ قرار دیا ہے، اور اسی لئے ایسی جگہ جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں یا آرام کرتے ہوں کسی کے لئے باآواز بلند قرآن پڑھنے کو جائز نہیں رکھا اور جو شخص ایسے مواقع میں قرآن باآواز بلند پڑھتا ہے اس کو گناہگار فرمایا ہے، خلاصۃ الفتاویٰ وغیرہ میں ایسا ہی لکھا ہے۔

لیکن بعض دوسرے فقہاء نے یہ تفصیل فرمائی ہے کہ کان لگانا اور سننا صرف ان جگہوں میں واجب ہے جہاں قرآن کو سنانے ہی کے لئے پڑھا جا رہا ہو، جیسے نماز و خطبہ وغیرہ میں

اور اگر کوئی شخص بطور خود تلاوت کر رہا ہے یا چند آدمی کسی ایک مکان میں اپنی اپنی تلاوت کر رہے ہیں تو دوسرے کی آواز پر کان لگانا اور خاموش رہنا واجب نہیں، کیونکہ احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز میں جہڑا قرات فرماتے تھے اور ازواج مطہرات اس وقت نیند میں ہوتی تھیں، بعض اوقات حجرہ سے باہر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنی جاتی تھی۔

اور بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں رات کو پڑاؤ ڈالنے کے بعد صبح کو فرمایا کہ میں نے اپنے اشعری رفقاء سفر کو ان کی تلاوت کی آوازوں سے رات کے اندھیرے میں پہچان لیا کہ ان کے خیمے کس طرف اور کہاں ہیں، اگرچہ دن میں مجھے ان کے جائے قیام کا علم نہیں تھا۔

اس واقعہ میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشعری حضرات کو اس سے منع نہیں فرمایا کہ بلند آواز سے کیوں قرات کی اور نہ سونے والوں کو ہدایت فرمائی کہ جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو تم سب اٹھ بیٹھو اور قرآن سنو۔

اس قسم کی روایات سے فقہاء نے خارج نماز کی تلاوت کے معاملہ میں کچھ گنجائش دی ہے، لیکن اولیٰ اور بہتر سب کے نزدیک یہی ہے کہ خارج نماز بھی جب کہیں سے تلاوت قرآن کی آواز آئے تو اس پر کان لگائے اور خاموش رہے اور اسی لئے ایسے مواقع میں جہاں لوگ سونے میں یا اپنے کاروبار میں مشغول ہوں، تلاوت قرآن با آواز بلند کرنا مناسب نہیں۔

اس سے ان حضرات کی غلطی معلوم ہو گئی جو تلاوت قرآن کے وقت ریڈیو ایسے مجامع میں کھول دیتے ہیں جہاں لوگ اس کے سننے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، اسی طرح رات کو لاؤڈ اسپیکر لگا کر مسجدوں میں تلاوت قرآن اس طرح کرنا کہ اس کی آواز سے باہر کے سونے والوں کی نیند یا کام کرنے والوں کے کام میں خلل آئے، درست نہیں۔

علامہ ابن ہمامؒ نے لکھا ہے کہ جس وقت امام نماز میں یا خطیب خطبہ میں کوئی مضمون جنت و دوزخ کے متعلق پڑھ رہا ہو تو اس وقت جنت کی دعاء یا دوزخ سے پناہ مانگنا بھی جائز نہیں، کیونکہ اس آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا وعدہ اس شخص کے لئے ہے جو تلاوت قرآن کے وقت خاموش رہے، اور جو خاموش نہ رہے اس سے وعدہ نہیں، البتہ نفل نمازوں میں ایسی آیات کی تلاوت کے بعد آہستہ و حمانگنا سنت سے ثابت ہے اور موجب ثواب ہے (مظہری)

وَإِذْ كُنَّا نَدْعُو رَبَّنَا فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ

اور یاد کرتا رہ اپنے رب کو اپنے دل میں گڑگڑاتا ہوا اور ڈرتا ہوا اور ایسی آواز سے جو کہ

مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ ﴿۲۰۵﴾

پکار کر بولنے سے کم ہو صبح کے وقت اور شام کے وقت اور مت رہ بے خبر ،

إِنَّ الَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَ

بیشک جو تیرے رب کے نزدیک ہیں وہ تکبر نہیں کرتے اس کی بندگی سے اور

لِيَسْجُدَ لَهُ وَلَهُ يُسْجَدُونَ ﴿۲۰۶﴾

یاد کرتے ہیں اس کی پاک ذات کو اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اور (آپ ہر شخص سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ) اے شخص اپنے رب کی یاد کیا کر (قرآن سے یا تسبیح وغیرہ سے خواہ) اپنے دل میں (یعنی آہستہ آواز سے) عاجزی کے ساتھ اور (خواہ) زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ (اسی عاجزی اور خوف کے ساتھ) صبح و شام، (یعنی علی الدوام) اور (دوام کا مطلب یہ ہے کہ) اہل غفلت میں شمار مت ہونا (کہ اذکار مامور بہا بھی ترک کر دو) یقیناً جو (ملائکہ) تیرے رب کے نزدیک (مقرب) ہیں وہ اس کی عبادت سے (جس میں اصلی عقائد ہیں) تکبر نہیں کرتے اور اس کی پاکی بیان کرتے ہیں (جو کہ طاعت لسانی ہے) اور اس کو سجدہ کرتے ہیں (جو کہ اعمال بوارح سے ہے)۔

معارف و مسائل

ان سے پہلی آیات میں قرآن مجید سننے کا ذکر اور اس کے آداب کا بیان تھا، ان دو آیتوں میں جمہور کے نزدیک مطلق ذکر اللہ کا حکم اور اس کے آداب کا بیان ہے جس میں تلاوت قرآن بھی شامل ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نزدیک اس میں بھی ذکر سے مراد قرآن ہی ہے اور جو آداب اس میں بیان ہوئے ہیں وہ بھی تلاوت قرآن ہی سے متعلق ہیں، لیکن یہ کوئی اختلاف نہیں کیونکہ علاوہ قرآن کے دوسرے اذکار کا بھی سب کے نزدیک یہی حکم اور یہی آداب ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں انسان کو اللہ کی یاد اور ذکر کا حکم اور اس کے ساتھ اس کے اوقات اور آداب کا بیان ہے۔

ذکر خفی اور ذکر جہر کے احکام | پہلا ادب ذکر کے آہستہ یا بلند آواز سے کرنے کے متعلق ہے اس کے بارے میں قرآن کریم نے اس آیت میں دو طرح کا اختیار دیا ہے، ذکر خفی اور ذکر جہر۔ ذکر خفی کے بارے میں فرمایا **وَإِذْ كُنَّا نَبِّئُكَ فِي نَفْسِكَ** یعنی اپنے رب کو یاد کیا کرو اپنے دل میں، اس کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ بغیر زبان کی حرکت کے صرف دل میں دھیان اور خیال اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا رکھے جس کو ذکر قلبی یا تفکر کہا جاتا ہے، دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ زبان سے بھی آہستہ آواز میں اسماء الہیہ کے حروف ادا کرے، سب سے افضل اور بہتر صورت یہی ہے کہ جو ذکر کر رہا ہے اس کے مفہوم کو سمجھ کر دل میں بھی اس کا پورا استحضار اور دھیان ہو اور زبان سے بھی ادا کرے کیونکہ اس صورت میں قلب کے ساتھ زبان بھی ذکر میں شریک ہو جاتی ہے اور اگر صرف دل ہی دل میں دھیان اور تفکر میں مشغول رہے زبان سے کوئی حرف ادا نہ کرے وہ بھی بڑا ثواب ہے اور سب سے کم درجہ اس کا ہے کہ صرف زبان پر ذکر ہو اور قلب اس سے خالی اور غافل ہو، ایسے ہی ذکر کو مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے ۵

برزیاں تسبیح و در دل گاؤ حشر این چنین تسبیح کے دار و اثر

اور مقصد مولانا رومیؒ کا یہ ہے کہ قلب غافل کے ذکر کرنے سے ذکر کے آثار و برکات کامل حاصل نہیں ہوتے، اس کا انکار نہیں کہ یہ صرف زبانی ذکر بھی ثواب اور فائدہ سے خالی نہیں، کیونکہ بعض اوقات یہ زبانی ذکر ہی قلبی ذکر کا ذریعہ اور سبب بن جاتا ہے، زبان سے کہتے کہتے قلب بھی متاثر ہونے لگتا ہے اور کم از کم ایک عضو تو ذکر میں مشغول ہے ہی، وہ بھی ثواب سے خالی نہیں، اس لئے جن لوگوں کو ذکر و تسبیح میں دلجمعی اور دھیان اور استحضار نہیں ہوتا وہ بھی ایسے ذکر کو بے فائدہ سمجھ کر چھوڑیں نہیں، جاری رکھیں اور استحضار کی کوشش کرتے رہیں۔

دوسرا طریقہ ذکر کا اسی آیت میں یہ بتلایا **وَذُورَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ**، یعنی زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ۔ یعنی ذکر اللہ میں مشغول ہونے والے کو یہ بھی اختیار ہے کہ آواز سے ذکر کرے مگر اس کا ادب یہ ہے کہ بہت زور سے چیخ کر نہ کرے متوسط آواز کے ساتھ کرے جس میں ادب و احترام ملحوظ رہے، بہت زور سے ذکر و تلاوت کرنا اس کی علامت ہوتی ہے کہ مخاطب کا ادب و احترام اس کے دل میں نہیں، جس ہستی کا ادب و احترام اور رعب انسان کے دل میں ہوتا ہے اس کے سامنے طبعی طور پر انسان بہت بلند آواز سے نہیں بول سکتا، اس لئے عام ذکر اللہ ہو یا تلاوت قرآن جب آواز سے پڑھا جائے تو اس

کی رعایت رکھنا چاہئے کہ ضرورت سے زائد آواز بلند نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت سے ذکر اللہ اور تلاوت قرآن کے تین طریقے حاصل ہوئے، ایک یہ کہ صرف ذکر قلبی یعنی معانی قرآن اور معانی ذکر کے تصور اور تفکر پر اکتفا کرے، زبان کو بالکل حرکت نہ ہو، دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ زبان کو بھی حرکت دے مگر آواز بلند نہ ہو جس کو دوسرے آدمی سن سکیں، یہ دونوں طریقے ذکر کے ارشاد ربانی وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ میں داخل ہیں اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ استحضار قلب اور دھیان کے ساتھ زبان کی حرکت بھی ہو اور آواز بھی، مگر اس طریق کے لئے ادب یہ ہے کہ آواز کو زیادہ بلند نہ کرے، متوسط حد سے آگے نہ بڑھائے، یہ طریقہ ارشاد قرآنی وَذُكِّرَ الْجَاهِلِينَ الْقَوْلَ میں تلقین فرمایا گیا ہے، قرآن کریم کی ایک دوسری آیت نے اس کی مزید وضاحت ان لفظوں میں فرمائی ہے، وَلَا تَجْهَرُ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافُ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ اپنی قرات میں نہ زیادہ جہر کیا کریں اور نہ بالکل انخفاء، بلکہ جہر اور انخفاء کے درمیانی کیفیت رکھا کریں۔

نماز میں قرات قرآن کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کو یہی ہدایت فرمائی۔

صحیح حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر رات میں گھر سے نکلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ نماز میں مشغول تھے مگر تلاوت آہستہ کر رہے تھے، پھر حضرت عمر بن خطابؓ کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ بہت بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے، جب صبح کو یہ دونوں حضرات حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے صدیق اکبرؓ سے فرمایا کہ میں رات تمہارے پاس گیا تو دیکھا کہ تم پست آواز سے تلاوت کر رہے تھے، صدیقؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے جس ذات کو سنانا تھا اس نے سن لیا یہ کافی ہے، اسی طرح فاروق اعظمؓ سے فرمایا کہ آپ بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ قرات میں جہر کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ نیند کا غلبہ نہ رہے اور شیطان اس کی آواز سے بھاگے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ صدیق اکبرؓ کو یہ ہدایت کی کہ ذرا کچھ آواز بلند کیا کریں اور فاروق اعظمؓ کو یہ کہ کچھ پست کیا کریں۔ (ابوداؤد)

ترمذی میں روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے بارے میں بعض حضرات نے سوال کیا کہ جہر کرتے تھے یا ستر؟ انہوں نے فرمایا کہ کبھی جہر کبھی ستر، دونوں طرح تلاوت فرماتے تھے۔

رات کی نفل نماز میں اور خارج نماز تلاوت میں بعض حضرات نے جہر پسند کیا بعض نے آہستہ کو، اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ تلاوت کرنے والے کو اختیار ہے جس طرح چاہے تلاوت کرے، البتہ آواز سے تلاوت کرنے میں چند شرائط سب کے نزدیک ضروری ہیں، اول یہ کہ اس میں تام و نمود اور ریاء کا اندیشہ نہ ہو، دوسرے اس کی آواز سے دوسرے لوگوں کا حرج یا تکلیف نہ ہو، کسی دوسرے شخص کی نماز و تلاوت یا کام میں یا آرام میں خلل انداز نہ ہو، اور جہاں تام و نمود اور ریاء کا یا دوسرے لوگوں کے کام یا آرام میں خلل کا اندیشہ ہو تو سب کے نزدیک آہستہ ہی پڑھنا افضل ہے۔

اور جو حکم تلاوت قرآن کا ہے وہی دوسرے اذکار و تسبیح کا ہے کہ آہستہ اور بلند آواز سے دونوں طرح جائز ہے بشرطیکہ آواز اتنی بلند نہ ہو جو خشوع و خضوع اور ادب کے خلاف ہو نیز اس کی آواز سے دوسرے لوگوں کے کام یا آرام میں خلل نہ آتا ہو۔

اور اس کا فیصلہ کہ سر اور جہر میں سے افضل کیا ہے، اشخاص اور حالات کے اعتبار سے مختلف ہے، بعض لوگوں کے لئے جہر بہتر ہوتا ہے بعض کے لئے آہستہ، نیز بعض اوقات جہر بہتر ہوتا ہے بعض وقت سر، (تفسیر منطہری و روح البیان وغیرہ)

دوسرا ادب تلاوت اور ذکر کا یہ ہے کہ عاجزی اور تضرع کے ساتھ ذکر کیا جاوے جو نتیجہ اس کا ہوتا ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ کی عظمت و جلال مستحضر ہو اور جو ذکر کر رہا ہے اس کے معنی و مفہوم پر نظر ہو۔

تیسرا ادب اسی آیت میں لفظ خُفِیَّة سے یہ بتلایا گیا کہ ذکر و تلاوت کے وقت انسان پر ہیبت اور خوف کی کیفیت ہونا چاہئے، خوف اس کا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت اور عظمت کا حق ادا نہیں کر سکتے، ممکن ہے کہ ہم سے کوئی بے ادبی ہو جائے، نیز اپنے گناہوں کے استحضار سے عذاب الہی کا خوف نیز انجام اور خاتمہ کا خوف کہ معلوم نہیں ہمارا خاتمہ کس حال پر ہونا ہے، بہر حال ذکر و تلاوت اس طرح کیا جائے جیسے کوئی ہیبت زدہ ڈرنے والا کیا کرتا ہے۔

یہی آداب دعا اسی سورۃ اعراف کے شروع میں بھی ایک آیت میں اس طرح آئے ہیں اَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً، اس میں خُفْيَةً کے بجائے خُفِيَّةً کا لفظ آیا ہے جس کے معنی آہستہ آواز سے ذکر کرنے کے ہیں، گویا ذکر و تلاوت کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ آہستہ پست آواز سے کیا جائے، لیکن اس آیت نے اس کے معنی بھی واضح کر دیئے کہ اگرچہ آواز سے ذکر کرنا بھی ممنوع نہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ضرورت سے زائد آواز بلند نہ کرے، نیز اتنی بلند نہ کرے

جس میں خشوع و خضوع اور عاجزی و تضرع کی کیفیت جاتی رہے۔

آخر آیت میں ذکر و تلاوت کے اوقات بتلائے کہ صبح و شام ہونا چاہئے اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ کم از کم دن میں دو مرتبہ صبح اور شام ذکر اللہ میں مشغول ہونا چاہئے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صبح شام بول کر مراد تمام لیل و نہار کے اوقات ہوں جیسے مشرق مغرب بول کر سارا عالم مراد لیا جاتا ہے، اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ انسان پر لازم ہے کہ ہمیشہ ہر حال میں ذکر و تلاوت کا پابند رہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت ہر حال میں اللہ کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔

آخر آیت میں فرمایا وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ، یعنی اللہ کی یاد کو چھوڑ کر غفلت والوں میں شامل نہ ہو جانا کہ یہ بہت بڑا خسارہ ہے۔

دوسری آیت میں لوگوں کی عبرت و نصیحت کے لئے مقربانِ بارگاہِ الہی کا ایک مخصوص حال بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کے پاس ہونے سے مراد اللہ تعالیٰ کا مقبول ہونا ہے جس میں سب فرشتے اور تمام انبیاء علیہم السلام اور صالحین امت شامل ہیں، اور تکبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھ کر ان عبادات میں قصور نہیں کرتے بلکہ اپنے کو عاجز و محتاج سمجھ کر ہمیشہ اللہ کی یاد اور عبادت میں مشغول اور تسبیح کرتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے رہتے ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو دائمی عبادت اور یادِ خدا کی توفیق ہوتی ہے تو یہ اس کی علامت ہے کہ وہ ہر وقت اللہ کے پاس ہیں اور اللہ تعالیٰ کی معیت ان کو حاصل ہے سجدہ کے بعض فضائل اور احکام | یہاں عبادتِ نماز میں سے صرف سجدہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ تمام ارکانِ نماز میں سجدہ کو خاص فضیلت حاصل ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلائے جس سے میں جنت میں جا سکوں، حضرت ثوبانؓ خاموش رہے، اس نے پھر سوال کیا، پھر بھی خاموش رہے، جب تیسری مرتبہ سوال کو دہرایا تو انہوں نے کہا کہ میں نے یہی سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، آپ نے مجھے یہ وصیت فرمائی کہ کثرت سے سجدے کیا کرو کیونکہ جب تم ایک سجدہ کرتے ہو تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں اور ایک گناہ معاف فرما دیتے ہیں، یہ شخص کہتے ہیں کہ حضرت ثوبانؓ کے بعد میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے بلا تو ان سے بھی یہی سوال کیا، انہوں نے

بھی یہی جواب دیا۔

اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ اپنے رب کے ساتھ سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب کہ بندہ سجدہ میں ہو، اس لئے تم سجدہ کی حالت میں خوب دُعا کیا کرو کہ اس کے قبول ہونے کی بڑی امید ہے۔

یاد رہے کہ تنہا سجدہ کی کوئی عبادت معروف نہیں، اس لئے امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک کثرت سجدہ سے مراد یہ ہے کہ کثرت سے نوافل پڑھا کروں، جتنی نفلیں زیادہ ہوں گی سجدے زیادہ ہوں گے۔

لیکن اگر کوئی شخص تنہا سجدہ ہی کر کے دُعا کر لے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں اور سجدہ میں دُعا کرنے کی ہدایت نفلی نمازوں کے لئے مخصوص ہے فرائض میں نہیں۔

سورۃ اعراف ختم ہوئی، اس کی آخری آیت سجدہ ہے صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ جب کوئی آدم کا بیٹا کوئی آیت سجدہ پڑھتا ہے اور پھر سجدہ تلاوت کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا بھاگتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس انسان کو سجدہ کرنے کا حکم ملا اور اس نے تعمیل کر لی تو اس کا ٹھکانہ جنت ہوا، اور مجھے سجدہ کا حکم ہوا میں نے نافرمانی کی تو میرا ٹھکانہ جہنم ہوا۔

سُورَةُ الْاَنْفَالِ

سُورَةُ الْاَنْفَالِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ خَمْسٌ وَسَبْعُونَ آيَةً وَعَشْرٌ رُكُوعَاتٍ

سورۃ انفال مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی پچھتر آیتیں اور دس رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ ۚ

تجھ سے پوچھتے ہیں حکم غنیمت کا ، تو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا ،

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۖ وَاطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ ۚ

سو ڈرو اللہ سے اور صلح کرو آپس میں ، اور حکم مالو اللہ کا اور اس کے رسول کا

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱

اگر ایمان رکھتے ہو ۔

مضامین سورت | سورۃ انفال جو اس وقت شروع ہو رہی ہے مدنی سورت ہے۔ اس سے پہلی سورت یعنی سورۃ اعراف میں مشرکین اور اہل کتاب کے جہل و عناد اور کفر و فساد کا تذکرہ اور اس کے متعلقہ مباحث کا بیان تھا۔

اس سورت میں زیادہ تر مضامین غزوۂ بدر کے موقع پر انھیں لوگوں کے انجام بد، ناکامی اور شکست، اور ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کامیابی اور فتوحات متعلق ہیں جو مسلمانوں کے لئے احسان و انعام اور کفار کے لئے عذاب و انتقام تھا۔

اور چونکہ اس انعام کی سب سے بڑی وجہ مسلمانوں کا خلوص اور للہیت اور ان کا باہمی اتفاق ہے اور یہ اخلاص و اتفاق نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت کا اس لئے شروع سورت میں تقویٰ اور اطاعت حق اور ذکر اللہ اور توکل وغیرہ کی تعلیم دی گئی۔

خلاصہ تفسیر

یہ لوگ آپ سے غنیمتوں کا حکم دریافت کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ یہ غنیمتیں اللہ کی ہیں (یعنی وہ اللہ کی ملک ہیں اُس کو ہی حق ہے کہ اُن کے متعلق جو چاہیں حکم دے) اور رسول کی ہیں (بائیں معنی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حکم پا کر اُس کو نافذ کریں گے حاصل یہ ہے کہ اموال غنیمت کے بارہ میں تمہاری رائے اور تجویز کا کوئی دخل نہیں بلکہ اُس کا فیصلہ حکم شرعی پر ہوگا) تو تم (دنیا کی حرص مت کرو آخرت کے طالب رہو اس طرح پر کہ) اللہ سے ڈرو اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو (کہ آپس میں حسد اور بغض نہ رہے) اور اللہ کی اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم ایمان والے ہو۔

معارف و مسائل

یہ آیت غزوہ بدر میں پیش آنے والے ایک واقعہ سے متعلق ہے۔ آیت کی مفصل تفسیر سے پہلے وہ واقعہ سامنے رکھا جائے تو تفسیر سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ غزوہ بدر جو کفر و اسلام کا سب سے پہلا معرکہ تھا اس میں جب مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کچھ مال غنیمت ہاتھ آیا تو صحابہ کرام کے درمیان اس کی تقسیم کے متعلق ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جو اخلاص و اتفاق کے اُس مقام کے شایان نہ تھا جس پر صحابہ کرام کی پوری زندگی ڈھلی ہوئی تھی اس لئے سب سے پہلی ہی آیت میں اس کا فیصلہ فرمادیا گیا تاکہ اس مقدس گروہ کے قلوب میں صدق و اخلاص اور اتفاق و ایثار کے سوا کچھ نہ رہے۔

اس واقعہ کی تفصیل غزوہ بدر کے شریک حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی زبانی مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک، حاکم وغیرہ میں اس طرح منقول ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت سے کسی نے آیت مذکورہ میں لفظ انفال کا مطلب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ آیت تو ہمارے یعنی اصحاب بدر ہی کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جس کا واقعہ یہ تھا کہ مال غنیمت کی تقسیم کے بارہ میں ہمارے درمیان کچھ اختلاف پیدا ہو گیا تھا جس نے ہمارے اخلاق پر بُرا اثر ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ اموال غنیمت کو ہمارے ہاتھوں سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب حاضرین بدر میں اُس کو مساوی طور پر تقسیم فرمادیا۔

صورت یہ پیش آئی تھی کہ ہم سب غزوہ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور دونوں فریق میں گھمسان کی جنگ کے بعد اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی تو اب ہمارے

لشکر کے تین حصے ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے دشمن کا تعاقب کیا تاکہ وہ پھر واپس نہ آ سکے۔ کچھ لوگ کفار کے چھوڑے ہوئے اموال غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے اور کچھ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد اس لئے جمع رہے کہ کسی طرف سے چھپا ہوا دشمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ نہ کر دے۔ جب جنگ ختم ہو گئی اور رات کو ہر شخص اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو جن لوگوں نے مال غنیمت جمع کیا تھا وہ کہنے لگے کہ یہ مال تو ہم نے جمع کیا ہے اس لئے اس میں ہمارے سوا کسی کا حصہ نہیں۔ اور جو لوگ دشمن کے تعاقب میں گئے تھے انہوں نے کہا کہ تم لوگ ہم سے زیادہ اس کے حقدار نہیں ہو۔ کیونکہ ہم نے ہی دشمن کو پسا کیا اور تمہارے لئے یہ موقع فراہم کیا کہ تم بے فکر ہو کر مال غنیمت جمع کر لو۔ اور جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے آپ کے گرد جمع رہے انہوں نے کہا کہ ہم چاہتے تو ہم بھی مال غنیمت جمع کرنے میں تمہارے ساتھ شریک ہوتے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت جو جہاد کا سب سے اہم کام تھا ہم اس میں مشغول رہے اس لئے ہم بھی اس کے مستحق ہیں۔

صحابہ کرام کی یہ گفتگو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی اس پر یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی جس نے واضح کر دیا کہ یہ مال اللہ کا ہے اس کا کوئی مالک و حقدار نہیں۔ بجز اُس کے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرمائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادات ربانی کے ماتحت اس مال کو سب شرکاء جہاد میں مساوی طور پر تقسیم فرما دیا (ابن کثیر)۔ اور سب کے سب اللہ و رسول کے اس فیصلہ پر راضی ہو گئے۔ اور اُن کے خلاف شان جو صورت حال باہمی مسابقت کی پیش آگئی تھی اس پر نادم ہوئے۔

اور مسند احمد ہی میں اس آیت کے شان نزول کا ایک دوسرا واقعہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا بھی منقول ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر میں میرے بھائی عمیر شہید ہو گئے۔ میں نے اُن کے بالمقابل مشرکین میں سے سعید بن العاص کو قتل کر دیا اور اُس کی تلوار لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ تلوار مجھے مل جائے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کو مال غنیمت میں جمع کر دو۔ میں حکم ماننے پر مجبور تھا مگر میرا دل اس کا سخت صدمہ محسوس کر رہا تھا کہ میرا بھائی شہید ہوا اور میں نے اُس کے بالمقابل ایک دشمن کو مار کر اُس کی تلوار حاصل کی وہ بھی مجھ سے لے لی گئی مگر بائینہم تعمیل ارشاد کے لئے مال غنیمت میں جمع کرنے کے لئے آگے بڑھا تو ابھی دور نہیں گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۃ انفال کی یہ آیت نازل ہوئی اور آپ نے مجھے بلوا کر یہ تلوار مجھے عنایت فرمادی۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ حضرت سعدؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض بھی کیا تھا کہ یہ تلوار مجھے دے دی جائے

مگر آپ نے فرمایا کہ نہ یہ میری چیز ہے جو کسی کو دے دوں اور نہ آپ کی ملک ہے اس کو پورے مال غنیمت میں جمع کر دو اس کا فیصلہ جو کچھ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اُس کے مطابق ہوگا۔ (ابن کثیر مظہری)
اس میں کوئی بعد نہیں کہ یہ دونوں واقعے پیش آئے ہوں اور دونوں ہی کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی ہو۔

آیت کی پوری تفسیر یہ ہے

اس میں لفظ انفال نفل کی جمع ہے جس کے معنی ہیں فضل و انعام۔ نفلی نماز، روزہ، صدقہ کو بھی نفل اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ کسی کے ذمہ لازم و واجب نہیں، کرنے والے اپنی خوشی سے کرتے ہیں۔ اصطلاح قرآن و سنت میں لفظ نفل اور انفال مال غنیمت کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو کفار سے بوقت جہاد حاصل ہوتا ہے مگر قرآن کریم میں اس معنی کے لئے تین لفظ استعمال ہوئے ہیں انفال، غنیمہ، فیع۔ لفظ انفال تو اسی آیت میں مذکور ہے اور لفظ غنیمہ اور اُس کی تفصیل اسی سورت کی آیت لیسویں آیت میں آنے والی ہے اور لفظ فیع اور اُس کے متعلق تفصیل سورۃ حشر میں بیان ہوئی ہے وَ مَا أَفَاءَ اللَّهُ الْآيَةَ اور انہیوں کے معانی تھوٹے تھوٹے فرق کے ساتھ مختلف ہیں، فرق معمولی اور قلیل ہونے کی وجہ سے بعض اوقات ایک لفظ دوسرے کی جگہ مطلقاً مال غنیمت کے لئے بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ غنیمہ عموماً اُس مال کو کہتے ہیں جو جنگ و جہاد کے ذریعہ مخالف فرق سے حاصل ہو۔ اور فیع اُس مال کو کہتے ہیں جو بغیر جنگ و قتال کے کفار سے ملے خواہ وہ چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ یا رضامندی سے دے دینا قبول کریں۔ اور نفل اور انفال کا لفظ اکثر اُس انعام کے لئے بولا جاتا ہے جو امیر جہاد کسی خاص مجاہد کو اُس کی کارگزاری کے صلہ میں علاوہ حصہ غنیمت کے بطور انعام عطا کرے۔ یہ معنی تفسیر ابن جریر میں حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کئے ہیں (ابن کثیر)۔ اور کبھی مطلقاً مال غنیمت کو بھی نفل اور انفال کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اس آیت میں اکثر مفسرین نے یہی عام معنی لئے ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہی عام معنی نقل کئے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ عام اور خاص دونوں معنی کے لئے بولا جاتا ہے اس لئے کوئی اختلاف نہیں۔ اور اس کی بہترین تشریح و تحقیق وہ ہے جو امام ابو عبیدہؒ نے اپنی کتاب الاموال میں ذکر کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اصل لغت میں نفل کہتے ہیں فضل و انعام کو اور اس اُمت مرحومہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی انعام ہے کہ جہاد و قتال کے ذریعہ جو اموال کفار سے حاصل ہوں ان کو مسلمانوں کے لئے حلال کر دیا گیا۔ ورنہ پچھلی اُمتوں میں یہ دستور نہ تھا بلکہ مال غنیمت کے لئے قانون یہ تھا کہ وہ کسی کے لئے حلال نہیں تھے تمام اموال غنیمت کو ایک جگہ جمع کر دیا جاتا تھا۔ اور آسمان سے قدرتی طور پر ایک آگ (بجلی) آتی تھی اور اُس کو جلا کر خاک کر دیتی تھی یہی اُس جہاد کے مقبول عند اللہ ہونے کی علامت ہوتی تھی۔

اور اگر کوئی مال غنیمت جمع کیا گیا اور آسمانی بجلی نے اگر اس کو نہ جلایا تو یہ علامت اس کی ہوتی تھی کہ یہ جہاد اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں اس لئے اُس مال غنیمت کو بھی مردود اور منحوس سمجھا جاتا تھا اور اسے کوئی استعمال نہ کرتا تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ بخاری و مسلم میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا ہوئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر اور اُن کی اُمت کو نہیں ملیں۔ انہیں پانچ میں سے ایک یہ ہے کہ اُحِلَّتْ لِي الْغَنَائِمُ وَلَمْ تَحِلْ لِأَحَدٍ قَبْلِي یعنی میرے لئے اموال غنیمت حلال کر دیئے گئے حالانکہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہ تھے۔

آیت مذکورہ میں انفال کا حکم یہ بتلایا گیا کہ وہ اللہ کے ہیں اور رسول کے۔ معنی اس کے یہ ہیں کہ اصل ملکیت تو اللہ تعالیٰ کی ہے اور متصرف اُن میں اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں جو حکم خداوندی کے مطابق اپنی صوابدید پر اُن کو تقسیم کرتے ہیں۔

اسی لئے ائمہ تفسیر کی ایک جماعت نے جن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، مجاہد، عکرمہ، سدی وغیرہ داخل ہیں یہ فرمایا کہ یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا جب تک تقسیم غنائم کا وہ قانون نازل نہ ہوا تھا جو اسی سورت کے پانچویں رکوع میں آ رہا ہے کیونکہ اس میں پورے مال غنیمت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ جس طرح چاہیں تصرف فرمائیں اور آگے جو تفصیلی احکام آئے ہیں اُن میں یہ ہے کہ کل مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں عام مسلمانوں کی ضروریات کے لئے محفوظ کر دیا جائے اور چار حصے شرکاء جہاد میں ایک خاص قانون کے تحت تقسیم کر دیئے جائیں جن کی تفصیل احادیث صحیحہ میں مذکور ہے۔ اس تفصیلی بیان نے سورۃ انفال کی پہلی آیت کو منسوخ کر دیا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں کوئی ناسخ منسوخ نہیں بلکہ اجمال و تفصیل کا فرق ہے سورۃ انفال کی پہلی آیت میں اجمال ہے اور اکتالیسویں آیت میں اسی کی تفصیل ہے۔ البتہ مال فیہ جس کے احکام سورۃ حشر میں بیان ہوئے ہیں وہ پورا کا پورا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر تصرف ہے آپ اپنی صوابدید سے جس طرح چاہیں عمل فرمائیں۔ اسی لئے اُس جگہ احکام بیان فرمانے کے بعد یہ ارشاد فرمایا ہے۔ وَمَا أَتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ یعنی جو کچھ تم کو ہمارا رسول دے دے اُس کو لے لو اور جس کو روک دے اُس سے باز رہو۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مال غنیمت وہ ہے جو جنگ و جہاد کے ذریعہ ہاتھ آئے اور مال فیہ وہ جو بغیر قتال و جہاد کے ہاتھ آجائے۔ اور لفظ انفال دونوں کے لئے عام بھی بولا جاتا ہے اور خاص اُس انعام کو بھی کہتے ہیں جو کسی غازی کو امیر جہاد عطا کرے۔

اس سلسلہ میں غازیوں کو انعام دینے کی چار صورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد رائج ہیں

ایک یہ کہ یہ اعلان فرمادیں کہ جو شخص کسی مخالف کو قتل کرے تو جو سامان مقتول سپاہی سے حاصل ہو وہ اسی کا ہے جس نے قتل کیا۔ یہ سامان مال غنیمت میں جمع ہی نہ کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ بڑے لشکر میں سے کوئی جماعت الگ کر کے کسی خاص جانب جہاد کیلئے بھیجی جائے اور یہ حکم دے دیا جائے کہ اس جانب سے جو مال غنیمت حاصل ہو وہ اسی خاص جماعت کا ہو گا جو وہاں گئی ہے صرف اتنا کرنا ہو گا کہ اُس مال میں سے پانچواں حصہ عام مسلمانوں کی ضروریات کے لئے بیت المال میں جمع کیا جائے گا۔ تیسرے یہ کہ پانچواں حصہ جو بیت المال میں جمع کیا جاتا ہے اس میں سے کسی خاص غازی کو اُس کی ممتاز کارگزاری کے صلہ میں امیر کی صوابدید کے مطابق دیا جائے۔ چوتھے یہ کہ پورے مال غنیمت میں سے کچھ حصہ الگ کر کے خدمت پیشہ لوگوں کو بطور انعام دیا جائے جو مجاہدین کے گھوڑوں وغیرہ کی نگہداشت کرتے ہیں اور اُن کے کاموں میں مدد کرتے ہیں۔ (ابن کثیر)

خلاصہ مضمون آیت کا یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ لوگ آپ سے انفال کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ اُن سے کہہ دیجئے کہ انفال سب اللہ کے ہیں اور اُس کے رسول کے یعنی خود کوئی اُن کا حقدار یا مالک نہیں، اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُس کے رسول جو کچھ فیصلہ فرمائیں وہ ہی نافذ ہو گا۔

اس آیت کے آخری جملہ میں ارشاد فرمایا فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ

لوگوں کے باہمی اتفاق و اتحاد کی بنیاد تقویٰ اور خوفِ خدا ہے

جس میں صحابہ کرام کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور آپس کے تعلقات کو درست رکھو اس میں اشارہ اُس واقعہ کی طرف ہے جو غزوہ بدر میں اموال غنیمت کی تقسیم کی بابت صحابہ کرام کے آپس میں پیش آگیا تھا جس میں باہمی کشیدگی اور ناراضی کا خطرہ تھا۔ حق تعالیٰ نے تقسیم غنیمت کا قضیہ تو خود اس آیت کے ذریعے طے فرما دیا۔ اب اُن کے دلوں کی اصلاح اور باہمی تعلقات کی خوشگواہی کی تدبیر بتلائی گئی ہے جس کا مرکزی نقطہ تقویٰ اور خوفِ خدا ہے۔

تجربہ شائد ہے کہ جب تقویٰ اور خوفِ خدا و آخرت غالب ہوتا ہے تو بڑے بڑے جھگڑے منٹوں میں ختم ہو جاتے ہیں۔ باہمی منافرت کے پہاڑ گرد بن کر اُڑ جاتے ہیں، اہل تقویٰ کا حال بقول مولانا رومیؒ یہ ہو جاتا ہے

خود چہ جائے جنگ و جدل نیک و بد کیں الم از صلح ہا ہم میر مد
یعنی ان لوگوں کو کسی جنگ و جدل اور جھگڑے سے تو کیا دلچسپی ہوتی۔ ان کو تو خلاق کی صلح اور درستی کے لئے بھی فرصت نہیں ملتی۔ کیونکہ جس کا قلب اللہ تعالیٰ کی محبت و خوف اور یاد میں مشغول ہو اُس کو دوسروں سے تعلقات بڑھانے کی کہاں فرصت ہے

بسودائی جانان زباں مشغول بذکر حبیب از جہاں مشغول
اسی لئے اس آیت میں تقویٰ کی تدبیر بتلا کر فرمایا اَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ یعنی بذریعہ تقویٰ
آپس کے تعلقات کی اصلاح کرو اس کی مزید تشریح اس طرح فرمائی وَ اطِيعُوا اللَّهَ وَ رَسُولَهُ اِنَّ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یعنی اللہ اور رسول کی مکمل اطاعت ہو اگر تم مؤمن ہو یعنی ایمان کا تقاضا ہے
اطاعت اور اطاعت نتیجہ ہے تقویٰ کا اور جب یہ چیزیں لوگوں کو حاصل ہو جائیں تو اُن کے آپس
کے جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے اور دشمنی کی جگہ دلوں میں الفت و محبت پیدا ہو جائے گی۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ

ایمان والے وہی ہیں کہ جب نام آئے اللہ کا تو ڈر جائیں ان کے دل

وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهُ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَ عَلٰى رَٰبِّهِمْ

اور جب پڑھا جائے اُن پر اُس کا کلام تو زیادہ ہو جاتا ہے اُن کا ایمان اور وہ اپنے رب پر

يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو کہ قائم رکھتے ہیں نماز کو اور ہم نے جو اُن کو روزی دی ہے اس پر

يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ

خرچ کرتے ہیں۔ وہی ہیں سچے ایمان والے، ان کے لئے درجے ہیں

عِنْدَ رَٰبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ ۙ وَ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝

اپنے رب کے پاس اور معافی اور روزی عزت کی۔

خلاصہ تفسیر

(بس) ایمان والے تو وہی لوگ ہوتے ہیں کہ جب (اُن کے سامنے) اللہ کا ذکر آتا
ہے تو (اُس کی عظمت کے استحضار سے) اُن کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں اُن
کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں اُن کے ایمان کو اور زیادہ (مضبوط) کر دیتی ہیں اور وہ لوگ
اپنے رب پر توکل کرتے ہیں (اور) جو کہ نماز کی اقامت کرتے ہیں اور ہم نے اُن کو جو کچھ دیا
ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (بس) سچے ایمان والے یہ لوگ ہیں اُن کے لئے بڑے
بڑے درجے ہیں ان کے رب کے پاس اور (ان کے لئے) مغفرت ہے اور عزت کی روزی۔

معارف و مسائل

مؤمن کی مخصوص صفات | آیات مذکورہ میں اُن مخصوص صفات کا بیان ہے جو ہر مؤمن میں ہونا چاہئے۔ اس میں اشارہ ہے کہ ہر مؤمن اپنی ظاہر اور باطنی کیفیات اور صفات کا جائزہ لیتا رہے اگر یہ صفات اس میں موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر کرے کہ اُس نے اس کو مؤمنین کی صفات عطا فرمادی۔ اور اگر ان میں سے کوئی صفت موجود نہیں یا ہے مگر ضعیف و کمزور ہے تو اُس کے حاصل کرنے یا قوی کرنے کی فکر میں لگ جائے۔

پہلی صفت خوفِ خدا | پہلی صفت یہ بیان فرمائی اَلَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ یعنی جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل سہم جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت ان کے دلوں میں رچی اور بھری ہوئی ہے جس کا ایک تقاضا ہیبت و خوف ہے قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں اس کا ذکر کر کے اہل محبت کو بشارت دی گئی ہے وَ يَشْرِي الْمُحْسِنِينَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ۔ یعنی خوشخبری دے دیجئے اُن متواضع نرم خو لوگوں کو جن کے دل ڈر جاتے ہیں جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے۔ ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد کے ایک خاص تقاضا کا ذکر ہے یعنی ہیبت اور خوف اور دوسری آیت میں ذکر اللہ کی یہ خاصیت بھی بیان فرمائی گئی ہے کہ اُس سے دل مطمئن ہو جاتے ہیں اَلَا يَذْكُرُ اللَّهُ تَطْمِئِنُّ الْقُلُوبُ۔ یعنی اللہ ہی کی یاد سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس خوف و ہیبت کا ذکر ہے وہ دل کے سکون و اطمینان کے خلاف نہیں جیسے کسی درندے یا دشمن کا خوف قلب کے سکون کو برباد کر دیتا ہے ذکر اللہ کے ساتھ دل میں پیدا ہونے والا خوف اس سے بالکل مختلف ہے اور اسی لئے یہاں لفظ خوف استعمال نہیں فرمایا وَجَلَّ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کا ترجمہ مطلق خوف نہیں بلکہ وہ ہیبت ہے جو بڑوں کی جلالت شان کے سبب دل میں پیدا ہوتی ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ اللہ کے ذکر اور یاد سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی گناہ کے ارتکاب کا ارادہ کر رہا تھا اسی حال میں اُس کو خدا تعالیٰ کی یاد آگئی تو وہ اللہ کے عذاب سے ڈر گیا۔ اور گناہ سے باز آگیا۔ اس صورت میں خوف سے مراد خوفِ عذاب ہی ہوگا۔ (بحر محیط)

دوسری صفت ایمان میں ترقی | مؤمن کی دوسری صفت یہ بتلائی کہ جب اُس کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو اُس کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔ ایمان بڑھنے کے ایسے معنی جن پر سب علماء مفسرین و محدثین کا اتفاق ہے یہ ہیں کہ ایمان کی

قوت و کیفیت اور نور ایمان میں ترقی ہو جاتی ہے۔ اور یہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ اعمالِ صالحہ سے ایمان میں قوت اور ایسا شرح صدر پیدا ہو جاتا ہے کہ اعمالِ صالحہ اُس کی عادت طبعی بن جاتے ہیں جس کے چھوڑنے سے اُس کو تکلیف ہوتی ہے اور گناہ سے اُس کو طبعی نفرت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کے پاس نہیں جاتا۔ ایمان کے اسی مقام کو حدیث میں خلاوتِ ایمان کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کو کسی نے اس طرح نظم کیا ہے :

واذا حلت الخلاوة قلباً فشطت في العبادة الاعضاء

یعنی جب کسی دل میں خلاوتِ ایمان جگہ پکڑ لیتی ہے تو اُس کے ہاتھ پیر اور سب اعضاء عبادت میں راحت و لذت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اس لئے خلاصہ آیت کے مضمون کا یہ ہوا کہ مؤمن کامل کی یہ صفت ہونی چاہئے کہ جب اُس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھی جائیں تو اُس کے ایمان میں جلا و ترقی ہو اور اعمالِ صالحہ کی طرف رغبت بڑھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس طرح عام مسلمان قرآن پڑھتے ہیں اور سنتے ہیں کہ نہ قرآن کے ادب و احترام کا کوئی اہتمام ہے نہ اللہ جل شانہ کی عظمت پر نظر ہے ایسی تلاوت مقصود اور اعلیٰ نتائج پیدا کرنے والی نہیں گو ثواب سے وہ بھی خالی نہ ہو۔

تیسری صفت اللہ پر توکل | تیسری صفت مؤمن کی یہ بیان فرمائی کہ وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرے۔ توکل کے معنی اعتماد اور بھروسہ کے ہیں۔ مطلب یہ

ہے کہ اپنے تمام اعمال و احوال میں اُس کا مکمل اعتماد اور بھروسہ صرف ذاتِ واحد حق تعالیٰ پر ہو۔ صحیح حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ اپنی ضروریات کے لئے مادی اسباب اور تدابیر کو ترک کر کے بیٹھ جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ مادی اسباب و آلات کو اصل کامیابی کے لئے کافی نہ سمجھے بلکہ بقدر قدرت و ہمت مادی اسباب اور تدابیر کو فراہم کرنے اور استعمال کرنے کے بعد معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے اور سمجھے کہ اسباب بھی اُسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور اُن اسباب کے ثمرات بھی وہی پیدا کرتے ہیں۔ ہو گا وہی جو وہ چاہیں گے۔ ایک حدیث میں فرمایا اَجْمَلُوا فِي الطَّلَبِ وَتَوَكَّلُوا عَلَيْهِ۔ یعنی رزق اور اپنی حاجات کے حاصل کرنے کے لئے متوسط درجہ کی طلب اور مادی اسباب کے ذریعہ کوشش کر لو پھر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو۔ اپنے دل و دماغ کو صرف مادی تدبیروں اور اسباب ہی میں نہ الجھا رکھو۔

چوتھی صفت اقامتِ صلوٰۃ | چوتھی صفت مؤمن کی اقامتِ صلوٰۃ بتلائی۔ اس میں یہ بات قابلِ یاد رکھنے کے ہے کہ یہاں نماز پڑھنے کا نہیں بلکہ نماز کی اقامت کا ذکر ہے۔ اقامت کے لفظی معنی کسی چیز کو سیدھا کھڑا کرنے کے ہیں۔ مراد اقامتِ صلوٰۃ سے

یہ ہے کہ نماز کے پورے آداب و شرائط اُس طرح بجالائے جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قول و عمل سے بتلائے ہیں۔ آداب و شرائط میں کوتاہی ہوئی تو اُس کو نماز پڑھنا تو کہہ سکتے ہیں مگر اقامت صلوٰۃ نہیں کہہ سکتے۔ قرآن مجید میں نماز کے جو فوائد اور آثار اور برکات ذکر کی گئی ہیں اور فرمایا گیا ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ یعنی نماز روکتی ہے بے حیائی اور ہر گناہ سے۔ یہ بھی اقامت صلوٰۃ ہی پر موقوف ہے جب نماز کے آداب میں کوتاہی ہوئی تو گو فتویٰ کی رو سے اُس کی نماز کو جائز ہی کہا جائے مگر نماز کی برکات میں کوتاہی کی مقدار پر فرق پڑ جائے گا۔ اور بعض صورتوں میں ان برکات سے کلی طور پر محرومی ہو جائے گی۔

پانچویں صفت اللہ کی راہ میں خرچ کرنا | پانچویں صفت مرد مؤمن کی یہ بیان فرمائی کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اُس کو رزق دیا ہے وہ اُس میں سے

اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ یہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا عام ہے تمام صدقات و خیرات اور وقف و صلہ کو جس میں زکوٰۃ، صدقۃ الفطر وغیرہ واجبات شرعی بھی داخل ہیں اور نفلی صدقات و تبرعات بھی، مہانوں، دوستوں، بزرگوں کی مالی خدمت بھی۔

مرد مؤمن کی یہ پانچ صفات بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا۔ یعنی ایسے ہی لوگ سچے مؤمن ہیں جن کا ظاہر و باطن یکساں اور زبان اور دل متفق ہیں ورنہ جن میں یہ صفات نہیں وہ زبان سے تو اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہتے ہیں مگر اُن کے دلوں میں نہ توحید کا رنگ نہ اطاعت رسول کا۔ اُن کے اعمال اُن کے اقوال کی تردید کرتے ہیں۔ اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے جب وہ حاصل نہ ہو حق حاصل نہیں ہوتا۔

ایک شخص نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ اے ابوسعید کیا آپ مؤمن ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ بھائی ایمان دو قسم کے ہیں۔ تمہارے سوال کا مطلب اگر یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر اور جنت و دوزخ اور قیامت اور حساب کتاب پر ایمان رکھتا ہوں تو جواب یہ ہے کہ بیشک میں مؤمن ہوں۔ اور اگر تمہارے سوال کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ مؤمن کامل ہوں جس کا ذکر سورۃ انفال کی آیات میں ہے تو مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں اُن میں داخل ہوں یا نہیں۔ سورۃ انفال کی آیات سے وہی آیات مراد ہیں جو ابھی آپ نے سنی ہیں۔

آیات مذکورہ میں سچے مؤمن کی صفات و علامات بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا لَھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ کَرِیْمٌ۔

اس میں سچے مؤمنین کے لئے تین چیزوں کا وعدہ فرمایا۔ ایک درجات عالیہ، دوسرے

مغفرت، تیسرے رزق عمدہ۔

تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اس سے پہلی آیات میں سچے مومنین کی جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ تین قسم کی ہیں، ایک وہ جن کا تعلق قلب اور باطن کے ساتھ ہے جیسے ایمان، خوفِ خدا، توکل علی اللہ۔ دوسرے وہ جن کا تعلق جسمانی اعمال سے ہے جیسے نماز وغیرہ۔ تیسرے وہ جن کا تعلق انسان کے مال سے ہے جیسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔

ان تینوں قسموں کے بالمقابل تین انعاموں کا ذکر آیا ہے۔ درجاتِ عالیہ قلبی اور باطنی صفات کے مقابلہ میں اور مغفرت اُن اعمال کے مقابلہ میں جو انسان کے ظاہر بدن سے متعلق ہیں جیسے نماز روزہ وغیرہ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ نماز گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے اور رزق کریم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بالمقابل آیا ہے کہ جو کچھ خرچ کیا اُس سے بہت بہتر اور بہت زیادہ اُس کو آخرت میں ملے گا۔

کَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ

جیسے نکالا تجھ کو تیرے رب نے تیرے گھر سے حق کام کے واسطے، اور ایک جماعت اہل

الْمُؤْمِنِينَ لَكَرِهُونَ ۖ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ

ایمان کی راضی نہ تھی۔ وہ تجھ سے جھگڑتے تھے حق بات میں اُس کے ظاہر ہو چکنے کے بعد

كَانَتُمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۖ

گویا وہ ہانکے جاتے ہیں موت کی طرف آنکھوں دیکھتے۔

خلاصہ تفسیر

(مالِ غنیمت کا لوگوں کی مرضی کے موافق تقسیم نہ ہونا بلکہ بجانب اللہ اس کی تقسیم ہونا اگرچہ بعض لوگوں کو طبعاً گراں گزرا ہو مگر مصالح کثیرہ کی وجہ سے یہی خیر اور بہتر ہے۔ اور یہ معاملہ خلاف طبع مگر مصالح کثیرہ کو متضمن ہونے میں ایسا ہی ہے) جیسا آپ کے رب نے آپ کے گھر (اور بستی) سے مصلحت کے ساتھ آپ کو (بدر کی طرف) روانہ کیا اور مسلمانوں کی ایک جماعت (اپنی تعداد اور سامانِ جنگ کی قلت کی وجہ سے طبعاً) اس کو گراں سمجھتی تھی وہ اس مصلحت (کے کام) میں (یعنی جہاد اور مقابلہ لشکر کے معاملے میں) بعد اس کے کُاس کا ظہور ہو چکا تھا (اپنے بچاؤ کے لئے بطور مشورہ کے) آپ سے اس طرح جھگڑ رہے تھے کہ گویا کوئی اُن کو موت کی طرف ہانکے لئے جاتا ہے اور وہ (موت کو گویا) دیکھ رہے ہیں (مگر آخر کار انجام اس کا بھی اچھا ہوا کہ اسلام غالب اور کفر مغلوب ہوا)۔

معارف و مسائل

شروع سورت میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ سورۃ انفال کے بیشتر مضامین کفار و مشرکین پر عذاب و انتقام اور مسلمانوں پر احسان و انعام کے متعلق ہیں اور اُس کے ضمن میں دونوں فریق کے لئے عبرت و نصیحت کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ اور ان معاملات میں سب سے پہلا اور سب سے اہم واقعہ غزوۂ بدر کا تھا جس میں بڑے ساز و سامان اور تعداد و قوت کے باوجود مشرکین کو جانی اور مالی نقصانات کے ساتھ شکست اور مسلمانوں کو باوجود ہر طرح کی قلت اور بے سامانی کے فتح عظیم نصیب ہوئی۔ اس سورت میں واقعہ بدر کا تفصیلی بیان ہے۔ جو آیات مذکورہ سے شروع ہو رہا ہے۔

پہلی آیت میں اس بات کا ذکر ہے کہ بعض مسلمانوں کو بدر کے موقع پر جہاد کے لئے اقدام ناپسند تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فرمان کے ذریعہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کا حکم دیا تو ناپسند کرنے والے بھی ساتھ ہو گئے۔ اس بات کے بیان کرنے کے لئے قرآن کریم نے جو الفاظ اختیار فرمائے ہیں وہ کئی طرح سے قابل غور ہیں۔

اول یہ کہ آیت کا شروع کَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ سے ہوتا ہے۔ اس میں لفظ کَمَا ایک ایسا لفظ ہے جو تشبیہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو غور طلب یہ ہے کہ یہاں تشبیہ کس چیز کی کس چیز سے ہے۔ حضرات مفسرین نے اس کی مختلف توجیہات بیان فرمائی ہیں۔ امام تفسیر ابو حیان نے اس طرح کے پندرہ اقوال نقل کئے ہیں ان میں زیادہ اقرب تین احتمال ہیں۔

اول یہ کہ اس تشبیہ سے مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ جس طرح غزوۂ بدر کے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت صحابہ کرام کے آپس میں کچھ اختلاف رائے ہو گیا تھا۔ پھر حکم خداوندی کے تحت سب نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور اس کی برکات اور اچھے نتائج کا ظہور سامنے آ گیا۔ اسی طرح اس جہاد کے شروع میں کچھ لوگوں کی طرف سے ناپسندیدگی کا اظہار ہوا پھر حکم ربانی کے ماتحت سب نے اطاعت کی اور اُس کے مفید نتائج اور اعلیٰ ثمرات کا مشاہدہ ہو گیا۔ یہ توجیہ فراہ اور مترد کی طرف منسوب ہے (بحر محیط)۔ اسی کو بیان القرآن میں ترجیح دی ہے جیسا کہ خلاصہ تفسیر سے معلوم ہو چکا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں سچے مؤمنین کے لئے آخرت میں درجاتِ عالیہ اور مغفرت اور باعزت روزی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ان آیات میں اس وعدہ کے یقینی ہونے کا ذکر اس طرح کیا گیا کہ آخرت کا وعدہ اگرچہ ابھی آنکھوں کے سامنے نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ نصرت و فتح غزوۂ بدر میں آنکھوں کے سامنے آچکا ہے اس سے عبرت پکڑو اور یقین کرو کہ جس طرح یہ وعدہ دنیا ہی میں پورا ہو چکا ہے اسی طرح آخرت کا وعدہ بھی ضرور پورا ہوگا۔ (تفسیر قرطبی بحوالہ نحاس)

تیسرا احتمال وہ ہے جس کو ابو حیان نے مفسرین کے پندرہ اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مجھے ان میں سے کسی قول پر اطمینان نہیں تھا۔ ایک روز میں اسی آیت پر غور و فکر کرتے ہوئے سو گیا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ کسی جگہ جا رہا ہوں اور ایک شخص میرے ساتھ ہے میں اسی آیت کے متعلق اُس سے بحث کر رہا ہوں اور یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے کبھی ایسی مشکل پیش نہیں آئی جیسی اس آیت کے الفاظ میں پیش آئی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی لفظ محذوف ہے۔ پھر یکایک خواب ہی میں میرے دل میں پڑا کہ یہاں لفظ نَصْرَکَ محذوف ہے اس کو خود میں نے بھی پسند کیا اور جس شخص سے بحث کر رہا تھا اُس نے بھی پسند کیا۔ بیدار ہونے کے بعد اس پر غور کیا تو میرا اشکال ختم ہو گیا کیونکہ اس صورت میں لفظ کما تشبیہ کے لئے نہیں بلکہ بیان سبب کے لئے استعمال ہوا ہے اور معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ غزوۂ بدر میں اللہ جل شانہ کی طرف سے جو خاص نصرت و امداد آپ کی ہوئی اُس کا سبب یہ تھا کہ اس جہاد میں آپ نے جو کچھ کیا کسی اپنی خواہش اور رائے سے نہیں بلکہ قالص امر ربی اور حکم خداوندی کے تابع کیا۔ اُسی کے حکم پر آپ اپنے گھر سے نکلے۔ اور اطاعتِ حق کا یہی نتیجہ ہونا چاہئے اور یہی ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی امداد و نصرت اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔

بہر حال آیت کے اس جملہ میں یہ تینوں معنی محتمل اور صحیح ہیں۔ اس کے بعد اس پر نظر ڈالئے کہ قرآن کریم نے اس جہاد کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خود نکلتا ذکر نہیں کیا بلکہ یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نکالا۔ اس میں اشارہ ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال عبدیت و اطاعت کی طرف کہ آپ کا فعل درحقیقت حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو آپ کے اعضاء و جوارح سے صادر ہوتا ہے۔ جیسا ایک حدیث قدسی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بندہ جب اطاعت و عبدیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے بارہ میں یہ فرماتے ہیں کہ میں اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں وہ جو کچھ دیکھتا ہے میرے ذریعہ دیکھتا ہے میں اُس کے کان بن جاتا ہوں وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعہ سنتا ہے۔ میں اُس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں وہ جس کو پکڑتا ہے میرے ذریعہ پکڑتا ہے جس کی طرف چلتا ہے میرے ذریعہ چلتا ہے۔ خلاصہ اس کا یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی خاص نصرت و امداد اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ جن افعال کا صدور بظاہر اُس کے آنکھ کان یا ہاتھ پاؤں سے ہوتا ہے، درحقیقت اُس میں قدرت حق تعالیٰ شانہ کی کار فرما ہوتی ہے۔

رشتہ درگروم افگندہ دوست میبرد ہر جا کہ خاطر خواہ دوست
خلاصہ یہ ہے کہ لفظ اَخْرَجَکَ میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاد کے لئے نکلنا درحقیقت حق تعالیٰ کا نکالنا تھا جو آپ کی ذات سے ظاہر ہوا۔
یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ اَخْرَجَکَ رَبُّکَ فرمایا جس میں اللہ جل شانہ کا ذکر صفت رب

کے ساتھ کر کے اس طرف اشارہ کرو یا کہ اس جہاد کیلئے آپ کو نکالنا شانِ ربوبیت سے اور تربیت کے تقاضا سے تھا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ مظلوم و مقہور مسلمانوں کے لئے فتح یاب اور مغرور و ظالم کفار کے لئے پہلے عذاب کا مظاہرہ کرنا تھا۔

مِنْ بَيْتِكَ کے معنی ہیں آپ کے گھر سے۔ مطلب یہ ہوا کہ نکالا آپ کو آپ کے رب نے آپ کے گھر سے۔ جہور مفسرین کے نزدیک اس گھر سے مراد مدینہ طیبہ کا گھر یا خود مدینہ طیبہ ہے جس میں ہجرت کے بعد آپ مقیم ہوئے۔ کیونکہ واقعہ بدر، ہجرت کے دوسرے سال میں پیش آیا ہے۔ اس کے ساتھ لفظ بِالْحَقِّ کا اضافہ کر کے بتلادیا کہ یہ ساری کارروائی احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لئے عمل میں آئی ہے۔ دوسری حکومتوں کی طرح ملک گیری کی ہوس یا بادشاہوں کا غصہ اس کا سبب نہیں۔ آخر آیت میں فرمایا وَرَأَتْ فَرِیقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَمَّوْهُوْنَ یعنی ایک جماعت مسلمانوں کی اس جہاد کو گراں سمجھتی اور ناپسند کرتی تھی۔ صحابہ کرام کو یہ گرانی کس طرح اور کیوں پیش آئی اس کے سمجھنے کے لئے نیز آئندہ آنے والی دوسری آیات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے غزوہ بدر کے ابتدائی حالات اور اسباب کا پہلے معلوم کر لینا مناسب ہے اس لئے پہلے غزوہ بدر کا پورا واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔

ابن عقبہ وابن عامر کے بیان کے مطابق واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ میں یہ خبر ملی کہ ایوسفیان ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ ملک شام سے مالِ تجارت لے کر مکہ معظمہ کی طرف جا رہے ہیں۔ اور اس تجارت میں مکہ کے تمام قریشی شریک ہیں۔ ابن عقبہ کے بیان کے مطابق مکہ کا کوئی قریشی مرد یا عورت باقی نہ تھا جس کا اس میں حصہ نہ ہو۔ اگر کسی کے پاس صرف ایک شقال (یعنی ساڑھے چار ماشہ) سونا بھی تھا تو اُس نے اس میں اپنا حصہ ڈال دیا تھا۔ اس قافلہ کے پورے سرمایہ کے متعلق ابن عقبہ کی روایت یہ ہے کہ پچاس ہزار دینار تھے۔ دینار سونے کا سکہ ہے جو ساڑھے چار ماشہ کا ہوتا ہے سونے کے موجودہ بھاؤ کے حساب سے اُس کی قیمت باون روپیہ اور پورے سرمایہ کی قیمت چھبیس لاکھ روپیہ بنتی ہے اور یہ بھی آج کے نہیں بلکہ اب سے چودہ سو برس پہلے کے چھبیس لاکھ ہیں جو آج کے چھبیس کروڑ سے بھی زیادہ کی حیثیت رکھتے تھے اس تجارتی قافلہ کی حفاظت اور کاروبار کے لئے قریش کے ستر جوان اور سردار ساتھ تھے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ تجارتی قافلہ درحقیقت قریش مکہ کی ایک تجارتی کمپنی تھی۔

بخاری نے بروایت ابن عباسؓ وغیرہ نقل کیا ہے کہ اس قافلہ میں قریش کے چالیس سوار قریش کے سرداروں میں سے تھے جن میں عمرو بن العاص، حمزہ بن نوفل خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ قریش کی سب سے بڑی طاقت اُن کی یہی تجارت اور تجارتی سرمایہ تھا جس کے بٹ پر انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو تنگ کر کے مکہ چھوڑنے پر مجبور

کہہ دیا تھا۔ اس وقت جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سفر شام سے اس قافلہ کی واپسی کی اطلاع ملی تو آپ کی رائے ہوئی کہ اس وقت اس قافلہ کا مقابلہ کر کے قریش کی طاقت توڑ دینے کا موقع ہے۔ صحابہ کرام سے مشورہ کیا تو زمانہ رمضان کا تھا پہلے سے کسی جنگ کی تیاری نہ تھی۔ بعض حضرات نے تو جستی اور ہمت کا اظہار کیا مگر بعض نے کچھ پس و پیش کی۔ آپ نے بھی سب پر اس جہاد کی شرکت کو لازم نہ قرار دیا بلکہ یہ حکم دیا کہ جن لوگوں کے پاس سواریاں موجود ہیں وہ ہمارے ساتھ چلیں۔ اس وقت بہت سے آدمی جہاد میں جانے سے رک گئے اور جو لوگ جانا چاہتے تھے اور ان کی سواریاں دیہات میں تھیں انھوں نے اجازت چاہی کہ ہم اپنی سواریاں لے آویں تو ساتھ چلیں۔ مگر وقت اتنے انتظار کا نہ تھا۔ اس لئے حکم یہ ہوا کہ جن لوگوں کی سواریاں پاس موجود ہیں اور جہاد میں جانا چاہیں صرف وہی لوگ چلیں۔ باہر سے سواریاں منگانے کا وقت نہیں۔ اس لئے ساتھ جانے کا ارادہ رکھنے والوں میں سے بھی تھوڑے ہی آدمی تیار ہو سکے۔ اور جن حضرات نے اس جہاد میں ساتھ جانے کا ارادہ ہی نہیں کیا اُس کا سبب بھی یہ تھا کہ آپ نے سب کے ذمہ اس جہاد کی شرکت کو واجب نہ قرار دیا تھا۔ اور ان لوگوں کو یہ بھی اطمینان تھا کہ یہ تجارتی قافلہ ہے کوئی جنگی لشکر نہیں جس کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو زیادہ لشکر اور مجاہدین کی ضرورت پڑے۔ اس لئے صحابہ کرام کی بہت بڑی تعداد اس جہاد میں شریک نہ ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بیرسقیہ پر پہنچ کر قیس بن صعصعہؓ کو حکم دیا کہ لشکر کو شمار کریں تو انہوں نے شمار کر کے اطلاع دی کہ تین سو تیرہ حضرات ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سن کر خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ تعداد اصحاب طالوت کی ہے اس لئے فال نیک، فتح اور کامیابی کی ہے۔ صحابہ کرام کے ساتھ کل ستر اونٹ تھے۔ ہر تین آدمی کے لئے ایک اونٹ تھا جس پر وہ باری باری سوار ہوتے تھے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی دو حضرات ایک اونٹ کے شریک تھے ابولبابہؓ اور حضرت علیؓ جب آپ کی باری پیدل چلنے کی آتی تو یہ حضرات عرض کرتے کہ آپ سوار رہیں ہم آپ کے بدلے پیدل چلیں گے۔ رحمۃ للعالمین کی طرف سے یہ جواب ملتا کہ نہ تو تم مجھ سے زیادہ قوی ہو اور نہ میں آخرت کے ثواب سے مستغنی ہوں کہ اپنے ثواب کا موقع تمہیں دے دوں اس لئے اپنی باری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیدل ہی چلتے تھے۔

دوسری طرف کسی شخص نے ملک شام کے مشہور مقام عین زرقا پر پہنچ کر رئیس قافلہ ابوسفیان کو اس کی خبر پہنچا دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قافلہ کے انتظار میں ہیں ان کا تعاقب کریں گے۔ ابوسفیان نے احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔ جب یہ قافلہ حدود حجاز میں داخل ہوا تو ایک ہوشیار مستعد آدمی ضمضم بن عمرو کو بیس مثقال سونا یعنی تقریباً دو ہزار روپیہ اجرت دے کر

اس پر راضی کیا کہ وہ تیز رفتار سائڈنی پر سوار ہو کر جلد سے جلد مکہ مکرمہ میں یہ خبر پہنچا دے کہ ان کے قافلہ کو صحابہ کرام سے خطرہ لاحق ہے۔

ضمضم بن عمرو نے اُس زمانہ کی خاص رسم کے مطابق خطرہ کا اعلان کرنے کے لئے اپنی اونٹنی کے ناک کان کاٹ دیئے اور اپنے کپڑے آگے پیچھے سے پھاڑ ڈالے۔ اور کہا وہ کو اٹھا کر کے اونٹنی کی پشت پر رکھا۔ یہ علامات اُس زمانہ میں خطرہ کی گھنٹی سمجھی جاتی تھی۔ جب وہ اس شان سے مکہ میں داخل ہوا تو پورے مکہ میں ہلچل مچ گئی اور تمام قریش مدافعت کے لئے تیار ہو گئے۔ جو لوگ اس جنگ کے لئے نکل سکتے تھے خود نکلے اور جو کسی وجہ سے معذور تھے اُنھوں نے کسی کو اپنا قائم مقام بنا کر جنگ کے لئے تیار کیا۔ اور صرف تین روز میں یہ لشکر پورے ساز و سامان کے ساتھ تیار ہو گیا۔

ان میں جو لوگ اس جنگ میں شرکت سے ہچکچاتے اُس کو یہ لوگ مشتبہ نظروں سے دیکھتے اور مسلمانوں کا ہمنیال سمجھتے اس لئے ایسے لوگوں کو خصوصیت سے جنگ کے واسطے نکلنے پر مجبور کیا۔ جو لوگ علانیہ طور پر مسلمان تھے اور ابھی تک بوجہ اپنے اعذار کے ہجرت نہیں کر سکے تھے بلکہ مکہ میں بس رہے تھے اُن کو اور بنو ہاشم کے خاندان میں جس پر بھی یہ گمان تھا کہ یہ مسلمانوں سے ہمدردی رکھتا ہے اُن کو بھی اس جنگ کے لئے نکلنے پر مجبور کیا۔ انھیں مجبور لوگوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ اور ابوطالب کے دو بیٹے طالب اور عقیل بھی تھے۔

اس طرح اس لشکر میں ایک ہزار جوان دو سو گھوڑے اور چھ سو ذریں اور ترانے گانے والی لونڈیاں اور اُن کے طفلے وغیرہ لے کر بدر کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ ہر منزل پر دس اونٹ ان لوگوں کے کھانے کے لئے ذبح ہوتے تھے۔

دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک تجارتی قافلہ کے انداز سے مقابلہ کی تیاری کر کے بارہ رمضان کو شعبہ کے دن مدینہ طیبہ سے نکلے اور کئی منزل طے کرنے کے بعد بدر کے قریب پہنچ کر آپ نے دو شخصوں کو آگے بھیجا کہ وہ ابوسفیان کے قافلہ کی خبر لائیں۔ (منظہری)

خبروں نے یہ خبر پہنچائی کہ ابوسفیان کا قافلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعاقب کی خبر پر کراہل دریا کے کنارے کنارے گزر گیا اور اُس کی حفاظت اور مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے مکہ مکرمہ سے ایک ہزار جوانوں کا لشکر جنگ کے لئے آرہا ہے۔ (ابن کثیر)

ظاہر ہے کہ اس خبر نے حالات کا نقشہ پلٹ دیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفیق صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا کہ اس آنے والے لشکر سے جنگ کرنا ہے یا نہیں۔ حضرت ابویوب انصاری اور بعض دوسرے حضرات نے عرض کیا کہ ہم میں ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں اور نہ ہم اس قصد سے آئے ہیں۔ اس پر حضرت صدیق اکبرؓ کھڑے ہوئے اور تعمیل حکم کے لئے اپنے آپ کو

پیش کیا پھر فاروق اعظمؓ کھڑے ہوئے اور اسی طرح تعمیل حکم اور جہاد کے لئے تیار ہونے کا اظہار کیا پھر حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ

یا رسول اللہ جو کچھ آپ کو اللہ تعالیٰ کا حکم ملا ہے آپ اُس کو جاری کریں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ بخدا ہم آپ کو وہ جواب نہ دیں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا۔ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هُنَا قَاعِدُونَ۔ یعنی جائیے آپ اور آپ کا رب لڑ بھڑ لیں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو دین حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہمیں ملک حبشہ کے مقام برگ النعماد تک بھی لے جائیں گے تو ہم آپ کے ساتھ جنگ کے لئے چلیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے اور اُن کو دعائیں دیں۔ مگر ابھی تک حضرات انصار کی طرف سے موافقت میں کوئی آواز نہ اُٹھی تھی اور یہ احتمال تھا کہ حضرات انصار نے جو معاہدہ نصرت و امداد کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا تھا وہ اندرونِ مدینہ کا تھا۔ مدینہ سے باہر امداد کرنے کے وہ پابند نہیں اس لئے آپ نے پھر مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ لوگو مجھے مشورہ دو کہ اس جہاد پر اقدام کریں یا نہیں۔ اس خطاب کا روئے سخن انصار کی طرف تھا۔ حضرت سعد بن معاذ انصاریؓ سمجھ گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ ہم سے پوچھنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں۔ سعد بن معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ پر ایمان لائے اور اس کی شہادت دی کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں سب حق ہے اور ہم نے آپ سے عہد و پیمان کئے ہیں کہ ہر حال میں آپ کی اطاعت کریں گے۔ اس لئے آپ کو جو کچھ اللہ تعالیٰ کا حکم ملا ہو اُس کو جاری فرمائیے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو دین حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہم کو سمندر میں لے جائیں تو ہم آپ کے ساتھ دریا میں گھس جائیں گے ہم میں سے ایک آدمی بھی آپ سے پیچھے نہ رہے گا۔ ہمیں اس میں کوئی گرائی نہیں کہ آپ کل ہی ہمیں دشمن سے بھڑادیں۔ ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے کام سے ایسے حالات کا مشاہدہ کرائے گا جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ ہمیں اللہ کے نام پر جہاں چاہیں لے چلتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر بہت مسرور ہوئے۔ اور قافلہ کو حکم دے دیا کہ اللہ کے نام پر چلو۔ اور یہ خوش خبری سنائی کہ مجھ سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں سے ایک جماعت پر ہمارا غلبہ ہوگا۔ دونوں جماعتوں سے مراد۔ ایک ابوسفیان کا تجارتی قافلہ اور دوسرا یہ مکہ سے آنے والا لشکر ہے۔ پھر فرمایا کہ خدا کی قسم میں گویا اپنی آنکھوں سے مشرکین کی قتل گاہ کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ پورا واقعہ تفسیر ابن کثیر اور مظہری سے لیا گیا ہے۔

واقعہ کی تفصیل سننے کے بعد ان آیات مذکورہ صدر کو دیکھتے پہلی آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا
وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكُفْرًا ۖ وَهُوَ يَصِفُ ۚ
رہی تھی۔ اس سے اشارہ اس حال کی طرف ہے جو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کے وقت بعض صحابہ کرام
کی طرف سے ظاہر ہوا کہ انہوں نے جہاد سے پست ہمتی کا اظہار کیا۔

اور اسی واقعہ کا بیان دوسری آیت میں ہے يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا
يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۚ۔ یعنی یہ لوگ آپ سے حق کے معاملہ میں مجادلہ اور اختلاف
کرتے ہیں گویا ان کو موت کی طرف کھینچا جا رہا ہے جس کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

صحابہ کرام نے اگرچہ کوئی عدول حکمی نہ کی تھی بلکہ مشورہ کے جواب میں اپنے ضعف اور پست ہمتی
کا اظہار کیا تھا۔ مگر رسول کے ساتھیوں سے ایسی رائے کا اظہار بھی ان کے مقام بلند کے اعتبار سے اللہ
تعالیٰ کے نزدیک ناپسند تھا اس لئے ناراضی کے الفاظ سے اُس کو بیان فرمایا گیا۔

وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ

اور جس وقت تم سے وعدہ کرتا تھا اللہ دو جماعتوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے گی اور تم چاہتے تھے کہ

غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَن يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ

جس میں کاٹنا نہ لگے وہ تم کو ملے اور اللہ چاہتا تھا کہ سچا کر دے سچ کو اپنے کلاموں سے

وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ۚ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ

اور کاٹ ڈالے حبس کافروں کی تاکہ سچا کر دے سچ کو اور مٹھوٹا کر دے جھوٹ کو اور

لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ۚ إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي

اگرچہ ناراض ہوں گنہگار۔ جب تم لگے مسرہاد کرنے اپنے رب سے تو وہ پہنچا تمہاری فریاد کو کہ میں

مُيَسِّرٌ لَّكُمْ بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ۚ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا

مدد کو بھیجوں گا تمہاری ہزار فرشتے لگاتار آنے والے۔ اور یہ تو دی اللہ نے فقط

بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ

خوش خبری اور تاکہ مطمئن ہو جائیں اس سے تمہارے دل، اور مدد نہیں مگر اللہ کی طرف سے،

إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۚ

بیشک اللہ زور آور ہے حکمت والا۔

خلاصہ تفسیر

اور تم لوگ اُس وقت کو یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ تم سے اُن دو جماعتوں (یعنی تجارتی قافلہ یا لشکر) میں سے ایک (جماعت) کا وعدہ کر رہے تھے کہ وہ (جماعت) تمہارے ہاتھ آجائے گی (یعنی مغلوب ہو جوائے گی)۔ یہ وعدہ مسلمانوں سے بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ وحی ہوا تھا، اور تم اس تمنا میں تھے کہ غیر مسلح جماعت (یعنی تجارتی قافلہ) تمہارے ہاتھ آجائے اور اللہ کو یہ منظور تھا کہ اپنے احکام سے حق کا حق ہونا (اُس کو عملاً غلبہ دے کر) ثابت کر دے اور (یہ منظور تھا کہ) ان کافروں کی بنیاد کو قطع کر دے تاکہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا (عملاً) ثابت کر دے اگرچہ یہ مجرم لوگ (یعنی مغلوب ہونے والے کفار اس کو کتنا ہی) ناپسند کریں۔ اُس وقت کو یاد کرو جب کہ تم اپنے رب سے (اپنی تعداد اور سامان جنگ کی قلت اور دشمن کی کثرت دیکھ کر) فریاد کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری فریاد سن لی (اور وعدہ فرمایا) کہ تم کو ایک ہزار فرشتوں سے مدد دوں گا جو سلسلہ وار چلے آویں گے اور اللہ تعالیٰ نے امداد صرف اس (حکمت) کے لئے کی کہ (تم کو غلبہ پانے کی) بشارت ہو اور تاکہ تمہارے دلوں کو قرار آجائے (یعنی انسان کی تسلی طبعی طور پر اسباب، سامان سے ہوتی ہے اس لئے وہ بھی جمع کر دیا گیا) اور (واقعہ میں تو نصرت (اور غلبہ) صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے جو زبردست حکمت والے ہیں۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں غزوہ بدر کا واقعہ اور اُس میں جو حق تعالیٰ کی طرف سے نصرت و امداد کے مخصوص انعامات مسلمانوں پر مبذول ہوئے ان کا بیان ہے۔

پہلی اور دوسری آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو یہ اطلاع ملی کہ قریشیوں کا ایک عظیم لشکر اپنے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے مکہ سے نکل چکا ہے تو اب مسلمانوں کے سامنے دو جماعتیں تھیں ایک تجارتی قافلہ جس کو روایات میں عیتر سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسری یہ مسلح فوج جو مکہ سے چلی تھی جس کو نفیر کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس آیت میں یہ بتلایا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور بواسطہ آپ کے سب مسلمانوں سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت پر تمہارا مکمل قبضہ ہو جائے گا، کہ اُس کے متعلق جو تم چاہو گے کر سکو گے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ تجارتی قافلہ پر قبضہ آسان اور بے خطر تھا اور مسلح فوج پر مشکل اور خطرات سے پُر۔ اس لئے اس مبہم وعدہ کو سن کر بہت سے صحابہ کرام کی تمنا اور خواہش یہ ہوئی کہ وہ جماعت جس پر

مسلمانوں کا قبضہ ہونے کا وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے وہ غیر مسلح تجارتی قافلہ ہو جائے۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے اکابر صحابہ کا باشارات ربانی یہ ارادہ ہوا کہ مسلح فوج پر قبضہ ہو تو بہتر ہوگا۔

اس آیت میں غیر مسلح جماعت پر قبضہ چاہنے والے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہیں تو اپنی سہولت پسندی اور خطرات سے یکسوئی کے پیش نظر یہی پسند تھا کہ غیر مسلح تجارتی قافلہ پر تمہارا قبضہ ہو جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ اسلام کا اصل مقصد حاصل ہو یعنی حق کا حق ہونا واضح ہو جائے اور کافروں کی جڑ کٹ جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کام اُسی وقت ہو سکتا تھا جب کہ مسلح فوج سے مقابلہ اور اُس پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ اور غلبہ ہو۔

خلاصہ اس کامسلمانوں کو اس پر تنبیہ ہے کہ تم نے جو صورت پسند کی وہ نہایت پست ہمتی اور آرام طلبی اور وقتی اور ہنگامی فائدہ کی چیز تھی اور اللہ تعالیٰ نے جو ارادہ فرمایا وہ عالی ہمتی اور بلند مقاصد اور مکمل اور دائمی فوائد پر مشتمل تھا۔ پھر دوسری آیت میں اس کو مزید واضح فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت سے تو کوئی چیز باہر نہ تھی اگر وہ چاہتے تو تجارتی قافلہ پر مسلمانوں کا غلبہ اور قبضہ ہو جاتا مگر اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی شان کے ستایان اس کو سمجھا کہ مسلح فوج سے مقابلہ ہو کر اس پر قبضہ ہوتا کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا واضح ہو جائے۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ حق تعالیٰ تو علیم خبیر اور ہر کام کے آغاز و انجام سے باخبر ہیں اُن کی طرف سے اس مبہم وعدہ میں کیا مصلحت تھی کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت پر مسلمانوں کا غلبہ اور قبضہ ہوگا۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو متعین کر کے بھی فرما سکتے تھے کہ فلاں جماعت پر قبضہ ہو جائے گا۔

اس ابہام کی وجہ واللہ اعلم یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں صحابہ کرام کا امتحان کرنا تھا کہ آسان کام کو پسند کرتے ہیں یا مشکل کو۔ اور اُن کی اخلاقی تربیت بھی تھی جس کے ذریعہ اُن کو عالی ہمتی اور اعلیٰ مقاصد کی جدوجہد اور خطرات سے نہ گھبراتا سکھایا گیا۔

تیسری اور چوتھی آیتوں میں اُس واقعہ کا بیان ہے جو مسلح فوج سے مقابلہ ٹھن جانے کے بعد پیش آیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ آپ کے رفقاء صرف تین سو تیرہ اور وہ بھی اکثر غیر مسلح ہیں اور مقابلہ پر تقریباً ایک ہزار جوانوں کا مسلح لشکر ہے تو اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں نصرت و امداد کی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ آپ دُعا مانگتے تھے اور صحابہ کرام آپ کے ساتھ آمین کہتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے یہ کلمات نقل فرمائے ہیں
یا اللہ مجھ سے جو وعدہ آپ نے فرمایا ہے اُس کو جلد پورا فرما دے۔ یا اللہ اگر یہ

تھوڑی سی جماعت مسلمین فنا ہو گئی تو پھر زمین میں کوئی تیری عبادت کرنے والا باقی نہ رہے گا (کیونکہ ساری زمین کفر و شرک سے بھری ہوئی ہے یہی چند مسلمان ہیں جو صحیح عبادت بجالاتے ہیں)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برابر اسی طرح الحاج و زاری کے ساتھ دعا میں مشغول رہے یہاں تک کہ آپ کے شانوں سے چادر بھی سرک گئی، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر چادر اوڑھائی اور عرض کیا یا رسول اللہ آپ زیادہ فکر نہ کریں اللہ تعالیٰ آپ کی دعا ضرور قبول فرمائیں گے اور اپنا وعدہ پورا فرمائیں گے۔

آیت میں اِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ کے الفاظ سے یہی واقعہ مراد ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جب تم اپنے رب سے استغاثہ کر رہے تھے اور مدد طلب کر رہے تھے یہ استغاثہ اگرچہ دراصل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوا تھا مگر تمام صحابہ آئین کہہ رہے تھے اس لئے پوری جماعت کی طرف منسوب کیا گیا۔

اس کے بعد اس دعا کی قبولیت کا بیان اس طرح فرمایا فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَتَىٰ مِهْدُكُمْ بِاَلْفِ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرَدِّفَيْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری فریاد سن لی اور فرمایا کہ ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری امداد کروں گا جو یکے بعد دیگرے قطار کی صورت میں آنے والے ہوں گے۔

فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے جو بے نظیر قوت و طاقت عطا فرمائی ہے اُس کا اندازہ اُس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو قوم لوط علیہ السلام کی زمین کا تختہ الٹنے کے وقت پیش آیا کہ جبریل امین نے ایک پر کے ذریعہ یہ تختہ الٹ دیا۔ ایسی بے مثال طاقت والے فرشتوں کی اتنی بڑی تعداد مقابلہ میں بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی ایک بھی کافی تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی فطرت سے واقف ہیں کہ وہ تعداد سے بھی متاثر ہوتے ہیں اس لئے مقابل فریق کی تعداد کے مطابق فرشتوں کی تعداد بھیجنے کا وعدہ فرمایا تاکہ اُن کے قلوب پوری طرح مطمئن ہو جائیں۔

چوتھی آیت میں بھی یہی مضمون ارشاد فرمایا وَمَا جَعَلَ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی وَلِتَطْمَئِنَّ بِہٖ قُلُوْبُکُمْ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ صرف اس لئے کیا کہ تمہیں بشارت ہو اور تاکہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں۔

غزوہ بدر میں جو اللہ تعالیٰ کے فرشتے امداد کے لئے بھیجے گئے ان کی تعداد اس جگہ ایک ہزار مذکور ہے اور سورۃ آل عمران میں تین ہزار اور پانچ ہزار ذکر کی گئی ہے۔ اس کا سبب دراصل تین مختلف وعدے ہیں جو مختلف حالات میں کئے گئے ہیں۔ پہلا وعدہ ایک ہزار فرشتوں کا ہوا جس کا سبب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور عام مسلمانوں کی فریاد تھی۔ دوسرا وعدہ جو تین ہزار فرشتوں کا سورۃ آل عمران میں پہلے مذکور ہے وہ اُس وقت کیا گیا جب مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ قریشی لشکر کے لئے اور مکہ آرہی ہے۔ رُوح المعانی میں ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر وغیرہ سے ہر روایت شعبی منقول ہے کہ

مسلمانوں کو بدر کے دن یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر بخاری مشرکین کی اداؤں کے لئے کمک لے کر آیا ہے۔ اس خبر سے مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ اس پر آل عمران کی آیت اَللّٰہُ یُکَفِّیْکُمْ اَنْ یُّعِذَکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلَاثَةِ اَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُنْزَلٰتٍ۔ نازل ہوئی جس میں تین ہزار فرشتے اداؤں کے لئے آسمان سے نازل کرنے کا وعدہ ذکر کیا گیا۔

اور تیسرا وعدہ پانچ ہزار کا اس شرط کی ساتھ مشروط تھا کہ اگر فریق مخالف نے یکبارگی حملہ کر دیا تو پانچ ہزار فرشتوں کی مدد بھیج دی جائے گی وہ آل عمران کی آیت مذکورہ کے بعد کی آیت میں اس طرح مذکور ہے بَلٰی اِنْ تَصِیْرُوْا وَتَتَّقُوْا وَاٰتٰوْکُمْ مِّنْ قَوْرِہِمْ ہٰذَا یُعِیْذُکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَةِ اَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُسَوِّمٰتٍ۔ یعنی اگر تم ثابت قدم رہے اور تقویٰ پر قائم رہے اور مقابلہ شکر یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑا تو تمہارا رب تمہاری امداد پانچ ہزار فرشتوں سے کرے گا جو خاص نشان یعنی خاص وردی میں ہوں گے۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس وعدہ میں تین شرطیں تھیں ایک ثابت قدمی دوسرے تقویٰ تیسرے مخالف فریق کا یکبارگی حملہ۔ پہلی دو شرطیں تو صحابہ کرام میں موجود تھیں اور اس میدان میں اول سے آخر تک ان میں کہیں فرق نہیں آیا مگر تیسری شرط یکبارگی ہلہ کی واقع نہیں ہوئی اس لئے پانچ ہزار ملائکہ کے شکر کی نوبت نہیں آئی۔

اس لئے معاملہ ایک ہزار اور تین ہزار میں دائر رہا۔ جس میں یہ بھی احتمال ہے کہ تین ہزار سے مراد یہ ہو کہ ایک ہزار جو پہلے بھیجے گئے ان کے ساتھ مزید دو ہزار شامل کر کے تین ہزار کر دیئے گئے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ تین ہزار اُس پہلے ہزار کے علاوہ ہوں۔

یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ ان تین آیتوں میں ملائکہ کی تین جماعتوں کے بھیجنے کا وعدہ ہے اور ہر جماعت کے ساتھ ایک خاص صفت کا ذکر ہے۔ سورۃ انفال کی آیت جس میں ایک ہزار کا وعدہ ہے اُس میں تو ان ملائکہ کی صفت میں مُرَدِّفٰتٌ فرمایا ہے جس کے معنی ہیں پیچھے لگانے والے اس میں شاید اس طرف پہلے ہی اشارہ کر دیا گیا کہ ان فرشتوں کے پیچھے دوسرے بھی آنے والے ہیں۔ اور سورۃ آل عمران کی پہلی آیت میں ملائکہ کی صفت مُنْزَلٰتٍ ارشاد فرمائی۔ یعنی یہ فرشتے آسمان سے اتارے جائیں گے اس میں اشارہ خاص اہمیت کی طرف ہے کہ زمین میں جو فرشتے پہلے سے موجود ہیں ان سے کام لینے کے بجائے خاص اہتمام کے ساتھ یہ فرشتے آسمان سے اسی کام کے لئے بھیجے جائیں گے اور آل عمران کی دوسری آیت جس میں پانچ ہزار کا ذکر ہے اُس میں ملائکہ کی صفت مُسَوِّمٰتٍ ارشاد فرمائی ہے کہ وہ ایک خاص لباس اور علامت کے ساتھ ہوں گے۔ جیسا کہ روایات حدیث میں ہے کہ بدر میں نازل ہونے والے فرشتوں کے عمامے سفید اور غزوہ حنین میں مدو کے لئے آنے والے فرشتوں کے عمامے سرخ تھے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَمَا التَّصَدُّ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ
اس میں مسلمانوں کو تنبیہ فرمادی کہ جو مدد بھی کہیں سے ملتی ہے خواہ ظاہری صورت سے ہو یا مخفی انداز سے
سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اُسی کے قبضہ میں ہے فرشتوں کی مدد بھی اسی کے تابع فرمان ہے
اس لئے تمہاری نظر صرف اُسی ذات وحدہ لا شریک لہ کی طرف رہنی چاہئے کیونکہ وہ بڑا قدرت والا
حکمت والا ہے۔

إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسُ أَمْنَةً مِّنْهُ وَيُنْزِلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ

جس وقت کہ ڈال دی اس نے تم پر اُونگھ اپنی طرف سے تسکین کے واسطے اور اتارا تم پر آسمان سے

مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُم رَجَزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ

پانی کہ اُس سے تم کو پاک کر دے اور دور کر دے تم سے شیطان کی نجاست اور مضبوط کر دے

عَلَى قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ۖ إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ

تمہارے دلوں کو اور جمادے اُس سے تمہارے قدم۔ جب حکم بھیجا تیرے رب نے فرشتوں کو

أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبَّثُوا الَّذِينَ آمَنُوا سَأَلِقَىٰ فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا

کہ میں ساتھ ہوں تمہارے سو تم دل ثابت رکھو مسلمانوں کے، میں ڈال دوں گا دل میں کافروں کے

الرُّعْبَ قَاضِرِبُورًا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاصْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۚ ذَٰلِكَ

دہشت سوارو گردنوں پر اور کاٹو ان کی پور پور۔ یہ

بِأَنَّهُمْ شَاقِقُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ

اس واسطے ہے کہ وہ مخالفت ہوئے اللہ کے اور اُس کے رسول کے، اور جو کوئی مخالفت ہوا اللہ کا اور اس کے رسول کا

فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۖ ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ

تو بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے۔ یہ تو تم چکھ لو اور جان رکھو کہ

لِلْكَافِرِينَ عَذَابُ النَّارِ ۖ

کافروں کے لئے ہے عذاب دوزخ کا۔

خلاصہ تفسیر

اُس وقت کو یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ تم پر اُونگ طاری کر رہا تھا اپنی طرف سے جین دینے کے لئے
اور تم پر آسمان سے پانی برسا رہا تھا تاکہ اس پانی کے ذریعہ تم کو (بے وضو یا بے غسل ہونے کی حالت سے)

پاک کر دے اور (تاکہ اُس کے ذریعہ) تم سے شیطانی وسوسہ کو دفع کر دے اور (تاکہ) تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور (تاکہ) تمہارے پاؤں جمادے (یعنی تم ریگ میں نہ دھسے)۔ اُس وقت کو یاد کرو جب کہ آپ کا رب (اُن) فرشتوں کو (جو امداد کے لئے نازل ہوئے تھے) حکم دیتا تھا کہ میں تمہارا ساتھ ہی ہوں تو تم ایمان والوں کی ہمت بڑھاؤ میں ابھی کفار کے قلوب میں رعب ڈالے دیتا ہوں سو تم کفار کی گردنوں پر (حرم) مارو اور اُن کے پورے پورے کو مارو۔ یہ اس بات کی مزا ہے کہ انھوں نے اللہ کی اور اُس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ (اُس کو) سخت مزا دیتے ہیں (خواہ دنیا میں کسی حکمت سے یا آخرت میں یا دونوں میں) سو (بالفعل) یہ مزا چکھو اور جان رکھو کہ کافروں کے لئے جہنم کا عذاب مقرر ہی ہے۔

معارف و مسائل

شروع سورۃ انفال سے اللہ تعالیٰ کے اُن انعامات کا بیان ہو رہا ہے جو اُس کے فرمانبردار بندوں پر مبذول ہوئے۔ غزوہ بدر کے واقعات بھی اُسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ غزوہ بدر میں جو انعامات حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئے اُن میں سے پہلا انعام تو خود اس جہاد کے لئے مسلمانوں کو نکالنا ہے جس کا بیان آیت کَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ هَا هِيَ، دوسرا انعام فرشتوں کی مدد کا وعدہ ہے جس کا ذکر آیت اِذْ يَعِدُّكُمْ اللّٰهُ فِيْهَا ہے، تیسرا انعام دُعا کی قبولیت اور مدد کا وعدہ پورا کرنا ہے جس کا ذکر آیت اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فِيْهَا ہے۔ مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں چوتھے انعام کا تذکرہ ہے جس میں مسلمانوں کے لئے دو نعمتوں کا ذکر ہے ایک سب پر نیند غالب آکر پریشانی اور تکان کا دور ہو جانا دوسرے بارش کے ذریعہ ان کے لئے پانی مہیا فرمانا اور میدان جنگ کو ان کے لئے ہموار اور دشمن کے لئے دلدل بنادینا۔

تفصیل اس واقعہ کی یہ ہے کہ جس وقت کفر و اسلام کا یہ پہلا معرکہ ٹھن گیا تو کفار مکہ کا لشکر پہلے پہنچ کر ایک ایسے مقام پر پڑاؤ ڈال چکا تھا جو اونچائی پر تھا۔ پانی اُس کے قریب تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اس جگہ پہنچے تو وادی کے نچلے حصہ میں جگہ ملی۔ قرآن کریم نے اس میدان جنگ کا نقشہ اسی سورت کی بیالیسویں آیت میں اس طرح کھینچا ہے اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدُوِّ الدِّیْنِیِّ وَهُمْ بِالْعُدُوِّ الْقُصُوِّیِّ جس کا مفصل بیان بعد میں آئے گا۔

جس جگہ پہنچ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اول قیام فرمایا۔ اُس مقام کے واقف کار حضرت حباب بن منذرؓ نے اس کو جنگی اعتبار سے نامناسب سمجھ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ جو مقام آپ نے اختیار فرمایا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے جس میں ہمیں کوئی اختیار نہیں یا محض رائے اور مصلحت کے پیش نظر اختیار

فرمایا گیا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں یہ کوئی حکم خداوندی نہیں، اس میں تغیر تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ تب حضرت جناب بن منذرؓ نے عرض کیا کہ پھر تو بہتر ہے کہ اس مقام سے آگے بڑھ کر مکی سرداروں کے لشکر کے قریب ایک پانی کا مقام ہے اُس پر قبضہ کیا جائے وہاں ہمیں پانی اقراط کے ساتھ مل جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مشورہ قبول فرمایا اور وہاں جا کر پانی پر قبضہ کیا ایک حوض پانی کے لئے بنا کر اُس میں پانی کا ذخیرہ جمع فرمایا۔

اس سے مطمئن ہونے کے بعد حضرت سعد بن معاذؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارا خیال یہ ہے کہ ہم آپ کے لئے ایک سایہ بان کسی محفوظ جگہ میں بنا دیں جہاں آپ مقیم رہیں اور آپ کی سواریاں بھی آپ کے پاس رہیں۔

منشأً اس کا یہ ہے کہ ہم دشمن کے مقابلہ میں جہاد کریں گے اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح نصیب فرمائی تو یہی مقصد ہے اور اگر خدا نخواستہ کوئی دوسری صورت ہو تو آپ اپنی سواری پر سوار ہو کر اُن صحابہ کرام کے ساتھ جا ملیں جو مدینہ طیبہ میں رہ گئے ہیں کیونکہ میرا گمان یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جانثاری اور آپ سے محبت میں ہم سے کم نہیں اور اگر اُن کو آپ کے نکلنے کے وقت یہ خیال ہوتا کہ آپ کا اس مسلح لشکر سے مقابلہ ہو گا تو اُن میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہتا، آپ مدینہ میں پہنچ جائیں گے تو وہ آپ کے رفیق کار رہیں گے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی اس جانبازانہ پیش کش پر دعائیں دیں۔ اور ایک مختصر سا سایہ بان آپ کے لئے بنا دیا گیا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ کے سوا کوئی نہ تھا۔ حضرت معاذؓ دروازہ پر حفاظت کے لئے تلوار لئے کھڑے تھے۔

معرکہ کی پہلی رات تھی۔ تین سو تیرہ بے سامان لوگوں کا مقابلہ اپنے سے تین گنی تعداد یعنی ایک ہزار مسلح فوج سے تھا۔ میدان جنگ کا بھی اچھا مقام اُن کے قبضہ میں آچکا تھا۔ نچلا حصہ وہ بھی سخت ریتیلا جس میں چلنا دشوار مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا۔ طبعی پریشانی اور فکر سب کو تھی بعض لوگوں کے دل میں شیطان نے یہ وساوس بھی ڈالنے شروع کئے کہ تم لوگ اپنے آپ کو حق پر کہتے ہو اور اس وقت بھی بجائے آرام کرنے کے نماز تہجد وغیرہ میں مشغول ہو مگر حال یہ ہے کہ دشمن ہر حیثیت سے تم پر غالب اور تم سے بڑھا ہوا ہے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ایک خاص قسم کی تیند مساط فرمادی جس نے ہر مسلمان کو خواہ اُس کا ارادہ سونے کا تھا یا نہیں جبراً اُٹا دیا۔ حافظ حدیث ابو یعلیٰ نے نقل کیا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا کہ غزوہ بدر کی اس رات میں ہم میں سے کوئی باقی نہیں رہا جو سونہ گیا ہو۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام رات بیدار رہ کر صبح تک نماز تہجد میں مشغول رہے۔

اور ابن کثیرؒ نے بحوالہ صحیح نعتل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس رات میں جب کہ

اپنے عیش یعنی سائبان میں نماز تہجد میں مشغول تھے آپ کو بھی کسی قدر اونگھ آگئی مگر فوراً ہی ہنستے ہوئے بیدار ہو کر فرمایا۔ اے ابوبکر خوشخبری سنو یہ جبریل علیہ السلام ٹیلہ کے قریب کھڑے ہیں اور یہ کہہ کر آپ سائبان سے باہر یہ آیت پڑھتے ہوئے تشریف لے گئے سَيِّئُهُمْ اَجْمَعُ وَيُولُوكُنَ الدُّبُوۡرُ یعنی عنقریب دشمن کی جماعت ہار جائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گی۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے باہر نکل کر مختلف جگہوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ ابوجہل کی قتل گاہ ہے یہ فلاں کی یہ فلاں کی۔ اور پھر ٹھیک اسی طرح واقعات پیش آئے۔ (تفسیر مظہری)

اور جیسا غزوہ بدر میں تکان اور پریشانی دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کرام پر خاص قسم کی نیند مسلط فرمائی اسی طرح غزوہ اُحد میں بھی اسی طرح کا واقعہ ہوا۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود نقل کیا ہے کہ جنگ کی حالت میں نیند اللہ تعالیٰ کی طرف سے امن و اطمینان کی نشانی ہوتی ہے۔ اور نماز میں نیند شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔ (ابن کثیر)

دوسری نعمت مسلمانوں کو اس رات میں یہ ملی کہ بارش ہو گئی جس نے میدان جنگ کا نقشہ بالکل پلٹ دیا، قریشی لشکر نے جس جگہ پر قبضہ کیا تھا وہاں تو بارش بہت تیز آئی اور میدان میں لڑل ہو کر چلنا مشکل ہو گیا۔ اور جس جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام مقیم تھے یہاں ریت کی وجہ سے چلنا مشکل تھا یہاں بارش ہلکی ہوئی جس نے تمام ریت کو جما کر میدان کو نہایت ہموار خوشگوار بنا دیا۔

آیت مذکورہ میں انہیں دو نعمتوں کا ذکر ہے نیند اور بارش جس نے میدان کارزار کا نقشہ پلٹ کر وہ شیطانی وساوس دھو ڈالے جو بعض کمزور لوگوں کو ستا رہے تھے کہ ہم حق پر ہونے کے باوجود مقہور و مغلوب نظر آتے ہیں اور دشمن باطل پر ہونے کے باوجود قوت و شوکت اور اطمینان کی حالت میں ہے۔

آیت مذکورہ میں فرمایا کہ اُس وقت کو یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا چلین دینے کے لئے اور تم پر پانی برسا رہا تھا تاکہ اُس پانی سے تم کو پاک کر دے۔ اور تم سے شیطانی وسوسہ کو دفع کر دے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تمہارے پاؤں جما دے۔

دوسری آیت میں پانچویں انعام کا ذکر ہے جو اس غزوہ بدر کے میدان کارزار میں مسلمانوں پر مبذول ہوا۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرشتے مسلمانوں کی امداد کے لئے بھیجے تھے اُن کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم ایمان والوں کی ہمت بڑھاؤ میں ابھی کفار کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں، سو تم کفار کی گردنوں پر حربہ مارو اور اُن کے پور پور کو مارو۔

اس میں فرشتوں کو دو کام سپرد کئے گئے ایک یہ کہ مسلمانوں کی ہمت بڑھائیں یہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتے میدان میں آکر ان کی جماعت کو بڑھائیں اور ان کے ساتھ مل کر قتال میں حصہ لیں اور اس طرح بھی کہ اپنے تصرف سے مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کر دیں اور ان میں قوت پیدا کر دیں۔ دوسرا کام یہ بھی ان کے سپرد ہوا کہ فرشتے خود بھی قتال میں حصہ لیں اور کفار پر حملہ آور ہوں۔ اس آیت سے ظاہر یہی ہے کہ فرشتوں نے دونوں کام انجام دیئے، مسلمانوں کے دلوں میں تصرف کر کے ہمت و قوت بھی بڑھائی اور قتال میں بھی حصہ لیا۔ اور اس کی تائید چند روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے جو تفسیر درمنثور اور مظہری میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور قتال ملائکہ کی عینی شہادتیں صحابہ کرام سے نقل کی ہیں۔

تیسری آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ اس معرکہ کفر و اسلام میں جو کچھ ہوا اُس کا سبب یہ تھا کہ ان کفار نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی اور جو اللہ و رسول کی مخالفت کرتا ہے اُس کے لئے اللہ تعالیٰ کا عذاب شدید اور سخت ہوا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غزوہ بدر میں ایک طرف تو مسلمانوں پر انعامات نازل ہوئے۔ فتح و نصرت اُن کو حاصل ہوئی۔ دوسری طرف کفار پر مسلمانوں کے ہاتھوں سے عذاب نازل فرما کر اُن کی بدکرداریوں کی تھوڑی سی سزا دے دی گئی۔ اور اس سے زیادہ بھاری سزا آخرت میں ہونے والی ہے جس کو چوتھی آیت میں بیان فرمایا ذِکْرُ قَدْ ذُکِّرُوا وَ اَنْتُمْ لَکَیْفَیْنِ عَذَابِ النَّارِ۔

یعنی یہ ہمارا تھوڑا سا عذاب ہے اس کو چکھو اور سمجھ لو کہ اس کے بعد کافروں کے لئے جہنم کا عذاب آنے والا ہے جو نہایت شدید و مدید اور ناقابل قیاس ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحَفًا فَلَا تُولُوهُمْ

اے ایمان والو جب بھڑو تم کافروں سے میدان جنگ میں تو مت پھرو اُن سے

الْأَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُولِهِمْ يُؤْمِدْ يَوْمَ ذِکْرٍ إِلَّا مَتَحَرِّفًا لِّلْقِتَالِ أَوْ

پیٹھ۔ اور جو کوئی ان سے پھیرے پیٹھ اُس دن مگر یہ کہ ہنر کرتا ہو لڑائی کا یا

مُتَحَرِّفًا إِلَى فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَا لَهُ جَهَنَّمَ

جا ملتا ہو فوج میں سو وہ پھرا اللہ کا غضب لے کر اور اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے،

وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَکِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا

اور وہ کیا بُرا ٹھکانا ہے۔ سو تم نے ان کو نہیں مارا لیکن اللہ نے ان کو مارا، اور تو نے

رَمِيتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ

نہیں پھینکی مٹھی خاک کی جس وقت کہ پھینکی تھی لیکن اللہ نے پھینکی، اور تاکہ کرے ایمان والوں پر

مِنْهُ بَلَاءٌ حَسَنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۷﴾ ذَلِكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ

اپنی طرف سے خوب احسان، بیشک اللہ ہے سننے والا جاننے والا۔ یہ تو ہو چکا اور جان رکھو کہ اللہ

مُوهِنٌ كَيْدَ الْكَافِرِينَ ﴿۱۸﴾ إِنْ تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمْ الْفَتْحُ

مست کر دے گا تدبیر کافروں کی۔ اگر تم چاہتے ہو فیصلہ تو پہنچ چکا تمہارے پاس فیصلہ،

وَإِنْ تَنْتَهُوا فهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَإِنْ تَعُودُوا نَعُدْ وَلَنْ تُغْنِيَ

اور اگر باز آؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے، اور اگر بھی کرو گے تو ہم بھی پھر یہی کریں گے، اور کچھ کام نہ آئے گا

عَنْكُمْ فَنُتِّكُمْ شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ ۚ وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۹﴾

تمہارے تمہارا جتنا اگرچہ بہت ہوں اور جان لو کہ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو جب تم کافروں سے (جہاد میں) دو بدو مقابل ہو جاؤ تو ان سے پشت مت پھیرنا (یعنی جہاد سے مت بھاگنا) اور جو شخص ان سے اس موقع پر (یعنی مقابلہ کے وقت) پشت پھیرے گا مگر ہاں جو لڑائی کے لئے پینتر بدلتا ہو یا جو اپنی جماعت کی طرف پناہ لینے آتا ہو وہ مستثنیٰ ہے باقی اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ کے غضب میں آجائے گا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے (فَلَكُمْ تَقْتُلُوهُمْ اَلَا بِهٖ) کے اندر بھی ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ آپ نے بدر کے روز ایک مٹھی کنکریوں کی اٹھا کر کافروں کی طرف پھینکی جس کے ریزے سب کی آنکھوں میں جا گرے اور ان کو شکست ہوئی اور فرشتوں کا امداد کے لئے آنا اوپر آچکا ہے اس پر بطور تفسیر فرماتے ہیں کہ جب ایسے عجیب واقعات ہوئے جو کہ بالکل تمہارے اختیار سے خارج ہیں (سو اس سے معلوم ہوا کہ تاثیر حقیقی کے مرتبہ میں) تم نے ان (کافروں) کو قتل نہیں کیا لیکن (ہاں اس مرتبہ میں) اللہ تعالیٰ نے (بیشک) انکو قتل کیا (یعنی مؤثر حقیقی اسکی قدرت ہی، اور اسبطر تاثیر حقیقی کے مرتبہ میں) اپنے خاک کی مٹھی (انکی طرف) نہیں پھینکی، لیکن (ہاں اس مرتبہ میں) اللہ تعالیٰ نے (واقعی) وہ پھینکی اور (باوجود اس کے کہ مؤثر حقیقی قدرت حق ہی پھر جو آثار قتل وغیرہ کو قدرتِ عظیم پر مرتب فرمادیا تو اس میں حکمت یہ کہ تاکہ مسلمانوں کو اپنی طرف (انکے عمل کا) خوب اجر دے (اور اجر کا ملنا حسبِ سنتِ الہیہ موقوف ہو اس پر کہ فعل انکے عزم و اختیار کا درجہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ان مؤمنین کے اقوال کے خوب سننے والے (اور انکے افعال احوال کے) خوب جاننے والے ہیں) ان اقوال استغاثہ اور افعال قتال احوال تشویش وغیرہ

میں جو ان کو محنت پیش آتی ہم کو اس کی اطلاع ہے ان کو اس پر جزا دیں گے) ایک بات تو یہ ہوتی اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کافروں کی تدبیر کا کمزور کرنا تھا (اور زیادہ کمزوری اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اپنے برابر والے کے بلکہ اپنے سے کمزور کے ہاتھ سے مغلوب ہو جائے اور یہ بھی موقوف ہے اس پر کہ وہ آثارِ مؤمنین کے ہاتھ سے ظاہر ہوں ورنہ کہہ سکتے تھے کہ تدبیر تو ہماری قوی تھیں لیکن اقویٰ کے سامنے کہ تدبیر الہی ہے نہ چل سکیں تو اس سے آئندہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کا حوصلہ پست نہ ہو کیونکہ ان کو تو ضعیف ہی سمجھتے) اگر تم لوگ فیصلہ چاہتے ہو تو وہ فیصلہ تو تمہارے پاس آ موجود ہوا (کہ جو حق پر تھا اس کو غلبہ ہو گیا) اور اگر (اب حق زیادہ واضح ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے) باز آ جاؤ تو یہ تمہارے لئے نہایت خوب ہے اور اگر (اب بھی باز نہ آئے بلکہ) تم پھر وہی کام کرو گے (یعنی مخالفت) تو ہم بھی پھر وہی کام کریں گے (یعنی تم کو مغلوب اور مسلمانوں کو غالب کر دینا) اور (اگر تم کو اپنی جمعیت کا گھمنڈ ہو کہ اب کی بار اس سے زیادہ جمع کر لیں گے تو یاد رکھو کہ) تمہاری جمعیت تمہارے ذرا بھی کام نہ آئے گی گو کتنی زیادہ ہو اور واقعی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (اصل میں) ایمان والوں کے ساتھ (یعنی ان کا مددگار رہے) گو کسی عارض کی وجہ سے کسی وقت ان کے غلبہ کا ظہور نہ ہو لیکن اصل محل غلبہ کے یہی ہیں اس لئے ان سے مقابلہ کرنا اپنا نقصان کرنا ہے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں سے پہلی دو آیتوں میں اسلام کا ایک جنگی قانون بتلایا گیا ہے پہلی آیت میں لفظ زحف سے مراد دونوں لشکروں کا مقابلہ اور اختلاط ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ایسی جنگ پھڑپھڑ جانے کے بعد پشت پھیرنا اور میدان سے بھاگنا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔ دوسری آیت میں اس حکم سے ایک استثناء کا ذکر اور ناجائز طور پر بھاگنے والوں کے عذاب شدید کا بیان ہے۔

استثناء دو حالتوں کا ہے لَا مُتَحَرِّرًا لِلْقِتَالِ أَوْ مُتَحَرِّزًا إِلَىٰ فِتْنَةٍ یعنی جنگ کے وقت پشت پھیرنا صرف دو حالتوں میں جائز ہے۔ ایک تو یہ کہ میدان سے پشت پھیرنا محض ایک جنگی چال کے طور پر دشمن کو دکھلانے کے لئے ہو حقیقتہً میدان سے ہٹنا مقصد نہ ہو بلکہ مخالف کو ایک غفلت میں ڈال کر یکبارگی حملہ پیش نظر ہو۔ یہ معنی ہیں لَا مُتَحَرِّرًا لِلْقِتَالِ کے کیونکہ تحریف کے معنی کسی ایک جانب مائل ہونے کے آتے ہیں۔ (روح المعانی)

دوسری استثنائی حالت جس میں میدان سے پشت پھیرنے کی اجازت ہے یہ ہے کہ اپنے موجودہ

لشکر کی کمزوری کا احساس کر کے اس لئے پیچھے ہٹیں کہ مجاہدین کی مزید کمک حاصل کر کے پھر حملہ آور ہوں۔ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰی فِئْتَةٍ کے یہی معنی ہیں کیونکہ تَحْيِيز کے لفظی معنی انضمام اور ملنے کے ہیں اور فِئْتہ کے معنی جماعت کے مطلب یہ ہے کہ اپنی جماعت سے مل کر قوت حاصل کرنے اور پھر حملہ کرنے کی نیت سے میدان چھوڑے تو یہ جائز ہے۔

یہ استثناء ذکر کرنے کے بعد اُن لوگوں کی سزا کا ذکر ہے جنہوں نے استثنائی حالات کے بغیر ناجائز طور پر میدان چھوڑا یا پشت موڑی۔ ارشاد ہے فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَا وَدَّ جَهَنَّمُ وِبَشَرٍ الْمَصِيْرُ۔ یعنی میدان سے بھاگنے والے اللہ تعالیٰ کا غضب لے کر لوٹے اور اُن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

ان دونوں آیتوں سے یہ حکم معلوم ہوا کہ فریقِ مقابل کتنی ہی زیادہ تعداد اور قوت و شوکت میں ہو مسلمانوں کو اُن کے مقابلہ سے پشت پھیرنا حرام ہے۔ بجز دو استثنائی صورتوں کے یہ کہ پشت پھیرنا بھاگنے کے لئے نہ ہو بلکہ یا تو پیشتر بدلنے کے طور پر ہو اور یا کمک حاصل کر کے دوبارہ حملہ کرنے کے قصد سے ہو۔

غزوۂ بدر میں یہ آیتیں نازل ہوئیں اُس وقت یہی حکم عام تھا کہ خواہ کتنی ہی بڑی تعداد سے مقابلہ ہو جائے اور اپنی تعداد سے اُن کی کوئی نسبت نہ ہو پھر بھی پشت پھیرنا اور میدان چھوڑنا جائز نہیں۔ میدان بدر میں یہی صورت تھی کہ تین سو تیرہ کا مقابلہ تگنی تعداد یعنی ایک ہزار سے ہو رہا تھا۔ بعد میں تخفیف کے احکام سورۃ انفال کی آیت (۶۵) اور (۶۶) میں نازل ہوئے آیت (۶۵) میں بیس مسلمانوں کو دو سو کافروں کے اور سو مسلمانوں کو ایک ہزار کافروں کے مقابلہ میں جہاد کرنے کا حکم ہے اور آیت (۶۶) میں مزید تخفیف کا یہ قانون نازل ہو گیا۔ اَلَا نَ خَفِّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَاَعْلَمَ اَنْ فِیْكُمْ ضَعْفًاۙ فَاِنْ یَّکُنْ مِنْكُمْ قِوَاۡةٌ صّٰبِرَةٌ یَّغْلِبُوْا مَا مِثْلَتِیْنِ الْاٰیۃ۔ یعنی اب اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے آسانی کر دی اور تمہارے ضعف کے پیش نظر یہ قانون جاری کر دیا کہ اگر مسلمان سو آدمی ثابت قدم ہوں تو دو سو کفار پر غالب آسکیں گے۔ اس میں اشارہ کر دیا کہ اپنے سے دو گنی تعداد تک تو مسلمانوں ہی کے غالب رہنے کی توقع ہے اس لئے پشت پھیرنا جائز نہیں۔ ہاں فریقِ مخالف کی تعداد دو گنی سے بھی زیادہ ہو جائے تو ایسی حالت میں میدان چھوڑ دینا جائز ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جو شخص اکیلا تین آدمیوں کے مقابلہ سے بھاگا وہ بھاگا نہیں ہاں جو دو آدمیوں کے مقابلہ سے بھاگا وہ بھاگنے والا ہے یعنی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے (روح البیان)۔ اب یہی حکم قیامت تک باقی ہے۔ جمہور اُمت اور ائمہ اربعہ کے نزدیک حکم شرعی یہی ہے کہ جب تک فریقِ مخالف کی تعداد دو گنی سے زائد نہ ہو اُس وقت تک میدان جنگ سے بھاگنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔

صحیحین میں بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات کاموں کو انسان کے لئے مہلک فرمایا اُن میں میدان جنگ سے بھاگنا بھی شمار فرمایا۔ اور غزوہ حنین کے واقعہ میں صحابہ کرام کی ابتدائی پسپائی کو قرآن کریم نے ایک شیطانی لغزش قرار دیا جو اُس کے گناہ عظیم ہونے کی دلیل ہے ارشاد فرمایا اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ۔

اور ترمذی، ابوداؤد کی ایک روایت میں جو قصہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا منقول ہے کہ ایک مرتبہ جنگ سے بھاگ کر انھوں نے مدینہ میں پناہ لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اعتراف جرم کیا کہ ہم میدان جنگ سے بھاگنے والے مجرم ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اظہار ناراضی کے اُن کو تسلی دی اور فرمایا بَلْ اَنْتُمْ الْعُكَّارُونَ وَاَنَا فُتُّتُكُمْ یعنی تم بھاگنے والے نہیں بلکہ کمک حاصل کر کے دوبارہ حملہ کرنے والے ہو اور میں تمھارے لئے کمک ہوں۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو واضح فرما دیا کہ ان لوگوں کا بھاگ کر مدینہ میں پناہ لینا اُس استثناء کے اندر داخل ہے جس میں کمک حاصل کرنے کے لئے میدان چھوڑنے کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو حق تعالیٰ کے خوف اور ہیبت و عظمت کا جو مقام خاص حاصل تھا اُس کی بنا پر وہ اس ظاہری پسپائی سے بھی گھبرائے اور اپنے آپ کو جرم کی حیثیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔

تیسری آیت میں غزوہ بدر کے بقیہ واقعہ کا بیان کرنے کے ساتھ مسلمانوں کو اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ غزوہ بدر کی معجزانہ فتح میں کثرت کے قلت سے اور قوت کے ضعف سے مغلوب ہو جانے کو اپنی سعی و عمل کا نتیجہ نہ سمجھو بلکہ اُس ذات پاک کی طرف دیکھو جس کی نصرت و امداد نے یہ نقشہ جنگ پلٹ دیا۔

واقعہ جو اس آیت میں بیان ہوا اُس کی تفصیل ابن جریر طبریؒ اور بیہقی وغیرہ نے حضرت عبداللہ ابن عباس وغیرہ سے یہ نقل کی ہے کہ معرکہ بدر کے دن جب مکہ کے ایک ہزار جوانوں کا لشکر ٹیلہ کے پیچھے سے میدان میں آیا تو مسلمانوں کی قلت و ضعف اور اپنی کثرت و قوت پر فخر کرتا ہوا متکبرانہ انداز سے سامنے آیا۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ یا اللہ یہ تیرے جھٹلانے والے قریش فخر و تکبر کرتے ہوئے آرہے ہیں آپ نے جو فتح کا وعدہ مجھ سے فرمایا ہے اس کو جلد پورا فرما (روح البیان)۔ تو جبریل امین نازل ہوئے اور عرض کیا کہ آپ ایک مٹھی خاک کی لے کر دشمن کے لشکر کی طرف پھینک دیں۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ اور ابن ابی حاتم نے بروایت ابن زید نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ مٹی اور کنکروں کی مٹھی بھری ایک لشکر کے داہنے حصہ پر دوسری بائیں حصہ پر تیسری سامنے کی جانب پھینک دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس ایک یا تین مٹھی بھر کنکریوں کو قدرت نے

معجزانہ انداز میں اس طرح پھیلا دیا کہ مخالف لشکر کا کوئی آدمی باقی نہ رہا جس کی آنکھوں میں اور چہروں پر یہ دھول اور کنکریاں نہ پہنچی ہوں جس کا اثر یہ ہوا کہ پورے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا فرشتے الگ ان کے ساتھ شریک قتال تھے۔ (منظہری - روح)

بالآخر کچھ لوگ مخالف فریق کے قتل ہو گئے کچھ گرفتار کر لئے گئے باقی بھاگ گئے اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔

بالکل مایوسی اور ناامیدی کے عالم میں یہ فتح عظیم مسلمانوں کو حاصل ہوئی میدان جنگ سے واپس آکر آپس میں گفتگوئیں شروع ہوئیں صحابہ کرام اپنے اپنے کارنامے ایک دوسرے سے بیان کرنے لگے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی **فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ** جس میں اُن کو یہ ہدایت دی گئی کہ اپنی سعی و عمل پر ناز نہ کرو یہ جو کچھ ہوا وہ صرف تمہاری محنت و کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ خالص حق تعالیٰ کی نصرت و امداد کا ثمرہ تھا۔ جو دشمن تمہارے ہاتھوں قتل ہوئے اُن کو درحقیقت تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے قتل کیا ہے۔

اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہوا۔ **وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَفٰی**۔ یعنی یہ مٹھی کنکریوں کی جو آپ نے پھینکی وہ درحقیقت آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھینکنے کا یہ نتیجہ کہ لشکر دشمن کے ہر فرد کی آنکھوں میں پہنچ کر سب کو سراسیمہ کر دے یہ آپ کے پھینکنے کا اثر نہیں تھا بلکہ حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ صورت پیدا فرمائی ہے۔

ما رمیت اذ رمیت گفت حق کارما بر کار ہا دارد سبق

غور کیا جائے تو مسلمانوں کے لئے جہاد کی فتح و کامیابی سے زیادہ قیمتی یہ ہدایت تھی جس نے اُن کے ذہنوں کو اسباب سے پھیر کر مسبب الاسباب سے وابستہ کر دیا اور اس کے ذریعہ اُس فخر و عجب کی خرابی سے بچا لیا جس کے نشہ میں عموماً فاتح اقوام مبتلا ہو جایا کرتی ہیں۔ اور اس کے بعد یہ بتلایا کہ فتح و شکست ہمارے حکم کے تابع ہیں۔ اور ہماری فتح و نصرت اُن لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اطاعت گزار ہوں۔ **وَلِيُذِخَّرَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءٌ حَسَنًا** یعنی یہ فتح عظیم ہم نے اس لئے دی کہ مؤمنین کو اُن کی محنت کا پورا صلہ دے دے۔ بلاء کے لفظی معنی امتحان کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا امتحان کبھی مصیبت و مشقت میں مبتلا کر کے ہوتا ہے اور کبھی راحت و دولت دے کر۔ **بَلَاءٌ حَسَنٌ** اُس امتحان کو کہا گیا ہے جو راحت، دولت اور فتح و نصرت دے کر لیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس کو ہمارا انعام سمجھ کر شکر گزار ہوتے ہیں یا اُس کو اپنی ذاتی قابلیت کا اثر سمجھ کر فخر و ناز میں مبتلا ہو جاتے اور اپنے عمل کو برباد کر دیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کسی کے فخر و ناز کی کوئی

گنجائش نہیں ہے بقول مولانا روحیؒ

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ
چوتھی آیت میں اس کے بالمقابل اس فتح کا ایک اور فائدہ بھی یہ بتلایا گیا کہ ذَلِكُمْ وَاَنْتَ
اللّٰهُ مُّوْهِبُ الْكَفْرِ يٰۤاِنَّ يٰۤاِنَّ يٰۤاِنَّ۔ یعنی یہ فتح و نصرت اس لئے بھی مسلمانوں کو دی گئی کہ اس
کے ذریعہ کافروں کی تدبیروں کو ناکام اور ناکارہ بنا دیا جائے۔ جس سے وہ سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد
ہمارے ساتھ نہیں۔ اور کوئی تدبیر بغیر اللہ تعالیٰ کی مدد کے کامیاب نہیں ہو سکتی۔

پانچویں آیت میں شکست خوردہ قریشی کفار کو خطاب اور ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو
قریشی شکر کے مسلمانوں کے مقابلہ پر مکہ سے نکلنے کے وقت پیش آیا تھا۔

وہ یہ کہ جب قریشی کفار کا لشکر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے طیار ہو گیا تو مکہ سے نکلنے سے پہلے
لشکر کے سردار ابو جہل وغیرہ نے بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر دعائیں مانگی تھیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ
اس دعا میں انہوں نے اپنی فتح کی دعا کرنے کے بجائے عام الفاظ میں اس طرح دعا مانگی
یا اللہ دونوں لشکروں میں سے جو اعلیٰ و افضل ہے اور دونوں جماعتوں میں سے
جو زیادہ ہدایت پر ہے اور دونوں پارٹیوں میں سے جو زیادہ کریم و شریف ہے اور دونوں
میں سے جو دین افضل ہے اُس کو فتح دیجئے۔ (مظہری)

یہ بے وقوف تو یوں سمجھ رہے تھے کہ بمقابلہ مسلمانوں کے ہم ہی اعلیٰ و افضل اور زیادہ ہدایت پر
ہیں اس لئے یہ دعا ہمارے حق میں ہے اور اس دعا کے ذریعہ وہ یہ چاہتے تھے کہ خدا تعالیٰ کی طرف
سے حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے۔ اور جب ہم فتح پائیں تو یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے
حق پر ہونے کا فیصلہ ہو گا۔

مگر اُن کو یہ خبر نہ تھی کہ اس دعا میں درحقیقت وہ اپنے لئے بد دعا اور مسلمانوں کے لئے
دعا کر رہے ہیں۔ انجام جنگ سامنے آنے کے بعد قرآن کریم نے اُن کو بتلایا اِنَّ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ
جَاءَكُمْ الْفَتْحُ یعنی اگر تم خدائی فیصلہ چاہتے ہو تو وہ سامنے آچکا کہ حق کو فتح اور باطل کو شکست
ہو گئی۔ وَ اِنَّ تَذْتَهُوْا فْهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاگر تم اب بھی اپنے کفر و عناد سے باز آگئے تو
یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ وَ اِنَّ تَعُوْذُوْا نَعُوْذْ وَاگر تم پھر اپنی شرارت اور جنگ کی طرف
لوٹے تو ہم بھی مسلمانوں کی امداد کی طرف لوٹیں گے۔ وَ كُنْ تَعْنِيْ عَنْكُمْ فِئْتَكُمْ شَيْئًا وَاَلَوْ كُنْتُمْ
یعنی تمہاری جماعت اور جتھا کتنا ہی زیادہ ہو اللہ تعالیٰ کی نصرت کے مقابلہ میں تمہیں کچھ کام نہ دے گا۔
وَ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی کوئی جماعت تمہیں کیا کام دے سکتی ہے جب کہ قادر مطلق اللہ
تعالیٰ مسلمانوں کے ساتھ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنَّهُ وَأنْتُمْ

اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اس سے مت پھرو

تَسْمَعُونَ ﴿۲۰﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا

سن کر - اور اُن جیسے مت ہو جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا اور وہ سنتے

يَسْمَعُونَ ﴿۲۱﴾ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ

نہیں - بیشک سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہی بہرے گونگے ہیں جو

لَا يَعْقِلُونَ ﴿۲۲﴾ وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ

نہیں سمجھتے - اور اگر اللہ جانتا ان میں کچھ بھلائی تو اُن کو سنادیتا، اور اگر اُن کو اب سنا دے

لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۲۳﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ

تو ضرور بھاگیں منہ پھیر کر - اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا

وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ

اور رسول کا جس وقت بلائے تم کو اُس کام کی طرف جس میں تمہاری زندگی ہے، اور جان لو کہ اللہ روک لیتا ہے

بَيْنَ الْمَرَّةِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿۲۴﴾

آدمی سے اُس کے دل کو اور یہ کہ اُسی کے پاس تم جمع ہو گے -

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو اللہ کا کہنا مانو اور اس کے رسول کا اور اس کہنا ماننے سے روگردانی مت کرو اور تم (اعتقاد سے) سن تو لیتے ہی ہو (یعنی جیسا اعتقاد سے سن لیتے ہو ایسا ہی عمل بھی کیا کرو) اور تم (ترک اطاعت میں) ان لوگوں کی طرح مت ہونا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم نے سن لیا (جیسا کفار کے مطلق سماع کے اور منافقین سماع مع الاعتقاد کے مدعی تھے) حالانکہ وہ سنتے سناتے کچھ نہیں (کیونکہ تفہم اور اعتقاد دونوں میں مفقود ہے مطلب یہ کہ ثمرہ اعتقاد سننے کا عمل ہے جب عمل نہ ہوا تو بعض وجوہ سے مشابہ اسی کے ہو گیا کہ جیسے اعتقاد کے ساتھ سنا ہی نہیں جس کو تم بھی سخت مذموم جانتے ہو) بیشک (یہ بات ضرور ہے کہ اعتقاد سے سن کر عمل نہ کرنے والے اور ایک بلا اعتقاد سننے والے جو مثل نہ سننے کے ہے برے ہونے میں متفاوت ضرور ہیں کیونکہ کافر اور عاصی برابر نہیں چنانچہ بدترین خلاق اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو (حق بات کو اعتقاد کے ساتھ سننے سے) بہرے ہیں (اور حق بات کے کہنے سے) گونگے ہیں (اور) جو کہ (حق بات کو) ذرا نہیں سمجھتے (اور باوجود اعتقاد کے جن سے عمل میں

کو تا ہی ہو جاتی ہے وہ بدتر نہیں ہیں گو بد ہیں سو بد بھی نہ ہونا چاہئے) اور (جن کا حال مذکور ہوا کہ وہ اعتقاد سے نہیں سنتے وہ اس کی یہ ہے کہ ان میں ایک بڑی خوبی کی کسر ہے اور وہ خوبی طلب حق ہے کیونکہ مبدأ اعتقاد کا بھی طلب اور تلاش ہے گو اس وقت اعتقاد نہ ہو مگر کم از کم تردد تو ہو پھر اسی تردد و طلب کی برکت سے حق واضح ہو جاتا ہے اور وہ تردد اعتقاد بن جاتا ہے جس پر سماع کا نافع ہونا موقوف ہے سو ان میں یہی خوبی مفقود ہے چنانچہ) اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی دیکھتے (مراد یہ کہ ان میں وہ خوبی مذکور ہوتی کیونکہ خوبی کے وجود کے وقت علم الہی کا تعلق لازم ہے پس لازم بول کر ملزوم مراد لے لیا اور کوئی خوبی اس لئے کہا کہ جب ایسی خوبی نہیں جس پر مدار نجات ہے تو گویا کوئی خوبی بھی نہیں یعنی اگر ان میں طلب حق ہوتی) تو (اللہ تعالیٰ) ان کو (اعتقاد کے ساتھ) سننے کی توفیق دیتے (جیسا مذکور ہوا کہ طلب سے اعتقاد پیدا ہو جاتا ہے) اور اگر (اللہ تعالیٰ) ان کو اب (حالت موجودہ میں کہ ان میں طلب حق نہیں ہے) سنادیں (جیسا کہ گاہ گاہ ظاہری کافوں سے سن ہی لیتے ہیں) تو ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے (یعنی یہ نہیں کہ تامل و تدبر کے بعد بوجہ ظہور غلطی کے روگردانی کی ہو کیونکہ یہاں غلطی کا نام و نشان ہی نہیں بلکہ غضب تو یہ ہے کہ ادھر تو جبر ہی نہیں کرتے اور) اے ایمان والو! (ہم نے جو اوپر تم کو اطاعت کا حکم کیا ہے تو یاد رکھو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے کہ وہ حیات ابدی ہے جب یہ بات ہے تو تم اللہ اور رسول کے کہنے کو بجا لایا کرو جب کہ رسول (جن کا ارشاد خدا ہی کا ارشاد ہے) تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف (یعنی دین کی طرف جس سے زندگی جاوید میسر ہوتی ہے) بلاتے ہوں (تو اس حالت میں جب کہ ہر طرح تمہارا ہی فائدہ ہے کوئی وجہ نہیں کہ تم عمل نہ کرو) اور (اس کے متعلق دو باتیں اور) جان رکھو (ایک بات یہ) کہ اللہ تعالیٰ اڑ بن جایا کرتا ہے آدمی کے اور اس کے قلب کے درمیان میں (دو طریق سے ایک طریق یہ کہ مؤمن کے قلب میں طاعت کی برکت سے کفر و معصیت کو نہیں آنے دیتا دوسرا طریق یہ کہ کافر کے قلب میں مخالفت کی نحوست سے ایمان و طاعت کو نہیں آنے دیتا اس سے معلوم ہوا کہ طاعت کی مداومت بڑی نافع چیز ہے اور مخالفت کی مواظبت بڑی مضر چیز ہے) اور (دوسری بات یہ جان رکھو کہ) بلاشبہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے (اس وقت طاعت پر جزا اور مخالفت پر عزا ہوگی اس سے بھی طاعت کا نافع ہونا اور مخالفت کا مضر ہونا ثابت ہوا)۔

معارف و مسائل

غزوہ بدر جس کا واقعہ پچھلی آیات میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے اُس میں اہل اسلام اور کفار دونوں کے لئے عبرت اور حکمت کے بہت سے اسباق ہیں جن کی طرف قصہ کے

درمیانی جملوں میں تنبیہ فرمائی گئی ہے۔

مثلاً پچھلی آیات میں مشرکین مکہ کی شکست و ذلت کا واقعہ بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا تھا ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ یعنی ہر طرح کی قوت و سامان کے باوجود مشرکین مکہ کی شکست کا اصلی سبب اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت تھی۔ اس میں ان لوگوں کے لئے ایک تازیانہ عبرت ہے جو زمین و آسمان کے خالق و مالک کی قدرتِ کاملہ اور غیبی قوت سے قطع نظر کر کے صرف مادی قوتوں پر بھروسہ کرتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کے باوجود اُس کی امداد و نصرت کی غلط آرزوؤں سے اپنے نفس کو فریب دیتے ہیں۔

آیات مذکورہ میں اسی مسئلہ کا دوسرا رُخ مسلمانوں کو خطاب کر کے بیان فرمایا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو باوجود قلتِ تعداد اور بے سامانی کے یہ فتحِ عظیم صرف اللہ جل شانہ کی نصرت و امداد سے حاصل ہوئی اور یہ نصرت و امداد نتیجہ ہے اُن کی اطاعتِ حق کا۔ اس اطاعت پر مضبوطی سے قائم رہنے کے لئے مسلمانوں کو حکم دیا گیا۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُوْلَهُ یعنی اے ایمان والو! اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اختیار کرو اور اُس پر مضبوطی سے قائم رہو۔ پھر اسی مضمون کی مزید تاکید کے لئے فرمایا وَلَا تَوَلَّوْا عَنّٰهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ۔ یعنی قرآن اور کلمہ حق سن لینے کے باوجود اطاعت سے روگردانی نہ کرو۔

سُن لینے سے مراد حق بات کا سننا ہے اور سننے کے چار درجات ہیں ایک یہ کہ کوئی آواز صرف کانوں سے سن لی مگر نہ اُس کو سمجھنے کی کوشش کی نہ سمجھا اور نہ اُس پر اعتقاد و اعتماد کیا اور نہ عمل کیا۔ دوسرے یہ کہ کانوں سے سنا بھی اور سمجھا بھی مگر نہ اُس پر اعتقاد کیا نہ عمل۔ تیسرے یہ کہ سنا بھی اور سمجھا بھی اور اعتقاد و اعتماد بھی کیا مگر عمل نہیں کیا۔ چوتھے یہ کہ سنا بھی سمجھا بھی اور اعتقاد بھی کیا اور عمل بھی۔

یہ ظاہر ہے کہ سننے کا اصل مقصد پوری طرح تو چوتھے درجہ ہی سے حاصل ہوتا ہے جو مؤمنین کاملین کا مقام ہے اور ابتدائی تینوں درجوں میں سننا ناقص اور نامکمل ہے جس کو ایک حیثیت سے نہ سنا بھی کہہ سکتے ہیں جیسا کہ اگلی آیات میں آتا ہے۔ اور تیسرا درجہ جس میں حق کا سننا، سمجھنا، اعتقاد کرنا تو موجود ہے مگر عمل نہیں۔ اس میں اگرچہ سننے کا اصل مقصد پورا نہیں ہوتا مگر اعتقاد بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اس لئے وہ بھی بیکار نہیں، یہ درجہ گناہگار مسلمانوں کا ہے۔ اور دوسرا درجہ جس میں صرف سننا اور سمجھنا ہے نہ اعتقاد ہے نہ عمل یہ منافقین کا درجہ ہے کہ قرآن کو سنتے بھی ہیں سمجھتے بھی ہیں اور ظاہر میں اعتقاد و عمل کا دعویٰ بھی ہے مگر حقیقت میں عقیدہ اور عمل سے خالی ہیں اور پہلا درجہ عام مشرکین و کفار کا ہے جنہوں نے کلمہ حق اور قرآن کی آیات کانوں سے

تو سن لی مگر کبھی سمجھنے اور غور کرنے کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔

آیت مذکورہ میں مسلمانوں کو خطاب ہے کہ تم لوگ حق بات کو سن تو لیتے ہی ہو یعنی سننا سمجھنا، اعتقاد رکھنا تو تمہاری طرف سے موجود ہے مگر آگے اُس پر عمل بھی پورا کرو اطاعت سے روگردانی نہ کرو تاکہ سننے کا اصل مقصد مکمل ہو جائے۔

دوسری آیت میں اسی مضمون کی مزید تاکید کے لئے ارشاد فرمایا وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ۔ یعنی تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم نے سن لیا مگر درحقیقت سننا سنایا کچھ نہیں۔ ان لوگوں سے مراد عام کفار بھی ہیں جو سننے کا دعویٰ کرتے ہیں اعتقاد کا نہیں کرتے۔ اور منافقین بھی ہیں جو سننے کے ساتھ سمجھنے اور اعتقاد رکھنے کے بھی مدعی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ غور و فکر اور صحیح سمجھ سے یہ دونوں محروم ہیں۔ اس لئے ان کا سننا نہ سننے کے حکم میں ہے مسلمانوں کو ان لوگوں کے مشابہ ہونے سے منع فرمایا گیا۔

تیسری آیت میں ان لوگوں کی شدید مذمت ہے جو حق بات کو غور و تدبر کے ساتھ نہیں سنتے اور اُس کو قبول نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو قرآن کریم نے جانوروں سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ۔

لفظ دواب دابة کی جمع ہے اصل لغت کے اعتبار سے ہرزہ میں پر چلنے والے کو دابة کہا جاتا ہے مگر عرف و محاورہ میں صرف چوپایہ جانوروں کو دابة کہتے ہیں۔ معنی آیت کے یہ ہوئے کہ سب سے بدترین چوپائے اللہ کے نزدیک وہ ہیں جو حق کو سننے سے بہرے اور اُس کے قبول کرنے سے گونگے ہیں اور بہرے گونگے ہیں اگر کچھ عقل ہو تو وہ بھی اشاروں سے اپنے دل کی بات کہہ لیتا ہے اور دوسروں کی بات سمجھ لیتا ہے۔ یہ لوگ بہرے گونگے ہونے کے ساتھ بے عقل بھی ہیں اور یہ ظاہر ہے جو بہرے گونگا عقل سے بھی خالی ہو اُس کے سمجھنے سمجھانے کا کوئی راستہ نہیں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ واضح کر دیا کہ انسان کو جو احسن تقویم میں پیدا کیا گیا اور اشرف المخلوقات اور مخدوم کائنات بنایا گیا یہ سب انعامات صرف اطاعت حق میں مضمر اور منحصر ہیں جب انسان نے حق بات کے سننے سمجھنے اور ماننے سے اعراض کیا تو یہ سارے انعامات اُس سے سلب ہو جاتے ہیں اور وہ جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

تفسیر روح البیان میں ہے کہ انسان اپنی اصل خلقت کے اعتبار سے سب جانوروں سے افضل و اعلیٰ ہے اور فرشتوں سے کم درجہ رکھتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے سعی و عمل اور طاعت حق میں جدوجہد کرتا ہے تو فرشتوں سے بھی اعلیٰ و اشرف ہو جاتا ہے اور اگر اُس نے اطاعت حق سے روگردانی کی تو پھر وہ اسفل سافلین میں جاتا ہے اور جانوروں سے بھی زیادہ بدتر ہو جاتا ہے۔

چوتھی آیت میں ارشاد ہے وَكُوْنُوْا عَلٰمًا لِّلّٰهِ فِيْهِمْ خَيْرًا اَلَا سَمِعْتُمْ لَكُمْ وَكُوْا سَمْعَهُمْ لَكُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ اُن میں کوئی بھلائی دیکھتے تو اُن کو اعتقاد کے ساتھ سننے کی توفیق بخش دیتے اور اگر ان کو بحالت موجودہ کہ اُن میں طلبِ حق نہیں ہے حق بات سنا دیں تو وہ ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے۔

بھلائی سے مراد اس جگہ طلبِ حق ہے کہ طلبِ ہی کے ذریعہ تدبیر اور فہم کے دروازے کھلتے ہیں اور اسی سے اعتقاد و عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ اور جس میں طلبِ حق نہیں گویا اُس میں کوئی بھلائی نہیں معنی یہ ہیں کہ اگر اُن میں کوئی بھلائی موجود ہوتی تو ظاہر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتی جب اللہ تعالیٰ کے علم میں اُن کے اندر کوئی بھلائی نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ درحقیقت وہ ہر بھلائی سے محروم ہیں اور اس محرومی کی حالت میں اگر ان کو غور و تدبیر اور اعتقادِ حق کی دعوت دی جائے تو وہ ہرگز قبول نہ کریں گے بلکہ اُس سے منہ پھیر کر بھاگیں گے۔ یعنی ان کی یہ روگردانی اس بنا پر نہ ہوگی کہ دین میں اُن کو اعتراض کی بات نظر آگئی اس لئے نہیں مانا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے حق بات پر دھیان ہی نہیں دیا۔

اس تقریر سے وہ منطقی شبہ بھی رفع ہو گیا جو اہل علم کے دلوں میں کھٹکتا ہے کہ یہ قیاس کی شکل اول ہے حدِ اوسط حذف کریں تو نتیجہ غلط نکل رہا ہے۔ جواب یہ ہے کہ درحقیقت یہاں حدِ اوسط مکرر نہیں کیونکہ پہلے لَا سَمْعَهُمْ کا مفہوم الگ ہے دوسرے اَسْمَعَهُمْ کا الگ پہلے میں سماع قبول اور سماع نافع مراد ہے دوسرے میں خالی سماع۔

پانچویں آیت میں پھر اہل ایمان کو خطاب کر کے اللہ اور رسول کے احکام کی تعمیل و اطاعت کا حکم ایک خاص انداز سے دیا گیا کہ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں جس چیز کی دعوت دیتے ہیں اُس میں اللہ اور رسول کا اپنا کوئی فائدہ مضمّن نہیں بلکہ سب احکام تمہارے ہی فائدہ کیلئے دیئے گئے ہیں۔ ارشاد فرمایا اَسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَرَلِّیْ سُوْلًا اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْۤ اَعْنٰی اللّٰہ کی اور رسول کی جب کہ رسول تم کو ایسی چیز کی طرف بلائے جو تمہارے لئے زندگی بخش ہے۔

وہ حیات جس کا ذکر اس آیت میں ہے کیا ہے اس میں کئی احتمال ہیں اس لئے علماء تفسیر نے مختلف قول اختیار کئے ہیں سدی نے کہا کہ وہ حیات بخش چیز ایمان ہے کیونکہ کافر مردہ ہے۔ قتادہ نے فرمایا کہ وہ قرآن ہے جس میں دنیا و آخرت کی زندگی اور فلاح مضمّن ہے۔ مجاہد نے فرمایا کہ وہ حق ہے۔ ابن اسحاق نے فرمایا کہ مراد اُس سے جہاد ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عزت بخشی۔ اور یہ سب احتمالات اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں ان میں کوئی تضاد نہیں اور مراد یہ ہے کہ ایمان یا قرآن یا اتباعِ حق وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن سے انسان کا دل زندہ ہوتا ہے اور دل کی زندگی یہ ہے کہ بندہ اور اللہ تعالیٰ کے

درمیان جو غفلت و شہوت وغیرہ کے حجابات حائل ہیں وہ راہ سے ہٹ جائیں اور حجابات کی ظلمت دور ہو کر نور معرفت دل میں جگہ کر لے۔

ترمذی اور نسائی نے بروایت حضرت ابو ہریرہؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز اُبی بن کعبؓ کو بلایا۔ اُبی بن کعبؓ نماز پڑھ رہے تھے جلدی جلدی نماز پوری کر کے حاضر ہوئے آپؐ نے فرمایا کہ میرے پکارنے پر آنے میں دیر کیوں لگائی۔ اُبی بن کعبؓ نے عرض کیا کہ میں نماز میں تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ۔ اُبی بن کعبؓ نے عرض کیا کہ آئندہ اس کی اطاعت کروں گا اگر بحالت نماز بھی آپ بلائیں گے فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔

اس حدیث کی بنا پر بعض فقہاء نے فرمایا کہ حکم رسول کی اطاعت سے نماز میں جو کام بھی کریں اس سے نماز میں خلل نہیں ہوتا اور بعض نے فرمایا کہ اگرچہ خلاف نماز افعال سے نماز قطع ہو جائے گی اور اس کی بعد میں قضا کرنا پڑے گی لیکن کرنا ہی چاہئے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو بلائیں اور وہ نماز میں بھی ہو تو نماز کو قطع کر کے تعمیل حکم کرے۔

یہ صورت تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساتھ مخصوص ہے لیکن دوسرے ایسے کام جن میں تاخیر کرنے سے کسی شدید نقصان کا خطرہ ہو اُس وقت بھی نماز قطع کر دینا اور پھر قضا کر لینا چاہئے جیسے کوئی نمازی یہ دیکھے کہ نابینا آدمی کنویں یا گڑھے کے قریب پہنچ کر گرا چاہتا ہے تو فوراً نماز توڑ کر اس کو بچانا چاہئے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِہِ یعنی یہ بات سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی کے اور اُس کے قلب کے درمیان۔ اس جملہ کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور دونوں میں عظیم حکمت و موعظت پائی جاتی ہے جو ہر انسان کو ہر وقت یاد رکھنی چاہئے۔ ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ جب کسی نیک کام کے کرنے یا گناہ سے بچنے کا موقع آئے تو اُس کو فوراً کر گزرو۔ دیر نہ کرو اور اس فرصت و غنیمت سمجھو کیونکہ بعض اوقات آدمی کے ارادہ کے درمیان قضاء الہی حائل ہو جاتی ہے وہ اپنے ارادہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کوئی بیماری پیش آجائے یا موت آجائے یا کوئی ایسا مشغلہ پیش آجائے کہ اس کام کی فرصت نہ ملے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ فرصت عمر اور فرصت وقت کو غنیمت سمجھ کر آج کا کام کل پر نہ ڈالے کیونکہ معلوم نہیں کل کیا ہونا ہے۔

من نمی گویم زیان کن یا بفکر سود باشش ای ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش
اور دوسرا مطلب اس جملہ کا یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے نہایت قریب

ہونا بتلایا جیسے دوسری آیت میں نَحْنُ اقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ میں اللہ تعالیٰ کا انسان کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہونے کا بیان ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کا قلب ہر وقت حق تعالیٰ کے خاص تصرف میں ہے جب وہ کسی بندے کی برائیوں سے حفاظت کرنا چاہتے ہیں تو اس کے قلب اور گناہوں کے درمیان آرٹ کر دیتے ہیں اور جب کسی کی بد بختی مقدر ہوتی ہے تو اُس کے دل اور نیک کاموں کے درمیان آرٹ کر دی جاتی ہے اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رُعاؤں میں اکشر یہ دُعا کیا کرتے تھے يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ۔ یعنی اے دلوں کے پلٹنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت اور قائم رکھئے۔

حاصل اس کا بھی وہی ہے کہ اللہ اور رسول کے احکام کی تعمیل میں دیر نہ لگاؤ اور فرصت و وقت کو غنیمت جان کر فوراً کر گزرو معلوم نہیں کہ پھر دل میں نیکی کا یہ جذبہ اور اُمنگ باقی رہتی ہے یا نہیں۔

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۖ وَ

اور بچتے رہو اس فساد سے کہ نہیں پڑے گا تم میں سے خاص ظالموں ہی پر ، اور

اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝۲۹ وَادْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ

جان لو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے ۔ اور یاد کرو جس وقت تم تھوڑے تھے

مُسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ

مغلوب پڑے ہوئے ملک میں ڈرتے تھے کہ اُچک لیں تم کو لوگ

فَأُولَٰئِكَ وَآلِدُكُمْ بِنَصْرِهِ وَرِزْقِكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ

پھر اس نے تم کو ٹھکانا دیا اور قوت دی تم کو اپنی مدد سے اور روزی دی تم کو ستھری چیزیں تاکہ تم

تَشْكُرُونَ ۝۳۰ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ

شکر کرو۔ اے ایمان والو! خیانت نہ کرو اللہ سے اور رسول سے

وَتَخُونُوا أَمْنَكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝۳۱ وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ

اور خیانت نہ کرو آپس کی امانتوں میں جان کر ۔ اور جان لو کہ بیشک تمہارے مال

وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ وَأَنَّ اللَّهَ عِنْدَ أَجْرٍ عَظِيمٍ ۝۳۲

اور اولاد خرابی میں ڈالنے والے ہیں اور یہ کہ اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے ۔

خلاصہ تفسیر

اور (جس طرح تم پر اپنی اصلاح کے متعلق طاعت واجب ہے اسی طرح یہ بھی طاعت واجبیں

داخل ہے کہ بقدر وسع دوسروں کی اصلاح میں بطریق امر بالمعروف ونہی عن المنکر بالید یا باللسان ترک اختلاط یا نفرت بالقلب جو کہ آخری درجہ ہے کوشش کرو ورنہ در صورت مداہنت ان منکرات کا وبال جیسا مرتکبین منکرات پر واقع ہوگا ایسا ہی کسی درجہ میں ان مداہنت کرنے والوں پر بھی واقع ہوگا جب یہ بات ہے تو تم ایسے وبال سے بچو کہ جو خاص ان ہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں ان گناہوں میں مرتکب ہوئے ہیں (بلکہ ان گناہوں کو دیکھ کر جنہوں نے مداہنت کی ہے وہ بھی اس میں شریک ہوں گے اور اس سے بچنا یہی ہے کہ مداہنت مت کرو) اور یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت مزادینے والے ہیں (ان کی سزا سے خوف کر کے مداہنت سے بچو) اور (اس غرض سے کہ نعمتوں کے یاد کرنے سے اطاعت مستم کا شوق ہوتا ہے خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو اور خاص کر) اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم (ایک وقت میں یعنی قبل ہجرت عدد میں بھی) قلیل تھے (اور قوت کے اعتبار سے بھی) سرزمین (مکہ) میں کمزور شمار کئے جاتے تھے (اور غایت ضعف حال سے) اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ تم کو (مخالف) لوگ نوچ کھسوٹ نہ لیں سو (ایسی حالت میں) اللہ تعالیٰ نے تم کو (مدینہ میں اطمینان سے) رہنے کو جگہ دی اور تم کو اپنی نصرت سے قوت دی (سامان سے بھی اور مردم شماری کو زیادہ کرنے سے بھی جس سے قلت اور استضعاف اور خوف احتطاف سب زائل ہو گیا) اور (صرف یہی نہیں کہ تمہاری مصیبت ہی کو دور کر دیا ہو بلکہ اعلیٰ درجہ کی خوشحالی بھی عطا فرمائی کہ دشمنوں پر تم کو غلبہ دے کر کثرت قوتحات سے تم کو نفیس نفیس چیزیں عطا فرمائیں تاکہ تم (ان نعمتوں کا) شکر کرو (اور بڑا شکریہ ہے کہ اطاعت کرو) اسے ایمان والو (ہم مخالفت اور معصیت سے اس لئے حماقت کرتے ہیں کہ اللہ اور رسول کے تم پر کچھ حقوق ہیں جن کا نفع تمہاری ہی طرف عائد ہوتا ہے اور معصیت سے ان حقوق میں خلل پڑتا ہے جس سے واقع میں تمہارے ہی نفع میں خلل پڑتا ہے جب یہ بات ہے تو تم اللہ اور رسول کے حقوق میں خلل مت ڈالو اور (باعتبار انجام کے اس مضمون کو اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ تم) اپنی قابل حفاظت چیزوں میں (کہ وہ تمہارے منافع ہیں جو اعمال پر مرتب ہوتے ہیں) خلل مت ڈالو اور تم تو (اس کا مضر ہونا) جانتے ہو اور (اکثر اوقات مال و اولاد کی محبت محل طاعت ہو جاتی ہے اس لئے تم کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ) تم اس بات کو جان رکھو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد ایک امتحان کی چیز ہے (کہ دیکھیں کون ان کی محبت کو ترجیح دیتا ہے اور کون اللہ تعالیٰ کی محبت کو ترجیح دیتا ہے سو تم ان کی محبت کو ترجیح مت دینا) اور (اگر ان کے منافع کی طرف نظر جائے تو تم) اس بات کو بھی جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے پاس (ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی محبت کو ترجیح دیتے ہیں) بڑا بھاری اجر (موجود) ہے (کہ اس کے سامنے یہ فانی منفعتیں محض بیچ ہیں)۔

معارف و مسائل

قرآن کریم نے غزوہ بدر کی کچھ تفصیلات اور اُس میں مسلمانوں پر اپنے انعامات کا ذکر فرمانے کے بعد اُس سے حاصل شدہ نتائج اور پھر اُس کے مناسب مسلمانوں کو کچھ پند و نصیحت کے ارشادات بیان فرمائے ہیں جن کا سلسلہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ** سے شروع ہوا ہے۔ اسی سلسلہ کی یہ آیات ہیں جو اوپر لکھی گئی ہیں۔

ان میں سے پہلی آیت میں ایسے گناہ سے بچنے کی خاص طور پر ہدایت کی گئی ہے جس کا عذاب شدید صرف گناہ کرنے والوں پر محدود نہیں رہتا بلکہ ناکردہ گناہ لوگ بھی اُس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ گناہ کونسا ہے اس میں علماء تفسیر کے متعدد اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ گناہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت اور برے کاموں سے روکنے کی جدوجہد کا ترک کر دینا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس کا حکم دیا ہے کہ کسی جرم و گناہ کو اپنے ماحول میں قائم نہ رہنے دیں کیونکہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا یعنی جرم و گناہ دیکھتے ہوئے باوجود قدرت کے اُس کو منع نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اُن سب پر اپنا عذاب عام کر دیں گے جس سے نہ گناہگار بچیں گے نہ بے گناہ۔

اور بے گناہ سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو اصل گناہ میں ان کے ساتھ شریک نہیں مگر امر بالمعروف کے ترک کر دینے کے گناہگار وہ بھی ہیں اس لئے یہاں یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ایک کے گناہ کا عذاب دوسرے پر ڈالنا بے انصافی اور قرآنی فیصلہ **لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ** کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہاں گناہگار اپنے اصل گناہ کے وبال میں اور بے گناہ ترک امر بالمعروف کے گناہ میں پکڑے گئے کسی کا گناہ دوسرے پر نہیں ڈالا گیا۔

امام بغویؒ نے شرح السنہ اور معالم میں بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ و صدیقہ عائشہؓ یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص جماعت کے گناہ کا عذاب عام لوگوں پر نہیں ڈالتے جب تک کہ ایسی صورت پیدا نہ ہو جائے کہ وہ اپنے ماحول میں گناہ ہوتا ہوا دیکھیں اور اُن کو یہ قدرت بھی ہو کہ اُس کو روک سکیں اس کے باوجود انہوں نے اس کو روکا نہیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا عذاب ان سب کو گھیر لیتا ہے۔

اور ترمذیؒ ابو داؤد وغیرہ میں صحیح سند کے ساتھ منقول ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا کہ جب لوگ کسی ظالم کو دیکھیں اور ظلم سے اُس کا ہاتھ نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سب پر اپنا عذاب عام کر دیں۔

صحیح بخاری میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قانونی حدود توڑنے والے گناہگار ہیں اور جو لوگ ان کو دیکھ کر مدد ہمت کرنے والے ہیں، یعنی باوجود قدرت کے اُن کو گناہ سے نہیں روکتے ان دونوں طبقوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بحری جہاز کے دو طبقے ہوں اور نیچے کے طبقہ والے اوپر آکر اپنی ضرورت کے لئے پانی لیتے ہوں جس سے اوپر والے تکلیف محسوس کریں۔ نیچے والے یہ دیکھ کر یہ صورت اختیار کریں کہ کشتی کے نچلے حصہ میں سوراخ کر کے اُس سے اپنے لئے پانی حاصل کریں اور اوپر کے لوگ ان کی اس حرکت کو دیکھیں اور منع نہ کریں تو ظاہر ہے کہ پانی پوری کشتی میں بھر جائے گا اور جب نیچے والے غرق ہوں گے تو اوپر والے بھی ڈوبنے سے نہ بچیں گے۔

ان روایات کی بنا پر بہت سے حضرات مفسرین نے یہ قرار دیا کہ اس آیت میں فتنہ سے مراد یہی گناہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ترک کر دینا ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ اس گناہ سے مراد ترک جہاد کا گناہ ہے خصوصاً اُس وقت جبکہ امیر المؤمنین کی طرف سے جہاد کی دعوت عام مسلمانوں کو دے دی جائے اور اسلامی شعائر کی حفاظت اس پر موقوف ہو کیونکہ اس وقت ترک جہاد کا وبال صرف تارکین جہاد پر نہیں بلکہ پورے مسلمانوں پر پڑتا ہے۔ کفار کے غلبہ کے سبب عورتیں بچے بوڑھے اور بہت سے بے گناہ مسلمان قتل و غارت کا شکار ہو جاتے ہیں، ان کے جان و مال خطرہ میں پڑ جاتے ہیں۔ اس صورت میں عذاب سے مراد دنیوی مصائب اور تکلیفیں ہوں گی۔

اور قرینہ اس تفسیر کا یہ ہے کہ پچھلی آیات میں بھی ترک جہاد کرنے والوں پر ملامت کی گئی ہے وَ اِنَّ فَرِیقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ کُفِرُوْهُنَّ۔ اور یَاٰیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا لَقِیْتُمْ الْکَافِرِیْنَ فَزَحِّفُوْا زَحْفًا قَلِیْلًا تُوْکَلُوْهُمْ الْاَذْبَارُ۔ وغیرہ آیات سابعہ اسی بیان میں آئی ہیں۔

اور غزوہ اُحد میں جبکہ چند مسلمانوں کو لغزش ہوئی کہ گھاٹی کی حفاظت چھوڑ کر نیچے آگئے تو اُس کی مصیبت صرف غلطی کرنے والوں پر نہیں بلکہ پورے مسلم لشکر پر پڑی یہاں تک کہ خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معرکہ میں زخم آیا۔

دوسری آیت میں بھی احکام الہیہ کی اطاعت کو آسان کرنے اور اُس پر ترغیب دینے کے لئے مسلمانوں کو ان کی پچھلی خستہ حالی اور ضعف و کمزوری پھر اُس کے بعد اپنے فضل و انعام سے حالات بدل کر اُن کو قوت اور اطمینان عطا فرمانے کا ذکر ہے۔ ارشاد فرمایا

وَ اِذْ کُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ یَّتَخَفَکُمْ النَّاسُ فَاَذِکُمْ وَاَیْدُکُمْ بِنَصْرِیْ وَ زَرْقُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔

یعنی اے مسلمانو اپنے اُس حال کو یاد کرو جو قبیل، ہجرت مکہ معظمہ میں تھا کہ تعداد میں بھی کم تھے اور قوت میں بھی ہر وقت یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ دشمن اُن کو نوچ کھسوٹ لیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو مدینہ میں بہترین ٹھکانا عطا فرمایا۔ اور نہ صرف ٹھکانا بلکہ اپنی تائید و نصرت سے اُن کو قوت اور دشمنوں پر فتح اور اموال عظیمہ عطا فرمادیئے۔ آخر آیت میں فرمایا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ یعنی تمہارے حالات کی اس کایا پلٹ اور انعاماتِ الہیہ کا مقصد یہ ہے کہ تم شکر گزار بندے بنو۔ اور ظاہر ہے کہ شکر گزاری اُس کے احکام کی اطاعت میں منحصر ہے۔

تیسری آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں یا آپس میں بندوں کے حقوق میں خیانت نہ کریں کہ حق ادا ہی نہ کریں یا اُس میں کوئی اور کوتاہی کر کے ادا کریں۔ آخر آیت میں وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ فرما کر یہ بتلا دیا کہ تم تو خیانت کی بُرائی اور اُس کے وبال کو جانتے ہی ہو پھر اُس پر اقدام کرنا قرینِ دانشمندی نہیں اور چونکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے غفلت و کوتاہی کا سبب عموماً انسان کے اموال و اولاد ہوا کرتے ہیں اس لئے اس پر تنبیہ کرنے کے لئے فرمایا وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ أَجْرُ عَظِيمٍ۔ یعنی یہ بات سمجھ رکھو کہ تمہارے مال و اولاد تمہارے لئے فتنہ ہیں۔

فتنہ کے معنی امتحان کے بھی آتے ہیں اور عذاب کے بھی اور ایسی چیزوں کو بھی فتنہ کہا جاتا ہے جو عذاب کا سبب بنیں۔ قرآن کریم کی مختلف آیتوں میں ان تینوں معنی کے لئے لفظ فتنہ استعمال ہوا ہے۔ یہاں تینوں معنی کی گنجائش ہے بعض اوقات مال و اولاد خود بھی انسان کے لئے دنیا ہی میں وبال جان بن جاتے ہیں اور ان کے سبب غفلت و معصیت میں مبتلا ہو کر سببِ عذاب بن جانا تو بالکل ظاہر ہے۔ اول یہ کہ مال و اولاد کے ذریعہ تمہارا امتحان لینا مقصود ہے کہ یہ چیزیں ہمارے انعامات ہیں۔ تم انعام لے کر شکر گزار اور اطاعت شعار بنتے ہو یا ناشکرے اور نافرمان۔ دوسرے اور تیسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مال اور اولاد کی محبت میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا تو یہی مال و اولاد تمہارے لئے عذاب بن جائیں گے۔ بعض اوقات تو دنیا ہی میں یہ چیزیں انسان کو سخت مصیبتوں میں مبتلا کر دیتی ہیں اور دنیا ہی میں مال و اولاد کو وہ عذاب محسوس کرنے لگتے ہیں ورنہ یہ تو لازمی ہے کہ دنیا میں جو مال اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف کمایا گیا یا خرچ کیا گیا وہ مال ہی آخرت میں اس کے لئے سانپ بچھو اور آگ میں داغ دینے کا ذریعہ بن جائے گا۔ جیسا کہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں اور بے شمار روایات حدیث میں اس کی تصریحات موجود ہیں۔ اور تیسرے معنی یہ کہ یہ چیزیں سببِ عذاب بن جائیں یہ تو ظاہر ہی ہے کہ جب یہ چیزیں اللہ تعالیٰ سے غفلت اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کا سبب بنیں تو عذاب کا سبب بن گئیں۔ آخر آیت میں فرمایا وَأَنَّ اللَّهَ

عِنْدَكَ أَجْرٌ عَظِيمٌ۔ یعنی یہ بھی سمجھ لو کہ جو شخص اللہ اور رسول کے احکام کی تعمیل میں مال و اولاد کی محبت سے مغلوب نہ ہو اُس کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔

اس آیت کا مضمون تو سب مسلمانوں کو عام اور شامل ہے مگر واقعہ اس کے نزول کا اکثر مفسرین کے نزدیک حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے جو غزوہ بنو قریظہ میں پیش آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے بنو قریظہ کے قلعہ کا اکیس روز تک محاصرہ جاری رکھا جس سے عاجز ہو کر انہوں نے وطن چھوڑ کر ملک شام چلے جانے کی درخواست کی آپ نے ان کی شرارتوں کے پیش نظر اس کو قبول نہیں فرمایا بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ صلح کی صرف یہ صورت ہے کہ سعد بن معاذ تمہارے بارہ میں جو کچھ فیصلہ کریں اُس پر راضی ہو جاؤ۔ انہوں نے درخواست کی کہ سعد بن معاذ کے بجائے ابولبابہ کو یہ کام سپرد کرو یا جائے۔ کیونکہ حضرت ابولبابہؓ کے اہل و عیال اور جائداد بنو قریظہ میں تھے، اُن سے یہ خیال تھا کہ وہ ہمارے معاملہ میں رعایت کریں گے۔ آپ نے ان کی درخواست پر حضرت ابولبابہ کو بھیج دیا۔ بنو قریظہ کے سب مرد و زن ان کے گرد جمع ہو کر رونے لگے اور یہ پوچھا کہ اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اتر آئیں تو کیا ہمارے معاملہ میں وہ کچھ نرمی فرمائیں گے۔ ابولبابہؓ کو معلوم تھا کہ ان کے معاملہ میں نرمی برتنے کی رائے نہیں ہے۔ انہوں نے کچھ ان لوگوں کی گریہ و زاری سے اور کچھ اپنے اہل و عیال کی محبت سے متاثر ہو کر اپنے گلے پر تلوار کی طرح ہاتھ پھیر کر اشارہ سے بتلادیا کہ ذبح کئے جاؤ گے۔ گویا اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راز فاش کر دیا۔

مال و اولاد کی محبت میں یہ کام کر تو گزرے۔ مگر فوراً تنبیہ ہوا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت کی۔ جب وہاں سے واپس ہوئے تو اس درجہ ندامت سوار ہوئی کہ آپ کی خدمت میں لوٹنے کے بجائے سیدھے مسجد میں پہنچے اور مسجد کے ایک ستون کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ دیا اور قسم کھائی کہ جب تک میری توبہ قبول نہ ہوگی اسی طرح بندھا رہوں گا چاہے اسی حالت میں موت آجائے۔ چنانچہ سات روز مکمل اسی طرح بندھے کھڑے رہے ان کی بیوی اور لڑکی نگہداشت کرتی تھیں، انسانی ضرورت کے وقت اور نماز کے وقت کھول دیتی اور فارغ ہونے کے بعد پھر باندھ دیتی تھیں، کھانے پینے کے پاس نہ جاتے تھے یہاں تک کہ غشی طاری ہو جاتی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اول اس کی اطلاع ملی تو فرمایا کہ اگر وہ اول ہی میرے پاس آجاتے تو میں ان کے لئے استغفار کرتا اور توبہ قبول ہو جاتی اب جب کہ وہ یہ کام کر گزرے تو اب قبولیت توبہ نازل ہونے کا انتظار ہی کرنا ہے۔

چنانچہ سات روز کے بعد آخر شب میں آپ پر یہ آیتیں ان کی توبہ قبول ہونے کے متعلق نازل ہوئیں بعض حضرات نے ان کو خوشخبری سنائی اور کھولنا چاہا مگر انہوں نے کہا کہ جب تک خود

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھے نہ کھولیں گے میں کھلنا پسند نہ کروں گا۔ چنانچہ جب آپ صبح کی نماز کے وقت مسجد میں تشریف لائے تو اپنے دست مبارک سے ان کو کھولا۔ آیت مذکورہ میں جو خیانت کرنے اور مال و اولاد کی محبت سے مغلوب ہونے کی ممانعت کا ذکر آیا ہے اُس کا اصل سبب یہ واقعہ ہے۔ واللہ اعلم۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ

اے ایمان والو اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو کر دے گا تم میں فیصلہ اور دور کر دے گا

عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝۱۹ وَإِذَا

تم سے تمہارے گناہ اور تم کو بخش دے گا، اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔ اور جب

يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ

مشرک کرتے تھے کافر کہ تجھ کو قید کر دیں یا مار ڈالیں یا نکال دیں،

وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَكْرِيْنَ ۝۲۰ وَإِذَا تُتْلَىٰ

اور وہ بھی داؤ کرتے تھے اور اللہ بھی داؤ کرتا تھا، اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے۔ اور جب کوئی پڑھے

عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَذَا إِنْ

اُن پر ہماری آیتیں تو کہیں ہم سن چکے اگر ہم چاہیں تو ہم بھی کہیں ایسا یہ تو

هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝۲۱ وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا

کچھ بھی نہیں مگر احوال ہیں اگلوں کے۔ اور جب وہ کہنے لگے کہ یا اللہ اگر یہی دین

هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ

حق ہے تیری طرف سے تو ہم پر برسا دے پتھر آسمان سے

أَوْ آتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝۲۲ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ

یا لاہم پر کوئی عذاب دردناک۔ اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرتا اُن پر جب تک تو رہتا ان میں،

وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۝۲۳

اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرے گا اُن پر جب تک وہ معافی مانگتے رہیں گے۔

خلاصہ تفسیر

(اور) اے ایمان والو! اطاعت کی اور برکات ستوفہ یہ کہ اگر تم اللہ سے ڈر (کرا طاعت

کرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک فیصلہ کی چیز دے گا (اس میں ہدایت اور نور قلب جس سے حق و باطل میں علمی فیصلہ ہوتا ہے اور غلبہ علی الاعداد اور نجات آخرت جس سے حق و باطل میں عملی فیصلہ ہوتا ہے سب آگیا) اور تم سے تمہارے گناہ دور کر دے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے (خدا جانے اپنے فضل سے اور کیا کیا دے دے جو قیاس و گمان میں بھی نہ آتا ہو) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے سامنے تذکیر نعمت کے لئے) اس واقعہ کا بھی ذکر کیجئے جب کہ کافر لوگ آپ کی نسبت (بڑی بڑی) تدبیریں سوچ رہے تھے کہ (آیا) آپ کو قید کر لیں یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا آپ کو خارج وطن کر دیں اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر (ان تدبیروں کے دفع کرنے کے لئے) کر رہے تھے اور سب سے زیادہ مستحکم تدبیر والا اللہ ہے (جس کے سامنے ان کی ساری تدبیریں گاؤں خورد ہو گئیں اور آپ بال بال محفوظ رہے اور صحیح سالم مدینہ آپہنچے۔ چونکہ آپ کا اس طرح بچ رہنا مؤمنین کے حق میں بے انتہا ابواب سعادت کی مفتاح ہے اس لئے اس واقعہ کے ذکر کا حکم فرمایا) اور (ان کفار کی یہ حالت ہے کہ) جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سن (کر دیکھ) لیا (یہ تو کوئی معجزہ نہیں کیونکہ) اگر ہم ارادہ کریں تو اس کی برابر ہم بھی کہہ لائیں (پس) یہ (قرآن) تو (کلام الہی و معجزہ وغیرہ) کچھ بھی نہیں صرف بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے منقول چلی آرہی ہیں (کہ پہلے اہل مل بھی یہی دعویٰ توحید و بعثت وغیرہ کے کرتے آئے ہیں انہی کے مضامین آپ نقل کر رہے ہیں) اور (اس سے بڑھ کر قابل ذکر وہ حالت ہے) جب کہ ان لوگوں نے (اپنے اس جہل مرکب میں غایت صلابت و جلالت ظاہر کرنے کو یہ بھی) کہا کہ اے اللہ اگر یہ قرآن آپ کی طرف سے واقعی ہے تو ہم پر (اس کے نہ ماننے کی وجہ سے) آسمان سے پتھر برسائے یا ہم پر کوئی (اور) دردناک عذاب واقع کر دیجئے (جو کہ خارق عادت ہونے میں مثل بارش سنگ کے ہو اور جب ایسے عذاب واقع نہ ہوئے تو اپنی حقانیت پر ناز کرتے ہیں) اور (یہ نہیں سمجھتے کہ باوجود ان کے بطلان کے خاص موانع کی وجہ سے یہ عقوبات مذکورہ نازل نہیں ہوتیں ان موانع کا بیان یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ ایسا نہ کریں گے کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے ان کو (ایسا) عذاب دیں اور (نیز) اللہ تعالیٰ ان کو (ایسا) عذاب نہ دیں گے جس حالت میں کہ وہ استغفار بھی کرتے رہتے ہیں (گو وہ آخرت میں بوجہ ایمان نہ ہونے کے نافع نہ ہو لیکن آخر عمل صالح ہے دنیا میں تو کفار کو نافع ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ ان عقوبات خارقہ سے دوام موانع ہیں ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف رکھنا مکہ میں یا دنیا میں۔ اور دوسرا ان لوگوں کا اپنے طواف وغیرہ میں یہ کہنا غفرانک جو کہ بعد ہجرت و بعد وفات بھی باقی تھا اور ایک مائع حدیثوں میں ہے کہ حضور کی امت میں کسی کا ہونا گو امت دعوت ہی ہو یہ مائع باوجود کسی کے استغفار نہ کرنے کے

بھی باقی ہے پس یہ امور فی نفسہ مانع ہوئے گوا حیاناً مانع کے ہوتے ہوئے بھی کوئی عذاب خارق کسی عارضی مصلحت سے واقع ہو جائے جیسا کذب و سخ وغیرہ کا قرب قیامت میں ہونا حدیثوں میں وارد ہے۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں اس کا ذکر تھا کہ انسان کے لئے مال اور اولاد ایک فتنہ یعنی آزمائش کی چیز ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کی محبت میں مغلوب ہو کر انسان عموماً خدا تعالیٰ اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے حالانکہ اس عظیم نعمت کا عقلی تقاضا یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کی وجہ سے اُس کی طرف اور زیادہ جھکتا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت اُسی مضمون کی تکمیل ہے اس میں فرمایا ہے کہ جو شخص عقل کو طبیعت پر غالب رکھ کر اس آزمائش میں ثابت قدم رہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و محبت کو سب چیزوں پر مقدم رکھے جس کو قرآن و شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کہا جاتا ہے تو اُس کو اس کے صلہ میں تین چیزیں عطا ہوتی ہیں فرقان، کفارۃ سیئات، مغفرت۔

فرقان اور فرق دونوں مصدر ایک ہی معنی کے ہیں۔ محاورات میں فرقان اُس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو دو چیزوں میں واضح طور پر فرق اور فصل کر دے۔ اسی لئے فیصلہ کو فرقان کہتے ہیں کیونکہ وہ حق اور ناحق میں فرق واضح کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کو بھی فرقان کہا جاتا ہے کیونکہ اُس کے ذریعہ اہل حق کو فتح اور اُن کے مخالف کو شکست ہو کر حق و باطل کا فرق واضح ہو جاتا ہے قرآن کریم میں اسی معنی کے لئے غزوۂ بدر کو یوم الفرقان کے نام سے موسوم کیا ہے۔

اس آیت میں تقویٰ اختیار کرنے والوں کو فرقان عطا ہونے کا اکثر مفسرین صحابہ کے نزدیک یہی مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد اور حفاظت اُن کے ساتھ ہوتی ہے کوئی دشمن اُن کو گزند نہیں پہنچا سکتا اور تمام مقاصد میں کامیابی اُن کی رفیق ہوتی ہے۔

ہر کہ ترسید از حق و تقوای گزید ترسدا زوے جن و انس و ہر کہ دید
تفسیر مہائمی میں ہے کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کچھلے واقعہ میں حضرت ابولبابہؓ سے جو اپنے اہل و عیال کی حفاظت کی خاطر لغزش ہو گئی تھی وہ اس لئے بھی خطا تھی کہ اہل و عیال کی حفاظت کا بھی صحیح راستہ یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت کو اپنا شعار بنایا جاتا تو سب مال و اولاد اللہ تعالیٰ کی پناہ اور حفاظت میں آجاتے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ فرقان سے مراد اس آیت میں وہ عقل و بصیرت ہے جس کے ذریعہ حق و باطل،

کمرے کھوٹے میں امتیاز کرنا سہل ہو جائے تو معنی یہ ہوئے کہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ایسی بصیرت اور فراست عطا فرما دیتے ہیں کہ اُن کو اچھے بُرے میں فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

دوسری چیز جو تقویٰ کے صلہ میں عطا ہوتی ہے وہ کفارۃ سنیات ہے یعنی جو خطائیں اور لغزشیں اُس سے سرزد ہوتی ہیں دنیا میں ان کا کفارہ اور بدل کر دیا جاتا ہے یعنی اُس کو ایسے اعمالی صالحہ کی توفیق ہو جاتی ہے جو اُس کی سب لغزشوں پر غالب آجاتے ہیں۔ تیسری چیز جو تقویٰ کے صلہ میں ملتی ہے وہ آخرت کی مغفرت اور سب گناہوں بخطاؤں کی معافی ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ یعنی اللہ تعالیٰ بڑے فضل و احسان والے ہیں۔ اس میں اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ عمل کی جزاء تو عمل کے پیمانہ پر ہوتی ہے۔ یہاں بھی تقویٰ کی جو جزاء خیرتین چیزوں میں مذکور ہے وہ تو جزاء اور بدلہ کے طور پر ہے مگر اللہ تعالیٰ بڑے فضل و احسان والے ہیں اُن کی داد و دہش کسی پیمانہ کے ساتھ مقید نہیں اور اُن کے احسان و انعام کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا اس لئے تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام سے ان تین چیزوں کے علاوہ بھی بہت بڑی امیدیں رکھنا چاہئے۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کے ایک خاص انعام و احسان کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام پر بلکہ پوری دنیا پر ہوا ہے۔ کہ قبل از ہجرت جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے زغم میں تھے اور وہ آپ کے قید یا قتل کرنے کے مشورے کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سلامت و عافیت مدینہ طیبہ پہنچا دیا۔

جس کا واقعہ تفسیر ابن کثیر اور مظہری میں بروایت محمد بن اسحاق و امام احمد و ابن جریر وغیرہ یہ نقل کیا گیا ہے کہ جب مدینہ طیبہ سے آنے والے انصار کا مسلمان ہو جانا مکہ میں مشہور ہوا تو قریش مکہ کو یہ فکر دامنگیر ہو گئی کہ اب تک تو ان کا معاملہ صرف مکہ میں دائر تھا جہاں ہر طرح کی قوت ہمارے ہاتھ میں ہے اور اب جب کہ مدینہ میں اسلام پھیلنے لگا اور بہت سے صحابہ کرام ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچ گئے تو اب ان کا ایک مرکز مدینہ طیبہ قائم ہو گیا جہاں یہ ہر طرح کی قوت ہمارے خلاف جمع کر سکتے ہیں اور پھر ہم پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ اور ان کو یہ بھی احساس ہو گیا کہ اب تک تو کچھ صحابہ کرام ہی ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے ہیں اب یہ بھی قوی امکان ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی وہاں چلے جائیں اس لئے رؤساء مکہ نے مشورہ کے لئے دارالندوہ میں ایک خاص مجلس طلب کی۔ دارالندوہ مسجد حرام کے متصل قصی بن کلاب کا مکان تھا جس کو ان لوگوں نے قومی مسائل میں مشورہ اور مجلس کرنے کے لئے مخصوص کر رکھا تھا اور زمانہ اسلام میں اُس کو مسجد حرام میں داخل کر لیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ باب الزیادات ہی وہ جگہ تھی جس کو دارالندوہ کہا جاتا تھا۔

حسبِ عادت اس مہم مشورہ کے لئے قریشی سرداروں کا اجتماع دارالندوہ میں ہوا جس میں ابو جہل، تضر بن حارث، عقبہ، شیبہ، امیر بن خلف، ابوسفیان وغیرہ قریش کے تمام نمایاں اشخاص شامل ہوئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کے مقابلہ کی تدبیریں زیرِ غور آئیں۔

ابھی مشورہ کی مجلس شروع ہی ہوئی تھی کہ ابلیس لعین ایک سن رسیدہ عربی شیخ کی صورت میں دارالندوہ کے دروازہ پر اکھڑا ہوا۔ لوگوں نے پوچھا کہ تم کون ہو کیوں آئے ہو۔ بتلایا کہ میں نجد کا باشندہ ہوں مجھے معلوم ہوا کہ آپ لوگ ایک اہم مشورہ کر رہے ہیں تو قومی ہمدردی کے پیش نظر میں بھی حاضر ہو گیا کہ ممکن ہے میں کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔

یہ سن کر اس کو اندر بلا لیا گیا اور مشورہ شروع ہوا تو سہیلی کی روایت کے مطابق ابوالخثریٰ ابن ہشام نے یہ مشورہ پیش کیا کہ ان کو یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آہنی زنجیروں میں قید کر کے مکان کا دروازہ بند کر دیا جائے اور چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ معاذ اللہ وہ آپ اپنی موت مر جائیں۔ یہ سن کر شیخ نجدی ابلیس لعین نے کہا کہ یہ رائے صحیح نہیں۔ کیونکہ اگر تم نے ایسا کیا تو معاملہ چھپے گا نہیں بلکہ اس کی شہرت دور دور پہنچ جائے گی اور ان کے صحابہ اور رفقاء کے فدائیانہ کارنامے تمہارے سامنے ہیں بہت ممکن ہے کہ یہ لوگ جمع ہو کر تم پر حملہ کر دیں اور اپنے قیدی کو تم سے چھڑالیں۔ سب طرف سے آوازیں اٹھیں کہ شیخ نجدی کی بات صحیح ہے اس کے بعد ابوالاسود نے یہ رائے پیش کی کہ ان کو مکہ سے نکال دیا جائے یہ باہر جا کر جو چاہیں کرتے رہیں ہمارا شہر ان کے فساد سے مآمون ہو جائے گا۔ اور ہمیں کچھ جنگ و جدال بھی کرنا نہ پڑے گا۔

شیخ نجدی یہ سن کر پھر بولا کہ یہ رائے بھی صحیح نہیں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کیسے شیریں کلام آدمی ہیں لوگ اُن کا کلام سن کر مفتون اور مسحور ہو جاتے ہیں۔ اگر اُن کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا تو بہت جلد اپنی طاقتور جماعت بنالیں گے اور تم پر حملہ کر کے شکست دے دیں گے۔ اب ابو جہل بولا کہ جو کرنے کا کام ہے تم میں سے کسی نے نہیں سمجھا۔ میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے وہ یہ کہ ہم عرب کے سب قبیلوں میں سے ہر قبیلہ کا ایک نوجوان لے لیں اور ہر ایک کو عمدہ کام کرنے والی تلوار دے دیں۔ یہ سب لوگ یکبارگی اُن پر حملہ کر کے قتل کر دیں۔ ہم ان کے فساد سے تو اس طرح نجات حاصل کر لیں۔ اب رہا اُن کے قبیلہ بنو عبد مناف کا مطالبہ جو ان کے قتل کا سبب ہم پر عائد ہوگا سو ایسی صورت میں جب کہ قتل کسی ایک نے نہیں بلکہ ہر قبیلہ کے ایک ایک شخص نے کیا ہے تو قصاص یعنی جان کے بدلے جان لینے کا مطالبہ تو باقی نہیں رہ سکتا۔ صرف خونبہا یا دیت کے مال کا مطالبہ رہ جائے گا وہ ہم سب قبیلوں سے جمع کر کے اُن کو دے دیں گے اور بے فکر ہو جائیں گے۔

شیخ نجدی ابلیس لعین نے یہ سن کر کہا کہ بس رائے یہی ہے اور اس کے سوا کوئی چیز کا رگر نہیں۔ پوری مجلس نے اسی کے حق میں رائے دے دی اور آج ہی رات میں اپنا یہ ناپاک عزم پورا کرنے کا تہیہ کر لیا گیا۔

مگر انبیاء علیہم السلام کی غیبی طاقت کو یہ جاہل کیا سمجھ سکتے تھے۔ اس طرف جبرئیل امین نے ان کے دار المشورہ کی ساری کیفیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو باخبر کر کے یہ تدبیر بتلائی کہ آج رات میں آپ اپنے بسترے پر آرام نہ کریں اور بتلایا کہ اب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکہ سے ہجرت کرنے کی اجازت دے دی ہے۔

ادھر مشورہ کے مطابق شام ہی سے قریشی نوجوانوں نے سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کو حکم دیا کہ آج کی رات وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بسترے پر آرام کریں اور یہ خوشخبری سنادی کہ اگرچہ بظاہر اس میں آپ کی جان کا خطرہ ہے مگر دشمن آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

حضرت علی مرتضیٰ نے اس کام کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا اور آپ کے بستر پر لیٹ گئے مگر اب مشکل یہ درپیش تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس محاصرہ سے کیسے نکلیں۔ اس مشکل کو اللہ تعالیٰ نے ایک معجزہ کے ذریعہ حل کیا وہ یہ کہ بامراہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ٹٹھی میں مٹی بھر کر باہر شریف لائے اور محاصرہ کرنے والے جو کچھ آپ کے بارہ میں گفتگو کر رہے تھے اُس کا جواب دیا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی نظروں اور فکروں کو آپ کی طرف سے پھیر دیا کہ کسی نے آپ کو نہ دیکھا حالانکہ آپ ان میں سے ہر ایک کے سر پر خاک ڈالتے ہوئے نکلے چلے گئے۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد کسی آنے والے نے ان لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کیوں کھڑے ہو تو انہوں نے بتلایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انتظار میں۔ اس نے کہا کہ تم کس خام خیالی میں ہو وہ تو یہاں سے نکل کر جا بھی چکے ہیں اور تم میں سے ہر ایک کے سر پر خاک ڈالتے ہوئے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے سروں پر ہاتھ رکھا تو اس کی تصدیق ہوئی کہ ہر ایک کے سر پر مٹی پڑی ہوئی تھی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ آپ کے بستر پر لیٹے ہوئے تھے مگر محاصرہ کرنے والوں نے ان کے کروٹیں بدلنے سے پہچان لیا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں اس لئے قتل پر اقدام نہیں کیا۔ صبح تک محاصرہ کرنے کے بعد یہ لوگ خائب و خاموش ہو کر واپس ہو گئے۔ یہ رات اور اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خاص فضائل میں سے ہے۔ قریشی سرداروں کے مشورہ میں جوتین رائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیش کی گئی تھیں اُن تینوں کو قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر فرمایا ہے **وَإِذْ يَمْكُورُ بِكِ الذِّينَ كَفَرُوا**

لِيُغَيِّبُ تُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ - یعنی وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جب کہ کفار آپ کے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کریں یا قتل کر دیں یا شہر بدر کر دیں۔

مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی سب تدبیریں خاک میں ملا دیں۔ اسی لئے آخر آیت میں فرمایا وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَكْرِيئِينَ - یعنی اللہ تعالیٰ بہتر تدبیر کرنے والے ہیں۔ جو ساری تدبیروں پر غالب آجاتی ہے جیسا کہ اس واقعہ میں مشاہدہ ہوا۔

لفظ مکر کے معنی عربی لغت میں یہ ہیں کہ کسی حیلہ و تدبیر کے ذریعہ اپنے مقابل شخص کو اُس کے ارادہ سے روک دیا جائے۔ پھر اگر یہ کام کسی نیک مقصد سے کیا جائے تو یہ مکر محمود اور اچھا ہے اور کسی بُرے مقصد سے کیا جائے تو مذموم اور بُرا ہے اس لئے یہ لفظ انسان کے لئے بھی بولا جاسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے بھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کے لئے صرف ایسے ماحول میں استعمال ہوتا ہے جہاں کلام کے سیاق اور تقابل کے ذریعہ مکر مذموم کا شبہ نہ ہو سکے (منظہری) جیسے یہاں ہے۔

اس جگہ یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ آخر آیت میں جو الفاظ ارشاد فرمائے وہ بصیغہ مضارع ہیں جو حال و استقبال کے معنی پر دلالت کرتا ہے ارشاد فرمایا وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ یعنی وہ اہل ایمان کی ایذا رسانی کی تدبیریں کرتے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی تدبیروں کے ناکام کرنے کی تدبیر کرتے رہیں گے اس میں اشارہ ہے کہ کفار کا یہ دائمی شعار رہے گا کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کریں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد بھی ہمیشہ ہی سچے مسلمانوں سے ان کی تدبیروں کو دفع کرتی رہے گی۔

اکتیسویں اور تیسویں آیتوں میں اسی دارالندوہ کے ایک شریکِ نصر بن حارث کی ایک بے ہودہ گفتگو اور تیسویں آیت میں اُس کا جواب مذکور ہے۔ نصر بن حارث چونکہ تجارت پیشہ آدمی تھا مختلف ملکوں کے سفروں میں یہود و نصاریٰ کی کتابیں اور اُن کی عبادتیں دیکھنے کا بار بار اتفاق ہوتا تھا اس لئے جب اس نے قرآن کریم میں پچھلی امتوں کے حالات سنے تو کہنے لگا کہ قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَذَا اِنَّ هَذَا اَرَا اِلَّا اَسَاطِيرُ الْاَوَّلِينَ - یعنی یہ باتیں تو ہماری سنی ہوئی ہیں اگر ہم چاہیں تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں یہ تو پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ اور جب بعض صحابہ نے اُس کو لاجواب کیا کہ اگر تم ایسا کلام کہہ سکتے ہو تو پھر کہتے کیوں نہیں جب کہ قرآن نے حق و باطل کا فیصلہ اس پر رکھ دیا ہے اور پوری دنیا کو یہ چیلنج دیا ہے کہ اگر خلاف کرنے والے سچے ہیں تو قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت ہی کی مثال پیش کریں۔ اور خلافت میں مردِ صحر کی بازی لگانے والے مال و اولاد قربان کرنے والے سب مل کر بھی ایک چھوٹی سی سورت قرآن کے مقابلہ میں پیش نہ کر سکے تو اب یہ کہنا کہ ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا کلام کہہ سکتے ہیں ایک ایسی بات ہے جو کوئی غیرت مند آدمی نہیں کہہ سکتا۔ پھر جب نصر بن حارث سے

صحابہ کرامؓ نے اس کلام الہی کا حق ہونا بیان کیا تو اپنے غلط مذہب پر بختگی دکھلانے کے لئے کہنے لگا۔
 اللَّهُمَّ إِنَّكَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوْ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ۔
 یعنی اے اللہ اگر یہی قرآن آپ کی طرف سے حق ہے تو ہم پر پتھر برسا دیجئے یا کوئی دوسرا سخت عذاب
 نازل کر دیجئے۔

قرآن کریم نے خود اس کا جواب دیا۔ پہلے ارشاد فرمایا وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ
 یعنی اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کریں گے کہ آپ کے مکہ میں ہوتے ہوئے اُن پر عذاب نازل کریں۔ کیونکہ اول تو
 سب ہی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ حق تعالیٰ کا دستور یہ ہے کہ جس بستی میں وہ موجود ہوں اُس پر
 اُس وقت تک عذاب نازل نہیں فرماتے جب تک اپنے پیغمبروں کو وہاں سے نکال نہ لیں۔ جیسے
 حضرت ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے معاملہ میں مشاہدہ ہوا کہ جب تک
 یہ حضرات بستی میں رہے عذاب نہیں آیا جب وہاں سے نکال لئے گئے اُس وقت عذاب نازل ہوا۔
 خصوصاً سید الانبیاء جو رحمۃ للعالمین کا لقب دے کر بھیجے گئے ہیں آپ کے کسی بستی میں موجود ہوتے ہوئے
 اُن پر عذاب آنا آپ کی شان کے خلاف تھا۔

خلاصہ جواب کا یہ ہوا کہ تم تو قرآن اور اسلام کی مخالفت کی وجہ سے اسی کے مستحق ہو کہ تم پر
 پتھر برساتے جائیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں موجود ہونا اس سے مانع ہے۔ امام ابن جریرؒ
 نے فرمایا کہ آیت کا یہ حصہ اُس وقت نازل ہوا جب کہ آپ مکہ مکرمہ میں موجود تھے پھر ہجرت مدینہ
 کے بعد آیت کا دوسرا حصہ یہ نازل ہوا وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ
 اُن پر عذاب نازل کرنے والے نہیں جب کہ وہ استغفار کرتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ آپ کے مدینہ
 شریف چلے جانے کے بعد اگرچہ عذاب عام کا یہ مانع رفع ہو گیا کہ آپ وہاں موجود تھے مگر اس وقت
 بھی ایک مانع عذاب کا یہ موجود رہا کہ بہت سے ضعیف مسلمین جو ہجرت نہ کر سکتے تھے مکہ میں رہ
 گئے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہتے تھے۔ اُن کی خاطر سے اہل مکہ پر عذاب نازل نہیں
 کیا گیا۔

پھر جب یہ سب حضرات بھی ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچ گئے تو بعد کی آیت کا یہ جملہ نازل ہوا
 وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ
 اللہ تعالیٰ ان کو عذاب نہ دیں حالانکہ وہ لوگوں کو مسجد حرام میں عبادت کرنے سے روکتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اب مانع عذاب دونوں رفع ہو چکے، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہے
 اور نہ استغفار کرنے والے مسلمان مکہ میں باقی رہے تو اب عذاب آنے سے کوئی رکاوٹ باقی نہیں۔
 خصوصاً ان کے استحقاق عذاب میں خود مخالف اسلام ہونے کے علاوہ اس جرم کا بھی اضافہ ہو گیا کہ

یہ لوگ خود تو عبادت کے قابل نہ تھے اور جو مسلمان عبادت عمرہ و طواف کے لئے مسجد حرام میں جانا چاہیں اُن کو روکنے لگے تو اب ان کا استحقاق عذاب بالکل مکمل ہو گیا چنانچہ فتح مکہ کے ذریعہ ان پر عذاب نازل کیا گیا۔

مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکنے کا واقعہ غزوہ حدیبیہ میں پیش آیا تھا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ کے قصد سے تشریف لے گئے اور مشرکین مکہ نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا اور آپ کو اور سب صحابہ کرام کو اپنے احرام کھولنے اور واپس جانے پر مجبور کیا یہ واقعہ سلسلہ ہجری کا ہے اس کے دو سال بعد مشہد میں مکہ مکرمہ فتح ہو گیا، اس طرح ان پر مسلمانوں کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا۔

ابن جریر کی اس تفسیر کا مدار اس پر ہے کہ مانع عذاب آپ کا مکہ میں ہونا قرار دیا جائے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں وجود مانع عذاب ہے جب تک آپ دنیا میں تشریف فرما ہیں آپ کی قوم پر عذاب نہیں آسکتا۔ اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ آپ کا حال دوسرے انبیاء کی طرح نہیں کہ وہ خاص خاص مقامات یا قبائل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ جب وہاں سے نکل کر کسی دوسرے خطہ میں پہنچ گئے تو ان کی قوم پر عذاب آجاتا تھا۔ بخلاف سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کی نبوت و رسالت سارے عالم کے لئے اور قیامت تک کے لئے عام اور شامل ہے پوری دنیا آپ کا مقام بعثت اور دائرہ رسالت ہے اس لئے جب تک آپ دنیا کے کسی حصہ میں موجود ہیں آپ کی قوم پر عذاب نہیں آسکتا۔

اس تفسیر پر مطلب یہ ہوگا کہ اہل مکہ کے افعال کا تقاضا تو یہی تھا کہ ان پر پتھر برسائے جائیں مگر دو چیزیں اس عذاب سے مانع ہوئیں ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں تشریف فرما ہونا، دوسرے اہل مکہ کا استغفار کرنا کیونکہ یہ لوگ مشرک و کافر ہونے کے باوجود اپنے طواف وغیرہ میں غفرانک استغفار کیا کرتے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کیا کرتے تھے۔ ان کا یہ استغفار کفر و شرک کے ساتھ گو آخرت میں نافع نہ ہو مگر دنیا میں اُس کا بھی یہ نفع اُن کو مل گیا کہ دنیا میں عذاب سے بچ گئے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتے، کفار و مشرکین اگر کوئی نیک عمل کرتے ہیں تو اس کا بدلہ اُن کو اسی دنیا میں دے دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جو یہ ارشاد فرمایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو عذاب نہ دے حالانکہ یہ لوگ مسلمانوں کو مسجد حرام میں عبادت کرنے سے روکتے ہیں، اس کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ دنیا میں عذاب نہ ہونے سے یہ لوگ معزور اور مطمئن نہ ہو جائیں کہ ہم مجرم ہی نہیں یا ہم پر عذاب نہیں ہوگا۔ اگر دنیا میں نہ ہوا تو آخرت کے عذاب سے ان کی کسی طرح نجات نہیں۔ اس تفسیر پر مَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ سے عذاب میں عذاب آخرت مراد ہوگا۔

آیات مذکورہ سے چند فوائد حاصل ہوئے۔ اول یہ کہ جس بستی میں لوگ استغفار کرتے ہوں اللہ تعالیٰ کا دستور یہ ہے کہ اُس پر عذاب نازل نہیں کرتے۔

دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے آپ کی امت پر خواہ مسلم ہوں یا کافر عذاب نہیں آئے گا اور مراد اس سے یہ ہے کہ عذاب عام جس سے پوری قوم تباہ ہو جائے ایسا عذاب نہیں آئے گا جیسے قوم نوح، قوم لوط، قوم شعیب وغیرہ کے ساتھ پیش آیا کہ اُن کا نام و نشان مٹ گیا۔ افراد و احاد پر کوئی عذاب آجائے وہ اس کے منافی نہیں جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں خسف اور مسخ کا عذاب آئے گا۔ خسف کے معنی زمین میں اتر جانا اور مسخ کے معنی صورت مسخ ہو کر بندریا سُور وغیرہ جانوروں کی شکل میں تبدیل ہو جانا۔ اس کی مراد یہی ہے کہ بعض بعض افراد امت پر ایسے عذاب بھی آئیں گے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں ہونا قیامت تک باقی رہے گا کیونکہ آپ کی رسالت قیامت تک کے لئے ہے۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بھی زندہ ہیں گو اُس زندگی کی صورت سابق زندگی سے مختلف ہے اور یہ بحث لغو اور فضول ہے کہ ان دونوں زندگیوں میں فرق کیا ہے کیونکہ نہ اس پر امت کا کوئی دینی یا دنیوی کام موقوف ہے نہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے ایسی فضول اور بے ضرورت بحثوں کو پسند فرمایا بلکہ منع فرمایا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے روضہ میں زندہ ہونا اور آپ کی رسالت کا قیامت تک قائم رہنا اس کی دلیل ہے کہ آپ قیامت تک دنیا میں ہیں اس لئے یہ امت قیامت تک عذاب عام سے مأمون رہے گی۔

وَمَا لَهُمْ آلَا يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

اور ان میں کیا بات ہے کہ عذاب نہ کرے اُن پر اللہ اور وہ تو روکتے ہیں مسجد حرام سے

وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۚ إِنَّ أَوْلِيَاءَهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَكِنْ أَكْثَرُهُمْ

اور وہ اس کے اختیار والے نہیں، اس کے اختیار والے تو وہی ہیں جو پرہیزگار ہیں لیکن ان میں اکثروں کو

لَا يَعْلَمُونَ ۚ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَ

اس کی خبر نہیں۔ اور اُن کی نماز نہیں تھی کعبہ کے پاس مگر سیٹیاں بجا جانی اور

تَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ

تالیان، سو چکھو عذاب بدلہ اپنے کفر کا۔ بیشک جو لوگ

كَفَرُوا وَيُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدَّوْا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ فَسَيُنْفِقُونَهَا

کافر ہیں وہ خرچ کرتے ہیں اپنے مال تاکہ روکیں اللہ کی راہ سے، سو ابھی اور خرچ کریں گے

ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ

پھر آخر ہوگا وہ اُن پر افسوس اور آخر مغلوب ہوں گے، اور جو کافر ہیں وہ دوزخ کی طرف

يُحْشَرُونَ ﴿۳۷﴾ لِيُبَيِّنَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ

ہائے جائیں گے۔ تاکہ جدا کر دے اللہ ناپاک کو پاک سے اور رکھے ناپاک کو

بَعْضُهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلُهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ

ایک کو ایک پر پھر اُس کو ڈھیر کر دے اکٹھا پھر ڈال دے اُس کو دوزخ میں، وہی لوگ

هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿۳۸﴾ قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَا

ہیں نقصان میں۔ تو کہہ دے کافروں کو کہ اگر وہ باز آجائیں تو معاف ہو اُن کو جو کچھ

قَدْ سَلَفَ ۚ وَإِنْ يَعُودُوا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْأَوَّلِينَ ﴿۳۹﴾

ہو چکا، اور اگر پھر بھی وہی کریں گے تو پڑ چکی ہے راہ اگلوں کی۔

خلاصہ تفسیر

اور (ان موانع کے سبب عذاب خارق نازل نہ ہونے سے بالکل ہی عذاب سے مطمئن نہ ہو جائیں کیونکہ جس طرح امور مذکورہ مانع عذاب ہیں اسی طرح ان کی حرکتیں مقتضی عذاب بھی ہیں پس مانع کا اثر عذاب خارق میں ظاہر ہوا اور مقتضی کا اثر نفس عذاب میں ظاہر ہوگا کہ عذاب غیر خارق ان پر نازل ہوگا چنانچہ اس مقتضی کا بیان فرماتے ہیں کہ) ان کا کیا استحقاق ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ (بالکل ہی معمولی) سزا (بھی) نہ دے حالانکہ (ان کی یہ حرکتیں مقتضی سزا کی ہیں مثلاً) وہ لوگ (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو) مسجد حرام (میں جانے اور اس میں نماز پڑھنے اور اس میں طواف کرنے) سے روکتے ہیں (جیسا حدیبیہ میں حقیقتہً روکا جس کا قصہ سورہ بقرہ میں گزر چکا اور زمانہ قیام مکہ میں حکماً روکا کہ اس قدر تنگ کیا کہ ہجرت کی ضرورت ہوئی) حالانکہ وہ لوگ اس مسجد کے متولی (بننے کے بھی لائق) نہیں (اور عابدین کو روکنا تو درکنار رہا جس کا اختیار خود متولی کو بھی نہیں ہوتا) اس کے متولی (بننے کے لائق) تو سوا متقیوں کے (کہ وہ اہل ایمان ہیں) اور کوئی بھی اشخاص نہیں لیکن ان میں اکثر لوگ (اپنی نالائقی کا) علم نہیں رکھتے (خواہ علم ہی نہ ہو یا یہ کہ جب

اس علم پر عمل نہ کیا تو وہ مثل عدم علم کے ہے غرض جو سچ نمازی تھے ان کو تو مسجد سے اس طرح روکا اور (خود مسجد کا کیسا حق ادا کیا اور اس میں کیسی اچھی نماز پڑھی جس کا بیان یہ ہے کہ) ان کی نماز خانہ کعبہ (مذکور بعنوان مسجد حرام) کے پاس صرف یہ تھی سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا (یعنی بجائے نماز کے ان کی یہ نامعقول حرکتیں ہوتی تھیں) سو (ان حرکات کا ضرور مقتضایہ ہے کہ ان پر کوئی نہ کوئی عذاب گو وہ معمولی اور عادی ہونا نازل کر کے ان کو خطاب کیا جائے کہ لو) اس عذاب کا مزہ چکھو اپنے کفر کے سبب (جس کا ایک اثر وہ قول ہے **لَوْ نَشَاءُ لَمُوتُوا** اور ایک اثر وہ قول ہے **إِنْ كَانَتْ هَذِهِ أُمَّةً** اور ایک اثر وہ فعل ہے **يَصُدُّونَ** اور ایک اثر وہ فعل ہے **مُكَاءٌ وَتَصْدِيَةٌ** چنانچہ غزوات متعددہ میں یہ سزا واقع ہوئی جیسا کہ اس سورت کے رکوع دوم میں بھی ہے **ذَلِكُمْ قَدْ وَفَّوْا لَكُمْ** **بَعْدَ ذَلِكَ** **يَا نَهْمٌ شَاقُّوا** اللہ کے یہاں تک تو ان لوگوں کے اقوال و اعمال بدنیہ کا ذکر تھا آگے ان کے اعمال مالیہ کا بیان ہے کہ) بلا شک یہ کافر لوگ اپنے مالوں کو اس لئے خرچ کر رہے ہیں کہ اللہ کی راہ سے (یعنی دین سے لوگوں کو) روکیں (چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ اور مخالفت کے سامان جمع کرنے میں ظاہر ہے کہ جو خرچ ہوتا تھا اس میں یہی غرض تھی) سو یہ لوگ تو اپنے مالوں کو (اسی غرض کے لئے) خرچ کرتے ہی رہیں گے (مگر) پھر (آخر میں جب اتنا ناکامی کے محسوس ہوں گے) وہ مال ان کے حق میں باعث حسرت ہو جائیں گے (کہ خواہ مخواہ خرچ کیا اور) پھر (آخر) مغلوب (ہی) ہو جائیں گے (جس سے حسرت ضیاع اموال کا تھوڑی دوسری حسرت مغلوبیت کی جمع ہو جائے گی) اور (یہ سزا و حسرت و مغلوبیت تو ان کی دنیا میں ہے باقی آخرت کی سزا وہ الگ ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) کافر لوگوں کو دوزخ کی طرف (لے جانے کے لئے قیامت میں) جمع کیا جائے گا تاکہ اللہ تعالیٰ ناپاک (لوگوں) کو پاک (لوگوں) سے الگ کر دے (کیونکہ جب دوزخیوں کو دوزخ کی طرف لائیں گے ظاہر ہے کہ اہل جنت ان سے علیحدہ رہ جائیں گے) اور (ان سے الگ کر کے) ناپاکوں کو ایک دوسرے سے ملا دے یعنی ان سب کو متصل کر دے پھر (متصل کر کے) ان سب کو جہنم میں ڈال دے ایسے ہی لوگ پورے خسارہ میں ہیں (جس کا کہیں منتہی نہیں) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ (اپنے کفر سے) باز آجائیں گے (اور اسلام قبول کر لیں گے) تو ان کے سارے گناہ جو (اسلام سے) پہلے ہو چکے ہیں سب معاف کر دیئے جائیں گے (یہ حکم تو حالت اسلام کا ہوا) اور اگر اپنی وہی (کفر کی) عادت رکھیں گے تو (ان کو سزا دیجئے کہ) کفار سابقین کے حق میں (ہمارا) قانون نافذ ہو چکا ہے (کہ دنیا میں ہلاک اور آخرت میں عذاب وہی تمہارے لئے ہو گا چنانچہ قتل سے ہلاک بھی ہوئے اور غیر کفار عرب کا ہلاک ذمی ہونا بھی ہے تم جانو)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں یہ بتلایا گیا تھا کہ مشرکین مکہ اپنے کفر و انکار کی وجہ سے اگرچہ اس کے مستحق ہیں کہ ان پر آسمانی عذاب آجائے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں موجود ہونا عذاب عام آنے سے مانع ہے اور ہجرت کے بعد ان ضعیفہ مسلمین کی وجہ سے ایسا عذاب نہیں آتا جو مکہ میں رہ کر اللہ سے استغفار کرتے رہتے ہیں۔

مذکورہ آیتوں میں یہ بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ضعیفہ مسلمین کی رعایت سے اگر دنیا میں ان کا عذاب مل ہی گیا تو ان لوگوں کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ عذاب کے مستحق نہیں بلکہ ان کا استحقاق عذاب کھلا ہوا ہے اور علاوہ کفر و انکار کے اور بھی ان کے ایسے جرائم ہیں جن کی وجہ سے ان پر عذاب آجانا چاہئے۔ ان دونوں آیتوں میں ان کے تین جرم شمار کئے گئے ہیں۔

اول یہ کہ یہ لوگ خود تو مسجد حرام میں عبادت گزاری کے قابل ہی نہیں اور جو مسلمان وہاں عبادت نماز طواف وغیرہ ادا کرنا چاہتے ہیں ان کو آنے سے روک دیتے ہیں۔ اس میں واقعہ حدیبیہ کی طرف اشارہ ہے جب کہ سترہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لئے مکہ مکرمہ پہنچے تھے اور مشرکین مکہ نے آپ کو روک کر واپس جانے پر مجبور کیا تھا۔

دوسرا جرم یہ فرمایا کہ یہ بے وقوف یوں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ہم مسجد حرام کے متولی ہیں جس کو چاہیں اس میں آنے کی اجازت دیں جس کو چاہیں نہ دیں۔

ان کا یہ خیال دو غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا اول یہ کہ اپنے آپ کو مسجد حرام کا متولی سمجھا حالانکہ کوئی کافر کسی مسجد کا متولی نہیں ہو سکتا دوسرے یہ کہ متولی کو یہ حق ہے کہ جس کو چاہے مسجد میں آنے سے روک دے جب کہ مسجد خانہ خدا ہے اُس میں آنے سے روکنے کا کسی کو حق نہیں بجز ایسی خاص صورتوں کے جن میں مسجد کی بے حرمتی یا دوسرے نمازیوں کی تکلیف کا اندیشہ ہو۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی مسجدوں کو بچاؤ چھوٹے بچوں سے، اور پاگل آدمیوں سے اور باہمی جھگڑوں سے چھوٹے بچوں سے مراد وہ بچے ہیں جن سے ناپاکی کا خطرہ ہے اور پاگل سے ناپاکی کا بھی خطرہ ہے اور نمازیوں کی ایذاء کا بھی۔ اور باہمی جھگڑوں سے مسجد کی بے حرمتی بھی اور نمازیوں کی ایذاء بھی۔

اس حدیث کی رو سے متولی مسجد کے لئے یہ تو حق ہے کہ ایسے چھوٹے بچوں، پاگلوں کو مسجد میں نہ آنے دے اور باہمی جھگڑے مسجد میں نہ ہونے دے لیکن بغیر ایسی صورتوں کے کسی مسلمان کو مسجد سے روکنے کا کسی متولی مسجد کو حق نہیں۔

قرآن کریم کی آیت متذکرہ میں صرف پہلی بات بیان کرنے پر اکتفاء کیا کہ ان لوگوں کو مسجد حرام کا متولی کیسے مانا جائے۔ جب کہ اصول یہ ہے کہ اُس کے متولی صرف متقی مسلمان ہی ہو سکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسجد کا متولی مسلمان دیندار پرہیزگار ہونا چاہئے اور بعض حضرات مفسرین نے اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجح قرار دے کر یہ معنی لکھے ہیں کہ اللہ کے ولی صرف متقی پرہیزگار لوگ ہو سکتے ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق آیت سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو لوگ شریعت و سنت کے خلاف عمل کرنے کے باوجود ولی اللہ ہونے کا دعویٰ کریں وہ جھوٹے ہیں اور جو ایسے لوگوں کو ولی اللہ سمجھیں وہ دھوکے میں ہیں۔ تیسرا جرم ان لوگوں کا یہ بتلایا کہ کفر و شرک کی گزندگی تو تھی ہی ان کے افعال و اعمال تو عام انسانی سطح سے بھی گرے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے جس فعل کا نام نماز رکھتے ہیں وہ بجز اس کے نہیں کہ اُس میں کچھ منہ سے سیٹیاں بجائیں کچھ ہاتھوں سے تالیاں اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو ذرا بھی عقل ہو وہ ان افعال کو عبادت و نماز کیا کوئی صحیح انسانی فعل بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے آخر آیت میں ارشاد فرمایا فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ یعنی تمہارے کفر اور جرائم کا انجام یہی ہے کہ اب اللہ کا عذاب چکھو۔ عذاب سے اس جگہ عذاب آخرت بھی مراد ہو سکتا ہے اور عذاب دنیا بھی جو غزوہ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں ان پر نازل ہوا۔

اس کے بعد چھتیسویں آیت میں کفار مکہ کے ایک اور واقعہ کا بیان ہے جس میں انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف قوت جمع کرنے کے لئے مالِ عظیم جمع کیا اور پھر اُس کو دینِ حق اور مسلمانوں کے مٹانے کے لئے خرچ کیا۔ مگر انجام کار یہ ہوا کہ وہ مال بھی ہاتھ سے گیا اور مقصد حاصل ہونے کے بجائے خود ذلیل و خوار ہوئے۔

واقعہ اس کا بروایت محمد بن اسحاق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ منقول ہے کہ غزوہ بدر کے شکست زدہ زخم خوردہ بچے کچھ کفار مکہ جب وہاں سے واپس مکہ پہنچے تو جن لوگوں کے باپ بیٹے اس جہاد میں مارے گئے تھے وہ تجارتی قافلہ کے امیر ابوسفیان کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ جنگ تمہارے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے لڑی گئی جس کے نتیجہ میں یہ تمام جانی اور مالی نقصانات اٹھانے پڑے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس مشترک تجارتی کمپنی سے ہماری کچھ مدد کی جائے تاکہ ہم آئندہ مسلمانوں سے اپنا انتقام لے سکیں۔ ان لوگوں نے اس کو منظور کر کے ایک بڑی رقم دے دی جس کو انہوں نے غزوہ بدر کا انتقام لینے کے لئے غزوہ اُحد میں خرچ کیا اور اُس میں بھی انجام کار مغلوب ہوئے اور شکست کے غم کے ساتھ مال ضائع کرنے کی حسرت مزید ہو گئی۔

قرآن کریم نے اس آیت میں یہ واقعہ پیش آنے سے پہلے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے

انجام کی خبر دے دی۔ ارشاد فرمایا : وہ لوگ جو کافر ہیں اپنے مالوں کو اس کام کے لئے خرچ کرنا چاہتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کے دین سے روک دیں۔ سو اس کا انجام یہ ہوگا کہ یہ اپنا مال بھی خرچ کر ڈالیں گے اور پھر ان کو مال خرچ کرنے پر حسرت ہوگی، اور انجام کار مغلوب ہو جائیں گے۔ چنانچہ غزوہ اُحد میں ٹھیک یہی صورت ہوئی کہ جمع شدہ مال بھی خرچ کر ڈالا۔ اور پھر مغلوب ہوئے تو شکست کے غم کے ساتھ مال ضائع ہونے پر الگ حسرت و ندامت ہوئی۔

اور بغوی وغیرہ بعض مفسرین نے اس آیت کے مضمون کو خود غزوہ بدر کے اخراجات پر محمول فرمایا ہے کہ غزوہ بدر میں ایک ہزار جوانوں کا جو لشکر مسلمانوں کے مقابلہ پر گیا تھا ان کے کھانے پینے وغیرہ کے کل اخراجات مکہ کے بارہ سرداروں نے اپنے ذمہ لئے تھے جن میں ابو جہل۔ عقبہ۔ شیبہ وغیرہ شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک ہزار آدمیوں کے آنے جانے کھانے پینے وغیرہ کے اخراجات پر بڑی رقم خرچ ہوئی۔ تو ان لوگوں کو اپنی شکست کے ساتھ اپنے اموال ضائع ہونے پر بھی شدید حسرت و ندامت پیش آئی۔ (مظہری)

آخر آیت میں آخرت کے اعتبار سے ان لوگوں کے انجام بد کا بیان ہے وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُخْشَرُونَ۔ یعنی جو لوگ کافر ہیں اُن کا حشر جہنم کی طرف ہوگا۔

مذکورہ آیتوں میں دین حق سے روکنے کے لئے مال خرچ کرنے کا جو انجام بد ذکر کیا گیا ہے اُس میں آج کے وہ کفار بھی داخل ہیں جو لوگوں کو اسلام سے روکنے اور اپنے باطل کی طرف دعوت دینے پر لاکھوں روپیہ شفاخانوں، تعلیم گاہوں اور صدقہ خیرات کے عنوان سے خرچ کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ گمراہ لوگ بھی اس میں داخل ہیں جو اسلام کے اجماعی عقائد میں شبہات و اوہام پیدا کر کے اُن کے خلاف لوگوں کو دعوت دینے کے لئے اپنے اموال خرچ کرتے ہیں لیکن حق تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت فرماتے ہیں اور بہت سے مواقع میں مشاہدہ بھی ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ بڑے بڑے اموال خرچ کرنے کے باوجود اپنے مقصد میں ناکام رہتے ہیں۔

سینتیسویں آیت میں واقعات مذکورہ کے کچھ نتائج کا بیان ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے جو اموال کفار نے اسلام کے خلاف استعمال کئے اور پھر اُن کو حسرت و ندامت ہوئی اور ذلیل و خوار ہوئے اس کا فائدہ یہ ہے کہ

لِيُمَيِّزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ۔ یعنی تاکہ اللہ تعالیٰ گندی چیز اور پاک صاف چیز میں فرق ظاہر کر دیں۔ لفظ خبیث اور طیب دو متقابل لفظ ہیں۔ لفظ خبیث ناپاک، گندے اور حرام کے لئے بولا جاتا ہے اور طیب اس کے بالمقابل پاک، صاف، ستھرے اور حلال کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس جگہ ان دونوں لفظوں سے کفار کے اموال خبیثہ اور مسلمانوں کے اموال طیبہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں

مطلب یہ ہے کہ کفار نے جو مال عظیم خرچ کئے وہ مال خبیث اور ناپاک تھے اُس کا بُرا نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ مال بھی گیا اور جانیں بھی گئی اس کے بالمقابل مسلمانوں نے بہت تھوڑا مال خرچ کیا مگر وہ مال پاک اور حلال تھا۔ اُن کے خرچ کرنے والے کامیاب ہوئے اور مزید مال غنیمت بھی ملا تھا آیا اس کے بعد ارشاد فرمایا۔

وَيَجْعَلِ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَى
بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي
جَهَنَّمَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ
یعنی اللہ تعالیٰ جمع کر دیتا ہے ایک خبیث
کو دوسرے خبیث کے ساتھ پھر ان سب کو جمع
کر دے گا جہنم میں یہی لوگ خسارہ میں پڑنے والے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے کہہ رہا گھاس کو کھینچتا ہے اور نئی سائنس کے تجربات میں ساری دنیا کا نظام ہی باہمی کشش پر قائم ہے اسی طرح اعمال و اخلاق میں بھی کشش ہے۔ ایک بُرا عمل دوسرے بُرے عمل کو اور ایک اچھا عمل دوسرے اچھے عمل کو کھینچتا ہے مال خبیث دوسرے مال خبیث کو کھینچتا ہے اور یہ پھر اموال خبیثہ آتار خبیثہ پیدا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں جتنے اموال خبیثہ ہیں سب کو جہنم میں جمع فرمادیں گے۔ اور یہ مال فاسد بڑے خسارہ میں پڑ جائیں گے۔

اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس جگہ خبیث اور طیب کی مراد عام قرار دی ہے یعنی پاک اور ناپاک۔ پاک سے مؤمن اور ناپاک سے کافر مراد ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ حالات مذکورہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ پاک و ناپاک یعنی مؤمن و کافر میں امتیاز ہو جائے مؤمنین جنت میں اور کفار سب ایک جگہ جہنم میں جمع کر دیئے جائیں۔

اڑتیسویں آیت میں کفار کے لئے پھر ایک مربیانہ خطاب ہے جس میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی۔ ترغیب اس کی ہے کہ اگر وہ ان تمام افعال شنیعہ کے بعد اب بھی توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں تو پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور ترہیب یہ کہ اگر وہ اب بھی باز نہ آئے تو سمجھ لیں اُن کے لئے اللہ تعالیٰ کو کوئی نیا قانون بنانا یا سوچنا نہیں پڑتا۔ پہلے زمانہ کے کافروں کے لئے جو قانون جاری ہو چکا ہے وہ ہی اُن پر بھی جاری ہوگا کہ دنیا میں ہلاک و برباد ہوئے اور آخرت میں عذاب کی مستحق ہوئے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ

اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فساد اور ہو جائے حکم سب اللہ کا ،

فَإِنْ أَنْتَهُوَ فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝۱۹ وَإِنْ تَوَلَّوْا

پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ ان کے کام کو دیکھتا ہے۔ اور اگر وہ نہ مائیں

فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَوْلَاكُمْ نِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿۴۰﴾

تو جان لو کہ اللہ تمہارا حمایتی ہے، کیا خوب حمایتی ہے اور کیا خوب مددگار ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور (پھر ان کے اس کافر رہنے کی صورت میں اے مسلمانو!) تم ان (کفار عرب) سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فساد عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور (اللہ کا) دین (خالص) اللہ ہی کا ہو جائے (اور کسی کے دین کا خالصہ اللہ ہی کے لئے ہو جاتا موقوف ہے قبول اسلام پر۔ تو حاصل یہ ہوا کہ شرک چھوڑ کر اسلام اختیار کریں۔ خلاصہ یہ کہ اگر اسلام نہ لائیں تو ان سے لڑو جب تک اسلام نہ لائیں کیونکہ کفار عرب سے جزیہ نہیں لیا جاتا) پھر اگر یہ (کفر سے) باز آجائیں تو (ان کے ظاہری اسلام کو قبول کرو دل کا حال مت ٹٹو کیونکہ اگر یہ دل سے ایمان نہ لائیں گے تو) اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھتے ہیں (وہ آپ سمجھ لیں گے تم کو کیا) اور اگر (اسلام سے) روگردانی کریں تو (اللہ کا نام لے کر ان کے مقابلہ سے مت ہٹو اور) یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ (ان کے مقابلہ میں) تمہارا رفیق ہے وہ بہت اچھا رفیق ہے اور بہت اچھا مددگار ہے (سو وہ تمہاری رفاقت اور نصرت کرے گا)۔

معارف و مسائل

یہ سورۃ انفال کی انتالیسویں آیت ہے اس میں دو لفظ قابل غور ہیں ایک لفظ فتنہ دوسرا دین۔ یہ دونوں لفظ عربی لغت کے اعتبار سے کئی معنی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ائمہ تفسیر صحابہ و تابعین سے اس جگہ دو معنی منقول ہیں۔ ایک یہ کہ فتنہ سے مراد کفر و شرک اور دین سے مراد دین اسلام لیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ اس تفسیر پر معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ مسلمانوں کو کفار سے قتال اُس وقت تک جاری رکھنا چاہئے جب تک کہ کفر مٹ کر اُس کی جگہ اسلام آجائے اسلام کے سوا کوئی دین و مذہب باقی نہ رہے۔ اس صورت میں یہ حکم صرف اہل مکہ اور اہل عرب کے لئے مخصوص ہو گا۔ کیونکہ جزیرۃ العرب اسلام کا گھر ہے اس میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین رہے تو دین اسلام کے لئے خطرہ ہے۔ باقی ساری دنیا میں دوسرے ادیان و مذاہب کو قائم رکھا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات اور روایات حدیث اس پر شاہد ہیں۔

اور دوسری تفسیر جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ فتنہ سے مراد اس جگہ وہ ایذا اور عذاب و مصیبت ہے جس کا سلسلہ کفار مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر ہمیشہ جاری رہا تھا

جب تک وہ مکہ میں تھے تو ہر وقت ان کے زعم میں پھنسے ہوئے طرح طرح کی ایذا میں بہتے رہے پھر جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو ایک ایک مسلمان کا تعاقب کر کے قتل و غارتگری کرتے رہے مدینہ میں پہنچنے کے بعد بھی پورے مدینہ پر حملوں کی صورت میں ان کا غیظ و غضب ظاہر ہوتا رہا۔

اور اس کے بالمقابل دین کے معنی قہر و غلبہ کے ہیں اس صورت میں تفسیر آیت کی یہ ہو گئی کہ مسلمانوں کو کفار سے اُس وقت تک قتال کرتے رہنا چاہئے جب تک کہ مسلمان ان کے مظالم سے محفوظ نہ ہو جائیں اور دین اسلام کا غلبہ نہ ہو جائے کہ وہ غیروں کے مظالم سے مسلمانوں کی حفاظت کر سکے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ایک واقعہ سے بھی اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب امیر مکہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے مقابلہ میں حجاج بن یوسف نے فوج کشی کی اور دونوں طرف مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے مقابلہ پر چل رہی تھیں تو دو شخص حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ اس وقت جس بلاد میں مسلمان مبتلا ہیں آپ دیکھ رہے ہیں حالانکہ آپ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں جو کسی طرح ایسے فتنوں کو برداشت کرنے والے نہ تھے۔ کیا سبب ہے کہ آپ اس فتنہ کو رفع کرنے کے لئے میدان میں نہیں آتے۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کا خون بہانا حرام قرار دیا ہے۔ ان دونوں نے عرض کیا کہ کیا آپ قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھتے قَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ۔ یعنی مقاتلہ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ بیشک میں یہ آیت پڑھتا ہوں اور اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔ ہم نے اس آیت کے مطابق کفار سے قتال جاری رکھا یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو گیا اور غلبہ دین اسلام کا ہو گیا۔ اور تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ اب باہم قتال کر کے فتنہ پھر پیدا کر دو اور غلبہ غیر اللہ کا اور دین حق کے خلاف کا ہو جائے۔ مطلب یہ تھا کہ جہاد و قتال کا حکم فتنہ کفار و مظالم کفار کے مقابلہ میں تھا وہ ہم کر چکے اور برابر کرتے رہے یہاں تک کہ یہ فتنہ فرو ہو گیا۔ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کو اُس پر قیاس کرنا صحیح نہیں بلکہ مسلمانوں کے باہمی مقاتلہ کے وقت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات یہ ہیں کہ اس میں بیٹھا رہنے والا کھڑا ہونے والے سے بہتر ہے۔

خلاصہ اس تفسیر کا یہ ہے کہ مسلمانوں پر اعداء اسلام کے خلاف جہاد و قتال اُس وقت تک واجب ہے جب تک کہ مسلمانوں پر ان کے مظالم کا فتنہ ختم نہ ہو جائے اور اسلام کو سب اُدیان پر غلبہ حاصل نہ ہو جائے۔ اور یہ صورت صرف قرب قیامت میں ہوگی اس لئے جہاد کا حکم قیامت تک جاری اور باقی ہے۔

اعداء اسلام کے خلاف جہاد و قتال کے نتیجہ میں دو صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ مسلمانوں پر ظلم و جور سے باز آجائیں خواہ اس طرح کہ اسلامی برادری میں داخل ہو کر بھائی بن جائیں

یا اس طرح کہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے مسلمانوں پر ظلم و ستم سے باز آجائیں اور اطاعت کا معاہدہ کر لیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی کو قبول نہ کریں اور مقابلہ پر مجبے رہیں اگلی آیت میں ان دونوں صورتوں کے احکام مذکور ہیں۔ ارشاد فرمایا:

فَإِنْ اَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ اِلٰهَ بِمَآ
يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

یعنی اگر وہ باز آجائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھتے ہیں۔

اُس کے مطابق اُن کی ساتھ معاملہ فرمادیں گے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر وہ باز آجائیں تو ان کے خلاف جہاد کو بند کر دیا جائے۔ اس صورت میں مسلمانوں کو یہ خطرہ ہو سکتا تھا کہ معرکہ قتال کے بعد کفار کی طرف سے صلح کا معاہدہ یا مسلمان ہو جانے کا اظہار بہت ممکن ہے کہ محض کوئی جنگی چال اور دھوکہ ہو۔ ایسی صورت میں جنگ بند کر دینا مسلمانوں کے لئے مضر ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب ان الفاظ سے دیا گیا کہ مسلمان تو ظاہری اعمال کے پابند ہیں، دلوں کا دیکھنے والا اور اُن کے مخفی سرا رکھ جانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لئے جب وہ مسلمان ہونے کا اظہار کریں یا معاہدہ صلح کر لیں تو مسلمان اس پر مجبور ہیں کہ جہاد و قتال بند کر دیں۔ مگر یہ معاملہ کہ انھوں نے سچے دل سے اسلام یا صلح کو قبول کیا ہے یا اس میں دھوکہ ہے اس کو اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے جانتے ہیں اگر وہ ایسا کریں گے تو اُس کا دوسرا انتظام ہو جائے گا۔ مسلمانوں کو ان خیالات اور خطرات پر اپنے معاملات کی بنیاد نہیں رکھنا چاہئے۔ اگر اظہار اسلام یا معاہدہ صلح کے بعد اُن پر ہاتھ اٹھایا گیا تو جہاد کرنے والے مجرم ہو جائیں گے جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے کہ میں دشمنان اسلام سے قتال کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کو قبول کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور جب وہ ایسا کر لیں تو اُن کے خون اور اموال سب محفوظ ہو جائیں گے۔ بجز اس کے کہ اسلامی قانون کے ماتحت کسی جرم کی پاداش میں اُن کو سزا دی جائے۔ اور اُن کے دلوں کا حساب اللہ پر رہے گا کہ وہ سچے دل سے اس کلمہ اور اعمال اسلام کو قبول کر رہے ہیں یا نفاق سے۔

دوسری ایک حدیث جو ابو داؤد نے بہت سے صحابہ کرام کی روایت سے نقل کی ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی معاہدہ پر یعنی اُس شخص پر جس نے اسلامی حکومت کی اطاعت و وفاداری کا معاہدہ کر لیا ہو کوئی ظلم کرے یا اُس کو نقصان پہنچائے یا اُس سے کوئی ایسا کام لے جو اُس کی طاقت سے زائد ہے یا اُس کی کوئی چیز بغیر اس کی دلی رضامندی کے حاصل کرے تو میں قیامت کے دن اس مسلمان کے خلاف معاہدہ کی حمایت کروں گا۔

قرآن مجید کی آیت مذکورہ اور روایات حدیث نے بظاہر مسلمانوں کو ایک سیاسی خطرہ میں مبتلا

کر دیا کہ بڑے سے بڑا دشمن اسلام جب ان کی زد میں آجائے اور محض جان بچانے کے لئے کلمہ اسلام پڑھ لے تو مسلمانوں پر لازم کر دیا کہ فوراً اپنا ہاتھ روک لیں اس طرح تو وہ کسی دشمن پر بھی قابو نہیں پاسکتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے مخفی سرائر کو اپنے ذمہ لے کر معجزانہ انداز میں یہ کر دکھایا کہ عملی طور پر مسلمانوں کو کسی میدان جنگ میں ایسا ابتلاہ پیش نہیں آیا۔ البتہ صلح کی حالت میں سیکڑوں منافقین پیدا ہوئے جنہوں نے دھوکہ دینے کے لئے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا اور بظاہر نماز روزہ بھی ادا کرنے لگے۔ ان میں سے بعض کم ظرف لوگوں کا تو اتنا ہی مقصد تھا کہ مسلمانوں سے کچھ فوائد حاصل کر لیں اور دشمنی کرنے کے باوجود ان کے انتقام سے محفوظ رہیں۔ اور بعض وہ بھی تھے جو سیاسی مقصد لے کر مسلمانوں کے راز معلوم کرنے اور مخالفین سے سازش کرنے کے لئے ایسا کر رہے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے قانون نے ان سب کے بارہ میں مسلمانوں کو یہی ہدایت دی کہ وہ ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کریں جب تک خود اُن کی طرف سے اسلام دشمنی اور معاہدہ کی خلاف ورزی ثابت نہ ہو جائے۔

قرآن کی یہ تعلیم تو اُس صورت میں تھی جب کہ دشمنان اسلام اپنی دشمنی سے باز آجائے گا اقرار اور معاہدہ کر لیں۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنی ضد اور عناد پر قائم رہیں اُس کے متعلق حکم اس کے بعد کی آیت میں ارشاد فرمایا: **وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا إِلَهُكُمُ الْمَوْلَىٰ وَنَعْمُ النَّصِيرُ** یعنی اگر وہ بات نہ مانیں تو تم یہ سمجھ رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار حمایتی ہے اور وہ بہت اچھا حمایتی اور بہت اچھا مددگار ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر وہ اپنے ظلم و جور اور کفر و شرک سے باز نہ آئیں تو مسلمانوں کے ذمہ وہی حکم ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ اُن سے قتال جاری رکھیں۔ اور جہاد و قتال چونکہ بڑے لشکر اور بہت سے اسلحہ اور ساز و سامان پر عادیہ موقوف ہے اور مسلمانوں کو عام طور پر یہ چیزیں کم حاصل تھیں اس لئے یہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو حکم قتال بھاری معلوم ہو یا وہ اپنی قلت تعداد اور قلت سامان کی وجہ سے یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہم مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اس کا علاج اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں کو بتلایا گیا کہ اگرچہ تعداد اور سامان ان لوگوں کے پاس مسلمانوں سے زائد سہی مگر وہ اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت و حمایت کہاں سے لائیں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہے جس کو وہ ہر میدان میں اپنے ساتھ مشاہدہ کرتے رہے ہیں، اور فرمایا کہ یوں تو امداد و حمایت دنیا میں ہر فریق کسی نہ کسی سے حاصل کر ہی لیتا ہے مگر مدار کار اس مددگار کی قوت و طاقت اور علم و تجربہ پر ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاقت و قوت اور علم و بصیرت سے زیادہ کیا، برابر بھی سارے جہان کو حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ سب سے بہتر حمایتی اور مددگار ہے۔

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ

اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے سوائے اس کے واسطے ہے اس میں سے پانچواں حصہ

وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ

اور رسول کے واسطے اور اس کے قرابت والوں کے واسطے اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے

إِنْ كُنْتُمْ أَمْنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ

اگر تم کو یقین ہے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اتاری اپنے بندے پر فیصلہ کے دن

يَوْمَ التَّقَىٰ الْجَمْعِ وَاللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۴۱﴾

جس دن بھڑکیں دونوں فوجیں، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور اس بات کو جان لو کہ جو شے (کفار سے) بطور غنیمت کے تم کو حاصل ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ (اس کے کل پانچ حصے کئے جائیں جن میں سے چار حصے تو مقاتلین کا حق ہے اور ایک حصہ یعنی) اس کا پانچواں حصہ (پھر پانچ حصوں پر تقسیم ہو گا جن میں سے ایک تو) اللہ کا اور اس کے رسول کا ہے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے گا جن کو دینا بمنزلہ اس کے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کر دیا) اور (ایک حصہ) آپ کے قرابت داروں کا ہے اور (ایک حصہ) یتیموں کا ہے (ایک حصہ) غریبوں کا ہے اور (ایک حصہ) مسافروں کا ہے اگر تم اللہ پر یقین رکھتے ہو اور اس چیز پر (یقین رکھتے ہو) جس کو ہم نے اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر فیصلہ کے دن (یعنی) جس دن کہ (بدر میں) دونوں جماعتیں (مومنین اور کفار کی) باہم مقابل ہوئی تھیں نازل فرمایا تھا (مراد اس سے امداد غیبی بواسطہ ملائکہ کے ہے یعنی اگر ہم پر اور ہمارے الطاف غیبیہ پر یقین رکھتے ہو تو اس حکم کو جان رکھو اور عمل کرو یہ اس لئے بڑھا دیا کہ خمس نکالنا شاق نہ ہو اور یہ سمجھ لیں کہ یہ ساری غنیمت اللہ ہی کی امداد سے تو ہاتھ آئی پھر اگر ہم کو ایک خمس نہ ملا تو کیا ہوا وہ چار خمس بھی تو ہماری قدرت سے خارج تھے بلکہ محض قدرت الہیہ سے حاصل ہوئے) اور اللہ (ہی) ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں (پھر تمہارا استحقاق تو اتنا بھی نہیں تھا یہ بھی بہت مل گیا)۔

معارف و مسائل

اس آیت میں مالِ غنیمت کے احکام اور اس کی تقسیم کا قانون مذکور ہے۔ اس سے پہلے چند ضروری الفاظ کی تشریح سن لیجئے۔

لفظ غنیمت لغت میں اُس مال کے لئے بولا جاتا ہے جو دشمن سے حاصل کیا جائے۔ اصطلاح شریعت میں غیر مسلموں سے جو مال جنگ و قتال اور قہر و غلبہ کے ذریعہ حاصل ہو اُس کو غنیمت کہتے ہیں اور جو صلح و رضامندی سے حاصل ہو جیسے جزیہ و خراج وغیرہ اُس کو فِیئ کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں انھیں دونوں لفظوں سے ان دونوں قسموں کے احکام بتائے گئے ہیں۔ سورۃ انفال میں مالِ غنیمت کے احکام کا ذکر ہے جو جنگ و قتال کے وقت غیر مسلموں سے حاصل ہو۔

یہاں سب سے پہلے ایک بات پیش نظر رہنا چاہئے وہ یہ کہ اسلامی اور قرآنی نظریہ کے مطابق تمام کائنات کی اصلی ملکیت صرف اُس ذاتِ حق تعالیٰ کی ہے جس نے اُنھیں پیدا کیا ہے انسان کی طرف کسی چیز کی ملکیت کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کے ذریعہ کسی شخص کی ملکیت قرار دے دی ہو۔ جیسے سورۃ یسین میں چوپائے جانوروں کے ذکر میں ارشاد فرمایا اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَا اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مِلْكُوْنَ۔ یعنی کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ چوپاؤں کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا پھر لوگ اُن کے مالک بن گئے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی ملکیت ذاتی نہیں ہم نے اپنے فضل سے اُن کو مالک بنا دیا۔

جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ سے بغاوت کرتی ہے یعنی کفر و شرک میں مبتلا ہو جاتی ہے تو پہلے حق تعالیٰ ان کی اصلاح کے لئے اپنے رسول اور کتابیں بھیجتے ہیں جو بدبخت اس انعام الہی سے بھی متاثر نہیں ہوتے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو اُن کے مقابلہ میں جہاد و قتال کا حکم دے دیتے ہیں جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ان باغیوں کے جان و مال سب مباح کر دیئے گئے ان کو اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اموال سے نفع اٹھانے کا حق نہیں رہا۔ بلکہ ان کے اموال بحق سرکار ضبط ہو گئے۔ انھیں ضبط شدہ اموال کا دوسرا نام مالِ غنیمت ہے۔ جو کفار کی ملکیت سے نکل کر خالص حق تعالیٰ کی ملکیت میں رہ گئے۔

ان ضبط شدہ اموال کے لئے زمانہ قدیم سے حق تعالیٰ کا قانون یہ رہا ہے کہ ان سے کسی کو فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی بلکہ ایسے اموال کو جمع کر کے کسی کھلی جگہ میں رکھ دیا جاتا اور آسمان سے ایک بجلی آکر اُن کو جلا دیتی تھی۔ یہی علامت ہوتی تھی اس جہاد کے قبول ہونے کی۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جو چند خصوصیات حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئیں اُن میں ایک

یہ بھی ہے کہ مالِ غنیمت آپ کی اُمت کے لئے حلال کر دیا گیا۔ (کافی حدیث مسلم) اور حلال بھی ایسا کہ اُس کو اَطیب الاموال کہا جاتا ہے یعنی سب سے زیادہ پاک مال۔ وجہ یہ ہے کہ جو مال انسان اپنے کسب اور کمائی سے حاصل کرتا ہے اُس میں انسانوں کی ملکیت سے واسطہ در واسطہ منتقل ہو کر ایک مال اس کی ملکیت میں آتا ہے اور ان واسطوں میں حرام و ناجائز یا مکروہ طریقوں کا احتمال رہتا ہے بخلاف مالِ غنیمت کہ کفار کی ملکیت اُن سے ختم ہو کر براہِ راست حق تعالیٰ کی ملکیت رہ گئی اور اب جس کو ملتا ہے براہِ راست حق تعالیٰ کی ملکیت سے ملتا ہے جس میں کوئی مشبہ اور شائبہ حرمت یا کراہت کا نہیں رہتا جیسے گنویں سے نکالا ہوا پانی یا خود رو گھاس جو براہِ راست حق تعالیٰ کا انعام انسان کو ملتا ہے کوئی انسانی واسطہ درمیان میں نہیں ہوتا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مالِ غنیمت جو پچھلی امتوں کے لئے حلال نہیں تھا اُمتِ مرحومہ کے لئے بطورِ انعام حلال کر دیا گیا۔ آیت مذکورہ میں اُس کی تقسیم کا ضابطہ اس عنوان سے بیان فرمایا گیا ہے کہ **وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّن شَيْءٍ**۔ اس میں عربی لغت کے قاعدہ سے اول تو لفظ ما عموم پر دلالت کرتا ہے پھر اُس عموم کی تاکید مزید کے لئے لفظ **مِّن شَيْءٍ** بڑھایا گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ چھوٹی بڑی چیز مالِ غنیمت میں حاصل ہو وہ سب اسی قانون کے تحت داخل ہے کسی چیز کو معمولی یا چھوٹا سمجھ کر کوئی شخص قانون تقسیم کے علاوہ اگر لے لے گا تو وہ سخت مجرم قرار پائے گا۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک سوئی اور اُس کا دھاگہ بھی جو مالِ غنیمت کا جز ہو کسی کے لئے اُس کا بغیر اپنے حصہ شرعی کے لے لینا جائز نہیں۔ اور مالِ غنیمت میں سے کوئی چیز بغیر حصہ کے لینے کو حدیث میں غلول فرما کر اُس پر شدید وعید فرمائی ہے اور عام بھوری سے زیادہ شدید حرام قرار دیا ہے۔

ضابطہ تقسیم کا یہ عنوان دے کر تمام مجاہد مسلمانوں کو اس سے باخبر کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مال تمہارے لئے حلال کر دیا ہے مگر ایک خاص ضابطہ کے تحت حلال ہے اُس کے خلاف اگر کوئی لے گا تو وہ جہنم کا ایک انگارہ ہوگا۔

قرآنی قانون کا یہی وہ امتیاز ہے جو دنیا کے دوسرے قوانین کو حاصل نہیں اور یہی قانون قرآنی کی تاثیر کامل اور کامیابی کا اصلی راز ہے کہ اول خوفِ خدا و آخرت کو پیش نظر کر کے اُس سے ڈرایا گیا دوسرے نمبر پر تعزیری سزائیں بھی جاری کی گئیں۔

ورنہ غور کا مقام ہے کہ عین میدانِ جنگ کی افراتفری کے وقت جو اموال غیر مسلموں کے قبضہ سے حاصل کئے جائیں جن کی تفصیل نہ پہلے سے مسلمانوں کے امیر کے علم میں ہے نہ کسی دوسرے کے۔ اور موقع میدانِ جنگ کا ہے جو عموماً جنگل اور صحراء ہوتے ہیں جن میں پھینے چھپانے کے ہزاروں

مواقع ہوتے ہیں۔ نرے قانون کے زور سے ان اموال کی حفاظت کسی کے بس میں نہیں، صرف خوفِ خدا و آخرت ہی وہ چیز تھی جس نے ایک ایک مسلمان کو ان اموال میں ادنیٰ تصرف کرنے سے باز رکھا۔ اب اس ضابطہ تقسیم کو دیکھئے ارشاد فرمایا فَاتَّ بِاللهِ حُمُسَهُ وَ لِلرَّسُولِ وَ لِلَّذِي الْقُرْبَانِ وَ الْيَتْمٰی وَ الْمَسْكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ - یعنی مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اس کے رشتہ داروں کا اور یتیموں، مسکینوں، مسافروں کا ہے۔

یہاں پہلے تو یہ بات غور طلب ہے کہ ضابطہ پورے مالِ غنیمت کی تقسیم کا بیان ہو رہا ہے مگر قرآن نے صرف اس کے پانچویں حصے کی تقسیم کا ضابطہ یہاں ذکر فرمایا باقی چار حصوں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ اس میں کیا راز ہے اور باقی چار حصوں کی تقسیم کا کیا قانون ہے۔ لیکن قرآن میں غور و تدبر کرنے سے ان دونوں باتوں کا جواب انہیں لفظوں میں یہ نکل آتا ہے کہ قرآن کریم نے جہاد کرنے والے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا مَا غَنِمْتُمْ یعنی جو کچھ تم نے غنیمت میں حاصل کیا۔ اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ مال ان حاصل کرنے والوں کا حق ہے اور اس کے بعد جب یہ ارشاد فرما دیا کہ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ اور رسول وغیرہ کا ہے تو اس کا نتیجہ صاف یہ نکل آیا کہ باقی چار حصے غائبین اور مجاہدین کے ہیں۔ جیسے قرآن کریم کے قانون وراثت میں ایک جگہ ارشاد ہے وَ وَرِثَتْهُ اَبْوَاكُ فَلِلْاُمِّهِ الثَّلَاثُ - یعنی جب کسی شخص کے وارث اُس کے ماں باپ ہوں تو ماں کا تیسرا حصہ ہے۔ یہاں بھی صرف ماں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ باقی دو حصے باپ کا حق ہیں۔ اسی طرح مَا غَنِمْتُمْ کے بعد جب صرف پانچویں حصہ کو اللہ کے لئے رکھا گیا تو معلوم ہوا کہ باقی چار حصے مجاہدین کا حق ہیں۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور عمل نے اس کو اور اس کی پوری تفصیلات کو واضح کر دیا کہ یہ چار حصے مجاہدین میں ایک خاص قانون کے تحت تقسیم فرمائے۔

اب اُس پانچویں حصہ کی تفصیل سنئے جس کو قرآن کریم نے اس آیت میں متعین فرما دیا ہے الفاظِ قرآنی میں اس جگہ چھ الفاظ مذکور ہیں لِلّٰهِ - لِلرَّسُولِ - لِلَّذِي الْقُرْبَانِ - الْيَتْمٰی - الْمَسْكِيْنِ - ابْنِ السَّبِيْلِ۔

اس میں لفظِ لِلّٰهِ تو ایک جلی عنوان ہے اُن مصارف کا جن میں یہ پانچواں حصہ تقسیم ہوگا یعنی یہ سب مصارف خالص اللہ کے لئے ہیں۔ اور اس لفظ کے اس جگہ لانے میں ایک خاص حکمت ہے جس کی طرف تفسیر مظہری میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کے لئے صدقات کا مال حرام قرار دیا گیا ہے کہ وہ آپ کے شایانِ شان نہیں کیونکہ عام لوگوں کے اموال کو پاک کرنے کے لئے ان میں سے نکالا ہوا حصہ ہے جس کو حدیث میں اَوْسَاخِ النَّاسِ

فرمایا ہے یعنی لوگوں کا میل کچیل۔ وہ شان نبوت کے لائق نہیں۔

مال غنیمت کے پانچویں حصہ میں سے چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو بھی قرآن کی اس آیت نے حصہ دیا ہے اس لئے اس پر متنبہ کیا گیا کہ یہ حصہ لوگوں کی ملکیت سے منتقل ہو کر نہیں آیا بلکہ بلا واسطہ اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ مال غنیمت کفار کی ملک سے نکل کر براہ راست حق تعالیٰ کی خالص ملکیت ہو جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور انعام تقسیم ہوتا ہے۔ اس لئے اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ذوی القربیٰ کو جو حصہ مال غنیمت کے خمس سے دیا گیا ہے وہ لوگوں کے صدقات کا نہیں بلکہ براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے فضل و انعام ہے۔ شروع آیت میں فرمایا گیا اللہ یعنی یہ سب مال اصل میں خالص ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے، اُسی کے فرمان کے مطابق مذکورہ مصارف میں خرچ کیا جائے گا۔

اس لئے اس خمس کے اصلی مصارف پانچ رہ گئے رسول۔ ذوی القربیٰ۔ یتیم۔ مسکین۔ مسافر۔ پھر ان میں استحقاق کے درجے مختلف ہیں۔ قرآن کریم کی بلاغت دیکھئے کہ ان درجات استحقاق کا فرق کس باریک اور لطیف انداز سے ظاہر فرمایا گیا ہے کہ ان پانچ میں سے پہلے دو پر حرف لام لایا گیا لِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ۔ اور باقی تین قسموں کو بغیر حرف لام کے باہم معطوف بنا کر ذکر کر دیا گیا۔ حرف لام عربی زبان میں کسی خصوصیت کے اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ اللہ میں حرف لام اختصاص ملکیت کے بیان کے لئے ہے کہ اصل مالک سب چیزوں کا اللہ تعالیٰ ہے اور لفظ للرسول میں استحقاق کی خصوصیت کا بیان مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خمس غنیمت کے صرف کرنے اور تقسیم کرنے کا حق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا جس کا حاصل امام طحاوی کی تحقیق اور تفسیر مظہری کی تقریر کے مطابق یہ ہے کہ اگرچہ اس جگہ خمس کے مصارف میں پانچ ناموں کا ذکر ہے لیکن درحقیقت اس میں پورا تصرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ اپنی صوابدید کے مطابق ان پانچ قسموں میں خمس غنیمت کو صرف فرمائیں جیسا کہ سورۃ انفال کی پہلی آیت میں پورے مال غنیمت کا حکم یہی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صوابدید کے مطابق جہاں چاہیں صرف فرمائیں جس کو چاہیں دیں۔ آیت وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ نے کل مال غنیمت کے پانچ حصے کر کے چار کو مجاہدین کا حق قرار دے دیا مگر پانچواں حصہ بدستور اُسی حکم میں رہا کہ اس کا صرف کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑا گیا صرف اتنی بات کا اضافہ ہوا کہ اس پانچویں حصے کے پانچ مصارف بیان کر دیئے گئے کہ یہ ان میں دائر رہے گا۔ مگر جمہور ائمہ اہل تحقیق کے نزدیک آپ کے ذمہ یہ لازم نہیں تھا کہ اس خمس کے پانچ حصے برابر کریں اور مندرجہ آیت پانچوں قسموں میں برابر تقسیم کریں بلکہ صرف

اتنا ضروری تھا کہ خمس غنیمت کو انھیں پانچ قسموں کے اندر سب کو یا بعض کو اپنی صوابدید کے مطابق عطا فرمائیں۔

اس کی سب سے بڑی واضح دلیل خود اس آیت کے الفاظ اور ان میں بیان کی ہوئی مصارف کی قسمیں ہیں کہ یہ سب قسمیں عملاً الگ الگ نہیں بلکہ باہم مشترک بھی ہو سکتی ہیں مثلاً جو شخص ذوی القربیٰ میں داخل ہے وہ یتیم بھی ہو سکتا ہے مسکین اور مسافر بھی۔ اسی طرح مسکین اور مسافر یتیم بھی ہو سکتے ہیں ذوی القربیٰ بھی، جو مسکین ہے وہ مسافر کی فہرست میں بھی آ سکتا ہے اگر ان سب قسموں میں الگ الگ برابر تقسیم کرنا مقصود ہوتا تو یہ قسمیں ایسی ہونا چاہئے تھیں کہ ایک قسم کا آدمی دوسری قسم میں داخل نہ ہو۔ ورنہ پھر یہ لازم آئیگا کہ جو ذوی القربیٰ میں سے ہے اور وہ یتیم بھی ہے مسکین بھی مسافر بھی تو اس کو ہر حیثیت سے ایک ایک حصہ ملا کر چار حصے دیئے جائیں جیسا کہ تقسیم فرائض و میراث کا یہی قاعدہ ہے کہ ایک شخص کو میت کے ساتھ مختلف قسم کی قرابتیں حاصل ہیں تو ہر قرابت کا حصہ اس کو الگ ملتا ہے اور امت میں اس کا کوئی قائل نہیں کہ ایک شخص کو چار حصے دیئے جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقصود اس آیت کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پابندی عائد کرنا نہیں ہے کہ ان سب قسموں کو ضروری دیں اور برابر دیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ خمس غنیمت کا مال ان پانچ قسموں میں سے جس قسم پر جتنا خرچ کرنا آپ کی رائے میں مناسب ہو اُتار دے دیں (تفسیر مظہری)۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب اس خمس میں سے ایک خادم کا سوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور گھر کے کاموں میں اپنی محنت و مشقت اور کمزوری کا سبب بھی ظاہر کیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عذر فرما کر ان کو دینے سے انکار کر دیا کہ میرے سامنے تمھاری ضرورت سے زیادہ اہل صفہ صحابہ کرام کی ضرورت ہے جو انتہائی فقر و افلاس میں مبتلا ہیں ان کو چھوڑ کر میں تمھیں نہیں دے سکتا۔ (صحیح بخاری و مسلم)

اس سے واضح ہو گیا کہ ہر ایک قسم کا الگ حق نہیں تھا ورنہ ذوی القربیٰ کے حق میں فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے کون مقدم ہوتا۔ بلکہ یہ سب بیان مصارف ہے بیان استحقاق نہیں۔

تقسیم خمس بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھا گیا وہ آپ کے منصب نبوت و رسالت کی بنا پر ایسا ہی تھا جیسے آپ کو خصوصی طور پر یہ بھی حق دیا گیا تھا کہ پورے مال غنیمت

میں آپ اپنے لئے کوئی چیز انتخاب کر کے لے لیں جس کی وجہ سے بعض غنیمتوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اشیاء لی بھی تھیں۔ اور خمس غنیمت میں سے آپ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا نفقہ ادا فرماتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد یہ حصہ خود بخود ختم ہو گیا کیونکہ آپ کے بعد کوئی رسول و نبی نہیں۔

خمس ذوی القربیٰ

اس میں تو کسی کا اختلاف نہیں کہ فقراء ذوی القربیٰ کا حق خمس غنیمت میں دوسرے مصارف یعنی یتیم، مسکین، مسافر سے مقدم ہے۔ کیونکہ فقراء ذوی القربیٰ کی امداد زکوٰۃ و صدقات سے نہیں ہو سکتی دوسرے مصارف زکوٰۃ و صدقات سے بھی ہو سکتے ہیں (کما صرح بہ فی الہدایہ و یقدمون) البتہ اغنیاء ذوی القربیٰ کو

اس میں سے دیا جائے گا یا نہیں۔ اس میں امام اعظم ابو حنیفہؒ کا فرمانا یہ ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جو ذوی القربیٰ کو عطا فرماتے تھے تو اُس کی دو بنیادیں تھیں ایک اُن کی حاجتمندی اور فقر دوسرے اقامت دین اور دفاع عن الاسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و امداد۔ دوسرا سبب تو وفات نبوی کے ساتھ ختم ہو گیا صرف پہلا سبب فقر و حاجتمندی رہ گیا اُس کی بنا پر تا قیامت ہر امام و امیر اُن کو دوسروں سے مقدم رکھے گا (ہدایہ۔ جصاص)۔ امام شافعیؒ سے بھی یہی قول منقول ہے (قرطبی)

اور بعض فقہاء کے نزدیک سہم ذوی القربیٰ بحیثیت قرابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کے لئے باقی ہے جس میں اغنیاء اور فقراء سب شریک ہیں البتہ امیر وقت اپنی صوابدید کے مطابق اُن کو حصہ دے گا۔ (مظہری)

اور اصل چیز اس معاملہ میں خلفاء راشدین کا تعامل ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کیا کیا۔ صاحب ہدایہ نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

ان الخلفاء الاربعة الراشدین چاروں خلفاء راشدین نے آنحضرت صلی اللہ
قسموه علی ثلثہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خمس غنیمت کو صرف
تین قسموں میں تقسیم فرمایا ہے یتیم، مسکین، فقیر۔

البتہ حضرت فاروق اعظمؓ سے ثابت ہے کہ فقراء ذوی القربیٰ کو خمس غنیمت سے دیا کرتے تھے (آخرہ ابو داؤد) اور ظاہر ہے کہ یہ تخصیص صرف فاروق اعظمؓ کی نہیں دوسرے خلفاء کا بھی یہی عمل ہوگا۔

اور جن روایات سے یہ ثابت ہے کہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ اپنے آخری زمانہ خلافت تک ذوی القربیٰ کا حق نکالتے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اُس کا متولی بنا کر ذوی القربیٰ میں تقسیم کراتے تھے (کافی روایت کتاب الخراج لابن یوسف) تو یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ وہ تقسیم فقراء ذوی القربیٰ کے لئے مخصوص ہو۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

ذوی القربیٰ کی تعیین خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس طرح فرمادی

فائدہ

کہ بنو ہاشم تو آپ کا اپنا قبیلہ ہی تھا بنو المطلب کو بھی ان کے ساتھ اس لئے شامل

فرمایا تھا کہ یہ لوگ بھی جاہلیت و اسلام میں کبھی بنو ہاشم سے الگ نہیں ہوئے یہاں تک کہ قریش مکہ نے جب غذائی مقاطعہ بنو ہاشم کا کیا اور ان کو شعب ابی طالب میں بند کر دیا تو بنو المطلب کو اگرچہ قریش نے مقاطعہ میں داخل نہیں کیا تھا مگر یہ لوگ اپنی رضامندی سے مقاطعہ میں شریک ہو گئے (مظہری) غزوہ بدر کے دن کو
 آیت مذکورہ میں بدر کے دن کو یوم الفرقان فرمایا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ سب سے پہلے مادی اور ظاہری طور پر مسلمانوں کی واضح فتح اور کفار کی عبرتناک شکست اس دن میں ہونے کی بنا پر کھنرو اسلام کا ظاہری فیصلہ بھی اس دن ہو گیا۔

إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى وَالرَّكْبُ

جس وقت تم تھے درلے کنارہ پر اور وہ پرلے کنارہ پر اور قافلہ

أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَا خْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ وَلَكِنْ

نیچے آگیا تھا تم سے ، اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے تو نہ پہنچتے وعدہ پر ایک ساتھ لیکن

لَيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ

اللہ کو کر ڈالنا تھا ایک کام کو جو مقرر ہو چکا تھا ، تاکہ مے جس کو مرنے سے قیام حجت

بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٢﴾

کے بعد اور جیوے جس کو جینا ہے قیام حجت کے بعد، اور بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

إِذْ يُرِيكُهُمُ اللَّهُ فِي مَنَايِكَ قَلِيلًا وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا

جب اللہ نے وہ کافر دکھائے تجھ کو تیری خواب میں تھوڑے ، اور اگر تجھ کو بہت دکھلا دیتا

تَفَشَلْتُمْ وَلِتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ إِنَّهُ عَلِيمٌ

تو تم لوگ نامردی کرتے اور جھگڑا ڈالتے کام میں لیکن اللہ نے بجایا ، اس کو خوب معلوم ہے

بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٢٣﴾ وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ التَّقَيْتُمْ فِي

جوبات ہے دلوں میں ۔ اور جب تم کو دکھلائی وہ فوج مقابلہ کے وقت تمہاری

أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ

آنکھوں میں تھوڑی اور تم کو تھوڑا دکھلایا ان کی آنکھوں میں تاکہ کر ڈالے اللہ ایک کام جو مقرر

مَفْعُولًا وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٢٤﴾

ہو چکا تھا ، اور اللہ تک پہنچتا ہے ہر کام ۔

خلاصہ تفسیر

یہ وہ وقت تھا کہ جب تم اس میدان کے ادھر والے کنارہ پر تھے اور وہ لوگ (یعنی کفار) اُس میدان کے ادھر والے کنارہ پر تھے (ادھر والے سے مراد مدینہ سے نزدیک کا موقع اور ادھر والے سے مراد مدینہ سے دور کا موقع) اور وہ قافلہ (قریش کا) تم سے نیچے کی طرف کو (بچا ہوا) تھا (یعنی سمندر کے کنارے کنارے جارہا تھا حاصل یہ کہ پورے جوش کا سامان جمع ہو رہا تھا کہ دونوں آپس میں آمنے سامنے تھے کہ ہر ایک دوسرے کو دیکھ کر جوش میں آئے ادھر قافلہ رستہ ہی میں تھا جس کی وجہ سے لشکر کفار کو اس کی حمایت کا خیال دلنشیں ہوا جس سے اور جوش میں زیادتی ہو غرض وہ ایسا شدید وقت تھا پھر بھی خدا تعالیٰ نے تم پر امداد غیبی نازل کی جیسا اوپر ارشاد ہوا ہے اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا (اور) وہ تو مصلحت یہ ہوئی کہ اتفاقاً مقابلہ ہو گیا ورنہ اگر (پہلے سے حسب معمول و عادت) تم اور وہ (لڑائی کے لئے) کوئی بات ٹھہراتے (کہ فلاں وقت لڑیں گے) تو (مقتضا حالت موجودہ کا یہ تھا کہ) ضرور اس تقرر کے بارہ میں تم میں اختلاف ہوتا (یعنی خواہ صرف مسلمانوں میں یا ہم کہ بوجہ بے سرو سامانی کے کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا اور خواہ کفار کے ساتھ اختلاف ہوتا جس کی وجہ اس طرف کی بے سرو سامانی اور اس طرف مسلمانوں کا رعب بہر حال دونوں طرح اس جنگ کی نوبت نہ آتی پس اس میں جو فوائد ہوئے وہ ظہور میں نہ آتے جن کا بیان لِيَهْلِكْ میں آتا ہے) لیکن (اللہ تعالیٰ نے ایسا سامان کر دیا کہ اس کی نوبت نہیں آتی بلا قصد لڑائی ٹھن گئی) تاکہ جو کام اللہ کو کرنا منظور تھا اس کی تکمیل کر دے یعنی تاکہ (حق کا نشان ظاہر ہو جائے اور) جس کو برباد (یعنی گمراہ) ہونا ہے وہ نشان آئے پیچھے برباد ہو اور جس کو زندہ (یعنی ہدایت یافتہ) ہونا ہے وہ (بھی) نشان آئے پیچھے زندہ ہو (مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا لڑائی ہونا تاکہ ایک خاص طریق سے اسلام کا حق ہونا ظاہر ہو جائے کہ اس قلتِ عدد و کم سامانی پر مسلمان غالب آئے جو کہ خارقِ عادت ہے جس سے معلوم ہوا کہ اسلام حق ہے پس اس سے حجت الہیہ تام ہو گئی اس کے بعد جو گمراہ ہو گا وہ وضوحِ حق کے بعد ہو گا کہ جس میں عذاب کا پورا استحقاق ہو گیا اور عذر کی گنجائش ہی نہ رہی اسی طرح جس کو ہدایت ہونا ہو گا وہ حق کو قبول کر لے گا۔ خلاصہ حکمت کا یہ ہوا کہ حق واضح ہو جائے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے خوب جاننے والے ہیں (کہ اس وضوح کے بعد زبان اور قلب سے کون کفر کرتا ہے اور کون ایمان لاتا ہے اور) وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے خواب میں آپ کو وہ لوگ کم دکھائے (چنانچہ آپ نے صحابہ کو اس خواب کی خبر کی ان کے دل خوب قوی ہو گئے) اور اگر اللہ تعالیٰ آپ کو وہ لوگ زیادہ کر کے دکھا دیتے (اور آپ صحابہ سے فرما دیتے)

تو (اے صحابہؓ) تمہاری ہمتیں ہارجائیں اور اس امر (قتال) میں تم میں باہم نزاع (اور اختلاف) ہو جاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے (اس کم ہمتی اور اختلاف سے تم کو) بچالیا بیشک وہ دلوں کی باتوں کو خوب جانتا ہے (اس کو معلوم تھا کہ اس طرح ضعف پیدا ہوگا اس طرح قوت، اس لئے ایسی تدبیر کی) اور (صرف خواب ہی میں آپ کو کم دکھلانے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ تتمیم حکمت کے لئے بیداری میں مقابلہ کے وقت مسلمانوں کی نظر میں بھی کفار کم دکھلائی دیئے جیسا کہ بالعکس بھی ہوا جو کہ واقع کے مطابق بھی تھا چنانچہ فرماتے ہیں کہ) اس وقت کو یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ تمہیں جبکہ تم مقابل ہوئے ان لوگوں کو تمہاری نظر میں کم کر کے دکھلا رہے تھے اور (اسی طرح) ان کی نگاہ میں تم کو کم کر کے دکھلا رہے تھے تاکہ جو کام اللہ کو کرنا منظور تھا اس کی تکمیل کر دے (جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے لیہلك من هلك الى) اور سب مقدمے خدا ہی کی طرف رجوع کئے جائیں گے (وہ ہالک اور سخی یعنی گمراہ اور مہتد کو مزا و جزا دیں گے)۔

معارف و مسائل

غزوۂ بدر کفر و اسلام کا وہ پہلا معرکہ تھا جس نے ظاہری اور مادی طور پر بھی اسلام کی برتری اور حقانیت کا ثبوت دیا اس لئے قرآن کریم نے اس کی تفصیلات بیان کرنے کا خاص اہتمام فرمایا۔ آیات متذکرہ میں اسی کا بیان ہے۔ جس کے ذکر میں بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کے علاوہ ایک خاص مصلحت اس کا اظہار ہے کہ اس معرکہ میں ظاہری اور مادی طور پر مسلمانوں کے فتح پانے کا کوئی امکان نہ تھا اور مشرکین مکہ کی شکست کا کوئی احتمال نہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی غیبی قوت نے سارے ساز و سامان اور ظاہری اسباب کی کایا پلٹ دی۔ اسی واقعہ کی وضاحت کے لئے ان آیات میں غزوۂ بدر کے محاذ جنگ کا پورا نقشہ قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے ان آیات کی تشریح سے پہلے چند الفاظ و لغات کی تشریح دیکھ لیجئے۔

عُدُوَّة کے معنی ایک جانب کے آتے ہیں اور لفظ دنیا ادنیٰ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں مترب تر۔ آخرت کے مقابلہ میں اس جہان کو بھی دنیا اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ عالم آخرت کی نسبت انسان کی طرف قریب تر ہے۔ اور لفظ قُصُوٰی اقصىٰ سے بنا ہے اقصىٰ کے معنی ہیں بعید تر۔

بیالیسویں آیت میں ہلاکت اور اُس کے مقابلہ میں حیات کا ذکر آیا ہے۔ ان دونوں لفظوں سے موت و حیات کے ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ معنوی موت و حیات یا ہلاکت و نجات مراد ہے۔ معنوی حیات اسلام و ایمان ہے اور موت مشرک و کفر۔ قرآن کریم نے کئی جگہ یہ الفاظ اس معنی میں

استعمال کئے۔ ایک جگہ ارشاد ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ** یعنی اے ایمان والو تم کہاؤ اللہ و رسول کا جب تم کو وہ ایسی چیز کی طرف بلائیں جس میں تمہاری حیات ہے۔ مراد حیات سے وہ حقیقی حیات اور دائمی راحت ہے جو ایمان و اسلام کے صلہ میں ملتی ہے۔ اب آیات کی تفسیر یہ ہوئی کہ۔

بیا لیسویں آیت میں غزوہ بدر کے محاذِ جنگ کا نقشہ یہ بتلایا گیا ہے کہ مسلمان عُدُوہ دُنیا کے پاس تھے اور کفار عُدُوہ قُصُوہی کے پاس۔ مسلمانوں کا مقام اس میدان کے اس کنارہ پر تھا جو مدینہ سے قریب تھا اور کفار میدان کے دوسرے کنارے پر تھے جو مدینہ سے بعید تھا۔ اور ابوسفیان کا تجارتی قافلہ جس کی وجہ سے یہ جہاد کھڑا کیا گیا تھا وہ بھی مکہ سے آنے والے لشکر کفار سے قریب اور مسلمانوں کی زد سے باہر تین میل کے فاصلہ پر سمندر کے کنارے چل رہا تھا۔ اس نقشہ جنگ کے بیان سے مقصد یہ بتلانا ہے کہ جنگی اعتبار سے مسلمان بالکل بے موقع غلط جگہ ٹھہرے تھے جہاں سے دشمن پر قابو پانے کا بلکہ اپنی جان بچانے کا بھی کوئی امکان ظاہری اعتبار سے نہ تھا۔ کیونکہ اس میدان کی وہ جانب جو مدینہ سے قریب تھی ایک ریتیلی زمین تھی جس میں چلنا بھی دُوبھر تھا۔ پھر پانی کی کوئی جگہ ان کے پاس نہ تھی۔ اور مدینہ سے بعید والی جانب جس پر کفار نے اپنا پڑاؤ ڈالا تھا وہ صاف زمین تھی اور پانی بھی وہاں سے قریب تھا۔

اور اس میدان کے دونوں کناروں کا پتہ دے کر یہ بھی بتلادیا کہ دونوں لشکر بالکل آمنے سامنے تھے کہ کسی کی طاقت یا ضعف دوسرے سے مخفی نہ رہ سکتا۔ نیز یہ بھی بتلادیا کہ مشرکین مکہ کے لشکر کو یہ بھی اطمینان حاصل تھا کہ ہمارا تجارتی قافلہ مسلمانوں کی زد سے نکل چکا ہے اب اگر ہمیں ضرورت پڑے تو وہ بھی ہماری امداد کر سکتا ہے۔ اس کے بالمقابل مسلمان اپنی جگہ کے اعتبار سے بھی تکلیف و پریشانی میں تھے اور کہیں سے کمک ملنے کا بھی کوئی احتمال نہ تھا۔ اور یہ بات پہلے سے متعین اور ہر لکھے پڑھے آدمی کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے لشکر کی کل تعداد تین سو تیرہ تھی اور کفار کی تعداد ایک ہزار۔ مسلمانوں کے پاس نہ سوار یوں کی تعداد کافی تھی اور نہ اسلحہ کی۔ اُس کے بالمقابل لشکر کفار ان سب چیزوں سے آراستہ تھا۔

نہ مسلمان اس جہاد میں کسی مسلح لشکر سے جنگ کی طیاری کر کے نکلے تھے۔ ہنگامی طور پر ایک تجارتی قافلہ کا راستہ روکنے اور دشمن کی قوت کو پست کرنے کے خیال سے صرف تین سو تیرہ مسلمان بے سامانی کے عالم میں نکل کھڑے ہوئے تھے اچانک غیر ارادی طور پر ایک ہزار جوانوں کے مسلح لشکر سے مقابلہ پڑ گیا۔

قرآن کی اس آیت نے بتلایا کہ لوگوں کی نظر میں یہ واقعہ اگرچہ ایک اتفاقی حادثہ کی صورت میں

بلا ارادہ پیش آیا۔ لیکن دنیا میں جتنے اتفاقات غیر اختیاری صورت سے پیش آیا کرتے ہیں اُن کی سطح اور صورت اگرچہ محض اتفاقات کی ہوتی ہے لیکن خالق کائنات کی نظر میں وہ سب کے سب ایک مستحکم نظام کی لگی بندھی کڑیاں ہوتی ہیں اُن میں کوئی چیز بے ربط یا بے موقع نہیں ہوتی۔ جب وہ پورا نظام سامنے آجائے اُس وقت انسان کو پتہ لگ سکتا ہے کہ اس اتفاقی واقعہ میں کیا کیا حکمتیں مستور تھیں۔

غزوہ بدر ہی کے واقعہ کو لے لیجئے اس کی اتفاقی اور غیر اختیاری صورت سے ظاہر ہونے میں یہ مصلحت تھی کہ وَلَوْ تَوَاعَدُ تَطَارًا خَلَعْتُمْ فِي السِّمِيعَاتِ، یعنی اگر عام دنیا کی جنگوں کی طرح یہ جنگ بھی تمام پہلوؤں پر غور و فکر اور یا بھی قرار دادوں کے ذریعہ لڑی جاتی تو حالات کا تقاضا یہ تھا کہ یہ جنگ ہوتی ہی نہیں بلکہ اس میں اختلاف پڑ جاتا خواہ اس طرح کہ خود مسلمانوں کی رائے اپنی قلت و کمزوری اور مقابل کی کثرت و قوت کو دیکھ کر مختلف ہو جاتی یا اس طرح کہ دونوں فریق اہل کفر و اہل اسلام مقررہ وعدہ پر میدان میں نہ پہنچتے۔ مسلمان تو اپنی قلت و کمزوری کو دیکھ کر اقدام کی ہمت نہ کرتے اور کفار پر حق تعالیٰ نے مسلمانوں کا رعب جمایا ہوا تھا وہ کثرت و قوت کے باوجود مقابلہ پر آنے سے گھبراتے۔

اس لئے قدرت کے مستحکم نظام نے دونوں طرف ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملے۔ مکہ والوں کو تو ابوسفیان کے قافلہ کی گھبراہٹ ہوئی فریاد نے ایک ہولناک صورت میں سامنے آکر بے سوچے سمجھے چلنے پر آمادہ کر دیا۔ مسلمانوں کو اس خیال نے کہ ہمارے مقابلہ پر کوئی جنگی مسلح لشکر نہیں۔ ایک معمولی تجارتی قافلہ ہے۔ مگر علیم و خیر کو منظور یہ تھا کہ دونوں میں باقاعدہ جنگ ہو جائے تاکہ اس جنگ کے پیچھے جو نتائج فتح اسلام کے ظہور میں آنے والے ہیں وہ سامنے آجائیں۔ اسی لئے فرمایا وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا یعنی ان حالات کے باوجود جنگ اس لئے ہو کر رہی کہ اللہ تعالیٰ کو جو کام کرنا ہے اُس کی تکمیل کر دکھائے۔ اور وہ یہ تھا کہ ایک ہزار جوانوں کے مسلح باسامان لشکر کے مقابلہ میں تین سو تیرہ بے سروسامان فاقہ زدہ مسلمانوں کی ایک ٹولی اور وہ بھی محاذ جنگ کے اعتبار سے بے موقع جب اس پہاڑ سے ٹکراتی ہے تو یہ پہاڑ پاش پاش ہو جاتا ہے اور یہ چھوٹی سی جماعت فتح مند ہوتی ہے، جو کھلی آنکھوں اس کا مشاہدہ ہے کہ اس جماعت کی پیٹھ پر کوئی بڑی قدرت اور طاقت کام کر رہی تھی جس سے یہ ایک ہزار کا لشکر محروم تھا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اُس کی تائید اسلام کی وجہ سے اور اس کی محرومی کفر کی وجہ سے تھی۔ جس سے حق و باطل اور کھرے کھوٹے کا پورا امتیاز ہر سمجھدار انسان کے سامنے آگیا۔ اسی لئے آخر آیت میں ارشاد فرمایا۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنِّي بِيَدِهِ وَيُخْلِكَ مَنْ حَيَّ عَنِّي بِيَدِي۔ یعنی واقعہ بدر میں اسلام کی

کی کھلی حقانیت اور کفر و شرک کے باطل و مردود ہونے کو اس لئے کھول دیا گیا کہ آئندہ جو ہلاکت میں پڑے وہ دیکھ بھال کر پڑے اور جو زندہ رہے وہ بھی دیکھ بھال کر رہے۔ اندھیرے اور مغالطہ میں کوئی کام نہ ہو۔

اس آیت کے الفاظ میں ہلاکت سے مراد کفر اور حیات و زندگی سے مراد اسلام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق واضح ہو جانے کے بعد غلط فہمی کا احتمال اور عذر تو ختم ہو گیا اب جو کفر اختیار کرتا ہے وہ دیکھتی آنکھوں ہلاکت کی طرف جا رہا ہے اور جو اسلام اختیار کرتا ہے وہ دیکھ بھال کر دائمی زندگی اختیار کر رہا ہے پھر فرمایا **وَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ** یعنی اللہ تعالیٰ خوب سننے والے جاننے والے ہیں کہ سب کے دلوں میں چھپے ہوئے کفر و ایمان تک اُن کے سامنے ہیں اور ہر ایک کی نرا و جزا بھی۔ تینتا الیسویں اور چوالیسویں دونوں آیتوں میں ایک خاص کر شتمہ قدرت کا ذکر ہے جو غزوہ بدر کے میدان میں اس غرض کے لئے عمل میں لایا گیا کہ ایسا نہ ہونے پائے کہ دونوں لشکروں میں سے کوئی بھی میدان جنگ چھوڑ کر اس جنگ کو ہی ختم کر ڈالے کیونکہ اس جنگ کے نتیجہ میں مادی حیثیت سے بھی حقانیت اسلام کا مظاہرہ کرنا مقدر تھا۔

اور وہ کرشمہ قدرت یہ تھا کہ لشکر کفار اگرچہ واقع میں مسلمانوں سے تین گنا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت کاملہ سے مسلمانوں کو اُن کی تعداد بہت کم کر کے دکھلایا۔ تاکہ مسلمانوں میں کمزوری اور اختلاف پیدا نہ ہو جائے۔ اور یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دکھلایا گیا آپ نے سب مسلمانوں سے بتلادیا جس سے اُن کی ہمت بڑھ گئی۔ دوسری مرتبہ عین میدان جنگ میں جب کہ دونوں فریق آمنے سامنے کھڑے تھے مسلمانوں کو اُن کی تعداد کم دکھلانی گئی۔ آیت ۲۳ میں خواب کا واقعہ اور ۲۴ میں بیداری کا مذکور ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہماری نظروں میں اپنا مقابل لشکر ایسا نظر آ رہا تھا کہ میں نے اپنے قریب کے ایک آدمی سے کہا کہ یہ لوگ تو بے آدمیوں کی تعداد میں ہوں گے۔ اُس شخص نے کہا کہ نہیں تنو ہوں گے۔

آخری آیت میں اس کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے **يُقَلِّدُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ** یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی مقابل لشکر کی نظر میں کم کر کے دکھلایا۔ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعداد تو حقیقت ہی میں کم تھی وہ صحیح تعداد اُن کو دکھلا دی اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جتنی تعداد واقعی تھی اُس سے بھی کم کر کے دکھلایا گیا جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ ابو جہل نے مسلمانوں کے لشکر کو دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان کی تعداد تو اس سے زیادہ معلوم نہیں، ہوتی جن کی خوراک ایک اونٹ ہو۔ عرب میں کسی لشکر کی تعداد معلوم کرنے کے لئے اس سے اندازہ قائم کیا جاتا تھا کہ

کتنے جانور ان کی خوراک کے لئے ذبح ہوتے ہیں، ایک اونٹ سو آدمیوں کی خوراک سمجھا جاتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس میدان بدر میں وہاں کے کچھ لوگوں سے قریش مکہ کے لشکر کا پتہ چلانے کے لئے پوچھا تھا کہ ان کے لشکر میں روزانہ کتنے اونٹ ذبح کئے جاتے ہیں تو آپ کو دس اونٹ روزانہ بتلائے گئے جس سے آپ نے ایک ہزار لشکر کا تخمینہ قائم فرمایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابو جہل کی نظر میں مسلمان نکل سو آدمی کی تعداد میں دکھلائے گئے۔ یہاں بھی کم کر کے دکھلانے میں یہ حکمت تھی کہ مشرکین کے قلوب پر مسلمانوں کا رعب پہلے ہی نہ چھا جائے جس کی وجہ سے وہ میدان پھوڑ بھاگیں۔

فائدہ | اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات معجزہ اور خرق عادت کے طور پر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آنکھوں کا مشاہدہ غلط ہو جائے۔ جیسا یہاں ہوا۔

اسی لئے اس جگہ دوبارہ فرمایا لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا۔ یعنی یہ کرشمہ قدرت اور آنکھوں کے مشاہدات پر تصرف اس لئے ظاہر کیا گیا کہ جو کام اللہ تعالیٰ کرنا چاہتے ہیں وہ پورا ہو جائے۔ یعنی مسلمانوں کو قلت و بے سامانی کے باوجود فتح دے کر اسلام کی حقانیت اور تائیدِ غیبی کا اظہار جو اس جنگ سے مقصود تھا وہ پورا کر دکھائے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَلَآئِی اللّٰهُ تُرْجَعُ الْأُمُورُ یعنی آخر کار سب کام اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹتے ہیں جو چاہے کرے جو چاہے حکم دے۔ قلت کو کثرت پر قوت کو ضعف پر غلبہ دے دے کم کو زیادہ، زیادہ کو کم کر دے۔ مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے

گر تو خواہی عین غم شادی شود عین بند پائے آزادی شود
چوں تو خواہی آتش آب خوش شود در تو خواہی آب ہم آتش شود
خاک و باد و آب و آتش بندہ اند بامن و تو مردہ با حق زندہ اند

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا الْقِيَمَةُ فُتِنَتْ فَانْثَبِتُوا وَادْكُرُوا اللَّهَ

اے ایمان والو جب بھڑو کسی فوج سے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت

کَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۴۵﴾ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا

یاد کرو تاکہ تم مراد پاؤ۔ اور حکمِ مالو اللہ کا اور اس کے رسول کا اور آپس میں نہ جھگڑو

فَتَفْسَلُوا وَتَذْهَبَ رِجْكُمْ وَأَصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۴۶﴾

پس نامرد ہو جاؤ گے اور جاتی رہے گی تمہاری ہوا اور صبر کرو، بیشک اللہ ساتھ ہے صبر والوں کے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ

اور نہ ہو جاؤ اُن جیسے جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اترتے ہوئے اور لوگوں کے دکھانے کو

وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿۴۸﴾

اور روکتے تھے اللہ کی راہ سے ، اور اللہ کے قابو میں ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں ۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو جب تم کو (کفار کی کسی) جماعت سے (جہاد میں) مقابلہ کا اتفاق ہو کرے تو (ان آداب کا لحاظ رکھو ایک یہ کہ) ثابت قدم رہو (بھاگو مت) اور (دوسرے یہ کہ) اللہ کا خوب کثرت سے ذکر کرو (کہ ذکر سے قلب میں قوت ہوتی ہے) امید ہے کہ تم (مقابلہ میں) کامیاب ہو (کیونکہ ثبات قدم اور ثبات قلب جب جمع ہوں تو کامیابی غالب ہے) اور (تیسرے یہ کہ تمام امور متعلقہ حرب میں) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت (کا لحاظ) کیا کرو (کہ کوئی کارروائی خلافِ شرع نہ ہو) اور (جو تھے یہ کہ اپنے امام سے اور باہم بھی) نزاع مت کرو ورنہ (باہمی نا اتفاقی سے) کم ہمت ہو جاؤ گے (کیونکہ قوتیں منتشر ہو جائیں گی ایک کو دوسرے پر وثوق نہ ہوگا اور اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہے) اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی (ہوا خیزی سے مراد بددعا ہے کیونکہ دوسروں کو اس نا اتفاقی کی اطلاع ہونے سے یہ امر لازمی ہے) اور (پانچویں یہ کہ اگر کوئی امر ناگواری کا پیش آئے تو اس پر صبر کرو بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں) اور معیتِ الہی موجب نصرت ہے) اور (چھٹے یہ کہ نیت خالص رکھو تفاخر اور تمائش میں) ان (کافر) لوگوں کے مشابہ مت ہونا کہ جو (اسی واقعہ بدر میں) اپنے گھروں سے اترتے ہوئے اور لوگوں کو (اپنی شان و سامان) دکھلاتے ہوئے نکلے اور (اس فخر و ریا کے ساتھ یہ بھی نیت تھی کہ) لوگوں کو اللہ کے رستہ (یعنی دین) سے روکتے تھے (کیونکہ مسلمانوں کو زک دینے چلے تھے جس کا اثر عام طبائع پر بھی دین سے بعد ہوتا) اور اللہ تعالیٰ (ان لوگوں کو پوری سزا دے گا چنانچہ وہ) ان کے اعمال کو (اپنے علم کے احاطہ میں لئے ہوئے ہے ۔

معارف و مسائل

جنگِ جہاد میں کامیابی کے لئے قرآنی ہدایات | پہلی دو آیتوں میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو میدانِ جنگ اور مقابلہ دشمن کے لئے ایک خاص ہدایت نامہ دیا ہے جو اُن کے لئے دنیا میں کامیابی اور

فتمندی کا اور آخرت کی نجات و فلاح کا نسخہ اکسیر ہے اور قردنِ اولیٰ کی تمام جنگوں میں مسلمانوں کی فوق العادت کامیابیوں اور فتوحات کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اور وہ چند چیزیں ہیں۔

اول ثبات۔ یعنی ثابت رہنا اور جتنا۔ جس میں ثباتِ قلب اور ثباتِ قدم دونوں داخل ہیں کیونکہ جب تک کسی شخص کا دل مضبوط اور ثابت نہ ہو اُس کا قدم اور اعضاء ثابت نہیں رہ سکتے اور یہ چیز ایسی ہے جس کو ہر مؤمن و کافر جانتا اور سمجھتا ہے اور دنیا کی ہر قوم اپنی جنگوں میں اس کا اہتمام کرتی ہے۔ کیونکہ اہل تجربہ سے مخفی نہیں کہ میدانِ جنگ کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ کامیاب ہتھیار ثباتِ قلب و قدم ہی ہے دوسرے سارے ہتھیار اس کے بغیر بیکار ہیں۔

دوسرے ذکر اللہ یہ وہ مخصوص اور معنوی ہتھیار ہے جس سے مؤمن کے سوا عام دنیا غافل ہے پوری دنیا جنگ کے لئے بہترین اسلحہ اور نئے سے نیا سامان ہیا کرنے اور فوج کے ثابت قدم رکھنے کی تو پوری تدبیریں کرتی ہے۔ مگر مسلمانوں کے اس روحانی اور معنوی ہتھیار سے بے خبر اور نا آشنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر میدان میں جہاں مسلمانوں کا مقابلہ ان ہدایات کے مطابق کسی قوم سے ہوا مخالف کی پوری طاقت اور اسلحہ اور سامان کو بیکار کر دیا۔ ذکر اللہ کی اپنی ذاتی اور معنوی برکات تو اپنی جگہ ہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ ثباتِ قدم کا اس سے بہتر کوئی نسخہ بھی نہیں۔ اللہ کی یاد اور اس پر اعتماد وہ بجلی کی طاقت ہے جو ایک انسان ضعیف کو پہاڑوں سے ٹکرا جانے پر آمادہ کر دیتی ہے اور کیسی ہی مصیبت اور پریشانی ہو اللہ کی یاد سب کو ہوا میں اڑا دیتی ہے اور انسان کے قلب کو مضبوط اور قدم کو ثابت رکھتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھئے کہ جنگ و قتال کا وقت عادتاً ایسا وقت ہوتا ہے کہ اُس میں کوئی کسی کو یاد نہیں کرتا اپنی فکر پڑی ہوتی ہے۔ اسی لئے جاہلیتِ عرب کے شعراء میدانِ جنگ میں بھی اپنے محبوب کو یاد کرنے پر فخر کیا کرتے ہیں کہ وہ بڑی قوتِ قلب اور محبت کی پختگی کی دلیل ہے ایک جاہلی شاعر نے کہا ہے ۛ ذکرتک والخطی یخطر بیننا۔ یعنی میں نے تجھے اُس وقت بھی یاد کیا جب کہ نیزے ہمارے درمیان لچک رہے تھے۔

قرآن کریم نے اس پر خطر موقع میں مسلمانوں کو ذکر اللہ کی تلقین فرمائی اور وہ بھی کشیدہ کی تاکید کے ساتھ۔

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ پورے قرآن میں ذکر اللہ کے سوا کسی عبادت کو کثرت سے کرنے کا حکم نہیں صَلَوةً کَثِیْرًا صِیَامًا کَثِیْرًا کہیں مذکور نہیں۔ سبب یہ ہے کہ ذکر اللہ ایک ایسی آسان عبادت ہے کہ اُس میں نہ کوئی بڑا وقت خرچ ہوتا ہے نہ محنت نہ کسی دوسرے کام میں اس سے رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اُس پر مزید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے ذکر اللہ کے لئے

کوئی مشرط اور پابندی، وضو، طہارت، لباس اور قبلہ وغیرہ کی بھی نہیں لگائی ہر شخص ہر حال میں با وضو، بے وضو، کھڑے، بیٹھے، لیٹے کر سکتا ہے اور اُس پر اگر امام جزی کی اس تحقیق کا اضافہ کر لیا جائے جو انھوں نے حصن حصین میں لکھی ہے کہ ذکر اللہ صرف زبان یا دل سے ذکر کرنے ہی کو نہیں کہتے بلکہ ہر جائز کام جو اللہ تعالیٰ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں رہ کر کیا جائے وہ بھی ذکر اللہ ہے۔ تو اس تحقیق پر ذکر اللہ کا مفہوم اس قدر عام اور آسان ہو جاتا ہے کہ سوتے ہوئے بھی انسان کو ذکر کہہ سکتے ہیں۔ جیسے بعض روایات میں ہے نوم العالم عبادة یعنی عالم کی تیند بھی عبادت میں داخل ہے کیونکہ عالم جو اپنے علم کے مقتضی پر عمل کرتا ہو اُس کے لئے یہ لازم ہے کہ اُس کا سونا اور جاگنا سب اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی کے دائرہ میں ہو۔

میدان جنگ میں ذکر اللہ کی کثرت کا حکم اگرچہ بظاہر مجاہدین کے لئے ایک کام کا اضافہ نظر آتا ہے جو عادیہ مشقت و محنت کو چاہتا ہے۔ لیکن ذکر اللہ کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ محنت نہیں لیتا بلکہ ایک فرحت و قوت اور لذت بخشتا ہے اور انسان کے کام میں اور معین و مددگار بنتا ہے۔ یوں بھی محنت و مشقت کے کام کرنے والوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی کلمہ یا گیت گنگنا یا کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو اُس کا نعم البدل دے دیا جو ہزاروں فوائد اور حکمتوں پر مبنی ہے۔ اسی لئے آخر آیت میں فرمایا لَحَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ۔ یعنی اگر تم نے ثبات اور ذکر اللہ کے دو گڑ یاد کر لئے اور ان کو میدان جنگ میں استعمال کیا تو فلاح و کامیابی تمھاری ہے۔

میدان جنگ کا ذکر ایک تو وہ ہے جو عام طور پر نعرہ تکبیر کے انداز میں کیا جاتا ہے اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ پر نظر اور اعتماد و توکل اور دل سے اُس کی یاد۔ لفظ ذکر اللہ ان سب کو شامل ہے۔ چھیا لیسویں آیت میں ایک تیسری چیز کی تلقین اور کی گئی وہ ہے اَطِيعُوا اللَّهَ وَرُسُلَهُ۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو لازم پکڑو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی امداد و نصرت اُس کی اطاعت ہی کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے معصیت اور نافرمانی تو اللہ کی ناراضی اور ہر فضل سے محرومی کے اسباب ہوتے ہیں۔ اس طرح میدان جنگ کے لئے قرآنی ہدایت نامہ کی تین دفعات ہو گئیں ثبات، ذکر اللہ، اطاعت۔ اس کے بعد فرمایا وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا۔ اس میں مضر پہلوؤں پر تنبیہ کر کے اُن سے بچنے کی ہدایت ہے۔ اور وہ مضر پہلو جو جنگ کی کامیابی میں مانع ہوتا ہے باہمی نزاع و اختلاف ہے۔ اس لئے فرمایا وَلَا تَنَازَعُوا۔ یعنی آپس میں نزاع اور کشاکش نہ کرو۔ ورنہ تم میں بزدلی پھیل جائے گی اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اس میں باہمی نزاع کے دو نتیجے بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ تم ذاتی طور پر کمزور اور بزدل ہو جاؤ گے۔ دوسرے یہ کہ تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی دشمن کی نظروں میں حقیر ہو جاؤ گے باہمی کشاکش

اور نزاع سے دوسروں کی نظریں پھرتی ہو جانا تو بدتر بھی امر ہے لیکن خود اپنی قوت پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے کہ اُس میں کمزوری اور بزدلی آجائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باہمی اتحاد و اعتماد کی صورت میں ہر ایک انسان کے ساتھ پوری جماعت کی طاقت لگی ہوئی ہوتی ہے اس لئے ایک آدمی اپنے اندر بقدر اپنی جماعت کے قوت محسوس کرتا ہے اور جب باہمی اتحاد و اعتماد نہ رہا تو اس کی اکیلی قوت رہ گئی وہ ظاہر ہے جنگ و قتال کے میدان میں کوئی چیز نہیں۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا **وَاصْبِرْ** یعنی صبر کو لازم پکڑو۔ سیاق کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نزاع اور جھگڑوں سے بچنے کا کامیاب نسخہ بتلایا گیا ہے اور بیان اس کا یہ ہے کہ کوئی جماعت کتنی ہی متحد الخیاں اور متحد المقصد ہو مگر افراد انسانی کی طبعی خصوصیات ضرور مختلف ہوا کرتی ہیں، نیز کسی مقصد کے لئے سعی و کوشش میں اہل عقل و تجربہ کی رایوں کا اختلاف بھی ناگزیر ہے۔ اس لئے دوسروں کے ساتھ چلنے اور اُن کو ساتھ رکھنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آدمی خلاف طبع امور پر صبر کرنے اور نظر انداز کرنے کا عادی ہو اور اپنی رائے پر اتنا جماؤ اور اصرار نہ ہو کہ اُس کو قبول نہ کیا جائے تو لڑ بیٹھے۔ اسی صفت کا دوسرا نام صبر ہے۔ آج کل یہ تو ہر شخص جانتا اور کہتا ہے کہ آپس کا نزاع بہت بُری چیز ہے مگر اُس سے بچنے کا جو گڑ ہے کہ آدمی خلاف طبع امور پر صبر کرنے کا جو گریز اپنی بات منوانے اور چلانے کی فکر میں نہ پڑے۔ یہ بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے اسی لئے اتحاد و اتفاق کے سارے وعظ و پند بے سود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ آدمی کو دوسرے سے اپنی بات منوانے پر تو قدرت نہیں ہوتی مگر خود دوسرے کی بات مان لینا اور اگر اُس کی عقل و دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ اُس کو نہ مانے تو کم از کم نزاع سے بچنے کے لئے سکوت کر لینا تو بہر حال اختیار میں ہے اس لئے قرآن کریم نے نزاع سے بچنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ صبر کی تلقین بھی ہر فرد جماعت کو کر دی تاکہ نزاع سے بچنا عملی دنیا میں آسان ہو جائے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ قرآن کریم نے اس جگہ **لَا تَنَازَعُوا** فرمایا ہے یعنی باہمی کشاکش کو روکا ہے رائے کے اختلاف یا اُس کے اظہار سے منع نہیں کیا۔ اختلاف رائے جو دیانت اور اخلاص کے ساتھ ہو وہ کبھی نزاع کی صورت اختیار نہیں کیا کرتا۔ نزاع و جدال وہیں ہوتا ہے جہاں اختلاف رائے کے ساتھ اپنی بات منوانے اور دوسرے کی بات نہ ماننے کا جذبہ کام کر رہا ہو۔ اور یہی وہ جذبہ ہے جس کو قرآن کریم نے **وَاصْبِرْ** کے لفظ سے ختم کیا ہے اور آخر میں صبر کرنے کا ایک عظیم الشان فائدہ بتلا کر صبر کی تلخی کو دور فرما دیا۔ ارشاد فرمایا **إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ**۔ یعنی صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر حال میں ان کا رفیق ہوتا ہے اور یہ اتنی بڑی دولت ہے کہ دونوں جہان کی ساری دولتیں اس کے مقابلہ میں سیج ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غزوات میں انہیں ہدایات کو مستحضر کرانے کے لئے عین میدان جنگ میں یہ خطبہ دیا "اے لوگو دشمن سے مقابلہ کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو اور جب ناگزیر طور پر مقابلہ ہو ہی جائے تو پھر صبر و ثبات کو لازم پکڑو اور یہ سمجھ لو کہ جنت تلواروں کے سایہ میں ہے۔" (مسلم)

سینتالیسویں آیت میں ایک اور مضر پہلو پر تنبیہ اور اُس سے پرہیز کی ہدایت دی گئی ہے وہ ہے اپنی قوت و کثرت پر نازیبا کام میں اخلاص کے بجائے اپنی کوئی اور غرض مضمر ہونا کیونکہ یہ دونوں چیزیں بھی بڑی بڑی طاقتور جماعتوں کو پسپا اور زیر کر دیا کرتی ہیں۔

اس آیت میں اشارہ قریش مکہ کے حالات کی طرف بھی ہے جو اپنے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے بھاری تعداد اور سامان لے کر اپنی قوت و کثرت پر اترتے ہوئے نکلے تھے۔ اور جب تجارتی قافلہ مسلمانوں کی زد سے باہر ہو گیا اُس وقت بھی اس لئے واپس نہیں ہوئے کہ اپنی شجاعت و بہادری کا مظاہرہ کرتا تھا۔

مستند روایات میں ہے کہ جب ابوسفیان اپنا تجارتی قافلہ لے کر مسلمانوں کی زد سے بچ نکلے تو ابو جہل کے پاس قاصد بھیجا کہ اب تمہارے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں رہی واپس آجاؤ اور بھی بہت سے قریش سرداروں کی یہی رائے تھی۔ مگر ابو جہل اپنے کبر و غرور اور شہرت پرستی کے جذبہ میں قسم کھا بیٹھا کہ ہم اس وقت تک واپس نہ ہوں گے جب تک چند روز مقام بدر پر پہنچ کر اپنی فتح کا جشن نہ منالیں۔

جس کے نتیجہ میں وہ اور اُس کے بڑے بڑے ساتھی سب وہیں ڈھیر ہوئے اور ایک گڑھے میں ڈالے گئے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو ان کے طریقہ کار سے پرہیز کرنے کی ہدایت فرمائی گئی۔

وَاذْذَرَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمْ

اور جس وقت خوشنما کر دیا شیطان نے اُن کی نظروں میں اُن کے عملوں کو اور بولا کہ کوئی بھی غالب نہ ہوگا تم پر

الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَأَتْ الْفِئْتَنَ

آج کے دن لوگوں میں سے اور میں تمہارا حمایتی ہوں، پھر جب سامنے ہوئیں دونوں فوجیں

نَكَصَ عَلَى عَقْبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيٌّ مِّنْكُمْ اِنِّيْ اَرَى مَا لَا

اتو وہ الٹا پھرا اپنی ایڑیوں پر اور بولا میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں میں دیکھتا ہوں جو تم

تَرَوْنَ اِنِّيْ اَخَافُ اللّٰهَ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۴۸ اِذْ يَقُوْلُ

نہیں دیکھتے میں ڈرتا ہوں اللہ سے، اور اللہ کا عذاب سخت ہے۔ جب کہنے لگے

الْمُنْفِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هَؤُلَاءِ دِينُهُمْ

منافق اور جن کے دلوں میں بیماری ہے یہ لوگ مغرور ہیں اپنے دین پر ،

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۴۹﴾

اور جو کوئی بھروسہ کرے اللہ پر تو اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

خلاصہ تفسیر

اور اس وقت کا ان سے ذکر کیجئے جب کہ شیطان نے ان (کفار) کو (بذریعہ وسوسہ) ان کے اعمال (کفریہ عداوت و مخالفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) خوشنما کر کے دکھائے (کہ انہوں نے ان باتوں کو اچھا سمجھا) اور (وسوسہ سے بڑھ کر یہ کیا کہ بالمشافہ ان سے) کہا کہ (تم کو وہ قوت و شوکت ہے کہ تمہارے مخالف) لوگوں میں سے آج کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور میں تمہارا حامی ہوں (نہ بیرونی دشمنوں سے ڈرو اور نہ اندرونی دشمنوں سے اندیشہ کرو) پھر جب دونوں جماعتیں (کفار و مسلمین کی) ایک دوسرے کے بالمقابل ہوئیں (اور اس نے ملائکہ کا نزول دیکھا) تو وہ اٹے پاؤں بھاگا اور یہ کہا کہ میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں (میں حامی و امی کچھ نہیں بنتا کیونکہ) میں ان چیزوں کو دیکھ رہا ہوں جو تم کو نظر نہیں آتیں (مراد فرشتے ہیں) میں تو خدا سے ڈرتا ہوں (کبھی کسی فرشتہ سے دنیا ہی میں میری خبر لو وے) اور اللہ تعالیٰ سخت مزا دینے والے ہیں۔ اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے کہ جب منافقین (مدینہ والوں میں سے) اور جن کے دلوں میں (شک کی) بیماری تھی (مکہ والوں میں سے) مسلمانوں کا بے سروسامانی کے ساتھ مقابلہ کفار میں آجانا دیکھ کر) یوں کہتے تھے کہ ان (مسلمان) لوگوں کو ان کے دین نے بھول میں ڈال رکھا ہے (کہ اپنے دین کے حق ہونے کے بھروسے ایسے خطرہ میں آپڑے۔ اللہ جواب دیتے ہیں) اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ اکثر غالب ہی آتا ہے کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (اس لئے اپنے اوپر بھروسہ کرنے والے کو غالب کر دیتے ہیں اور احياناً ایسا شخص مغلوب ہو جائے تو اس میں کچھ مصلحت ہوتی ہے کیونکہ) وہ حکمت والے (بھی) ہیں (غرض ظاہری سامان و بے سامانی پر مدار نہیں قادر کوئی اور ہی ہے)۔

معارف و مسائل

سورۃ انفال میں شروع سے غزوہ بدر میں پیش آنے والے واقعات اور حالات کا اور ان سے حاصل ہونی والی نصائح اور عبرتوں کا اور متعلقہ احکام کا بیان چل رہا ہے۔

اسی میں ایک واقعہ قریش مکہ کو شیطان کے فریب دے کر مسلمانوں کے مقابلہ پر ابھارنے اور پھر عین میدان جنگ میں ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جانے کا ہے جو آیات مذکورہ کے شروع میں مذکور ہے۔

شیطان کا یہ فریب قریش کے دلوں میں دوسوہ ڈالنے کی صورت سے تھا یا انسانی شکل میں آکر رو برو گفتگو سے۔ اس میں دونوں احتمال ہیں مگر الفاظ قرآن سے زیادہ تر تائید دوسری ہی صورت کی ہوتی ہے کہ بشکل انسانی سامنے آکر فریب دیا۔

امام ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جب قریش مکہ کا لشکر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے مکہ سے نکلا تو ان کے دلوں پر ایک خطرہ اس کا سوار تھا کہ ہمارے قریب میں قبیلہ بنو بکر بھی ہمارا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم مسلمانوں کے مقابلہ پر جائیں اور یہ دشمن قبیلہ موقع پا کر ہمارے گھروں اور عورتوں، بچوں پر چھاپہ مار دے۔ ایسا قافلہ ابوسفیان کی گھرائی ہوئی فریاد پر طیار ہو کر نکل تو کھڑے ہوئے مگر یہ خطرہ ان کے لئے زنجیر پا بنا ہوا تھا کہ اچانک شیطان سراقہ بن مالک کی صورت میں اس طرح سامنے آیا کہ اُس کے ہاتھ میں جھنڈا اور اُس کے ساتھ ایک دستہ بہادر فوج کا ہے۔ سراقہ بن مالک اُس علاقہ اور قبیلہ کا بڑا سردار تھا جن سے حملہ کا خطرہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر قریشی جوانوں کے لشکر سے خطاب کیا اور دو طرح سے فریب میں مبتلا کیا۔ اول یہ کہ لَا غَالِبَ لَكُمْ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ یعنی آج تمام لوگوں میں تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ مجھے تمہارے مقابل فریق کی قوت کا بھی اندازہ ہے اور تمہاری قوت و کثرت کو بھی دیکھ رہا ہوں اس لئے تمہیں یقین دلانا ہوں کہ تم بے فکر ہو کر آگے بڑھو تمہیں غالب رہو گے کوئی تمہارے مقابلہ پر غالب آنے والا نہیں۔

دوسرے یہ کہ اِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ یعنی تمہیں جو بنی بکر وغیرہ سے خطرہ لگا ہوا ہے کہ وہ تمہارے پیچھے مکہ پر چڑھ دوڑیں گے۔ اس کی میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ ایسا نہ ہو گا میں تمہارا حامی ہوں۔ قریش مکہ سراقہ بن مالک اور اُس کی بڑی شخصیت اور اثر و رسوخ سے پہلے سے واقف تھے اُس کی بات سُن کر ان کے دل جم گئے اور قبیلہ بنی بکر کے خطرہ سے بے فکر ہو کر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے آمادہ ہو گئے۔

اس دو گونہ فریب سے شیطان نے ان لوگوں کو اپنے مقتل کی طرف ہانک دیا فَلَمَّا تَرَأَتْهُ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلَى عَقَبَيْهِ۔ جب مشرکین مکہ اور مسلمانوں کی دونوں جماعتیں (مقام بدر میں) آمنے سامنے ہوئیں تو شیطان پچھلے پاؤں لوٹ گیا۔

غزوہ بدر میں چونکہ مشرکین مکہ کی پیٹھ پر ایک شیطانی لشکر بھی آگیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ

نے اُن کے مقابلہ میں فرشتوں کا لشکر جبریل و میکائیل کی قیادت میں بھیج دیا۔ امام ابن جریر وغیرہ نے بروایت ابن عباس نقل کیا ہے کہ شیطان نے جو اُس وقت بشکل انسانی سراقہ بن مالک کی صورت میں اپنے شیطانی لشکر کی قیادت کر رہا تھا، جب جبریل امین اور اُن کے ساتھ فرشتوں کا لشکر دیکھا تو گھبرا اٹھا اُس وقت اُس کا ہاتھ ایک قریشی جوان حارث بن ہشام کے ہاتھ میں تھا فوراً اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا۔ حارث نے ٹوکا کہ یہ کیا کرتے ہو تو اُس کے سینہ پر مار کر حارث کو گرا دیا۔ اور اپنے شیطانی لشکر کو لے کر بھاگ پڑا۔ حارث نے اُس کو سراقہ سمجھتے ہوئے کہا کہ اے عرب کے سردار سراقہ تو نے تو یہ کہا تھا کہ میں تمہارا حامی اور مددگار ہوں اور عین میدان جنگ میں یہ حرکت کر رہے ہو۔ تو شیطان نے بشکل سراقہ جواب دیا۔ اِنِّیْ بِرَبِّیْ مُتَمَكِّنٌ اِنِّیْ اَرٰی مَا لَا تَرٰوْنَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰہَ۔ یعنی میں تمہارے معاہدہ سے بری ہوتا ہوں کیونکہ میں وہ چیز دیکھ رہا ہوں جو تمہاری آنکھیں نہیں دیکھتیں مراد فرشتوں کا لشکر تھا۔ اور یہ کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اس لئے تمہارا ساتھ چھوڑتا ہوں۔

شیطان نے فرشتوں کا لشکر دیکھا تو اُن کی قوت سے وہ واقف تھا سمجھ گیا کہ اب اپنی خیر نہیں اور یہ جو کہا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ امام تفسیر قتادہ نے کہا کہ یہ اس نے جھوٹ بولا اگر وہ خدا سے ڈرا کرتا تو نافرمانی کیوں کرتا۔ مگر اکثر حضرات نے فرمایا کہ ڈرنا بھی اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور عذاب شدید کو پوری طرح جانتا ہے اس لئے نہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں البتہ بڑا خوف بغیر ایمان و اطاعت کے کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔

ابو جہل نے جب سراقہ اور اُس کے لشکر کی پسپائی سے اپنے لشکر کی ہمت کو ٹوٹنے دیکھا تو بات بنائی اور کہا کہ سراقہ کے بھاگ جانے سے تم متاثر نہ ہو اس نے تو حفصہ طور پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ سازش کر رکھی تھی۔ شیطان کی پسپائی کے بعد ان کا جوش خروش ہونا تھا ہو گیا۔ پھر جب یہ لوگ مکہ واپس آئے اور ان میں سے کسی کی ملاقات سراقہ بن مالک کے ساتھ ہوئی تو اُس نے سراقہ کو ملامت کی کہ جنگ بدر میں ہماری شکست اور سارے نقصان کی ذمہ داری تجھ پر ہے تو نے عین میدان جنگ میں پسپا ہو کر ہمارے جوانوں کی ہمت توڑ دی۔ اس نے کہا کہ میں نہ تمہارے ساتھ گیا نہ تمہارے کسی کام میں شریک ہوا۔ میں نے تو تمہاری شکست کی خبر بھی تمہارے مکہ پہنچنے کے بعد سنی۔

یہ سب روایات امام ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ شیطان لعین کی یہ عام عادت ہے کہ انسان کو بُرائی میں مبتلا کر کے عین موقع پر الگ ہو جاتا ہے قرآن کریم نے اس کی یہ عادت بار بار بیان فرمائی ہے، ایک آیت میں ہے کَمَثَلِ الشَّيْطَانِ اِذَا قَالَ لِلْاِنْسَانِ

اَكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بِرَحْمَتِكَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ۔

شیطانی دجل و فریب اور آیت متذکرہ کے اس واقعہ سے چند فوائد حاصل ہوئے۔

اس سے بچنے کا طریقہ۔
 اقول یہ کہ شیطان انسان کا دشمن ہے اُس کو نقصان پہنچانے کے لئے طرح طرح کے حیلے کرتا اور بہروپ بدلتا ہے۔ بعض اوقات محض دل میں وسوسہ ڈال کر پریشان کرتا ہے اور بعض اوقات سامنے آکر دھوکا دیتا ہے۔

دوسرے یہ کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے اس کی قدرت دی ہے کہ وہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ ایک مشہور حنفی فقیہ کی کتاب احکام المرجان فی احکام الجان میں اس کو بوضاحت ثابت کیا گیا ہے۔ اسی لئے محققین صوفیائے کرام جو اصحاب کشف و شہود ہیں انھوں نے لوگوں کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ کسی شخص کو دیکھ کر یا اس کا کلام سن کر بغیر تحقیق حال کے اس کے پیچھے چلنا بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ کشف و الہام میں بھی شیطانی تلبیسات ہو سکتی ہیں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ست پس بہر دستے شاید داد دست
 اور حافظ نے فرمایا ہے

در راہ عشق و وسوسہ اہرن بے ست ہمدار و گوش را بہ پیام سروش دار
 پیام سروش سے مراد وحی الہی ہے۔

کامیابی کے لئے صرف اخلاص نیت ہی کافی نہیں اس سے پہلے راستہ سیدھا ہونا ضروری ہے۔

تیسرے یہ کہ جو لوگ کفر و مشرک یا دوسرے ناجائز اعمال میں مبتلا ہوتے ہیں اُس کا بیشتر سبب یہی ہوتا ہے کہ شیطان ان کے اعمال بد کو خوبصورت مستحسن اور نفع بخش ظاہر کر کے ان کے دل و دماغ کو حق و صدق اور صحیح نتائج کی طرف سے پھیر دیتا ہے وہ اپنے باطل ہی کو حق اور بُرے کو بھلا سمجھنے لگتے ہیں اور اہل حق کی طرح اپنے باطل پر جان دینے کے لئے طیار ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے قریشی شکر اور اس کے سردار جب بیت اللہ سے رخصت ہو رہے تھے تو بیت اللہ کے سامنے ان الفاظ سے دُعا کر کے چلے گئے کہ اللّٰھم انصر اھدی الطائفین یعنی اے اللہ ہم دونوں جماعتوں میں سے جو زیادہ ہدایت پر ہے اس کی مدد فرمائیے اور فتح دیجئے۔ یہ بے خبر لوگ شیطانی فریب میں آکر اپنے آپ ہی کو زیادہ ہدایت پر اور حق بجانب سمجھتے تھے۔ اور پورے اخلاص کے ساتھ اپنے باطل کی حمایت و نصرت میں جان مال قربان کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ بڑا اخلاص کافی نہیں جب تک کہ عمل کا رخ درست نہ ہو۔
 اس کے بعد کی دوسری آیت میں منافقین مدینہ اور مشرکین مکہ کا ایک مشترک مقولہ مسلمانوں

کے بارہ میں یہ نقل کیا جو گویا ان پر ترس کھا کر کہا گیا ہے کہ عَزَّ وَهُوَ لَدَّ دِئْنُهُمْ۔ یعنی میدان بدر میں یہ مٹھی بھر مسلمان اتنے بھاری اور قوی شکر سے ٹکرانے آگئے ان بے چاروں کو ان کے دین نے قریب میں ڈال کر موت کے منہ میں دے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ حَكِيمٌ۔ یعنی جو شخص اللہ پر توکل اور بھروسہ کر لیتا ہے تو یاد رکھو کہ وہ کبھی ذلیل نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہے اُس کی حکمت کے سامنے سب کی عقل و دانش رکھی رہ جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم لوگ صرف مادہ اور مادیات کو جانتے والے اور اُسی پر بھروسہ کرنے والے ہو تمہیں اُس مخفی طاقت کی خبر نہیں جو اس مادہ اور مادیات کے پیدا کرنے والے کے خزانوں میں ہے اور جو اُن لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اعتماد رکھتے ہیں۔

آج بھی دیندار بھولے بھالے مسلمانوں کو دیکھ کر بہت سے عقل و دانش کے مدعی یوں ہی کہا کرتے ہیں کہ ہاں اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو لیکن اگر ان میں اللہ پر ایمان اور اعتماد پورا ہو تو انہیں اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ

اور اگر تو دیکھے جس وقت جان قبض کرتے ہیں کافروں کی فرشتے مارتے ہیں اُن کے منہ پر

وَأَذْبَارَهُمْ ۖ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٥٠﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمْتِ

اور ان کے پیچھے، اور کہتے ہیں چکھو عذاب جلنے کا۔ یہ بدلہ ہے اسی کا جو تم نے آگے بھیجا

أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿٥١﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ

اپنے ہاتھوں اور اس واسطے کہ اللہ ظلم نہیں کرتا۔ پسندوں پر۔ جیسے دستور فرعون والوں کا

وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَآخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۚ

اور جو ان سے پہلے تھے، کہ منکر ہوئے اللہ کی باتوں سے سو پکڑا اُن کو اللہ نے ان کے گناہوں پر،

إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٥٢﴾ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا

بیشک اللہ زور آور ہے سخت عذاب کرنے والا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ ہرگز بدلنے والا نہیں

نِعْمَةً أَنعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرَ أَمْرًا بِأَنفُسِهِمْ ۚ وَأَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٥٣﴾

اس نعمت کو جو دی تھی اس نے کسی قوم کو جب تک وہی نہ بدل ڈالیں اپنے جیوں کی بات اور یہ کہ اللہ سنتے والا جاننے والا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور اگر آپ (اس وقت کا واقعہ) دیکھیں (تو عجیب واقعہ نظر آئے) جب کہ فرشتے ان (موجودہ) کافروں کی جان قبض کرتے جاتے ہیں (اور) ان کے منہ پر اور ان کی پشتوں پر ماتے جاتے ہیں اور یہ کہتے جاتے ہیں کہ (ابھی کیا ہے آگے چل کر) آگ کی سزا جھیلنا (اور) یہ عذاب ان اعمال (کفریہ) کی وجہ سے ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں اور یہ امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں (سو) اللہ تعالیٰ نے بے جرم سزا نہیں دی پس) ان کی حالت (اس بارہ میں کہ کفر پر سزایاب ہوئے) ایسی ہے جیسی فرعون والوں کی اور ان سے پہلے (کافر) لوگوں کی حالت تھی کہ انہوں نے آیات الہیہ کا انکار کیا سو خدا تعالیٰ نے ان کے (ان) گناہوں پر ان کو (عذاب میں) پکڑ لیا بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی قوت والے سخت سزا دینے والے ہیں (کہ ان کے مقابلہ میں کوئی ایسی قوت نہیں کہ ان کے عذاب کو ہٹا سکے اور) یہ بات (کہ بلا جرم ہم سزا نہیں دیتے) اس سبب سے ہے (کہ ہمارا ایک قاعدہ کلیہ مقرر ہے اور بلا جرم سزا نہ دینا اسی قاعدہ کی ایک فرع ہے اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کسی ایسی نعمت کو جو کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتے جب تک کہ وہی لوگ اپنے ذاتی اعمال کو نہیں بدل ڈالتے اور یہ امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے جاننے والے ہیں (پس وہ تغیر قوی کو سننے ہیں تغیر فعلی کو جانتے ہیں۔ سو ان کفار موجودین نے اپنی یہ حالت بدلی کہ ان میں باوجود کفر کے اول ایمان لانے کی استعداد قریب تھی انکار و مخالفت کر کے اس کو بعید کر ڈالا پس ہم نے اپنی نعمت امہال کو جو پہلے سے ان کو حاصل تھی مبدل بنا کر دیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے بطریق مذکور نعمت قرب استعداد کو بدل ڈالا۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی دو آیتوں میں موت کے وقت کافروں کے عذاب اور فرشتوں کی تنبیہات کا ذکر ہے۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ اگر آپ ان کافروں کا حال اُس وقت دیکھتے جبکہ اللہ کے فرشتے ان کی روح قبض کرنے کے وقت ان کے پیہروں اور پشتوں پر مار رہے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے کہ آگ میں جلنے کا عذاب چکھو۔ تو آپ ایک بڑا ہیبتناک منظر دیکھتے۔

ائمہ تفسیر میں سے بعض حضرات نے اس کو اُن کفار قریش کے متعلق قرار دیا ہے جو میدان بدر میں مسلمانوں کے مقابلہ پر آئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی امداد کے لئے فرشتوں کا شکر

بھیج دیا تھا اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ میدانِ بدر میں جو قریشی مردار مارے گئے اُن کے مارنے میں فرشتوں کا ہاتھ تھا جو اُن کے سامنے سے چہروں پر اور پیچھے سے اُن کی پشتوں پر مار کر اُن کو ہلاک کر رہے تھے اور ساتھ ہی آخرت میں جہنم کے عذاب کی خبر سن رہے تھے۔

اور جن حضرات نے الفاظِ آیت کے عموم کی بنا پر اس کا مضمون عام رکھا ہے اُن کے مطابق معنی آیت کے یہ ہیں کہ جب کوئی کافر مرتا ہے فرشتہ موت اُن کی روح قبض کرنے کے وقت اُن کے چہرہ اور پشت پر مارتا ہے بعض روایات میں ہے کہ آگ کے کوڑے اور لوہے کے گرز اُن کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جن سے وہ مرنے والے کافر کو مارتے ہیں۔ مگر چونکہ اس عذاب کا تعلق اس عالمِ عالم سے نہیں بلکہ عالمِ قبر سے ہے جس کو برزخ کہا جاتا ہے اس لئے یہ عذاب عام طور پر آنکھوں سے نہیں دیکھا جاتا۔

اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ خطاب کیا گیا کہ اگر آپ دیکھتے تو بڑا عبرتناک منظر دیکھتے اس سے معلوم ہوا کہ موت کے بعد عالمِ برزخ میں کفار کو عذاب ہوتا ہے مگر اُس کا تعلق عالمِ غیب سے ہے اس لئے عام طور پر دیکھا نہیں جاتا۔ عذابِ قبر کا ذکر قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی آیا ہے اور روایاتِ حدیث تو اس معاملہ میں بے شمار ہیں۔

دوسری آیت میں کفار کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ عذاب دنیا و آخرت تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے چونکہ عام کاروبار ہاتھوں ہی سے وجود میں آتے ہیں اس لئے ہاتھوں کا ذکر کر دیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں کہ بلا وجہ کسی کو عذاب میں مبتلا کر دیں۔

تیسری آیت میں بتلایا گیا کہ ان مجرموں پر اللہ تعالیٰ کا یہ عذاب کوئی انوکھی چیز نہیں بلکہ عادت اللہ ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے اُن کو عقل و فہم دیتے ہیں۔ گرد و پیش میں اُن کے لئے بشمار ایسی چیزیں موجود ہوتی ہیں جن میں غور و فکر کرنے سے وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت و عظمت کو پہچانیں اور عاجز مخلوق کو اُس کا شریک نہ بنائیں پھر مزید تنبیہ کے لئے اپنی کتابیں اور رسول بھیجتے ہیں۔ اللہ کے رسول اُن کے افہام و تفہیم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے وہ اُن کو اللہ تعالیٰ کی قوتِ قاہرہ کے مظاہر بھی بشکل معجزات دکھلاتے ہیں۔ جب کوئی فرد یا قوم ان سب چیزوں سے بالکل استغنیاء کر لے اور خدائی تنبیہات میں سے کسی پر کان نہ دھرے تو پھر عادت اللہ تعالیٰ کی ایسی لوگوں کے بارہ میں یہی ہے کہ دنیا میں بھی اُن پر عذاب آتا ہے اور آخرت کے دائمی عذاب میں بھی گرفتار ہوتے ہیں۔ ارشاد فرمایا کَذَّابٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ ذَّاب کے معنی عادت کے ہیں مطلب یہ ہے کہ جیسے اِلٰی فِرْعَوْنَ اور اُن سے پہلے کافروں

سرکشوں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی عادت دنیا کو معلوم ہو چکی ہے کہ فرعون کو اس کے سارے حشم و خدم سمیت دریا میں غرق کر دیا اور اُن سے پہلے عاد و ثمود کی قوموں کو مختلف قسم کے عذابوں سے ہلاک کر دیا۔ کَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور نشانیوں کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے عذاب میں پکڑ لیا۔ اِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قوی ہے کوئی قوت و شجاعت والا اپنی قوت کے بل پر اُس کے عذاب سے نہیں چھوٹ سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ کی سزا بھی بڑی سخت ہے۔

چوتھی آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے انعام و عطا کے قائم اور باقی رکھنے کا ایک ضابطہ بیان فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا اِنَّ اللَّهَ لَكُمۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ مُغَيِّرُۢ نِعْمَةٍ اَنْعَمَهَا عَلٰی قَوْمٍ رَّحۡشٰی يُغَيِّرُۢ اُمۡاِیۡاۤنَفْسِهِمۡ یعنی اللہ تعالیٰ جو نعمت کسی قوم کو عطا فرماتے ہیں اُس کو اُس وقت تک بدلے نہیں جب تک یہ لوگ خود ہی اپنے حالات اور اعمال کو نہ بدل دیں۔

یہاں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے عطا و نعمت کے لئے کوئی ضابطہ نہیں بیان فرمایا، نہ اُس کے لئے کوئی قید و شرط لگائی نہ اُس کو کسی کے اچھے عمل پر موقوف رکھا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو سب سے پہلی نعمت جو خود ہمارا وجود ہے اور اُس میں قدرت حق جل شانہ کی عجیب صنعت گری سے ہزاروں حیرت انگیز نعمتیں ودیعت رکھی گئی ہیں یہ نعمتیں ظاہر ہے کہ اُس وقت عطا ہوئیں جب کہ نہ ہم تھے نہ ہمارا کوئی عمل تھا۔

ما نَبُوۡدِیۡمُ وَتَقَاۡضٰی مَا نَبُوۡدُ لطف تو ناگفتہ ما می شہود
اگر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات بندوں کے نیک اعمال کے منتظر رہا کرتے تو ہمارا وجود ہی قائم نہ ہوتا۔

حق تعالیٰ کی نعمت و رحمت تو اُس کے رب العالمین اور رحمن و رحیم ہونے کے نتیجہ میں خود بخود ہے۔ ہاں اس نعمت و رحمت کے قائم اور باقی رہنے کا ایک ضابطہ اس آیت میں یہ بیان کیا گیا کہ جس قوم کو اللہ تعالیٰ کوئی نعمت دیتے ہیں اُس سے اُس وقت تک واپس نہیں لیتے جب تک وہ اپنے حالات اور اعمال کو بدل کر خود ہی اللہ کے عذاب کو دعوت نہ دے۔

حالات کے بدلنے سے مراد یہ ہے کہ اچھے اعمال اور حالات کو بدل کر بُرے اعمال اور بُرے حالات اختیار کر لے یا یہ کہ اللہ کی نعمتیں مبتدول ہونے کے وقت جن اعمال بد اور گناہوں میں مبتلا تھا نعمتوں کے ملنے کے بعد اُن سے زیادہ بُرے اعمال میں مبتلا ہو جائے۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جن قوموں کا ذکر پچھلی آیات میں آیا ہے یعنی کفار قریش اور آل فرعون ان کا تعلق اس آیت سے اس بنا پر ہے کہ یہ لوگ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ملنے کے

وقت بھی کچھ اچھے حالات میں نہیں تھے سب کے سب مشرک اور کافر ہی تھے۔ لیکن انعامات کے بعد یہ لوگ اپنی بد عملیوں اور شرارتوں میں پہلے سے زیادہ تیز ہو گئے۔

آل فرعون نے بنی اسرائیل پر طرح طرح کے مظالم کرنے شروع کر دیئے، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ اور مخالفت پر آمادہ ہو گئے جو ان کے پچھلے جرائم میں ایک شدید اضافہ تھا جس کے ذریعہ انہوں نے اپنے حالات مزید برائی کی طرف بدل ڈالے تو اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی نعمت کو نفقت اور عذاب سے بدل دیا۔ اسی طرح قریش مکہ اگرچہ مشرک اور بد عمل تھے لیکن اس کے ساتھ ان میں کچھ اچھے اعمال صلہ رحمی، مہمان نوازی، حجاج کی خدمت، بیت اللہ کی تعظیم وغیرہ بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر دین و دنیا کی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے۔ دنیا میں ان کی تجارتوں کو فروغ دیا۔ اور ایسے ملک میں جہاں کسی کا تجارتی قافلہ سلامتی سے نہ گزر سکتا تھا ان لوگوں کے تجارتی قافلے ملک شام و یمن میں جاتے اور کامیاب آتے تھے جس کا ذکر قرآن کریم نے سورہ لایلف میں رَحْلَةَ الشَّتَاءِ وَالصَّيْفِ کے عنوان سے کیا ہے۔

اور دین کے اعتبار سے وہ عظیم نعمت ان کو عطا ہوئی جو پچھلی کسی قوم کو نہیں ملی تھی کہ سید الانبیاء خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ان میں مبعوث ہوئے اللہ تعالیٰ کی آخری اور جامع کتاب قرآن ان میں بھیجی گئی۔

مگر ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کی شکر گزاری اور قدر کرنے اور اس کے ذریعہ اپنے حالات کو درست کرنے کے بجائے پہلے سے بھی زیادہ گندے کر دیئے کہ صلہ رحمی کو چھوڑ کر مسلمان ہو جانے والے بھائی بھتیجیوں پر وحشیانہ مظالم کرنے لگے۔ مہمان نوازی کے بجائے ان مسلمانوں پر آب و دانہ بند کرنے کے عہد نامے لکھے گئے۔ حجاج کی خدمت کے بجائے مسلمانوں کو حرم میں داخل ہونے سے روکنے لگے۔ یہ وہ حالات تھے جن کو کفار قریش نے بدلا۔ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو نفقتوں اور عذاب کی صورت میں تبدیل کر دیا کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوئے اور جو ذات رحمۃ اللعالمین بن کر آئی تھی اُسی کے ذریعہ انہوں نے اپنی موت و ہلاکت کو دعوت دے دی۔

اور تفسیر مظہری میں معتمد کتب تاریخ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کلاب بن مرہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب میں تیسرے دادا کے دادا ہیں یہ ابتداء سے دین ابراہیم و اسماعیل علیہ السلام کے پابند اور اُس پر قائم تھے اور نسل بعد نسل اس دین کی قیادت و سیادت ان کے ہاتھ میں رہی۔ قصی بن کلاب کے زمانہ میں ان لوگوں میں بت پرستی کا آغاز ہوا۔ ان سے پہلے کعب بن لوی ان کے دینی قائد تھے جمعہ کے روز جس کو ان کی زبان میں عروبہ کہا جاتا تھا سب لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کرتے اور بتلایا

کرتے تھے کہ ان کی اولاد میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوں گے۔ اُن کا اتباع سب پر لازم ہوگا۔ جو اُن پر ایمان نہ لائے گا اُس کا کوئی عمل قابل قبول نہ ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں اُن کے عربی اشعار شعراء جاہلیت میں مشہور و معروف ہیں۔ اور قتیب بن کلاب تمام حجاج کے لئے کھانے اور پانی کا انتظام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں آپ کے عہد مبارک تک قائم رہیں۔ اس تاریخی تشریح سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ قریش کی تبدیلی حالات سے یہ مراد ہو کہ دین ابراہیمی کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار کر لی۔

بہر حال مضمون آیت سے یہ معلوم ہوا کہ بعض اوقات حق تعالیٰ اپنی نعمت بعض ایسے لوگوں کو بھی عطا فرماتے ہیں جو اپنے عمل سے اُس کے مستحق نہیں ہوتے لیکن عطاۃ نعمت کے بعد اگر وہ اپنے اعمال کا رخ اصلاح و درستی کی طرف پھرنے کے بجائے اعمالِ بد میں اور زیادتی کرنے لگیں تو پھر یہ نعمت اُن سے چھین لی جاتی ہے اور وہ عذابِ الہی کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

آخر آیت میں فرمایا **وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ** یعنی اللہ تعالیٰ ان کی ہر گفتگو کو سننے والے اور اُن کے تمام اعمال و افعال کو جاننے والے ہیں اس میں کسی غلطی یا غلط فہمی کا امکان نہیں۔

كَذٰبٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوْا بِآیٰتِ رَبِّهِمْ

جیسے دستور فرعون والوں کا اور جو ان سے پہلے تھے، کہ انھوں نے جھٹلائیں باتیں اپنے رب کی

فَاَهْلٰكُنْهُمْ یٰۤاَنۡزِلُ نُوْرٌۢ بِہُمْ وَاَغْرَقْنَا اِلٰ فِرْعَوْنَ وَ كُلٌّۭ کَانُوْا

پھر ہلاک کر دیا ہم نے ان کو اُن کے گناہوں پر اور ڈبو دیا ہم نے فرعون والوں کو، اور سارے

ظٰلِمِیْنَ ۝۵۴ اِنَّ شَرَّ الدّٰوَابِّ عِنۡدَ اللّٰهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَہُمْ لَا

ظالم تھے۔ بدتر سب جانداروں میں اللہ کے ہاں وہ ہیں جو منکر ہوئے پھر وہ نہیں

یُؤْمِنُوْنَ ۝۵۵ الَّذِیْنَ عٰہَدَتۡ مِنْہُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عٰہِدَہُمْ فِی

ایمان لاتے۔ جن سے تو نے معاہدہ کیا ہے ان میں سے پھر وہ توڑتے ہیں اپنا عہد

کُلِّ مَرَّةٍ وَہُمْ لَا یَتَّقُوْنَ ۝۵۶ فَاِمَا تَشْفٰیہُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ

ہر بار اور وہ ڈر نہیں رکھتے۔ سو اگر کبھی توبائے اُن کو لڑائی میں تو اُن کو ایسی مزا

بِہِمۡ مِّنۡ خَلْفَہُمْ لَعَلَّہُمْ یَذۡکُرُوْنَ ۝۵۷ وَاِمَا تَخَافُنَ مِنْ قَوْمٍ

دے کہ دیکھ کر بھاگ جائیں ان کے پچھلے تاکہ ان کو عبرت ہو۔ اور اگر تجھ کو ڈر ہو کسی قوم سے

خِیَآئَۃٍ فَاَنْذِرْہِمْ عَلٰی سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ ۝۵۸

دغا کا تو پھینک دے ان کا عہد ان کی طرف ایسی طرح برکہ ہو جاوے کہ وہ برابر، بیشک اللہ کو خوش نہیں آتے دغا باز۔

۵۸

ابتداء وجود سے لے کر موجودہ حالات تک اُس کی نعمتوں ہی میں ان کی پرورش ہوئی ہے اُسی کی نشانیوں کو جھٹلانے لگے۔

نیز پہلی آیت فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوبِهِمْ فرمایا تھا یہاں فَاَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ ارشاد فرمایا۔ اس میں اس اجمال کی تفصیل و تشریح ہو گئی کیونکہ پہلی آیت میں ان کا عذاب میں پکڑا جانا ذکر کیا گیا جس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ زندہ اور باقی رہتے ہوئے مصیبتوں میں گرفتار ہو جائیں یا سرے سے ان کا وجود ہی ختم کر دیا جائے۔ اس آیت میں اَهْلَكْنَاهُمْ فرما کر واضح کر دیا کہ ان سب قوموں کی سزا سزائے موت تھی ہم نے ان سب کو ہلاک کر ڈالا۔ ہر قوم کی ہلاکت کی مختلف صورتیں ظاہر ہوئیں ان میں سے فرعون چونکہ خدائی کا دعویدار تھا اور اس کی قوم اُس کی تصدیق کرتی تھی اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کر دیا گیا وَاعْرَقْنَاهُ الْفَوْرُغُونَ یعنی ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا۔ دوسری قوموں کی ہلاکت کی صورتیں یہاں بیان نہیں کی گئیں دوسری آیات میں اُس کی بھی تفصیل موجود ہے کہ کسی پر زلزلہ آیا، کوئی زمین کے اندر دھنسا دی گئی، کسی کی صورتیں مسخ ہو گئی، کسی پر ہوا کا طوفان مسلط ہو گیا اور آخر میں مشرکین مکہ پر غزوہ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے عذاب آیا۔

اس کے بعد کی آیت میں انھیں کافروں کے بارہ میں ارشاد فرمایا اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اس میں لفظ دواب دابقہ کی جمع ہے جس کے لغوی معنی زمین پر چلتے والے کے ہیں اس لئے انسان اور جتنے جانور زمین پر چلتے ہیں سب کو یہ لفظ شامل ہے مگر عام محاورات میں یہ لفظ خاص چوپائے جانوروں کے لئے بولا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا حال بے شعوری میں جانوروں سے بھی زیادہ گرا ہوا تھا اس لئے اس لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ معنی آیت کے واضح ہیں کہ تمام جانوروں اور انسانوں میں سب سے بدترین جانور یہ لوگ ہیں۔ آخر آیت میں فرمایا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ یعنی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی خداداد استعداد و قابلیت کو ضائع کر دیا، چوپائے جانوروں کی طرح کھانے پینے سونے جاگنے کو مقصد زندگی بنا لیا، اس لئے ان کی رسائی ایمان تک نہیں ہو سکتی۔

حضرت سعید بن جبیرؓ نے فرمایا کہ یہ آیت یہود کے چھ آدمیوں کے بارہ میں آئی ہے جن کے متعلق حق تعالیٰ نے پیشگی خبر دی کہ یہ لوگ آخر تک ایمان نہیں لائیں گے۔

نیز اس لفظ میں اُن لوگوں کو عذاب سے مستثنیٰ کرنا منظور ہے جو اگرچہ اُس وقت کفار کے ساتھ لگے ہوئے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف جدوجہد میں مشغول ہیں مگر آئندہ کسی وقت اسلام قبول کر کے اپنی سابق غلط کاریوں سے توبہ کر لیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ان میں سے بہت بڑی جماعت مسلمان ہو کر نہ صرف خود صالح و متقی بن گئی بلکہ دنیا کے لئے مصلح اور تقویٰ کی داعی بن کر کھڑی ہوئی۔

تیسری آیت الذین عہدت منہم ثم ینقضون عہدہم فی کل مرۃ وہم لا یتقون۔ یہ آیت یہود مدینہ بنو قریظہ اور بنو نضیر کے متعلق ہے۔ پچھلی آیتوں میں مشرکین مکہ پر میدان بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں عذاب الہی نازل ہونے کا ذکر اور پچھلی آیتوں کے کفار سے اُن کی تمثیل کا بیان ہوا تھا۔ اس آیت میں اُس ظالم جماعت کا ذکر ہے جو ہجرت مدینہ کے بعد مسلمانوں کے لئے مارِ آستین بنی اور جو ایک طرف مسلمانوں کے ساتھ صلح و آشتی کی دعویٰ دار تھی دوسری طرف مشرکین مکہ کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتی تھی۔ یہ لوگ مذہباً یہود تھے اور جس طرح مشرکین مکہ میں اسلام کے خلاف سب سے بڑا علمبردار ابو جہل تھا اسی طرح یہود مدینہ میں اس کا علمبردار کعب بن اشرف تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے۔ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر یہ لوگ مرعوب تو ہوئے مگر دل میں اسلام دشمنی کی آگ ہمیشہ سلگتی رہتی تھی۔

اسلامی سیاست کا تقاضا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو یہود مدینہ کو کسی نہ کسی معاہدہ کے تحت ساتھ لگایا جائے۔ تاکہ وہ مکہ والوں کو مدد نہ پہنچائیں۔ یہود بھی اپنی مرغوبیت کی بنا پر اسی کے خواہشمند تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ پہنچ کر اسلامی سیاست کی سب سے پہلی بنیاد اس کو بنایا کہ ہاجرین و انصار کی وطنی اور قومی عصبیتوں کو ختم کر کے ایک نئی قومیت اسلام کے نام پر قائم فرمائی۔ ہاجرین و انصار کے مختلف قبائل کو آپس میں بھائی بھائی بنادیا۔ اور آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انصار کے باہمی اختلافات جو صدیوں سے چلے آ رہے تھے سب کو دور فرما کر آپس میں بھی اور ہاجرین کے ساتھ بھی بھائی بھائی بنادیا۔

اس سیاست کا دوسرا قدم یہ تھا کہ حریف مقابل دو تھے ایک مشرکین مکہ جن کی ایذاؤں نے مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دوسرے یہود مدینہ جو اب مسلمانوں کے پڑوسی بن گئے تھے ان میں سے یہود کے ساتھ ایک معاہدہ کیا گیا جس کا

دوسرا قدم
معاہدہ یہود

عہد نامہ مفصل لکھا گیا اس معاہدہ کی پابندی اطراف مدینہ کے سب یہودیوں پر اور اس طرف تمام ہاجرین و انصار پر عائد تھی۔ معاہدہ کا پورا متن البدایہ والنہایہ ابن کثیر میں اور سیرت ابن ہشام وغیرہ میں مفصل موجود ہے اس کا سب سے اہم جز یہ تھا کہ باہمی اختلاف کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ سب کے لئے واجب التعمیل ہو گا اور ہر جز یہ تھا کہ یہود مدینہ مسلمانوں کے خلاف کسی دشمن کو ظاہر یا باطناً کوئی امداد نہیں دیں گے۔ لیکن ان لوگوں نے غزوہ بدر کے وقت عہد شکنی

کر کے مشرکین مکہ کو اسلحہ اور سامان جنگ سے مدد پہنچائی۔ مگر جب غزوہ بدر کا انجام مسلمانوں کی فتح مبین اور کفار کی ہزیمت و شکست کی صورت میں سامنے آیا تو پھر ان لوگوں پر رعب غالب ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہو کر عذر کیا کہ اس مرتبہ ہم سے غلطی ہو گئی اس کو معاف فرمادیں آئندہ عہد شکنی نہیں کریں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی حکم و کرم جو آپ کا شعار تھا اُس کی بنا پر دوبارہ معاہدہ کی تجدید فرمائی۔ مگر یہ لوگ اپنی سرشت سے مجبور تھے غزوہ اُحد میں مسلمانوں کی ابتدائی شکست اور نقصان کا علم ہو کر ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور ان کا سردار کعب بن اشرف خود سفر کر کے مکہ پہنچا اور مشرکین مکہ کو اس پر آمادہ کیا گیا کہ اب وہ پوری تیاری کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کریں اور یہود مدینہ اُن کے ساتھ ہوں گے۔

یہ دوسری عہد شکنی تھی جو ان لوگوں نے اسلام کے خلاف کی۔ آیت مذکورہ میں اس بار بار کی عہد شکنی کا ذکر فرما کر ان لوگوں کی شرارت بیان کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن سے آپ نے معاہدہ کر لیا مگر یہ ہر مرتبہ اپنے عہد کو توڑتے رہے۔ آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ۔ یعنی یہ لوگ ڈرتے نہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بدنصیب لوگ چونکہ ہوس دنیا میں مست و بے ہوش ہیں آخرت کی فکر ہی نہیں اس لئے آخرت کے عذاب سے نہیں ڈرتے۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے بدکردار عہد شکن لوگوں کا جو انجام بد اس دنیا میں ہوا کرتا ہے یہ لوگ اپنی غفلت و نادانی کی وجہ سے اُس سے نہیں ڈرتے۔

پھر ساری دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ان لوگوں نے اپنی اس بدکرداری کی سزا چکھی۔ ابو جہل کی طرح کعب بن اشرف مارا گیا، اور یہود مدینہ جلا وطن کئے گئے۔

چوتھی آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان بدعہدوں کے بارہ میں ایک ہدایت نامہ دیا جس کے الفاظ یہ ہیں

فَإِمَّا تَنْتَقِفْهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّذْ بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ لَعَلَّهِمْ يَذَّكَّرُونَ ۝

اس میں لفظ تَنْتَقِفْهُمْ کے معنی ہیں ان پر قابو پانے کے اور شَرِّذْ مصدر تشرید سے بنا ہے جس کے اصلی معنی بھاگ دینے اور منتشر کر دینے کے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں کہ اگر آپ کسی جنگ میں ان لوگوں پر قابو پالیں تو ان کو ایسی سخت دردناک سزا دیں جو دوسروں کے لئے عبرت ہو جائے ان کے پیچھے جو لوگ ان کے سپاہیوں پر اسلام دشمنی میں لگے ہوئے ہیں وہ یہ سمجھ لیں کہ اب خیر اسی میں ہے کہ یہاں سے بھاگ کر اپنی جان بچائیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ ان کو ایسی سزا دی جائے جس کو دیکھ کر مشرکین مکہ اور دوسرے دشمن قبال بھی متاثر ہوں اور آئندہ اُن کو مسلمانوں کے

مقابلہ میں آنے کی جرأت نہ رہے۔

آخر آیت میں لَعَلَّكُمْ يَذَكَّرُونَ فرما کر رب العالمین کی رحمت عامہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ اس دردناک سزا کا اصلی مقصد بھی کوئی انتقام لینا یا اپنے غصہ کو فرو کرنا نہیں بلکہ انھیں کی یہ مصلحت ہے کہ شاید یہ صورت حال دیکھ کر یہ لوگ کچھ ہوش میں آجائیں اور اپنے کئے پر تادم ہو کر اپنی اصلاح کر لیں۔

پانچویں آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ و صلح کے فتانوں کی ایک اہم دفعہ بتلائی گئی ہے جس میں معاہدہ کی پابندی کی خاص اہمیت کے ساتھ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ اگر کسی وقت معاہدہ کے دوسرے فریق کی طرف سے خیانت

معاہدہ صلح کو ختم کرنے کی صورت

یعنی عہد شکنی کا خطرہ پیدا ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ ہم معاہدہ کی پابندی کو بدستور قائم رکھیں لیکن یہ بھی جائز نہیں کہ معاہدہ کو صاف طور پر ختم کر دینے سے پہلے ہم اُن کے خلاف کوئی اقدام کریں بلکہ صحیح صورت یہ ہے کہ اُن کو اطمینان و فرصت کی حالت میں اس سے آگاہ کر دیا جائے کہ تمھاری بدنیتی یا خلاف ورزی ہم پر ظاہر ہو چکی ہے یا یہ کہ تمھارے معاملات مشتبہ نظر آتے ہیں اس لئے ہم آئندہ اس معاہدہ کے پابند نہیں رہیں گے تم کو بھی ہر طرح اختیار ہے کہ ہمارے خلاف جو کارروائی چاہو کرو۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں

وَأَمَّا اتِّخَافُكُمْ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةٌ فَانذِرْهُمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ۔
یعنی اگر آپ کو کسی قوم معاہدہ سے خیانت اور عہد شکنی کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو اُن کا عہد اُن کی طرف ایسی صورت سے واپس کر دیں کہ آپ اور وہ برابر ہو جائیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

مطلب یہ ہے کہ جس قوم کے ساتھ کوئی معاہدہ صلح ہو چکا ہے اُس کے مقابلہ میں کوئی جنگی اقدام کرنا خیانت میں داخل ہے اور اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے اگرچہ یہ خیانت دشمن کافروں ہی کے حق میں کی جائے۔ وہ بھی جائز نہیں البتہ اگر دوسری طرف سے عہد شکنی کا خطرہ پیدا ہو جائے تو ایسا کیا جاسکتا ہے کہ کھلے طور پر ان کو اعلان کے ساتھ آگاہ کر دیں کہ ہم آئندہ معاہدہ کے پابند نہیں رہیں گے۔ مگر یہ اعلان ایسی طرح ہو کہ مسلمان اور دوسرا فریق اُس میں برابر ہوں۔ یعنی ایسی صورت نہ کی جائے کہ اس اعلان و تنبیہ سے پہلے اُن کے مقابلہ کی تیاری کر لی جائے اور وہ خالی الذہن ہونے کی بنا پر تیاری نہ کر سکیں بلکہ جو کچھ تیاری کرنا ہے وہ اس اعلان و تنبیہ کے بعد کریں۔

یہ ہے اسلام کا عدل و انصاف کہ خیانت کرنے والے دشمنوں کے بھی حقوق کی حفاظت کی

جاتی ہے اور مسلمانوں کو اُن کے مقابلہ میں اس کا پابند کیا جاتا ہے کہ عہد کو واپس کرنے سے پیشتر کوئی طیاری بھی اُن کے خلاف نہ کریں۔ (منظہری وغیرہ)

ایفائے عہد کا ایک واقعہ عجیبہ | ابو داؤد، ترمذی، نسائی، امام احمد بن حنبل نے سلیم بن عامر کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کا ایک قوم

کے ساتھ ایک میعاد کے لئے التواء جنگ کا معاہدہ تھا۔ حضرت معاویہؓ نے ارادہ فرمایا کہ اس معاہدہ کے ایام میں اپنا لشکر اور سامان جنگ اُس قوم کے قریب پہنچا دیں تاکہ معاہدہ کی میعاد ختم ہوتے ہی وہ دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ مگر عین اُس وقت جب حضرت معاویہؓ کا لشکر اُس طرف روانہ ہو رہا تھا یہ دیکھا گیا کہ ایک معمر آدمی گھوڑے پر سوار بڑے زور سے یہ نعرہ لگا رہے ہیں **اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَفَاءٌ لَا غَدْرًا**۔ یعنی نعرہ تکبیر کے ساتھ یہ کہا کہ ہم کو معاہدہ پورا کرنا چاہئے اُس کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس قوم سے کوئی صلح یا ترک جنگ کا معاہدہ ہو جائے تو چاہئے کہ ان کے خلاف نہ کوئی گرہ کھولیں اور نہ باندھیں۔ حضرت معاویہؓ کو اس کی خبر کی گئی۔ دیکھا تو یہ کہنے والے بزرگ حضرت عمرو بن عبسہؓ صحابی تھے۔ حضرت معاویہؓ نے فوراً اپنی فوج کو واپسی کا حکم دے دیا تاکہ التواء جنگ کی میعاد میں لشکر کشی پر اقدام کر کے خیانت میں داخل نہ ہو جائیں۔ (ابن کثیر)

وَلَا يَحْسِبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا إِنَّهُمْ لَا يَعْزِمُونَ ۝۵۹

اور یہ نہ سمجھیں کافر لوگ کہ وہ بھاگ نکلے، وہ ہرگز تھکا نہ سکیں گے ہم کو۔

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ

اور تیار کرو اُن کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے

تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ

کہ اُس سے دھاک پڑے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر اور دوسروں پر اُن کے سوا،

لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۖ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي

جن کو تم نہیں جانتے، اللہ اُن کو جانتا ہے، اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ

سَبِيلِ اللَّهِ يُوفِّيَ الْيَكْمَ وَأَنْتُمْ لَا تَظْلَمُونَ ۝۶۰ وَإِنْ جَنَحُوا

کی راہ میں وہ پورا ملے گا تم کو اور تمہارا حق نہ رہ جائے گا۔ اور اگر وہ جھکیں

لِلسَّلَامِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝۶۱

صلح کی طرف تو تو بھی جھک اُسی طرف اور بھروسہ کر اللہ پر، بیشک وہی ہے سننے والا جاننے والا۔

وَاِنْ يُرِيدُوا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِیْ

اور اگر وہ چاہیں کہ تجھ کو دغا دیں تو تجھ کو کافی ہے اللہ، اُسی نے

اَیَّدَكَ بِنَصْرِہٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۲﴾

تجھ کو زور دیا اپنی مدد کا اور مسلمانوں کا ۔

خلاصہ تفسیر

اور کافر لوگ اپنے کو یہ خیال نہ کریں کہ وہ بچ گئے یقیناً وہ لوگ (خدا تعالیٰ کو) عاجز نہیں کر سکتے (کہ اس کے ہاتھ نہ آئیں یا تو دنیا ہی میں مبتلائے عقوبت کر دے گا ورنہ آخرت میں تو یقینی ہے) اور ان کافروں سے (مقابلہ کرنے) کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پیلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اس (سامان) کے ذریعہ سے تم (اپنا) رعب جمائے رکھو ان پر جو کہ (کفر کی وجہ سے) اللہ کے دشمن ہیں اور (تمہاری فکر میں رہنے کی وجہ سے) تمہارے دشمن ہیں (جن سے شب و روز تم کو سابقہ پڑتا رہتا ہے) اور ان کے علاوہ دوسرے کافروں پر بھی (رعب جمائے رکھو) جن کو تم (بالیقین) نہیں جانتے (بلکہ) ان کو اللہ ہی جانتا ہے (جیسے کفار فارس اور روم وغیرہم جن سے اس وقت سابقہ نہیں پڑا مگر صحابہ کا ساز و سامان و فن سپہگری اپنے وقت میں ان کے مقابلہ میں بھی کام آیا اور ان پر بھی رعب جما، بعض مقابل ہو کر مغلوب ہوئے بعض نے جزیہ قبول کیا کہ یہ بھی اثر رعب کا ہے) اور اللہ کی راہ میں (جس میں جہاد بھی آگیا) جو کچھ بھی خرچ کر دو گے (جس میں وہ خرچ بھی آگیا جو ساز و راق درست کرنے میں کیا جائے) وہ (یعنی اس کا ثواب) تم کو (آخرت میں) پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارے لئے (اس میں) کچھ کمی نہ ہوگی اور اگر وہ (کفار) صلح کی طرف جھکیں تو آپ (کو) بھی (اجازت ہے کہ اگر اس میں مصلحت دیکھیں تو) اس طرف جھک جائیے اور (اگر باوجود مصلحت کے یہ احتمال ہو کہ یہ ان کی چال نہ ہو تو) تو اللہ پر بھروسہ رکھنے (ایسے احتمالوں سے اندیشہ نہ کیجئے) بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے (ان کے اقوال اور احوال کو سنتا جانتا ہے ان کا خود انتظام کر دے گا) اور اگر (واقع میں وہ احتمال صحیح ہو اور) وہ لوگ (سچے صلح سے) آپ کو دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تعالیٰ آپ (کی مدد اور حفاظت کرنے) کے لئے کافی ہیں (جیسا کہ اس کے قبل بھی آپ کی کفایت فرماتے تھے چنانچہ) وہ وہی ہے جس نے آپ کو اپنی (غیبی) امداد (یعنی ملائکہ) سے اور (ظاہری امداد یعنی) مسلمانوں سے قوت دی ۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں اُن کفار کا ذکر ہے جو غزوہ بدر میں مشرک نہیں تھے اس لئے بچ گئے یا مشرک ہونے کے بعد بھاگ نکلے اس طرح اپنی جان بچالی۔ ان لوگوں کے متعلق اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ یوں نہ سمجھیں کہ ہم بچ نکلے۔ کیونکہ غزوہ بدر کفار کے لئے ایک عذاب الہی تھا اور اُس کی پکڑ سے بچنا کسی کے بس میں نہیں۔ اس لئے فرمایا اِنَّهُمْ لَا يُجْرُونَ یعنی یہ لوگ اپنی چالاکی سے اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے وہ جب پکڑنا چاہیں گے یہ ایک قدم نہ سرک سکیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ دنیا ہی میں پکڑ لئے جائیں ورنہ آخرت میں تو ان کی گرفتاری ظاہر ہے۔

اس آیت نے اس طرف اشارہ کر دیا کہ کوئی مجرم گناہگار اگر کسی مصیبت اور تکلیف سے نجات پا جائے اور پھر بھی توبہ نہ کرے بلکہ اپنے جرم پر ڈٹا رہے تو یہ اس کی علامت نہ سمجھو کہ وہ کامیاب ہو گیا اور ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا بلکہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی گرفت میں ہے اور یہ ڈھیل اُس کے عذاب اور مصیبت کو اور بڑھا رہی ہے گو اُس کو محسوس نہ ہو۔

جہاد کے لئے اسلحہ اور سامان | دوسری آیت میں اسلام سے دفاع اور کفار کے مقابلہ کے لئے طیاری کے احکام ہیں، ارشاد فرمایا وَاعِدُوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ یعنی

سامان جنگ کی طیاری کرو کفار کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے۔ اس میں سامان جنگ کی طیاری کی ساتھ مَا اسْتَطَعْتُمْ کی قید لگا کر یہ اشارہ فرما دیا کہ تمہاری کامیابی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ تمہارے مقابل کے پاس جیسا اور جتنا سامان ہے تم بھی اتنا ہی حاصل کر لو۔ بلکہ اتنا کافی ہے کہ اپنی مقدور بھر جو سامان ہو سکے وہ جمع کر لو تو اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد تمہارے ساتھ ہوگی۔

اس کے بعد اُس سامان کی کچھ تفصیل اس طرح فرمائی مِنْ قُوَّتٍ یعنی مقابلہ کی قوت جمع کرو پاس میں تمام جنگی سامان اسلحہ، سواری وغیرہ بھی داخل ہیں اور اپنے بدن کی ورزش، فنون جنگ کا سیکھنا بھی قرآن کریم نے اس جگہ اُس زمانہ کے مروجہ ہتھیاروں کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ قوت کا عام لفظ اختیار فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ یہ قوت ہر زمانہ اور ہر ملک و مقام کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے اُس زمانہ کے اسلحہ تیر، تلوار، نیزے تھے اس کے بعد بندوق توپ کا زمانہ آیا۔ پھر اب بموں اور راکٹوں کا وقت آگیا۔ لفظ قوت ان سب کو شامل ہے اس لئے آج کے مسلمانوں کو بقدر استطاعت ایٹمی قوت، ٹینک اور لڑاکا طیارے، آب دوزکشتیاں جمع کرنا چاہئے کیونکہ یہ سب اسی قوت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اور اس کے لئے جس علم و فن کو سیکھنے کی ضرورت پڑے وہ سب اگر اس نیت سے ہو کہ اس کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں سے دفاع کا اور کفار کے

مقابلہ کا کام لیا جائے گا تو وہ بھی جہاد کے حکم میں ہے۔

لفظ قَوَّت عام ذکر کرنے کے بعد ایک خاص قوت کا صراحت بھی ذکر فرمادیا وَصَتْ رَبَّ بِطِ
الْخَيْلِ لفظ رباط مصدری معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور مربوط کے معنی میں بھی پہلی صورت
میں اس کے معنی ہوں گے گھوڑے باندھنا اور دوسری صورت میں بندھے ہوئے گھوڑے۔ حاصل
دونوں کا ایک ہی ہے کہ جہاد کی نیت سے گھوڑے پالنا اور ان کو باندھنا یا پلے ہوئے گھوڑوں کو
جمع کرنا۔ سامان جنگ میں سے خصوصیت کے ساتھ گھوڑوں کا ذکر اس لئے کر دیا کہ اُس زمانہ میں
کسی ملک و قوم کے فتح کرنے میں سب سے زیادہ مؤثر و مفید گھوڑے ہی تھے۔ اور آج بھی بہت سے
ایسے مقامات ہیں جن کو گھوڑوں کے بغیر فتح نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ گھوڑوں کی پیشانی میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھ دی ہے۔

صحیح احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سامان جنگ فراہم کرنے اور اُس کے استعمال
کی مشق کرنے کو بڑی عبادت اور موجب ثواب عظیم قرار دیا ہے۔ تیر بنانے اور چلانے پر بڑے بڑے
اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔

اور چونکہ جہاد کا اصل مقصد اسلام اور مسلمانوں سے دفاع ہے اور دفاع ہر زمانہ اور ہر قوم کا
جدا ہوتا ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ
وَالسِّبْغَةَ (رواہ ابو داؤد والنسائی والدارمی عن انسؓ)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح دفاع و جہاد ہتھیاروں سے ہوتا ہے بعض اوقات زبان
سے بھی ہوتا ہے اور قلم بھی زبان ہی کے حکم میں ہے۔ اسلام اور قرآن سے کفر و الحاد کے حملوں
اور تحریفوں کی مدافعت زبان یا قلم سے یہ بھی اس صریح نص کی بنا پر جہاد میں داخل ہے۔
آیت مذکورہ میں سامان جنگ کی طیاری کا حکم دینے کے بعد اُس سامان کے جمع کرنے کی
مصلحت اور اصل مقصد بھی ان الفاظ میں بیان فرمایا تَرْهَبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ یعنی
سامان جنگ و دفاع جمع کرنے کا اصل مقصد قتل و قتال نہیں بلکہ کفر و شرک کو زیر کرنا اور
مرعوب و مغلوب کر دینا ہے وہ کبھی صرف زبان یا قلم سے بھی ہو سکتا ہے اور بعض اوقات اُس
کے لئے قتل و قتال ضروری ہوتا ہے۔ جیسی صورت حال ہو اُس کے مطابق دفاع کرنا فرض ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جنگ و جہاد کی طیاری سے جن لوگوں کو مرعوب کرنا مقصود ہے
اُن میں سے بعض کو تو مسلمان جانتے ہیں اور وہ وہ لوگ ہیں جن سے مسلمانوں کا مقابلہ جاری تھا
یعنی کفار مکہ اور۔ ہود مدینہ۔ اور کچھ وہ لوگ بھی ہیں جن کو ابھی تک مسلمان نہیں جانتے۔ مراد
اس سے پوری دنیا کے کفار و مشرکین ہیں جو ابھی تک مسلمانوں کے مقابلہ پر نہیں آئے مگر

آئندہ اُن سے بھی تصادم ہونے والا ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت نے بتلادیا کہ اگر مسلمانوں نے اپنے موجودہ حریف کے مقابلہ کی تیاری کر لی تو اس کا رعب صرف انہیں پر نہیں بلکہ دور دور کے کفار کسری و قیصر وغیرہ پر بھی پڑے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور خلفائے راشدین کے عہد میں یہ سب مغلوب و مرعوب ہو گئے۔

جنگی سامان جمع کرنے اور جنگ کرنے میں ضرورت مال کی بھی پڑتی ہے بلکہ سامان جنگ بھی مال ہی کے ذریعہ طیار کیا جاسکتا ہے اس لئے آخر آیت میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی فضیلت اور اُس کا اجر عظیم اس طرح بیان فرمایا ہے کہ اس راہ میں تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے اُس کا پورا پورا بدلہ تمہیں دے دیا جائے گا۔ بعض اوقات تو دنیا میں بھی مال غنیمت کی صورت میں یہ بدلہ مل جاتا ہے ورنہ آخرت کا بدلہ تو متعین ہے اور ظاہر ہے کہ وہ زیادہ قابل قدر ہے۔

تیسری آیت میں صلح کے احکام اور اس کے متعلقات کا بیان ہے ارشاد فرمایا **وَرَأَى جُنُودًا لِّلشَّكْرِ فَاجْتَنَحْ لَهَا لَفْظَ سَلَمٍ** بفتح السین اور **سَلَمٍ** بکسر السین دونوں طرح صلح کے معنی میں آتا ہے معنی آیت کے یہ ہیں کہ اگر کفار کسی وقت صلح کی طرف جھکیں تو آپ کو بھی جھک جانا چاہئے۔ یہاں صیغہ امر تنخیر کے لئے استعمال فرمایا ہے مراد یہ ہے کہ جب کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ کو بھی اختیار ہے اگر مسلمانوں کی مصلحت صلح میں محسوس کریں تو صلح کر سکتے ہیں۔ اور **رَأَى جُنُودًا** کی قید سے معلوم ہوا کہ صلح اُسی وقت کی جاسکتی ہے جب کفار کی طرف سے صلح کی خواہش ظاہر ہو۔ کیونکہ بغیر اُن کی خواہش کے اگر مسلمان خود ہی صلح کی تحریک کریں تو یہ اُن کی کمزوری سمجھی جائے گی۔

ہاں اگر کوئی موقع ایسا آپڑے کہ مسلمان کسی زرقہ میں گھر جائیں اور اپنی سلامتی کے لئے کوئی صورت بجز صلح کے نظر نہ آئے تو صلح میں پیش قدمی بھی بقول فقہاء جائز اور اشارات نصوص سے ثابت ہے۔

اور چونکہ دشمن کی جانب سے صلح کی خواہش ہونے میں یہ احتمال رہتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ دے کر غفلت میں ڈال دیں اور پھر یکبارگی حملہ کر دیں اس لئے آخر آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی کہ **وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ** یعنی آپ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں کہ وہی خوب سننے والے جاننے والے ہیں۔ وہ ان کی گفتگو کو بھی سنتے ہیں اور اُن کے دلوں میں چھپے ہوئے ارادوں کو بھی جانتے ہیں وہ آپ کی مدد کے لئے کافی ہیں۔ آپ ایسے بے دلیل احتمالات پر اپنے کاموں کی بنیاد نہ رکھیں۔ اور ایسے خطرات کو اللہ کے حوالہ کر دیں۔ اس کے بعد چوتھی آیت میں اسی مضمون کو اور زیادہ صراحت اور وضاحت کے ساتھ اس طرح

بیان فرمایا وَاِنْ يُرِيدُوا اَنْ يَّخْذُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِيْ اَيْدَكَ يَنْصُرُ ۝۶
وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۔

یعنی اگر بھی احتمال واقع ہو جائے کہ صلح کرنے سے اُن کی نیت خراب ہو آپ کو دھوکہ ہی دینا چاہیں تب بھی آپ کوئی پروا نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کے لئے کافی ہیں پہلے بھی اللہ تعالیٰ ہی کی امداد و تائید سے آپ کا کام چلا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مدد سے آپ کی تائید و سرمایہ جو آپ کی فتح و کامیابی کی اصل بنیاد اور حقیقت ہے اور ظاہری طور پر مسلمانوں کی جماعت آپ کی امداد کے لئے کھڑی کر دی جو اسباب ظاہرہ میں سے ہیں۔ تو جس مالک حقیقی اور قادر مطلق نے تمام اسباب فتح و کامیابی کو وجود عطا فرمایا وہ آج بھی دشمنوں کے دھوکہ فریب کے معاملہ میں آپ کی مدد فرمائے گا۔ اسی وعدہ خداوندی کے تحت اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عمر بھر کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ دشمنوں کے دھوکہ فریب سے کوئی گزند پہنچی ہو۔ اسی لئے علماء تفسیر نے فرمایا ہے کہ یہ وعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایسا ہے جیسا کہ وَاللّٰهُ يَعْصِيْكَ مِنْ النَّاسِ کا وعدہ کہ اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی کرتے والے صحابہ کرام کو مطمئن اور سبکدوش فرمادیا تھا۔ اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا (بیان القرآن)۔ دوسرے لوگوں کو ظاہری تدبیر اور گرد و پیش کے حالات کے تابع کام کرنا چاہئے۔

وَ اَلْفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۖ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّا

اور الفت ڈالی اُن کے دلوں میں ، اگر تو خرچ کر دیتا جو کچھ زمین میں ہے سارا نہ

اَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ

افت ڈال سکتا ان کے دلوں میں لیکن اللہ نے الفت ڈالی اُن میں ، بیشک وہ زور آور ہے

حٰكِمٌ ۝۶۳ يَّا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ

حکمت والا۔ اے نبی کافی ہے تجھ کو اللہ اور جتنے تیرے ساتھ ہیں

الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۶۴ يَّا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۖ

مسلمان۔ اے نبی شوق دلا مسلمانوں کو لڑائی کا ،

اِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتِيْنَ وَاِنْ

اگر ہوں تم میں بیس شخص ثابت قدم رہنے والے تو غالب ہوں دوسو پر ، اور اگر

يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا آلَ فِائِمٍ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِهِمْ

ہوں تم میں سو شخص تو غالب ہوں ہزار کافروں پر اس واسطے کہ وہ

قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ۖ (۶۵) الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ

لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ اب بوجھ ہلکا کر دیا اللہ نے تم پرے اور جانا کہ

فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا إِتَيْنَ

تم میں سستی ہے، سو اگر ہوں تم میں سو شخص ثابت قدم رہنے والے تو غالب ہوں دوسو پر،

وَأِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ

اور اگر ہوں تم میں ہزار تو غالب ہوں دو ہزار پر اللہ کے حکم سے، اور اللہ

مَعَ الصَّابِرِينَ ۖ (۶۶)

ساتھ ہے ثابت قدم رہنے والوں کے۔

خلاصہ تفسیر

اور (مسلمانوں کو ذریعہ امداد بنانے کے لئے) ان کے قلوب میں اتفاق پیدا کر دیا (چنانچہ ظاہر ہے کہ اگر باہم اتفاق نہ ہو تو کوئی کام خصوصاً دین کی نصرت مل کر نہیں کر سکتے اور ان میں بوجہ حب ریاست اور غلبہ بغض و عداوت اتفاق ایسا دشوار تھا کہ) اگر آپ (باوجودیکہ عقل و تدبیر بھی کامل رکھتے ہیں اور سامان بھی اس کے لئے آپ کے پاس کافی ہوتا تھا) دنیا بھر کا مال (اس کام کے لئے) خرچ کرتے تب بھی ان کے قلوب میں اتفاق پیدا نہ کر سکتے لیکن (یہ) اللہ ہی (کا کام تھا کہ اس) نے ان میں باہم اتفاق پیدا کر دیا بیشک وہ زبردست ہیں (کہ جو چاہیں اپنی قدرت سے کر دیں اور حکمت والے ہیں (کہ جس طریق سے مناسب جانیں اس کام کو کر دیں اور جب اللہ تعالیٰ کا اپنی غیبی امداد اور مؤمنین سے آپ کی نصرت فرمانا معلوم ہو گیا تو) اے نبی (اس سے ثابت ہو گیا کہ) آپ کے لئے (حقیقت میں) اللہ کافی ہے اور جن مؤمنین نے آپ کا اتباع کیا ہے (ظاہراً) وہ کافی ہیں اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ مؤمنین کو جہاد کی ترغیب دیجئے (اور اس کے متعلق یہ قانون سنا دیجئے کہ) اگر تم میں کے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو (اپنے سے دس گونہ عدد پر یعنی) دو سو پر غالب آجائیں گے اور (اسی طرح) اگر تم میں کے سو آدمی ہوں گے تو ہزار کفار پر غالب آجائیں گے اس وجہ سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (دین کو) کچھ نہیں سمجھتے (اور اس وجہ سے کفر پر مصر ہیں اور اس سبب سے ان کو غیبی امداد نہیں پہنچتی اس سبب سے وہ مغلوب

ہو جاتے ہیں پس تم پر واجب ہے کہ اپنے سے دس گونہ کے مقابلہ سے بھی پسپا نہ ہو۔ اول یہ حکم نازل ہوا تھا جب صحابہؓ پر شاق ہوا تو عرض کیا۔ ایک مدت کے بعد یہ دوسری آیت جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا نازل ہوئی (یعنی) اب اللہ تعالیٰ نے تم پر تخفیف کر دی اور معلوم کر لیا کہ تم میں ہمت کی کمی ہے سو (یہ حکم دیا جاتا ہے کہ) اگر تم میں کے سو آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو (اپنے سے دو گونہ عدد پر یعنی) دو سو پر غالب آجائیں گے اور (اسی طرح) اگر تم میں کے ہزار ہوں گے تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آجائیں گے اور (ہم نے جو صابر کی قید لگائی تو اس لئے کہ) اللہ تعالیٰ صابریں (یعنی جو دل اور قدم سے ثابت رہیں ان) کے ساتھ ہیں (یعنی ان کی مدد کرتے ہیں)۔

معارف و مسائل

سورۃ انفال کی مذکورہ چار آیاتوں میں سے پہلی آیت میں مسلمانوں کی فتح و کامیابی کے اصلی سبب اور اُس کے حصول کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خطاب کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے اپنی خاص مدد سے اور مسلمانوں کی جماعت سے آپ کی تائید اور نصرت فرمائی ہے۔ اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت سے کسی کی امداد و نصرت ظاہر ہے کہ صرف اُسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ یہ جماعت باہم متفق اور متحد ہو۔ اور بقدر اتفاق و اتحاد ہی اُس کی قوت اور وزن ہوتا ہے باہمی اتحاد و یگانگت کے رشتے قوی ہیں تو پوری جماعت قوی ہے اور اگر یہ رشتے ڈھیلے ہیں تو پوری جماعت ڈھیلی اور کمزور ہے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے اُس خاص انعام کا ذکر فرمایا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و نصرت کے لئے عام مسلمانوں پر ہوا کہ اُن کے دلوں میں مکمل وحدت و الفت پیدا کر دی گئی۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ سے پہلے ان کے دو قبیلوں۔ اوس و خزرج کے آپس میں شدید جنگیں لڑی جا چکی تھیں اور جھگڑے چلتے رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان جانی دشمنوں کو باہم شیر و شکر بھائی بھائی بنا دیا۔ مدینہ میں قائم ہونے والی نئی اسلامی ریاست کے قیام و بقا اور دشمنوں پر غالب آنے کا حقیقی اور معنوی سبب تو اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد تھی اور ظاہری سبب مسلمانوں کی آپس میں مکمل الفت و محبت اور اتفاق و اتحاد تھا۔

اسی کے ساتھ اس آیت میں یہ بھی بتلایا گیا کہ مختلف لوگوں کے دلوں کو جوڑ کر اُن میں الفت و محبت پیدا کرنا کسی انسان کے بس کا کام نہیں صرف اُس ذات کا کام ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی انسان ساری دنیا کی دولت بھی اس کام کے لئے خرچ کر ڈالے کہ باہم

مناقرت رکھنے والے لوگوں کے دلوں میں الفت پیدا کر دے تو وہ کبھی اس پر قابو نہیں پاسکتا۔
 مسلمانوں کا آپس میں حقیقی اور پائدار اتفاق | اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگوں کے قلوب میں باہمی الفت
 اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری پر موقوف ہے | و محبت اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ
 تعالیٰ کی نافرمانی کے ساتھ اُس کے انعام کو حاصل نہیں کیا جاسکتا بلکہ حصول انعام کے لئے اُس کی
 اطاعت و رضا جوئی شرط ہے۔

جماعتوں اور افراد کے درمیان وحدت و اتفاق ایک ایسی چیز ہے جس کے محمود اور مفید
 ہونے سے کسی مذہب و ملت اور کسی فکر و نظر والے کو اختلاف نہیں ہو سکتا اور اسی لئے ہر شخص
 جو لوگوں کی اصلاح کی فکر کرتا ہے وہ ان کو آپس میں متفق کرنے پر زور دیتا ہے لیکن عام دنیا اس
 حقیقت سے بے خبر ہے کہ دلوں کا پورا اور پائدار اتفاق ظاہری تدبیروں سے حاصل نہیں ہوتا یہ صرف
 اللہ تعالیٰ کی اطاعت و رضا جوئی سے حاصل ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کی طرف کئی آیتوں
 میں اشارے فرمائے ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہے **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا**۔
 اس میں اختلاف و تفرقہ سے بچنے کی یہ تدبیر بتلائی گئی ہے کہ سب مل کر اللہ کی رستی یعنی مسترآن یا
 شریعت اسلام کو مضبوط تھام لیں تو سب آپس میں خود بخود متفق ہو جائیں گے اور باہمی تفرقہ ختم
 ہو جائیں گے۔ رائے کا اختلاف دوسری چیز ہے اور وہ جب تک اپنی حد کے اندر رہے تفرقہ اور جھگڑے
 کا سبب کبھی نہیں بنتا۔ جھگڑا فساد بھی ہوتا ہے جب کہ حدود شریعت سے تجاوز کیا جائے۔ آج
 اتفاق اتفاق تو سب پکارتے ہیں مگر اتفاق کے معنی ہر شخص کے نزدیک یہ ہوتے ہیں کہ لوگ میری
 بات مان لیں تو اتفاق ہو جائے۔ اور دوسرے بھی اتفاق کے لئے اسی فکر میں ہوتے ہیں کہ وہ
 ہماری بات مان لیں تو اتفاق ہو جائے۔ حالانکہ جب رایوں کا اختلاف اہل عقل و دیانت میں
 ناگزیر اور ضروری ہے تو یہ ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص دوسرے کے ساتھ متفق ہونے کو اس پر موقوف
 رکھے کہ دوسرا اس کی بات مان لے تو قیامت تک آپس میں اتفاق نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اتفاق کی
 صحیح اور فطری صورت وہ ہی ہے جو قرآن نے بتلائی کہ دونوں مل کر کسی تیسرے کی بات کو تسلیم
 کر لیں اور تیسرا وہی ہونا چاہئے جس کے فیصلے میں غلطی کا امکان نہ ہو۔ وہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ ہی
 ہو سکتا ہے اس لئے آیت مذکورہ میں اس کی ہدایت فرمائی گئی کہ سب مل کر اللہ کی کتاب کو مضبوط
 تھام لو تو آپس کے جھگڑے ختم ہو کر اتفاق کامل پیدا ہو جائے گا۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے **إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ اللَّهُ ذُرِّيًّا**
وَدًّا۔ یعنی جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اللہ تعالیٰ اُن کے آپس میں محبت و مودت پیدا
 فرمادیتے ہیں۔ اس آیت نے واضح کر دیا کہ دلوں میں حقیقی محبت و مودت پیدا ہونے کا اصلی طریق

ایمان اور عمل صالح کی پابندی ہے اس کے بغیر اگر کہیں کوئی اتفاق و اتحاد مصنوعی طور پر قائم کر بھی لیا جائے تو وہ محض بے بنیاد اور کمزور ہوگا ذرا سی ٹھیس میں ختم ہو جائے گا۔ جس کا مشاہدہ تمام اقوام دنیا کے حالات و تجربات سے ہوتا رہتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ کے اُس انعام کی وضاحت کی گئی ہے جو مدینہ کے تمام قبائل کے دلوں میں الفت پیدا کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد و نصرت کے لئے ان کو ایک آہنی دیوار کی طرح بست کر کیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں بھی یہی مضمون خلاصہ کے طور پر بیان فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ کے لئے حقیقت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ اور ظاہر کے اعتبار سے مؤمنین کی جماعت کافی ہے آپ کسی بڑے سے بڑے دشمن کی تعداد یا سامان سے خوف زدہ نہ ہوں۔ حضرات مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت غزوہ بدر کے میدان میں جنگ شروع ہونے سے پہلے نازل ہوئی تھی تاکہ قلیل العدد، بے سامان مسلمان اپنے مقابل کی بھاری تعداد اور بھاری سامان سے مرعوب نہ ہو جائیں۔

تیسری اور چوتھی آیت میں مسلمانوں کے لئے ایک جنگی قانون کا ذکر ہے کہ اُن کو کس حد تک اپنے حریف کے مقابلہ پر جتنا فرض اور اس سے ہٹنا گناہ ہے۔ پچھلی آیات اور واقعات میں اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد غیبی مسلمانوں کے ساتھ ہوتی ہے اس لئے ان کا معاملہ عام اقوام دنیا کا سا معاملہ نہیں یہ تھوڑے بھی بہت سوں پر غالب آسکتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ مِّنْ فَئِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فَئِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ (یعنی بہت سی قلیل العدد جماعتیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے کثرت والے مقابل پر غالب آجاتی ہیں)۔

اس لئے اسلام کے سب سے پہلے جہاد غزوہ بدر میں دس مسلمانوں کو سو آدمیوں کے برابر قرار دے کر یہ حکم دیا گیا کہ

اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو دشمنوں پر غالب آجائیں گے اور اگر تم سو ہو گے تو ایک ہزار کافروں پر غالب آجاؤ گے۔

عنوان تعبیر اس میں ایک خبر کا رکھا گیا ہے کہ سو مسلمان ایک ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے مگر مقصد یہ حکم دینا ہے کہ سو مسلمانوں کو ایک ہزار کفار کے مقابلہ سے بھاگنا جائز نہیں۔ عنوان خبر کا رکھنے میں مصلحت یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل اس خوشخبری سے مضبوط ہو جائیں کہ اللہ کا وعدہ ہماری حفاظت اور قلبہ کا ہے۔ اگر حکم کو بصیغہ امر قانون کی صورت میں پیش کیا جاتا تو فطری طور پر وہ بھاری معلوم ہوتا۔

غزوۂ بدر پہلے پہل کی جنگ ایسی حالت میں تھی جب کہ مسلمانوں کی مجموعی تعداد ہی بہت کم تھی اور وہ بھی سب کے سب محاذ جنگ پر گئے نہ تھے بلکہ فوری طور پر جو لوگ طیار ہو سکے وہی اس جنگ کی فوج بنے اس لئے اس جہاد میں سو مسلمانوں کو ایک ہزار کافروں کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا اور ایسے انداز میں دیا کہ فتح و نصرت کا وعدہ ساتھ تھا۔

جو تھی آیت میں اس حکم کو آئندہ کے لئے منسوخ کر کے دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ اب اللہ تعالیٰ نے تخفیف کر دی اور معلوم کر لیا کہ تم میں ہمت کی کمی ہے سو اگر تم میں کے سو آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آجائیں گے۔

یہاں بھی مقصد یہ ہے کہ سو مسلمانوں کو دو سو کافروں کے مقابلہ سے گریز کرنا جائز نہیں۔ پہلی آیت میں ایک مسلمان کو دس کے مقابلہ سے گریز ممنوع قرار دیا تھا اس آیت میں ایک کو دو کے مقابلہ سے گریز ممنوع رہ گیا۔ اور یہی آخری حکم ہے جو ہمیشہ کے لئے جاری اور باقی ہے۔ یہاں بھی حکم کو حکم کے عنوان سے نہیں بلکہ خبر اور خوشخبری کے انداز سے بیان فرمایا گیا ہے جس میں اشارہ ہے کہ ایک مسلمان کو دو کافروں کے مقابلہ پر جتنے کا حکم معاذ اللہ کوئی بے انصافی یا تشدد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان میں اُس کے ایمان کی وجہ سے وہ قوت رکھ دی ہے کہ ان میں کا ایک دو کی برابر رہتا ہے۔

مگر دونوں جگہ اس فتح و نصرت کی خوشخبری کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے کہ یہ مسلمان ثابت قدم رہنے والے ہوں اور ظاہر ہے کہ قتل و قتال کے میدان میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ثابت قدم رہنا اُسی کا کام ہو سکتا ہے جس کا ایمان کامل ہو۔ کیونکہ ایمان کامل انسان کو شوق شہادت کا جذبہ عطا کرتا ہے اور یہ جذبہ اُس کی طاقت کو بہت کچھ بڑھا دیتا ہے۔

آخر آیت میں عام قانون کی صورت سے بتلادیا وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ یعنی اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کا ساتھ ہی ہے۔ اس میں میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے والے بھی شامل ہیں اور عام احکام شرعیہ کی پابندی پر ثابت قدم رہنے والے حضرات بھی۔ ان سب کے لئے معیت الہیہ کا وعدہ ہے اور یہ معیت ہی ان کی فتح و ظفر کا اصلی راز ہے۔ کیونکہ جس کو قادرِ مطلق کی معیت نصیب ہو گئی اُس کو ساری دنیا مل کر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔

مَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ

نبی کو نہیں چاہئے کہ اپنے ہاں رکھے قیدیوں کو جہت تک خوب خوزیری نہ کر لے ملک میں،

تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ

تم چاہتے ہو اسباب دنیا کا، اور اللہ کے ہاں چاہئے آخرت، اور اللہ زور آور ہے

حَكِيمٌ ﴿٦٨﴾ ۱۰ لَا كِتَابَ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ

حکمت والا۔ اگر نہ ہوتی ایک بات جس کو لکھ چکا اللہ پہلے سے تو تم کو پہنچتا اس لینے میں

عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٦٩﴾ فَكُلُوا مِنَّمَا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا

بڑا عذاب۔ سو کھاؤ جو تم کو غنیمت میں مباح حلال مستحکم، اور ڈرتے رہو

اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٧٠﴾

اللہ ہے، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان۔

خلاصہ تفسیر

(اے مسلمانو! تم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ان قیدیوں سے کچھ لے کر چھوڑ دینے کا مشورہ دیا یہ بے جا تھا کیونکہ) نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں (بلکہ قتل کر دیئے جائیں) جب تک کہ وہ زمین میں اچھی طرح (کفار کی) خوزیری نہ کر لیں (کیونکہ مشروعیت جہاد کی اصلی غرض دفع فساد ہے اور بدوں اس حد کے جس میں کہ بالکل شوکت کفار کی ٹوٹ جائے دفع فساد ممکن نہیں پس اس نوبت سے پہلے قیدیوں کا زندہ چھوڑ دینا آپ کی شان اصلاح کے مناسب نہیں البتہ جب ایسی قوت ہو جائے پھر قتل ضروری نہیں بلکہ اور صورتیں بھی مشروع ہیں پس ایسی نامناسب رائے تم نے آپ کو کیوں دی) تم تو دنیا کا مال و اسباب چاہتے ہو (اس لئے فدیہ کی رائے دی) اور اللہ تعالیٰ آخرت (کی مصلحت) کو چاہتے ہیں (اور وہ اس میں ہے کہ کفار خوف سے مغلوب ہو جائیں جس میں آزادی سے اسلام کا نور و ہدایت پھیلے اور بے روک ٹوک لوگ بکثرت مسلمان ہوں اور نجات پائیں) اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست بڑی حکمت والے ہیں (وہ تم کو کفار پر غالب کرتے اور فتوحات کی کثرت سے تم کو مالدار کر دیتے گو کسی حکمت کے سبب اس میں دیر ہوتی جو فعل تم سے واقع ہوا ہے وہ ایسا نا پسندیدہ ہے کہ) اگر خدا تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقدر نہ ہو چکتا (وہ یہ کہ ان قیدیوں میں لوگ مسلمان ہو جائیں گے جس سے فساد محتمل واقع نہ ہوگا۔ اگر یہ ہوتا) تو جو امر تم نے اختیار کیا ہے اس کے بارے میں

تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہوتی (لیکن چونکہ کوئی فساد نہ ہوا اور اتفاقاً تمہارا مشورہ صائب نکل آیا اس لئے تم سزائے بچ گئے یعنی ہم نے اس فدیہ کو مباح کر دیا) سو جو کچھ تم نے (ان سے فدیہ میں) لیا ہے اس کو حلال پاک سمجھ کر کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ آئندہ ہر طرح کی احتیاط رکھو) بیشک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بڑی رحمت والے ہیں (کہ تمہارا گناہ بھی معاف کر دیا یہ مغفرت ہے اور فدیہ بھی حلال کر دیا یہ رحمت ہے)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ کا تعلق غزوہ بدر کے ایک خاص واقعہ سے ہے اس لئے ان کی تفسیر سے پہلے صحیح اور مستند روایات حدیث کے ذریعہ اُس واقعہ کا بیان ضروری ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ غزوہ بدر اسلام میں سب سے پہلا جہاد ہے اور چانک پیش آیا ہے اُس وقت تک جہاد سے متعلق احکام کی تفصیل قرآن میں نازل نہیں ہوئی تھی جہاد میں اگر مال غنیمت ہاتھ آجائے تو اُسے کیا کیا جائے۔ دشمن کے سپاہی اپنے قبضہ میں آجائیں تو ان کو گرفتار کرنا جائز ہے یا نہیں اور گرفتار کر لیا جائے تو پھر ان کے ساتھ معاملہ کیا کرنا چاہئے۔

مال غنیمت کے متعلق پچھلے تمام انبیاء کی شریعتوں میں قانون یہ تھا کہ مسلمانوں کو اُس سے نفع اٹھانا اور استعمال کرنا حلال نہیں تھا بلکہ حکم یہ تھا کہ پورا مال غنیمت جمع کر کے کسی میدان میں رکھ دیا جائے اور دستور الہی یہ تھا کہ آسمان سے ایک آگ آتی اور اُس سارے مال کو جلا کر خاک کر دیتی۔ یہی علامت اُس جہاد کے مقبول ہونے کی سمجھی جاتی تھی۔ اگر مال غنیمت کو جلانے کے لئے آسمانی آگ نہ آئے تو یہ اس کی علامت ہوتی ہے کہ جہاد میں کوئی کوتاہی رہی ہے جس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں۔

صحیح بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کفار سے حاصل ہونے والا مال غنیمت کسی کے لئے حلال نہیں تھا مگر امت مرحومہ کے لئے حلال کر دیا گیا۔ مال غنیمت کا اس امت کے لئے خصوصی طور پر حلال ہونا اللہ تعالیٰ کے تو علم میں تھا مگر غزوہ بدر کے واقعہ تک اس کے متعلق کوئی وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کے حلال ہونے کے متعلق نازل نہیں ہوئی تھی۔ اور غزوہ بدر میں صورت حال یہ پیش آئی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بالکل خلاف قیاس غیر معمولی فتح عطا فرمائی۔ دشمن نے مال بھی چھوڑا جو بطور غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور ان کے بڑے بڑے سردار مسلمانوں

نے گرفتار کر لئے۔ مگر ان دونوں چیزوں کے جائز ہونے کی صراحت کسی وحی الہی کے ذریعہ ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔

اس لئے صحابہ کرام کے اس عاجلانہ اقدام پر عتاب نازل ہوا۔ اُسی عتاب و ناراضی کا اظہار ایک وحی کے ذریعہ کیا گیا جس میں جنگی قیدیوں کے متعلق بظاہر تو مسلمانوں کو دو چیزوں کا اختیار دیا گیا تھا مگر اسی اختیار دینے میں ایک اشارہ اس کی طرف بھی کر دیا گیا تھا کہ مسئلہ کے دونوں پہلوؤں میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک پسندیدہ اور دوسرا ناپسندیدہ ہے۔ جامع ترمذی۔ سنن نسائی۔ صحیح ابن حبان میں بروایت علی مرتضیٰ منقول ہے کہ اس موقع پر حضرت جبریل امین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ اور یہ حکم سنایا کہ آپ صحابہ کرام کو دو چیزوں میں اختیار دے دیجئے ایک یہ کہ ان قیدیوں کو قتل کر کے دشمن کی شوکت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔ دوسرے یہ کہ ان کو فدیہ یعنی کچھ مال لے کر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن اس دوسری صورت میں بامر الہی یہ طے شدہ ہے کہ اس کے بدلہ آئندہ سال مسلمانوں کے اتنے ہی آدمی شہید ہوں گے جتنے قیدی آج مال لے کر چھوڑ دیئے جائیں گے۔ یہ صورت اگرچہ تنخیر کی تھی اور صحابہ کرام کو دونوں چیزوں کا اختیار دے دیا گیا تھا مگر دوسری صورت میں ستر مسلمانوں کی شہادت کا فیصلہ ذکر کرنے میں اس طرف ایک خفیف اشارہ ضرور موجود تھا کہ یہ صورت اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسند نہیں کیونکہ اگر یہ پسند ہوتی تو ستر مسلمانوں کا خون اس کے نتیجہ میں لازم نہ ہوتا۔

صحابہ کرام کے سامنے جب یہ دونوں صورتیں بطور اختیار کے پیش ہوئیں تو بعض صحابہ کرام کا خیال یہ ہوا کہ اگر ان لوگوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تو بہت ممکن ہے کہ یہ سب یا بعض کسی وقت مسلمان ہو جائیں جو اصلی فائدہ اور مقصد جہاد ہے۔ دوسرا یہ بھی خیال تھا کہ مسلمان اس وقت افلاس کی حالت میں ہیں اگر ستر آدمیوں کا مالی فدیہ ان کو مل گیا تو ان کی تکلیف بھی دور ہوگی اور آئندہ کے لئے جہاد کی تیاری میں بھی مدد مل جائے گی۔ رہا ستر مسلمانوں کا شہید ہونا سو وہ مسلمانوں کے لئے خود ایک نعمت و سعادت ہے اُس سے گھبراتا نہیں چاہئے۔ ان خیالات کے پیش نظر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور اکثر صحابہ کرام نے یہی رائے دی کہ ان قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کر دیا جائے۔ صرف حضرت عمر بن خطاب اور سعد بن معاذ وغیرہ چند حضرات نے اس رائے سے اختلاف کر کے ان سب کو قتل کر دینے کی رائے اس بنیاد پر دی کہ یہ حسن اتفاق ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں قوت و طاقت فراہم کرنے والے سارے قریشی سردار اس وقت قابو میں آگئے ہیں ان کا قبول اسلام تو موہوم خیال

ہے مگر یہ گمان غالب ہے کہ یہ لوگ واپس ہو کر پہلے سے زیادہ مسلمانوں کے خلاف سرگرمی کا سبب بنیں گے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو رحمۃ للعالمین ہو کر تشریف لائے تھے اور رحمت مجسم تھے صحابہ کرام کی دورائیں دیکھ کر آپ نے اُس رائے کو قبول کر لیا جس میں قیدیوں کے معاملہ میں رحمت اور سہولت تھی کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ آپ نے صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کو خطاب کر کے فرمایا لو اتفقتما ما خالفتما یعنی اگر تم دونوں کسی ایک رائے پر متفق ہو جاتے تو میں تمہاری رائے کے خلاف نہ کرتا (مظہری)۔ اختلاف رائے کے وقت آپ کی رحمت و شفقت علی الخلق کا تقاضا یہی ہوا کہ اُن کے معاملے میں آسانی اختیار کی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور اس کے نتیجہ میں آئندہ سال غزوہ احد کے موقع پر اشارات ربانی کے مطابق ستر مسلمانوں کے شہید ہونے کا واقعہ پیش آیا۔

تُرِيدُونَ عَرَصَ الدُّنْيَا میں اُن صحابہ کرام کو خطاب ہے جنہوں نے فدیہ لے کر چھوڑنے کی رائے دی تھی۔ اس آیت میں بتلایا گیا کہ آپ حضرات نے ہمارے رسول کو نامناسب مشورہ دیا۔ کیونکہ کسی نبی کے لئے یہ شایان شان نہیں ہے کہ اُس کو دشمنوں پر قابو مل جائے تو اُن کی قوت و شوکت کو نہ توڑے اور مفسد قسم کے دشمن کو باقی رکھ کر مسلمانوں کے لئے ہمیشہ کی مصیبت قائم کر دے۔

اس آیت میں حَتَّى يُلَاقُوا فِي الْأَرْضِ کے الفاظ آئے ہیں۔ لفظ اشْخَان کے معنی لغت میں کسی کی قوت و شوکت کو توڑنے میں مبالغہ سے کام لینے کے ہیں۔ اسی معنی کی تاکید کے لئے لفظ فِي الْأَرْضِ لایا گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ دشمن کی شوکت کو خاک میں ملا دے۔ جن صحابہ کرام نے فدیہ لے کر چھوڑ دینے کی رائے دی تھی اگرچہ اُن کی رائے میں ایک جز خالص دینی تھا یعنی آزادی کے بعد ان لوگوں کے مسلمان ہو جانے کی امید۔ مگر ساتھ ہی دوسرا جز اپنی ذاتی منفعت کا بھی تھا کہ ان کو مال ہاتھ آجائے گا۔ اور ابھی تک کسی نص صریح سے اس مال کا جائز ہونا بھی ثابت نہ تھا۔ اس لئے انسانوں کا وہ معاشرہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر تربیت اس پیمانہ پر بنایا جا رہا تھا کہ اُن کا مرتبہ فرشتوں سے بھی آگے ہو اُن کے لئے یہ مال کی طرف دھیان بھی ایک قسم کی معصیت سمجھی گئی۔ اور جو کام جائز و ناجائز کاموں سے مرکب ہو اُس کا مجموعہ ناجائز ہی کہلاتا ہے اس لئے صحابہ کرام کا یہ عمل قابل عتاب قرار دے کر یہ ارشاد نازل ہوا۔

تُرِيدُونَ عَرَصَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ یعنی تم لوگ

دنیا کو چاہتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ تم سے یہ چاہتا ہے کہ تم آخرت کے طالب بنو۔ یہاں بطور عتاب کے اُن کے صرف اُس فعل کا ذکر کیا گیا جو وجہ ناراضی تھا دوسرا سبب یعنی قیدیوں کے مسلمان ہو جانے کی امید۔ اس کا یہاں ذکر نہیں فرمایا۔ جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ صحابہ کرام جیسی پاکباز مخلص جماعت کے لئے ایسی مشترک نیت جس میں کچھ دین کا جز ہو کچھ اپنے دنیوی نفع کا یہ بھی قابل قبول نہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ اس آیت میں عتاب و تنبیہ کا خطاب صحابہ کرام کی طرف ہے اگرچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی رائے کو قبول و سرما کر ایک گونہ شرکت ان کے ساتھ کر لی تھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل خالص آپ کے رُحْمۃٌ لِّلْعَالَمِین ہونے کا مظہر تھا کہ صحابہ میں اختلاف رائے ہونے کی صورت میں اُس صورت کو اختیار فرمایا جو قیدیوں کے حق میں سہولت و شفقت کی تھی۔

آخر آیت میں وَاللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ حَکِیْمٌ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والے ہیں اگر آپ لوگ جلد بازی نہ کرتے تو وہ اپنے فضل سے آئندہ فتوحات میں تمہارے لئے مال و دولت کا بھی سامان کر دیتے۔

دوسری آیت بھی اسی عتاب کا تتمہ ہے جس میں فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو جو کام تم نے اختیار کیا کہ مال لے کر قیدیوں کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اُس کے بارہ میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہو جاتی۔

اس نوشتہ تقدیر سے کیا مراد ہے، اس کے متعلق ترمذی میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مال غنیمت تم سے پہلے کسی قوم کسی اُمت کے لئے حلال نہیں تھا۔ بدر کے موقع میں جب مسلمان مال غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے حالانکہ ابھی تک ان کے لئے مال غنیمت حلال نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ مال غنیمت کے حلال ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کا یہ اقدام ایسا گناہ تھا کہ اس پر عذاب آجانا چاہئے تھا لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم لوح محفوظ میں لکھا ہوا تھا کہ اس اُمت کے لئے مال غنیمت حلال کیا جائے گا اس لئے مسلمانوں کی اس خطا پر عذاب نازل نہیں کیا تھا۔ (منظہری)

بعض روایات حدیث میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عذاب الہی بالکل سامنے آچکا تھا۔ اللہ نے اپنے فضل سے روک دیا اور اگر عذاب آجاتا تو بجز عمر بن خطاب اور سعد بن معاذ کے کوئی اُس سے نہ بچتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سبب عتاب قیدیوں سے فدیہ لے کر چھوڑ دینا تھا اور ترمذی کی روایت سابقہ سے اس کا سبب مال غنیمت جمع کرنا معلوم ہوتا ہے مگر دونوں میں کوئی تضاد نہیں قیدیوں سے

فدیہ لینا بھی مالِ غنیمت ہی کا جز ہے۔

مسئلہ۔ آیت مذکورہ میں قیدیوں سے فدیہ لے کر آزاد کرنے یا مالِ غنیمت جمع کرنے پر جو عتاب نازل ہوا اور عذاب الہی سے ڈرایا گیا مگر پھر معافی دے دی گئی۔ اس سے یہ بات نہ کھلی کہ آئندہ کے لئے ان معاملات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔ اس لئے اگلی آیت میں مالِ غنیمت کا مسئلہ تو صاف کر دیا گیا فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ یعنی جو مالِ غنیمت تم کو ہاتھ آگیا ہے وہ اب کھا سکتے ہو وہ آئندہ کے لئے تمہارے واسطے حلال کر دیا گیا۔ مگر اس میں بھی ایک شبہ یہ رہ جاتا ہے کہ مالِ غنیمت حلال کرنے کا حکم تو اب ملا ہے۔ اس حکم سے پہلے جو غلطی سے جمع کر لیا گیا تھا شاید اُس میں کسی قسم کی کراہت ہو اس لئے اس کے بعد حَلَالًا طَيِّبًا فرما کر یہ شبہ بھی دور کر دیا گیا کہ اگرچہ نزولِ حکم سے پہلے جمع غنیمت کا اقدام درست نہ تھا مگر اب جب کہ مالِ غنیمت حلال ہونے کا حکم آگیا تو پہلا جمع کیا ہوا بھی بغیر کسی کراہت کے حلال ہے۔

مسئلہ۔ یہاں اصول فقہ کا ایک مسئلہ قابلِ نظر اور قابلِ یادداشت ہے کہ جب کسی ناجائز اقدام کے بعد مستقل آیت کے ذریعہ اُس مال کو حلال کرنے کا حکم نازل ہو جائے تو سابقہ اقدام کا اس میں کوئی اثر نہیں رہتا۔ یہ مال حلال طیب ہو جاتا ہے جیسا کہ یہاں ہوا لیکن اسی کی ایک دوسری نظیر یہ ہے کہ کسی معاملہ میں حکم تو پہلے سے نازل شدہ تھا مگر اُس کا ظہور عمل کرنے والوں پر نہیں تھا اس بنا پر اُس کی خلاف ورزی کر گزرے، بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارا یہ عمل قرآن و سنت کے فلاں حکم کے خلاف تھا۔ تو اس صورت میں ظہورِ حکم کے بعد وہ مال حلال نہیں رہتا اگرچہ سابقہ غلطی کو معاف بھی کر دیا جائے۔ (تور الانوار ملا جیون)

آیت مذکورہ میں مالِ غنیمت کو حلال طیب تو قرار دے دیا گیا مگر آخر آیت میں یہ قید لگا دی گئی وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔ اس میں اشارہ کر دیا کہ مالِ غنیمت اگرچہ حلال کر دیا گیا ہے مگر وہ بھی ایک خاص قانون کے تحت حلال ہوا ہے اُس قانون کے خلاف یا اپنے حق سے زائد لیا جائے گا تو وہ جائز نہیں۔

یہاں دو معاملے تھے ایک مالِ غنیمت دوسرے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا۔ پہلے معاملے کے متعلق تو اس آیت نے بات صاف کر دی مگر دوسرا معاملہ ابھی تک صاف نہیں ہوا۔ اس کے متعلق سورۃ محمد میں یہ آیت نازل ہوئی فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْبَثْتُمُوهُمْ فَنَزَلُوا أَلْفًا مِّنْهُنَّ مَقْتُلًا مُّوْتًا حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا (یعنی جب جنگ میں کافروں سے تمہارا مقابلہ ہو تو اُن کی گردنیں مار دو

یہاں تک کہ جب تم نوحوں ریزی کے ذریعہ ان کی قوت شوکت توڑ چکو تو پھر ان کو قید کر کے مضبوط باندھو۔ اس کے بعد یا تو ان پر احسان کر کے بغیر کسی معاوضہ کے آزاد کر دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر میں قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کرنے پر عتاب نازل ہوا، یہ اسلام کا پہلا جہاد تھا اس وقت تک کافروں کی قوت و شوکت ٹوٹ نہیں چکی تھی اتفاقاً ان پر ایک مصیبت پڑ گئی تھی پھر جب اسلام اور مسلمانوں کا مکمل غلبہ حاصل ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے وہ حکم منسوخ کرنے کے لئے سورۃ محمد کی آیت مذکورہ نازل فرمادی۔ جس میں نبی کریم اور مسلمانوں کو قیدیوں کے بارے میں چار اختیار دے دیئے گئے وہ ہیں۔

ان شاءوا قتلوہم وان شاءوا
چاہیں تو سب کو قتل کر دیں یا چاہیں تو
استعبدوہم وان شاءوا فادوہم
غلام بنالیں یا چاہیں تو فدیہ لے کر چھوڑ
وان شاءوا اعتقوہم (منظہری)
دیں یا چاہیں تو بغیر فدیہ کے آزاد کر دیں۔

مذکورہ چار اختیارات میں سے پہلے دو پر تو پوری اُمت کا اتفاق اور اجماع ہے کہ امیر مسلمین کے لئے قیدیوں کو قتل کر دینے کا بھی اختیار ہے اور غلام بنالینے کا بھی۔ لیکن ان کو بلا معاوضہ چھوڑ دینے یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینے میں فقہاء امت کا اختلاف ہے۔

امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، ثوریؒ، اسحاقؒ اور تابعین میں سے حضرت حسن بصریؒ اور عطاء کا قول یہ ہے کہ یہ دونوں صورتیں بھی امیر مسلمین کے لئے جائز ہیں کہ قیدیوں کو معاوضہ لے کر چھوڑ دے یا بلا معاوضہ آزاد کر دے یا مسلمان قیدیوں سے تبادلہ کرے۔

اور امام ابو حنیفہؒ، ابو یوسفؒ، محمدؒ، اوزاعیؒ اور قتادہؒ اور ضحاکؒ اور سدیؒ اور ابن جریجؒ فرماتے ہیں کہ بلا معاوضہ چھوڑنا تو بالکل جائز نہیں۔ فدیہ لے کر چھوڑنا بھی امام ابو حنیفہؒ کے مشہور مذہب میں جائز نہیں۔ البتہ سیر کبیر کی روایت یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو مال کی ضرورت ہو تو فدیہ لے کر چھوڑ سکتے ہیں۔ البتہ مسلمان قیدیوں کے تبادلہ میں ان کو چھوڑ دینا امام ابو حنیفہؒ اور صاحبین کے نزدیک جائز ہے (کما ہوا ظہر الروایتین عنہم منظہری)

جن حضرات نے فدیہ لے کر یا بلا فدیہ چھوڑ دینے کی اجازت دی ہے وہ حضرت ابن عباسؓ کے قول کے مطابق سورہ محمد کی آیت کو انفال کی آیت کا نسخ اور آیت انفال کو منسوخ قرار دیتے ہیں فقہاء حنفیہ نے آیت سورہ محمد کو منسوخ قرار دیا ہے اور سورہ انفال کی آیت فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلَفَهُمْ اور آیت اَقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ کو اس کا نسخ قرار دیا ہے اس لئے قیدیوں کو آزاد کر دینا خواہ فدیہ لے کر ہو یا بلا فدیہ ان کے نزدیک جائز نہیں۔ (منظہری)

لیکن اگر سورہ انفال کی آیت کے الفاظ اور سورہ محمد کے الفاظ میں غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی ناسخ و منسوخ نہیں۔ بلکہ دو مختلف حالتوں کے دو حکم ہیں۔ سورہ انفال کی آیت میں بھی اصل حکم اِثْنَانِ فِي الْاَرْضِ یعنی قتل کے ذریعہ کافروں کی قوت توڑ دینا۔ اور سورہ محمد کی آیت میں بھی جو مَتْنٌ وَفِدَاءٌ (یعنی قیدیوں کو بلا معاوضہ یا معاوضہ لے کر آزاد کرنے) کا اختیار دیا گیا ہے اُس سے پہلے اِثْنَانِ فِي الْاَرْضِ کا بیان ہو چکا ہے یعنی خون ریزی کے ذریعہ کفر کی قوت ٹوٹ جانے کے بعد یہ بھی اختیار ہے کہ قیدیوں کو فدیہ پر یا بلا فدیہ آزاد کر دیا جائے۔

امام اعظم ابو حنیفہ کی روایت سیر کبیر کا بھی یہی منشاء ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے حالات اور ضرورت پر نظر کر کے دونوں قسم کے احکام دیئے جاسکتے ہیں۔ وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنَ فِيْٓ أَيْدِيكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰى رَاتِ

اے نبی کہہ دے اُن سے جو تمہارے ہاتھ میں ہیں قیدی اگر

يَعْلَمِ اللّٰهُ فِيْٓ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا اُخِذَ مِنْكُمْ

جانے گا اللہ تمہارے دلوں میں کچھ نیکی تو دے گا تم کو بہتر اُس سے جو تم سے چھین گیا

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۷۰ وَ اِنْ يُرِيْدُوْا خِيَانَتَكُمْ

اور تم کو بخشے گا، اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان اور اگر چاہیں گے تجھ سے دغا کرنی

فَقَدْ خَانُوْا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۷۱

سو وہ دغا کر چکے ہیں اللہ سے اس سے پہلے پھر اُس نے اُن کو پکڑوا دیا، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے پیغمبر آپ کے قبضہ میں جو قیدی ہیں (ان میں جو مسلمان ہو گئے ہیں) آپ ان سے فرما دیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو تمہارے قلب میں ایمان معلوم ہوگا (یعنی تم دل سے مسلمان ہوئے ہو گے) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم تو مطابق واقع کے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ مسلمان اسی کو جانیں گے جو واقع میں مسلمان ہوگا اور جو شخص غیر مسلم ہوگا اس کو غیر مسلم ہی جانیں گے پس اگر تم دل سے مسلمان ہو گے تو جو کچھ تم سے (فدیہ میں) لیا گیا ہے (دنیا میں) اس سے بہتر تم کو دے دے گا اور (آخرت میں) تم کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے ہیں (اس لئے تم کو بخش

دیں گے اور) بڑی رحمت والے ہیں (اس لئے تم کو نعم البدل دیں گے) اور اگر (یا فرض) یہ لوگ (صدق دل سے مسلمان نہ ہوئے ہوں بلکہ اظہار اسلام سے محض آپ کو دھوکا ہی دینا چاہیں اور دل میں) آپ کے ساتھ خیانت کرنے کا (یعنی نقض عہد کر کے مخالفت و مقابلہ کا) ارادہ رکھتے ہوں تو (کچھ فکر نہ کیجئے اللہ تعالیٰ ان کو پھر آپ کے ہاتھوں میں گرفتار کر اے گا جیسا) اس سے پہلے انہوں نے اللہ کے ساتھ خیانت کی تھی (اور آپ کی مخالفت اور مقابلہ کیا) پھر اللہ نے ان کو (آپ کے ہاتھوں میں) گرفتار کر دیا اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے والے ہیں (کہ کون خائن ہے اور) بڑی حکمت والے ہیں (ایسی صورتیں پیدا کر دیتا ہے جس سے خائن مغلوب ہو جاتے)۔

معارف و مسائل

غزوہ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ اسلام اور مسلمانوں کے وہ دشمن جنہوں نے ان کے ستانے، مارنے، قتل کرنے میں کسی وقت بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور جب موقع مل گیا انتہائی وحشیانہ مظالم ان پر کئے مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہو جانے کے بعد ان کی جان بخشی کر دینا کوئی معمولی بات نہ تھی ان کے لئے بڑی غنیمت اور انتہائی لطف و کرم تھا فدیہ میں جو رقم ان سے لی گئی وہ بھی نہایت معمولی تھی۔

اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم دیکھئے کہ اس معمولی رقم کے دینے سے جو ایک قسم کی تکلیف ان کو پیش آئی اُس کو بھی کس طرح رفع فرمایا جاتا ہے۔ آیت مذکورہ میں ارشاد ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں کوئی خیر پائیں گے تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اُس سے بہتر تمہیں دے دیں گے۔ اور اُس پر مزید یہ کہ تمہارے پچھلے گناہ بخش دیں گے۔ خیر سے مراد ایمان اور اخلاص ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آزاد ہونے کے بعد ان قیدیوں میں جو لوگ ایمان و اسلام کو اخلاص کے ساتھ اختیار کر لیں گے تو جو کچھ فدیہ میں دیا ہے اُس سے زیادہ اور بہتر اُن کو مل جائے گا۔ قیدیوں کو آزاد و خود مختار کر دینے کے ساتھ اس طرح دعوت دی گئی کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے تفع نقصان پر غور کریں۔ چنانچہ واقعات شاہد ہیں کہ ان لوگوں میں سے جو مسلمان ہو گئے اللہ تعالیٰ نے اُن کی مغفرت اور جنت کے درجاتِ عالیہ کے علاوہ دنیا میں بھی اُن کو اتنا مال و دولت دے دیا جو اُن کے فدیہ سے بدرجہا زائد تھا۔

اکثر مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیت حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارہ میں نازل ہوئی تھی کیونکہ وہ بھی بدر کے قیدیوں میں شامل تھے اور اُن

سے بھی فدیہ لیا گیا تھا۔ ان کی خصوصیت اس معاملہ میں یہ تھی کہ جنگ بدر میں یہ مکہ سے اپنے ساتھ تقریباً سات سو گنی سونا لے کر چلے تھے تاکہ وہ لشکر کفار پر خرچ کیا جائے۔ اور ابھی یہ خرچ ہونے نہیں پایا تھا کہ وہ مع اس سونے کے گرفتار کر لئے گئے۔

جب فدیہ دینے کا وقت آیا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے ساتھ جو سونا تھا اُس کو میرے فدیہ کی رقم میں لگا لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مال آپ کفر کی امداد کے لئے لائے تھے وہ تو مسلمانوں کا مال غنیمت بن گیا۔ فدیہ اُس کے علاوہ ہونا چاہئے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اپنے دو بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کا فدیہ بھی آپ ادا کریں۔ عباسؓ نے عرض کیا کہ اگر اتنا مالی بار مجھ پر ڈالا گیا تو مجھے قریش سے بھیک مانگنا پڑے گی میں بالکل فقیر ہو جاؤں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیوں کیا آپ کے پاس وہ مال موجود نہیں جو مکہ سے روانگی کے وقت آپ نے اپنی زوجہ ام الفضل کے حوالہ کیا ہے۔ حضرت عباس نے پوچھا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا جب کہ وہ میں نے رات کی تاریکی اور تنہائی میں اپنی بیوی کے سپرد کیا تھا اور کوئی تیسرا آدمی اس سے واقف نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے اُس کی پوری تفصیل بتلا دی۔ حضرت عباس کے دل میں یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے رسول ہونے کا یقین ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل سے معتقد تھے مگر کچھ شبہات تھے جو اللہ تعالیٰ نے اس وقت رفع فرما دیئے اور وہ درحقیقت اسی وقت سے مسلمان ہو گئے۔ مگر ان کا بہت سا روپیہ قریش مکہ کے ذمہ قرض تھا۔ اگر یہ اسی وقت اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیتے تو وہ روپیہ مارا جاتا اس لئے اعلان نہیں کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کسی سے اس کا اظہار نہیں کیا۔ فتح مکہ سے پہلے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت چاہی کہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آجائیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہی مشورہ دیا کہ ابھی ہجرت نہ کریں۔

حضرت عباسؓ کی اس گفتگو پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت مذکورہ میں آیا ہوا وعدہ بھی اُن کو بتلا دیا کہ اگر آپ نے اسلام قبول کر لیا اور اخلاص کے ساتھ مؤمن ہو گئے تو جو کچھ مال فدیہ میں خرچ کیا ہے اس سے بہتر اللہ تعالیٰ آپ کو عطا فرما دیں گے۔ چنانچہ حضرت عباسؓ اظہار اسلام کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ میں تو اس وعدہ کا ظہور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ مجھ سے بیس اوقیہ سونا فدیہ میں لیا گیا تھا، اس وقت میرے بیس غلام مختلف جگہوں میں تجارت کا کاروبار کر رہے ہیں اور کسی کا کاروبار بیس ہزار درہم سے

کم کا نہیں ہے۔ اور اُس پر مزید یہ انعام ہے کہ مجھے حجاج کو آب زمزم پلانے کی خدمت مل گئی ہے جو میرے نزدیک ایسا گرانقدر کام ہے کہ سارے اہل مکہ کے اموال بھی اس کے مقابلہ میں بیچ سمجھتا ہوں۔

غزوہ بدر کے قیدیوں میں سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے تھے مگر ان کے بارہ میں یہ کھٹک لوگوں کے دل میں تھی کہ شاید یہ لوگ مکہ پہنچ کر اسلام سے پھر جائیں اور پھر ہمیں کوئی نقصان پہنچائیں۔ حق تعالیٰ نے اس کے بعد والی آیت میں اس خطرہ کو اس طرح دور فرما دیا رَاثُ یُرِیدُ وَاٰخِیَانَتُکَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْکَنَ مِنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ۔ یعنی اگر یہ لوگ آپ کے ساتھ خیانت ہی کا ارادہ کر لیں تو اس سے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ یہ تو وہی لوگ ہیں جو اس سے پہلے اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں یعنی میثاق ازل میں جو اللہ تعالیٰ کے رب العالمین ہونے کا اقرار کیا تھا اُس کی مخالفت کرنے لگے تھے۔ لیکن ان کی یہ خیانت خود انہیں کے لئے مضر ثابت ہوئی کہ انجام کار ذلیل و خوار اور گرفتار ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ تو دلوں کے رازوں کو جاننے والے اور بڑی حکمت والے ہیں۔ اگر یہ لوگ اب بھی آپ کی مخالفت کرنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ سے باہر کہاں چلے جائیں گے وہ پھر ان کو اسی طرح پکڑ لے گا۔ پچھلی آیت میں آزاد ہونے والے قیدیوں کو اسلام کی طرف دعوت ترغیبی انداز میں دی گئی تھی اس آیت میں ترہیب کے ذریعہ اُن کو آگاہ کر دیا کہ تمہاری دنیا و آخرت کی بھلائی اسلام و ایمان میں منحصر ہے۔

یہاں تک کفار کے ساتھ قتل و قتال اور اُن کے قید کرنے، آزاد کرنے کے اور اُن سے صلح و مصالحت کے احکام کا بیان ہو رہا تھا۔ اگلی آیات میں آخر سورت تک اسی سلسلہ کے ایک خاص باب کا ذکر اور اُس کے احکام کی کچھ تفصیل مذکور ہے اور وہ احکام ہجرت ہیں کیونکہ کفار کے ساتھ مقابلہ میں کبھی ایسے حالات بھی پیش آ سکتے ہیں کہ نہ مسلمانوں کو اُن کے مقابلہ پر قتل و قتال کی طاقت ہے اور نہ وہ صلح پر راضی ہیں۔ ایسی کمزوری کی حالت میں اسلام اور مسلمانوں کی نجات کی راہ ہجرت ہے کہ اس شہر اور ملک کو چھوڑ کر کسی دوسری زمین میں جا کر قیام کریں جہاں اسلامی احکام پر آزادانہ عمل ہو سکے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَرَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ

جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑا اور لڑے اپنے مال اور جان سے

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اَوْوَا وَنَصَرُوْا اُولٰٓئِکَ بَعْضُهُمْ

اللہ کی راہ میں اور جن لوگوں نے جگہ دی اور مدد کی وہ ایک دوسرے کے

أُولَٰئِكَ بِعِضٍ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِّنْ

رفیق ہیں، اور جو ایمان لائے اور گھر نہیں چھوڑا تم کو اُن کی

وَلَا يَتِيهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ

رفاقت سے کچھ کام نہیں جب تک وہ گھر نہ چھوڑ آئیں، اور اگر وہ تم سے مدد چاہیں

فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ

دین میں تو تم کو لازم ہے اُن کی مدد کرنی مگر مقابلہ میں ان لوگوں کے کہ اُن میں اور تم میں عہد ہو،

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝۴۲ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِعِضِهِمْ أُولَٰئِكَ

اور اللہ جو تم کرتے ہو اُس کو دیکھتا ہے۔ اور جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے

بَعْضٌ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ۝۴۳

رفیق ہیں، اگر تم یوں نہ کرو گے تو فتنہ پھیلے گا ملک میں اور بڑی خرابی ہوگی۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجْهَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ

اور جو لوگ ایمان لائے اور اپنے گھر چھوڑے اور لڑے اللہ کی راہ میں اور جن لوگوں نے

أَوَّاءٌ نَّصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَ

اُن کو جگہ دی اور اُن کی مدد کی وہی ہیں سچے مسلمان، اُن کے لئے بخشش ہے اور

رِزْقٌ كَرِيمٌ ۝۴۴ وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجْهَهُمْ

روزی عزت کی۔ اور جو ایمان لائے اس کے بعد اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے

مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنْكُمْ وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ

تمہارے ساتھ ہو کر سو وہ لوگ بھی تمہیں میں ہیں، اور رشتہ دار آپس میں حقدا زیادہ ہیں ایک دوسرے کے

فِي كِتَابِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝۴۵

اللہ کے حکم میں، تحقیق اللہ ہر چیز سے خبردار ہے۔

خلاصہ تفسیر

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت بھی کی اور اپنے مال اور جان سے اللہ کے راستہ میں جہاد بھی کیا (جس کا وقوع لازم عادیہ ہجرت سے تھا گو مدار حکم توارث نہیں اور یہ جماعت مہاجرین سے ملقب ہے) اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) رہنے کو جگہ دی اور (ان کی)

بہشت

مدد کی (اور یہ جماعت انصار سے ملقب ہے) یہ (دونوں قسم کے) لوگ باہم ایک دوسرے کے وارث ہوں گے اور جو لوگ ایمان تولائے اور ہجرت نہیں کی تمہارا (یعنی مہاجرین کا) ان سے میراث کا کوئی تعلق نہیں (نہ یہ ان کے وارث نہ وہ ان کے) جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں (اور جب ہجرت کر لیں پھر وہ بھی اسی حکم میں داخل ہو جائیں گے) اور (گو ان سے تمہارا توارث نہ ہو لیکن) اگر وہ تم سے دین کے کام (یعنی قتال مع الکفار) میں مدد چاہیں تو تمہارے ذمے (ان کی) مدد کرنا واجب ہے مگر اس قوم کے مقابلہ میں نہیں کہ تم میں اور ان میں باہم عہد (صلح کا) ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو دیکھتے ہیں (پس ان کے مقررہ احکام میں خلل ڈال کر مستحق ناخوشی نہ ہونا) اور (جس طرح باہم تم میں علاقہ توارث کا ہے اسی طرح) جو لوگ کافر ہیں وہ باہم ایک دوسرے کے وارث ہیں (نہ تم ان کے وارث نہ وہ تمہارے وارث) اگر اس (حکم مذکور) پر عمل نہ کرو گے (بلکہ باوجود مخالفت دین محض قرابت کی بنا پر مؤمن و کافر میں علاقہ توارث قائم رکھو گے) تو دنیا میں بڑا فتنہ اور بڑا فساد پھیلے گا۔ (کیونکہ توارث سے سب ایک جماعت سمجھی جائے گی اور بدون جدا جماعت ہوئے اسلام کو قوت و شوکت حاصل نہیں ہو سکتی اور ضعف اسلام سرمایہ تمام ترقی و فساد عالم کا ہے جیسا کہ ظاہر ہے) اور (اس حکم توارث بین المہاجرین والانصار میں ہر چند کہ سب مہاجرین برابر ہیں خواہ زمانہ ہجرت نبویہ میں انہوں نے ہجرت کی ہو یا بعد میں لیکن فضیلت و مرتبہ میں باہم متفاوت ہیں چنانچہ) جو لوگ (اول) مسلمان ہوئے اور انہوں نے (ہجرت نبویہ کے زمانہ میں) ہجرت کی اور (اول ہی سے) اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان کی مدد کی یہ لوگ (تو) ایمان کا پورا حق ادا کرنے والے ہیں (کیونکہ اس کا حق یہی ہے کہ اس کے قبول کرنے میں سبقت کرے) ان کے لئے (آخرت میں) بڑی مغفرت اور (جنت میں) بڑی معزز روزی (مقرر) ہے اور جو لوگ (ہجرت نبویہ کے) بعد کے زمانہ میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ جہاد کیا (یعنی کام تو سب کئے مگر بعد میں) سو یہ لوگ (گو فضیلت میں تمہارے برابر نہیں لیکن تاہم) تمہارے ہی شمار میں ہیں (فضیلت میں تو من وجہ کیونکہ اعمال کے تفاوت سے مرتبہ میں تفاضل ہو جاتا ہے اور احکام میراث میں من کل الوجوہ کیونکہ اعمال کے تفاضل سے احکام شرعی میں تفاوت نہیں ہوتا) اور (ان بعد والے مہاجرین میں) جو لوگ (باہم یا مہاجرین سابقین کے) رشتہ دار ہیں (گو فضل و رتبہ میں کم ہوں لیکن میراث کے اعتبار سے) کتاب اللہ (یعنی حکم شرعی یا آیت میراث) میں ایک دوسرے (کی میراث) کے (بہ نسبت غیر رشتہ داروں کے) زیادہ حقدار ہیں (گو غیر رشتہ دار فضل و رتبہ میں زیادہ ہوں) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب

جانتے ہیں (اس لئے ہر وقت کی مصلحت کے مناسب حکم مقرر فرماتے ہیں)۔

معارف و مسائل

یہ سورۃ انفال کی آخری چار آیتیں ہیں۔ ان میں اصل مقصود ہجرت کے وہ احکام ہیں جن کا تعلق مہاجر مسلمانوں کی وراثت سے ہے۔ اُس کے بالمقابل غیر مہاجر مسلمان اور غیر مسلموں کی وراثت کا بھی ذکر آیا ہے۔

خلاصہ ان احکام کا یہ ہے کہ جن لوگوں پر شرعی احکام عائد ہوتے ہیں وہ اولاً دو قسم پر ہیں۔ مسلم، کافر۔ پھر مسلم اُس وقت کے لحاظ سے دو قسم کے تھے ایک مہاجر جو مکہ سے ہجرت فرض ہونے پر مدینہ طیبہ میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ دوسرے غیر مہاجر جو کسی جائز عذر سے یا کسی دوسری وجہ سے مکہ ہی میں رہ گئے تھے۔

باہمی رشتہ داری اور قرابت ان سب قسم کے افراد میں دائر تھی کیونکہ اوائل اسلام میں بکثرت ایسا تھا کہ بیٹا مسلمان ہے باپ کافر یا باپ مسلمان ہے بیٹا کافر۔ اسی طرح بھائی بھتیجیوں اور زائے ناموں وغیرہ کا حال۔ اور مسلمان مہاجر اور غیر مہاجر میں رشتہ داریاں ہونا تو ظاہر ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ اور حکمت بالغہ کی وجہ سے مرنے والے انسان کے چھوڑے ہوئے مال کا مستحق اُسی کے قریبی عزیزوں، رشتہ داروں کو قرار دیا ہے حالانکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ جس کو جو کچھ دنیا میں ملا وہ سب کا سب اللہ تعالیٰ کی ملک حقیقی تھا، اُسی کی طرف سے زندگی بھر استعمال کرنے، نفع اُٹھانے کے لئے انسان کو دے کر عارضی مالک بنا دیا گیا تھا اس لئے تقاضائے عقل و انصاف تو یہ تھا کہ ہر مرنے والے کا ترکہ اللہ تعالیٰ کی ملک کی طرف لوٹ جاتا جس کی عملی صورت اسلامی بیت المال میں داخل کرنا تھا جس کے ذریعہ ساری خلق خدا تعالیٰ کی پرورش اور تربیت ہوتی ہے۔ مگر ایسا کرنے میں ایک تو ہر انسان کے طبعی جذبات کو ٹھیس لگتی جب کہ وہ جانتا کہ میرا مال میرے بعد نہ میری اولاد کو ملے گا نہ ماں باپ اور بیوی کو۔ اور پھر اس کا یہ نتیجہ بھی طبعی طور پر لازمی سا تھا کہ کوئی شخص اپنا مال بڑھانے اور اُس کو محفوظ رکھنے کی فکر نہ کرتا صرف اپنی زندگی کی حد تک ضروریات جمع رکھنے سے زائد کوئی شخص محنت و جانفشانی نہ کرتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ پورے انسانوں اور شہروں کے لئے تباہی و بربادی کی صورت اختیار کرتا۔

اس لئے حق تعالیٰ جل شانہ نے میراث کو انسان کے رشتہ داروں کا حق قرار دے دیا

بالخصوص ایسے رشتہ داروں کا جن کے فائدہ ہی کے لئے وہ اپنی زندگی میں مال جمع کرتا اور طرح طرح کی محنت مشقت اٹھاتا تھا۔

اس کے ساتھ اسلام نے اُس اہم مقصد کو بھی وراثت کی تقسیم میں سامنے رکھا جس کے لئے انسان کی تخلیق ہوئی یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت۔ اور اس کے لحاظ سے پورے عالم انسان کو دو الگ الگ قویں قرار دے دیا۔ مؤمن اور کافر۔ آیت قرآن خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ کا یہی مطلب ہے۔

اسی دو قوی نظریہ نے نسبی اور خاندانی رشتوں کو میراث کی حد تک قطع کر دیا کہ نہ کسی مسلمان کو کسی رشتہ دار کافر کی میراث سے کوئی حصہ ملے گا اور نہ کسی کافر کا کسی مسلمان رشتہ دار کی وراثت میں کوئی حق ہوگا۔ پہلی دو آیتوں میں یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ اور یہ حکم دائمی اور غیر منسوخ حکم ہے کہ اول اسلام سے لے کر قیامت تک یہی اسلام کا اصول وراثت ہے۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا حکم مسلمان مہاجر اور غیر مہاجر دونوں کے آپس میں وراثت کا ہے۔ جس کے متعلق پہلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مسلمان جب تک مکہ سے ہجرت نہ کرے اُس وقت تک اس کا تعلق بھی ہجرت کرنے والے مسلمانوں سے وراثت کے بارہ میں منقطع ہے۔ نہ مہاجر مسلمان اپنے غیر مہاجر مسلمان رشتہ دار کا وارث ہوگا اور نہ غیر مہاجر کسی مہاجر مسلمان کی وراثت سے کوئی حصہ پائے گا یہ حکم ظاہر ہے کہ اُس وقت تک تھا جب تک کہ مکہ مکرمہ فتح نہیں ہوا تھا فتح مکہ کے بعد تو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا تھا لا ہجرۃ بعد الفتح۔ یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت کا حکم ختم ہو گیا اور جب ہجرت کا حکم ہی ختم ہو گیا تو ترک ہجرت کرنے والوں سے بے تعلق کا سوال ختم ہو گیا۔

اسی لئے اکثر مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ حکم فتح مکہ سے منسوخ ہو چکا ہے اور اہل تحقیق کے نزدیک یہ حکم بھی دائمی غیر منسوخ ہے مگر حالات کے تابع بدلا ہے۔ جن حالات میں نزول قرآن کے وقت یہ حکم آیا تھا اگر کسی زمانہ میں یا کسی ملک میں پھر ویسے ہی حالات پیدا ہو جائیں تو پھر یہی حکم جاری ہو جائے گا۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے ہر مسلمان مرد و عورت پر مکہ سے ہجرت کو فرض عین قرار دیا گیا تھا۔ اس حکم کی تعمیل میں بحر معدودے چند مسلمانوں کے سبھی مسلمان ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آ گئے تھے اور اُس وقت مکہ سے ہجرت نہ کرنا اس کی علامت بن گیا تھا کہ وہ مسلمان نہیں اس لئے اُس وقت غیر مہاجر کا اسلام بھی مشتبہ اور مشکوک تھا اس لئے مہاجر اور غیر مہاجر کی باہمی وراثت کو قطع کر دیا گیا تھا۔

اب اگر کسی ملک میں پھر بھی ایسے ہی حالات پیدا ہو جائیں کہ وہاں رہ کر اسلامی فرائض کی ادائیگی بالکل نہ ہو سکے تو اس ملک سے ہجرت کرنا پھر فرض ہو جائے گا اور ایسی حالت میں بلا عذر قوی ہجرت نہ کرنا اگر یقینی طور پر علامت کفر کی ہو جائے تو پھر بھی یہی حکم عائد ہوگا کہ مہاجر اور غیر مہاجر میں باہمی وراثت جاری نہ رہے گی۔ اس تقریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ مہاجر اور غیر مہاجر میں قطع وراثت کا حکم درحقیقت کوئی جداگانہ حکم نہیں بلکہ وہ پہلا ہی حکم ہے جو مسلم اور غیر مسلم میں قطع وراثت کو بیان کرتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اس علامت کفر کی وجہ سے وراثت سے تو محروم کر دیا گیا مگر محض اتنی علامت کی وجہ سے اُس کو کافر نہیں قرار دیا جب تک اُس سے صریح اور واضح طور پر کفر کا ثبوت نہ ہو جائے۔

اور غالباً اسی مصلحت سے اس جگہ ایک اور حکم غیر مہاجر مسلمانوں کا ذکر کر دیا گیا ہے کہ اگر وہ مہاجر مسلمانوں سے امداد و نصرت کے طالب ہوں تو مہاجر مسلمانوں کو اُن کی امداد کرنا ضروری ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ غیر مہاجر مسلمانوں کو بالکل کافروں کی صف میں نہیں رکھا بلکہ اُن کا یہ اسلامی حق باقی رکھا گیا کہ ضرورت کے وقت اُن کی امداد کی جائے۔

اور چونکہ اس آیت کا شان نزول ایک خاص ہجرت ہے مکہ سے مدینہ کی طرف اور غیر مہاجر مسلمان وہی تھے جو مکہ میں رہ گئے تھے اور کفار مکہ کے نزعہ میں تھے تو یہ ظاہر ہے کہ ان کا امداد طلب کرنا انہیں کفار مکہ کے مقابلہ میں ہو سکتا تھا۔ اور جب قرآن کریم نے مہاجر مسلمانوں کو اُن کی امداد کا حکم دے دیا تو بظاہر اس سے یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ ہر حال میں اور ہر قوم کے مقابلہ میں ان کی امداد کرنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے اگرچہ وہ قوم جس کے مقابلہ پر اُن کو امداد مطلوب ہے اُس سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ التواء جنگ کا بھی ہو چکا ہو۔ حالانکہ اصول اسلام میں عدل و انصاف اور معاہدہ کی پابندی ایک اہم فریضہ ہے۔ اس لئے اسی آیت میں ایک استثنائی حکم یہ بھی ذکر فرما دیا گیا کہ اگر غیر مہاجر مسلمان مہاجر مسلمانوں سے کسی ایسی قوم کے مقابلہ پر مدد طلب کریں جس سے مسلمانوں نے ترک جنگ کا معاہدہ کر رکھا ہے تو پھر اپنے بھائی مسلمانوں کی امداد بھی معاہدہ کفار کے مقابلہ میں جائز نہیں۔

یہ خلاصہ مضمون ہے پہلی دو آیتوں کا۔ اب الفاظ سے اس کو ملا کر دیکھئے۔ ارشاد ہوتا ہے
 اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ
 الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ۗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُهَاجِرُوْا
 مَا لَكُمْ مِنْ وَّلَآئِیَّتِهِمْ مِنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوْا۔

یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کے لئے اپنے وطن اور اعداء و اقرباء کو

چھوڑا اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا۔ مال خرچ کر کے ہتھیار اور سامان جنگ خریدا اور میدان جنگ کے لئے اپنی جانوں کو پیش کر دیا۔ اس سے مراد مہاجرین اولین ہیں۔ اور وہ لوگ جنہوں نے رہنے کو جگہ دی اور مدد کی۔ اس سے مراد انصار مدینہ ہیں۔ ان دونوں فریق کے متعلق یہ ارشاد فرمایا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ پھر فرمایا کہ وہ لوگ جو ایمان تولے آئے مگر ہجرت نہیں کی تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں جب تک وہ ہجرت نہ کریں۔

اس جگہ قرآن کریم نے لفظ ولی اور ولایت استعمال فرمایا ہے جس کے اصلی معنی دوستی اور گہرے تعلق کے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ حسنؓ قتادہؓ مجاہدؓ وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اس جگہ ولایت سے مراد وراثت اور ولی سے مراد وارث ہے اور بعض حضرات نے ولایت کے لغوی معنی یعنی دوستی اور امداد و اعانت ہی مراد لئے۔

پہلی تفسیر کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان مہاجر و انصار آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے ان کا تعلق وراثت نہ غیر مسلم کے ساتھ قائم رہے گا نہ ان مسلمانوں کے ساتھ جنہوں نے ہجرت نہیں کی۔ پہلا حکم یعنی اختلاف دین کی بنا پر قطع وراثت تو دائمی اور باقی رہا مگر دوسرا حکم فتح مکہ کے بعد جب کہ ہجرت ہی کی ضرورت نہ رہی تو مہاجر اور غیر مہاجر میں قطع وراثت کا حکم بھی باقی نہ رہا۔ اس سے بعض فقہار نے اس پر استدلال کیا ہے کہ جس طرح اختلاف دین قطع وراثت کا سبب ہے اسی طرح اختلاف دارین بھی قطع وراثت کا سبب ہے جس کی تفصیلی بحث کتب فقہ میں مذکور ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَإِنْ اسْتَنْصَرُواكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَى قَوْمٍ مِّبَيْنَکُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّبْيَاتٌ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ یعنی یہ لوگ جنہوں نے ہجرت نہیں کی اگرچہ ان سے تعلق وراثت منقطع کر دیا گیا ہے مگر وہ بہر حال مسلمان ہیں اگر وہ اپنے دین کی حفاظت کے لئے مہاجر مسلمانوں سے مدد طلب کریں تو ان کے ذمہ اُن کی امداد کرنا واجب ہے۔ مگر اس کے ساتھ اصول عدل و انصاف اور پابندی معاہدہ کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے اگر وہ کسی ایسی قوم کے مقابلہ پر تم سے امداد طلب کریں جس قوم سے تمہارا معاہدہ ترک جنگ کا ہو چکا ہے تو اُن کے مقابلہ میں ان مسلمانوں کی امداد بھی جائز نہیں۔

صلح حدیبیہ کے وقت ایسا ہی واقعہ پیش آیا جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ سے صلح کر لی اور شرائط صلح میں یہ بھی داخل تھا کہ مکہ سے جو شخص اب مدینہ جائے اُس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس کر دیں۔ عین اسی معاملہ صلح کے وقت ابو جندلؓ جن کو

کفار مکہ نے قید کر کے طرح طرح کی تکلیفوں میں ڈالا ہوا تھا کسی طرح حاضر خدمت ہو گئے اور اپنی مظلومیت کا اظہار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد کے طالب ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو رحمت عالم بن کر آئے تھے ایک مظلوم مسلمان کی فریاد سے کتنے متاثر ہوئے ہوں گے اس کا اندازہ کرنا بھی ہر شخص کے لئے آسان نہیں مگر اس تاثر کے باوجود آیت مذکورہ کے حکم کے مطابق اُن کی امداد کرنے سے عذر فرما کر واپس کر دیا۔

ان کی یہ واپسی سبھی مسلمانوں کے لئے انتہائی دل آزار تھی مگر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ارشادات ربانی کے ماتحت گویا اس کا مشاہدہ فرما رہے تھے کہ اب ان مظالم کی عمر زیادہ نہیں رہی اور چند روز کے صبر کا ثواب ابو جندل کو اُور ملنا ہے اس کے بعد بہت جلد مکہ فتح ہو کر یہ سارے قصے ختم ہونے والے ہیں۔ بہر حال اس وقت ارشاد قرآنی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کی پابندی کو ان کی شخصی مصیبت پر ترجیح دی یہی شریعت اسلام کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے اُن کو دنیا میں فتح و عزت اور آخرت کی فلاح کا مالک بنایا ہے۔ ورنہ عام طور پر دنیا کی حکومتیں معاہدات کا ایک کھیل کھیلتی ہیں جس کے ذریعہ کمزور کو دبانا اور قوت والے کو فریب دینا مقصد ہوتا ہے۔ جس وقت اپنی ذرا سی مصلحت سامنے ہوتی ہے تو سو طرح کی تاویلیں کر کے معاہدہ کو ختم کر ڈالتے ہیں اور الزام دوسروں کے سر لگانے کی فکر کرتے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ۔ یعنی کافر لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ لفظ ولی جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ایک عام مفہوم رکھتا ہے جس میں وراثت بھی داخل ہے اور معاملات کی ولایت و سرپرستی بھی۔ اس لئے اس آیت سے معلوم ہوا کہ کافر لوگ آپس میں ایک دوسرے کے وارث سمجھے جائیں گے اور تقسیم وراثت کا جو قانون اُن کے اپنے مذہب میں رائج ہے اُن کی وراثت کے معاملہ میں اُسی قانون کو نافذ کیا جائے گا۔ نیز ان کے یتیم بچوں کا ولی لڑکیوں کے نکاح کا ولی بھی انہیں میں سے ہوگا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عائلی مسائل میں غیر مسلموں کا اپنا مذہبی قانون اسلامی حکومت میں محفوظ رکھا جائے گا۔

آخر آیت میں ارشاد ہے إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ یعنی اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پوری زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔

اس جملہ کا تعلق اُن تمام احکام کے ساتھ ہے جو اس سے پہلے ذکر کئے گئے ہیں مثلاً یہ کہ مہاجرین و انصار کو آپس میں ایک دوسرے کے اولیاء ہونا چاہئے جس میں باہمی امداد

واعانت بھی داخل ہے اور وراثت بھی۔ دوسرے یہ کہ اس وقت کے مہاجر اور غیر مہاجر مسلمانوں کے آپس میں وراثت کا تعلق نہ رہنا چاہئے۔ مگر امداد و نصرت کا تعلق اپنی شرائط کے ساتھ باقی رہنا چاہئے تیسرے یہ کہ کفار آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں اُن کے قانون ولایت اور وراثت میں کوئی دخل اندازی مسلمانوں کو نہیں چاہئے۔

اگر ان احکام پر عمل نہ کیا گیا تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔ یہ تنبیہ غالباً اس لئے کی گئی کہ جو احکام اس جگہ بیان ہوئے ہیں وہ عدل و انصاف اور امن عامہ کے لئے بنیادی اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان آیات نے یہ واضح کر دیا کہ باہمی امداد و اعانت اور وراثت کا تعلق جیسے رشتہ داری پر مبنی ہے ایسے ہی اس میں مذہبی اور دینی رشتہ بھی قابل لحاظ ہے بلکہ نسبی رشتہ پر دینی رشتہ کو ترجیح حاصل ہے اسی وجہ سے کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ آپس میں نسبی رشتہ سے باپ اور بیٹے یا بھائی بھائی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مذہبی تعصب اور عصبیت جاہلیت کی روک تھام کرنے کے لئے یہ بھی ہدایت دے دی گئی ہے کہ مذہبی رشتہ اگرچہ اتنا قوی اور مضبوط ہے مگر معاہدہ کی پابندی اس سے بھی زیادہ مقدم اور قابل ترجیح ہے۔ مذہبی تعصب کے جوش میں معاہدہ کی خلاف ورزی جائز نہیں۔ اسی طرح یہ بھی ہدایت دے دی گئی کہ کفار آپس میں ایک دوسرے کے ولی اور وارث ہیں اُن کی شخصی ولایت و وراثت میں مداخلت نہ کی جائے۔ دیکھنے کو تو یہ چند فرعی اور جزئی احکام ہیں مگر درحقیقت امن عالم کے لئے عدل و انصاف کے بہترین اور جامع بنیادی اصول ہیں۔ اسی لئے اس جگہ ان احکام کو بیان فرمانے کے بعد ایسے الفاظ سے تنبیہ فرمائی گئی جو عام طور پر دوسرے احکام کے لئے نہیں کی گئی کہ اگر تم نے ان احکام پر عمل نہ کیا تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔ ان الفاظ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ احکام فتنہ و فساد کو روکنے میں خاص دخل اور اثر رکھتے ہیں۔

تیسری آیت میں مکہ سے ہجرت کرنے والے صحابہ اور اُن کی مدد کرنے والے انصارِ مدینہ کی تعریف و ثنا اور اُن کے سچا مسلمان ہونے کی شہادت اور اُن سے مغفرت اور باعزت رُزوی کا وعدہ مذکور ہے ارشاد فرمایا اُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا یعنی یہی لوگ سچے پکے مسلمان ہیں اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ ہجرت نہ کرنے والے حضرات بھی اگرچہ مسلمان ہیں مگر اُن کا اسلام کامل بھی نہیں اور یقینی بھی نہیں کیونکہ یہ احتمال بھی ہے کہ دراصل منافق ہوں بظاہر اسلام کا دعویٰ رکھتے ہوں۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا لَٰهُمْ مَغْفِرَةٌ۔ یعنی اُن کے لئے مقرر ہے مغفرت۔ جیسا کہ صحیح احادیث میں ہے اِلَٰسْلَامُ يَهْدِيْكُمْ مَّا كَانَتْ قَبْلَهُ وَالْهَجْرَةُ تَهْدِيْكُمْ مَّا كَانَتْ قَبْلَهَا۔

یعنی مسلمان ہو جانا پچھلے سب گناہوں کے انبار کو ڈھکا دیتا ہے اسی طرح ہجرت کرنا پچھلے سب گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔

چوتھی آیت میں مہاجرین کے مختلف طبقات کا حکم بیان فرمایا ہے کہ اگرچہ اُن میں بعض لوگ مہاجرین اولین ہیں جنہوں نے صلح حدیبیہ سے پہلے ہجرت کی اور بعض دوسرے درجہ کے مہاجر ہیں جنہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کی اور اس کی وجہ سے اُن کے آخری درجات میں فرق ہو گا مگر احکام دنیا میں اُن کا حکم بھی وہی ہے جو مہاجرین اولین کا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے وارث ہیں۔ اسی لئے مہاجرین کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا فَاُولَٰئِكَ مِنْكُمْ یعنی یہ دوسرے درجہ کے مہاجرین بھی تمہارے ہی زمرہ میں شامل ہیں اس لئے وراثت کے احکام میں بھی ان کا حکم عام مہاجرین کی طرح ہے۔

یہ سورۃ الفال کی بالکل آخری آیت ہے اس کے آخر میں قانون میراث کا ایک جامع ضابطہ بیان فرمایا گیا ہے جس کے ذریعہ اُس عارضی حکم کو منسوخ کر دیا گیا ہے جو اوائل ہجرت میں مہاجرین و انصار کے درمیان موافقات کے ذریعہ ایک دوسرے کا وارث بننے کے متعلق جاری ہوا تھا وَ اُولَٰئِكَ اَمْرٌ حَاسِمٌ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ۔

لفظ اَوْلٰی عربی زبان میں صاحب کے معنی میں آتا ہے جس کا ترجمہ اردو میں والے سے کیا جاتا ہے اَوْلٰی الْعَقْلُ عَقْلُ وَالْیَ اَوْلٰی اَمْرًا وَالْیَ اَوْلٰی اَرْحَامًا کے معنی ہو گا اَرْحَامُ وَالْیَ اَرْحَامُ رَحْم کی جمع ہے جو اصل میں اُس عضو کا نام ہے جس کے اندر بچہ کی تخلیق عمل میں آتی ہے اور چونکہ رشتہ داری کا تعلق رحم کی شرکت سے قائم ہوتا ہے اس لئے اَوْلٰی اَرْحَامُ رشتہ داروں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ اگرچہ ایک ولایت عامہ سب مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حاصل ہے جس کے سبب بوقت ضرورت ایک دوسرے کی امداد و اعانت بھی واجب ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے ہیں لیکن جو مسلمان آپس میں قرابت اور رشتہ کا تعلق رکھتے ہوں وہ دوسرے مسلمانوں سے مقدم ہیں۔ فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ کے معنی اس جگہ فِیْ حُکْمِ اللّٰہِ کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم خاص سے یہ قانون بنا دیا ہے۔

اس آیت نے یہ ضابطہ بتا دیا کہ تقسیم وراثت رشتہ داری کے معیار پر ہونا چاہئے۔ اور لفظ اَوْلٰی اَمْرًا حَاسِمًا مطلقاً اقرباء اور رشتہ داروں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اُن میں سے خاص خاص رشتہ داروں کے حصے تو خود قرآن کریم نے سورۃ نسا میں متعین فرما دیئے جن کو علم میراث کی اصطلاح میں اہل فرائض یا ذوی الفروض کہا جاتا ہے، اُن کو دینے کے بعد جو مال بچے وہ اس

آیت کی رو سے دوسرے رشتہ داروں میں تقسیم ہونا چاہئے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سب رشتہ داروں میں کسی مال کا تقسیم کرنا کسی کی قدرت میں نہیں کیونکہ دُور کی رشتہ داری تو ساری دنیا کے انسانوں کے درمیان بلاشبہ موجود ہے کہ سب کے سب ایک ہی باپ اور ماں آدم و حوا علیہما السلام سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کی عملی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ قریبی رشتہ داروں کو بعید پر مقدم رکھ کر قریب کے سامنے بعید کو محروم کیا جائے جس کا تفصیلی بیان احادیثِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں اس طرح موجود ہے کہ ذوی الفروض کے حصے دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ میت کے عصبات یعنی جدی رشتہ داروں کو درجہ بدرجہ دیا جائے یعنی عصبہ قریب کو بعید پر مقدم رکھ کر قریب کے سامنے بعید کو محروم کیا جائے۔ اور اگر عصبات میں سے کوئی بھی زندہ موجود نہیں تو پھر باقی رشتہ داروں میں تقسیم کیا جائے۔

عصبات کے علاوہ جو دوسرے رشتہ دار ہوتے ہیں علمِ میراث و فرائض کی خاص اصطلاح میں لفظ ذوی الارحام انہیں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ اصطلاح بعد میں مقرر کی گئی ہے قرآنِ کریم میں اُولَ الْاَرْحَامِ کا لفظ لغوی معنی کے مطابق تمام رشتہ داروں پر حاوی ہے جس میں ذوی الفروض اور عصبات اور ذوی الارحام سب اجمالی طور پر داخل ہیں۔

پھر اس کی کچھ تفصیل سورۃ نسا کی آیات میں آگئی جن میں خاص خاص رشتہ داروں کے حصے حق تعالیٰ نے خود مقرر فرما دیئے جن کو اصطلاحِ میراث میں ذوی الفروض کہتے ہیں اور باقی کے متعلق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

الْحَقُّ الْفَرَأْنُضُ بَاھِلْھَا فَمَا بَقِیَ فَمِنْھَا وِلٰی رَجُلٌ ذَکُو۔ (بخاری)

یعنی جن کے حصے قرآن نے مقرر کر دیئے ہیں وہ پورے اُن کو دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ ان لوگوں کو دیئے جائیں جو میت سے قریب تر مرد ہوں۔

ان کو اصطلاحِ میراث میں عصبات کہا جاتا ہے۔ اگر کسی میت کے عصبات میں کوئی موجود نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق پھر دوسرے رشتہ داروں کو دیا جاتا ہے جن کو اصطلاح میں ذوی الارحام کہتے ہیں جیسے ماموں خالہ وغیرہ۔

سورۃ انفال کی اس آخری آیت کے آخری جملہ نے اسلامی وراثت کا وہ قانون منسوخ کر دیا جو اس سے پہلی آیات میں مذکور ہے جن کی رو سے مہاجرین و انصار میں باہمی وراثت جاری ہوتی تھی اگرچہ ان کے درمیان کوئی رشتہ داری نہ ہو کیونکہ یہ حکم ایک

ہنگامی حکم ہے جو ادا اہل ہجرت کے وقت دیا گیا تھا۔
 سورۃ انفال ختم ہو گئی اللہ تعالیٰ ہم سب کو اُس کے سمجھنے اور پھر اُس پر عمل کرنے
 کی توفیق عطا فرمائیں۔

تمت سورۃ الانفال بعون اللہ تعالیٰ وحمدہ لیلة الخميس
 لثمانی وعشرين من جمادی الاخری سنۃ ۱۳۸۱ھ واسأل
 اللہ تعالیٰ التوفیق والعون فی تفسیر سورۃ التوبة واللہ
 الحمد اولہ و آخرہ۔

محمد شفیع عفی عنہ

وتم النظر الثاني عليه يوم الجمعة لتسعة عشر من
 جمادی الاولى سنۃ ۱۳۹۱ھ والحمد لله على ذلك۔

سُورَةُ تَوْبَةٍ

سُورَةُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ ثَلَاثٌ وَتِسْعٌ وَعِشْرُونَ آيَةً وَسِتِّينَ رُكُوعًا

سورۃ توبہ مدینہ میں اُتری اور اُس کی ایک سو انتیس آیتیں اور سولہ رکوع ہیں۔

بَرَاءَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدْتُم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ①

صاف جواب ہے اللہ کی طرف سے اور اُس کے رسول کی، ان مشرکوں کو جن سے تمہارا عہد ہوا تھا۔

فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي

سو پھرو اس ملک میں چار مہینے اور جان لو کہ تم نہ تمھکا سکو گے

اللَّهِ وَأَنَّ اللَّهَ مُخْزِي الْكَافِرِينَ ② وَأَذَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ

اللہ کو اور یہ کہ اللہ رُسوا کرنے والا ہے کافروں کو۔ اور سنا دینا ہے اللہ کی طرف سے اور اُس کے

إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ③

رسول کی، لوگوں کو دن بڑے حج کے کہ اللہ الگ ہے مشرکوں سے،

وَرَسُولُهُ فَإِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا

اور اُس کا رسول، سو اگر تم توبہ کرو تو تمھارے لئے بہتر ہے، اور اگر نہ مانو تو جان لو

أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ ④ وَبَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُوا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ⑤

کہ تم ہرگز نہ تمھکا سکو گے اللہ کو، اور خوش خبری سنارے کافروں کو عذاب دردناک کی۔

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُواكُمْ شَيْئًا وَلَمْ

مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا پھر انھوں نے کچھ قصور نہ کیا تمھارے ساتھ اور مدد

يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوْا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ

نہ کی تمہارے مقابلہ میں کسی کی سوائے یوں کر دو ان کا عہد ان کے وعدہ تک ،

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿۵﴾ فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا

بیشک اللہ کو پسند ہیں احتیاط والے ۔ پھر جب گزر جائیں ہینے پناہ کے تو مارو

الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَأَحْصُوا وَهُمْ

مشرکوں کو جہاں پاؤ اور پکڑو اور گھرو

وَأَقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ

اور بیٹھو ہر جگہ ان کی تاک میں ، پھر اگر وہ توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز

وَاتُوا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۶﴾

اور دیا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا رستہ ، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ۔

خلاصہ تفسیر

اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین (کے عہد) سے دست برداری ہے جن سے تم نے (بلا تعین شد) عہد کر رکھا تھا (یہ جہاد کا حکم ہے) ان جماعت کی تفصیل معارف میں آہی ہے اور جماعت چہارم یعنی جن سے کچھ بھی عہد نہ تھا ان کا بھی حکم اس سے بدرجہ اولیٰ مفہوم ہو گیا کہ جب معاہدین سے رفع امان کر دیا تو غیر معاہدین میں تو کوئی احتمال امن کا پہلے سے بھی نہیں ہے) سو ان دونوں جماعتوں کو اطلاع کر دو کہ تم لوگ اس سرزمین میں چار مہینے چل پھر لو (اجازت ہے تاکہ اپنا موقع اور پناہ ڈھونڈ لو) اور (اس کے ساتھ) یہ (بھی) جان رکھو کہ (اس مہلت کی بدولت صرف مسلمانوں کی دست برد سے بچ سکتے ہو لیکن) تم خدا تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے (کہ اس کے قبضہ سے نکل سکو) اور یہ (بھی) جان رکھو کہ بے شک اللہ تعالیٰ (آخرت میں) کافروں کو رسوا کریں گے (یعنی عذاب دیں گے تمہاری سیاحت اس سے نہیں بچا سکتی اور احتمال قتل دنیا میں الگ رہا۔ اس میں ترغیب ہے توبہ کی) اور (پہلی دوسری جماعت کا حکم یہ ہے کہ) اللہ اور رسول کی طرف سے بڑے حج کی تاریخوں میں عام لوگوں کے سامنے اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول دونوں (بدون مقرر کرنے کسی میعاد کے ابھی) دست بردار ہوئے ہیں ان مشرکین (کو امن دینے) سے (جنہوں نے خود نقص عہد کیا۔ مراد جماعت اول ہے مگر) پھر (بھی ان سے کہا جاتا ہے کہ) اگر تم (کفر سے) توبہ کر لو تو تمہارے لئے (دونوں جہان میں) بہتر ہے

(دنیا میں تو اس لئے کہ تمہاری عہد شکنی معاف ہو جائے گی اور قتل سے بچ جاؤ گے اور آخرت میں ظاہر ہے کہ نجات ہوگی) اور اگر تم نے (اسلام سے) اعراض کیا تو یہ سمجھ رکھو کہ تم خدا کو عاجز نہیں کر سکو گے (کہ کہیں نکل کر بھاگ جاؤ) اور (آگے خدا کو عاجز نہ کر سکنے کی تفسیر ہے کہ) ان کافروں کو ایک دردناک سزا کی خبر سنا دیجئے (جو آخرت میں واقع ہوگی یہ تو یقینی اور احتمال سزائے دنیا کا الگ مطلب یہ ہوا کہ اگر اعراض کرو گے تو سزا بھگتو گے) ہاں مگر وہ مشرکین (اس رفع امان و دست برداری سے) مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے عہد لیا پھر انہوں نے (عہد پورا کرنے میں) تمہارے ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں (تمہارے) کسی (دشمن) کی مدد کی (مراد اس سے جماعت دوم ہے) سو ان کے معاہدہ کو ان کی مدت (مقررہ) تک پورا کر دو (اور بد عہدی نہ کرو کیونکہ) واقعی اللہ تعالیٰ (بد عہدی سے) احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں (پس تم احتیاط رکھو گے تو تم بھی پسندیدہ حق ہو جاؤ گے۔ آگے جماعت اول کے حکم کا تتمہ ہے کہ جب ان کو کوئی مہلت نہیں تو گوان سے بھی قتال کی گنجائش ہو سکتی تھی لیکن ابھی محرم کے ختم تک اشہر حرم مانع قتال ہیں) سو (ان کے گزرنے کا انتظار کرو اور) جب اشہر حرم گزر جائیں تو (اس وقت) ان مشرکین (جماعت اول) کو جہاں پاؤ مارو پکڑو باندھو اور داؤ گھات کے موقعوں میں ان کی تاک میں بیٹھو (یعنی لڑائی میں جو جو ہوتا ہے سب کی اجازت ہے) پھر اگر (کفر سے) توبہ کر لیں اور (اسلام کے کام کرنے لگیں یعنی مثلاً) نماز پڑھنے لگیں، زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کا رستہ چھوڑ دو (یعنی قتل و قید مت کرو کیونکہ) واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں (اس واسطے ایسے شخص کا کفر بخش دیا اور اس کی جان بچالی اور یہی حکم بقیہ جماعت کا ہوگا ان کی میعادیں گزرنے کے بعد)۔

معارف و مسائل

سورۃ برات شروع ہو رہی ہے جس کو سورۃ توبہ بھی کہا جاتا ہے۔ برات اس لئے کہا جاتا ہے کہ اُس میں کفار سے برات کا ذکر ہے اور توبہ اس لئے کہ اُس میں مسلمانوں کی توبہ قبول ہونے کا بیان ہے۔ (منظہری)۔ اس سورت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مصاحف قرآن میں اس سورت کے شروع میں بسم اللہ نہیں لکھی جاتی اس کے سوا تمام قرآنی سورتوں کے شروع میں بسم اللہ لکھی جاتی ہے۔ اس کی وجہ معلوم کرنے سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ قرآن مجید تیس سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوا ہے ایک ہی سورت کی آیتیں مختلف اوقات میں نازل ہوئیں جبریل امین جب وحی لے کر آتے تو ساتھ ہی بحکم الہی یہ بھی بتلاتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت

میں فلاں آیت کے بعد رکھی جائے۔ اسی کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تبیین وحی کو ہدایت فرما کر لکھوا دیتے تھے۔

اور جب ایک سورت ختم ہو کر دوسری سورت شروع ہوتی تھی تو سورت شروع ہونے سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم نازل ہوتی تھی جس سے یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ پہلی سورت ختم ہو گئی اب دوسری سورت شروع ہو رہی ہے۔ قرآن مجید کی تمام سورتوں میں ایسا ہی ہوا۔ سورۃ توبہ نزول کے اعتبار سے بالکل آخری سورتوں میں سے ہے۔ اس کے شروع میں عام دستور کے مطابق نہ بسم اللہ نازل ہوئی اور نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب وحی کو اس کی ہدایت فرمائی۔ اسی حال میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔

جامع قرآن حضرت عثمان غنیؓ نے اپنی خلافت کے عہد میں جب قرآن مجید کو کتابی صورت میں ترتیب دیا تو سب سورتوں کے خلاف سورۃ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ تھی اس لئے یہ شبہ ہو گیا کہ شاید یہ کوئی مستقل سورت نہ ہو بلکہ کسی دوسری سورت کا جز ہو۔ اب اس کی فکر ہوئی کہ اگر یہ کسی دوسری سورت کا جز ہو تو وہ کونسی سورت ہو سکتی ہے۔ مضامین کے اعتبار سے سورۃ انفال اس کے مناسب معلوم ہوئی۔

اور حضرت عثمانؓ سے ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان دونوں سورتوں کو قرینتین یعنی ملی ہوئی کہا جاتا تھا۔ (منظہری) اس لئے سورۃ انفال کے بعد اس کو رکھ دیا گیا یہ احتیاط تو اس لئے کی گئی کہ دوسری سورت کا جز ہو تو اس کے ساتھ رہنا چاہئے مگر احتمال یہ بھی تھا کہ علیحدہ مستقل سورت ہو اس لئے لکھنے میں یہ سورت اختیار کی گئی کہ سورۃ انفال کے ختم پر سورۃ توبہ کے شروع سے پہلے کچھ جگہ خالی چھوڑ دی گئی جیسے عام سورتوں میں بسم اللہ کی جگہ ہوتی ہے۔

سورہ برائت یا توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھے جانے کی یہ تحقیق خود جامع قرآن حضرت عثمانؓ سے ابو داؤد، نسائی، مسند امام احمد، ترمذی میں مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ایک سوال کے جواب میں منقول ہے۔ اس سوال میں حضرت ابن عباسؓ نے حضرت عثمان غنیؓ سے یہ بھی استفسار کیا تھا کہ قرآن کی سورتوں کی جو ترتیب قائم کی گئی ہے کہ سب سے پہلے بڑی سورتیں رکھی گئیں جن میں سو آیتوں سے زیادہ ہوں جن کو اصطلاح میں مثنیں کہا جاتا ہے اس کے بعد وہ بڑی سورتیں رکھی گئی ہیں جن میں سو سے کم آیات ہیں جن کو مثانی کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد چھوٹی سورتیں رکھی گئی ہیں جن کو مفضلات کہا جاتا ہے۔ اس ترتیب کا بھی تقاضا یہ ہے کہ سورۃ توبہ کو سورۃ انفال سے پہلے رکھا جائے کیونکہ سورۃ توبہ کی آیتیں سو سے زائد

انفال کی سو سے کم ہیں۔ شروع کی سات طویل سورتیں جن کو سبع طوال کہا جاتا ہے اُس میں بھی بجائے انفال کے سورۃ توبہ ہی زیادہ مناسب ہے۔ اس کے خلاف کرنے میں کیا مصلحت ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا کہ یہ سب باتیں صحیح ہیں لیکن قرآن کے معاملہ میں احتیاط کا مقتضی وہی ہے جو اختیار کیا گیا۔ کیونکہ اگر سورۃ توبہ مستقل سورت نہ ہو بلکہ سورۃ انفال کا جز ہو تو یہ ظاہر ہے کہ سورۃ انفال کی آیات پہلے نازل ہوئی ہیں اور توبہ کی اُس کے بعد۔ اس لئے اُن کو انفال کی آیات پر مقدم کرنا بغیر وحی کے جائز نہیں اور وحی میں ہمیں کوئی ایسی ہدایت نہیں ملی اس لئے انفال کو مقدم اور توبہ کو مؤخر کیا گیا۔

اس تحقیق سے یہ معلوم ہو گیا کہ سورۃ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا احتمال ہے کہ سورۃ توبہ علیحدہ سورت نہ ہو بلکہ انفال کا جز ہو اس احتمال پر یہاں بسم اللہ لکھنا ایسا نا درست ہو گا جیسے کوئی شخص کسی سورت کے درمیان بسم اللہ لکھ دے۔

اسی بنا پر حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص اوپر سے سورۃ انفال کی تلاوت کرتا آیا ہو اور سورۃ توبہ شروع کر رہا ہو وہ بسم اللہ نہ پڑھے۔ لیکن جو شخص اسی سورت کے شروع یا درمیان سے اپنی تلاوت شروع کر رہا ہے اُس کو چاہئے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر شروع کرے بعض ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ سورۃ توبہ کی تلاوت میں کسی حال بسم اللہ پڑھنا جائز نہیں غلط ہے اور اُس پر دوسری غلطی یہ ہے کہ بجائے بسم اللہ کے یہ لوگ اس کے شروع میں اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّارِ پڑھتے ہیں جس کا کوئی ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے نہیں ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو بروایت ابن عباس رضیہ منقول ہے کہ سورۃ براءت کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ امان ہے اور سورۃ براءت میں کفار کے امان اور عہد و پیمان کو ختم کیا گیا ہے۔ سو یہ ایک نکتہ اور لطیفہ ہے جو اصلی سبب کے منافی نہیں۔ یعنی اصلی سبب تو یہی ہے کہ سورۃ انفال اور توبہ کے ایک ہونے کے احتمال کی بنا پر بسم اللہ نہیں لکھی گئی پھر اس نہ لکھے جانے کا ایک لطیفہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سورت میں کفار سے براءت اور رفع امان مذکور ہے جو بسم اللہ کے مناسب نہیں اس لئے تکوینی طور پر یہاں ایسے اسباب پیدا کر دیئے گئے کہ بسم اللہ یہاں نہ لکھی جائے۔

سورۃ توبہ کی آیات مذکورہ کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے چند واقعات کا جاننا ضروری ہے جن کے سبب سے یہ آیات نازل ہوئی ہیں اس لئے پہلے ان واقعات کی مختصر تفصیل لکھی جاتی ہے۔

(۱) پوری سورۃ توبہ میں چند غزوات اور اُن سے متعلقہ واقعات کا اور اُن کے ضمن میں بہت سے احکام و مسائل کا بیان ہوا ہے۔ مثلاً تمام قبائل عرب سے معاہدات کا ختم کر دینا۔

فتح مکہ۔ غزوہ حنین۔ غزوہ تبوک۔ ان واقعات میں فتح مکہ سب سے پہلے سنہ ہجری میں پھر غزوہ حنین اسی سال میں پھر غزوہ تبوک رجب سنہ ہجری میں پھر تمام قبائل عرب سے معاہدات ختم کرنے کا اعلان ذی الحجہ سنہ ہجری میں ہوا۔

(۲) نبذ عہد یعنی معاہدات ختم کر دینے کے متعلق جو مضامین ان آیات میں مذکور ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ سنہ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا قصد فرمایا اور قریش مکہ نے آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیا۔ اور مقام حدیبیہ میں ان سے صلح ہوئی۔ اس صلح کی میعاد روج المعانی کی نقل کے مطابق دس سال کی تھی۔ مکہ میں علاوہ قریش کے دوسرے قبائل بھی تھے معاہدہ صلح کی ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبائل میں جس کا جی چاہے وہ قریش کا حلیف اور ساتھی بن جائے اور جس کا جی چاہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف ہو کر آپ کے ساتھ ہو جائے۔ چنانچہ قبیلہ خزاعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف بننا پسند کیا اور آپ کے ساتھ ہو گئے اور قبیلہ بنی بکر نے قریش کے ساتھ ہونا اختیار کر لیا۔ اس معاہدہ کی رو سے یہ لازمی تھا کہ دس سال کے اندر نہ باہمی جنگ ہوگی نہ کسی جنگ کرنے والے کو کسی جانب سے کوئی مدد دی جائے گی اور جو قبیلہ کسی فریق کا حلیف ہے وہ بھی اُسی کے حکم میں سمجھا جائے گا کہ اُس پر حملہ کرنا یا حملہ آور کو مدد دینا معاہدہ کی خلاف ورزی سمجھا جائے گا۔

یہ معاہدہ سنہ ہجری میں ہوا سنہ ہجری میں معاہدہ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ کرام کے فوت شدہ عمرہ کی قضاء کرنے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور تین روز قیام کر کے حسب معاہدہ واپس تشریف لے آئے۔ اس وقت تک کسی فریق کی طرف سے معاہدہ صلح کی کوئی خلاف ورزی نہ تھی۔

اس کے بعد پانچ چھ ماہ گزرے تھے کہ قبیلہ بنی بکر نے قبیلہ خزاعہ پر رات کے وقت چھاپہ مارا اور قریش نے بھی یہ سمجھ کر کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہت دور ہیں اور رات کا وقت ہے آپ تک واقعہ کی تفصیلات پہنچنا مشکل ہے اس حملہ میں بنی بکر کو ہتھیاروں اور اپنے جوانوں سے امداد دی۔

ان واقعات اور حالات کے مطابق جن کو بالا خر قریش نے بھی تسلیم کر لیا وہ معاہدہ صلح ٹوٹ گیا جو حدیبیہ میں دس سال کے التواء جنگ کا ہوا تھا۔

قبیلہ خزاعہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے اُنھوں نے اس واقعہ کی اطلاع آپ کو دے دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی عہد شکنی کی خبر پا کر قریش کے خلاف

جنگ کی خفیہ تیاری شروع کر دی۔

قریش کو بدر و احد اور اتر آب کے معرکوں میں مسلمانوں کی غیبی اور ربانی طاقت کا اندازہ ہو کر اپنی قوت و طاقت کا نشہ اتر چکا تھا اس وقت عہد شکنی کرنے کے بعد مسلمانوں کی طرف سے جنگ کا خطرہ تو پیدا ہو ہی چکا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع پہنچنے کے بعد مکمل خاموشی سے یہ خطرہ اور زیادہ قوی ہو گیا۔ مجبور ہو کر ابوسفیان کو مدینہ بھیجا کہ وہ خود جا کر حالات کا اندازہ لگائیں اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جنگ کی تحریک کا اندازہ ہو تو پھلے واقعہ پر عذر و معذرت کر کے آئندہ کے لئے تجدید معاہدہ کر لیں۔

ابوسفیان کو مدینہ پہنچ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی تیاریوں کا کچھ علم ہوا تو پریشان ہو کر اکابر صحابہ میں سے ایک ایک کے پاس گئے کہ وہ سفارش کر کے معاہدہ کی تجدید کرا دیں مگر سب نے ان کے سابقہ اور لاحقہ تلخ معاملات کے سبب انکار کر دیا۔ اور ابوسفیان ناکام واپس آئے۔ قریش مکہ پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔

ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب روایت ہدایت و ابن کثیر۔ ۱۱ رمضان ۶۱۰ھ کو مدینہ طیبہ سے صحابہ کرام کی بڑی جمعیت کے ساتھ مکہ پر حملہ کرنے کے قصد سے کوچ فرمایا۔ اور بالآخر مکہ مکرمہ فتح ہو گیا۔

فتح مکہ کے وقت | فتح مکہ کے وقت
مغلوب دشمنوں کے ساتھ | بے نظیر کریمانہ سلوک

فج کے وقت بہت سے رؤساء قریش جو پہلے سے اسلام کی حقانیت کا یقین رکھتے تھے مگر برادری کے خوف سے اظہار نہ کر سکتے تھے اب ان کو موقع مل گیا وہ مشرف باسلام ہو گئے۔ اور جو اس وقت بھی اپنے قدیم مذہب کفر پر جمے رہے ان کو بھی بجز معدودے چند افراد کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو جان و مال کا امان دے کر پیغمبرانہ اور معجزانہ اخلاق کا وہ ثبوت دیا جس کا دوسرے لوگوں سے تصور بھی نہیں ہو سکتا ان کی تمام گزشتہ عداوتوں اور مظالم اور بے رحمی کے واقعات کو یکسر نظر انداز فرما کر ارشاد فرمایا کہ میں آج تم سے وہی بات کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے اُس وقت کہی تھی جب کہ وہ والدین کے ساتھ یوسف علیہ السلام کے پاس مصر پہنچے تھے۔ لَا تَزْنِبْ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ۔ یعنی تمہارے ظلم و جور کا انتقام لینا یا کوئی سزا دینا تو کیا ہم تم کو ملامت کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

فتح مکہ کے وقت مشرکین کی | بہر حال اس وقت مکہ پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہو گیا مکہ اور اطراف مکہ چار قسمیں اور ان کے احکام میں رہنے والے غیر مسلموں کو جان و مال کا امان دے دیا گیا۔ لیکن اس وقت ان غیر مسلموں کے مختلف حالات تھے۔ ایک قسم تو وہ لوگ تھے جن سے حدیبیہ میں صلح کا

معاہدہ ہوا اور انھوں نے خود اس کو توڑ دیا اور وہی فتح مکہ کا سبب ہوا۔ دوسرے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن سے صلح کا معاہدہ کسی خاص میعاد کے لئے کیا گیا اور وہ اس معاہدہ پر قائم رہے جیسے بنی کنانہ کے دو قبیلے بنی ضمہ اور بنی مدلج جن سے ایک مدت کے لئے صلح ہوئی تھی اور سورہ برات نازل ہونے کے وقت بقول خازن ان کی میعاد صلح کے نو مہینے باقی تھے۔ تیسرے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن سے معاہدہ صلح بغیر تعیین مدت کے ہوا تھا۔ چوتھے وہ لوگ تھے جن سے کسی قسم کا معاہدہ نہ تھا۔

فتح مکہ سے پہلے جتنے مشرکین یا اہل کتاب سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدات کئے اُن سب کا یہ تلخ تجربہ مسلسل ہوتا رہا کہ انھوں نے خفیہ اور علانیہ عہد شکنی کی اور دشمنوں سے سازش کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی مقدور بھرپوری کوششیں کیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مسلسل تجربہ اور اشارات الہیہ کے ماتحت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی معاہدہ صلح نہ کیا جائے گا۔ اور جزیرۃ العرب کو ایک اسلامی قلعہ کی حیثیت سے صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے گا جس کا مقصد یہ تھا کہ مکہ اور جزیرۃ العرب پر اقتدار حاصل ہوتے ہی اعلان کر دیا جاتا کہ غیر مسلم یہاں سے دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ لیکن اسلام کے اصول عدل والضاف اور رحمانہ سلوک اور رحمۃ للعالمین کی رحمت عامہ کے ماتحت بلا مہلت کے ایسا کرنا مناسب نہ تھا۔ اس لئے سورہ برات کے شروع میں ان چاروں قسم کی غیر مسلم جماعتوں کے جدا جدا احکام نازل ہوئے۔ پہلی جماعت جو قریش مکہ کی تھی جنھوں نے میثاق حدیبیہ کو خود توڑ دیا تھا اب یہ کسی مزید مہلت کے مستحق نہ تھے مگر چونکہ یہ زمانہ اشہر حرم کا زمانہ تھا جن میں جنگ و قتال منجانب اللہ ممنوع تھا اس لئے اُن کے متعلق تو وہ حکم آیا جو سورہ توبہ کی پانچویں آیت میں مذکور ہے **فَإِذَا أَسْلَخَ الْأَشْهُرَ الْحُرُمَ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَالْأَنَافِتِ** جس کا حاصل یہ تھا کہ ان لوگوں نے عہد شکنی کر کے اپنا کوئی حق باقی نہیں چھوڑا مگر اشہر حرم کا احترام بہر حال ضروری ہے اس لئے اشہر حرم ختم ہوتے ہی یا وہ جزیرۃ العرب سے نکل جائیں یا مسلمان ہو جائیں ورنہ اُن سے جنگ کی جائے۔

اور دوسری جماعت جن سے کسی خاص میعاد کے لئے معاہدہ صلح کیا گیا اور وہ اس پر قائم رہے ان کا حکم سورہ توبہ کی چوتھی آیت میں یہ آیا۔ **إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ شَيْئًا وَ لَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ**۔ یعنی وہ مشرک لوگ جن سے تم نے معاہدہ صلح کر لیا پھر انہوں نے

معاہدہ پر قائم رہنے میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں تمہارے کسی دشمن کی مدد کی۔ تو تم ان کے معاہدہ کو اُس کی مدت تک پورا کر دو کیونکہ اللہ تعالیٰ احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ یہ حکم بنو ضمرہ اور بنو مدلج کا تھا جس کی رو سے اُن کو نو مہینے کی مہلت مل گئی۔

اور تیسری اور چوتھی دونوں جماعتوں کا ایک ہی حکم آیا جو سورہ توبہ کی پہلی اور دوسری آیت میں مذکور ہے بَرَاءَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدْتُم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ۚ فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ وَإِنَّ اللَّهَ مُحْزِي الْمُكْفِرِينَ ۝ یعنی اعلان دست برداری اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اُس کے رسول کی طرف سے ہے اُن مشرکین کے لئے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، سو تم لوگ اس سرزمین میں چار مہینے چل پھرو۔ اور یہ جان رکھو کہ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ بے شک اللہ تعالیٰ کافروں کو رسوا کریں گے۔

غرض پہلی دوسری آیتوں کی رو سے اُن سب لوگوں کو جن سے بلا تعین مدت کوئی معاہدہ تھا یا جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ تھا چار مہینے کی مہلت مل گئی۔

اور چوتھی آیت کی رو سے اُن لوگوں کو تا اختتام معاہدہ مہلت مل گئی جن کے ساتھ کسی خاص میعاد کا معاہدہ تھا اور پانچویں آیت سے مشرکین مکہ کو اشہر حرم ختم ہونے تک مہلت مل گئی۔ کفار سے معاہدات ختم ہو جانے پر بھی ان احکام کا نفاذ اور مہلت کا شروع اُس وقت سے تجویز ہوا جبکہ اُن کو مہلت دینے کا کریمانہ سلوک ان احکام کا اعلان تمام عرب میں ہو جائے۔ اس اعلان عام کے لئے

یہ انتظام کیا گیا کہ سہ ماہی کے ایام حج میں منیٰ و عرفات کے عام اجتماعات میں اُس کا اعلان کیا جائے جس کا ذکر سورہ توبہ کی تیسری آیت میں اس طرح آیا وَاذْأَنَّكَ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ فَإِنْ تُبْتَلُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ ۚ وَبَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُوا بِعَذَابٍ آتٍ بِهِمْ ۝ یعنی اعلان عام ہے عام لوگوں کے سامنے اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے بڑے حج کی تاریخوں میں اس بات کا کہ اللہ اور اُس کا رسول دونوں دست بردار ہوتے ہیں ان مشرکین سے۔ پھر اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور اگر تم نے اعراض کیا تو یہ سمجھ رکھو کہ تم خدا کو عاجز نہیں کر سکو گے اور ان کافروں کو ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔

کفار سے معاہدہ ختم کیا جائے تو اعلان عام اور سب کو چنانچہ اس حکم ربانی کی تعمیل کے لئے رسول ہر شیخ و خبردار کے بغیر اُن کے خلاف کوئی عمل درست نہیں کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سہ ماہی کے حج میں حضرت صدیق اکبر اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کو مکہ مکرمہ بھیج کر میدان عرفات اور منیٰ میں جہاں

تمام قبائل عرب کا اجتماع تھا یہ اعلان کرا دیا اور یہ بھی ظاہر تھا کہ اس عظیم نشانِ مجمع کی معرفت پورے عرب میں اس حکم کا مشترک ہو جانا لازمی تھا۔ پھر احتیاطاً حضرت علیؓ کی معرفت یمن میں بالتخصیص اس کا اعلان کرا دیا۔

اس اعلانِ عام کے بعد صورتِ حال یہ ہو گئی کہ پہلی جماعت یعنی مشرکینِ مکہ کو اشہرِ حرم کے خاتمہ یعنی محرمِ سنہ ہجری کے ختم تک اور دوسری جماعت کو رمضانِ سنہ ہجری تک اور تیسری چوتھی جماعتوں کو ۱۰ ربیع الثانی سنہ ہجری تک حدود سے خارج ہو جانا چاہیے اور جو اس کی خلاف ورزی کرے وہ مستحقِ قتال ہے۔ اس طرح اگلے سال کے زمانہ حج تک کوئی کافر داخلِ حدود نہ رہے پائے گا۔ جس کا ذکر سورہ توبہ کی اٹھائیسویں آیت میں آئے گا جس میں ارشاد ہے **فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا**۔ یعنی یہ لوگ اس سال کے بعد مسجدِ حرام کے پاس نہ جاسکیں گے۔ اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد **لَا يَحْتَجُّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ** کا یہی مطلب ہے سورہ توبہ کی ابتدائی پانچ آیتوں کی تفسیر واقعات کی روشنی میں سامنے آچکی۔

مذکورہ پانچ آیات سے متعلق | **چند مسائل اور فوائد**
 دوسرے دشمنِ قبائل کے ساتھ جو معاملہ عفو و درگزر اور رحم و کرم کا فرمایا اس نے عملی طور پر مسلمانوں کو یہ اخلاقی درس دیا کہ جب تمہارا کوئی دشمن تمہارے قابو میں آجائے اور تمہارے سامنے عاجز ہو جائے تو اُس سے گزشتہ عداوتوں اور ایذاؤں کا انتقام نہ لو بلکہ عفو و کرم سے کام لے کر اسلامی اخلاق کا ثبوت دو۔ اگرچہ ایسا کرنا اپنے طبعی جذبات کو کچلنا ہے لیکن اس میں چند عظیم فائدے ہیں اول خود اپنے لئے کہ انتقام لے کر اپنا غصہ اتار لینے سے وقتی طور پر اگرچہ نفس کو کچھ راحت محسوس ہو لیکن یہ راحت فنا ہونے والی ہے اور اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کے درجاتِ عالیہ جو اس کو ملنے والے ہیں وہ اس سے ہر حیثیت میں زیادہ بھی ہیں اور دائمی بھی اور عقل کا تقاضا یہی ہے کہ دائمی کو فانی پر ترجیح دے۔ دوسرے یہ کہ دشمن پر قابو پانے کے بعد اپنے غصہ کے جذبات کو دبا دینا اس کا ثبوت ہے کہ ان کی لڑائی اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے لئے تھی اور یہی وہ اعلیٰ مقصد ہے جو اسلامی جہاد اور عام بادشاہوں کی جنگ میں امتیاز اور جہاد و فساد میں فرق کرتے والا ہے کہ جو لڑائی اللہ کے لئے اور اُس کے احکام جاری کرنے کے لئے ہو وہ جہاد ہے ورنہ فساد۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ دشمن حیبِ مقہور و مغلوب ہونے کے بعد ان اخلاقی فاضلہ کا مشاہدہ کرے گا تو شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ اُس کو اسلام اور مسلمانوں سے محبت پیدا ہوگی جو اُس کے لئے

کلیدِ کامیابی ہے اور یہی جہاد کا اصل مقصد ہے۔

(۲) دوسرا مسئلہ جو آیات مذکورہ سے سمجھا گیا یہ ہے کہ عفو کفار سے عفو و درگزر کے یہ معنی نہیں کہ اُن کے شر سے بچنے کا اہتمام بھی نہ کیا جائے و کرم کے یہ معنی نہیں کہ دشمنوں کے شر سے اپنی حفاظت نہ کرے اور اُن کو ایسا آزاد چھوڑ دے کہ وہ پھر ان کو نقصان اور ایذا پہنچاتے رہیں۔ بلکہ عفو و کرم کے ساتھ تقاضائے عقل یہ ہے کہ پچھلے تجربوں سے آئندہ زندگی کے لئے سبق حاصل کرے اور اُن تمام رخنوں کو بند کرے جہاں سے یہ خود دشمنوں کی زد میں آسکے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکیمانہ ارشاد ہے لَا یُلْدَغ الْمَرْءُ مِنْ جَحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَینَ۔ یعنی عقلمند آدمی ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔ جس سوراخ سے ایک مرتبہ کسی زہریلے جانور نے اس کو کاٹا ہے اُس میں دوبارہ ہاتھ نہیں دیتا۔

۹۔ ہجری کے قرآنی اعلانِ برابرت اور مشرکین کو مہلت و اطمینان کے ساتھ حدودِ حرم خالی کر دینے کی ہدایات اسی حکمتِ عملی کا ثبوت ہیں۔

(۳) تیسرا فائدہ سورہ توبہ کی ابتدائی آیات سے یہ معلوم ہوا کہ کمزور قوموں کو بلا مہلت کسی جگہ سے نکل جانے کا حکم یا ان پر یکبارگی حملہ بزدلی اور غیر شریفانہ فعل ہے۔ جب ایسا کرنا ہو تو پہلے سے اعلانِ عام کر دیا جائے اور ان کو اس کی پوری مہلت دی جائے کہ وہ اگر ہمارے قانون کو تسلیم نہیں کرتے تو آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں بسہولت جاسکیں۔ جیسا کہ مذکورہ آیتوں میں ۹۔ ہجری کے اعلانِ عام اور اُس کے بعد تمام جماعتوں کو مہلت دینے کے احکام سے واضح ہوا۔

(۴) چوتھا مسئلہ آیات مذکورہ سے یہ معلوم ہوا کہ کسی قوم کے ساتھ معاہدہ صلح کر لینے کے بعد اگر میعاد سے پہلے اُس معاہدہ کو ختم کر دینے کی ضرورت پیش آجائے تو اگرچہ چند شرائط کے ساتھ اس کی اجازت ہے مگر بہتر یہی ہے کہ معاہدہ کو اس کی میعاد تک پورا کر دیا جائے جیسا کہ سورہ توبہ کی چوتھی آیت میں بنو ضمرہ اور بنو مدیح کا معاہدہ نو مہینہ تک پورا کرنے کا حکم آیا ہے۔

(۵) پانچواں مسئلہ ان آیات سے یہ معلوم ہوا کہ دشمنوں کے ساتھ ہر معاملہ میں اس کا خیال رہنا چاہئے کہ مسلمانوں کی دشمنی اُن کی ذات کے ساتھ نہیں بلکہ ان کے کافرانہ عقائد و خیالات کے ساتھ ہے جو انھیں کے لئے دنیا و آخرت کی بربادی کے اسباب ہیں۔ اور مسلمانوں کی اُن سے مخالفت بھی درحقیقت اُن کی ہمدردی اور خیر خواہی پر مبنی ہے۔ اسی لئے جنگ و صلح کے ہر مقام پر اُن کو نصیحت و خیر خواہانہ فہمائش کسی وقت نہ چھوڑنا چاہئے۔ جیسا کہ ان آیتوں میں جا بجا اس کا ذکر ہے کہ اگر تم اپنے خیالات سے تائب ہو گئے تو یہ تمھارے لئے فلاح دنیا و آخرت ہے۔

اور اُس کے ساتھ یہ بھی بتلادیا کہ اگر تائب نہ ہوئے تو صرف یہی نہیں کہ تم دنیا میں قتل و غارت کئے جاؤ گے جس کو بہت سے کافر اپنا قومی کارنامہ سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں بلکہ یہ بھی سمجھ رکھو کہ مرنے کے بعد بھی عذاب سے نجات نہ پاؤ گے۔ مذکورہ آیتوں میں اعلانِ برائت کے ساتھ ہمدردانہ فہمائش کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

(۶) چھٹا مسئلہ یہ ہے کہ چوتھی آیت میں جہاں مسلمانوں کو میعادِ صلح کے ختم ہونے تک عہد کو پورا کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اُسی کے ساتھ آیت کو اس جملہ پر ختم کیا گیا ہے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ معاہدہ پورا کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیں۔ عام قوموں کی طرح اُس میں جیلے اور تاویلین نکال کر خلافت و رزی کی راہ نہ ڈھونڈیں۔

(۷) ساتواں مسئلہ پانچویں آیت کی تفصیلات سے یہ معلوم ہوا کہ جب صحیح مقصد کے لئے کسی قوم سے جنگ چھڑ جائے تو پھر اُن کے مقابلہ کے لئے ہر طرح کی قوت پورے طور پر استعمال کرنا چاہئے اُس وقت رحم دلی یا نرمی درحقیقت رحم دلی نہیں بلکہ بزدلی ہوتی ہے۔

(۸) آٹھواں مسئلہ مذکورہ پانچویں آیت سے یہ ثابت ہوا کہ کسی غیر مسلم کے مسلمان ہو جانے پر اعتماد تین چیزوں پر موقوف ہے۔ ایک توبہ دوسرے اقامتِ صلوٰۃ تیسرے ادائے زکوٰۃ، جب تک اس پر عمل نہ ہو محض کلمہ پڑھ لینے سے اُن کے ساتھ جنگ بند نہ کی جائے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جن لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا اُن کے مقابلہ پر صدیق اکبرؓ نے جہاد کرنے کے لئے اسی آیت سے استدلال فرما کر تمام صحابہ کو مطمئن کر دیا تھا۔

(۹) نواں مسئلہ ان آیات میں یہ ہے کہ یَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ سے کیا مراد ہے۔ اس میں حضراتِ مفسرین کے مختلف اقوال ہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، فاروق اعظمؓ، عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ نے فرمایا کہ یَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ سے مراد یومِ عرفہ ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الحج عرفة۔ (ابوداؤد۔ ترمذی)

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد یوم النحر یعنی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ اور بعض دوسرے ائمہ نے ان سب اقوال کو جمع کرنے کے لئے فرمایا کہ حج کے پانچوں دن یوم الحج اکبر کا مصداق ہیں جن میں عرفہ اور یوم النحر دونوں داخل ہیں اور لفظ یوم مفرد لانا اس محاورہ کے مطابق ہے جیسے غزوہ بدر کے چند ایام کو قرآن کریم میں یَوْمَ الْفُرْقَانِ کے مفرد نام سے تعبیر کیا ہے۔ اور عرب کی عام جنگوں کو لفظ یوم ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے اگرچہ اُن میں کتنے ہی ایام صرف ہوئے ہوں جیسے یومِ بعاث، یومِ احد وغیرہ۔

اور چونکہ عمرہ کو حج اصغر یعنی چھوٹا حج کہا جاتا ہے اُس سے ممتاز کرنے کے لئے حج کو حج اکبر کہا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآنی اصطلاح میں ہر سال کا حج حج اکبر ہی ہے۔ عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ جس سال عرفہ بروز جمعہ واقع ہو صرف وہ ہی حج اکبر ہے اس کی اصلیت اس کے سوا نہیں ہے کہ اتفاقی طور پر جس سال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع ہوا ہے اُس میں عرفہ بروز جمعہ ہوا تھا۔ یہ اپنی جگہ ایک فضیلت ضرور ہے مگر آیت مذکورہ کے مفہوم سے اس کا تعلق نہیں۔ امام جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ ایام حج کو حج اکبر فرمانے سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ ایام حج میں عمرہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ان ایام کو قرآن کریم نے حج اکبر کے لئے مخصوص فرما دیا ہے۔

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ

اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے تو اُس کو پناہ دے دے یہاں تک کہ وہ سُن لے

كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَا مَنَّهُ ط ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ ۝

کلام اللہ کا پھر پہنچا دے اُس کو اُس کی امن کی جگہ، یہ اس واسطے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے۔

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِندَ اللَّهِ وَعِندَ رَسُولِهِ إِلَّا

کیونکہ ہودے مشرکوں کے لئے عہد اللہ کے نزدیک اور اُس کے رسول کے نزدیک مگر

الَّذِينَ عَاهَدُوا لَكَ مِنَ النِّسَاءِ مَا مَنَعَ بِأَيْمَانِهِمْ أَن يَشَرَٰهُ

جن لوگوں سے تم نے عہد کیا تھا مسجد حرام کے پاس، سو جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں

فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ط إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝ كَيْفَ وَإِنْ

تم اُن سے سیدھے رہو، بیشک اللہ کو پسند ہیں احتیاط والے۔ کیونکر رہے صلح اور اگر

يُظْهِرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلَّا ذِمَّتَهُ ط يُرِضُونَكُمْ

وہ تم پر قابو پائیں تو نہ لحاظ کریں تمہاری قرابت کا اور نہ عہد کا، تم کو راضی کر دیتے ہیں

بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ ۚ وَكَثُرُهُمْ فَاسِقُونَ ۝ اسْتَرَوْا

اپنے منہ کی بات سے اور اُن کے دل نہیں مانتے، اور اکثر اُن میں بد عہد ہیں۔ بیچ ڈالے انہوں نے

بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمًّا قَلِيلًا فَصَدُّوا عَن سَبِيلِهِ ط إِنَّهُمْ سَاءَ مَا

اللہ کے حکم تھوڑی قیمت پر بھرو کا اُس کے رستہ سے، بُرے کام ہیں جو وہ

كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلَّا وَلَا ذِمَّةً ط وَأُولَٰئِكَ

لوگ کر رہے ہیں۔ نہیں لحاظ کرتے کسی مسلمان کے حق میں قرابت کا اور نہ عہد کا، اور وہی

هُمُ الْمُعْتَدُونَ ۝ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ

ہیں زیادتی پر۔ سو اگر توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیتے رہیں زکوٰۃ

فَاخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ ۖ وَنُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿١١﴾

تو تمہارے بھائی ہیں حکم شریعت میں، اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں حکموں کو جاننے والے لوگوں کے واسطے۔

خلاصہ تفسیر

اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے (زمانہ اباحت قتل میں بعد ختم میعاد امن کے تو بہ و اسلام کے فوائد و برکات سن کر اس طرف راغب ہو اور حقیقت و حقیقت اسلام کی تلاش کی غرض سے آپ کے پاس آکر) آپ سے پناہ کا طالب ہو (تاکہ اطمینان سے سن سکے اور سمجھ سکے) تو (ایسی حالت میں) آپ اس کو پناہ دیجئے تاکہ وہ کلام الہی (مراد مطلق دلائل دین حق کے ہیں) سن لے پھر (اس کے بعد) اس کو اس کی امن کی جگہ میں پہنچا دیجئے (یعنی پہنچنے دیجئے تاکہ وہ سوچ سمجھ کر اپنی رائے قائم کر لے) یہ حکم (اتنی پناہ دینے کا) اس سبب سے (دیا جاتا) ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ پوری خبر نہیں رکھتے (اس لئے قدرے مہلت دینا ضروری ہے۔ جماعت اول نے جو نقص عہد کیا تھا ان کے نقص عہد سے پہلے بطور پیشین گوئی کے فرماتے ہیں کہ) ان مشرکین (قریش) کا عہد اللہ کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک کیسے (قابل رعایت) رہے گا (کیونکہ رعایت تو اس عہد کی ہوتی ہے جس کو دوسرا شخص خود نہ توڑے ورنہ رعایت نہیں باقی رہتی۔ مطلب یہ کہ یہ لوگ عہد کو توڑ دیں گے اس وقت اس طرف سے بھی رعایت نہ ہوگی) مگر جن لوگوں سے تم نے مسجد حرام (یعنی حرم) کے نزدیک عہد لیا ہے (مراد دوسری جماعت ہے جن کا استثناء اوپر بھی) اَلَا الَّذِیْنَ عَلٰہُ تَحَدُّثٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ تَحَدُّثٌ کُمْ یَنْقُصُ کُمْ الخ میں آچکا ہے یعنی ان سے امید ہے کہ یہ عہد کو قائم رکھیں گے) سو جب تک یہ لوگ تم سے سیدھی طرح رہیں (یعنی عہد نہ توڑیں) تم بھی ان سے سیدھی طرح رہو (اور مدت عہد کی ان سے پوری کرو و چنانچہ زمانہ نزول برأت میں اس مدت میں نو ماہ باقی رہے اور بوجہ ان کی عہد شکنی نہ کرنے کے ان کی یہ مدت پوری کی گئی) بلاشبہ اللہ تعالیٰ (بد عہدی سے) احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں (پس تم بھی احتیاط رکھنے سے پسندیدہ حق ہو جاؤ گے یہ استثناء کر کے پھر عود ہے مضمون متعلق جماعت اول کی طرف کہ) کیسے (ان کا عہد قابل رعایت رہے گا یعنی وہ لوگ عہد پر کب قائم رہیں گے) حالانکہ ان کی یہ حالت ہے کہ اگر وہ

تم پر کہیں غلبہ پا جائیں تو تمہارے بارے میں نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول و قرار کا (کیونکہ ان کی یہ صلح مجبوری اور خوفِ جہاد سے ہے دل سے نہیں پس) یہ لوگ تم کو (صرف) اپنی زبانی باتوں سے راضی کر رہے ہیں اور ان کے دل (ان باتوں کو) نہیں مانتے (پس جب دل سے اس عہد کے پورا کرنے کا عزم نہیں ہے تو کیا پورا ہوگا) اور ان میں زیادہ آدمی شیریں ہیں (کہ عہد پورا کرنا نہیں چاہتے اور اگر ایک آدھ پورا کرنا بھی چاہتا ہو تو زیادہ کے سامنے ایک دو کی کب چلتی ہے اور وجدان کے شریر ہونے کی یہ ہے کہ) انہوں نے احکامِ الہیہ کے عوض (دنیا کی) متاعِ ناپائدار کو اختیار کر رکھا ہے (جیسا کہ کفار کی حالت ہوتی ہے کہ دین کو چھوڑ کر دنیا کو اس پر ترجیح دیتے ہیں جب دنیا زیادہ محبوب ہوگی تو جب عہد شکنی میں دنیوی غرض حاصل ہوتی نظر آئے گی اس میں کچھ باک نہ ہوگا بخلاف اس شخص کے جو دین کو ترجیح دیتا ہے وہ احکامِ الہیہ اور وفائے عہد وغیرہ کا پابند ہوگا) سور اس ترجیحِ دنیا علی الدین کی وجہ سے (یہ لوگ اللہ کے (سیدھے) رستہ سے) جس میں وفائے عہد بھی داخل ہے (ہٹے ہوئے ہیں) (اور) یقیناً یہ ان کا عمل بہت ہی برا ہے (اور ہم نے جو اوپر کہا ہے لَا یَرْقُبُوا فِیْکُمْ اِلَّا سِوَا سِوَا میں تمہاری کچھ تخصیص نہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ) یہ لوگ کسی مسلمان کے بارے میں (بھی) نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول و قرار کا اور یہ لوگ (خصوص اس باب میں) بہت ہی زیادتی کر رہے ہیں سو (جب ان کے عہد پر اعتماد و اطمینان نہیں بلکہ احتمالِ عہد شکنی کا بھی ہے جیسا کہ اس کی جانب مخالف کا بھی احتمال ہے اس لئے ہم ان کے بارے میں مفصل حکم سناتے ہیں کہ) اگر یہ لوگ (کفر سے) توبہ کر لیں (یعنی مسلمان ہو جائیں) اور (اس اسلام کو ظاہر بھی کر دیں مثلاً) نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو (پھر ان کی عہد شکنی وغیرہ پر اصلاً نظر نہ ہوگی خواہ انہوں نے کچھ ہی کیا ہو، اسلام لانے سے) وہ تمہارے دینی بھائی ہو جائیں گے (اور پچھلا کیا ہوا سب معاف ہو جائے گا) اور ہم سمجھدار لوگوں (کو بتلانے) کے لئے احکام کو خوب تفصیل سے بیان کرتے ہیں (چنانچہ اس مقام پر بھی ایسا ہی کیا گیا)۔

معارف و مسائل

سورۃ توبہ کی ابتدائی پانچ آیتوں میں اس کا ذکر تھا کہ فتحِ مکہ کے بعد مکہ اور اُس کے اطراف کے تمام مشرکین و کفار کو جان و مال کا عام امان دے دیا گیا مگر ان کی سابقہ عداوت اور عہد شکنی کے تجربہ کی بنا پر آئندہ کے لئے ان سے کوئی معاہدہ نہ کیا جانا طے ہو گیا۔ اس قرار داد کے باوجود جن لوگوں سے کوئی معاہدہ اس سے پہلے ہو چکا تھا اور انہوں نے عہد شکنی نہیں کی تو اُن کا

معاہدہ ختم میعاد تک پورا کرنے کے احکام ان آیات میں نازل ہوئے۔ اور جن سے کوئی معاہدہ نہیں تھا یا کسی معین میعاد کا معاہدہ نہیں تھا ان کے ساتھ بھی یہ رعایت کی گئی کہ ان کو فوری طور پر مکہ چھوڑ دینے کے حکم کے بجائے چار مہینہ کی وسیع مہلت دے دی گئی کہ اس عرصہ میں وہ مکہ چھوڑ کر جہاں مناسب سمجھیں سہولت و اطمینان کے ساتھ چلے جائیں۔ یا اگر اسلام کی حقانیت ان پر روشن ہو چکی ہے تو مسلمان ہو جائیں۔ ان احکام کا نتیجہ یہ تھا کہ سال آئندہ تک مکہ مکرمہ سہولت کے ساتھ ان سب غدار مشرکین سے خالی ہو جائے اور چونکہ یہ خالی کرنا بھی کسی انتقامی جذبہ سے نہیں بلکہ مسلسل تجربوں کے بعد اپنی حفاظت کے پیش نظر عمل میں لایا گیا تھا اس لئے ان کی اصلاح و خیر خواہی کا دروازہ اب بھی کھلا رکھا گیا۔ جس کا ذکر چھٹی آیت میں ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ مانگے تو آپ کو پناہ دینی چاہئے تاکہ وہ آپ کے قریب اگر اللہ کا کلام سن سکے اور اسلام کی حقانیت کو سمجھ سکے۔ اور صرف یہی نہیں کہ وقتی طور پر اس کو پناہ دے دی جائے بلکہ جب وہ اپنے اس کام سے فارغ ہو جائے تو اپنی حفاظت اور نگرانی میں اس کو اس مقام تک پہنچانا بھی مسلمانوں کے ذمہ ہے جہاں یہ اپنے آپ کو محفوظ و مطمئن سمجھتا ہے۔ آخر آیت میں فرمایا کہ یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ لوگ پوری خبر نہیں رکھتے قریب آکر باخبر ہو سکتے ہیں۔

اس آیت سے بھی چند مسائل اور فوائد حاصل ہوئے جن کو امام ابو بکر جصاص نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

حقانیت اسلام کو دلائل کے ساتھ | اول یہ کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی کافر مسلمانوں سے سمجھانا علماء دین کا فرض ہے | اس کا مطالبہ کرے کہ مجھے اسلام کی حقانیت دلیل سے سمجھاؤ تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کا مطالبہ پورا کریں۔

دوسرے یہ کہ جو شخص اسلام کی تحقیق اور معلومات حاصل کرنے کے لئے ہمارے پاس آئے تو ہم پر واجب ہے کہ اس کو اجازت دیں اور اس کی حفاظت کریں۔ اس کو کسی قسم کی تکلیف یا نقصان پہنچانا جائز نہیں۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ اس کے آنے کا مقصد اللہ کا کلام سننا اور اسلام کی تحقیق کرنا ہو اور اگر کوئی دوسری غرض تجارت وغیرہ ہو تو وہ مسلمانوں کے مصالح اور حاکم مسلمین کی صوابدید پر موقوف ہے مناسب سمجھے تو اجازت دے ورنہ اختیار ہے۔

غیر مسلم جو دارالاسلام کے باشندے نہ ہوں ان کو ضرورت کے | تیسرے یہ کہ غیر مسلم حربی جس کے ساتھ ہمارا کوئی زائد دارالاسلام میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی جائے | معاہدہ نہ ہو اس کو ضرورت سے زیادہ ٹھہرنے کی

اجازت نہ دی جائے۔ کیونکہ آیت مذکورہ میں پناہ دینے اور ٹھہرانے کی یہ حد مقرر کر دی گئی ہے
حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ - یعنی اُس کو اپنے یہاں اتنا ٹھہراؤ کہ وہ اللہ کا کلام سُن لے۔
چوتھے یہ کہ مسلمان حاکم و امیر کے فرائض میں سے ہے کہ جب کوئی حربی غیر مسلم کسی ضرورت کی
بن پر ہم سے اجازت (ویزا) لے کر ہمارے ملک میں داخل ہو تو اُس کے حالات پر نظر رکھے اور
جب وہ اپنا کام پورا کر چکے اُس کو حفاظت کے ساتھ واپس کر دے۔

ساتویں آٹھویں نویں دسویں چار آیتوں میں اُس اعلانِ برائت کی حکمت کا بیان ہے جو
سورہ توبہ کی ابتدائی آیات میں ذکر کیا گیا ہے اس آیت میں عہد شکنی کرنے والے مشرکین کی طبعی
خست اور مسلمانوں سے بغض و عناد کی شدت کا ذکر کر کے یہ بتلایا گیا ہے کہ ان سے وفاء عہد کی
امید رکھنا ہی غلط ہے۔ ارشاد فرمایا کہ بجز چند لوگوں کے جن سے مسجد حرام کے پاس تمہارا
معاہدہ ہوا تھا ان مشرکین کا کوئی عہد اللہ اور اُس کے رسول کے نزدیک قابلِ رعایت
کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اُن کا یہ حال ہے کہ اگر اُن کو کسی وقت بھی ذرا موقع مل جائے تو
وہ تمہارے بارہ میں نہ کسی قرابت داری کی رعایت کریں نہ عہد و پیمان کی اور وجہ اس کی یہ
ہے کہ یہ لوگ معاہدہ کرنے کے وقت بھی دل میں اس کے پورا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے
بلکہ صرف الفاظ سے تمہیں خوش کرنا چاہتے ہیں اور اُن میں سے اکثر لوگ فاسق یعنی عہد شکن
غدار ہیں۔

کفار کے مقابلہ میں بھی سچائی پر قائم رہنے اور اُن کے متعلق مبالغہ آمیزی سے پرہیز کرنے کی تعلیم
قرآن کریم کے اس بیان نے مسلمانوں کو یہ ہدایت دی
کہ اپنے دشمن مخالفین کے معاملہ میں بھی جب کوئی گفتگو
آئے تو سچائی اور انصاف کو ہاتھ سے نہ دیں مبالغہ آمیزی سے کام نہ لیں جیسا کہ ان آیات میں
مشرکین مکہ کے بارہ میں اس کی پوری رعایت کی گئی ہے کہ اگرچہ معدودے چند لوگوں کے سوا
بھی نے عذر و عہد شکنی کی تھی اور ایسے حالات میں عام طور پر کہنے والے سبھی کو بُرا کہا کرتے
ہیں مگر قرآن کریم نے اِلَّا الَّذِیْنَ عٰہَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرما کر اُن لوگوں کا استثناء کر دیا
جنہوں نے عہد شکنی نہیں کی اور یہ حکم دیا کہ جب تک وہ استقامت اور وفاء عہد پر قائم رہیں
تم بھی عہد پر قائم رہو، دوسرے لوگوں کی خیانت سے متاثر ہو کر ان کے عہد کو نہ توڑو۔

اس کے بعد عہد شکنی کرنے والوں کا جہاں یہ حال بیان فرمایا کہ ان لوگوں کے دلوں میں
شروع ہی سے خیانت تھی وفائے عہد کا ارادہ ہی نہ تھا یہاں بھی اُکْتُرْتُمْ فَمِیْثُوْنَ فَمَا کر
اشارہ کر دیا کہ ان میں بھی سب کا یہ حال نہیں بعض شریف لوگ ایسے بھی ہیں جو عہد پر قائم رہنا
چاہتے تھے مگر دوسروں کے سامنے اُن کی بات نہ چلی۔

یہ وہی مضمون ہے جس کی ہدایت قرآن کریم نے دوسری جگہ صاف لفظوں میں اس طرح دی ہے لَا يَجْرِمُكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ یعنی کسی قوم کی عداوت تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم انصاف کو چھوڑ بیٹھو۔

اس کے بعد نویں آیت میں ان عداوت مشرکین کی غداری کی علت اور ان کے مرض کا سبب بیان فرما کر ان کو بھی ایک ہدایت نامہ دے دیا کہ اگر یہ غور کریں تو اپنی اصلاح کر لیں اور عام مسلمانوں کو بھی متنبہ کر دیا کہ جس سبب سے یہ لوگ غدرو خیانت میں مبتلا ہوئے اُس سبب سے پورے طور پر پرہیز کو اپنا شعار بنالیں۔ اور وہ سبب ہے حب دنیا کہ دنیا کے مال و متاع کی محبت نے ان کو اندھا کر دیا ہے تھوڑے سے پیسوں کے بدلہ میں اللہ کی آیات اور اپنے ایمان کو بیچ ڈالتے ہیں۔ اور ان کا یہ کردار نہایت بُرا ہے۔

دسویں آیت میں انہیں لوگوں کی انتہائی کجروی کا یہ بیان ہے لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلَّا ذَلٰلًا مِّمَّہٗ۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ ان لوگوں نے عہد کرنے والے مسلمانوں سے غداری کی اور اُن کی قرابت اور عہد و پیمان کو پیچھے ڈال دیا بلکہ ان کا حال یہ ہے کہ کسی مسلمان کے بارہ میں نہ یہ قرابت کی رہایت کرنے والے ہیں نہ کسی عہد و پیمان کی۔

مشرکین کے مذکورہ حالات کا طبعی تقاضا یہ ہو سکتا تھا کہ مسلمان ان سے ہمیشہ کے لئے بیزار ہو جائیں۔ اور کسی حالت میں بھی ان کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اسی لئے قرآنی عدل و انصاف نے گیارھویں آیت میں یہ ہدایت دے دی۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوْا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ۔ یعنی اگر یہ لوگ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو اب یہ بھی تمہارے دینی بھائی ہیں۔

اس میں بتلا دیا کہ کوئی کیسا ہی دشمن ہو اور کتنی ہی ایذا اُس نے پہنچائی ہو جب وہ مسلمان ہو گیا تو جس طرح اللہ تعالیٰ اُس کے سب پچھلے گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں، مسلمانوں پر بھی لازم ہے کہ پچھلے سب معاملات کو دل سے بھلا دیں اور آج سے اُن کو اپنا دینی بھائی سمجھیں اور برادرانہ تعلق کے حقوق ادا کریں۔

اسلامی برادری میں داخل ہونے کی تین شرطیں | اس آیت نے واضح کر دیا کہ اسلامی برادری میں داخل ہونے کے لئے تین شرطیں ہیں اول کفر و شرک سے توبہ دوسرے نماز تیسرے زکوٰۃ۔ کیونکہ ایمان و توبہ تو ایک امر مخفی ہے جس کی حقیقت کا عام مسلمانوں کو علم نہیں ہو سکتا اس لئے اس کی دو ظاہری علامتوں کو بیان کر دیا گیا، یعنی نماز اور زکوٰۃ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اس آیت نے اہل قبلہ مسلمانوں کے خون کو حرام

کر دیا، یعنی جو لوگ نماز، زکوٰۃ کے پابند ہوں اور اسلام کے خلاف کوئی قول و فعل ان کا ثابت نہ ہو وہ تمام احکام میں مسلمان سمجھے جائیں گے، اگرچہ ان کے دل میں صحیح ایمان نہ ہو یا نفاق ہو۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زکوٰۃ سے انکار کر نیوالوں پر جہاد کرنے کے لئے اسی آیت سے استدلال فرما کر صحابہ کرامؓ کو مطمئن کیا تھا (ابن کثیر)۔ آخر آیت میں معاہدین اور تائبین سے متعلقہ احکام مذکورہ کی پابندی کی تاکید کرنے کیلئے ارشاد فرمایا وَتُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ، یعنی ہم سمجھدار لوگوں کے لئے احکام کو خوب تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

وَأِنْ تَكَتُّوا أَيْمَانَكُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنْتُمْ فِي دِيْنِكُمْ

اور اگر وہ توڑیں اپنی قسمیں عہد کرنے کے بعد اور عیب لگاویں تمہارے دین میں

فَقَاتِلُوا أَيْمَانَهُ الْكُفْرُ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ

تو لڑو کفر کے سرداروں سے بے شک ان کی قسمیں کچھ نہیں تاکہ وہ

يَنْتَهُوْنَ ۝۱۲ أَلَا تَقَاتِلُونَ قَوْمًا نَكَتُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا

باز آویں، کیا نہیں لڑتے ایسے لوگوں سے جو توڑیں اپنی قسمیں اور فکر میں رہیں

بِأَخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ بَدَءُكُمْ وَأَوَّلَ مَرَّةٍ أَخْشَوْهُمْ

کہ رسول کو نکال دیں اور انہوں نے پہلے چھیڑ کی تم سے، کیا ان سے ڈرتے ہو

فَاللَّهُ أَخْتٌ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝۱۳ قَاتِلُوهُمْ

سو اللہ کا ڈر چاہتے تم کو زیادہ اگر تم ایمان رکھتے ہو، لڑو ان سے

يَعِزُّهُمْ اللَّهُ بَأْيِدِكُمْ وَيُخْرِجُهُمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ

تا عذاب دے اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں اور رسوا کرے اور تم کو ان پر غالب کرے اور

يَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ ۝۱۴ وَيَذْهَبَ غِظَ قُلُوبِهِمْ

ٹھنڈے کرے دل مسلمان لوگوں کے، اور نکالے ان کے دل کی جبلن،

وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝۱۵ أَمْ

اور اللہ توبہ نصیب کرے گا جسکو چاہے گا اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے، کیا

حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ

تم یہ گمان کرتے ہو کہ چھوٹ جاؤ گے اور حالانکہ ابھی معلوم نہیں کیا اللہ نے تم میں ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا

وَلَمْ يَتَّخِذْ دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ

اور نہیں پکڑا انھوں نے سوا اللہ کے اور اس کے رسول کے اور مسلمانوں کے کسی

وَلِيَّةٌ وَاللَّهُ خَيْرٌ لِّمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۶﴾

کو بھیدی، اور اللہ کو خیر ہے جو تم کر رہے ہو۔

حُلاصۃ تفسیر

اور اگر وہ لوگ عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں (عہدوں) کو توڑ ڈالیں (جیسا کہ ان کی حالت سے غالب ہے) اور (عہد توڑ کر ایمان بھی نہ لائیں بلکہ اپنے کفر پر قائم رہیں جسکا ایک ثبوت یہ ہو کہ تمھاری دین (اسلام) پر طعن (واعتراض) کریں تو اس حالت میں) تم لوگ اس قصد سے کہ یہ اپنے کفر سے باز آجائیں، ان پیشوایان کفر سے (خوب) لڑو (کیونکہ اس صورت میں) ان کی قسمیں (باقی) نہیں رہیں (یہاں تک قبل نقص پیشینگوئی ہو چکی، آگے بعد وقوع نقص کے قتال کی ترغیب ہے کہ) تم ایسے لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جنھوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا (اور بنی بکر کی بمقابلہ خراہ کے، دیکھ) اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جلا وطن کر دینے کی تجویز کی، اور انھوں نے تم سے خود پہلے چھیڑ نکالی کہ تمھاری طرف سے وفاتے عہد میں کوئی کمی نہیں ہوئی، انھوں نے بیٹھے بٹھائے خود ایک شوشہ چھوڑا، پس ایسے لوگوں سے کیوں نہ لڑو (کیا ان سے لڑنے میں ڈرتے ہو کہ ان کے پاس جمعیت زیادہ ہے) سو اگر یہ بات ہی تو ہرگز ان سے مت ڈرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کے زیادہ متحق ہیں کہ تم ان سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو (اور ان سے ڈرنے کا یہ مقتضا ہے کہ ان کے حکم کے خلاف مت کرو اور وہ حکم دیتے ہیں قتال کا پس) ان سے لڑو، اللہ تعالیٰ (کا وعدہ ہے کہ) ان کو تمھارے ہاتھوں سزا دے گا اور ان کو ذلیل (و خوار) کرے گا اور تم کو ان پر غالب کرے گا اور (ان کی اس تعذیب اور تمھاری نفرت سے) بہت سے (ایسے) مسلمانوں کے قلوب کو شفاء دے گا اور ان کے قلوب کے غیظ (و غضب) دور کر دے گا (جو خود تاب مقابلہ کی نہیں رکھتے اور ان کی حرکات کو دیکھ کر دل ہی دل میں گھٹتے ہیں) اور (ان ہی کفار میں سے) جس پر (توجہ و فضل کرنا) منظور ہو گا اللہ تعالیٰ (توجہ دے گا) فرمائے گا (یعنی مسلمان ہونے کی توفیق دے گا، چنانچہ فتح مکہ میں بعض لڑے اور ذلیل و مقتول ہوئے اور بعض مسلمان ہو گئے) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں (کہ علم سے ہر ایک کا انجام کہ اسلام ہی یا کفر جاتے ہیں، اور اسی لئے اپنی حکمت سے احکام مناسبہ مقرر فرماتے ہیں اور تم جو لڑنے سے جی چراتے ہو گو بعض ہی سہی تو) کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم یوں ہی (اسی

حالت پر) چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ نے (ظاہری طور پر) ان لوگوں کو تو دیکھا ہی نہیں جنہوں نے تم میں سے ایسے موقع پر جہاد کیا ہو اور اللہ و رسول اور مؤمنین کے سوا کسی کو خصوصیت کا دوست نہ بنایا ہو جس کے ظاہر ہونے کا اچھا ذریعہ ایسے موقع کا جہاد ہی جہاں مقابلہ اعزہ و اقارب کے ہو کہ پورا امتحان ہو جائے کہ کون اللہ کو چاہتا ہے اور کون برادری کو، اور اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے تمہارے سب کاموں کی پس اگر جہاد میں جستی کر دو گے یا سستی کر دو گے اسی کے موافق تم کو جزا دے گا) :

معارف و مسائل

قریش مکہ جن سے سلسلہ میں بمقام حدیبیہ ایک معاہدہ التواہ جنگ کا ہوا تھا ان کے متعلق سورۃ توبہ کی ابتدائی آیتوں میں بطور پیشگوئی کے یہ اطلاع دی گئی تھی کہ یہ لوگ اپنے معاہدہ پر قائم نہ رہیں گے جس کا ذکر سورۃ توبہ کی ساتویں آیت میں **كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ** کے الفاظ میں گزر چکا ہے، اور پھر آٹھویں نویں دسویں آیتوں میں ان کی عہد شکنی کے اسباب کا بیان ہوا، عیار ہویں آیت میں اس کا بیان آیا کہ عہد شکنی کے اس جرم عظیم کے بعد بھی اگر یہ لوگ مسلمان ہو جائیں اور اپنے اسلام کا اظہار نماز روزہ کے ذریعہ کرنے لگیں تو پھر مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان کے پچھلے جرائم کا کوئی اثر اپنے معاملات میں باقی نہ رکھیں، بلکہ ان کو اپنا دینی بھائی سمجھیں اور برادرانہ معاملات کریں، مذکورہ بارہویں آیت میں اس کا بیان ہے کہ پیشگوئی کے مطابق جب یہ لوگ عہد شکنی کر سں ڈالیں تو پھر ان کے ساتھ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔

اس میں ارشاد فرمایا **وَإِنْ كُنْتُمْ لَا تَكُونُونَ أَوْلِيَاءَ لَهُمْ فَكُفُّوا عَنْهُمْ قَاتِلُوا فَكُفُّوا** یعنی اگر یہ لوگ اپنے معاہدہ اور قسموں کو توڑ ڈالیں اور مسلمان بھی نہ ہوں بلکہ بدستور تمہارے دین اسلام پر طعن و تشنیع کرتے رہیں تو ان کفر کے پیشواؤں کے ساتھ جنگ کرو، یہاں یہ بات قابل غور ہو کہ تقاضائے مقام اس جگہ بظاہر یہ تھا کہ **فَقَاتِلُوا هُمْ** فرمایا جاتا یعنی ان لوگوں سے قتال کرو، قرآن کریم نے اس جگہ مختصر ضمیر استعمال کرنے کے بجائے **فَقَاتِلُوا** **أَوَّلِيَاءَ الْكُفْرِ** فرمایا، ائمہ، امام کی جمع ہے، معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اپنی عہد شکنی کی وجہ سے کفر کے امام اور قائد ہو کر اس کے مستحق ہو گئے کہ ان سے جنگ کی جائے، اس میں حکیم قتال کی علت اور وجہ کا بھی بیان ہو گیا، اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہاں ائمہ الکفر سے مراد قریش مکہ کے وہ سردار ہیں جو لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنے اور جنگی تیاریوں میں لگے رہتے تھے، ان سے جنگ کرنے کو خصوصیت کے ساتھ اس لئے ذکر فرمایا کہ اہل مکہ کی

اصل طاقت کا سرچشمہ ہی لوگ تھے، اس کے علاوہ مسلمانوں کی قریبی رشتہ داری بھی انہی لوگوں سے تھی، جس کی وجہ سے اس کا خطرہ ہو سکتا تھا کہ ان کے معاملہ میں کوئی رعایت برقی جاک (مظہری) دارالاسلام میں غیر مسلم ذمیوں کو اسلام پر علمی تنقید کی تو اجازت ہو مگر طعن و تشنیع کی نہیں !!

کرنے میں داخل ہے، جو شخص اسلام اور شریعت اسلام پر طعنہ زنی کرے وہ مسلمانوں کا معاہدہ نہیں رہ سکتا، مگر باتفاق فقہاء اس سے مراد وہ طعن و تشنیع ہو جو اسلام اور مسلمانوں کی اہانت اور تحقیر کے طور پر اعلانا کی جائے، احکام و مسائل کی تحقیق میں کوئی علمی تنقید کرنا اس سے مستثنیٰ ہے اور لغت میں اس کو طعن و تشنیع کہتے بھی نہیں۔

اس لئے دارالاسلام کے غیر مسلم باشندوں کو علمی تنقید کی تو اجازت دی جاسکتی ہے، مگر اسلام پر طعنہ زنی اور تحقیر و توہین کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

اسی آیت میں فرمایا اِنَّهُمْ لَا اَيُّمَانَ لَهُمْ یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کی قسم کوئی قابل اعتبار قسم نہیں، کیونکہ یہ لوگ قسم توڑنے اور عہد شکنی کرنے کے عادی ہیں، اور اس جج کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جب انھوں نے اپنی قسم توڑ دی تو اب مسلمانوں پر بھی ان کی قسم اور عہد کی کوئی ذمہ داری نہیں رہی۔

آخر آیت میں ہے لَعَلَّكُمْ يَتَّقُونَ، تاکہ وہ باز آجائیں، اس آخری جملہ میں بتلادیا کہ مسلمانوں کی جنگ و جہاد کا مقصد عام دنیا کے لوگوں کی طرح دشمن کو ستانا اور جوش انتقام کو فرو کرنا یا عام بادشاہوں کی طرح ملک گیری نہ ہونا چاہئے، بلکہ ان کی جنگ کا مقصد دشمنوں کی خیر خواہی اور ہمدردی اور یہ جذبہ ہونا چاہئے کہ وہ لوگ اپنی غلط روش سے باز آجائیں۔

اس کے بعد تیرہویں آیت میں مسلمانوں کو جہاد و قتال کی ترغیب کے لئے فرمایا کہ تم اسی قوم کے ساتھ جنگ کے لئے کیوں تیار نہ ہو گے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکالنے کا منصوبہ بنایا، مراد اس سے یہود مدینہ ہیں، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ سے نکالنے کا منصوبہ بنایا تھا، اور کہا تھا لَیْخْرُجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلُّ، یعنی ایسا ضرور ہوگا کہ عزت و قوت والا کمزور ذلیل کو مدینہ سے نکال دے گا۔ ان کے نزدیک عزت والے وہ لوگ تھے اور مسلمانوں کو کمزور و ذلیل سمجھتے تھے، جس کے جواب میں حق تعالیٰ نے ان کے ہی قول کو اس طرح پورا کر دکھایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے ان کو مدینہ سے نکال کر یہ ثابت کر دیا کہ عزت والے مسلمان ہی ہیں اور کمزور و ذلیل یہود تھے۔

دوسری وجہ اُن سے جنگ کرنے کی یہ ارشاد فرمائی، وَهُمْ بَدَءُكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ،

یعنی جنگ و قتال کی پہل اپنی لوگوں کی طرف سے ہوئی، اب تو صرف مدافعت کا رروائی ہے، جو ہر فطرت سلیمہ کا تقاضا ہے۔

پھر مسلمانوں کے دلوں سے ان لوگوں کا رعب و در کرنے کے لئے فرمایا أَتَخْشَوْنَهُمْ قَالَ اللَّهُ أَتُحِبُّونَ أَن تَخْشَوْهُمْ، یعنی کیا تم لوگ ان سے خوف کھاتے ہو، حالانکہ خوف اور ڈرنا صرف اللہ تعالیٰ سے چاہئے، جس کے عذاب کو کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی، آخر میں إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ فرما کر بتلادیا کہ غیر اللہ سے ایسا خوف کھانا جو احکام شرعیہ کی ادائیگی میں حائل ہو سکے کسی مؤمن مسلمان کا کام نہیں۔

چودھویں اور پندرہویں آیت میں بھی مسلمانوں کو جنگ و جہاد کی ترغیب ایک دوسرے عنوان سے دی گئی ہے، جس میں چند چیزیں بتلائی گئیں۔

اول یہ کہ اگر تم ان سے جنگ کے لئے تیار ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کی مدد تمھارے شامل ہوگی، اور یہ قوم اپنے اعمال بد کی وجہ سے اللہ کے عذاب کی مستحق تو ہو ہی چکی ہے، مگر ان پر اللہ کا عذاب پچھل قوموں کی طرح آسمان یا زمین سے نہیں آئے گا، بلکہ يُحَنِّ بِكُمْ اللَّهُ يَأْتِيكُمْ یعنی ان کو اللہ تعالیٰ تمھارے ہاتھوں سے عذاب دیں گے۔

دوسرے یہ کہ اس جنگ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دلوں کو اس رنج و غم سے شفا عطا فرمائیں گے جو کفار کی طرف سے ان کو مسلسل پہنچتا رہا ہے۔

تیسرے یہ کہ ان کی غدارسی اور عہد شکنی کے سبب جو غیظ و غضب مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوا تھا، اپنی کے ہاتھوں ان کو عذاب دے کر ان کے غیظ کو دور فرمادیں گے۔

پچھلی آیت میں لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ فرما کر مسلمانوں کو اس کی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کسی قوم کو اپنا غصہ اتارنے کے لئے نہ لڑیں، بلکہ ان کی اصلاح و ہدایت کو مقصد بنائیں، اس آیت میں یہ بتلادیا کہ جب وہ اپنی نیت کو اللہ کے لئے صاف کر لیں اور محض اللہ کے لئے لڑیں تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ایسی صورتیں بھی پیدا فرمادیں گے کہ ان کے غم و غصہ کا انتقام بھی خود بخود ہو جائے۔

چوتھی چیز یہ ارشاد فرمائی وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَى مَن يَشَاءُ، یعنی ان میں سے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا اس کی توبہ قبول فرمالیں گے،

جس سے معلوم ہوا کہ اس جہاد کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ دشمن کی جماعت میں گہرے لوگوں کو اسلام کی توفیق ہو جائے گی، وہ مسلمان ہو جائیں گے، چنانچہ فتح مکہ میں بہت سے مکرش ذلیل و خوار ہوئے اور بہت سے لوگ مشرف باسلام ہو گئے۔

ان آیات میں جن حالات و واقعات کی خبر بطور پیشگوئی دی گئی ہے تاریخ شاہد ہو کہ وہ سب ایک ایک کر کے اسی طرح مشاہدہ میں آئے جس طرح قرآن حکیم نے خبر دی تھی، اس لئے یہ آیات بہت سے معجزات پر مشتمل ہیں۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسْجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَى

مشرکوں کا کام نہیں کہ آباد کریں اللہ کی مسجدیں اور تسلیم کر رہے ہوں

أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي النَّارِ

اپنے اوپر کفر کو وہ لوگ خراب گئے اُن کے عمل اور آگ میں

هُمْ خَالِدُونَ ۝ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسْجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَ

رہیں گے وہ ہمیشہ ، وہی آباد کرتا ہے مسجدیں اللہ کی جو یقین لایا اللہ پر اور

الْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ

آخرت کے دن پر اور قائم کیا نماز کو اور دیتا رہا زکوٰۃ اور نہ ڈرا سوائے

إِلَّا اللَّهَ فَكَفَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ۝

اللہ کے کسی سے سوا امیدوار ہیں وہ لوگ کہ ہو دیں ہدایت والوں میں۔

خلاصہ تفسیر

مشرکین کی یہ لیاقت ہی نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو جن میں مسجد حرام بھی آگئی آباد کریں جس حالت میں وہ خود اپنے کفر کی باتوں کا اقرار کر رہے ہیں (چنانچہ وہ خود اپنا مشرب بتلانے کے وقت ایسے عقائد کا اقرار کرتے تھے جو واقع میں کفر ہیں، مطلب یہ کہ عمارتِ منجنا گو عمل محمود ہو لیکن باوجود مشرک کے کہ اس کے منافی ہے اس عمل کی اہلیت ہی مفقود ہے اور اس لئے وہ محض غیر معتد بہ ہے، پھر فخر کی کیا گنجائش ہے) ان لوگوں کے (جو مشرک ہیں) سب اعمال (نیک مثل عمارتِ مسجد وغیرہ) اکارت اور ضائع ہیں (بوجہ اس کے کہ ان کی قبولیت کی شرط نہیں پائی جاتی اور ضائع عمل پر فخر ہی کیا) اور دوزخ میں وہ لوگ ہمیشہ رہیں گے (کیونکہ وہ عمل جو کہ اسبابِ نجات سے ہے وہ تو ضائع ہی ہو گیا تھا) ہاں اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا ان لوگوں کا کام ہے (یعنی علی وجہ الکمال ان سے مقبول ہوتا ہے) جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر (دل سے) ایمان لائیں (اور جو ارجح سے اس کا اظہار بھی کریں مثلاً اس طرح کہ) نماز کی

پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ پر ایسا توکل رکھتے ہوں کہ، بجز اللہ کے کسی سے نہ ڈریں
سوائے لوگوں کی نسبت توقع (یعنی وعدہ) ہے کہ اپنے مقصود (یعنی جنت نجات) تک پہنچ
جائیں گے کیونکہ ان کے اعمال بوجہ ایمان کے مقبول ہوں گے، اس لئے آخرت میں نفع
ہوگا اور مشرکین اس شرط سے محروم ہیں، اور عمل بے ثمر پر نخر لا حاصل)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں مشرکین مکہ کی کج روی، عہد شکنی اور اپنے دین باطل کے لئے ہر طرح کی
کوشش کا اور اس کے مقابلہ پر مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب کا بیان آیا تھا، آیات مذکورہ میں
مسلمانوں کو جہاد کی تاکید کے ساتھ یہ بتلایا گیا ہے کہ جنگ و جہاد ہی وہ چیز ہے جس میں مسلمان
کا امتحان ہوتا ہے، مخلص مسلمان اور منافق یا ضعیف الایمان کا امتیاز ہوتا ہے، اور یہ امتحان
ضروری ہے۔

سولہویں آیت میں ارشاد فرمایا کہ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم صرف کلمہ اسلام زبان سے
کہہ لینے اور اسلام کا دعویٰ کر لینے پر آزاد چھوڑ دیئے جاؤ گے، جب تک اللہ تعالیٰ ظاہری
طور پر بھی ان سچے اور سچے مسلمانوں کو نہ دیکھ لیں جو تم میں سے جہاد کرنے والے ہیں، اور جو
اللہ اور رسول اور مسلمانوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار دوست نہیں بناتے۔
اسی آیت میں اُن عام لوگوں کو خطاب ہے جو مسلمان سمجھے جاتے تھے، اگرچہ ان میں سے
بعض منافق بھی تھے اور بعض ضعیف الایمان اور مذہب تھے، ایسے ہی لوگوں کا یہ حال تھا
کہ اپنے غیر مسلم دوستوں کو مسلمانوں کے راز دار اسرار پر مطلع کر دیا کرتے تھے، اس لئے اس
آیت میں مخلص مسلمان کی دو علامتیں بتلا دی گئیں۔

مخلص مسلمان کی | اول یہ کہ اللہ کے واسطے کفار سے جہاد کریں، دوسرے یہ کہ کسی غیر مسلم کو اپنا
دوست بنائیں | راز دار دوست بنائیں آخر آیت میں فرمایا **وَاللّٰهُ يُخَيِّرُكُمْ بَيْنَ اَعْمَلِكُمْ**، یعنی تم جو
کچھ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہیں، ان کے آگے کسی کا حیلہ و تاویل نہیں چل سکتی۔

یہی مضمون قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے، **اَحْسِبَ
النَّاسَ اَنْ يَّكُوْا اَنْ يَّقُوْا لَوْ اٰمَنَّا وَهَمَّ لَا يُفْتَنُوْا**، یعنی کیا لوگوں نے یوں سمجھ رکھا ہے
کہ وہ صرف زبانی اپنے آپ کو مؤمن کہنے پر آزاد چھوڑ دیئے جائیں گے، اور ان کا کوئی امتحان
نہ لیا جائے گا؟

کسی غیر مسلم کو ہمارا دوست بنانا درست نہیں | آیت مذکورہ میں جو لفظ **وَلِيْنَجْهَ** آیا اس کے معنی خیل

اور بھیدی کے ہیں، اور ایک دوسری آیت میں اسی معنی کے لئے لفظ بَطَانَة استعمال کیا گیا ہے، بطانہ کے اصل معنی اس کپڑے کے ہیں جو دوسرے کپڑوں کے نیچے بطن اور بدن کے ساتھ متصل ہو، مراد اس سے ایسا آدمی ہے جو اندر کے رازوں سے واقف ہو، اس آیت کے الفاظ یہ ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِّنْ دُونِكُمْ لَا يَأْمُرُكُمْ بِحَبَالِ اللَّهِ

”اے ایمان والو! اپنے مسلمانوں کے سوا کسی کو ہر از اور بھیدی دوست نہ بناؤ وہ تمہیں دھوکہ دے کر برباد کرنے میں کوئی کسر نہ رکھیں گے۔“

اس کے بعد ستر ہویں اور اٹھا رہیں آیتوں میں مسجد حرام اور دوسری مساجد کو عبادت باطلہ سے پاک کرنے اور صحیح و مقبول طریقہ پر عبادت کرنے کی ہدایات ہیں۔

اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ اور مسجد حرام سے ان تمام بتوں کو نکال ڈالا جن کی مشرکین عبادت کیا کرتے تھے، اس طرح حسی طور پر تو مسجد حرام بتوں سے پاک ہو گئی، لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قدیم دشمنوں پر غالب آنے کے بعد سب کو معافی اور امان دیدیا تھا، اور وہ مشرکین اب بھی بیت اللہ اور حرم مکہ میں عبادت و طواف وغیرہ اپنے باطل طریقوں پر کیا کرتے تھے۔

اب ضرورت اس بات کی تھی کہ جس طرح مسجد حرام کو بتوں سے پاک کر دیا گیا، اسی طرح بت پرستی اور اس کے تمام باطل طریقوں سے بھی اس مقدس زمین کو پاک کیا جائے، اور اس سے پاک کرنے کی ظاہری صورت یہی تھی کہ مشرکین کا داخلہ مسجد حرام میں ممنوع قرار دیدیا جائے لیکن اس دیتے ہوئے امان کے خلاف ہوتا، اور معاہدہ کی پابندی اسلام میں ان سب چیزوں سے مقدم اور اہم تھی، اس لئے فوری طور پر ایسے احکام نہیں دیئے گئے بلکہ فتح مکہ سے اگلے ہی سال میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبرؓ اور علی مرتضیٰؓ کے ذریعہ منیٰ اور عرفہ کے عام اجتماع میں یہ اعلان کر دیا کہ آئندہ کوئی مشرک نہ طواف کی عبادت اور حج و طواف وغیرہ حرم میں نہ ہو سکے گی، اور جاہلیت میں جو ننگے ہو کر طواف کرنے کی رسم بد چل پڑی تھی آئندہ اس حرکت کی اجازت نہ دی جائے گی، چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے منیٰ کے اجتماع عام میں اس کا اعلان کر دیا کہ:-

| | |
|--|---------------------------------------|
| لَا يَحْجُّنَ بَعْدَ النِّعَامِ مُشْرِكٌ | یعنی اس سال کے بعد کوئی مشرک حج |
| وَلَا يُطَوِّفَنَّ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ | نکرے گا، اور کوئی نہنگا آدمی بیت اللہ |
| | کا طواف نہ کر سکے گا۔ |

اور یہ سال بھر کی مہلت اس لئے دیدی گئی کہ ان میں بہت سے وہ لوگ بھی تھے جن کے ساتھ

مسلمانوں کا معاہدہ تھا اور وہ ابھی تک معاہدہ پر قائم تھے، میعاد معاہدہ پورا ہونے سے پہلے ان کو کسی نئے قانون کا پابند کرنا اسلامی رواداری کے خلاف تھا، اس لئے ایک سال پہلے سے یہ اعلان جاری کر دیا گیا کہ حرم محترم کو مشرکانہ عبادات اور رسوم سے پاک کرنا طے کر دیا گیا ہے کیونکہ اس قسم کی عبادت درحقیقت عبادت اور مسجد کی آبادی نہیں بلکہ دیرانی ہے۔

یہ مشرکین مکہ اپنی مشرکانہ رسوم کو عبادت اور مسجد حرام کی عمارت و آبادی کا نام دیتی اور اس پر فخر کیا کرتے تھے، کہ ہم بیت اللہ اور مسجد حرام کے متولی اور اس کی عمارت کے ذمہ دار ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عباسؓ جب اسلام لانے سے پہلے غزوہ بدر میں گرفتار ہوئے اور مسلمانوں نے ان کو کفر و شرک پر قائم رہنے سے عار دلائی، تو انھوں نے جواب دیا کہ تم لوگ صرف ہماری بُرائیاں یاد رکھتے ہو اور بھلائیوں کا کوئی ذکر نہیں کرتے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم بیت اللہ اور مسجد حرام کو آباد رکھنے اور اس کا انتظام کرنے اور حجاج کو پانی پلانے وغیرہ کی خدمات کے متولی بھی ہیں، اس پر قرآن کریم کی یہ آیتیں نازل ہوئیں، مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَحْضُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ یعنی مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجد کی تعمیر کریں، کیونکہ مسجد صرف وہی جگہ ہے جو ایک اللہ وحدہ کی عبادت کے لئے بنائی گئی ہے، شرک و کفر اس کی ضد ہے، وہ عمارت مسجد کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

عمارت مسجد کا لفظ جو اس آیت میں آیا ہے کئی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، ایک ظاہری در و دیوار کی تعمیر، دوسرے مسجد کی حفاظت اور صفائی اور ضروریات کا انتظام، تیسری عبادت کے لئے مسجد میں حاضر ہونا، عمرہ کو عمرہ اسی مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ اس میں بیت اللہ کی زیارت اور عبادت کے لئے حاضری ہوتی ہے۔

مشرکین مکہ تمینوں معنی کے اعتبار سے اپنے آپ کو معمار بیت اللہ اور عمارت مسجد حرام کا ذمہ دار سمجھتے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے، ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ مشرکین کو اللہ کی مساجد کی عمارت کا کوئی حق نہیں جبکہ وہ خود اپنے کفر و شرک کے گواہ ہیں، ان لوگوں کے اعمال جبط اور ضائع ہو گئے اور وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہیں گے۔

خود اپنے کفر و شرک کی گواہی کا مطلب یا تو یہ ہے کہ اپنے مشرکانہ افعال و اعمال کے سبب گویا خود اپنے کفر و شرک کی گواہی دے رہے ہیں، اور یا یہ کہ عادتاً جب کسی نصرانی یا یہودی سے پوچھا جائے کہ تم کون ہو؟ تو وہ اپنے آپ کو نصرانی یا یہودی کہتا ہے، اسی طرح مجوس اور بت پرست اپنے کافرانہ ناموں ہی سے اپنا تعارف کراتے ہیں، یہی ان کے کفر و شرک کا اعتراف اور شہادت ہے (ابن کثیر)

اس آیت میں عمارت مسجد کا منفی پہلو بیان کیا گیا تھا کہ مشرکین اس کے اہل نہیں ہیں۔

دوسری آیت میں عمارت مسجد کا مثبت پہلو اس طرح ارشاد فرمایا: إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسْجِدَ اللَّهِ مَنْ
آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَآثَمَ الصَّلَاةَ وَالْزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ
فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ، ”یعنی مسجدوں کو آباد کرنا انہی لوگوں کا کام ہے جو
اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لادیں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور بجز اللہ تعالیٰ کے
کسی سے نہ ڈریں سوائے لوگوں کے متعلق توقع ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔“

مطلب یہ ہے کہ مساجد کی اصلی عمارت صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو حقیرہ اور عمل کے عتباً
سے احکام الہی کے پابند ہوں، اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور نماز زکوٰۃ کے پابند ہوں
اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں، اس جگہ صرف اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان کا ذکر کیا
رسول پر ایمان کے ذکر کرنے کی اس لئے ضرورت نہ سمجھی گئی کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی کوئی صورت
بجز اس کے ہو ہی نہیں سکتی کہ رسول پر ایمان لائے، اور اس کے ذریعہ جو احکام اللہ تعالیٰ کی طرف
سے آئیں ان کو دل سے قبول کرے، اس لئے ایمان باللہ میں ایمان بالرسول فطری طور پر داخل ہے
یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرام سے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ
اللہ پر ایمان کیا چیز ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، آپ نے فرمایا
کہ اللہ پر ایمان یہ ہے کہ آدمی دل سے اس کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی قابلِ عبادت نہیں
اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، اس حدیث نے بتلادیا کہ رسول پر ایمان لانا اللہ پر ایمان لانے
میں داخل اور شامل ہے (منظہری بحوالہ صحیحین)

اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کے معاملہ
میں کسی کے خوف سے اللہ کے حکم کو ترک نہ کرے، ورنہ خوف کی چیزوں سے ڈرنا اور دہشت
کھانا تو تقاضائے عقل و فطرت ہے، درندے اور زہریلے جانوروں سے چور ڈاکو سے طبعی
طور پر ڈرنا اس کے خلاف نہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب جادوگر
نے رسیوں کے سانپ بنا کر دکھائے تو وہ ڈر گئے، فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ، اس لئے
ایذار اور نقصان پہنچانے والوں سے طبعی خوف نہ حکیم قرآنی کے خلاف ہے، نہ رسالت اور ولایت کے
ہاں اس خوف سے مغلوب ہو کر کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں خلل ڈالنا یا ان کو ترک کر دینا یہ مؤمن کی شان
نہیں، یہی اس جگہ مراد ہے۔

بعض مسائل متعلقہ آیت | اور عمارت مسجد جس کے متعلق ان آیتوں میں یہ ذکر ہے کہ مشرک کافر نہیں کر سکتے
بلکہ وہ صرف نیک صالح مسلمان ہی کا کام ہے، اس سے مراد مساجد کی تولیت اور انتظامی ذمہ داری

جس کا حاصل یہ ہو کہ کسی کافر کو کسی اسلامی وقف کا متولی اور منتظم بنانا جائز نہیں، باقی رہا ظاہری درو دیوار وغیرہ کی تعمیر سو اس میں کسی غیر مسلم سے بھی کام لیا جائے تو مضائقہ نہیں (تفسیر مرغی) اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم ثواب سمجھ کر مسجد بنادے یا مسجد بنانے کے لئے مسلمانوں کو چندہ دیدے تو اس کا قبول کر لینا بھی اس شرط سے جائز ہے کہ اس سے کسی دینی یا دنیوی نقصان یا الزام کا یا آئندہ اس پر قبضہ کر لینے کا یا احسان جتلانے کا خطرہ نہ ہو (در المختار، شامی، مرغی)

اور اس آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ مساجد کی عمارت اور آبادی صرف نیک مسلمان ہی کا کام ہے، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو شخص مساجد کی حفاظت، صفائی، اور دوسری ضروریات کا انتظام کرتا ہے، اور جو عبادت اور ذکر اللہ کے لئے یا علم دین اور قرآن پڑھنے پڑھانے کے لئے مسجد میں آتا جاتا ہے اس کے یہ اعمال اس کے مؤمن کامل ہونے کی شہادت ہے۔

امام ترمذی اور ابن ماجہ نے بروایت ابو سعید خدریؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ مسجد کی حاضری کا پابند ہو تو اس کے ایمان کی شہادت دو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

اور صحیحین کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صبح شام مسجد میں حاضر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا ایک درجہ تیار فرما دیتے ہیں۔

اور حضرت سلمان فارسیؓ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مسجد میں آیا وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کرنے والا ہمان ہے، اور میزبان پر حق ہے کہ ہمان کا اکرام کرے (منظری بحوالہ طبرانی، ابن جریر، بیہقی وغیرہ)

مفسر القرآن حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عمارت مسجد میں یہ بھی داخل ہے کہ مسجد کو ایسی چیزوں سے پاک کرے جن کے لئے مسجدیں نہیں بنائی گئیں، مثلاً خرد فروخت دنیا کی باتیں کسی گم شدہ چیز کی تلاش، یا دنیا کی چیزوں کا لوگوں سے سوال، یا انصoul قسم کے اشعار، جھگڑا، لڑائی اور شور و شغب وغیرہ (منظری)

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ

کیا تم نے کر دیا حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجد الحرام کا بسانا برابر اس کے جو

۲۱ مَنْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجْهَدَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ لَا يَكُنْ

یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر، اور لڑا اللہ کی راہ میں یہ برابر نہیں ہیں

عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۱۹ الَّذِينَ اٰمَنُوا

اللہ کے نزدیک اور اللہ رستہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو ۱ جو ایمان لائے

وَهَاجِرُوا وَاجْهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۝

اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے ،

أَعْظَمَ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝

ان کیلئے بڑا درجہ ہے اللہ کے ہاں اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں ،

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّتِ لَهُمْ ۝

خوش خبری دیتا ہے انکو پروردگار ان کا اپنی طرف سے مہربانی کی اور رضامندی کی اور باغوں کی کہ جن میں

فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَكَ ۝

ان کو آرام ہے ہمیشہ کا ، رہا کریں ان میں مدام ، بے شک اللہ کے پاس

أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ يَٰ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ

بڑا ثواب ہے ، اے ایمان والو مت پکڑو اپنے باپوں کو

وَأِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَآءَ إِنِ اسْتَجَبُوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ ۝

اور بھائیوں کو رفیق اگر وہ عزیز رکھیں کفر کو ایمان سے ،

وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَاُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝

اور جو تم میں ان کی رفاقت کرے سو وہی لوگ ہیں گنہگار۔

حُصْلَةُ تَفْسِيرِ

سیاحتم لوگوں نے حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص کے عمل کی برابر قرار دے لیا جو کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو، اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو وہ عمل ایمان اور جہاد ہے، یعنی یہ عمل برابر نہیں اور جب اعمال برابر نہیں، یہ (عامل) لوگ (بھی باہم) برابر نہیں اللہ کے نزدیک (غرض عمل عمل باہم اور عامل عامل باہم برابر نہیں مقصود بقریبہ سیاق یہ ہے کہ ایمان اور جہاد میں سے ہر واحد افضل ہے، سقاۃ اور عمارت کے ہر واحد سے یعنی ایمان بھی دونوں سے افضل ہے، اور اس سے جواب ہو گیا مشرکین کا کہ ان میں ایمان نہ تھا، اور جہاد بھی دونوں سے افضل ہے اس سے جواب ہو گیا بعض مؤمنین کا جو کہ بعد ایمان کے سقاۃ اور عمارت کو جہاد پر تفضیل دیتے تھے) اور ریلیم مذکور بہت ہی ظاہر ہے لیکن جو لوگ بے انصاف ہیں (مراد مشرک ہیں) اللہ تعالیٰ ان کو

سمجھ نہیں دیتا اس لئے وہ نہیں مانتے بخلاف اہل ایمان کے کہ وہ اس تحقیق کو فوراً مان گئے، آگے اس مضمون کی تصریح ہے جو اوپر لائیسٹون سے مقصود تھا یعنی، جو لوگ ایمان لائے اور (اللہ کی سطور) انھوں نے ترک وطن کیا اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کیا وہ درجہ میں اللہ کے نزدیک بمقابلہ اہل سقایہ و اہل عمارت کے بہت بڑے ہیں کیونکہ اگر اہل سقایہ و اہل عمارت میں ایمان نہ ہو تب تو یہ بڑائی انہی مومنین جہاد میں مخلص ہو اور اگر ان میں ایمان ہو تو گو وہ بھی بڑے ہیں مگر یہ زیادہ بڑے ہیں، اور یہی لوگ پورے کامیاب ہیں کیونکہ اگر ان کے مقابلین میں ایمان نہ ہو تب تو کامیابی کا حصر انہی میں ہے، اور اگر ایمان ہو تو کامیابی مشترک ہے، لیکن ان کی کامیابی ان سے اعلیٰ ہے، آگے اس درجہ اور فوز کا بیان ہے کہ ان کا رب ان کو بتارت دیتا ہے اپنی طرف سے بڑی رحمت اور بڑی رضا مندی اور رحمت کے ایسے باغوں کی ان کے لئے کہ ان (باغوں) میں دائمی نعمت ہوگی (اور) ان میں یہ ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے، بلاشبہ اللہ کے پاس بڑا اجر ہے، (اس میں سے ان کو دیا جائے گا) اے ایمان والو اپنے باپوں کو اور اپنے بھائیوں کو (اپنا) رفیق مت بناؤ اگر وہ لوگ کفر کو بمقابلہ ایمان کے (ایسا) عزیز رکھیں کہ ان کے ایمان لانے کی امید نہ رہے اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ رفاقت رکھے گا سو ایسے لوگ بڑے نافرمان ہیں (مطلب یہ کہ بڑا مانع ہجرت سے ان لوگوں کا تعلق ہے اور خود وہی جائز نہیں پھر ہجرت میں کیا دشواری ہے) :

معارف و مسائل

شروع کی چار آیتیں ۱۹ سے ۲۲ تک ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں، وہ یہ کہ بہت مشرکین مکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ ہم مسجد حرام کی آبادی اور حجاج کو پانی پلانے کا انتظام کرتے ہیں، اس پر ہر کسی کا کوئی عمل نہیں ہو سکتا، اسلام لانے سے پہلے جب حضرت عباسؓ غزوہ بدر میں گرفتار ہو کر مسلمانوں کی قید میں آئے، اور ان کے مسلم عزیزوں نے ان کو اس پر ملامت کی کہ آپ نعمتِ ایمان سے محروم ہیں تو انھوں نے بھی یہی کہا تھا کہ آپ لوگ ایمان و ہجرت کو اپنا بڑا سرمایہ فضیلت سمجھتے ہیں، مگر ہم بھی تو مسجد حرام کی عمارت اور حجاج کو پانی پلانے کی اہم خدمات کے متولی ہیں جن کی برابر کسی کا عمل نہیں ہو سکتا، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، (ابن کثیر بروایت علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس) :

اور مسند عبد الرزاق کی بعض روایات میں ہے کہ حضرت عباسؓ کے مسلمان ہو جانے کے بعد طلحہ بن شیبہؓ اور حضرت عباسؓ اور علی کرم اللہ وجہہ کے آپس میں گفتگو ہو رہی تھی، طلحہ نے کہا کہ مجھے وہ فضیلت حاصل ہے جو تم میں سے کسی کو حاصل نہیں، کہ بیت اللہ کی چابی میرے ہاتھ

میں ہو میں اگر چاہوں تو بیت اللہ کے اندر جا کر رات گزار سکتا ہوں، حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ میں حجاج کو پانی پلانے کا متویٰ اور مستنظم ہوں اور مسجد حرام میں میرے اختیارات ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ حضرات کس چیز پر فخر کر رہے ہیں، میرا حال تو یہ ہے کہ میں نے سب لوگوں سے چھ مہینہ پہلے بیت اللہ کی طرف نماز میں پڑھی ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک رہا ہوں، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، جن میں واضح کر دیا گیا کہ کوئی عمل کتنا ہی اعلیٰ و افضل ہو ایمان کے بغیر اللہ کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں، اور نہ حالت شرک میں ایسے اعمال کا کرنے والا اللہ کے نزدیک مقبول ہے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ واقعہ منقول ہے کہ وہ ایک روز جمعہ کے دن مسجد نبویؐ میں چند حضرات صحابہ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس جمع تھے، حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ اسلام و ایمان کے بعد میرے نزدیک حجاج کو پانی پلانے سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں، اور مجھے اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے عمل کی پروا نہیں، ایک دوسرے صاحب نے ان کے جواب میں کہا کہ نہیں، اللہ کی راہ میں جہاد سب سے بڑا عمل ہے، ان دونوں میں بحث ہونے لگی، تو حضرت فاروق اعظمؓ نے دونوں کو ڈانٹ کر کہا کہ منبر نبویؐ کے پاس شور و شغب نہ کرو، مناسب بات یہ ہو کہ جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد یہ بات خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لو، اس تجویز کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، جن میں جہاد کو عمارت مسجد حرام اور سقایۃ حجاج سے افضل عمل بتلایا گیا۔

اور اس میں کوئی بعد نہیں کہ اصل آیات کا نزول تو مشرکین کے فخر و تکبر کے جواب میں ہوا ہو، پھر اس کے بعد جو واقعات مسلمانوں کے باہم پیش آئے ان میں بھی انہی آیات کو استدلال کے لئے پیش کیا گیا ہو جس سے سننے والوں کو یہ محسوس ہوا کہ یہ آیات اس واقعہ میں نازل ہوئیں۔ بہر حال آیات مذکورہ میں دونوں قسم کے واقعات کا یہ جواب ہو کہ شرک کے ساتھ تو کوئی عمل کتنا ہی بڑا ہو مقبول اور قابل ذکر ہی نہیں، اس لئے کسی مشرک کو عمارت مسجد، یا سقایۃ حجاج کی وجہ سے کوئی فضیلت و بزرگی مسلمانوں کے مقابلہ میں حاصل نہیں ہو سکتی، اور ایمان کے بعد بھی ایمان و جہاد کا درجہ بہ نسبت عمارت مسجد حرام اور سقایۃ الحجاج کے بہت زیادہ ہے جو مسلمان ایمان و جہاد میں مقدم رہے وہ ان مسلمانوں سے افضل ہیں جنہوں نے جہاد میں شرکت نہیں کی، صرف مسجد حرام کی تعمیر اور حجاج کے پانی پلانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔

اس تمہید کے بعد آیات مذکورہ کے الفاظ اور ترجمہ پر پھر ایک نظر ڈالتے، ارشاد فرمایا

کہ کیا تم نے حجاج کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص کے برابر قرار دیا جو کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو، اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو، یہ لوگ برابر نہیں اللہ کے نزدیک۔

بقریۃ سیاق مقصود یہ ہے کہ ایمان اور جہاد میں سے ہر ایک افضل ہے، سقایۃ الحجاج اور عمارت مسجد سے، یعنی ایمان بھی دونوں سے افضل ہے، اور جہاد بھی ایمان کے افضل ہونے سے مشرکین کی بات کا جواب ہو گیا، اور جہاد کے افضل ہونے سے ان مسلمانوں کی بات کا جواب ہو گیا جو عمارت مسجد اور سقایۃ حجاج کو جہاد سے افضل کہتے تھے۔

ذکر اللہ جہاد سے افضل ہے | تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت میں جو عمارت مسجد پر جہاد کو فضیلت اور ترجیح دی گئی ہے یہ عمارت کے ظاہری معنی کی رو سے ہو یعنی مسجد کی تعمیر اور ضروری انتظامات کہ جہاد کا ان کے مقابلہ میں افضل ہونا مسلم ہے۔

لیکن عمارت مسجد کے ایک دوسرے معنی عبادت اور ذکر اللہ کے لئے مسجد میں حاضری کے بھی آتے ہیں، اور درحقیقت مسجد کی اصلی عمارت و آبادی اسی سے ہے، اس معنی کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات کی بناء پر عمارت مسجد جہاد سے افضل و اعلیٰ ہو جیسا کہ مسند احمد اور ترمذی، ابن ماجہ میں حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسا عمل بتلاؤں جو تمہارے تمام اعمال سے بہتر اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ افضل ہو، اور تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا اور سونے چاندی کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بھی افضل ہو، اور اس سے بھی افضل ہو کہ تم جہاد میں دشمن سے سخت مقابلہ کرو جس میں تم ان کو قتل کرو وہ تمہیں قتل کریں، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ عمل ضرور بتلائیے، آپ نے فرمایا کہ وہ عمل ذکر اللہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کی فضیلت جہاد سے بھی زیادہ ہے، اور عمارت مسجد جب بمعنی ذکر اللہ لی جائے تو وہ بھی جہاد سے افضل ہے، مگر اس جگہ مشرکین کا فخر و غرور ظاہر ہے کہ ذکر اللہ اور عبادت کی بناء پر نہ تھا بلکہ ظاہری تعمیر اور انتظامات کی بناء پر تھا، اس لئے جہاد کو اس سے افضل قرار دیا گیا۔

اور قرآن و سنت کے مجموعی ارشادات میں غور کریے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عمل کا دوسرے عمل سے افضل و اعلیٰ ہونا حالات و واقعات کے تابع ہوتا ہے، بعض حالات میں ایک عمل دوسرے سے افضل ہوتا ہے، اور حالات بدلنے کے بعد معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے، جس وقت اسلام اور مسلمانوں سے دفاع کی ضرورت شدید ہو اس وقت یقیناً جہاد تمام عبادات سے افضل ہوگا، جیسا کہ غزوہ خندق میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار نمازیں قضا ہو جانے

کے واقعہ سے ظاہر ہے، اور جس وقت ایسی شدید ضرورت نہ ہو تو ذکر اللہ اور عبادت بمقابلہ جہاد کے افضل ہوگا۔

آخر آیت میں وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ، فرما کر یہ بتلا دیا کہ یہ کوئی دقیق اور باریک بات نہیں بلکہ بالکل واضح ہے کہ ایمان سارے اعمال کی بنیاد اور ان سبب افضل ہے، اور یہ کہ جہاد بہ نسبت عمارت مسجد اور سقایۃ الحجاج کے افضل ہے، مگر اللہ تعالیٰ بے انصاف لوگوں کو سمجھ نہیں دیتا، اس لئے وہ ایسی کھلی اور ظاہری باتوں میں بھی کج بحثی کرتے رہتے ہیں۔

بیسویں آیت میں اس مضمون کی تفصیل ہے جو پہلی آیت میں لَا يَسْتَوُونَ کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے، یعنی ایمان لانے والے مجاہد اور صرف عمارت مسجد اور سقایۃ حجاج کرنے والے اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہیں، اس میں ارشاد فرمایا: الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجْهَهُمْ لِلدِّينِ سَبِيلَ اللّٰهِ يَأْمُرُ اِلٰهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ط یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہ اللہ کے نزدیک درجہ میں بڑے ہیں، اور پورے کامیاب یہی لوگ ہیں۔

کیونکہ ان کے مقابلہ میں جو مشرک ہیں ان کو تو کامیابی کا کوئی درجہ ہی حاصل نہیں، اور جو مسلمان ہیں اگرچہ نفس کامیابی میں وہ بھی شریک ہیں، مگر ان کی کامیابی ان سے بڑھتی ہوئی ہے، اس لئے پورے کامیاب یہی لوگ ہیں۔

اکیسویں اور بائیسویں آیتوں میں ان کامیاب لوگوں کے اجر عظیم اور درجاتِ آخرت کا بیان ہے يَرْبِّئُهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّتْ لَهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ مُّخْلِطِينَ فِيْهَا اَبْدًا اَلَانَ اللّٰهُ عِنْدَكَ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ط یعنی ان لوگوں کو ان کا پروردگار خوش خبری سنانا ہو اپنی رحمت اور رضا کی اور ایسی جنتوں کی جن میں ان کے لئے ہمیشہ قائم رہنے والی نعمتیں ہوں گی اور یہ لوگ بھی ان نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے، ان کو یہاں سے کبھی نہ نکالا جائے گا، بیشک اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔

آیات مذکورہ میں ہجرت اور جہاد کے فضائل کا بیان آیا ہے، جن میں وطن اور اعزاء و اقارب اور احباب و اصحاب اور اموال و املاک سب کو چھوڑنا پڑتا ہے، اور ظاہر ہے کہ انسان کی طبیعت پر یہ کام سب سے زیادہ شاق اور دشوار ہیں، اس لئے اگلی آیت میں ان چیزوں کے ساتھ حد سے زیادہ تعلق اور محبت کی مذمت فرما کر مسلمانوں کے ذہنوں کو ہجرت و جہاد کے لئے آمادہ کیا گیا ہے، ارشاد فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَاُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ط

یعنی اے ایمان والو تم اپنے باپ دادا اور بھائیوں کو رفیق مت بناؤ، اگر وہ لوگ کفر کو بمقابلہ ایمان کے عزیز رکھیں، اور تم میں سے جو شخص ان کے ساتھ باوجود ان کے کفر کے رفاقت رکھے گا سو اس کو لوگ بڑے نافرمان ہیں۔

ماں باپ بھائی بہن اور تمام رشتہ داروں سے تعلق کو مضبوط رکھنے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہدایات سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، مگر اس آیت میں یہ بتلادیا کہ ہر تعلق کی ایک حد ہے، ان میں سے ہر تعلق خواہ ماں باپ اور اولاد کا ہو، یا حقیقی بھائی بہن کا، اللہ اور اس کے رسول کے تعلق کے ...۔۔۔۔۔ مقابلہ میں نظر انداز کرنے کے قابل ہے، جس موقع پر یہ دونوں رشتے ٹکڑا جائیں، تو پھر رشتہ دہ تعلق اللہ و رسول کا ہی قائم رکھنا ہے، اس کے مقابلہ میں سارے تعلقات سے قطع نظر کرنا ہے۔

آیات مذکورہ متعلق | مذکورہ پانچ آیتوں سے چند فوائد اور مسائل حاصل ہوئے:
چند فوائد اور مسائل | اول یہ کہ ایمان روح عمل ہے، اس کے بغیر کیسا ہی اچھا عمل ہو وہ صرف صورت بے جان اور ناقابل قبول ہے، نجات آخرت میں اس کی کوئی قیمت نہیں، ہاں اللہ تعالیٰ کے یہاں انصاف نہیں، کافروں کے ایسے بے روح اعمال حسنہ بھی بالکل ضائع نہیں کئے جاتے، ان کا بدلہ ان کو دنیا ہی میں آرام و عیش اور دولت و راحت دے کر بیباق کر دیا جاتا ہے، جس کا بیان قرآن کریم کی متعدد آیات میں آیا ہے۔

دوسرا فائدہ ان آیات سے یہ حاصل ہوا کہ معصیت و نافرمانی سے انسان کی عقل بھی خراب ہو جاتی ہے۔
اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، انیسویں آیت کے آخر میں إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ، فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے جیسا کہ اس کے بالمقابل ایک آیت میں إِنَّ تَقْوَا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اطاعت و تقویٰ سے انسان کی عقل کو جلا ہوتی ہے، سلامت فکر نصیب ہوتی ہے، وہ اچھے بُرے کی تمیز میں غلطی نہیں کرتا۔
تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ نیک اعمال میں بھی باہمی تفاضل ہے، اور اسی کی مناسبت سے عمل کرنے والوں کے درجات میں تفاضل قائم ہوتا ہے، سب عمل کرنے والے ایک درجہ میں نہیں رکھو جاسکتے، اور مدار کثرت عمل پر نہیں بلکہ حسن عمل پر ہے، سورہ ملک میں آیا ہے: لِيَسْبِقَ أَهْلُ عِلْمٍ أَحْسَنُ عَمَلًا یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری آزمائش کریں گے، کہ کون زیادہ اچھا عمل کرے گا؟
چوتھا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ راحت و نعمت دائمی رہنے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ وہ نعمتیں کسی وقت ختم نہ ہو جائیں، دوسرے یہ کہ کسی وقت ان لوگوں کو ان نعمتوں سے جدا نہ کیا جائے، اس لئے اللہ کے مقبول بندوں کے لئے دونوں چیزوں کی ضمانت دیدی گئی، نَعِيمٌ مُّقِيمٌ فرما کر نعمتوں کا دائمی ہونا بیان فرما دیا، اور خَلِيدٌ یعنی فیہما ابد آ، فرما کر ان لوگوں کو کبھی ان نعمتوں

سے الگ نہ کرنے کا اطمینان دلایا۔

اصل رشتہ اسلام و ایمان کا رشتہ ہی، نبی و ملی تعلقات سب پر قربان کرتے ہیں۔ پانچواں سملہ ایک بنیادی سملہ ہے کہ رشتہ داری اور دوستی کے سارے تعلقات پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق مقدم ہے، جو تعلق اس سے ٹکرائے وہ توڑنے کے قابل ہے، صحابہ کرام کا وہ عمل جس کی وجہ سے وہ ساری امت سے افضل و اعلیٰ قرار پائے یہی چیز تھی کہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان و مال اور ہر رشتہ و تعلق کو قربان کر کے زبانِ حال سے کہا ہے

تو نخل خوش عمر کیستی کہ سر و دامن و ہمہ ز خویش بریدند و با تو پیوستند
بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی اور قریش مکہ انصارِ مدینہ تو سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے، اور بدر و احد کے میدانوں میں باپ بیٹے، بھائی بھائی کی تلواریں آپس میں ٹکرائیں اسکی شہادت دی کہ ان کا مسلک یہ تھا کہ

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد ؛ فدائے یک تن بیگانہ کا شنا باشد
اَللّٰهُمَّ اِنِّ رُقْنَا اَتْبَاعَهُمْ وَاجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اَلْاَشْيَاءِ اِلَيْنَا وَخَشْيَتَكَ اَخَوْفَ اَلْاَشْيَاءِ عَلَيْنَا

قُلْ اِنْ كَانَ اَبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَنْرَا وَاُجُكُمْ

تو کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں

وَعَشِيرَتُكُمْ وَاَمْوَالٌ اِقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ

اور برادری اور مال جو تم نے کماتے ہیں اور سوداگری جس کے بند ہونے سے

كَسَادُهَا وَمَسْكِنٌ تَرْضَوْنَهَا اَحَبُّ اِلَيْكُمْ مِّنْ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ

تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جن کو پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول

وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهِ فَتَرْكُوهَا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرٍ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي

سے اور لڑنے سے اس کی راہ میں تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم، اور اللہ رہتہ نہیں دیتا

الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

نافرمان لوگوں کو۔

خلاصہ تفسیر

آگے اسی مضمون کی زیادہ تفصیل ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپ (ان سے)

کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں تمکاسی نہ ہو لے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن میں رہنے کو تم پسند کرتے ہو (اگر یہ چیزیں) تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (مزائے ترک ہجرت کا) بھیج دیں (جیسا دوسری آیت میں ہے) إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّيْتُمْ الْمَلَائِكَةَ إِلَى قَوْلِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا وَلَّهُمْ جَهَنَّمَ اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنے والے لوگوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتا یعنی ان کا مقصود تھا ان چیزوں سے تمتع وہ بہت جلد خلافت اُن کی توقع کے موت سے منقطع ہو جاتا ہے) :

معارف و مسائل

سورۃ توبہ کی یہ آیت دراصل ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے مکہ سے ہجرت فرض ہونے کے وقت ہجرت نہیں کی، ماں، باپ، بھائی، بہن، اولاد اور بیوی اور مال و جائیداد کی محبت نے ان کو فریضہ ہجرت ادا کرنے سے روک دیا، ان کے بارے میں حق تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ آپ اُن لوگوں سے کہہ دیں کہ :

”اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں تمکاسی نہ ہو لے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں، اور اللہ تعالیٰ نافرمانی کرنے والوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتا“ اس آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا کہ حکم سے مراد جہاد و قتال اور فتح مکہ کا حکم ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اس وقت دنیاوی تعلقات پر اللہ و رسولؐ کے تعلقات کے قربان کرنے والوں کا انجام بد عنقریب سامنے آنے والا ہے، جبکہ مکہ فتح ہوگا، اور نافرمانی کرنے والے ذلیل و خوار ہوں گے، اور ان کے یہ تعلقات اس وقت ان کے کام نہ آئیں گے۔

اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس جگہ حکم سے مراد حکم عذاب ہے، کہ دنیوی تعلقات پر آخری تعلقات کو قربان کر کے ہجرت نہ کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا حکم عذاب عنقریب آنے والا ہے یا تو دنیا ہی میں اُن پر عذاب آئے گا ورنہ آخرت کا عذاب تو یقینی ہے، آیت میں اس جگہ مقصود تو ترک ہجرت پر عذاب ہے، مگر ذکر بجائے ہجرت کے جہاد کا کیا گیا، جو ہجرت کے بعد کا اگلا قدم ہے، اس میں اشارہ

کر دیا گیا کہ ابھی تو صرف ہجرت اور ترکِ وطن ہی کا حکم ہوا ہے، اس میں کچھ لوگ ہمت ہار بیٹھے، آگے جہاد کا حکم آنے والا ہے، جس میں اللہ اور رسولؐ کی محبت پر ساری محبتوں کو اور خود اپنی جان کو قربان کرنا پڑتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ ہجرت ہی کو جہاد سے تعبیر کر دیا ہو کیونکہ وہ بھی حقیقت میں جہاد ہی کا ایک شعبہ ہے۔

اور آخر آیت میں **وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ** فرما کر یہ بھی بتلا دیا کہ جو لوگ حکمِ ہجرت کے باوجود اپنے دنیوی تعلقات کو ترجیح دے کر اپنے خویش و عزیز اور مال و مکان سے چمٹے رہے، ان کا یہ عمل دنیا میں بھی اُن کے لئے مفید نہیں ہوگا، اور اُن کا یہ مقصد حاصل نہیں ہوگا کہ ہمیشہ اپنے اہل و عیال اور مال و مکان میں امن و چین سے بیٹھیں رہیں، بلکہ حکمِ جہاد شروع ہوتے ہی یہ سب چیزیں اُن کے لئے وبالِ جان بن جائیں گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نا فرمانی کرنے والوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتے۔

مسائل متعلقہ ہجرت | **اَوَّل** جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرض کر دی گئی تو وہ صرف ایک فرض ہی نہیں بلکہ مسلمان ہونے کی علامت بھی تھی، جو باوجود

قدرت کے ہجرت نہ کرے وہ مسلمان نہ سمجھا جاتا تھا، یہ حکم فتحِ مکہ کے بعد منسوخ ہو گیا، اور اصل حکم یہ باقی رہ گیا کہ جس زمین پر انسان کو اللہ کے احکام نماز و روزہ وغیرہ کی تعمیل ممکن نہ ہو اس سے ہجرت کرنا ہمیشہ کے لئے فرض ہے، بشرطیکہ ہجرت پر قدرت ہو۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی ہر ایسی جگہ کو چھوڑ دے جہاں فسق و فجور کا غلبہ ہو یہ ہمیشہ کیلئے مستحب ہے (تفصیل فتح الباری میں ہے)

آیت مذکورہ میں براہِ راست تو خطاب ان لوگوں سے ہے جنہوں نے ہجرت فرض ہونے کے وقت دنیوی تعلقات کی محبت سے مغلوب ہو کر ہجرت نہیں کی، لیکن الفاظِ آیت کا عموم تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس درجہ ہونا لازم و واجب ہے کہ دوسرا کوئی تعلق اور کوئی محبت اُس پر غالب نہ آئے، اور جس نے اس درجہ کی محبت پیدا نہ کی وہ مستحقِ عذاب ہو گیا، اس کو عذابِ الہی کا منتظر رہنا چاہئے۔

سچا ایمان اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ **اللہ اور رسولؐ کی محبت ساری دنیا اور خود اپنی جان سے بھی زیادہ ہو !!!** اسی لئے ایک صحیح حدیث میں جو صحیحین میں بروایت انسؓ منقول ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی آدمی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس

کے نزدیک اس کے باپ، اور اولاد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ اور ابو داؤد، ترمذی میں بروایت ابو امامہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ جس نے کسی سے دوستی کی تو اللہ کے لئے کی اور دشمنی کی تو وہ بھی اللہ کے لئے کی اور مال کو خرچ کیا تو وہ بھی اللہ کے لئے، اور کسی جگہ خرچ کرنے سے رکھا تو وہ بھی اللہ کے لئے، اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔

ان روایات حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ ایمان کی تکمیل اس پر موقوف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سب محبتوں پر غالب ہو، اور انسان کی دوستی دشمنی، دینا یا نہ دینا سب حکم خدا و رسول کے تابع ہو۔

اہم تفسیر قاضی بیضاوی وغیرہ نے فرمایا کہ بہت کم لوگ ہیں جو اس آیت کی وعید سے مستثنیٰ ہوں، کیونکہ عام طور پر بڑے سے بڑے عابد و زاہد اور عالم و متقی بھی اہل و عیال اور مال و متاع کی محبت سے مغلوب نظر آتے ہیں، **إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ**، مگر ساتھ ہی قاضی بیضاوی نے فرمایا کہ محبت سے مراد اس جگہ اختیاری محبت ہے، غیر اختیاری اور طبعی محبت مراد نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی طاقت و اختیار سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، اس لئے اگر کسی شخص کا دل ان دنیوی تعلقات کی طبعی محبت سے لبریز ہو مگر ان سے اتنا مغلوب نہ ہو کہ اللہ و رسول کے احکام کی خلاف ورزی کی پروا نہ کرے، تو وہ بھی اس وعید سے خارج اور اللہ و رسول کی محبت کو غالب رکھنے والا ہے، جیسے کوئی بیمار و دوا کی تلخی یا آپریشن کی تکلیف سے طبعاً گھبراتا ہے، مگر عقلاً اس کو اپنی نجات و سلامتی کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کرتا ہے، تو وہ کسی کے نزدیک قابل ملامت نہیں، اور نہ کوئی عقل سلیم اس کو اس پر مجبور کرتی ہے، کہ طبعی اور غیر اختیاری گھبراہٹ اور کراہت کو بھی دل سے نکال دے، اسی طرح اگر کسی کو مال و اولاد وغیرہ کی محبت کے سبب بعض احکام الہیہ کی تعمیل میں غیر اختیاری طور پر تکلیف محسوس ہو، مگر اس کے باوجود وہ اس تکلیف کو برداشت کر کے احکام الہیہ بجالائے تو وہ بھی قابل ملامت نہیں، بلکہ قابل تحسین ہے، اور اللہ و رسول کی محبت کو اس آیت کے مطابق غالب رکھنے والا کہلائے گا۔

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ محبت کا اعلیٰ مقام یہی ہے کہ طبیعت پر بھی غالب آجائے، اور محبوب کے حکم کی تعمیل کی لذت ہر تلخی و تکلیف کو بھی لذت بنادے، جیسا دنیا کی فانی لذت و راحت کے طلبکاروں کو رات دن دیکھا جاتا ہے، کہ بڑی سے بڑی محنت و مشقت کو منہ کھیل کر اختیار کر لیتے ہیں، کسی دفتر کی ملازمت میں مہینہ کے ختم پر ملنے والے چند سکوں کی محبت انسان کی نیند، آرام اور سائے تعلقات پر ایسی غالب آجاتی ہے کہ اس کے پیچھے ہزاروں مشقتوں کو بڑی کوششوں، سفارشوں، اور رشوتوں کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔

ریخ و راحت شد چو مطلب شد بزرگ : گرد گلہ تو تیاے چشم گر گشت

اللہ والوں کو یہ مقام اللہ و رسول اور نعمائے آخرت کی محبت میں ایسا ہی حاصل ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی تکلیف تکلیف نظر نہیں آتی، صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین خصلتیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں پائی جاویں تو اس کو ایمان کی حلاوت حاصل ہو جاتی ہے، وہ تین خصلتیں یہ ہیں، ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک ان کے ماسوائے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو، دوسرے یہ کہ وہ کسی اللہ کے بندے سے صرف اللہ ہی کے لئے محبت رکھے، تیسرے یہ کہ کفر و شرک اس کو آگ میں ڈالے جانے کے برابر محسوس ہو۔

اس حدیث میں حلاوت ایمان سے مراد محبت کا یہی مقام ہے جو انسان کے لئے ہر مشقت و محنت کو لذیذ بنا دیتا ہے۔ از محبت تلخا شیریں شود، اسی مقام کے متعلق بعض علماء نے فرمایا ہے

وَإِذَا أَحَلَّتِ الْحَلَاوَةُ قَلْبًا ۖ نَشِطَتْ فِي الْعِبَادَةِ الْأَعْضَاءُ

”یعنی جب کسی دل میں حلاوت ایمان پیدا ہو جاتی ہے، تو عبادت و اطاعت میں اس کے اعضاء لذت پانے لگتے ہیں۔“

اسی کو بعض روایات میں بشارت ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے، اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ محبت خدا و رسول کا یہ مقام ایک نعمت گہری ہے، مگر وہ صرف اللہ والوں کی صحبت و معیت ہی سے حاصل ہوتی ہے، اسی لئے صوفیائے کرام اس کو خدمت مشائخ سے حاصل کرنا ضروری قرار دیتے ہیں، صاحب لوح البیان نے فرمایا کہ یہ مقام خلعت اسی کو حاصل ہوتا ہے جو خلیل اللہ کی طرح اپنے مال، اولاد اور جان کو اللہ کی محبت میں قربان کرنے کے لئے تیار ہو۔

خلیل آسادر ملک یقین زن ۖ نواسے لا احب الا فلین زن

قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و شریعت کی حفاظت اور اس میں رخنے ڈالنے والوں کی مدافعت بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ایک کھلا نشان ہے، رزقنا اللہ تعالیٰ و جمیع المسلمین حجتہ و حجت رسولہ کما یحب و یرضاه

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۖ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۖ إِذْ

مدد کر چکا ہے اللہ تمہاری بہت میدانوں میں اور حنین کے دن، جب

أَعَجَبْتُكُمْ كَثَرْتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْعًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمْ

خوش ہوئے تم اپنی کثرت پر پھر وہ کچھ کام نہ آئی تمہارے اور تنگ ہو گئی تم پر

الْأَرْضُ بِسَارِحَتٍ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ ۚ ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ

زمین باوجود اپنی فراخی کے پھر ہٹ گئے تم پیٹھ دے کر، پھر اتاری اللہ نے

سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ

اپنی طرف سے تسکین اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر اور اتاریں فوجیں کہ جن کو

تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۚ

تم نے نہیں دیکھا اور عذاب دیا کافروں کو اور یہی سزا ہے منکروں کی

ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَلَى مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۚ

پھر توبہ نصیب کرے گا اللہ اس کے بعد جسکو چاہے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

حُصُولُ تَفْسِيرِ

تم کو خدا تعالیٰ نے (لڑائی کے) بہت موقعوں میں (کفار پر) غلبہ دیا (جیسے بدر وغیرہ) اور حنین کے دن بھی (جس کا قصہ عجیب و غریب ہو تم کو غلبہ دیا) جبکہ یہ واقعہ ہوا تھا کہ تم کو اپنے مجمع کی کثرت سے غرہ ہو گیا تھا، پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کارآمد نہ ہوئی اور کفار کے تیر بڑے سے ایسی پریشانی ہوئی کہ تم پر زمین باوجود اپنی (اس) فراخی کے تنگی کرنے لگی پھر (آخر) تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (کے قلب) پر اور دوسرے مؤمنین (کے قلوب) پر اپنی (طرف سے) تسلی نازل فرمائی، اور (درد کے لئے) ایسے شکر آسمان سے نازل فرمائے جن کو تم نے نہیں دیکھا (مراد فرشتے ہیں جس کے بعد تم پھر مستعد قتال ہوئے اور غالب آئے) اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کو سزا دی کہ ان پر ہزیمت اور قتل و قید واقع ہوئی، اور یہ کافروں کی (دنیا میں) سزا ہے، پھر اللہ تعالیٰ ان کافروں میں سے جسکو چاہیں توبہ نصیب کر دیں (چنانچہ بہت سے مسلمان ہو گئے) اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں، کہ جو شخص ان میں مسلمان ہوا اس کے سب پچھلے گناہ معاف کر کے مستحق جنت کا بنا دیا) ۛ

مَعَارِفُ وَمَسَائِلُ

آیات مذکورہ میں غرہ حنین کے واقعات شکست و فتح کا اور ان کے ضمن میں بہت سے اصولی اور فروعی مسائل اور فوائد کا بیان ہے، جیسا کہ اس سے پہلی صورت میں فتح مکہ اور اس کے متعلقات کا ذکر تھا، شروع آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے اس انعام و احسان کا ذکر فرمایا ہے،

جو مسلمانوں پر ہر موقع اور ہر حالت میں مبذول رہا ہے، ارشاد فرمایا:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد فرمائی بہت مقامات میں، اور اس تمہید کے بعد خصوصیت کے ساتھ فرمایا قِيَوْمَ حُنَيْنٍ، یعنی غزوہ حنین کے دن بھی اللہ تعالیٰ کی مدد پہنچی۔

غزوہ حنین کی خصوصیت اس وجہ سے فرمائی ہو کہ اس میں بہت سے واقعات اور حالات خلافتِ توقع عجیب انداز سے ظاہر ہوئے، جن میں غور کرنے سے انسان کے ایمان میں قوت اور عمل میں ہمت پیدا ہوتی ہے، اس لئے آیات مذکورہ کی لفظی تفسیر سے پہلے اس غزوہ کے ضروری واقعات جو حدیث و تاریخ کی مستند کتابوں میں مذکور ہیں کسی قدر تفصیل سے بیان کر دینا مناسب ہے، تاکہ آیات مذکورہ کے سمجھنے میں آسانی ہو اور جن فوائد کے لئے یہ واقعات بیان فرمائے گئے ہیں وہ سامنے آجائیں، ان واقعات کا بیشتر حصہ تفسیر منطہری سے لیا گیا ہے، جس میں بحوالہ کتب حدیث و تاریخ واقعات کا ذکر ہے۔

حُنَيْنٌ، مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک مقام کا نام ہے، جو مکہ مکرمہ سے دس میل سے کچھ زیادہ فاصلہ پر واقع ہے، رمضان شمسہ ہجری میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا، اور قریش مکہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، تو عرب کا ایک بہت بڑا مشہور بہادر جنگجو اور مالدار قبیلہ ہوازن جس کی ایک شاخ طائف کے رہنے والے بنو نقیف بھی تھے، ان میں ہچل مچ گئی، انھوں نے جمع ہو کر یہ کہنا شروع کیا، کہ مکہ فتح ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو کافی قوت حاصل ہو گئی ہے، اس سے فارغ ہونے کے بعد لازمی ہے کہ ان کا رخ ہماری طرف ہوگا، اس لئے دشمنی کی بات یہ ہے کہ ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہم خود ان پر حملہ کر دیں، اس کام کے لئے قبیلہ ہوازن نے اپنی سب شاخوں کو جو مکہ سے طائف تک پھیلی ہوئی تھیں جمع کر لیا، اس قبیلہ کے سب بڑے چھوٹے بجز معدودے چند افراد کے جن کی تعداد سو سے بھی کم تھی، سب ہی جمع ہو گئے۔ اس تحریک کے لیڈر مالک بن عوف تھے، جو بعد میں مسلمان ہو گئے، اور اسلام کے بڑے علمبردار ثابت ہوئے، اس وقت مسلمانوں کی خلافتِ حملہ کا سب سے زیادہ جوش اہنی میں تھا، قبیلہ کی عظیم اکثریت نے ان کی رائے سے اتفاق کر کے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں، اس قبیلہ کی چھوٹی چھوٹی شاخیں بنو کعب اور بنو کلاب اس رائے سے متفق نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کو کچھ بصیرت دیدی تھی، انھوں نے کہا کہ اگر مشرق سے مغرب تک ساری دنیا بھی محمد کے خلافت جمع ہو جائے گی تو وہ ان سب پر بھی غالب آئیں گے، ہم خدائی طاقت کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتے، باقی سب کے سب نے معاہدے کئے، اور مالک ابن عوف نے ان سب کو پوری

قوت سے جنگ پر قائم رہنے کی ایک تدبیر یہ کہ ہر شخص کے تمام اہل و عیال بھی ساتھ چلیں، اور اپنا اپنا پورا مال بھی ساتھ لے کر نکلیں، جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ میدان سے بھاگنے لگیں تو بیوی بچوں اور مال کی محبت ان کے پاؤں کی زنجیر بن جائے، میدان سے گریز کا ان کے لئے کوئی موقع نہ رہے۔ ان کی تعداد کے بارے میں اہل تاریخ کے مختلف اقوال ہیں، حافظ حدیث علامہ ابن حجر و غیرہ نے راجح اس کو قرار دیا ہے کہ چوبیس یا اٹھائیس ہزار کا مجمع تھا، اور بعض حضرات نے چار ہزار کی تعداد بیان کی ہے، یہ ممکن ہے کہ سب اہل و عیال عورتوں بچوں سمیت تعداد چوبیس یا اٹھائیس ہزار ہو، اور لڑنے والے جوان ان میں چار ہزار ہوں۔

بہر حال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ میں ان کے خطرناک عزائم کی اطلاع ملی تو آپ نے ان کے مقابلہ پر جانے کا عزم فرمایا، مکہ مکرمہ پر حضرت عتاب بن اسید کو امیر بنایا، اور حضرت معاذ بن جبل کو ان کے ساتھ لوگوں کو سلامی تعلیمات سکھانے کے لئے چھوڑا، اور قریش مکہ سے آٹھ اور سامان جنگ عاریت کے طور پر مانگا، صفوان بن امیہ جو قریش کا سردار تھا بول اٹھا کہ کیا آپ یہ سامان جنگ ہم سے غصب کر کے لینا چاہتے ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں بلکہ عاریت کے طور پر لیتے ہیں جس کی واپسی ہمارے ذمہ ہوگی، یہ سن کر اس نے تنویر میں ہستعار دیں اور نوفل بن حارث نے تین ہزار نیزے اسی طرح پیش کر دیے۔ امام زہری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چودہ ہزار صحابہ کا لشکر لے کر اس جہاد کی طرف متوجہ ہوئے، جن میں بارہ ہزار انصار مدینہ تھے، جو فتح مکہ کے لئے آپ کے ساتھ آئے تھے، اور دو ہزار وہ مسلمان تھے جو مکہ اور اطراف مکہ کے لوگوں میں سے بوقت فتح مسلمان ہو گئے تھے، جن کو طلقاء کہا جاتا ہے، سوال کی چھٹی تاریخ ہفتہ کے دن آپ اس غزوہ کے لئے نکلے، اور فرمایا کہ کل انشاء اللہ تمہارا قیام خیف بنی کنانہ کے اس مقام پر ہوگا، جہاں جمع ہو کر قریش مکہ نے مسلمانوں کے خلاف مقاطعہ کے لئے عہد نامہ لکھا تھا۔

یہ چودہ ہزار مجاہدین کا لشکر تو جہاد کے لئے نکلا، ان کے ساتھ مکہ کے بیشتر لوگ مرد و عورتا شائی بن کر نکلے، جن کے دلوں میں عموماً یہ تھا کہ اگر اس موقع پر مسلمانوں کو شکست ہو تو ہمیں بھی اپنا انتقام لینے کا موقع ملے گا، اور یہ کامیاب ہوں تو بھی ہمارا کوئی نقصان نہیں۔

اسی قسم کے لوگوں میں ایک شیبہ بن عثمان بھی تھے، جنہوں نے بعد میں مسلمان ہو کر خود اپنا واقعہ بیان کیا کہ عنزوہ بدر میں میرا باپ حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے اور چچا حضرت علیؓ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا جس کا جوش انتقام اور انتہائی غیظ میرے دل میں تھا، میں اس موقع کو غنیمت جان کر مسلمانوں کے ساتھ ہو لیا کہ جب یہیں موقع پاؤں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر

حملہ کردوں، میں ان کے ساتھ ہو کر ہر وقت موقع کی تلاش میں رہا، یہاں تک کہ اس جہاد کے ابتدائی وقت میں جب کچھ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑے اور وہ بھاگنے لگے تو میں موقع پا کر حضورؐ کے قریب پہنچا، مگر دیکھا کہ داہنی طرف حضرت عباسؓ آپؐ کی حفاظت کر رہے ہیں، اور بائیں طرف ابوسفیانؓ ابن حارث، اس لئے میں پیچھے کی طرف پہنچ کر ارادہ ہی کر رہا تھا کہ یکبارگی تلوار سے آپؐ حملہ کر دوں کہ یکایک آپؐ کی نظر مجھ پر پڑی، اور آپؐ نے مجھے آواز دی کہ شیبہ یہاں آؤ، اپنے قریب بلا کر دست مبارک میرے سینہ پر رکھ دیا، اور دعا کی کہ یا اللہ اس سے شیطان کو دور کر دے، اب جو میں نظر اٹھاتا ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے دل میں اپنے آنکھ کان اور جان سے بھی زیادہ محبوب ہو جاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ کفار کا مقابلہ کرو، اب تو میرا یہ حال تھا کہ میں اپنی جان آپؐ پر قربان کر رہا تھا، اور بڑی بے جگری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاد سے واپس آئے تو میں خدمت میں حاضر ہوا، آپؐ نے میرے دل کے تمام خیالات کی نشاندہی کر دی، کہ تم مکہ سے اس نیت پر چلے تھے، اور میرے گرد میرے قتل کے لئے گھوم رہے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ تم سے نیک کام لینے کا تھا جو ہو کر رہا۔

اسی طرح کا واقعہ نصر بن حارث کو پیش آیا کہ وہ بھی اسی نیت سے حنین گئے تھے، وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معصومیت اور محبت ڈال دی، اور ایک مرد مجاہد بن کر دشمنوں کی صفوں سے ٹکرا گئے۔

اسی سفر میں ابو بردہ بن نیارؓ کو یہ واقعہ پیش آیا کہ مقام اوطاس پر پہنچ کر دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے تشریف رکھتے ہیں، اور ایک اور شخص آپؐ کے پاس بیٹھا ہے آپؐ نے ذکر فرمایا کہ میں سو گیا تھا، یہ شخص آیا اور..... میری تلوار اپنے قبضہ میں لے کر میرے سر پر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ اے محمدؐ! اب بتلاؤ تمہیں کون میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ اللہ بچا سکتا ہے، یہ سن کر تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی، ابو بردہ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ اجازت دیجئے کہ میں اس دشمن خدا کی گردن مار دوں، یہ دشمن قوم کا جاسوس معلوم ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو بردہ خاموش رہو اللہ تعالیٰ میری حفاظت کرنے والا ہے، جب تک کہ میرا دین سارے دینوں پر غالب نہ آجائے، اور آپؐ نے اس شخص کو کوئی ملامت بھی نہ فرمائی، اور آزاد چھوڑ دیا۔

مقام حنین پر پہنچ کر مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا تو حضرت ہبیل بن حنظلہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ خبر لے کر حاضر ہوئے کہ گھوڑے سوار آدمی ابھی دشمن کی طرف سے آیا ہے وہ بتلا رہا ہے کہ قبیلہ ہوازن پورا کا پورا مع اپنے سب سامان کے مقابلہ پر آ گیا ہے، آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شکر تبسم فرمایا اور کہا کہ پروانہ کر دیہ سارا سامان مسلمانوں کے لئے مالِ غنیمت بن کر ہاتھ آئے گا۔

اس جگہ ٹھہر کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن حذافہ کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ دشمن کے حالات کا پتہ چلاتیں، وہ ان کی قوم میں جا کر دو دن رہے، سب حالات دیکھتے سنتے رہے، ان کے لیڈر اور کمانڈر مالک بن عوف کو دیکھا کہ وہ اپنے لوگوں سے کہہ رہا ہے کہ محمدؐ کو اب تک کسی بہادر تجربہ کار قوم سے سابقہ نہیں پڑا، مکہ کے بھولے بھالے قریشیوں کا مقابلہ کر کے انہیں اپنی طاقت کا زعم ہو گیا، اب ان کو پتہ لگے گا، تم سب لوگ صبح ہوتے ہی اس طرح صف بندی کرو کہ ہر ایک کے پیچھے اس کے بیوی بچے اور مال ہو، اور اپنی تلواروں کی میانوں کو توڑ ڈالو، اور سب مل کر یکبارگی بٹہ بولو، یہ لوگ جنگ کے بڑے تجربہ کار تھے، اپنی فوج کے چند دستوں کو مختلف گھاٹیوں میں چھپا دیا تھا۔

اس طرف کفار کے لشکر کی یہ تیاریاں تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کا یہ پہلا جہاد تھا۔ جس میں چودہ ہزار سپاہی مقابلہ کے لئے نکلے تھے، اور سامانِ جنگ بھی ہمیشہ سے زیادہ تھا، اور یہ لوگ بدرِ واحد کے میدانوں میں یہ دیکھ چکے تھے کہ صرف تین سو تیرہ بے سامان لوگوں نے ایک ہزار کے لشکرِ جرار پر فتح پائی، تو آج اپنی کثرت اور تیاری پر نظر کر کے حاکم اور بزار کی روایت کے مطابق ان میں سے بعض کی زبان سے ایسے کلمات نکل گئے کہ آج تو یہ ممکن نہیں کہ ہم کسی سے مغلوب ہو جائیں آج تو مقابلہ کی دیر ہے کہ دشمن فوراً بھاگے گا۔

مالک الملک والملکوت کو یہی چیز نا پسند تھی کہ اپنی طاقت پر کوئی بھروسہ کیا جاتے، چنانچہ مسلمانوں کو اس کا سبق اس طرح ملا کہ جب قبیلہ ہوازن نے قرار داد کے مطابق یکبارگی بٹہ بولا اور گھاٹیوں میں چھپے ہوئے دستوں نے چار طرف سے گھیرا ڈال دیا، اگر دو غبار نے دن کو رات بنا دیا تو صحابہ کرام کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگنے لگے، صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر سوار پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ رہے تھے، اور بہت تھوڑے سے صحابہ کرام جن کی تعداد عین سو اور بعض نے ایک سو یا اس سے بھی کم بتلائی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جھے رہے، وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ آپ آگے نہ بڑھیں۔

یہ حالت دیکھ کر آپ نے حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ بلند آواز سے صحابہ کو پکار دو کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے شجرہ کے نیچے جہاد کی بیعت کی تھی، اور سورۃ بقرہ والے حضرات کہاں ہیں، اور وہ انصار کہاں ہیں جنہوں نے جان کی بازی لگانے کا عہد کیا تھا، سب کو چاہئے کہ واپس آئیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ہیں۔

حضرت عباسؓ کی ایک آواز بجلی کی طرح دوڑ گئی، اور یکایک سب بھاگنے والوں کو پشیمانی ہوئی، اور بڑی دلیری کے ساتھ لوٹ کر دشمن کا پورا مقابلہ کیا، اسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی مدد بھیج دی، ان کا کمانڈر مالک بن عوف اپنے اہل و عیال اور سب مال کو چھوڑ کر بھاگا، اور قلعہ کے قلعہ میں جا چھپا، اور پھر باقی پوری قوم بھاگ کھڑی ہوئی، ان کے ستر سردار مارے گئے، بعض مسلمانوں کے ہاتھ سے کچھ بچے زخمی ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا، ان کا سب مال مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، چھ ہزار جنگی قیدی چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں چار ہزار اوقیہ چاندی ہاتھ آئی۔

پہلی اور دوسری آیت میں اسی مضمون کا بیان ہے، ارشاد فرمایا کہ جب تم کو اپنے مجمع کی کثرت سے غرہ ہو گیا تھا پھر وہ کثرت تمھارے کچھ کار آمد نہ ہوئی اور زمین باوجود فراخی کے تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی تسلی نازل فرمائی اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اور ایسے لشکر فرشتوں کے نازل کر دیئے، جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو تمھارے ہاتھ سے سزا دلا دی۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا **ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكُوتًا عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ** یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور سب مسلمانوں پر اپنی تسلی نازل فرمادی۔
معنی اس کے یہ ہیں کہ غزوہ حنین کے ابتدائی ہلے میں جن صحابہ کرام کے پاؤں اکھڑ گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب پر اپنی تسلی نازل فرمادی، جس سے ان کے اکھڑے ہوئے قدم جم گئے، اور بھاگنے والے پھر لوٹ آئے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان صحابہ پر جو مضبوطی کے ساتھ محاذ پر جمے رہے تسلی نازل فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنی فتح قریب نظر آنے لگی، اور چونکہ تسلی کی یہ دو قسمیں تھیں ایک بھاگنے والوں کے لئے دوسری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمے رہنے والوں کے لئے، اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے **عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ** کو علیحدہ علیحدہ تکرار علی کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا **وَأَنْزَلَ الْجُودَ الْمُتَرَوِّحًا**، یعنی ایسے لشکر نازل فرمادیے جن کو تم نے نہیں دیکھا، اس سے مراد عام طور پر لوگوں کا نہ دیکھنا ہے، اعداد و افراد سے جو بعض روایتوں میں اس لشکر کا دیکھنا منقول ہے وہ اس کے منافی نہیں۔

پھر فرمایا **وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ**، یعنی کافروں کو اللہ تعالیٰ نے سزا دیدی، اور کافروں کی یہی سزا ہے۔ اس سزا سے مراد ان کا مسلمانوں کے ہاتھوں مفتوح اور مغلوب ہونا ہے، جو واضح طور پر مشاہدہ میں آیا، مطلب یہ ہے کہ یہ دنیاوی سزا تھی، جو فوری طور پر مل گئی،

آگے آخرت کے معاملہ کا ذکر بعد کی آیت میں اس طرح آیا ہے:

ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مَنْ بَعْدَ ذَلِكَ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ "یعنی پھر خدا تعالیٰ جسکو چاہیں توبہ نصیب کر دیں، اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں۔" اس میں اشارہ ہے کہ اس جہاد میں جن لوگوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں مغلوب اور مفتوح ہو چکی ہوں، ان میں سے بھی کچھ لوگوں کو توفیق ایمان نصیب ہوگی، چنانچہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا جس کی تفصیل یہ ہے:

| | |
|--|--|
| حنین کی فتح، اور ہوازن و ثقیف کے سرداروں کا مسلمان ہو کر حاضر ہونا | حنین میں قبیلہ ہوازن و ثقیف کے کچھ سردار مارے گئے، کچھ بھاگ کھڑے ہوئے ان کے ساتھ جوان کے اہل و عیال اور اموال تھے وہ مسلمانوں کے قیدی اور مال غنیمت بن کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے |
|--|--|

جس میں چھ ہزار قیدی چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زائد بکریاں، اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی جس کے تقریباً چار من ہوتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسفیان بن حرب کو اموال غنیمت کا نگران مقرر فرمایا۔

پھر شکست خوردہ ہوازن اور ثقیف نے مختلف مقامات پر مسلمانوں کے خلاف اجتماع کیا مگر ہر مقام پر ان کو شکست ہوتی گئی، وہ سخت مرعوب ہو کر طائف کے نہایت مستحکم قلعہ میں قلعہ بند ہو گئے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ بیس روز اس قلعہ کا محاصرہ کیا، یہ قلعہ بند دشمن اندر ہی سے تیر بڑھاتے رہے، سامنے آنے کی کسی کوشش نہ ہوئی، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ان لوگوں کے لئے بددعا فرمائیے، مگر آپ نے ان کے لئے ہدایت کی دعا فرمائی اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے مشورہ فرما کر واپسی کا قصد فرمایا، اور مقام جعرانہ پر پہنچ کر ارادہ فرمایا کہ پہلے مکہ معظمہ جا کر عمرہ ادا کریں، پھر مدینہ طیبہ کو واپسی ہو، مکہ والوں کی بڑی تعداد جو تماشائی بن کر مسلمانوں کی فتح و شکست کا امتحان کرنے آئی تھی، اس جگہ پہنچ کر ان میں سے بہت لوگوں نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

اسی مقام پر پہنچ کر مال غنیمت کی تقسیم کا انتظام کیا گیا تھا، ابھی اموال غنیمت تقسیم ہو ہی رہے تھے، کہ دفعۃً ہوازن کے چوڑا سرداروں کا ایک وفد زہیر بن صرد کی قیادت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا،

... جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی چچا ابویرقان بھی تھے، انھوں نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم مسلمان ہو چکے ہیں، اور یہ درخواست کی کہ ہمارے اہل و عیال اور اموال ہمیں واپس دیدیتے جائیں، اس درخواست میں عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ ہم بسلسلہ رضاعت آپ کے

خولش و عزیز ہیں، اور جو مصیبت ہم پر پڑی ہے وہ آپ سے مخفی نہیں، آپ ہم پر احسان فرمائیں، رئیس و فرائیک شاعر آدمی تھا، اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! اگر ہم بادشاہ روم یا شاہ عراق سے اپنی ایسی مصیبت کے پیش نظر کوئی درخواست کرتے تو ہمارا خیال یہ ہو کہ وہ بھی ہماری درخواست کو رد نہ کرتے اور آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے اخلاقِ فاضلہ میں سب سے زیادہ ممتاز فرمایا ہے، آپ سے ہم بڑی امید لے کر آئے ہیں۔

رَحْمَةُ اللَّهِ عَلَيْكَ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے لئے یہ موقع دوہری مشکل کا تھا کہ ایک طرف ان لوگوں پر رحم و کرم کا تقاضا کیجئے ان کے سب قیدی اور اموال ان کو واپس کر دیئے جائیں، دوسری طرف یہ کہ اموالِ غنیمت میں تمام مجاہدین کا حق ہوتا ہے، ان سب کو ان کے حق سے محروم کر دینا از روئے انصاف درست نہیں، اس لئے صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ان کے جواب میں فرمایا:

میرے ساتھ کس قدر مسلمانوں کا لشکر ہے، جو ان اموال کے حق دار ہیں، میں سچی اور فصاحت کو پسند کرتا ہوں، اس لئے آپ لوگوں کو اختیار دیتا ہوں کہ یا تو اپنے قیدی واپس لے لو، یا اموالِ غنیمت ان دونوں میں جس کو تم انتخاب کرو وہ تمہیں دیدیئے جائیں گے، سب قیدیوں کی واپسی کو اختیار کیا، تو رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے تمام صحابہ کو جمع فرما کر ایک خطبہ دیا جس میں حمد و ثناء کے بعد فرمایا کہ:

”یہ تمہارے بھائی تائب ہو کر آگئے ہیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کے قیدی ان کو واپس دیدیئے جائیں تم میں سے جو لوگ خوش دلی کے ساتھ اپنا حصہ واپس لینے کے لئے تیار ہوں وہ احسان کریں اور جو اس کے لئے تیار نہ ہوں تو ہم ان کو آئندہ اموالِ فتنے میں سے اس کا بدلہ دیدیں گے۔“

| | |
|--------------------------------|---|
| حقوق کے معاملہ میں رائے عامہ | مختلف اطراف سے یہ آواز اٹھی کہ ہم خوش دلی کے ساتھ سب قیدی |
| معلوم کرنے کے لئے عوامی جلسوں | واپس کرنے کے لئے تیار ہیں، مگر عدل و انصاف اور حقوق کے |
| کی آوازیں کافی نہیں، ہر ایک کے | معاملہ میں احتیاط کے پیش نظر رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے |
| علحدہ رائے معلوم کرنی چاہئے | اس طرح کی مختلف آوازوں کو کافی نہ سمجھا، اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا |

کہ کون لوگ اپنا حق چھوڑنے کے لئے خوش دلی سے تیار ہوں اور کون ایسے ہیں جو شرمناک و خاموش رہے، معاملہ لوگوں کے حقوق کا ہی، اس لئے ایسا کیا جائے کہ ہر جماعت اور خاندان کے سردار اپنی اپنی جماعت کے لوگوں سے الگ الگ صحیح بات معلوم کر کے مجھے بتائیں۔

اس کے مطابق سرداروں نے ہر ایک سے علحدہ علحدہ اجازت حاصل کرنے کے بعد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ بتلایا کہ سب لوگ خوش دلی سے اپنا حق چھوڑنے کے لئے تیار ہیں، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب قیدی ان کو واپس کر دیئے۔

یہی وہ لوگ تھے جن کے نائب ہونے کی طرف مذکورہ تیسری آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے **ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ الْآيَةِ**، غزوہ حنین میں پیش آنے والے واقعات کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس کا کچھ حصہ تو خود قرآن کریم میں مذکور ہے اور باقی مستند روایات حدیث سے لیا گیا ہے (منظری و ابن کثیر)

احکام و مسائل | ان واقعات کے ضمن میں بہت سے احکام و ہدایات اور ضمنی فوائد آئے ہیں، وہی ان واقعات کے بیان کرنے کا اصل مقصد ہیں۔

آیات مذکورہ میں سب سے پہلی ہدایت تو یہ دی گئی کہ مسلمانوں کو کسی وقت بھی اپنی جمیعت اور طاقت پر غرور نہ ہونا چاہئے، جس طرح کمزوری اور بے سامانی کے وقت ان کی نظر اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد پر رہتی ہے اسی طرح قوت و طاقت کے وقت بھی ان کا مکمل اعتماد صرف اللہ تعالیٰ کی امداد ہی پر ہونا چاہئے۔

غزوہ حنین میں مسلمانوں کی تعدادی کثرت اور سامان حرب کے کافی ہونے کی وجہ سے بعض صحابہ کرام کی زبان پر جو بڑا بول آگیا تھا کہ آج تو کسی کی مجال نہیں جو ہم سے بازی لجا سکے، اللہ تعالیٰ کو اپنی اس محبوب جماعت کی زبان سے ایسے کلمات پسند نہ آئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی ہلکے وقت مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے، اور بھاگنے لگے، پھر اللہ تعالیٰ ہی کی غیبی امداد سے یہ میدان مسخ ہوا۔

مفتوح و مغلوب کفار کے | دوسری ہدایت اس واقعہ سے یہ حاصل ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حنین کے لئے مکہ کے مفتوح غیر مسلموں میں عدل و انصاف اور احتیاط سے جو سامان جنگ زبردیں اور نیزے لئے تھے یہ ایسا موقع تھا کہ ان سے زبردستی بھی یہ چیزیں لی جاسکتی تھیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عاریت کہہ کر لیا اور پھر سب کو ان کی مستحاض چیزیں واپس کر دیں۔

اس واقعہ نے مسلمانوں کو دشمنوں کے ساتھ بھی پورے عدل و انصاف اور رحم و کرم کے معاملہ کا سبق دیا۔

تیسری ہدایت اس ارشاد نبویؐ سے حاصل ہوئی جس میں حنین کی طرف جاتے ہوئے خیف بنی کنانہ میں قیام کے وقت فرمایا کہ کل ہم ایسے مقام پر قیام کریں گے جس میں بیٹھ کر ہمارے دشمن قریش مکہ نے مسلمانوں کے خلاف مقاطعہ کی قرارداد پر معاہدہ کیا تھا، اس میں

اشارہ ہو کہ جب مسلمانوں کو حق تعالیٰ نے فتح و قوت عطا فرمادی تو اپنے پچھلے مصیبت کے دور کو نہ بھلا دیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا ہو سکے، ہوازن کے شکست خوردہ لوگوں کے بار بار حملہ آور ہونے اور تیر بربانی کے جواب میں رحمتہ للعالمین کی زبان مبارک سے بددعا کے بجائے ان کے لئے ہدایت کی دعا مسلمانوں کو یہ سبق دے رہی ہے کہ مسلمانوں کی جنگ و جہاد کا مقصد صرف دشمن کو زیر کرنا نہیں، بلکہ ان کو ہدایت پر لانا ہے، اس لئے اس کی کوشش سے کسی وقت غفلت نہ ہونی چاہئے۔

تیسری آیت نے یہ ہدایت کر دی کہ جو کفار مقابلہ میں مغلوب ہو جائیں ان سے بھی مایوس نہ ہوں کہ شاید اللہ تعالیٰ ان کو پھر اسلام و ایمان کی ہدایت دیدیں، جیسا کہ وفد ہوازن کے واقعہ اسلام سے ثابت ہوا۔

وفد ہوازن کی درخواست پر ان کے جنگی قیدیوں کی واپسی کے وقت جب صحابہ کرام کے مجمع سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا اور مجمع کی طرف سے یہ آوازیں آئیں کہ ہم سب انکی واپسی کی خوشدلی سے رضامند ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کافی نہ سمجھا بلکہ جدا جدا ہر ایک کی اجازت معلوم کرنے کا اہتمام فرمایا۔

اس سے ثابت ہوا کہ حقوق کے معاملہ میں جب تک خوش دلی کا اطمینان نہ ہو جائے کسی کا حق لینا جائز نہیں، مجمع کے رعب یا لوگوں کی شرم سے کسی کا خاموش رہنا رضامندی کے لئے کافی نہیں، اسی سے حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ کسی شخص پر اپنی وجاہت کا رعب ڈال کر کسی دینی مقصد کے لئے چندہ کرنا بھی درست نہیں، کیونکہ ایسے حالات میں بہت سے شریف آدمی محض شرمناشرمی کچھ دیدیتے ہیں، پوری رضامندی نہیں ہوتی، اس طرح کے مال میں برکت بھی نہیں ہوتی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا الشَّارِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا

اے ایمان والو! مشرک جو ہیں سو پلید ہیں سو نزدیک نہ آنے پاویں

الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا ۖ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً

مسجد الحرام کے اس برس کے بعد اور اگر تم ڈرتے ہو فقر سے

فَسَوْفَ يَغْنِيَكُمْ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۲۸﴾

تو آئندہ غنی کر دے گا تم کو اللہ اپنے فضل سے اگر چاہی، بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! مشرک لوگ (بوجہ عقائد خبیثہ کے) نرے ناپاک ہیں سو (اس ناپاک پر جو احکام متفرع ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہو کہ) یہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام (یعنی حرم) کے پاس (وہی) نہ آنے پائیں (یعنی حرم کے اندر داخل نہ ہوں) اور اگر تم کو (اس حکم کے جاری کرنے سے بدیں و حسد) مفلسی کا اندیشہ ہو کہ لین دین انہی سے زیادہ متعلق ہو جب یہ نہ رہیں گے تو کام کیسے چلے گا، تو (تم خدا پر توکل رکھو) خدا تم کو اپنے فضل سے اگر چاہے گا (ان کا) محتاج نہ رکھے گا، بیشک اللہ تعالیٰ (احکام کی مصلحتوں کو) خوب جاننے والا ہے (اور ان مصلحتوں کی تکمیل کے باب میں) بڑا حکمت والا ہے (اس لئے) یہ حکم مقرر کیا اور تمہارے افلاس کے اندر اس کا سامان بھی کر دے گا) ۛ

معارف و مسائل

سورۃ توبہ کے شروع میں کفار و مشرکین سے اعلان برارت کیا گیا تھا، مذکورہ صدر آیت میں اس اعلان برارت سے متعلق احکام کا ذکر ہے، اعلان برارت کا حاصل یہ تھا کہ سال بھر کے عرصہ میں تمام کفار کے معاہدات ختم یا پورے کر دیئے جائیں، اور اعلان کے ایک سال بعد کوئی مشرک حدود حرم میں نہ رہنے پائے۔

اس آیت میں اسی کا بیان ایک خاص انداز میں کیا گیا ہے، جس میں اس حکم کی حکمت و مصلحت بھی بتلا دی اور اس کی تعمیل میں جو بعض مسلمانوں کو خطرات تھے ان کا بھی جواب دیدیا، اس میں لفظ نجس بفتح جیم استعمال فرمایا ہے، جو نجاست کے معنی میں ہے، اور نجاست کہا جاتا ہے ہر گندگی کو جس سے انسان کی طبیعت نفرت کرے، امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ اس میں وہ نجاست بھی داخل ہے جو آنکھ، ناک یا ہاتھ وغیرہ سے محسوس ہو، اور وہ بھی جو علم و عقل کے ذریعہ معلوم ہو، اس لئے لفظ نجس اس غلاظت اور گندگی کو بھی شامل ہے جو ظاہری طور پر سب محسوس کرتے ہیں، اور اس معنوی نجاست کو بھی جس کی بناء پر شرعاً وضو یا غسل واجب ہوتا ہے، جیسے جنابت یا حیض و نفاس کے ختم ہونے کے بعد کی حالت، اور وہ بطنی نجاست بھی جس کا تعلق انسان کے قلب سے ہے، جیسے عقائد فاسدہ اور حقائق ردیہ۔

آیت مذکورہ میں کلمہ اِنَّمَا لایا گیا ہے جو حصر کے لئے استعمال ہوتا ہے اس لئے اِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ کے معنی یہ ہو گئے کہ مشرکین نری نجاست ہی ہیں، اور صحیح بات یہ ہے کہ عام طور پر مشرکین میں یمینوں قسم کی نجاستیں ہوتی ہیں، کیونکہ بہت سی ظاہری ناپاک چیزوں

کو وہ ناپاک نہیں سمجھتے، اس لئے ان ظاہری نجاستوں سے بھی نہیں بچتے جیسے شراب اور اس سے بنی ہوئی چیزیں، اور معنوی نجاست سے غسل جنابت وغیرہ کے تو وہ معتقد ہی نہیں، اسی طرح عقائد فاسدہ اور حشلاق رذیلہ کو بھی وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

اسی لئے آیت مذکورہ میں مشرکین کو نری نجاست قرار دے کر یہ حکم دیا گیا فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَاوِمِهِمْ هَذَا، یعنی ایسا کرنا چاہئے کہ اس سال کے بعد یہ مشرکین مسجد حرام کے پاس نہ جاسکیں۔

مسجد حرام کا لفظ عام طور پر تو اس جگہ کے لئے بولا جاتا ہے جو بیت اللہ کے گرد..... چار دیواری سے گھری ہوئی ہے، لیکن قرآن و حدیث میں بعض اوقات یہ لفظ پورے حرم مکہ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، جو کئی میل مرتبہ کا رقبہ اور چاروں طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قائم کردہ حدود سے گھرا ہوا ہے، جیسا کہ واقعہ معراج میں الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ سے باتفاق یہی معنی مراد لئے گئے ہیں، کیونکہ واقعہ معراج معروف مسجد حرام کے اندر سے نہیں بلکہ حضرت اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا کے مکان سے ہوا ہے، اسی طرح آیت کریمہ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْنَا عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ میں مسجد حرام سے پورا حرم ہی مراد ہے، کیونکہ جس واقعہ صلح کا اس میں ذکر ہے، وہ مقام حدیبیہ پر ہوا ہے، جو حدود حرم سے باہر اس کے متصل واقع ہے۔ (جصاص) اس لئے معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ اس سال کے بعد مشرکین کا داخلہ حدود حرم میں ممنوع ہے، اس سال سے مراد کونسا سال ہے، بعض حضرات نے فرمایا کہ سنہ ہجری مراد ہے، مگر جہور مفسرین کے نزدیک سنہ ہجری رائج ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ براءت حضرت صدیق اکبرؓ اور علی مرتضیٰؓ کے ذریعہ موسم حج میں اسی سنہ میں کرایا ہے، اس لئے سنہ سے سنہ تک مہلت کا سال ہے، سنہ ہجری کے بعد یہ قانون نافذ ہوا۔

| | |
|---|--|
| مشرکین کے مسجد حرام میں داخلے کی ممانعت کا مطلب اور یہ کہ مسجد حرام کی خصوصیت ہو یا سب مسجد کے لئے عام ہے | آیت مذکورہ میں جو حکم دیا گیا ہے کہ سنہ کے بعد سے کوئی مشرک مسجد حرام کے پاس نہ جانے پائے اس کے متعلق تین باتیں غور طلب ہیں، کہ یہ حکم مسجد حرام کے ساتھ مخصوص ہو یا دنیا کی دوسری مسجدیں بھی اسی حکم میں داخل ہیں اور اگر مسجد حرام کے ساتھ |
|---|--|

مخصوص ہے تو کسی مشرک کا داخلہ مسجد حرام میں مطلقاً ممنوع ہے، یا صرف حج و عمرہ کیلئے داخلہ کی ممانعت ہے، ویسے جاسکتا ہے، تیسرے یہ کہ آیت میں یہ حکم مشرکین کا بیان کیا گیا ہے، کفار اہل کتاب بھی اس میں شامل ہیں یا نہیں۔

ان تفصیلات کے متعلق چونکہ الفاظ قرآن ساکت ہیں اس لئے اشاراتِ قرآن اور

روایات حدیث کو سامنے رکھ کر ائمہ مجتہدین نے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق احکام بیان فرمائے، اس سلسلہ میں پہلی بحث اس میں ہے کہ قرآن کریم نے مشرکین کو نجس کس اعتبار سے قرار دیا ہے، اگر ظاہری نجاست یا معنوی جنابت وغیرہ مراد ہے تو ظاہر ہے کہ کسی مسجد میں نجاست کا داخل کرنا جائز نہیں، اسی طرح جنابت والے شخص یا حیض و نفاس والی عورت کا داخلہ کسی مسجد میں جائز نہیں، اور اگر اس میں نجاست سے مراد کفر و شرک کی باطنی نجاست ہی تو ممکن ہے کہ اس کا حکم ظاہری نجاست سے مختلف ہو۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ فقہائے مدینہ امام مالک وغیرہ رحمہم اللہ نے فرمایا کہ مشرکین ہرجی کے اعتبار سے نجس ہیں، ظاہری نجاست سے بھی عموماً اجتناب نہیں کرتے، اور جنابت وغیرہ کے بعد غسل کا بھی اہتمام نہیں کرتے، اور کفر و شرک کی باطنی نجاست تو ان میں سے ہے ہی، اس لئے یہ حکم تمام مشرکین اور تمام مساجد کے لئے عام ہے، اور اس کی دلیل میں حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کا فرمان پیش کیا جس میں انھوں نے اہل بلاد کو ہدایت کی تھی کہ کفار کو مساجد میں داخل نہ ہونے دیں، اس فرمان میں اسی آیت مذکورہ کو تحریر فرمایا تھا:

نیز یہ کہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

| | |
|--------------------------------------|--|
| لَا أُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَ | ”یعنی مسجد میں داخل ہونا کسی حائضہ |
| لَا جُنُبٍ، | عورت یا جنبی شخص کیلئے میں حلال نہیں سمجھتا“ |

اور مشرکین و کفار عموماً حالت جنابت میں غسل کا اہتمام نہیں کرتے، اس لئے ان کا داخلہ مساجد میں ممنوع ہے۔

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ یہ حکم مشرکین اور کفار اہل کتاب کے لئے عام ہے، مگر مسجد حرام کے لئے مخصوص ہے، دوسری مساجد میں ان کا داخلہ ممنوع نہیں، (قرطبی) اور دلیل میں شامہ ابن اثنال کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ مسلمان ہونے سے پہلے یہ گرفتار ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسجد نبویؐ کے ایک ستون سے باندھ دیا تھا۔

امام عظیم ابو حنیفہؒ کے نزدیک آیت میں مشرکین کو مسجد حرام کے قریب جانے سے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ سال سے ان کو مشرکانہ طرز پر حج و عمرہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی اور دلیل یہ ہے کہ جس وقت موسم حج میں حضرت علی مرتضیٰؓ کے ذریعہ اعلان برائت کر دیا گیا تو اس میں اعلان اسی کا تھا کہ لَا يُحْجُّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ، جس میں ظاہر کر دیا گیا تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کر سکے گا، اس لئے اس آیت میں فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ کے معنی بھی اس اعلان کے مطابق یہی ہیں کہ ان کو حج و عمرہ کی ممانعت کر دی گئی،

اور کسی ضرورت سے باجائز امیر المؤمنین داخل ہو سکتے ہیں، وفد ثقیف کا واقعہ اس کا شاہد ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب ان کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا حالانکہ یہ لوگ اس وقت کافر تھے، صحابہ کرام نے عرض بھی کیا، یا رسول اللہ یہ نجس قوم ہے، تو آپ نے فرمایا کہ مسجد کی زمین پر ان لوگوں کی نجاست کا کوئی اثر نہیں پڑتا (جصاص)۔

اس روایت نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ قرآن کریم میں مشرکین کو نجس کہنے سے انکی نجاست کفر و شرک مراد ہے، جیسا کہ امام عظیم ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے، اسی طرح حضرت جابر ابن عبد اللہؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مشرک مسجد کے پاس نہ جائے، بجز اس کے کہ وہ کسی مسلمان کا غلام یا کنیز ہو تو بضرورت اس کو داخل کر سکے ہیں (قرطبی)۔ یہ حدیث بھی اسی کی شاہد ہے کہ نجاست ظاہری کو سبب قرار دے کر مشرکین کو مسجد حرام سے نہیں روکا گیا ورنہ اس میں غلام اور جاریہ کی کوئی تخصیص نہ تھی، بلکہ بنیاد اصل کفر و شرک اور ان کے غلبہ کا خطرہ ہے، غلام و کنیز میں یہ خطرہ نہیں، ان کو اجازت دیدی گئی، اس کے علاوہ ظاہری نجاست کے اعتبار سے تو مسلمان بھی اس میں داخل ہیں کہ نجاست یا حدث اکبر کی حالت میں ان کے لئے بھی مسجد حرام کا داخلہ ممنوع ہے۔

نیز جہور کی تفسیر کے مطابق مسجد حرام سے اس جگہ جب پورا حرم مراد ہے تو وہ بھی اسی کا مقتضی ہے کہ یہ ممانعت ظاہری نجاست کی بنیاد پر نہیں، بلکہ کفر و شرک کی نجاست کی بنیاد پر ہے، اسی لئے صرف مسجد حرام میں ان کا داخلہ ممنوع نہیں کیا گیا، بلکہ پورے حرم محترم میں ممنوع قرار دیا گیا، کیونکہ وہ اسلام کا جہی اور ایک قلعہ ہے، اس میں کسی غیر مسلم کو رکھنا گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ امام عظیم ابو حنیفہؒ کی اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ نجاسات سے مساجد کی تطہیر بھی ایک مستقل مسئلہ ہے جو قرآن مجید اور احادیث سے ثابت ہے، لیکن اس آیت کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں بلکہ اسلام کے اس سیاسی حکم سے ہے جس کا اعلان سورۃ براءت کے شروع میں کیا گیا ہے کہ جتنے مشرکین مکہ میں موجود تھے، ان سب کو حرم محترم کو خالی کرنا مقصود تھا، لیکن بتقاضی عدل و انصاف و رحم و کرم مکہ فتح ہوتے ہی سب کو یک قلم خارج کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ جن لوگوں سے کسی خاص میعاد کا معاہدہ تھا اور وہ لوگ اس معاہدہ پر قائم رہے تو ان کی میعاد معاہدہ پوری کر کے اور باقیوں کو کچھ کچھ مہلت دے کر سال بھر کے اندر اس تجویز کی تکمیل پیش نظر تھی، اسی کا بیان اس آیت مذکورہ میں آیا کہ اس سال کے بعد مشرکین کا داخلہ حدود حرم میں ممنوع ہو جائے گا وہ مشرکانہ حج و عمرہ نہ کرنے پائیں گے۔

اور جس طرح سورۃ توبہ کی آیات میں واضح طور پر یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ سلسلہ ہجری کے بعد

کوئی مشرک حدودِ حرم میں داخل ہو سکے گا، روایات حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دائرہ کو اور وسیع فرما کر پورے جزیرۃ العرب کے لئے بھی حکم دیدیا تھا، مگر عہد رسالت میں اس کی تکمیل نہ ہونے پائی، پھر صدیق اکبرؓ بھی دوسرے سنگامی مسائل کی وجہ سے اس پر توجہ نہ دے سکے فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانہ میں اس حکم کو نافذ فرمایا۔

اب رہا کفار کی نجاست اور مساجد کی نجاسات سے تطہیر کا مسئلہ وہ اپنی جگہ ہی، جس کے مسائل کتب فقہ میں تفصیل سے مذکور ہیں، کوئی مسلمان بھی ظاہری نجاست یا حالتِ جنابت میں کسی مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا، اور عام کفار و مشرکین ہر اہل کتاب وہ بھی عموماً ان نجاسات سے پاک نہیں ہوتے، اس لئے بلا ضرورت شدیدہ ان کا داخلہ بھی کسی مسجد میں جائز نہیں۔

اس آیت کا رد سے جب کفار و مشرکین کا داخلہ حرم میں ممنوع کر دیا گیا تو مسلمانوں کے سامنے ایک معاشی مسئلہ یہ پیش آیا کہ مکہ میں کوئی پیداوار نہیں، باہر کے آنے والے ہی اپنے ساتھ ضروریات لاتے تھے، اور موسم حج میں اہل مکہ کے لئے سب ضروریات جمع ہو جاتی تھیں، اب ان کا داخلہ ممنوع ہو جانے کے بعد کام کیسے چلے گا، اس کا جواب قرآن میں یہ دیا گیا کہ **وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَتَكُمْ فَسَوْفَ يُغْنِيَكُمْ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّ شَاءَ**، یعنی اگر تمہیں معاشی مشکلات کا اندیشہ ہو تو سمجھ لو کہ نظامِ معاش تمام مخلوق کا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے، اگر وہ چاہیں گے تو تمہیں ان سب کفار سے مستغنی کر دیں گے، اور یہاں ”اگر چاہیں گے“ کی قید لگانے کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں کوئی شک و تردید ہو، بلکہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ صرف مادی اسباب پر نظر رکھنے والوں کے لئے اگرچہ یہ بات بہت بعید اور مشکل نظر آتی ہے کہ ظاہری ذریعہ معاش یہی غیر مسلم تھے، ان کا داخلہ ممنوع کرنا اپنے لئے اسبابِ معاش منقطع کرنے کے مترادف ہے، مگر ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ان مادی اسباب کا محتاج نہیں، جب ان کا ارادہ کسی کام سے متعلق ہو جائے تو سب اسباب مطابق ہوتے چلے جاتے ہیں، بس چاہنے کی دیر ہے اور کچھ نہیں، اس لئے **إِنْ شَاءَ** فرما کر اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا

لوط و ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ

يَحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَنْتَوْنَ دِينَ الْحَقِّ

حرام جانتے ہیں اس کو جس کو حرام کیا اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے اور نہ قبول کرتے ہیں دین سچا

مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ

ان لوگوں میں سے جو اہل کتاب ہیں یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل

طَغِرُونَ ﴿۲۹﴾ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عِزِّيْرُ ابْنِ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى

ہو کر ، اور یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا

الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهَوْنَ قَوْلَ

کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہو یہ باتیں کہتے ہیں اپنے منہ سے ایسی کرنے لگے اگلے کافروں

الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ قَتَلَهُمُ اللَّهُ إِنْ يَكُونُ قَوْلُ

کی بات کی ، صلاک کرے ان کو اللہ، کہاں سے پھرے جاتے ہیں ۔

خلاصہ تفسیر

اہل کتاب جو کہ نہ خدا پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر (پورا ایمان رکھتے ہیں) اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے حرام بتلایا ہے اور نہ سچے دین (اسلام) کو قبول کرتے ہیں ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر اور رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں، اور یہود (میں سے بعض) نے کہا کہ (نعوذ باللہ) عزیر (علیہ السلام) خدا کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ (میں سے اکثر) نے کہا کہ مسیح (علیہ السلام) خدا کے بیٹے ہیں، یہ ان کا قول ہے ان کے منہ سے کہنے کا (جس کا واقع میں کہیں نام و نشان نہیں) یہ بھی ان لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں (مراد مشرکین عرب جو ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، مطلب یہ کہ ان کو تو یہ بھی کافر سمجھتے ہیں، پھر انہی کی سی کفریات بکتے ہیں، اور پہلے ہونا اس معنی پر ہو کہ مشرکین کی گمراہی قدیم تھی) خدا ان کو غارت کرے یہ کدھر لٹے جا رہے ہیں (کہ خدا پر ایسے افتراء باندھتے ہیں یہ تو ان کے اقوال کفریہ تھے)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلی آیت میں مشرکین مکہ سے جہاد و قتال کا ذکر تھا، ان آیات میں اہل کتاب سے جہاد کا بیان ہے، یہ گویا غزوہ تبوک کی تمہید ہے جو اہل کتاب کے مقابلہ میں

پیش آیا ہے، تفسیر درمنثور میں مفسر ہر آیت سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیات غزوہ تبوک کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، اور لفظ اہل کتاب اگرچہ اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے ہر اس کا فرقہ جانت پر حاوی ہے جو کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتی ہو، لیکن قرآن کریم کی اصطلاح میں یہ لفظ صرف یہود نصاریٰ کے لئے استعمال ہوا ہے، کیونکہ عرب کے قرب و جوار میں یہی دو فرقے اہل کتاب کے معروف تھے، اسی لئے قرآن کریم نے مشرکین عرب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اَنْ تَقُولُوْا اِنَّمَا اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰی رَسُوْلَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ كُنَّا عَنْ رَاسِئِهِمْ لَخٰفِلِيْنَ۔

اور جہاد و قتال کا جو حکم اس آیت میں بمقابلہ اہل کتاب دیا گیا ہے وہ درحقیقت اہل کتاب کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ تمام طوائف کفار کا یہی حکم ہے، کیونکہ اس آیت میں حکم قتال کی جو وجہ آگے بیان کی گئی ہیں وہ سب کفار میں مشترک ہیں، تو حکم بھی مشترک ہونا چاہئے، مگر ذکر میں اہل کتاب کی خصوصیت اس لئے کی گئی کہ یہ ممکن تھا کہ مسلمانوں کو ان کے مقابلہ میں جہاد و قتال کرنے سے اس بنا پر جھجک ہو کہ یہ لوگ کسی درجہ میں ایمان رکھتے ہیں، تورات و انجیل اور حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام پر ان کا ایمان ہو تو ممکن تھا کہ انبیاء سابقین اور ان کی کتابوں کے ساتھ ان کا منسوب ہونا مسلمانوں کے لئے جہاد سے رکاوٹ کا سبب بن جائے، اس لئے بالخصوص ان کے ساتھ قتال کا ذکر کر دیا گیا۔

دوسرا اس جگہ ذکر میں اہل کتاب کے ساتھ تخصیص کرنے سے اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ ایک حیثیت سے یہ لوگ زیادہ سزا کے مستحق ہیں، کیونکہ یہ اہل علم تھے، ان کے پاس توریت و انجیل کا علم تھا، جن میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک اور حلیہ تک تفصیل سے مذکور ہے، اس علم کے باوجود ان کا کفر و انکار اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں ایک حیثیت سے ان کا جرم زیادہ شدید ہو گیا، اس لئے خصوصی طور پر ان سے جنگ کا ذکر کیا گیا۔

جنگ کے حکم کی چار وجوہ اس آیت میں بتلائی گئی ہیں، اول لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ، یعنی وہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، دوسرے وَلَا بِآيٰتِنَا، یعنی آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، تیسرے لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ، یعنی ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جن کو اللہ نے حرام بتلایا ہے، چوتھے لَا يَدْعُوْنَ دِيْنََ الْحَقِّ، یعنی سچے دین کو قبول نہیں کرتے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ تو بظاہر خدا تعالیٰ پر بھی ایمان رکھتے ہیں، اور آخرت و قیامت کے بھی قائل ہیں، پھر ان چیزوں پر ان کے ایمان کی نفی کیوں کی گئی وجہ یہ ہے کہ محض ایمان لانے کے الفاظ تو کافی نہیں، جس طرح کا ایمان اللہ تعالیٰ کے نزدیک

مطلوب ہے، جب اس طرح کا ایمان نہ ہوا تو وہ نہ ہونے کے حکم میں ہے، یہود و نصاریٰ نے اگرچہ علانیہ طور پر توحید کا انکار نہیں کیا، مگر جیسا کہ اگلی آیت میں آ رہا ہے کہ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہہ کر اس کی خدائی میں شریک ٹھہرا دیا، اس لئے ان کا اقرار توحید لغو اور ایمان کا دعویٰ غلط ہو گیا۔

اسی طرح آخرت پر جس طرح کا ایمان مطلوب ہے وہ بھی اکثر اہل کتاب میں نہیں رہا تھا، ان میں سے بہت سے لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ قیامت میں حشر اجساد یعنی مادی اجسام کی دوبارہ زندگی نہ ہوگی، بلکہ ایک قسم کی روحانی زندگی ہوگی، اور جنت و دوزخ بھی کوئی خاص مقامات نہیں، روح کی خوشی کا نام جنت اور رنج کا نام جہنم ہے جو ارشادات ربانی کے سراسر خلاف ہے، اس لئے یوم آخر پر بھی ان کا ایمان درحقیقت ایمان نہ ہوا۔

تیسری چیز جو یہ فرمائی کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے یہ ان کو حرام نہیں سمجھتے اس سے مراد یہ ہے کہ بہت سی چیزیں جن کو تورات یا انجیل نے حرام قرار دیا تھا یہ اس کی حرمت کے قائل نہیں، جیسے ربا (سود)، اسی طرح اور بہت سی کھانے پینے کی چیزیں جو تورات و انجیل میں حرام قرار دی گئی تھیں انھوں نے ان کو حرام نہ سمجھا، اور ان میں مبتلا ہو گئے۔

اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اس کو حلال سمجھنا صرف ایک گناہ ہی کا ارتکاب نہیں بلکہ کفر ہے، اسی طرح کسی حلال چیز کو حرام قرار دینا بھی کفر ہی ہاں اگر حرام کو حرام سمجھتے ہوئے علی کوتاہی غلطی سے ہو جائے تو وہ کفر نہیں، فسق اور گناہ ہی، آیت مذکورہ میں ان لوگوں سے جہاد و قتال کرتے رہنے کی ایک حد اور انتہاء بھی بتلائی ہے، يُحْشَىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ، یعنی یہ حکم قتال اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ وہ ماتحت ہو کر، رعیت بن کر جزیہ دینا منظور نہ کر لیں۔

جزیہ کے لفظی معنی بدلے اور جزام کے ہیں، اصطلاح شرع میں اس سے مراد وہ رقم ہے جو کفار سے قتل کے بدلہ میں لی جاتی ہے۔

وجہ یہ ہے کہ کفر و شرک اللہ اور رسول کی بغاوت ہے، جس کی اصلی سزا قتل ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے ان کی سزائیں یہ تخفیف کر دی کہ اگر وہ اسلامی حکومت کی رعیت بن کر عام اسلامی قانون کے ماتحت رہنا منظور کریں تو ان سے ایک معمولی رقم جزیہ کی لے کر چھوڑ دیا جائے، اور اسلامی ملک کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے ان کی جان و مال، آبرو کی حفاظت اسلامی حکومت کے ذمہ ہوگی، ان کی مذہبی رسوم میں کوئی مزاحمت نہ کی جائے، اسی رقم کو جزیہ کہا جاتا ہے جزیہ کا تعین اگر یا بھی مصالحت اور رضامندی سے ہو تو شرعاً اس کی کوئی تحدید نہیں

جتنی مقدار اور جس چیز پر باہمی معاہدہ صلح کا ہو جائے وہی ان سے لیا جائے گا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل تہران کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرمایا کہ ان کی پوری جماعت سے سالانہ دو ہزار حُلّے دینے پر معاہدہ ہو گیا، حُلّہ دو کپڑوں کے جوڑے کو کہتے ہیں، ایک تہنبد ایک چادر، ہر حُلّہ کی قیمت کا اندازہ بھی یہ طے کر دیا گیا تھا کہ ایک اوقیہ چاندی کی قیمت کا ہوگا، اوقیہ چالیس درہم یعنی ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے گیارہ تولہ چاندی ہوتی ہے۔

اسی طرح نصاریٰ بنی تغلبہ حضرت فاروق اعظمؓ کا اس پر معاہدہ ہوا کہ ان کا جزیہ اسلامی زکوٰۃ کے حساب سے وصول کیا جائے مگر زکوٰۃ سے جو دگنا۔

اور اگر مسلمانوں نے کسی ملک کو جنگ کے ذریعہ فتح کیا، پھر وہاں کے باشندوں کی جائدادوں کو انہی کی ملکیت پر برقرار رکھا، اور وہ رعیت بن کر رہنے پر رضامند ہو گئے، تو ان کے جزیہ کی مقرر شرح یہ ہوگی جو حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے عہد خلافت میں نافذ فرمائی کہ سرمایہ دار مسمول سے چار درہم اور متوسط الحال سے اس کا نصف صرف دو درہم اور غریب سے جو تندرست اور محنت مزدوری یا صنعت و تجارت وغیرہ کے ذریعہ کماتا ہے اس سے اس کا بھی آدھا صرف ایک درہم ماہوار یعنی ساڑھے تین ماشہ چاندی یا اس کی قیمت لی جائے، اور جو باکھل مفلس یا ایا، سچ یا معذور ہیں ان کو کچھ نہ لیا جائے، اسی طرح عورتوں، بچوں، بوڑھوں سے اور ان کے تارک الدنیا مذہبی پیشواؤں سے کچھ نہ لیا جائے۔

اتنی قلیل مقدار کے لینے کے لئے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات یہ تھیں کہ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے، اور جو شخص کسی غیر مسلم باشندہ پر ظلم کرے گا تو میں قیامت کے روز ظالم کے مقابلہ میں اس غیر مسلم کی حمایت کروں گا (مظہری)۔

اسی طرح کی روایات سے بعض ائمہ فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ دراصل جزیہ کی کوئی خاص شرح شرعاً مقرر نہیں ہے، بلکہ حاکم وقت کی صوابدید پر ہے کہ ان لوگوں کے حالات کا جائزہ لیکر اس کے مناسب تجویز کریں۔

اس بیان سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ جزیہ کفار سے سزائے قتل رفع کرنے کا معاوضہ ہے اسلام کا بدلہ نہیں، اس لئے پریشیہ نہیں ہو سکتا کہ تھوڑے سے دام لے کر اسلام سے اعراض اور کفر پر قائم رہنے کی اجازت کیلئے دیدی گئی، اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اپنے مذہب قائم رہتے ہوئے اسلامی حکومت میں رہنے کی اجازت بہت سے ان لوگوں کو بھی ملتی ہے جن سے جزیہ نہیں لیا جاتا، مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، مذہبی پیشوا، ایا، سچ معذور، اگر جزیہ اسلام کا بدلہ تو تو ان سے بھی لیا جانا چاہئے تھا۔

آیت مذکورہ میں عطاءِ جزیہ کے ساتھ جو عَنّ یٰی فرمایا ہے اس میں حرف عَنّ بمعنی سبب اور یٰی بمعنی قوت و غلبہ ہے، اور معنی یہ ہیں کہ یہ جزیہ کا دینا بطور اختیار ہی چندہ یا خیرات کے نہ ہو، بلکہ اسلامی غلبہ کو تسلیم کرنے اور اس کے ماتحت رہنے کی حیثیت سے ہو (کذا فی الروح) اور وَهَمَ طَعْنُ وُؤن کے معنی ام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے مطابق یہ ہیں کہ وہ لوگ اسلام کے عام (جنرل) قانون کی اطاعت کو اپنے ذمہ لازم قرار دیں (روح المعانی و منہجری)

اور اس آیت میں جو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جب یہ لوگ جزیہ ادا کرنا منظور کر لیں تو جنگ بند کر دی جائے، اس میں جمہور فقہاء کے نزدیک تمام کفار شامل ہیں، خواہ اہل کتاب ہوں یا غیر اہل کتاب، البتہ مشرکین عرب اس سے مستثنیٰ ہیں، کہ ان سے جزیہ قبول نہیں کیا گیا۔

دوسری آیت میں اسی مضمون کی مزید تفصیل ہے، جس کا ذکر پہلی آیت میں اجمالاً آیا ہے کہ یہ اہل کتاب اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، اس دوسری آیت میں فرمایا کہ یہود تو عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں، اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، اس لئے ان کا دعویٰ توحید اور ایمان کا غلط ہوا۔ پھر فرمایا ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ "یعنی یہ اُن کا قول ہے ان کے منہ سے" اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ صاف طور پر اپنی زبانوں سے اس کا اقرار کرتے ہیں کوئی محقق چیز نہیں، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ کلمہ کفر صرف ان کی زبانوں پر ہو نہ اس کی کوئی وجہ بتا سکتے ہیں نہ دلیل۔

پھر ارشاد فرمایا یُصْنَاهُ قَوْلَ الذِّینَ کَفَرُوا مِنْ قَبْلُ قَتَلَهُمُ اللّٰهُ اَلٰی یُؤْفَکُوْنَ، "یعنی یہ اُن لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو اُن سے پہلے کافر ہو چکے ہیں، خدا ان کو غار کرے، یہ کدھر اُٹے جا رہے ہیں"۔

مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ..... انبیاء کو خدا کا بیٹا کہنے میں ایسے ہی ہو گئے جیسے پچھلے کفار و مشرکین تھے، کہ فرشتوں کو اور لات و منات کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے ۛ

اتَّخَذُواْ اَحْبَارَهُمْ وُرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ لَمَّا سَمِعُواْ

ٹھہرا لیا انھوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا اللہ کو چھوڑ کر اور مسیح

ابْنِ مَرْيَمَ وَمَا اُمُّرُوْاْ اِلَّا لِيَعْبُدُوْاْ اِلٰهًا وَّاحِدًا جَلَّ اِلٰهَ

مریم کے بیٹے کو بھی اور ان کو حکم ہی ہوا تھا کہ بندگی کریں ایک مجبود کی، کسی کی بندگی نہیں

إِلَّا هُوَ سُبْحَنَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۳۱﴾ يُرِيدُ وَنَ أَنْ يُطْفِئُوا نَوْرَ

اس کے سوا وہ پاک ہر ان کے شریک بتلانے سے، چاہتے ہیں کہ بجھا دیں روشنی اللہ

اللہ بِأَفْوَ اٰهْرِہِمَّ وَاٰبِی اللہُ اِلَّا اَنْ یَّتِمَّ کُوْرَہٗ وَاُوْکِرَہٗ

کی اپنے منہ سے اور اللہ نہ رہے گا بدون پورا کئے اپنی روشنی کے اور پڑے برا مانیں

الْکٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ

کافر، اسی نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین

الْحَقِّ لِيُظْهِرَہٗ عَلٰی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَاُوْکِرَہٗ الْمُشْرِکُوْنَ ﴿۳۳﴾

دے کر تاکہ اس کو غلبہ دے ہر دین پر اور پڑے برا مانیں مشرک،

يَاۤیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ

اے ایمان والو بہت سے عالم اور درویش اہل کتاب کے

لَیَّا کُفُوْنَ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَاَیْصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ

کھاتے ہیں مال لوگوں کے ناحق اور روکتے ہیں اللہ کی

اللہِ وَالَّذِیْنَ یَّکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِیْضَہٗ وَلَا یُنْفِقُوْہَا

راہ سے، اور جو لوگ گاڑھ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اس کو خرچ نہیں کرتے

فِی سَبِیْلِ اللہِ فَبَشِّرْہُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۳۴﴾ یَوْمَ یُحْمَى عَلَیْہَا

اللہ کی راہ میں سوان کو خوش خبری سنائے عذاب دردناک کی، جس دن کہ آگ دہکائیں گے اس

فِی نَارِجَہَنَّمْ فَتُلَوٰی بِہَا جَبَاہُہُمْ وَجُنُوْبُہُمْ وَظُهُورُہُمْ

مال پر دوزخ کی، پھر داغیں گے اس سے ان کے ماتھے اور گروٹیں اور پیٹیں (کہا جائے گا)

هٰذَا مَا کُنْتُمْ لَا تُفْسِدُکُمْ فَاَنْتُمْ اَمَّا کُنْتُمْ

یہ جو تم نے گاڑھ کر رکھا تھا اپنے واسطے اب مزہ چکھو اپنے

تَکْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

گاڑھ بننے کا۔

خلاصہ تفسیر

آگے افعال کفریہ کا بیان ہو کہ انھوں نے (یعنی یہود و نصاریٰ نے) خدا کی توحید فی الطاعت کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو باعتبار طاعت کے (رب بنا رکھا ہے) کہ ان کی اطاعت تحلیل اور تحریم میں مثل اطاعت خدا کے کرتے ہیں کہ نص پر ان کے قول کو ترجیح دیتے ہیں اور ایسی طاعت بالکل عبادت ہی پس اس حساب سے وہ ان کی عبادت کرتے ہیں (اور مسیح بن مریم علیہ السلام کو بھی) ایک اعتبار سے رب بنا رکھا ہے کہ ان کو ابن اللہ کہتے ہیں کہ الوہیت اس کے لوازم سے ہے (حالانکہ ان کو کتب الہیہ میں) صرف یہ حکم کیا گیا ہے کہ فقط ایک مجبور و برحق کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں وہ ان کے شرک سے پاک ہے (اور یہ تو بیان تھا اتباع باطل کا) آگے بیان ہے اس کا کہ وہ دین حق کو رد کرتے ہیں کہ یہ بھی کفر ہے (یعنی) وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (یعنی دین اسلام) کو اپنے منہ سے (بھونک مار مار کر) بجھا دیں (یعنی منہ سے رد و اعتراض کی باتیں اس غرض سے کرتے ہیں کہ دین حق کو فروغ نہ ہو) حالانکہ اللہ تعالیٰ بدون اس کے کہ اپنے نور (مذکور) کو کمال تک پہنچا دے مانے گا نہیں، گو کافر لوگ (جن میں یہ بھی آگئے) کیسے ہی ناخوش ہوں، (چنانچہ) وہ اللہ ایسا ہے کہ اسی اتمام نور کے لئے (اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت رکھا (سا مان یعنی قرآن) اور سچا دین (یعنی اسلام) دے کر (دنیا میں) بھیجا ہے تاکہ اس (دین) کو (کہ وہی نور مذکور ہے) تمام (بقیہ) دینوں پر غالب کر دے (کہ یہی اتمام ہے) گو مشرک (جن میں یہ بھی داخل ہو گئے) کیسے ہی ناخوش ہوں، اے ایمان والو! اکثر اخبار و رہبان (یعنی یہود و نصاریٰ کے علماء و مشائخ عوام) لوگوں کے مال نامشروع طریقہ سے کھاتے..... (اڑاتے) ہیں (یعنی احکام حق کو پوشیدہ رکھ کر موافق مرضی عوام کے فتوے دے کر ان سے نذرانے لیتے ہیں) اور اس کی وجہ سے وہ اللہ کی راہ (یعنی دین اسلام) سے (لوگوں کو) باز رکھتے ہیں (کیونکہ ان کے جھوٹے فتووں کے دھوکہ میں آکر گرا ہی میں پھنسے رہتے ہیں اور حق کو قبول بلکہ طلب بھی نہیں کرتے) اور (غایت حرص سے مال بھی جمع کرتے ہیں جسکی نسبت یہ وعید ہو کہ) جو لوگ سونا چاندی جمع کر رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (یعنی زکوٰۃ نہیں نکالتے) سو آپ ان کو ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجئے، جو کہ اس روز واقع ہوگی کہ ان کو دوزخ کی آگ میں (اڈل) تپایا جائے گا، پھر ان سے لوگوں کی پیشانیوں اور ان کی کروٹوں اور ان کی پشتوں کو داغ دیا جائے گا، (اور یہ جتلا یا جائیگا کہ) یہ وہ ہے جسکو تم نے اپنے واسطے جمع کر کے رکھا تھا، سواب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔

معارف و مسائل

ان چاروں آیتوں میں یہود و نصاریٰ کے علماء اور عباد و زہاد کی گمراہی اور ان کے کفریات قوی و علی کا ذکر ہے، اخبار، خبر کی جمع ہے اور رُتبان، راہب کی جمع ہے، یہود و نصاریٰ کے عالم کو اور راہب عابد زہاد کو کہا جاتا ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے علماء اور عبادت گزاروں کو اللہ کے سوا اپنا رب اور معبود بنا رکھا ہے، اسی طرح عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو اپنا رب بنا لیا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رب و معبود بنانا تو اس لئے ظاہر ہے کہ وہ ان کو خدا تعالیٰ کا بیٹا مانتے اور کہتے تھے، اور علماء و مجتہد کو معبود بنانے کا جو الزام ان پر عائد کیا گیا ہے اگرچہ وہ صراحتاً ان کو اپنا رب نہ کہتے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اطاعت مطلقہ جو خالص اللہ جل شانہ کا حق ہے اس حق کو ان کے حوالے کر دیا تھا کہ ہر حال میں ان کے کہنے کی پیروی کرتے تھے، اگرچہ ان کا قول اللہ اور رسول کے خلاف ہی کیوں نہ ہو تو یہ ظاہر ہے کہ کسی کی ایسی اطاعت کرنا کہ اللہ و رسول کے فرمان کے خلاف بھی ہو تو اس کی اطاعت نہ جیو شے یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو اپنا رب اور معبود کہے جو کھلا ہو اکفر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسائل دین سے ناواقف عوام کے لئے علماء کے فتویٰ کا اتباع یا اجتہاد مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اتباع اس کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ یہ اتباع درحقیقت خدا و رسول ہی کے احکام کا اتباع ہوتا ہے، اہل علم و نظر براہ راست اللہ و رسول کے کلام کو دیکھ کر اس پر عمل کرتے ہیں، اور ناواقف عوام اہل علم سے پوچھ کر اپنی احکام پر عمل کرتے ہیں، اور اہل علم جو درجہ اجتہاد کا نہیں رکھتے وہ بھی اجتہادی مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اتباع کرتے ہیں، یہ اتباع خود قرآن کریم کے حکم کے مطابق ہے اور حق تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے جیسا کہ ارشاد ہے: فَسْئَلُوا أَهْلَ الدِّينِ كَرِيحًا كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ، ”یعنی اگر تم خود احکام خدا و رسول سے واقف نہیں تو اہل علم سے پوچھ کر عمل کیا کرو۔“

یہود و نصاریٰ کے عوام نے کتاب اللہ اور احکام خدا و رسول کو بالکل نظر انداز کر کے خود غرض پیٹ و علماء یا جاہل عبادت گزاروں کے قول و عمل ہی کو اپنا دین بنا لیا تھا، اس کی مذمت اس آیت میں فرمائی گئی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان لوگوں نے یہ گمراہی اختیار کر لی حالانکہ ان کو اللہ تعالیٰ ... کی طرف سے صرف ایک اللہ کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جو ان تمام چیزوں کے شرک سے پاک ہی جن کو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

اس آیت میں تو ان کے اتباع باطل اور غیبت کی ناجائز اطاعت کا ذکر تھا، اس کے بعد کی آیت میں ان کی ایک اور گمراہی کا ذکر ہے کہ یہ لوگ صرف اسی پر بس نہیں کرتے کہ خود گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں، بلکہ ہدایت اور دین حق کے مٹانے اور رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی مضمون کو بطور مثال کے اس طرح فرمایا ہے کہ یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ ان کے بس کی بات نہیں، اللہ تعالیٰ یہ طے کر چکے ہیں کہ وہ اپنے نور یعنی دین اسلام کو مکمل اور پورا ہی کریں گے خواہ کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں۔

اس کے بعد تیسری آیت کے مضمون کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ہدایت کا سامان یعنی قرآن اور دین حق یعنی اسلام دے کر اسی لئے بھیجا ہے تاکہ اس کو دنیا کے تمام بقیہ دینوں پر غالب کر دے، تقریباً اپنی لفظوں کے ساتھ قرآن کریم میں متحدہ آیات آئی ہیں جن میں یہ وعدہ ہے کہ دین اسلام کو تمام دنیا کے ادیان پر غالب کیا جائے گا۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ دین اسلام کو تمام دوسرے دینوں پر غالب کرنے کی خوشخبری اکثر زمانوں اور اکثر حالات کے اعتبار سے ہے جیسا کہ حضرت مقداد کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روئے زمین پر کوئی کچا پکا مکان باقی نہ رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے، عزت داروں کی عزت کے ساتھ اور ذلیل لوگوں کی ذلت کے ساتھ جن کو اللہ تم عزت دیں گے وہ مسلمان ہو جائیں گے اور جن کو ذلیل کرنا ہو گا وہ اسلام کو قبول تو نہ کریں گے مگر اسلامی حکومت کے تابع ہو جائیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا، ایک ہزار سال کے قریب اسلام کی شان و شوکت پوری دنیا پر چھائی رہی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین کے عہد مبارک میں تو اس نور کی تکمیل و اتمام کا مشاہدہ ساری دنیا کر ہی چکی ہے، اور آئندہ بھی دلائل اور حقائق کے اعتبار سے ہر زمانہ میں دین اسلام ایسا مکمل دین ہے کہ کسی معقول پسند انسان کو اس پر حرت گیری کا موقع نہیں مل سکتا، اس لئے کفار کی مخالفتوں کے باوجود یہ دین حق اپنی حجت و دلیل کے اعتبار سے ہمیشہ غالب ہے، اور جب مسلمان اس دین کی پوری پیروی کریں تو ان کا ظاہری غلبہ اور حکومت و سلطنت بھی اس کے لوازم میں سے ہے، جیسا کہ تاریخ اسلام کا تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے قرآن و سنت پر پوری طرح عمل کیا تو کوئی کوہ و دریا ان کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکا، اور یہ پوری دنیا پر غالب آکر رہے، اور جب کبھی جہاں کہیں ان کو مغلوب یا مقبوض ہونے کی نوبت آئی ہے تو وہ قرآن و سنت کے احکام سے غفلت اور خلاف ورزی کا نتیجہ بد تھا، جو ان کے سامنے آیا، دین حق پھر بھی اپنی جگہ منظر و منصور ہی رہا۔

چوتھی آیت میں مسلمانوں کو مخاطب بنا کر یہود و نصاریٰ کے علماء و مشائخ کے ایسے حالات کا ذکر ہے جن کی وجہ سے عوام میں گمراہی پھیلی، مسلمانوں کو مخاطب کرنے سے شاید اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ یہ حالات یہود و نصاریٰ کے علماء و مشائخ کے بیان ہو رہی ہیں لیکن ان کو بھی اس سے متنبہ رہنا چاہئے کہ ان کے ایسے حالات نہ ہو جائیں۔

اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ یہود و نصاریٰ کے بہت سے علماء و مشائخ کا یہ حال ہے کہ بطل طریقوں سے لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور اللہ کے سیدھے راستے سے ان کو روکتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ کے اکثر علماء و مشائخ کا یہی حال تھا اور ایسے حالات میں عام طور پر کہنے والے سبھی کو برا کہا کرتے ہیں، لیکن قرآن کریم نے اس جگہ لفظ گیتھیرا کا اضافہ کر کے مسلمانوں کو دشمنوں کے معاملہ میں بھی احتیاط کلام کی تلقین فرمادی، کہ یہ حال سب لوگوں کی طرف منسوب نہیں فرمایا، بلکہ یہ فرمایا کہ ان میں بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں، ان کی گمراہی یہ بتلائی گئی کہ وہ لوگوں کے اموال باطل طریقہ سے کھاتے ہیں، باطل طریقہ سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ بعض اوقات ان لوگوں سے پیسے لے کر حکم تورات کے خلاف فتویٰ دیدیتے تھے، اور بعض اوقات احکام الہی میں اخفاء اور تبلیس سے کام لیتے تھے، اس پر مزید ان کی یہ گمراہی بتلائی گئی کہ یہ کم بخت صرف خود ہی گمراہ نہیں بلکہ دوسرے طالبانِ رشد و ہدایت کو اللہ کے راستے سے روکنے کا سبب بھی ہیں، کیوں کہ جب لوگ اپنے مقتداؤں کو ایسے کام کرتے دیکھیں تو ان میں بھی جذبہ حق پرستی مرجھاتا ہے، اس کے علاوہ ان کے غلط فتویوں کی بنیاد پر وہ گمراہی اور غلطی ہی کو صواب و صحیح سمجھنے لگتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ کے علماء و مشائخ کی یہ بیماری کہ پیسوں کے لالچ میں غلط فتویٰ دیدیں چونکہ حب مال اور حرص دنیا کی وجہ سے پیدا ہوتی تھی، اس لئے آیت مذکورہ میں حب مال کے اندر غلو کے نتائج بد اور عذاب الیم کا بیان اور اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہے: **وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ**۔ یعنی جو لوگ سونے چاندی کو جمع کرتے رہتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب دردناک کی خوش خبری سننا دیجئے۔

وَلَا يَنْفِقُونَهَا کے لفظوں سے اس طرف اشارہ ہو گیا کہ جو لوگ بقدر ضروری اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو باقی ماندہ جمع کیا ہو مال ان کے حق میں مضر نہیں۔

حدیث میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے وہ کنز تم میں داخل نہیں۔ (ابوداؤد، احمد وغیرہ)

جس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ نکالنے کے بعد جو مال باقی رہا اس کا جمع رکھنا کوئی گناہ نہیں۔

جمہور فقہاء و ائمہ کا یہی مسلک ہے کہ لَا يُفْقَوْنَہَا کی ضمیر فیضۃ کی طرف راجع ہے، جس کے معنی چاندی کے ہیں اور پر سونے اور چاندی دو چیزوں کا ذکر تھا مگر ضمیر صرف چاندی کی طرف راجع کی گئی، تفسیر منطری میں اس کو اشارہ اس بات کا قرار دیا ہے کہ جب کسی شخص کے پاس سونا اور چاندی محفوظ محفوظ موجود ہو تو اعتبار چاندی کا کیا جائے گا، سونے کی قیمت بھی چاندی کے حساب میں لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

پانچویں آیت میں اس عذاب الیم کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے: یَوْمَ یُحْشٰی عَلَیْہَا فِی نَارِ جَهَنَّمَ فُتُکُوٰی بِمَا جَبَّہُمْ وَّجُنُوْهُمْ وَّظُہُوْرُهُمْ ۚ هٰذَا مَا کُنْتُمْ لَا تُفْسِکُمْ فَاَنْتُمْ اَمَّا کُنْتُمْ تَکْذِبُوْنَ ط ”یعنی زکوٰۃ نہ ادا کرنے والوں کو یہ عذاب الیم اس دن ہوگا جب کہ ان کے جمع کئے ہوئے سونے چاندی کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس سے انکی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں پر داغ دیئے جائیں گے، اور ان سے زبانی سزا کے طور پر کہا جائیگا کہ یہ وہ چیز ہیں جس کو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، سو اپنے جمع کئے ہوئے سرمایہ کو چکھو، اس سے معلوم ہوا کہ جزاء عمل عین عمل ہی، جو سرمایہ ناجائز طور پر جمع کیا تھا، یا اصل سرمایہ تو جائز تھا مگر انکی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو خود وہ سرمایہ ہی ان لوگوں کا عذاب بن گیا۔

اس آیت میں داغ لگانے کے لئے پیشانیوں، پہلوؤں، پشتوں کا ذکر کیا گیا ہے، یا تو اس سے مراد پورا بدن ہے، اور یا پھر ان تین چیزوں کی تخصیص اس بناء پر ہے کہ خلیل آدمی جو اپنا سرمایہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا نہیں چاہتا، جب کوئی سائل یا زکوٰۃ کا طلبگار اس کے سامنے آتا ہے تو اس کو دیکھ کر سب پہلے اس کی پیشانی پر بل آتے ہیں، پھر اس سے نظر بچانے کے لئے یہ دہنے باتیں مڑنا چاہتا ہے، اور اس سے بھی سائل نہ چھوڑے تو اس کی طرف پشت کر لیتا ہے، اس لئے پیشانی، پہلو، پشت اس عذاب کے لئے مخصوص کئے گئے۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللّٰهِ اثنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ

ہمیں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں اللہ کے حکم میں جن دن اس نے پیدا

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مِنْہَا اَرْبَعَةٌ حُرْمٌ ۚ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیْمُ ۝

کئے تھے آسمان اور زمین ان میں چار مہینے ہیں ادب کے، یہی ہے سیدھا دین

فَلَا تَظْلِمُوْا فِیْہِمْ اَنْفُسَکُمْ وَّقَاتِلُوا الشِّرْکِیْنَ کَاْفًا ۚ کَمَا

سوان میں ظلم مت کرو اپنے اوپر اور لڑو سب مشرکوں سے ہر حال میں جیسے

يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً طَوَّاعًا أَلَمْ يَأْنِ لِلَّهِ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿۳۶﴾ إِنَّمَا

وہ لڑتے ہیں تم سب کے ہر حال میں اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہو ڈرنے والوں کے ، یہ جو

النَّاسِ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ

ہمینہ ہٹا دینا ہو سو بڑھائی ہوئی بات ہو کفر کے عہد میں مگر اسی میں پڑتے ہیں اس کے کافر، حلال

عَمَّا وَيَحْرِمُونَهُ عَمَّا لِيُوطِئُوا إِلَيْهِ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيَحِلُّوا

کر لیتے ہیں اس ہمینہ کو ایک برس اور حرام رکھتے ہیں دوسرے برس تاکہ پوری کر لیں گنتی ان ہمینوں کی جو اللہ

مَا حَرَّمَ اللَّهُ طَرِيقَيْنِ لَهُمْ سُوءٌ أَعْمَالِهِمْ طَوَّاعًا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي

نے ادب کیلئے رکھے ہیں ، پھر حلال کر لیتے ہیں جو ہمینہ کہ اللہ نے حرام کیا بھلے کر دیو گنواں کی نظر میں ان کے بُرے کام اور

الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۳۷﴾

اللہ رستہ نہیں دیتا کافر لوگوں کو

خلاصہ تفسیر

یقیناً شمار ہمینوں کا (جو کہ) کتاب الہی (یعنی احکام شرعیہ) میں اللہ کے نزدیک معتبر ہیں بارہ مہینے (قمری) ہیں (اور کچھ آج سے نہیں بلکہ) جس روز اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین پیدا کئے تھے (اسی روز سے اور) ان میں چار خاص مہینے ادب کے ہیں (ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، رجب) یہی (امر مذکور) دین مستقیم ہے (یعنی ان مہینوں کا بارہ ہونا اور چار کا بتخصیص اشہر حرم ہونا اور بخلاف عادت جاہلیت کے کبھی سال کے مہینوں کا عدد بڑھا دیتے ، اور کبھی اشہر حرم کی تخصیص چھوڑ دیتے کہ یہ بد دینی ہے) سو تم ان سب مہینوں کے بارے میں (دین کے خلاف کر کے جو کہ موجب گناہ ہے) اپنا نقصان مت کرنا (یعنی اس عادت جاہلیت کے موافق مت کرنا) اور ان مشرکین سے (جبکہ یہ اپنی کفریات کو جن میں یہ خاص عادت بھی آگئی نہ چھوڑیں) سب سے لڑنا جیسا کہ وہ تم سب (مسلمانوں) سے لڑنے کو ہر وقت تیار رہا کرتے ہیں، اور اگر ان کے جمعیت اور سامان سے اندیشہ ہو تو) یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کا ساتھی ہے (پس ایمان و تقویٰ کو اپنا شعار رکھو اور کسی سے مت ڈرو آگے اُن کی عادت جاہلیت کا بیان ہے کہ) یہ مہینوں کا یا اُن کی حرمت کا آگے کو) ہٹا دینا کفر میں اور ترقی ہو جس سے (اور عام) کنارہ گمراہ کئے جاتے ہیں، (اس طور پر) کہ وہ اس حرام مہینہ کو کسی سال (نفسانی غرض سے) حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال

رجب کوئی غرض نہ ہو) حرام سمجھتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ نے جو مہینے حرام کئے ہیں (صرف) ان کی گنتی (بلا لحاظ تخصیص و تعین) پوری کر لیں پھر (جب تخصیص و تعین نہ رہی تو) اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں، ان کی بد اعمالیاں ان کو مستحسن معلوم ہوتی ہیں، اور ان کے اصرار علی الکفر پر غم کرنا بے سود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیتا کیونکہ یہ خود راہ پر آنا نہیں چاہتے) ۛ

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں کفار و مشرکین کے کفر و شرک، مگر اہی اور بد اعمالیوں کا ذکر تھا، ان دو آیتوں میں بھی اسی سلسلہ کا ایک مضمون اور عرب جاہلیت کی ایک جاہلانہ رسم بد کا بیان اور مسلمانوں کو اس سے اجتناب کی ہدایت ہے، وہ رسم بد ایک واقعہ سے متعلق ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ عہد قدیم سے تمام انبیاء سابقین کی شریعتوں میں سال کے بارہ مہینے مانے جاتے تھے اور ان میں سے چار مہینے بڑے متبرک اور ادب و احترام کے مہینے سمجھے جاتے تھے، تین مہینے مسلسل ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور ایک رجب کا۔

تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں اس پر متفق ہیں کہ ان چار مہینوں میں ہر عباد کا ثواب زیادہ ہوتا ہے، اور ان میں کوئی گناہ کرے تو اس کا وبال اور عذاب بھی زیادہ ہے، سابق شریعتوں میں ان مہینوں کے اندر قتل و قتال بھی ممنوع تھا۔

مکہ مکرمہ کے عرب چونکہ اسمعیل علیہ السلام کے واسطے سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد ہیں، اس لئے یہ سب لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے قائل اور ان کی شریعت کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے، اور چونکہ ملت ابراہیم میں بھی ان چار مہینوں (یعنی اشہر حرم) میں قتل و قتال اور شکار ممنوع تھا، عرب جاہلیت پر اس حکم کی تعمیل اس لئے سخت دشوار تھی، کہ دور جاہلیت میں قتل و قتال ہی ان کا پیشہ بن کر رہ گیا تھا، اس لئے اس میں آسانی پیدا کرنے کے لئے انھوں نے اپنی نفسانی اغراض کے لئے طرح طرح کے حیلے نکالے کبھی اشہر حرم کے کسی مہینہ میں جنگ کی ضرورت پیش آتی یا لڑتے لڑتے شہر حرام آجاتا تو کہہ دیتے کہ اب کے سال یہ مہینہ حرام نہیں ہوا اگلا مہینہ حرام ہوگا، مثلاً محرم آگیا تو کہتے کہ اس سال محرم کا مہینہ حرام نہیں بلکہ صفر کا مہینہ حرام ہوگا، اور مزید ضرورت پڑتی تو کہتے کہ ربیع الاول حرام ہوگا، یا یہ کہتے کہ اس سال صفر کا مہینہ پہلے آگیا، محرم بعد میں آئے گا اس طرح محرم کو صفر بنادیا، غرض سال بھر میں چار مہینے تو پورے کر لیتے تھے لیکن اللہ کی متعین کردہ ترتیب

اور تعین کا لحاظ نہ کرتے تھے، جس مہینہ کو چاہیں ذی الحجہ کہہ دیں اور جس کو چاہیں رمضان کہہ دیں جس کو چاہیں مقدم کر دیں جس کو چاہیں مؤخر کر دیں، اور کبھی زیادہ ضرورت پڑتی مثلاً لڑتے لڑتے دس مہینے گزر گئے اور سال کے صرف ہی مہینے باقی رہ گئے، تو ایسے موقع پر سال کے مہینوں کی تعداد بڑھا دیتے، اور کہتے کہ اب کے برس سال چودہ مہینوں کا ہوگا، اسی طرح باقی ماندہ چار مہینوں کو اشہر حرم بنا لیتے تھے۔ غرض دین ابراہیمی کا اتنا تو احترام کرتے تھے کہ سال میں چار مہینوں کا احترام کرتے اور ان میں قتل و قتال سے باز رہتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے جو ترتیب مہینوں کی متعین فرمائی اور اسی ترتیب سے چار مہینوں کو اشہر حرم قرار دیا، اس میں طرح طرح کی تاویلیں کر کے اپنی اغراض نفسانی کو پورا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس زمانہ میں اس کا امتیاز ہی دشوار ہو گیا تھا کہ کونسا مہینہ رمضان یا شوال کا ہے اور کونسا ذی القعدہ، ذی الحجہ یا رجب کا ہے، ہجرت کے آٹھویں سال جب مکہ مکرمہ فتح ہوا اور نویں سال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبرؓ کو موسم حج میں تمام کفار و مشرکین سے برابرت کا اعلان کرنے کے لئے بھیجا تو یہ مہینہ حقیقی حساب سے اگرچہ ذی الحجہ کا مہینہ تھا، مگر جاہلیت کے اسی پیرانے دستور کے مطابق یہ مہینہ ذی القعدہ کا قرار پایا تھا، اور اس سال ان کے نزدیک حج کا مہینہ بجائے ذی الحجہ کے ذی القعدہ مقرر تھا، پھر منسلحہ میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لئے تشریف لے گئے تو قدرتی طور پر ایسا نظام بن گیا کہ مہینہ اصلی ذی الحجہ کا تھا، اہل جاہلیت کے حساب میں بھی وہ ذی الحجہ ہی قرار پایا، اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منیٰ کے خطبہ میں ارشاد فرمایا: **إِنَّ الْمَظْمَانَ قَدْ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ**، یعنی زمانہ پھر پھر اگر پھر اپنی اسی ہیئت پر آگیا جس پر اس کو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش کے وقت رکھا تھا، یعنی جو مہینہ اصلی ذی الحجہ کا تھا جاہلیت والوں کے نزدیک بھی اس سال وہی مہینہ ذی الحجہ کا مہینہ قرار پایا۔

یہ تھی وہ رسم جاہلیت جو مہینوں کی تعداد اور ترتیب اور تعین میں کمی بیشی اور رد و بدل کر کے کی جاتی تھی، جس کے نتیجہ میں ان تمام احکام شرعیہ میں خلل آتا تھا جو کسی خاص مہینہ یا اس کی کسی خاص تاریخ سے متعلق ہیں، یا جو سال کے شروع یا ختم سے متعلق ہیں، مثلاً عشرہ ذی الحجہ میں احکام حج اور عشرہ محرم کے روزے اور ختم سال پر زکوٰۃ وغیرہ کے احکام۔

بات تو مختصر سی تھی کہ مہینہ کا نام بدل کر مقدم و مؤخر کر دیا، کہ محرم کو صفر اور صفر کو محرم بنا دیا لیکن اس کے نتیجہ میں سینکڑوں احکام شرعیہ کی تحریف ہو کر عمل برباد ہوا، قرآن مجید کی ان دو آیتوں میں اس رسم جاہلیت کی خرابی اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کی ہدایت ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہے: **إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا**، اس میں لفظ عِدَّة

تعداد کے معنی میں ہے، اور شہور شہر کی جمع ہے، شہر کے معنی مہینہ ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ متعین ہے، اس میں کسی کو کمی بیشی کا کوئی اختیار نہیں۔

اس کے بعد فی کتب اللہ کا لفظ بڑھا کر بتلادیا کہ یہ بات ازل سے لوح محفوظ میں لکھی ہوئی تھی، پھر یَوْمَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ قَرَأَ مَا كُتِبَ فَرَأَاهُ قَضَاءُ خَدَّادِ نَدَى اس معاملہ میں اگرچہ ازل میں جاری ہو چکی تھی، لیکن یہ مہینوں کی ترتیب اور تعین اس وقت عمل میں آئی جب آسمان و زمین پیدا کئے گئے۔

پھر ارشاد فرمایا مِنْهَا أَرْبَعَةٌ مُحَرَّمٌ، یعنی ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، ان کو حرمت والادو معنی کے اعتبار سے کہا گیا، ایک تو اس لئے کہ ان میں قتل و قتال حرام ہے، دوسرے اس لئے کہ یہ مہینے متبرک اور واجب الاحترام ہیں، ان میں عبادت کا ثواب زیادہ ملتا ہے، ان میں سے پہلا حکم تو شریعت اسلام میں منسوخ ہو گیا، مگر دوسرا حکم احترام ادب اور ان میں عبادت گزاری کا اہتمام اسلام میں بھی باقی ہے۔

حجۃ الوداع کے خطبہ یوم النحر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مہینوں کی تشریح یہ فرمائی کہ تین مہینے مسلسل ہیں، ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم..... اور ایک مہینہ رجب کا ہے، مگر ماہ رجب کے معاملہ میں عرب کے دو قول مشہور تھے، بعض قبائل اس مہینہ کو رجب کہتے تھے جس کو ہم رمضان کہتے ہیں، اور قبیلہ مضر کے نزدیک رجب وہ مہینہ تھا جو جمادی الثانیہ اور شعبان کے درمیان ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رجب مضر قرار دیا۔ وضاحت بھی فرمادی کہ جو جمادی الثانیہ اور شعبان کے درمیان ہے وہ ماہ رجب مراد ہے۔

ذَٰلِكَ الْيَقِيْنُ الْقَيِّمُ، یہ جو دین مستقیم یعنی مہینوں کی تعین اور ترتیب اور ان میں ہر مہینہ خصوصاً شہر حرم کے متعلق جو احکام ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے حکم ازلی کے مطابق رکھنا ہی دین مستقیم ہے، اس میں اپنی طرف سے کمی بیشی اور تغیر و تبدل کرنا کج فہمی اور کج طبعی کی علامت ہے۔

فَلَا تَظْلِمُوا فِئْتَكُمْ، یعنی ان مقدس مہینوں میں تم اپنا نقصان نہ کر بیٹھنا ان کے معینہ احکام و احترام کی خلاف ورزی کرنا نہیں عبادت گزاری میں کوتاہی کرو۔

امام جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ان متبرک مہینوں کا خاصہ یہ ہے کہ ان میں جو شخص کوئی عبادت کرتا ہے اس کو بقیہ مہینوں میں بھی عبادت کی توفیق اور ہمت ہوتی ہے، اسی طرح جو شخص کو شیش کر کے ان مہینوں میں اپنے آپ کو گناہوں اور برے کاموں سے بچالے تو باقی سال کے مہینوں میں اس کو ان برائیوں سے بچا آسان

ہو جاتا ہے، اس لئے ان مہینوں سے فائدہ نہ اٹھانا ایک عظیم نقصان ہے۔
یہاں تک مشرکین تکہ کی ایک خاص رسم جاہلیت کا بیان اور اس کا ابطال تھا، آخر آیت میں
پھر اس حکم کا اعادہ ہے جو شروع سورہ میں دیا گیا تھا کہ میعاد معاہدہ ختم ہونے کے بعد تمام مشرکین
وکفار سے جہاد واجب ہے۔

دوسری آیت میں بھی اسی رسم جاہلیت کا ذکر اس طرح فرمایا: **إِنَّمَا النَّسِيءُ سِوَىٰ ذَٰلِكَ**
فِي الْكُفْرِ، لفظ نسیء مصدر ہے، جس کے معنی پیچھے ہٹا دینے اور مؤخر کر دینے کے ہیں، اور بمعنی مؤخر
بھی استعمال ہوتا ہے۔

مشرکین عرب نے ان مہینوں کے آگے پیچھے کرنے کو یہ سمجھا تھا کہ اس طرح ہماری اغراض
نفسانی بھی فوت نہ ہوں گی، اور حکم خداوندی کی تعمیل بھی ہو جائے گی، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ
تمہارا مہینوں کو مؤخر کرنا اور اپنی جگہ سے ہٹا دینا کفر میں اور زیادتی ہے، جس سے ان کفار
کی گمراہی اور بڑھتی ہے، کہ وہ شہر حرام کو کسی سال تو حرام قرار دیں اور کسی سال حلال کر لیں۔
لِيُؤْاطِقُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ، یعنی تاکہ وہ پوری کر لیں گنتی ان مہینوں کی جن کو اللہ نے حرام
قرار دیا ہے، مطلب یہ ہے کہ محض گنتی پوری کر لینے سے تعمیل حکم نہیں ہوتی، بلکہ جو حکم جس مہینہ
کے لئے دیا گیا ہے اسی مہینہ میں اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔

احکام ومسائل | مذکورہ آیتوں سے ثابت ہوا کہ مہینوں کی جو ترتیب اور ان مہینوں کے جو
نام اسلام میں معروف ہیں وہ انسانوں کی بنائی ہوئی اصطلاح نہیں،
بلکہ رب العالمین نے جس دن آسمان و زمین پیدا کئے اسی دن یہ ترتیب اور یہ نام اور ان کے ساتھ
خاص خاص مہینوں کے خاص خاص احکام متعین فرمادیئے تھے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ
اللہ تعالیٰ کے نزدیک احکام شرعیہ میں قمری مہینوں کا اعتبار ہی، اسی قمری حساب پر تمام احکام
شرعیہ، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ دائر ہیں، لیکن قرآن حکیم نے تاریخ و سال معلوم کرنے کے
لئے جیسے قمر کو علامت قرار دیا ہے اسی طرح آفتاب کو بھی اس کی علامت فرمایا ہے،
لَتَعْلَمُوا عِدَّةَ السِّنِّينَ وَالْهُجُوتِ، اس لئے تاریخ و سال کا حساب چاند اور سورج دونوں
سے جائز ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کے لئے چاند کے حساب کو پسند فرمایا، اور احکام شرعیہ
اس پر دائر فرمائے، اس لئے قمری حساب کا محفوظ رکھنا فرض کفایہ ہے، اگر ساری امت قمری
حساب ترک کر کے اس کو بھلا دے تو سب گنہگار ہوں گے، اور اگر وہ محفوظ رہے تو دوسرے
حساب کا استعمال بھی جائز ہی، لیکن سنت اللہ اور سنت سلف کے خلاف ضرور ہی، اس لئے
بلا ضرورت اس کو اختیار کرنا اچھا نہیں۔

حساب کو پورا کرنے کے لئے جو لونڈ کا مہینہ بڑھایا جاتا ہے، بعض لوگوں نے اس کو بھی اس آیت کے تحت ناجائز سمجھا ہے، مگر وہ صحیح نہیں، کیونکہ جس حساب میں لونڈ کا مہینہ بڑھاتے ہیں اس سے احکام شرعیہ کا تعلق نہیں، اہل جاہلیت قمری اور شرعی مہینوں میں زیادتی کر کے شرعی احکام کو بدلتے تھے، اس لئے منع کیا گیا لونڈ کا کوئی اثر شرعی احکام پر نہیں پڑتا اس لئے وہ اس ممانعت میں داخل نہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ أَنْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ

اے ایمان والو تم کو کیا ہوا جب تم سے کہا جاتا ہے کہ کوچ کرو اللہ کی راہ میں

إِنَّا قَلَّمْنَا إِلَى الْأَرْضِ أَرْضَيْنِ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ فَمَا

تو گرے جاتے ہو زمین پر کیا خوش ہو گئے دنیا کی زندگی پر آخرت کو چھوڑ کر سو کچھ نہیں

مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۖ (۳۸) إِلَّا تَنْفِرُوا أَعْيُنُكُمْ

نفع اٹھانا دنیا کی زندگی کا آخرت کے مقابلہ میں مگر بہت تھوڑا، اگر تم نہ نکلو گے تو دیکھا تم کو عذاب

عَنْ آبَائِكُمُ اللَّيْمَاءِ وَيَسْتَبَدِلُ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا وَاللَّهُ

دردناک اور بدلہ میں لاوے گا اور لوگ تمھارے سوا اور کچھ نہ بگاڑ سکو گے تم اس کا، اور اللہ

عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۖ (۳۹) إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذَا خَرَجَ

سب چیز پر قادر ہے، اگر تم مدد نہ کرو گے رسول کی تو اس کی مدد کی ہو اللہ نے جس وقت اس کو

الَّذِينَ كَفَرُوا وَآثَانِي اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ

نکالا تھا کافروں نے کہ وہ دوسرا تھا دو میں کا جب وہ دونوں تھے غار میں جب وہ کہہ رہا تھا اپنی رفیق

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا جَافَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَكَ

سے تو غم نہ کھا، بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے، پھر اللہ نے اتاری اپنی طرف سے اس پر تسکین اور اس کی مدد

بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَ

کو وہ فوجیں بھیجیں کہ تم نے نہیں دیکھیں، اور نیچے ڈالی بات کافروں کی، اور

كَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۖ (۴۰) أَنْفِرُوا خِفَافًا

اللہ کی بات ہمیشہ اوپر ہے، اور اللہ زبردست، حکمت والا، نکلو ہلکے

وَقَالُوا جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ذَلِكُمْ

اور بوجھل اور لڑ اپنے مال سے اور جان سے اللہ کی راہ میں یہ

خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۴۱﴾ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَسَفَرًا

بہتر ہو تمھارے حق میں اگر تم کو سمجھ ہو، اگر مال ہوتا نزدیک اور سفر

قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوا وَلَكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ وَسَيَحْلِفُونَ

ہلکا تو وہ لوگ ضرورتی ساتھ ہو لیتے لیکن لمبی نظر آئی ان کو مسافت اور اب تمہیں کھاوینگے

بِاللَّهِ لَوْ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ وَاللَّهُ

اللہ کی کہ اگر ہم سے ہو سکتا تو ہم ضرور چلتے تمھاری ساتھ، وبال میں ڈالتے ہیں اپنی جانوں کو، اور اللہ

يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاِبُونَ ﴿۴۲﴾

جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو تم لوگوں کو کیا ہو کہ جب تم سے کہا جاتا ہو کہ اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کے لئے) نکلو تو تم زمین کو لگے جاتے ہو (یعنی اٹھتے اور چلتے نہیں) کیا تم نے آخرت کے عرصہ دنیاوی زندگی پر قناعت کر لی سودنیوی زندگی کی تمتع تو کچھ بھی نہیں بہت قلیل ہو، اگر تم اس جہاد کے لئے نہ نکلو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو سخت سزا دے گا، (یعنی تم کو ہلاک کر دیگا) اور تمہارے بدلے دوسری قوم پیدا کر دے گا، (اور ان سے اپنا کام لے گا) اور تم اللہ کے دین کو کچھ ضرر نہ پہنچا سکو گے، اور اللہ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے اگر تم لوگ رسول (اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد نہ کرو گے تو اللہ آپ کی مدد کرے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد اس وقت کر چکا ہے جبکہ اس سے زیادہ مصیبت و پریشانی کا وقت تھا جبکہ آپ کو کافروں نے (تنگ کر کے مکہ سے) جلا وطن کر دیا تھا جبکہ دو آدمیوں میں ایک آپ تھے (اور دوسرے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے ہمراہ تھے) جس وقت کہ دونوں (صاحب غار ثور) میں (موجود) تھے جبکہ آپ اپنے ہمراہی سے فرما رہے تھے کہ تم (کچھ) غم نہ کرو یقیناً اللہ تعالیٰ (کی مدد) ہمارے ہمراہ ہے سو (وہ مدد یہ ہوئی کہ) اللہ تعالیٰ نے آپ (کے قلب) پر اپنی (طرف سے) تسلی نازل فرمائی اور آپ کو ملائکہ کے ایسے لشکروں سے قوت دی جن کو تم لوگوں نے نہیں دیکھا، اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کی بات

اور تدبیر نیچی کر دی رکھ وہ ناکام رہے) اور اللہ ہی کا بول بالا رہا کہ ان کی تدبیر اور حفاظت غالب رہی) اور اللہ زبردست حکمت والا ہو (اسی لئے اسی کی بات اور حکمت غالب رہی جہاں کیلئے) نکل پڑو (خواہ) تھوڑے سامان سے (ہو) اور (خواہ) زیادہ سامان سے (ہو) اور اللہ ہی کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کر دینا تمھارے لئے بہتر ہو اگر تم یقین رکھتے ہو، (تو دیر مت کرو) اگر کچھ لگتے ہاتھ ملنے والا ہوتا اور سفر بھی معمولی ہوتا تو یہ (منافق) لوگ ضرور آپ کے ساتھ ہو لیتے لیکن ان کو تو مسافت ہی دور دراز معلوم ہونے لگی (اس لئے یہاں ہی رہ گئے) اور ابھی جب تم لوگ واپس آؤ گے تو خدا کی قسمیں کھا جائیں گے کہ اگر یہاں سے بس کی بات ہوتی تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے، یہ لوگ رچھوٹ بول بول کر اپنے آپ کو تباہ دینی مسیحی عذاب) کر رہے ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں بلاشبہ انکو استطاعت تھی اور پھر یہ نہیں گئے) :

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک غزوہ کا بیان اور اس کے ضمن میں بہت سے احکام اور ہدایات ہیں، یہ غزوہ غزوہ تبوک کے نام سے موسوم ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تقریباً آخری غزوہ ہے۔

تبوک، مدینہ کے شمال میں سرحدِ شام پر ایک مقام کا نام ہے، شام اس وقت رومی مسیحیوں کی حکومت کا ایک صوبہ تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہہ ہجری میں جب فتح مکہ اور غزوہ حنین سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ پہنچے تو اس وقت جزیرۃ العرب کے اہم حصے اسلامی حکومت کے زیر نگیں آچکے تھے، اور مشرکین مکہ کی ہشت سالہ مسلسل جنگوں کے بعد اب مسلمانوں کو ذرا سکون کا وقت ملا تھا۔

مگر جس ذات کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ مُبْلَغًا، نازل فرما کر پورے عالم کی فتوحات اور اس میں اپنے دین حق کو غالب کرنے کی بشارت دیدی تھی اس کو اور اس کے رفقاءِ کار کو فرصت کہاں، مدینہ پہنچتے ہی ملکِ شام سے آنے والے تجارت پیشہ لوگ جو شام سے زیتون کا تیل لاکر مدینہ وغیرہ میں فروخت کیا کرتے تھے، ان لوگوں نے یہ خبر پہنچائی کہ شاہِ روم ہرقل نے اپنی فوجیں مقامِ تبوک میں سرحدِ شام پر جمع کر دی ہیں، اور فوجیوں کو پورے ایک سال کی تنخواہیں پیشگی دے کر مطمئن اور خوش کر دیا ہے، اور عرب کے بعض قبائل سے بھی ان کی ساز باز ہو، ان کا ہمتیہ یہ ہے کہ مدینہ پر یکبارگی حملہ کریں۔

شریک نہیں ہوئے، ان کے متعلق کئی آیتیں نازل ہوئیں، اخْرُؤْنَ اَعْتَوْفُوا بِلِیٰکُمْ اَوْ یُحِیْمُ اور
 اخْرُؤْنَ مَرْجُوْنَ لَا مَرْءَ لَہِ اور وَ عَلٰی الثَّلَاثَةِ الَّذِیْنَ خَلَفُوْا الْاٰیَہِ تِیْنِیْنَ آیتیں آئیے
 ہی حضرات کے بارے میں نازل ہوئیں جن میں ان کی کاہلی پر زجر و تنبیہ بھی ہے اور بالآخر ان کی
 توبہ قبول ہونے کی بشارت بھی۔

پانچواں طبقہ منافقین کا تھا جو اپنے نفاق کی وجہ سے اس سخت امتحان میں اپنے نفاق
 کو چھپانے لگا، اور شرکتِ جہاد سے الگ رہا، اس طبقہ کا ذکر بہت سی آیات میں آیا ہے۔
 چھٹا طبقہ ان منافقین کا تھا جو جاسوسی اور شرارت کے لئے مسلمانوں کے ساتھ ہو لیا تھا
 ان کی حالت کا ذکر قرآن کریم کی ان آیات میں ہے: وَ فِیْکُمْ مَّمْضُؤْنَ لَہُمْ۔ وَ لَیْسَ لَہُمْ
 سَآئِئُہُمْ لَیْقُوْۤہُنَّ۔ وَ ہُمْ اٰیْمَاکُمْ یٰۤاَہْلَ الْاٰمِنِیْنَ۔

لیکن اس ساری سختی اور تکلیف کے باوجود شرکتِ جہاد سے باز رہنے والوں کی مجموعی تعداد
 پھر بھی برائے نام تھی، بھاری اکثریت انہی مسلمانوں کی تھی جو اپنے سارے منافع اور راحت کو
 قربان کر کے اللہ کی راہ میں ہر طرح کی مشقت برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گئے، اسی لئے
 اس جہاد میں نکلنے والے اسلامی لشکر کی تعداد تیس ہزار تھی، جو اس سے پہلے کسی جہاد میں
 نظر نہیں آئی۔

نتیجہ اس جہاد کا یہ ہوا کہ جب ہر قتل شاہِ روم کو مسلمانوں کی اتنی بڑی جمعیت کے مقابلہ
 پر آنے کی خبر پہنچی تو اس پر رعب طاری ہو گیا، مقابلہ پر نہیں آیا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم
 اپنے فرشتہ خصلت صحابہ کرام کے لشکر کے ساتھ چند روز محاذِ جنگ پر قیام کر کے جب مخالف
 کے مقابلہ پر آنے سے بایوس ہو گئے تو واپس تشریف لے آئے۔

جو آیتیں اوپر لکھی گئی ہیں بظاہر ان کا تعلق اس چوتھی جماعت سے ہے جو بغیر کسی صحیح
 عذر کے اپنی سستی اور کاہلی کی بنا پر شریکِ جہاد نہیں ہوئے، پہلی آیت میں ان کو اس کاہلی
 اور غفلت پر تنبیہ کی گئی اور اس کے ساتھ ان کے اس مرضِ غفلت و کاہلی کا سبب اور پھر
 اس کا علاج بھی ارشاد فرمایا گیا، جس کے ضمن میں یہ بھی واضح ہو گیا کہ:

دنیا کی محبت اور آخرت سے غفلت | کیونکہ مرض کا جو سبب اور علاج اس جگہ بیان فرمایا گیا ہے
 تمام جبرائیم کی بنیاد ہے | اگرچہ اس جگہ اس کا تعلق ایک خاص واقعہ سے تھا، لیکن اگر

عذر کیا جائے تو ثابت ہو گا کہ دین کے معاملہ میں ہر کوتاہی، سستی اور غفلت اور تمام جبرائیم
 اور گناہوں کا اصلی سبب یہی دنیا کی محبت اور آخرت سے غفلت ہے، اسی لئے حدیث میں رسولِ کریم
 صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مَحَبَّتُ الدُّنْیَا رَأْسُ كُلِّ خَطِیْئَةٍ، یعنی دنیا کی محبت ہر خطیئہ کا

حماہ کی بنیاد ہی اسی لئے آیت مذکورہ میں فرمایا گیا کہ:

”اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تمہیں اللہ کے راستہ میں نکلنے کے لئے کہا جاتا ہے تو تم زمین کو لگے جاتے ہو (حرکت کرنا نہیں چاہتے) کیا تم آخرت کے بدلے صرف دنیا کی زندگی پر مگن ہو گئے۔“

تشخیص مرض کے بعد اس کا علاج اٹھلے جملہ میں اس طرح ارشاد ہوا کہ:

”دنوی زندگی سے نفع اٹھانا تو کچھ بھی نہیں بہت قلیل و حقیر ہے۔“

جس کا حاصل یہ ہے کہ بڑی فکر آخرت کی دائمی زندگی کی چاہتے، اور یہ فکر آخرت ہی حقیقت

سارے امراض کا واحد اور مکمل علاج ہے اور انسداد جہنم کے لئے بے نظیر نسخہ اکسیر ہے۔

عقائد اسلام کے بنیادی اصول تین ہیں، توحید، رسالت اور آخرت، ان میں عقیدہ آخرت

درحقیقت اصلاح عمل کی روح اور جہنم اور گناہوں کے آگے ایک آہنی دیوار ہے، اگر غور

کیا جائے تو بدیہی طور پر معلوم ہو گا کہ دنیا میں امن و سکون اس عقیدہ کے بغیر قائم ہی نہیں ہو سکتا

آج کی دنیا میں مادی ترقیات اپنے شباب کو پہنچ رہی ہیں، جرائم کے انسداد کے لئے بھی کسی

ملک و قوم میں مادی تدبیروں کی کوئی کمی نہیں، قانون کی جکڑ بندی اور اس کے لئے انتظامی مشینری

روز بروز ترقی پر ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی آنکھوں دیکھا حال ہے کہ جرائم ہر جگہ اور ہر قوم

میں روز بروز ترقی ہی پر ہیں، ہماری نظر میں اس کی وجہ اس کے سوا نہیں کہ مرض کی تشخیص

اور علاج کا رخ صحیح نہیں، مرض کا سرچشمہ مادہ پرستی اور مادیات میں اہنماک اور آخرت

سے غفلت و اعراض ہے، اور اس کا واحد علاج ذکر اللہ اور آخرت کی فکر ہی، جس وقت اول

جس جگہ بھی دنیا میں اس اکسیری نسخہ کو استعمال کیا گیا پوری قوم اور اس کا معاشرہ صحیح انسانیت

کی تصویر بن کر فرشتوں کے لئے قابل رشک ہو گیا، عہد رسالت اور عہد صحابہ کرام کا مشاہدہ

اس کے لئے کافی دلیل ہے۔

آج کی دنیا جرائم کا انسداد تو چاہتی ہے، مگر خدا و آخرت سے غافل ہو کر چاہتی ہی

اور قدم قدم پر ایسے سامان جمع کرتی ہی جس میں رہ کر خدا و آخرت کی طرف دھیان بھی نہ آئے

تو اس کا لازمی نتیجہ وہی تھا جو آنکھوں کے سامنے آرہا ہے، کہ بہتر سے بہتر قانون اور فتاویٰ

مشینریاں سب فیل نظر آتی ہیں، جرائم اپنی جگہ نہ صرف موجود بلکہ روز بروز فانی رفتار سے

بڑھ رہے ہیں، کاش ایک مرتبہ عقلا دنیا اس قرآنی نسخہ کو استعمال کر کے دیکھیں تو انھیں معلوم

ہو کہ کس قدر آسانی کے ساتھ جرائم پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

دوسری آیت میں مستی اور کھالی برتنے والوں کو ان کے مرض اور علاج پر متنبہ کرنے

کے بعد آخری فیصلہ یہ بھی سنا دیا کہ :

”اگر تم جہاد کے لئے نہ نکلے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دوزخ میں مبتلا کر دیں گے اور

تمہاری جگہ کسی اور قوم کو کھڑا کر دیں گے، اور دین پر عمل نہ کرنے سے تم اللہ کو یا اللہ

کے رسول کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکو گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔“

تیسری آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا واقعہ پیش کر کے یہ بتلادیا گیا کہ

اللہ تعالیٰ کا رسول کسی انسان کی نصرت و امداد کا محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو براہ راست غیب سے

امداد پہنچا سکتے ہیں، جیسا کہ ہجرت کے وقت پیش آیا، جب آپ کو آپ کی برادری اور اہل وطن نے

وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا، سفر میں آپ کا رفیق بھی ایک صدیق کے سوا کوئی نہ تھا، دشمنوں کے

پیادے اور سوار تعاقب کر رہے تھے، آپ کی جائے پناہ بھی کوئی مستحکم قلعہ نہ تھا بلکہ ایک غار تھا،

جس کے کنارے تک تلاش کرنے والے دشمن پہنچ چکے تھے، اور رفیق غار ابو بکرؓ کو اپنی جان

کا تو غم نہ تھا، مگر اس لئے سہم رہے تھے کہ یہ دشمن سردار دعو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور

ہو جائیں گے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر شہادت بنے ہوئے نہ صرف خود مطمئن تھے،

بلکہ اپنے رفیق صدیقؓ کو فرما رہے تھے لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ”تم غمگین نہ ہو کیونکہ

اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

یہ بات کہنے کو تو دو لفظ ہیں جن کا بولنا کچھ مشکل نہیں، مگر سننے والے حالات کا پورا

نقشہ سامنے رکھ کر دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں کہ محض ماڈیات پر نظر رکھنے والے سے یہ اطمینان

ممکن ہی نہیں، اس کا سبب اس کے سوا نہ تھا جس کو قرآن نے اگلے جملے میں ارشاد فرمایا کہ :

”اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب مبارک پر تسلی نازل فرمادی، اور ایسے لشکروں

سے آپ کی امداد فرمائی، جن کو تم لوگوں نے نہیں دیکھا۔“

یہ لشکر فرشتوں کے لشکر بھی ہو سکتے ہیں اور پورے عالم کی قوتیں خود بھی خدائی لشکر

ہیں وہ بھی ہو سکتی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر کفر کا کلمہ لپست ہو کر رہا اور اللہ ہی کا بول بالا ہوا

چوتھی آیت میں پھر تاکید کے طور پر اس حکم کا اعادہ فرمایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے تم لوگوں کو جہاد کے لئے نکلنے کا حکم دیدیا تو تم پر نکلنا ہر حال میں فرض ہو گیا، اور

اس حکم کی تعمیل ہی میں تمہاری ہر بھلائی کا انحصار ہے۔

پانچویں آیت میں جہاد میں بوجہ غفلت و سستی شریک نہ ہونے والوں کے ایک عذر کا

بیان کر کے اس کی تردید کی گئی ہے کہ یہ عذر قابل قبول نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو اختیار و قدرت عطا

فرمائی تھی انہوں نے اس کو اللہ کی راہ میں مقدور رہا استعمال نہیں کیا، اس لئے عدم استطاعت کا عذر صحیح نہیں۔

عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا

اللہ بخشنے تجھ کو کیوں رخصت دیدی تو نے ان کو یہاں تک کہ ظاہر ہو جاتے تجھ پر سچ کہنے والے

وَتَعْلَمَ الْكَذِبِينَ ﴿۳۲﴾ لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

اور جان لیتا تو جھوٹوں کو، نہیں رخصت مانگتے تجھ سے وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ پر اور

الْآخِرَةِ يُجَاهِدُونَ وَأَيُّهَا مَوَالِيَهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ

آخرت کے دن پر اس سے کہ لڑیں اپنے مال اور جان سے اور اللہ خوب جانتا ہے

بِالسَّاقِينَ ﴿۳۳﴾ إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

ڈروالوں کو، رخصت وہی مانگتے ہیں تجھ سے جو نہیں ایمان لائے اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ ﴿۳۴﴾

اور آخرت کے دن پر اور شک میں پڑے ہیں دل اُن کے سو وہ اپنے شک ہی میں بھٹک رہے ہیں،

وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً وَلَكِنْ كَرِهَ اللَّهُ

اور اگر وہ چاہتے نکلنا تو ضرور تیار کرتے کچھ سامان اس کا لیکن پسند نہ کیا اللہ نے

أَنْبِعَاثَهُمْ قَبْضَتَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقُعْدِيَّيْنَ ﴿۳۵﴾ لَوْ

ان کا اٹھنا سو روک دیا ان کو اور حکم ہوا کہ بیٹھے رہو ساتھ بیٹھے والوں کے، اگر

خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَا أَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ

نکلنے میں تو کچھ نہ بڑھاتے تمہارے لئے مگر خرابی اور گھوڑے دوڑاتے تمہارے اندر

يَبْغُوا نَفْسَكُمْ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيكُمْ سَمْعُونُ لَهُمُ ط وَاللَّهُ عَلِيمٌ

بگاڑ کر دینکی تلاش میں اور تم میں بعضے جاسوس ہیں ان کے اور اللہ خوب جانتا ہے

بِالظَّالِمِينَ ﴿۳۶﴾ لَقَدْ ابْتَغُوا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَبُوا لَكَ

ظالموں کو، وہ تلاش کرتے رہی ہیں بگاڑ کی پہلے سے اور اللہ ہی

الْأُمُورَ حَتَّى جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَرِهُونَ ﴿۳۷﴾

تیرے کام یہاں تک کہ آپہنچا سچا وعدہ اور غالب ہوا حکم اللہ کا اور وہ ناخوش ہی رہی

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ ائْذَنْ لِّي وَلَا تَعْنِيْ ط الْاِلٰ فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا

اور بعضے ان میں کہتے ہیں مجھ کو رخصت دے اور مگر اسی میں نہ ڈال، سننا ہے: وہ تو مگر اسی میں پڑ چکے ہیں

وَ اِنْ جَهِتُمْ لَسَ حِيْطَةٌ بِالْكَافِرِيْنَ ۝۴۹ اِنْ تُصِيبْكَ حَسَنَةٌ تَسُوءُهُمْ

اور بیشک دوزخ گھیر رہی ہے، کا سر دلوں کو، اگر تجھ کو پہنچے کوئی خوبی تو وہ بُری لگتی ہے انکو

وَ اِنْ تُصِيبْكَ مُصِيبَةٌ يَقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَا اَمْرًا مِّنْ قَبْلُ وَ

اور اگر پہنچے کوئی سختی تو کہتے ہیں ہم نے تو سنبھال لیا تھا اپنا کام پہلے ہی اور

يَتَوَلَّوْا وَهُمْ فَرِحُوْنَ ۝۵۰ قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ

پھر جائیں خوشیاں کرتے، تو کہہ دے ہم کو ہر گز نہ پہنچے گا مگر وہی جو لکھا ہے اللہ

لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۵۱ قُلْ

نے ہمارے لئے وہی ہمارا ساز ہمارا، اور اللہ ہی پر چاہئے کہ بھروسہ کریں مسلمان، تو کہہ دے

هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَا اِلَّا اِحْدٰى الْحُسْنٰى ط وَ نَحْنُ نَتَرَبَّصُ

تم کیا امید کرو گے ہمارے حق میں مگر دو خوبیوں میں سے ایک کی اور ہم امیدوار ہیں تمہارے

بِكُمْ اَنْ يُصِيبَكُمْ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖ اَوْ بِاَيِّدٍ يِّنَا ط

حق میں کہ ڈالے تم پر اللہ کوئی عذاب اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں،

فَتَرَبَّصُوْا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ۝۵۲

سو منتظر رہو ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف (تو) کر دیا (لیکن) آپ نے ان کو (ایسی جلدی) اجازت کیوں دیدی تھی جب تک کہ آپ کے سامنے سچے لوگ ظاہر نہ ہو جاتے، اور (جب تک کہ) جھوٹوں کو معلوم نہ کر لیتے (تاکہ وہ خوش تو نہ ہونے پاتے، کہ ہم نے آپ کو دھوکہ دیدیا اور) جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے مال اور جان سے جہاد کرنے کے بارے میں (اس میں) شریک نہ ہونے کی کبھی، آپ سے رخصت نہ مانگیں گے (بلکہ وہ حکم کے ساتھ

دوڑ پڑیں گے) اور اللہ تعالیٰ ان مسقیوں کو خوب جانتا ہے (ان کو اجر و ثواب دے گا) البتہ وہ لوگ (چہار میں نہ جانے کی) آپ سے رخصت مانگتے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل (اسلام سے) شک میں پڑے ہیں سو وہ اپنے مشکوک میں پڑے ہوئے... حیران ہیں (کبھی موافقت کا خیال ہوتا ہے کبھی مخالفت کا) اور اگر وہ لوگ (غزوہ میں) چلنے کا ارادہ کرتے (جیسا کہ وہ اپنے عذر کے وقت ظاہر کرتے ہیں کہ چلنے کا تو ارادہ تھا، لیکن کیا کیا جائے فلاں ضرورت پیش آگئی سو اگر ایسا ہوتا) تو اس (چلنے) کا کچھ سامان تو درست کرتے (جیسا کہ سفر کے لوازم عادیہ سے ہے) لیکن (انہوں نے تو شروع سے ارادہ ہی نہیں کیا اور اس میں خیر ہوئی جیسا آگے آتا ہے) **لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ** اور اس کے خیر ہونے کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے ان کے جانے کو پسند نہیں کیا اس لئے ان کو توفیق نہیں دی اور (بحکم تکوینی) یوں کہہ دیا گیا کہ اپنا سچ لوگوں کے ساتھ تم بھی یہاں ہی دھرے رہو (اور ان کے جانے میں خیر نہ ہونے کی وجہ یہ ہو کہ) اگر یہ لوگ تمہارے ساتھ شامل ہو جاتے تو سو اس کے کہ اور دونا فساد کرتے اور کیا ہوتا (وہ فساد یہ ہوتا کہ) تمہارے درمیان فتنہ پردازی کی فکر میں دوڑے دوڑے پھرتے (یعنی لگائی بھائی کر کے آپس میں تفریق ڈالتے، اور جھوٹی خبریں اڑا کر پریشان کرتے، دشمن کا رعب تمہارے قلوب میں ڈالنے کی کوشش کرتے، اس لئے ان کا جانا ہی اچھا ہوا) اور (اب بھی) تم میں ان کے کچھ جاسوس موجود ہیں (جن کو اس سے زیادہ فساد کی تدبیر میں مہارت نہیں) اور ان ظالموں کو اللہ خوب سمجھے گا (اور ان لوگوں کی مفسدہ سازی و فتنہ پردازی کچھ آج نئی نہیں) انہوں نے تو پہلے (جنگِ احد وغیرہ میں) بھی فتنہ پردازی کی شکر کی تھی (کہ ساتھ ہو کر ہٹ گئے کہ مسلمان دل شکستہ ہو جائیں) اور (اس کے علاوہ بھی) آپ کی (ضرر رسانی کے) لئے کاروائیوں کی الٹ پھیر کرتے ہی رہے، یہاں تک کہ سچا وعدہ آگیا اور اس کا آنا یہ ہو کہ) اللہ کا حکم غالب رہا اور ان کو ناگوار ہی گذرنا پڑا، (اسی طرح آئندہ بھی بالکل تسلی رکھئے کچھ فکر نہ کیجئے) اور ان (منافقین متخلفین) میں بعض شخص وہ ہو جو (آپ سے) کہتا ہے کہ مجھ کو (غزوہ میں نہ جانے کی) اور گھر رہنے کی اجازت دیدیجئے، اور مجھ کو خرابی میں نہ ڈالئے خوب سمجھ لو کہ یہ لوگ خرابی میں تو پڑ ہی چکے ہیں، (کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی اور کفر سے بڑھ کر اور کونسی خرابی ہوگی) اور یقیناً دوزخِ آخرت میں) ان کافروں کو گھیرے گی اگر آپ کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو وہ ان کے لئے موجب غم ہوتی ہے، اور اگر آپ پر کوئی حادثہ آ پڑتا ہے تو (خوش ہو کر) کہتے ہیں کہ ہم نے تو اسی واسطے (پہلے سے اپنا احتیاط کا پہلو اختیار کر لیا تھا، کہ ان کے ساتھ لڑائی وغیرہ میں نہیں گئے تھے)

اور یہ کہہ کر وہ خوش ہوتے ہوئے چلے جاتے ہیں آپ (جواب میں ان سے دو باتیں) فرمادیکھے،
 (ایک تو یہ کہ، ہم پر کوئی حادثہ نہیں پڑ سکتا مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مقدر فرمایا ہے،
 وہ ہمارا مالک ہی رہے گا مالک حقیقی جو بخیر کرے مملوک کو اس پر راضی رہنا واجب ہے) اور دوسری
 کیا تخصیص ہے؟ اللہ کے تو سب مسلمانوں کو اپنے سب کام سپرد رکھنے چاہئیں (دوسری بات یہ)
 فرمادیکھے کہ ہمارے لئے جیسی اچھی حالت بہتر ہے ویسے ہی حوادث بھی باعتبار انجام کے
 کہ اس میں رفع درجات و قطع سینات ہونا بہتر ہے، پس تم تو ہمارے حق میں دو بہتریوں
 میں سے ایک بہتری کے منتظر رہتے ہو یعنی تم جو ہماری حالت کے منتظر رہتے ہو کہ دیکھو
 کیا ہو تو خواہ وہ حسنہ ہو یا مصیبت ہمارے لئے دونوں ہی میں بہتری ہے، اور ہم تمہارے
 حق میں اس کے منتظر رہا کرتے ہیں، کہ خدا تعالیٰ تم پر کوئی عذاب واقع کرے گا (خواہ) اپنی
 طرف سے (دنیا میں یا آخرت میں) یا ہمارے ہاتھوں سے (جب کہ تم اپنے کفر کو ظاہر کر دو،
 تو مثل دوسرے کفار کے قتل کے جاؤ) سو تم (اپنے طور پر) انتظار کرو (اور) ہم تمہارے ساتھ
 (اپنے طور پر) انتظار میں ہیں۔

معارف و مسائل

اس پورے رکوع کی سترہ آیتوں میں بیشتر ان منافقین کا ذکر ہے، جنہوں نے جھوٹے عذر
 پیش کر کے غزوۂ تبوک میں نہ جانے کی اجازت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کر لی تھی،
 اس کے ضمن میں بہت سے احکام و مسائل اور ہدایات ہیں۔

پہلی آیت میں ایک لطیف انداز سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی
 شکایت ہے کہ ان منافقین نے جھوٹ بول کر اپنے آپ کو معذور ظاہر کیا اور آپ نے قبل اس
 کے کہ ان کے حال کی تحقیق کر کے جھوٹ سچ کا پتہ لگاتے ان کو رخصت دیدی، جس کی بنا پر
 یہ لوگ خوشیاں مناتے اور یہ کہتے پھرے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوب دھوکہ
 دیا، اگرچہ اگلی آیتوں میں حق تعالیٰ نے اس کا بھی اظہار فرمایا کہ یہ لوگ محض حیلہ جونی کے لئے
 عذر پیش کر رہے تھے، ورنہ اگر ان کو اجازت نہ دی جاتی جب بھی یہ لوگ جانے والے نہ تھے
 اور ایک آیت میں اس کا بھی اظہار فرمایا کہ اگر بالفرض یہ لوگ اس جہاد میں جلتے بھی تو ان
 مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا، بلکہ ان کی سازش اور فتنہ پردازی سے اور خطرہ ہوتا۔

لیکن منشاء یہ ہے کہ ان کو اگر اجازت نہ دی جاتی تو پھر بھی یہ جانے والے نہ تھے، مگر
 ان کا نفاق کھل جاتا، اور ان کو مسلمانوں پر یہ طعنے کسے کا موقع نہ ملتا کہ ہم نے ان کو خوب

بیوقوف بنایا، اور مقصد درحقیقت عتاب نہیں بلکہ یہ بات ہے کہ آئندہ ان لوگوں کی چالوں سے
باخبر رہیں، اور سورۃ جو ایک قسم کا عتاب بھی ہے تو کس لطف و عنایت کے ساتھ کہ عتاب کی
بات جو لیم اذنت ہم سے شروع ہوتی ہے، یعنی آپ نے ان لوگوں کو کیوں اجازت دیدی
اس کے ذکر کرنے سے پہلے ہی عفا اللہ عنک ذکر فرما دیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ
نے آپ کو معاف فرما دیا۔

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب و مقام اور آپ کے تعلق مع اللہ پر نظر
رکھنے والے حضرات نے فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو عنایت تعلق حضرت حق جلّ
کے ساتھ تھا اس کے پیش نظر آپ کا قلب مبارک اس کا تحمل ہی نہ کر سکتا تھا کہ حق تعالیٰ کی طرف
سے کسی معاملہ میں آپ سے جواب طلب کیا جائے، اگر شروع میں لیم اذنت ہم کے الفاظ
ذکر فرما دیئے جاتے جن میں سورۃ جواب طلبی کا عنوان ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا
قلب مبارک اس کا تحمل نہ کر سکتا، اس لئے اس سے پہلے عفا اللہ عنک فرما کر ایک طرف تو
اس پر مطلع کر دیا کہ کوئی ایسا کام ہو گیا ہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہ تھا، دوسری طرف
اس کی معافی کی اطلاع پہلے دیدی تاکہ اکھلا کلام قلب مبارک..... پر زیادہ شاق نہ ہو۔

اور لفظ معافی سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ معافی تو جرم و گناہ کی ہوا کرتی ہے، اور
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گناہ سے معصوم ہیں تو پھر معافی کے یہاں کیا معنی ہو سکتے ہیں
وجہ یہ ہو کہ معافی جیسے گناہ کی ہوتی ہو ایسے ہی خلاف اولیٰ اور ناپسندیدہ چیز کے لئے بھی
معافی کا استعمال کیا جاسکتا ہے، اور وہ عصمت کے منافی نہیں۔

دوسری اور تیسری آیت میں مؤمنین اور منافقین کا یہ فرق بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ پر
صحیح ایمان رکھنے والے ایسے موقع پر کبھی اپنی جان و مال کی محبت میں جہاد سے جان چرانے کے
لئے آپ سے رخصت نہیں مانگا کرتے، بلکہ یہ کام صرف انہی لوگوں کا ہے جن کا اللہ پر اور دین
آخرت پر ایمان صحیح نہیں، اور اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کو خوب جانتے ہیں۔

چوتھی آیت میں ان کا عذر غلط ہونے کا ایک قرینہ یہ بتلا یا گیا ہے کہ وَلَوْ ارَادُوا
الْخُرُوجَ لَاَعَدُّوا لَكُمْ عُدَّةً، یعنی اگر واقعی یہ لوگ جہاد کے لئے نکلنے کا ارادہ رکھتے تو
اس کے لئے ضروری تھا کہ کچھ تیاری بھی تو کرتے، لیکن انہوں نے کوئی تیاری نہیں کی جس سے
معلوم ہوا کہ عذر کا بہانہ غلط تھا، درحقیقت ان کا ارادہ ہی جہاد کے لئے نکلنے کا نہیں تھا۔

عذر معقول اور نامعقول | اس آیت سے ایک اہم اصول مستفاد ہوا، جس سے معقول اور
نامعقول عذر میں امتیاز کیا جاسکتا ہے، وہ یہ کہ عذر راہی لوگوں
میں امتیاز

کا قابل قبول ہو سکتا ہے جو تعمیل حکم کے لئے تیار ہوں، پھر کسی اتفاقی حادثہ کے سبب معذور ہو گئے، معذوروں کے تمام معاملات کا یہی حکم ہے جس نے تعمیل حکم کے لئے کوئی تیاری نہیں کی اور ارادہ ہی نہیں کیا، پھر کوئی عذر بھی پیش آ گیا تو یہ عذر گناہ بدتر از گناہ کی ایک مثال ہوگی، صحیح عذر نہ سمجھا جائے گا، جو شخص نماز جمعہ کی حاضری کے لئے تیاری مکمل کر چکا ہے، اور جانے کا ارادہ کر رہا ہے کہ دفعۃً کوئی ایسا عذر پیش آ گیا جس کی وجہ سے نہ جاسکا تو اس کا عذر معقول ہے، اور اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اس کی عبادت کا پورا اجر عطا فرماتے ہیں، اور جس نے کوئی تیاری کی ہی نہیں، پھر اتفاقاً کوئی عذر بھی سامنے آ گیا تو وہ محض ایک بہانہ ہے۔ صبح کو سویرے نماز کے لئے اٹھنے کی تیاری پوری کی، گھڑی میں الارم لگایا، یا کسی کو مقرر کیا جو وقت پر جگائے، پھر اتفاق سے یہ تدبیریں غلط ہو گئیں جس کی وجہ سے نماز قضا ہو گئی، **جلی** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ التعلیس میں پیش آیا، کہ وقت پر جاگنے کے لئے یہ انتظام فرمایا کہ حضرت بلالؓ کو بٹھا دیا کہ وہ صبح ہوتے ہی سب کو جگا دیں، مگر اتفاق سے اُن پر بھی نیند غالب آ گئی، اور آفتاب نکل آنے کے بعد سب کی آنکھ کھلی، تو یہ عذر صحیح اور معقول ہے، جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: **لَا تَقْرَیْطُ فِی النَّوْمِ اِنَّمَا الْمَقْرَیْطُ فِی الْیَقَظَةِ**، یعنی نیند میں آدمی معذور ہے، کوتاہی وہ ہے جو جاگتے ہوئے کوتاہی کرے، وجہ یہ تھی کہ اپنی طرف سے وقت پر جاگنے کا انتظام مکمل کر لیا گیا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعمیل حکم کے لئے تیاری کرنے یا نہ کرنے ہی سے کسی عذر کے معقول یا نامعقول ہونے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے، محض زبانی جمع خرچ سے کچھ نہیں ہوتا۔

پانچویں آیت میں دھوکہ سے اجازت لینے والے منافقین کا یہ حال بھی بتلایا گیا، کہ ان کا جہاد میں نہ جانا ہی بہتر تھا، اگر یہ جاتے تو سازشوں اور جھوٹی خبروں سے فساد ہی پھیلاتے، **وَفِیْکُمْ سَمْعُوْنَ لَھُمْ** یعنی تم میں کچھ بھولے بھالے مسلمان ایسے بھی ہیں جو اُن کی جھوٹی افواہوں سے متاثر ہو سکتے تھے۔

لَقَدْ اَبْتَغَوْا لِفِتْنَةٍ مِّنْ قَبْلِ یعنی یہ لوگ اس سے پہلے بھی ایسا فتنہ و فساد پھیلا چکے ہیں، **جلی** غزوہ احد میں پیش آیا تھا۔

وَنَظَرَا مَرُّ اللّٰهِ وَھُمْ کَرِھُوْنَ، یعنی غالب آیا حکم اللہ کا حالانکہ منافقین اس سے بہت پیچ و تاب میں تھے، اس سے اشارہ فرمادیا کہ غلبہ اور فتح حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے، جیسا پہلے واقعات میں آپ کو فتح دی گئی، اس جہاد میں بھی ایسا ہی ہوگا اور

منافقین کی سب چالیں ناکام ہو جائیں گی۔

چھٹی آیت میں ایک خاص منافقِ جد بن قیس کا ایک خاص بہانہ ذکر کر کے اس کی گمراہی بیان فرمائی ہے، اس نے جہاد میں جانے سے یہ عذر پیش کیا تھا کہ میں نوجوان آدمی ہوں رومیوں کے مقابلہ پر جاؤں گا تو ان کی حسین عورتوں کے فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہے، قرآن کریم نے اس کے جواب میں فرمایا الْفِتْنَةُ سَاقُطَةٌ کہ یہ بیوقوف ایک موہوم فتنہ کا بہانہ کر کے ایک لھتی فتنہ یعنی امرِ رسول کی خلاف ورزی اور ترکِ جہاد کے گناہ میں فی الحال مبتلا ہو گئے۔

وَإِنْ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِمَا كُفِّرْتُمْ، یعنی جہنم ان سب کافروں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے جس سے نکل نہیں سکے، اس کی مراد یا تو یہ ہے کہ آخرت میں جہنم ان کو گھیرے میں لے لیگی اور یا یہ کہ جہنم میں پہنچنے کے اسباب جو اس وقت ان کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہیں، انہی کو جہنم سے تعبیر فرما دیا، اس معنی کے اعتبار سے گویا فی الحال بھی یہ لوگ جہنم ہی کے دائرہ میں ہیں۔ ساتویں آیت میں ان کی ایک اور کم ظرفی کا بیان ہے، کہ یہ لوگ اگر چہ ظاہر میں مسلمانوں کے ساتھ ملے رہتے ہیں، لیکن حال یہ ہے کہ إِنْ تُصِيبَكَ حَسَنَةٌ تَسُوءُ هُمْ یعنی اگر آپ کو کوئی فتح اور کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کو سخت ناگوار ہوتا ہے، وَإِنْ تُصِيبَكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرًا مِنْ قَبْلُ وَتَوَلَّوْا وَهُمْ قَرِحُونَ، یعنی اگر آپ کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ لوگ کہنے لگتے ہیں کہ ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال رہے ہیں، اسی لئے ہم نے اپنی مصالحت کو اختیار کیا، ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے اور یہ کہہ کر وہ خوشی خوشی واپس ہو جاتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو منافقین کے مذکورہ اقوال سے متاثر نہ ہونے اور اصل حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنے کی ہدایت ان الفاظ میں دی: قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ، یعنی آپ ان مادی اسباب کی پرستش کرنے والوں کو بتلا دیجئے کہ تم دھوکہ میں ہو یہ مادی اسباب محض ایک پردہ ہیں، ان کے اندر کام کرنے والی قوت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، ہمیں جو حال پیش آتا ہے وہ سب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے، اور وہی ہمارا مولیٰ اور مددگار ہے، اور مسلمانوں کو چاہئے کہ اسی پر اصل بھروسہ رکھیں، مادی اسباب کو صرف اسباب و علامات ہی کی حیثیت سے دیکھیں، ان پر کسی بھلائی یا بُرائی کا مدار نہ جائیں۔

اعتقاد تقدیر استعمال تدبیر کے ساتھ ہونا چاہئے اس آیت نے مسئلہ تقدیر اور مسئلہ توکل کی اصل حقیقت بے تدبیری کا نام توکل رکھنا غلط ہے بھی واضح کر دی کہ تقدیر و توکل پر یقین رکھنے کا یہ حاصل نہ ہونا چاہئے، کہ آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے، اور یہ کہ جو کچھ قسمت میں ہوگا وہ ہو جائیگا بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ اسباب اختیار یہ کے لئے اپنی پوری توانائی اور ہمت صرف کی جائے اور سجد قدرت اسباب جمع کرنے کے بعد معاملہ کو تقدیر و توکل کے حوالہ کریں، نظر صرف اللہ تعالیٰ پر رکھیں کہ نتائج ہر کام کے اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

مسئلہ تقدیر و توکل میں عام دنیا کے لوگ بڑی افراتفری میں پائے جاتے ہیں، کچھ بے دین لوگ وہ ہیں جو سرے سے تقدیر و توکل کے قائل ہی نہیں انھوں نے ہادی انبیاء کو خدا بنایا ہوا ہے، اور کچھ ناواقف ایسے بھی ہیں جنہوں نے تقدیر و توکل کو اپنی کم ہمتی اور بیکاری کا بہانہ بنا لیا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جہاد کے لئے پوری پوری تیاری اور اس کے بعد اس آیت کے نزول نے اس افراط و تفریط کو ختم کر کے صحیح راہ دکھلا دی کہ ”بر توکل زاتوئے اشتر بہ بند“ یعنی اسباب اختیار یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی نعمت ہیں، ان سے فائدہ نہ اٹھانا ناشکری اور بیوقوفی ہے، البتہ اسباب کو اسباب کے درجہ سے آگے نہ بڑھاؤ، اور عقیدہ یہ رکھو کہ نتائج و ثمرات ان اسباب کے تابع نہیں، بلکہ فرمان حق جل شانہ کے تابع ہیں۔

نویں آیت نے مرد مومن کی ایک البیلی شان کا ذکر کر کے اُن کی مصیبت پر خوش ہونی والے منافقین کو یہ جواب دیدیا کہ تم جس چیز کو ہمارے لئے مصیبت سمجھ کر خوش ہوتے ہو ہمارے نزدیک وہ مصیبت بھی مصیبت نہیں، بلکہ راحت و کامیابی ہی کی ایک دوسری صورت ہے، کیونکہ مرد مومن اپنے عزم میں ناکام ہو کر بھی دائمی اجر و صلہ کا مستحق بنتا ہے، جو ساری کامیابیوں کا مقصود اصلی ہے، اس لئے وہ ناکام ہو کر بھی کامیاب رہتا ہے، اور بگڑنے میں بھی بنتا ہے۔

وہ شوخی چل سکی با و صبا کی بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

مذکورہ آیت میں ھَلْ تَرَىٰ تَصَوَّنَ بَنَاتِیَ اِلَّا اَحَدَیَ الْحَسَنِیَّیْنِ کا یہی مطلب ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتلادیا کہ کفار کا حال اس کے بالکل برعکس ہے، کہ ان کو کسی حال عذاب و مصیبت سے چھٹکارا نہیں، یا تو دنیا ہی میں مسلمانوں کے ہاتھوں اُن پر خدا کا عذاب آجائیگا، اور اس طرح دنیا و آخرت دونوں میں وہ عذاب چھیں گے، اور اگر دنیا میں کسی طرح اس سے بچ گئے تو آخرت کے عذاب سے خلاصی کا کوئی امکان نہیں۔

قُلْ أَنْفِقُوا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا لَنْ يُتَقَبَلَ مِنْكُمْ إِنْ كُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا

کہہ دے کہ مال خرچ کرو خوشی سے یا ناخوشی سے ہرگز قبول نہ ہوگا تم سے بیشک تم نافرمان

فَاسِقِينَ ﴿۵۳﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ أَنْ تُقَبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَتُهُمْ إِلَّا أَنْ هُمْ

لوگ ہو، اور موقوف نہیں ہوا قبول ہونا ان کے خرچ کا مگر اسی بات پر

كَفَرُوا بِاللهِ وَبِرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ

کہ وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور نہیں آتے نماز کو مگر ہارے جی

كَسَالَى وَلَا يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كِرْهُونَ ﴿۵۴﴾ فَلَا تُعْجِبْكَ

سے اور خرچ نہیں کرتے مگر بُرے دل سے، سو تو تعجب نہ کر

أَمْوَالَهُمْ وَلَا أَوْلَادَهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا

ان کے مال اور اولاد سے، یہی چاہتا ہے اللہ کہ ان کو عذاب میں رکھے

فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿۵۵﴾ وَ

ان چیزوں کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں اور نکلے ان کی جان اور وہ اس وقت تک کافر ہی رہیں

يَحْلِفُونَ بِاللهِ إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَكِنَّهُمْ قَوْمٌ

اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ وہ بیشک تم میں ہیں اور وہ تم میں نہیں لیکن وہ لوگ

يَفْرُقُونَ ﴿۵۶﴾ لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأًا أَوْ مَغْرَبًا أَوْ مَدْخَلًا

ڈرتے ہیں تم سے، اگر وہ پاویں کوئی پناہ کی جگہ یا غار یا سرگھسانے کو جگہ تو

لَوَلَوْ أَلَيْهِ وَهُمْ يَجْعَلُونَ ﴿۵۷﴾ وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ

اُلٹے بھاگیں اسی طرف رستیاں تڑاتے، اور بعضے ان میں وہ ہیں کہ تجھ کو طعن دیتے

فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ لَمْ يُعْطُوا

ہیں خیرات بانٹنے میں سو اگر ان کو ملے اس میں سے تو راضی ہوں اور اگر نہ ملے تو

مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ﴿۵۸﴾ وَلَوْ أَهْمَرَضُوا مَا أَلَيْهِمْ

جب ہی وہ ناخوش ہو جاویں، اور کیا اچھا ہوتا اگر وہ راضی ہو جاتے اسی پر جو دیا ان کو

اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ

اللہ نے اور اس کے رسول نے اور کہتے کافی ہو ہم کو اللہ اور وہ دیکھا ہم کو اپنے فضل سے

وَرَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ ﴿۵۹﴾

اور اس کا رسول ہم کو تو اللہ ہی چاہئے۔

ع
۱۳

خلاصہ تفسیر

آپؐ (ان منافقین سے) فرما دیجئے کہ تم (جہاد وغیرہ میں) خواہ خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم کسی طرح (خدا کے نزدیک) مقبول نہیں (کیونکہ) بلاشبہ تم نافرمانی کرنے والے لوگ ہو (مراد اس سے کفر ہے جیسا کہ آگے آتا ہے) اور ان کی خیرات قبول ہونے سے اس کے سوا کوئی مانع نہیں کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا (اسی کو اوپر نافرمانی کہا تھا اور کافر کا کوئی عمل مقبول نہیں) اور (اس کفر باطنی کی علامت ظاہر میں یہ ہے کہ وہ) لوگ نماز نہیں پڑھتے مگر ہارے جی سے اور (نیک کام میں) خرچ نہیں کرتے مگر ناگواری کے ساتھ (کیونکہ دل میں ایمان تو ہے نہیں جس سے امید ثواب ہو اور اس امید سے رغبت ہو محض بڑامی سے بچنے کے لئے کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں اور جب وہ ایسے مردود ہیں) تو ان کے اموال اور اولاد آپؐ کو (اس) تعجب میں نہ ڈالیں (کہ ایسے غیر مقبول مردود لوگوں کو اتنے انعامات کس طرح عطا ہوتے) کیونکہ واقع میں ان کے لئے نعمت نہیں ایک قسم کا عذاب ہی (کیونکہ) اللہ کو صرف یہ منظور ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے دنیوی زندگی میں (بھی) ان کو گرفتار عذاب رکھے اور ان کی جان کفر ہی کی حالت میں نکل جاوے (جس سے آخرت میں بھی گرفتار عذاب ہوں تو جس مال و اولاد کا یہ انجام ہو اس کو انعام سمجھنا ہی غلطی ہے) اور یہ (منافق) لوگ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں (یعنی مسلمان ہیں) حالانکہ (واقع میں) وہ تم میں سے نہیں، لیکن (بات یہ ہے کہ) وہ ڈر پوک لوگ ہیں (ڈر کے مارے جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے کفر کو چھپاتے ہیں کہ ہمارے ساتھ دوسرے کفار کا معاملہ مسلمانوں کی طرف سے نہ ہوئے لگے، اور کسی دوسری جگہ ان کا ٹھکانا نہیں جہاں آزادی جاری ہیں ورنہ) ان لوگوں کو اگر کوئی بناہ کی جگہ مل جاتی یا رکھیں پہاڑ وغیرہ میں (غار) مل جاتے) یا کوئی گھس بیٹھنی کی ذرا جگہ (مل جاتی) تو یہ ضرور منہ اٹھا کر ادھر ہی چل دیتے (مگر یہ صورت ہی نہیں، اس لئے جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے آپ کو مسلمان بتاتے ہیں، اور ان میں بعض لوگ وہ ہیں جو

صدقات و تقسیم کرنے کے بارے میں آپ پر طعن کرتے ہیں کہ اس تقسیم میں نعوذ باللہ انصاف نہیں کیا گیا، تو اگر صدقات میں سے ان کو (ان کی خواہش کے مطابق) مل جاتا ہو تو وہ راضی ہو جاتے ہیں اور اگر ان صدقات میں سے ان کو (اپنی خواہش کے مطابق) نہیں ملتا تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ ان کے اعتراض کا منشاء دراصل کوئی اصول نہیں، بلکہ حرص دنیا اور خود غرضی ہے) اور ان کے لئے بہتر ہوتا اگر وہ لوگ اس پر راضی رہتے جو کچھ اللہ نے ان کو (دلوایا تھا) اور اس کے رسول نے دیا تھا اور اس کے متعلق یوں کہتے... کہ ہم کو اللہ رکا دیا، کافی ہے دہم کو اتنا ہی قاعدہ سے مل سکتا تھا اسی میں خیر و برکت ہوگی، اور پھر اگر حاجت پیش آئے گی اور مصلحت ہوگی تو آئندہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم کو اور دے گا، اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) دیں گے ہم (دل سے) اللہ ہی کی طرف راغب ہیں (اسی سے سب امیدیں رکھتے ہیں)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں منافقین کی بد اخلاقی اور بد اعمالی کا ذکر تھا، مذکورہ تمام آیات میں بھی یہی مضمون ہے: اِنَّهَا يَرِيْدُ اللّٰهُ لِيُخَيِّطَ بِهٖمْ مِّمَّا هُمْ كٰفِرُوْنَ، میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ منافقین کے مال و اولاد ان کے لئے نعمت نہیں عذاب ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیا کی محبت میں انہماک انسان کی اس دنیا ہی میں ایک عذاب و مصیبت بن جاتا ہے، اول مال دنیا کے حاصل کرنے کی تمناؤں اور پھر تدبیروں میں کیسی کیسی محنت، مشقت اور کوفت جسمانی اور روحانی اٹھانی پڑتی ہے، نہ دن کا چین نہ رات کی نیند، نہ اپنے تن بدن کی خبر، نہ اہل و عیال ہی میں دل بہلانے کی فرصت، پھر اگر وہ حاصل ہو گیا تو اس کی حفاظت اور اس کے بڑھانے کی فکر دن رات کا عذاب ہے، اور اگر ذرا سا نقصان ہو گیا یا کوئی بیماری پیش آگئی، تو غموں کا پہاڑ آپڑا، اور اگر ساری چیزیں اتفاق سے طبیعت اور خواہش کے مطابق حاصل بھی ہو جائیں تو اس کے گھٹ جانے کا اندیشہ اور بڑھاتے چلے جانے کی فکر کسی وقت چین نہیں لینے دیتی۔ پھر جب آخر کار یہ چیزیں موت کے وقت یا پہلے ہی اس کے ہاتھ سے جاتی ہیں تو اس پر حسرت یا اس مستط ہو جاتی ہے، یہ سب عذاب ہی عذاب ہی، جس کو بیوقوف انسان جس نے سامانِ راحت کا نام راحت رکھ لیا ہے، اور حقیقی راحت یعنی قلب کا سکون و اطمینان.... کی اس کو ہوا بھی نہیں لگی، اس لئے سامانِ راحت ہی کو راحت سمجھ کر اس پر مگن رہتا ہے، جو حقیقت میں اس کیلئے دنیا کے چین آرام کا بھی دشمن ہو اور آخرت کے عذاب کا مقدمہ بھی۔

کیا صدقات کا مال | آخری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اموال صدقات میں سے منافقین کا فرکو دیا جاسکتا ہے | کو بھی حصہ ملا کرتا تھا، مگر وہ خواہش کے مطابق نہ ملنے پر ناراض ہو جاتے اور طعن و تشنیع کرنے لگتے تھے، یہاں اگر صدقات سے مراد عام معنی لئے جائیں جس میں صدقات واجبہ اور نافلہ سب شامل ہیں، تو کوئی اشکال ہی نہیں کیونکہ نفلی صدقات میں سے غیر مسلموں کو دینا باتفاق امت جائز اور سنت سے ثابت ہے، اور اگر صدقات سے مراد اس جگہ صدقات فرض، زکوٰۃ، عشر وغیرہ ہی ہوں، تو منافقین کو اس میں سے حصہ دینا اس بناء پر تھا کہ وہ اپنی آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے، اور ظاہری کوئی نجات ان کے کفر پر قائم نہ ہوتی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے بمصلحت حکم یہی دے رکھا تھا کہ منافقین کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ (بیان مسترآن ملخصاً)

لَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كَسَالَىٰ، اس آیت میں منافقین کی دُعا ملتیں بتلائی گئی ہیں، ایک یہ کہ نماز کو آویں تو مستی کاہلی اور ہائے جی سے آویں دوسرے اللہ کی راہ میں خرچ کریں تو ناگواری کے ساتھ خرچ کریں۔

اس میں مسلمانوں کو بھی اس پر تنبیہ ہے کہ نماز میں مستی، کاہلی اور زکوٰۃ و صدقات سے دلی ناگواری پیدا ہونا علامت نفاق ہے، مسلمانوں کو کوشش کر کے ان علامات سے بچنا چاہئے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْغَمِيلِينَ عَلَيْهَا وَ

زکوٰۃ جو ہی سودہ حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور زکوٰۃ کے کام پر جانہوالوں کا اور

الْمَوَافِقَةِ قُلُوبِهِمْ وَفِي الرِّقَابِ الْغَرَمِينَ وَفِي سَبِيلِ

جن کا دل پر چانا منظور ہے اور گردنوں کے پھڑالے میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ

اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ①

کے رستہ میں اور راہ کے مسافر کو ٹھہرا یا ہوا ہو اللہ کا، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

خلاصہ تفسیر

(فرض) صدقات تو صرف حق ہی غریبوں کا اور محتاجوں کا اور جو کارکن ان صدقات (کی تحصیل وصول کرنے) پر متعین ہیں (جنگی لچوٹی کرنا) منظور ہے اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں (ضرر کیا جائے) اور قرضداروں کے قرضہ (ادا کرنے میں) اور جہاد والوں کے سامان میں اور مسافروں کی (امداد) میں حکم اللہ کی طرف سے مقرر ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں۔

معارف و مسائل

مَصَارِفُ الصَّدَقَاتِ | اس سے پہلی آیتوں میں صدقات کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض منافقین کے اعتراضات اور جواب کا ذکر تھا، جس میں منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگایا تھا آپ (معاذ اللہ) صدقات کی تقسیم میں انصاف نہیں کرتے، جس کو چاہتے ہیں جو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے مصارف صدقات کو متعین فرما کر ان کی اس غلط فہمی کو دور کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات خود متعین فرمادی ہے کہ صدقات کن لوگوں کو دینے چاہئیں، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم صدقات میں اسی ارشاد ربانی کی تعمیل فرماتے ہیں، اپنی رائے سے کچھ نہیں کرتے۔

اس کی تصدیق اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو ابو داؤد اور دارقطنی نے حضرت زیاد بن حارث صدائی کی روایت سے نقل کی ہے، یہ فرماتے ہیں کہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو معلیم ہوا کہ آپ ان کی قوم کے مقابلہ کے لئے ایک لشکر مسلمانوں کا روانہ فرما رہے ہیں، میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ شکر نہ بھیجیں، میں اس کا ذمہ لیتا ہوں، کہ وہ سب طبع و فرمانبرداری ہو کر آجائیں گے، پھر میں نے اپنی قوم کو خط لکھا تو سب کے سب مسلمان ہو گئے، اس پر آپ نے فرمایا يَا اَخَا صَدِّ اَنَا الْمُطَاعُ عِنِّي قَوْمِي، جس میں گویا ان کو یہ خطاب دیا گیا کہ یہ اپنی قوم کے محبوب اور مقتدا ہیں، میں نے عرض کیا کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں، اللہ تعالیٰ کے کرم سے ان کو ہدایت ہو گئی اور وہ مسلمان ہو گئے، یہ فرماتے ہیں کہ میں ابھی اس مجلس میں حاضر تھا کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ سوال کرنے کے لئے حاضر ہوا، آپ نے اس کو یہ جواب دیا کہ:

”صدقات کی تقسیم کو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا غیر نبی کے بھی حوالہ نہیں کیا، بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصروف متعین فرمادیئے، اگر تم ان آٹھ میں داخل ہو تو تمہیں دے سکتا ہوں، انتہی،“ (تفسیر قرطبی، ص ۶۸-۶۷)

آیت کا شان نزول معلوم کرنے کے بعد آیت کی مکمل تفسیر اور تشریح سننے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ جل شانہ نے تمام مخلوقات انسان و حیوان وغیرہ کو رزق دینے کا وعدہ فرمایا ہے، وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا، اور ساتھ ہی اپنی حکمت بالغہ سے ایسا نہیں کیا کہ سب کو رزق میں برابر کر دیتے، غنی و فقیر کا فرق نہ رہتا، اس میں انسان

کی اخلاقی تربیت اور نظامِ عالم سے متعلق سیکڑوں حکمتیں ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں اس حکمت کے ماتحت کسی کو مال دار بنادیا، کسی کو غریب فقیر، پھر مال داروں کے مال میں غریب فقیر کا حصہ لگا دیا، ارشاد فرمایا *فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلْمَسْكِينِ وَالمَحْرُومِ* جس میں بتلادیا کہ مالداروں کے مال میں اللہ تعالیٰ نے ایک معین مقدار کا حصہ فقراء کے لئے رکھ دیا ہے، جو ان فقراء کا حق ہے۔

اس سے ایک توبہ معلوم ہوا کہ مالداروں کے مال میں سے جو صدقہ نکلانے کا حکم دیا گیا ہو یہ کوئی ان کا احسان نہیں، بلکہ فقراء کا ایک حق ہے، جس کی ادائیگی ان کے ذمہ ضروری ہے، دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ حق اللہ تعالیٰ کے نزدیک متعین ہی، یہ نہیں کہ جس کا جی چاہے جب چاہے اس میں کمی بیشی کر دے، اللہ تعالیٰ نے اس متعین حق کی مقدار بھی بتلانے کا کام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا، اور اسی لئے آپ نے اس کا اس قدر اہتمام فرمایا کہ صحابہ کرام کو صرف زبانی بتلادینے پر کفایت نہیں فرمائی، بلکہ اس معاملہ کے متعلق مفصل فرمان لکھوا کر حضرت فاروق اعظم اور عمرو بن حزم کو سپرد فرمائے، جس سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ زکوٰۃ کے نصاب اور ہر نصاب میں سے مقدار زکوٰۃ ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے واسطے سے متعین کر کے بتلادیئے ہیں، اس میں کسی زمانہ اور کسی ملک میں کسی کو کمی بیشی یا تغیر و تبدل کا کوئی حق نہیں۔

صدقہ زکوٰۃ کی فرضیت صحیح یہ ہے کہ اوائل اسلام ہی میں مکہ مکرمہ کے اندر نازل ہو چکی تھی، جیسا کہ امام تفسیر ابن کثیر نے سورۃ مزمل کی آیت *فَاقِمُْوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ* سے استدلال فرمایا ہے، کیونکہ یہ سورۃ بالکل ابتداء وحی کے زمانہ کی سورتوں میں سے ہے، اس میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم بھی ہے، البتہ روایات حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء اسلام میں زکوٰۃ کے لئے کوئی خاص نصاب یا خاص مقدار مقرر نہ تھی، بلکہ جو کچھ ایک مسلمان کی اپنی ضرورتوں سے بچ رہے وہ سب اللہ کی راہ میں خرچ کیا جاتا تھا، نصابوں کا تعین اور مقدار زکوٰۃ کا بیان بعد از ہجرت مدینہ طیبہ میں ہوا ہے، اور پھر زکوٰۃ و صدقات کی وصولیابی کا نظام محکمانہ انداز کا توفیق مکہ کے بعد عمل میں آیا ہے، اس آیت میں باجماع صحابہ و تابعین اسی صدقہ واجبہ کے مصارف کا بیان ہے جو نماز کی طرح مسلمانوں پر فرض ہے، کیونکہ جو مصارف اس آیت میں متعین کئے گئے ہیں وہ صدقات فرض کے مصارف ہیں، نفلی صدقات میں روایات کی تصریحات کی بنا پر بہت وسعت ہو، وہ ان آٹھ مصارف میں منحصر نہیں ہیں۔

اگرچہ اوپر کی آیات میں صدقات کا لفظ عام صدقات کے لئے استعمال ہوا ہے، جن میں زکوٰۃ اور نفلی دونوں داخل ہیں، مگر اس آیت میں باجماع امت صدقات فرض ہی کے مصارف کا بیان مراد ہے، اور تفسیر قرطبی میں ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں لفظ صدقہ مطلقاً بولا گیا ہے اور کوئی قرینہ نفلی صدقہ کا نہیں ہے تو وہاں صدقہ فرض ہی مراد ہوتا ہے۔

اس آیت کو لفظ انما سے شروع کیا گیا ہے، یہ لفظ حصراً و انحصار کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس شروع ہی کے کلمہ نے بتلادیا کہ صدقات کے جو مصارف آگے بیان ہو رہے ہیں تمام صدقات واجبہ صرف انہیں میں خرچ ہونے چاہئیں، ان کے علاوہ کسی دوسرے مصرف خیر میں صدقات واجبہ صرف نہیں ہو سکتے، جیسے جہاد کی تیاری یا بنائے مسجد و مدارس یا دوسرے رفاہ عام کے ادارے، یہ سب چیزیں بھی اگرچہ ضروری ہیں، اور ان میں خرچ کرنے کا بہت بڑا ثواب ہے، مگر صدقات فرض جن کی مقدار میں متعین کر دی گئی ہیں، ان کو ان میں نہیں لگایا جاسکتا۔

آیت کا دوسرا لفظ صدقات، صدقہ کی جمع ہے، صدقہ لغت میں اس مال کے مجز کو کہا جاتا ہے جو اللہ کے لئے خرچ کیا جائے (قاموس)، امام راغب نے مفرد القرآن میں فرمایا کہ صدقہ کو صدقہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا دینے والا گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں اپنے قول و فعل میں صادق ہوں، اس کے خرچ کرنے کی کوئی غرض دنیوی نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لئے خرچ کر رہا ہوں، اسی لئے جس صدقہ میں کوئی نام و نمود یا دنیوی غرض شامل ہو جائے قرآن کریم نے اس کو کالعدم قرار دیا ہے۔

لفظ صدقہ اپنے اصلی معنی کی رُو سے عام ہے، نفلی صدقہ کو بھی کہا جاتا ہے، فرض زکوٰۃ کو بھی، نقل کے لئے اس کا استعمال عام ہے ہی، فرض کے لئے بھی قرآن کریم میں بہت جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے، جیسے خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً اور آیت زیر بحث إِنَّمَا الصَّدَقَتُ وَغَيْرُہَا، بلکہ قرطبی کی تحقیق تو یہ ہے کہ قرآن میں جب مطلق لفظ صدقہ بولا جاتا ہے تو اس سے صدقہ فرض ہی مراد ہوتا ہے، اور روایات حدیث میں لفظ صدقہ ہر نیک کام کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، جیسے حدیث میں ہے کہ کسی مسلمان سے خوش ہو کر ملنا بھی صدقہ ہے، کسی بوجھ اٹھانے والے کا بوجھ اٹھوا دینا بھی صدقہ ہے، کنویں سے پانی کا ڈول اپنے لئے نکالا اس میں سے کسی دوسرے کو دیدینا بھی صدقہ ہے، اس حدیث میں لفظ صدقہ مجازی طور پر عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

تیسرا لفظ اس کے بعد لِلْفَقَرِ سے شروع ہوا ہے، اس کے شروع میں حرف

لام ہے جو تخصیص کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس لئے معنی جملہ کے یہ ہوں گے کہ تمام صدقات صرف انہی لوگوں کا حق ہے جن کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔

اب ان آٹھ مصارف کی تفصیل سنئے جو اس کے بعد مذکور ہیں:-

ان میں پہلا مصروف فقراء ہیں، دوسرا مساکین، فقیر اور مسکین کے اصلی معنی میں اگرچہ اختلاف ہے، ایک کے معنی ہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو، دوسرے کے معنی ہیں جس کے پاس نصاب سے کم ہو، لیکن حکم زکوٰۃ میں دونوں یکساں ہیں، کوئی اختلاف نہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کے پاس اس کی ضروریاتِ اصلیہ سے زائد بقدر نصاب مال نہ ہو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، اور اس کے لئے زکوٰۃ لینا بھی جائز ہے، ضروریات میں رہنے کا مکان، استعمالی برتن اور کپڑے اور فریج وغیرہ سب داخل ہیں، نصاب یعنی سونا ساڑھے سات تولہ یا چاندی ساڑھے باون تولہ یا اس کی قیمت جس کے پاس ہو اور وہ قرضدار بھی نہ ہو نہ اس کو زکوٰۃ لینا جائز ہے نہ دینا، اسی طرح وہ شخص جس کے پاس کچھ چاندی یا کچھ پیسے نقد ہیں اور تھوڑا سا سونا ہے تو سب کی قیمت لگا کر اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے تو وہ بھی صاحبِ نصاب ہے، اس کو زکوٰۃ دینا اور لینا جائز نہیں، اور جو شخص صاحبِ نصاب نہیں مگر تندرست، قوی اور کمانے کے قابل ہو اور ایک دن کا گزارہ اس کے پاس موجود ہے اس کو اگرچہ زکوٰۃ دینا جائز ہے مگر یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں سے سوال کرے، اس میں بہت سے لوگ غفلت برتتے ہیں، سوال کرنا ایسے لوگوں کے لئے حرام ہے، ایسا شخص جو کچھ سوال کر کے حاصل کرتا ہے اس کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم کا انگارہ فرمایا ہے (ابوداؤد و بروایت علیؓ، قرطبی)

حاصل یہ ہے کہ فقیر اور مسکین میں زکوٰۃ کے باب میں کوئی فرق نہیں، البتہ وصیت کے حکم میں فرق پڑتا ہے کہ مساکین کے لئے وصیت کی ہے تو کیسے لوگوں کو دیا جائے، اور فقراء کے لئے ہے تو کیسے لوگوں کو دیا جائے، جس کے بیان کی یہاں ضرورت نہیں، فقیر اور مسکین کے دونوں مصروفوں میں یہ بات قدر مشترک ہے کہ جس کو مال زکوٰۃ دیا جائے وہ مسلمان ہو اور حاجاتِ اصلیہ سے زائد بقدر نصاب مال کا مالک نہ ہو۔

اگرچہ عام صدقات غیر مسلموں کو بھی دیئے جاسکتے ہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تَصَدَّقُوا عَلَىٰ أَهْلِ الدِّيَانِ كُلِّهَا"، یعنی ہر مذہب والے پر صدقہ کرو۔ لیکن صدقہ زکوٰۃ کے بارے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن بھیجنے کے وقت یہ ہدایت فرمائی تھی کہ مال زکوٰۃ صرف مسلمانوں کے اغنیاء سے لیا جائے، اور انہی کے فقراء پر صرف کیا جائے، اس لئے مال زکوٰۃ کو صرف مسلم فقراء و مساکین ہی پر صرف کیا جاتا ہے،

زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات یہاں تک کہ صدقۃ الفطر بھی غیر مسلم فقیر کو دینا جائز ہے (ہدایہ) اور دوسری شرط مالکِ نصاب نہ ہونے کی خود فقیر و مسکین کے معنی سے واضح ہو جاتی ہے، کیونکہ یا تو اس کے پاس کچھ نہ ہوگا، یا کم از کم مالِ نصاب کی مقدار سے کم ہوگا، اس لئے فقیر اور مسکین دونوں اتنی بات میں مشترک ہیں کہ ان کے پاس بقدر نصاب مال موجود نہیں ان دونوں مصروفوں کے بعد اور چھ مصارف کا بیان آیا ہے، ان میں پہلا مصرف عاملین صدقہ ہیں۔ تیسرا مصرف اَلْعَامِلِیْنَ عَلَیْہَا، یہاں عاملین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات زکوٰۃ و عشر وغیرہ... لوگوں سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کرنے کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں، یہ لوگ چونکہ اپنے تمام اوقات اس خدمت میں خرچ کرتے ہیں، اس لئے ان کی ضروریات کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہے، قرآن کریم کی اس آیت نے مصارف زکوٰۃ میں ان کا حصہ رکھ کر یہ متعین کر دیا کہ ان کا حق الخدمت اسی مَدِّ زکوٰۃ سے دیا جائے گا۔

اس میں اصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے مسلمانوں سے زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے کا فریضہ براہِ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا ہے، جس کا ذکر اسی سورت میں آگے آنے والی اس آیت میں ہے **خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً** یعنی وصول کریں آپ مسلمانوں کے اموال میں سے صدقہ، اس آیت کا مفصل بیان تو آئندہ آئے گا، یہاں یہ بتلانا منظور ہے کہ اس آیت کی تفسیر سے مسلمانوں کے امیر پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ زکوٰۃ و صدقات وصول کرے، اور یہ ظاہر ہے کہ امیر خود اس کام کو پورے ملک میں بغیر اعوان اور مددگاروں کے نہیں کر سکتا، انہی اعوان اور مددگاروں کا ذکر مذکورہ آیت میں **وَالْعَامِلِیْنَ عَلَیْہَا** کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔

انہی آیات کی تعمیل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے صحابہ کرام کو صدقات وصول کرنے کے لئے عامل بنا کر مختلف خطوں میں بھیجا ہے، اور آیت مذکورہ کی ہدایت کے موافق زکوٰۃ ہی کی حاصل شدہ رقم میں سے ان کو حق الخدمت دیا ہے، ان میں وہ حضرات صحابہ بھی شامل ہیں جو اغنیاء تھے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ کسی غنی یعنی مال دار کے لئے حلال نہیں، بجز پانچ شخصوں کے، ایک وہ شخص جو جہاد کے لئے نکلا ہے اور وہاں اس کے پاس بقدر ضرورت مال نہیں، اگرچہ گھر میں مال دار ہو دوسرے عامل صدقہ جو صدقہ وصول کرنے کی خدمت انجام دیتا ہو، تیسرے وہ شخص کہ اگرچہ اس کے پاس مال ہے مگر وہ موجودہ مال سے زیادہ کا مقروض ہے، چوتھے وہ شخص جو صدقہ کا

مال کسی غریب کین سے پیسے دے کر خرید لے، پانچویں وہ شخص جس کو کسی غریب فقیر نے صدقہ کا حاصل شدہ مال بطور ہدیہ تحفہ پیش کر دیا ہو۔

رہا یہ مسئلہ کہ عالمین صدقہ کو اس میں سے کتنی رقم دی جائے سو اس کا حکم یہ ہے کہ ان کی محنت و عمل کی حیثیت کے مطابق دی جائے گی (احکام القرآن جصاص، قرطبی)

البتہ یہ ضروری ہوگا کہ عالمین کی تنخواہیں نصف زکوٰۃ سے بڑھنے نہ پائیں، اگر زکوٰۃ کی وصول یا بی اتنی کم ہو کہ عالمین کی تنخواہیں دے کر نصف بھی باقی نہیں رہتی تو پھر تنخواہوں میں کمی کی جائے گی، نصف سے زائد صرف نہیں کیا جائے گا (تفسیر مظہری، ظہیریہ)

بیان مذکور سے معلوم ہوا کہ عالمین صدقہ کو جو رقم مذکور زکوٰۃ سے دی جاتی ہے وہ بحیثیت صدقہ نہیں بلکہ ان کی خدمت کا معاوضہ ہے، اسی لئے باوجود غنی اور مال دار ہونے کے بھی وہ اس رقم کے مستحق ہیں، اور زکوٰۃ سے ان کو دینا جائز ہے، اور مصارف زکوٰۃ کی آٹھ مدت میں سے صرف ایک یہی مدالیسی ہے جس میں رقم زکوٰۃ بطور معاوضہ خدمت دی جاتی ہے، ورنہ زکوٰۃ نام ہی اس عطیہ کا ہے جو غریبوں کو بغیر کسی معاوضہ خدمت کے دیا جائے، اور اگر کسی غریب فقیر کو کوئی خدمت لے کر مالی زکوٰۃ دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔

اسی لئے یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، اول یہ کہ مال زکوٰۃ کو معاوضہ خدمت میں کیسے دیا گیا، دوسرے یہ کہ مال دار کے لئے یہ مال زکوٰۃ حلال کیسے ہوا، ان دونوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہے، کہ عالمین صدقہ کی اصلی حیثیت کو سمجھ لیا جائے، وہ یہ ہے کہ یہ حضرات فقراء کے وکیل کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ سب جانتے ہیں کہ وکیل کا قبضہ اصل موکل کے قبضہ کے حکم میں ہوتا ہے، اگر کوئی شخص اپنا قرض وصول کرنے کے لئے کسی کو وکیل مختار بنا دے، اور قرضدار یہ قرض وکیل کو سپرد کر دے تو وکیل کا قبضہ ہوتے ہی قرضدار بری ہو جاتا ہے، تو جب رقم زکوٰۃ عالمین صدقہ نے فقراء کے وکیل ہونے کی حیثیت سے وصول کر لی تو ان کی زکوٰۃ ادا ہو گئی، اب یہ پوری رقم ان فقراء کی ملک ہے جن کی طرف سے بطور وکیل انھوں نے وصول کی ہے اب جو رقم بطور حق الخدمت ان کو دی جاتی ہے وہ مال داروں کی طرف سے نہیں بلکہ فقراء کی طرف سے ہوئی، اور فقراء کو اس میں ہر طرح کا تصرف کرنے کا اختیار ہے، ان کو یہ بھی حق ہو کہ جب اپنا کام ان لوگوں سے لیتے ہیں تو اپنی رقم میں سے ان کو معاوضہ خدمت دیدیں۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ فقراء نے تو ان کو وکیل مختار بنایا نہیں، یہ ان کے وکیل کیسے بن گئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا سربراہ جس کو امیر کہا جاتا ہے وہ قدرتی طور پر منجانب اللہ پورے ملک کے فقراء غریب کا وکیل ہوتا ہے، کیونکہ ان سب کی ضروریات

کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے، امیر مملکت جس جس کو صدقات کی وصول یا بی پر عامل بنادے وہ سب ان کے نائب کی حیثیت سے فقراء کے وکیل ہو جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ عاملین صدقہ کو جو کچھ دیا گیا وہ درحقیقت زکوٰۃ نہیں دی گئی، بلکہ زکوٰۃ جن فقراء کا حق ہے ان کی طرف سے معاوضہ خدمت دیا گیا، جیسے کوئی غریب فقیر کسی کو اپنے مقدمہ کا وکیل بنادے اور اس کا حق الخدمت زکوٰۃ کے حاصل شدہ مال سے ادا کرنے تو یہاں تو دینے والا بطور زکوٰۃ کے دے رہا ہو اور نہ لینے والا زکوٰۃ کی حیثیت کے لئے رہا ہے۔

تفصیل مذکور سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آجکل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا **فائدہ** ان کی طرف سے بھیجے ہوئے سفیر صدقات زکوٰۃ وغیرہ مدارس اور انجمنوں کے لئے

وصول کرتے ہیں، ان کا وہ حکم نہیں جو عاملین صدقہ کا اس آیت میں مذکور ہے، کہ زکوٰۃ کی رقم میں سے ان کی تنخواہ دی جاسکے، بلکہ ان کو مدارس اور انجمن کی طرف سے جداگانہ تنخواہ دینا ضروری ہے زکوٰۃ کی رقم سے ان کی تنخواہ نہیں دی جاسکتی، وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں، بلکہ اصحاب زکوٰۃ مال داروں کے وکیل ہیں، ان کی طرف سے مال زکوٰۃ کو مصرف پر لگانے کا انکو اختیار دیا گیا ہے، اسی لئے ان کے قبضہ ہو جانے کے بعد بھی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک یہ حضرات اس کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں۔

فقراء کا وکیل نہ ہونا اس لئے ظاہر ہے کہ حقیقی طور پر کسی فقیر نے ان کو اپنا وکیل بنایا نہیں، اور امیر المؤمنین کی ولایت عامہ کی بنا پر جو خود بخود کالت فقر حاصل ہوتی ہے وہ بھی ان کو حاصل نہیں، اس لئے بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان کو اصحاب زکوٰۃ کا وکیل قرار دیا جائے اور جب تک یہ اس مال کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں ان کا قبضہ ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی رقم خود مال والے کے پاس رکھی ہو۔

اس معاملہ میں عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے، بہت سے ادارے زکوٰۃ کا فنڈ وصول کر کے اس کو ساہا سال رکھے رہتے ہیں اور اصحاب زکوٰۃ سمجھتے ہیں کہ ہماری زکوٰۃ ادا ہو گئی، حالانکہ ان کی زکوٰۃ اس وقت ادا ہوگی جب ان کی رقم مصارف زکوٰۃ میں صرف ہو جائے۔

اسی طرح بہت سے لوگ نادانیت سے ان لوگوں کو عاملین صدقہ کے حکم میں داخل سمجھ کر زکوٰۃ ہی کی رقم سے ان کی تنخواہ دیتے ہیں، یہ نہ دینے والوں کے لئے جائز ہے نہ لینے والوں کے لئے۔

ایک اور سوال | یہاں ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے اشارات اور احادیث عبادت پر اجرت | رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی تصریحات سے یہ بات ثابت ہو کہ کسی

عبادت پر اجرت و معاوضہ لینا حرام ہے، مسند احمد کی حدیث میں بروایت عبدالرحمن بن شبل منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِقْرَءُوا الْقُرْآنَ وَلَا تَكُونُوا بِهٖ عَن قُرْآنٍ پڑھو، مگر اس کو کھانے کا ذریعہ نہ بناؤ۔ اور بعض روایات میں اس معاوضہ کو قطعہ جہنم فرمایا ہے جو قرآن پر لیا جائے، اس کی بناء پر فقہاء امت کا اتفاق ہے کہ طاعات و عبادات پر اجرت لینا جائز نہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ صدقات وصول کرنے کا کام ایک دینی خدمت اور عبادت ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک قسم کا جہاد فرمایا ہے، اس کا مقتضی یہ تھا کہ اس پر بھی کوئی اجرت و معاوضہ لینا حرام ہوتا، حالانکہ قرآن کریم کی اس آیت نے صراحتاً اس کو جائز قرار دیا، اور زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں اس کو داخل فرمایا۔

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس کے متعلق فرمایا کہ جو عبادات فرض یا واجب عین میں ان پر اجرت لینا مطلقاً حرام ہے، لیکن جو فرض کفایہ ہیں ان پر کوئی معاوضہ لینا اسی آیت کی رو سے جائز ہے، فرض کفایہ کے معنی یہ ہیں کہ ایک کام پوری امت یا پورے شہر کے ذمہ فرض کیا گیا ہے، مگر یہ لازم نہیں کہ سب ہی اس کو کریں، اگر بعض لوگ ادا کر لیں تو سب سبکدوش ہو جاتے ہیں، البتہ اگر کوئی بھی نہ کرے تو سب گنہگار ہوتے ہیں۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ اسی آیت سے ثابت ہوا کہ امامت و خطابت کا معاوضہ لینا بھی جائز ہے، کیونکہ وہ بھی واجب علی العین نہیں بلکہ واجب علی الکفایہ ہیں انتہی! اسی طرح تعلیم قرآن و حدیث اور دوسرے دینی علوم کا بھی یہی حال ہے، کہ یہ سب کام پوری امت کے ذمہ فرض کفایہ ہیں، اگر بعض لوگ کر لیں تو سب سبکدوش ہو جاتے ہیں، اس لئے اگر اس پر کوئی معاوضہ اور تنخواہ لی جائے تو وہ بھی جائز ہے۔

چوتھا مصرف مصارف زکوٰۃ میں سے مؤلفۃ القلوب ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی دل جوئی کے لئے ان کو صدقات دیئے جاتے تھے، عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان میں تین چار قسم کے لوگ شامل تھے، کچھ مسلمان کچھ غیر مسلم، پھر مسلمانوں میں بعض تو وہ لوگ تھے جو غریب حاجت مند بھی تھے، اور نو مسلم بھی، ان کی دل جوئی اس لئے کی جاتی تھی کہ اسلام پر بختہ ہو جائیں، اور بعض وہ تھے جو مال دار بھی تھے اور مسلمان ہو گئے تھے، مگر ابھی تک ایمان کا رنگ ان کے دلوں میں رچا نہیں تھا، اور بعض وہ لوگ تھے جو خود تو پیچھے مسلمان تھے مگر ان کی قوم کو ان کے ذریعہ ہدایت پر لانا اور بختہ کرنا مقصود تھا، اور غیر مسلموں میں بھی کچھ وہ لوگ تھے جن کے شر سے بچنے کے لئے ان کی دل جوئی کی جاتی تھی، اور بعض وہ تھے جن کے بالے میں یہ تجربہ تھا کہ نہ تبلیغ و تعلیم سے اثر پذیر ہوتے ہیں، نہ جنگ و تشدد سے

بلکہ احسان و حسن سلوک سے متاثر ہوتے ہیں، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم قویہ چاہتے تھے کہ خلقِ خدا کو کفر کی ظلمت سے نکال کر نور ایمان میں لے آئیں، اس کے لئے ہر وہ جائز تدبیر کرتے تھے جس سے یہ لوگ متاثر ہو سکیں، یہ سب قسمیں عام طور پر مؤلفۃ القلوب میں داخل سمجھی جاتی ہیں جن کو صدقات کا چوتھا مصرف اس آیت میں قرار دیا ہے۔

چوتھا مصرف مؤلفۃ القلوب ہیں، ان کے متعلق گذشتہ صفحات میں یہ بتلایا جا چکا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دل جوئی کے لئے ان کو صدقات سے حصہ دیا جاتا تھا، عام خیال کے مطابق ان میں مسلم و غیر مسلم دونوں طرح کے لوگ تھے، غیر مسلموں کی دل جوئی اسلام کی ترغیب کے لئے اور نو مسلموں کی دل جوئی اسلام پر بختہ کرنے کے لئے کی جاتی تھی، عام طور پر مشہور یہ ہے کہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک خاص علت اور مصلحت کے لئے جس کا ذکر ابھی آچکا ہے، صدقات دیئے جاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب کہ اسلام کو مادی قوت بھی حاصل ہو گئی اور کفار کے شر سے بچنے یا نو مسلموں کو اسلام پر بختہ کرنے کے لئے اس طرح کی تدبیروں کی ضرورت نہ رہی تو وہ علت اور مصلحت ختم ہو گئی، اس لئے ان کا حصہ بھی ختم ہو گیا جس کو بعض فقہاء نے منسوخ ہو جانے سے تعبیر فرمایا ہے، فاروق اعظمؓ حسن بصریؒ، شعبیؒ، ابو حنیفہؒ مالک بن انسؒ..... کی طرف یہی قول منسوب ہے۔

اور بہت سے حضرات نے فرمایا کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ منسوخ نہیں، بلکہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں اس کو ساقط کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت نہ رہنے کی وجہ سے ان کا حصہ ساقط کر دیا گیا، آئندہ کسی زمانہ میں پھر ایسی ضرورت پیش آجائے تو پھر دیا جاسکتا ہے، امام زہریؒ، قاضی عبدالوہابؒ ابن عربیؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا یہی مذہب ہی، لیکن تحقیقی اور صحیح بات یہ ہے کہ غیر مسلموں کو صدقات وغیرہ سے کسی وقت کسی زمانہ میں حصہ نہیں دیا گیا، اور نہ وہ مؤلفۃ القلوب میں داخل ہیں، جن کا ذکر مصارف صدقات میں آیا ہے۔

امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں ان سب لوگوں کے نام تفصیل کے ساتھ شمار کئے ہیں جن کی دل جوئی کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات سے حصہ دیا ہے، اور یہ سب شمار کرنے کے بعد فرمایا ہے: **وَيَا جُمْلَةَ فُكَّهْمُ مُؤْمِنٌ وَلَمْ يَكُنْ فِيهِمْ كَافِرٌ**، یعنی خلاصہ یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب سب کے سب مسلمان ہی تھے، ان میں کوئی کافر شامل نہیں تھا۔

اسی طرح تفسیر مظہری میں ہے: **لَمْ يَثْبُتْ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْطَى أَحَدًا مِّنَ الْكُفَّارِ إِلَّا يَلَا فِي شَيْءٍ مِّنَ الزَّكَاةِ**، یعنی یہ بات کسی روایت سے

ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کافر کو مالِ زکوٰۃ میں اس کی دلجوئی کیلئے حصہ دیا ہو اس کی تائید تفسیر کشاف کی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مصارفِ صدقات کا بیان یہاں ان کفارِ منافقین کے جواب میں آیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تقسیم صدقات کے بارے میں اعتراض کیا کرتے تھے کہ ہم کو صدقات نہیں دیئے، اس بات میں مصارفِ صدقات کی تفصیل بیان فرمانے سے مقصد یہ کہ ان کو بتلادیا جائے کہ کافر کا کوئی حق مالِ صدقات میں نہیں ہے، اگر مؤلفۃ القلوب میں کافر بھی داخل ہوں تو اس جواب کی ضرورت نہ تھی۔

تفسیر مظہری میں اس مغالطہ کو بھی اچھی طرح واضح کر دیا ہے جو بعض روایاتِ حدیث کے سبب لوگوں کو پیش آیا ہے، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غیر مسلموں کو کچھ عطیات دیئے ہیں، چنانچہ صحیح مسلم اور ترمذی کی روایت میں جو یہ مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان ابن امیہ کو کافر ہونے کے زمانے میں کچھ عطیات دیئے، اس کے متعلق امام نوویؒ کے حوالہ سے تحریر فرمایا کہ یہ عطیات زکوٰۃ کے مال سے نہ تھے، بلکہ عنبر و حنین کے مالِ غنیمت کا جو خمس بیت المال میں داخل ہوا اس میں سے دیئے گئے، اور یہ ظاہر ہے کہ بیت المال کی اس مد سے مسلم و غیر مسلم دونوں پر خرچ کرنا باتفاق فقہاء جائز ہے، پھر فرمایا کہ امام بیہقیؒ، ابن سید الناس، امام ابن کثیرؒ وغیرہم سب نے یہی قرار دیا ہے کہ یہ عطاء مالِ زکوٰۃ سے نہیں، بلکہ خمسِ غنیمت سے تھی۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عظیم فائدہ | عہدِ مبارک میں اموالِ صدقات اگرچہ بیت المال میں جمع کئے جاتے تھے مگر ان کا حساب بالکل جدا تھا، اور بیت المال کی دوسری مددات جیسے خمسِ غنیمت یا خمسِ معادن وغیرہ ان کا حساب جدا، اور ہر ایک کے مصارف جدا تھے، جیسا کہ حضرات فقہاء نے تصریح فرمائی ہے، کہ اسلامی حکومت کے بیت المال میں چار مد علیحدہ علیحدہ رہنی چاہئیں اور اصل حکم یہ ہے کہ صرف حساب علیحدہ رکھنا نہیں بلکہ ہر ایک مد کا بیت المال الگ ہونا چاہئے تاکہ ہر ایک کو اس کے مصروف میں خرچ کرنے کی پوری احتیاط قائم رہے، البتہ اگر کسی وقت کسی خاص مد میں کمی ہو تو دوسری مد سے بطور قرض لے کر اس پر خرچ کیا جاسکتا ہے یہ مدد بیت المال یہ ہیں:-

اول خمسِ غنائم: یعنی جو مال کفار سے بذریعہ جنگ حاصل ہوا اس کے چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر کے باقی پانچواں حصہ: بیت المال کا حق ہے، اور خمسِ معادن یعنی مختلف قسم کی کانوں سے نکلنے والی اشیاء میں سے پانچواں حصہ بیت المال کا حق ہے، خمسِ زکات، یعنی جو

قدیم خزانہ کسی زمین سے برآمد ہو اس کا بھی پانچواں حصہ بیت المال کا حق ہے، یہ تینوں قسم کے خمس بیت المال کی ایک ہی مد میں داخل ہیں۔

دوسری مد صدقات ہیں جس میں مسلمانوں کی زکوٰۃ، صدقہ الفطر، اور ان کی زمینوں کا عشر داخل ہے۔

تیسری مد خراج اور مال فنی ہے، جس میں غیر مسلموں کی زمینوں سے حاصل شدہ خراج اور ان کا جزیہ اور ان سے حاصل شدہ تجارتی ٹیکس اور وہ تمام اموال داخل ہیں جو غیر مسلموں سے ان کی رضا مندی کے ساتھ مصالحانہ طور پر حاصل ہوں۔

چوتھی مد منوائج کی ہے، جس میں لا وارث مال، لا وارث شخص کی میراث وغیرہ داخل ہیں، ان چار مدات کے مصارف اگرچہ الگ الگ ہیں، لیکن فقراء و مساکین کا حق ان چاروں مدات میں رکھا گیا ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلامی حکومت میں قوم کے اس ضعیف عنصر کو قوی کرنا کس قدر اہتمام کیا گیا ہے، جو درحقیقت اسلامی حکومت کا طغری امتیاز ہے، درنہ دنیا کے عام نظاموں میں ایک مخصوص طبقہ ہی بڑھتا رہتا ہے، غریب کو ابھرنے کا موقع نہیں ملتا، جس کے ردِ عمل نے اشتراکیت اور کمیونزم کو جنم دیا، مگر وہ بالکل ایک غیر فطری اصول اور بارش سے بھاگ کر پرنالہ کے نیچے کھڑے ہو جانے کے مرادف اور انسانی اخلاق کے لئے سیم قاتل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں چار بیت المال چار مدات کے لئے الگ الگ مقرریں اور فقراء و مساکین کا حق چاروں میں رکھا گیا ہے، ان میں سے پہلی تین مدوں کے مصارف جو قرآن کریم نے تفصیل کے ساتھ متعین فرما کر واضح طور پر بیان کر دیئے ہیں، پہلی مد یعنی خمس غنائم کے مصارف کا بیان سورۃ انفال دسویں پارہ کے شروع میں مذکور ہے، اور دوسری مد یعنی صدقات کے مصارف کا بیان سورۃ توبہ کی مذکور الصدر ساتھیوں آیات میں آیا ہے، جس کی تفصیل اس وقت زیر بحث ہے، اور تیسری مد جس کو اصطلاح میں مال فنی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کا بیان سورۃ حشر میں تفصیل کے ساتھ آیا ہے، اسلامی حکومت کی اکثر مدات فوجی اخراجات اور عمال حکومت کی تنخواہیں وغیرہ اسی مد سے خرچ کی جاتی ہیں، چوتھی مد یعنی لا وارث مال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور خلفائے راشدین کے تعامل سے اپاہج محتاجوں اور لا وارث بچوں کے لئے مخصوص ہے۔ (شامی کتاب الزکوٰۃ)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرات فقہاء نے بیت المال کی چاروں مدات بالکل الگ الگ رکھنے اور اپنے اپنے معینہ مصارف میں خرچ کرنے کی جو ہدایات دی ہیں، یہ سب قرآنی ارشادات

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پھر خلفائے راشدین کے تعامل سے واضح طور پر ثابت ہیں۔
 اس ضمنی فائدہ کے بعد پھر اصل مسئلہ مؤلفۃ القلوب کو سمجھئے کہ مذکور الصدر بیان میں
 محققین، محدثین و فقہاء کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ کسی
 کافر کو کسی وقت بھی نہیں دیا گیا، نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اور
 نہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں، اور جن غیر مسلموں کو دینا ثابت ہے وہ مد صدقات و زکوٰۃ
 سے نہیں بلکہ خمس غنیمت میں سے دیا گیا ہے، جس میں سے ہر حاجت مند مسلم و غیر مسلم کو دیا جاسکتا
 ہے، تو مؤلفۃ القلوب صرف مسلم رہ گئے، اور ان میں جو فقراء ہیں ان کا حصہ بدستور باقی ہونے
 پر پوری امت کا اتفاق ہے، اختلاف صرف اس صورت میں رہ گیا کہ یہ لوگ غنی صاحبِ نصیب
 ہوں تو امام شافعیؒ امام احمدؒ کے نزدیک چونکہ تمام مصارف زکوٰۃ میں فقر و حاجت مندی
 شرط نہیں، اس لئے وہ مؤلفۃ القلوب میں ایسے لوگوں کو بھی داخل کرتے ہیں جو غنی اور صاحبِ
 نصاب ہیں، امام عظیم ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک عاملین صدقہ کے علاوہ باقی تمام
 مصارف میں فقر و حاجت مندی شرط ہے، اس لئے مؤلفۃ القلوب کا حصہ بھی ان کو اسی
 شرط کے ساتھ دیا جائے گا کہ وہ فقیر و حاجت مند ہوں، جیسے غارمین اور رقاب، ابن سبیل وغیرہ
 سب میں اسی شرط کے ساتھ ان کو زکوٰۃ دی جاتی ہے کہ وہ اس جگہ حاجت مند ہوں، گو وہ اپنے
 مقام میں مال دار ہوں۔

اس تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ ائمہ اربعہ کے نزدیک منسوخ نہیں
 فرق صرف اتنا ہے کہ بعض حضرات نے فقراء و مساکین کے علاوہ کسی دوسرے مصرف میں
 فقر و حاجت مندی کے ساتھ مشروط نہیں کیا، اور بعض نے یہ شرط کی ہے، جن حضرات
 نے یہ شرط رکھی ہو وہ مؤلفۃ القلوب میں بھی صرف انہی لوگوں کو دیتے ہیں جو حاجت مند اور
 غریب ہوں، بہر حال یہ حصہ قائم اور باقی ہے۔ (تفسیر منظری)

یہاں تک صدقات کے آٹھ مصارف میں سے چار کا بیان آیا ہے، ان چاروں کا حق حرف
 لام کے تحت بیان ہوا، لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ، آگے جن چار مصارف کا ذکر ہے ان میں عنوان
 بدل کر لام کی جگہ حرف فِي استعمال فرمایا فِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ، زمخشری نے کشاف میں
 اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ یہ آخری چار مصرف
 بہ نسبت پہلے چار کے زیادہ مستحق ہیں، کیونکہ حرف فِي ظرفیت کے لئے بولا جاتا ہے، جس کی وجہ
 سے معنی یہ پیدا ہوتے ہیں کہ صدقات کو ان لوگوں کے اندر رکھ دینا چاہئے، اور ان کے زیادہ
 مستحق ہونے کی وجہ ان کا زیادہ ضرورت مند ہونا ہے، کیونکہ جو شخص کسی کا مملوک غلام ہی

وہ بہ نسبت عام فقراء کے زیادہ تکلیف میں ہے، اسی طرح جو کسی کا قرضدار ہے اور قرض خواہوں کا اس پر تقاضا ہے وہ عام غریب فقراء سے زیادہ تنگی میں ہے کہ اپنے اخراجات کے فکر سے بھی زیادہ قرضداروں کے قرض کی فکر اس کے ذمہ ہے۔

ان باقی ماندہ چار مصارف میں سب سے پہلے وَفِی الرِّقَابِ کا ذکر فرمایا ہے، رِقَاب رِقَبۃ کی جمع ہے، اصل میں گردن کو رِقَبۃ کہتے ہیں، عرف میں اس شخص کو رِقَبۃ کہہ دیا جاتا ہے جس کی گردن کسی دوسرے کی غلامی میں مقید ہو۔

اس میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ رِقَاب سے مراد اس آیت میں کیلئے؟ جمہور فقہاء و محدثین اس پر ہیں کہ اس سے مراد وہ غلام ہیں جن کے آقاؤں نے کوئی مقدار مال کی متعین کر کے کہہ دیا ہے کہ اتنا مال کما کر ہمیں دیدو تو تم آزاد ہو جبکہ قرآن سنت کی اصطلاح میں مکاتب کہا جاتا ہے ایسے شخص کو آقا اس کی اجازت دیدیتا ہے کہ وہ تجارت یا مزدوری کے ذریعہ مال کمائے، اور آقا کو لا کر دے، آیت مذکورہ میں رِقَاب سے مراد یہ ہے کہ اس شخص کو رقم زکوٰۃ میں سے حصہ دے کر اس کی گھلو خلاصی میں امداد کی جائے۔

یہ قسم غلاموں کی باتفاق مفسرین و فقہاء لفظ وَفِی الرِّقَابِ کی مراد ہے، کہ رقم زکوٰۃ ان کو دے کر ان کی گھلو خلاصی میں امداد کی جائے، ان کے علاوہ دوسرے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا یا ان کے آقاؤں کو رقم زکوٰۃ دے کر یہ معاہدہ کر لینا کہ وہ ان کو آزاد کر دیں گے، اس میں ائمہ فقہاء کا اختلاف ہے، جمہور ائمہ ابو حنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل وغیرہ رحمہم اللہ اس کو جائز نہیں سمجھتے، اور حضرت امام مالکؒ بھی ایک روایت میں جمہور کے ساتھ متفق ہیں کہ وَفِی الرِّقَابِ کو صرف مکاتب غلاموں کے ساتھ مخصوص فرماتے ہیں، اور ایک روایت میں امام مالکؒ سے یہ بھی منقول ہے کہ وَفِی الرِّقَابِ میں عام غلاموں کو داخل کر کے اس کی بھی اجازت دیتے ہیں کہ رقم زکوٰۃ سے غلام خرید کر آزاد کئے جائیں (احکام القرآن ابن عربی مالکی)

جمہور ائمہ و فقہاء جو اس کو جائز نہیں رکھتے، ان کے پیش نظر ایک فقہی مشکل ہے کہ اگر رقم زکوٰۃ سے غلام کو خرید کر آزاد کیا گیا تو اس پر صدقہ کی تعریف ہی صادق نہیں آتی، کیونکہ صدقہ وہ مال ہے جو کسی مستحق کو بلا معاوضہ دیا جائے، رقم زکوٰۃ اگر آقا کو دی جائے تو ظاہر ہے کہ نہ وہ مستحق زکوٰۃ ہے اور نہ اس کو یہ رقم بلا معاوضہ دی جا رہی ہے، اور غلام جو مستحق زکوٰۃ ہے اس کو یہ رقم دی نہیں گئی، یہ الگ بات ہے کہ اس رقم کے دینے کا فائدہ غلام کو پہنچ گیا کہ اس نے خرید کر آزاد کر دیا، مگر آزاد کرنا صدقہ کی تعریف میں داخل نہیں ہوتا، اور حقیقی معنی کو بلا وجہ چھوڑ کر صدقہ کے مجازی معنی یعنی عام مراد لینے کا بلا ضرورت کوئی جواز نہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آیت مذکورہ میں

مصارف صدقات کے بیان کئے جا رہے ہیں، اس لئے فی الرِّقَابِ کا مصداق کوئی ایسی چیز نہیں بن سکتی جس پر صدقہ کی تعریف ہی صادق نہ آئے، اور اگر یہ رقم زکوٰۃ خود غلام کو دی جائے تو غلام کی کوئی ملک نہیں ہوتی وہ خود بخود آقا کا مال بن جائے گا، پھر آزاد کرنا نہ کرنا بھی اس کے تحت سوار میں رہے گا۔

اس فقہی اشکال کی وجہ سے جمہور ائمہ اور فقہاء نے فرمایا کہ فی الرِّقَابِ سے مراد صرف غلام مرکا نہیں اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ صدقہ کی ادائیگی کے لئے یہ شرط ہے کہ کسی مستحق کو مالک بنا کر اس کے قبضہ میں دیدیا جائے جب تک مستحق کا مالکانہ قبضہ اس پر نہیں ہوگا زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

چھٹا مصرف الْفَارِصِينَ، غارم کی جمع ہے، جس کے معنی مدیون یعنی قرضدار کے ہیں یہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ پانچواں اور چھٹا مصرف جو حرف فی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے استحقاق میں پہلے چاروں مصارف سے زیادہ ہیں، اس لئے غلام کی گلو خلاصی کے لئے یا قرضدار کو ادائے قرض کے لئے دینا عام فقراء و مساکین کو دینے سے زیادہ افضل ہے، شرط یہ ہے کہ اس قرضدار کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے وہ قرض ادا کر سکے، کیونکہ غارم لغت میں ایسے ہی قرضدار کو کہا جاتا ہے، اور بعض ائمہ فقہاء نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ یہ قرض اس نے کسی ناجائز کام کے لئے نہ لیا ہو، اور اگر کسی گناہ کے لئے قرض کر لیا جیسے شراب وغیرہ یا شادی غمی کی ناجائز رسمیں وغیرہ تو ایسے قرضدار کو زکوٰۃ سے نہ دیا جائے گا تاکہ اس کی معصیت اور اسراف بے جا کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔

ساتواں مصرف فِي سَبِيلِ اللَّهِ ہے، یہاں پھر حرف فی کا اعادہ کیا گیا۔

تفسیر کشاف میں ہے کہ اس اعادہ سے اس طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ یہ مصرف پہلے سب مصارف سے افضل اور بہتر ہے، وجہ یہ ہے کہ ہمیں دو فائدے ہیں ایک تو غریب مفلس کی امداد دوسرے ایک دینی خدمت میں اعانت، کیونکہ فِي سَبِيلِ اللَّهِ سے مراد وہ غازی اور مجاہد ہے، جس کے پاس اسلحہ اور جنگ کا ضروری سامان خریدنے کے لئے مال نہ ہو، یا وہ شخص جس کے ذمہ حج فرض ہو چکا ہو مگر اس کے پاس اب مال نہیں رہا جس سے وہ حج فرض ادا کرے، یہ دونوں کام خالص دینی خدمت اور عبادت ہیں، اس لئے مال زکوٰۃ کو ان پر خرچ کرنے میں ایک مفلس کی امداد بھی ہے اور ایک عبادت کی ادائیگی میں تعاون بھی، اسی طرح حضرات فقہاء نے طالب علموں کو بھی اس میں شامل کیا ہے کہ وہ بھی ایک عباد کی ادائیگی کے لئے لیتے ہیں (روح بحوالہ ظہیریہ)

اور صاحب بدائع نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہو

اور اس کی ادائیگی میں مال کی ضرورت ہے تو وہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے بشرطیکہ اس کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے اس کام کو پورا کر سکے، جیسے دین کی تعلیم اور تبلیغ اور ان کے لئے نشر و شاعت، کہ اگر کوئی مستحق زکوٰۃ یہ کام کرنا چاہے تو اس کی امداد مال زکوٰۃ سے کر دی جائے مگر مال دار صاحب نصاب کو نہیں دیا جاسکتا۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان تمام صورتوں میں جو فی سبیل اللہ کی تفسیر میں مذکور ہیں فقر و حاجتمندی کی شرط ملحوظ ہے، غنی صاحب نصاب کا اس میں بھی حصہ نہیں، بجز اس کے کہ اس کا موجودہ مال اس ضرورت کو پورا نہ کر سکتا ہو، جو جہاد یا حج کے لئے درپیش ہے تو اگرچہ بقدر نصاب مال موجود ہونے کی وجہ سے اس کو غنی کہہ سکتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں اس کو غنی کہا گیا ہے، مگر وہ بھی اس اعتبار سے فقیر و حاجتمند ہی ہو گیا، کہ جس قدر مال جہاد یا حج کے لئے درکار ہے وہ اس کے پاس موجود نہیں، فتح القدیر میں شیخ ابن ہمام نے فرمایا کہ آیت صدقات میں جتنے مصرف ذکر کئے گئے ہیں ہر ایک کے الفاظ خود اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ فقیر و حاجتمندی کی بناء پر مستحق ہیں، لفظ فقیر مسکین میں تو یہ ظاہر ہی ہے، رقاب، غارمین، فی سبیل اللہ ابن سبیل کے الفاظ بھی اس طرف مشیر ہیں کہ ان کی حاجت روانی کی بناء پر ان کو دیا جاتا ہے، البتہ عاملین کو بطور معاوضہ خدمت دیا جاتا ہے، اسی لئے اس میں غنی و فقیر برا بر ہیں، جیسے غارمین کے مصرف میں بیان کیا جا چکا ہے کہ جس شخص کے ذمہ دس ہزار روپیہ قرض ہے اور پانچ ہزار روپیہ اس کے پاس موجود ہے تو اس کو بقدر پانچ ہزار کے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، کیونکہ جو مال اس کے پاس موجود ہے وہ قرض کی وجہ سے نہ ہونے کے حکم میں ہے۔

تنبیہ

لفظ فی سبیل اللہ کے لفظی معنی بہت عام ہیں، جو جو کام اللہ کی رضا جوئی کے لئے کئے جائیں وہ سب اس عام مفہوم کے اعتبار سے فی سبیل اللہ میں داخل ہیں، جو لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر و بیان اور انعمہ تفسیر کے ارشاد سے قطع نظر محض لفظی ترجمہ کے ذریعہ قرآن سمجھنا چاہتے ہیں یہاں ان کو یہ مغالطہ لگتا ہو کہ لفظ فی سبیل اللہ دیکھ کر زکوٰۃ کے مصارف میں ان تمام کاموں کو داخل کر دیا جو کسی حیثیت سے نیکی یا عبادت ہیں، مساجد، مدارس، شفا خانوں، مسافر خانوں وغیرہ کی تعمیر، کنویں اور پل اور سڑکیں بنانا، اور ان رفاہی اداروں کے ملازمین کی تنخواہیں اور تمام دفتری ضروریات ان سب کو انھوں نے فی سبیل اللہ میں داخل کر کے مصرف زکوٰۃ قرار دیدیا، جو مراسر غلط ہے، اور اجماع امت کے خلاف ہے، صحابہ کرام جنھوں نے قرآن کو براہ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا اور سمجھا ہے ان کی اور انعمہ تابعین کی جتنی تفسیریں

اس لفظ کے متعلق منقول ہیں ان میں اس لفظ کو حجاج اور مجاہدین کے لئے مخصوص قرار دیا گیا ہے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اپنے ایک اونٹ کو فی سبیل اللہ وقف کر دیا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا کہ اس اونٹ کو حجاج کے سفر میں استعمال کرو (مبسوط سرخسی، ص ۱۰ ج ۲)

امام ابن جریر، ابن کثیر، قرآن کی تفسیر روایات حدیث ہی سے کرنے کے پابند ہیں، ان سب نے لفظ فی سبیل اللہ کو ایسے مجاہدین اور حجاج کے لئے مخصوص کیا ہے جن کے پاس جہاد یا حج کا سامان نہ ہو، اور جن حضرات فقہاء نے طالب علموں یا دوسرے نیک کام کرنے والوں کو اس میں شامل کیا ہے تو اس شرط کے ساتھ کیا ہے کہ وہ فقیر و محتاج تہند ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ فقیر و محتاج تہند تو خود ہی مصارف زکوٰۃ میں سب سے پہلا مصرف ہیں، ان کو فی سبیل اللہ کے مفہوم میں شامل نہ کیا جاتا جب بھی وہ مستحق زکوٰۃ تھے، لیکن ائمہ اربعہ اور فقہاء ائمہ میں سے یہ کسی نے نہیں کہا کہ رفاہ عام کے اداروں اور مساجد و مدارس کی تعمیر اور ان کی جملہ ضروریات مصارف زکوٰۃ میں داخل ہیں، بلکہ اس کے خلاف اس کی تصریحات فرمائی ہیں کہ مال زکوٰۃ ان چیزوں میں صرف کرنا جائز نہیں، فقہاء حنفیہ میں سے شمس الآئمہ سرخسی نے مبسوط اور شرح سیر میں اور فقہاء شافعیہ میں ابو عبید نے کتاب الاموال میں اور فقہاء مالکیہ میں سے درودیر شرح مختصر خلیل میں اور فقہاء حنابلہ میں سے مؤلف نے مغنی میں اس کو پوری تفصیل سے لکھا ہے۔ ائمہ تفسیر اور فقہاء ائمہ کی مذکورہ تصریحات کے علاوہ اگر ایک بات پر غور کر لیا جائے تو اس مسئلہ کے سمجھنے کے لئے بالکل کافی ہے وہ یہ کہ اگر زکوٰۃ کے مسئلہ میں اتنا عموم ہوتا کہ تمام طاعات و عبادات اور ہر قسم کی نیکی پر خرچ کرنا اس میں داخل ہو تو پھر قرآن میں ان آٹھ مصرفوں کا بیان (معاذ اللہ) بالکل فضول ہو جاتا ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جو پہلے اسی سلسلہ میں بیان ہو چکا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مصارف صدقات متعین کرنے کا کام نبی کو بھی سپرد نہیں کیا، بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصرف متعین فرمادیئے۔

تو اگر فی سبیل اللہ کے مفہوم میں تمام طاعات اور نیکیاں داخل ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں زکوٰۃ کا مال خرچ کیا جاسکتا ہے تو معاذ اللہ یہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بالکل غلط ٹھہرتا ہے، معلوم ہوا کہ فی سبیل اللہ کے لغوی ترجمہ سے جو ناواقف کو عموم سمجھ میں آتا ہے وہ

اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے، بلکہ مراد وہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہ و تابعین کی تصریحات سے ثابت ہے۔

آٹھواں مصروف ابن سبیل ہے، سبیل کے معنی راستہ، اور ابن کا لفظ اصل میں تو بیٹے کے لئے بولا جاتا ہے، لیکن عربی محاورات میں ابن اور اب اور اخ وغیرہ کے الفاظ ان چیزوں کے لئے بھی بولے جاتے ہیں جن کا ہر تعلق کسی سے ہو، اسی محاورہ کے مطابق ابن سبیل، راہ گیر و مسافر کو کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کا ہر تعلق راستہ قطع کرنے اور منزل مقصود پر پہنچنے سے ہے، اور مصارف زکوٰۃ میں اس سے مراد وہ مسافر ہے جس کے پاس سفر میں بقدر ضرورت مال نہ ہو، اگرچہ اس کے وطن میں اس کے پاس کتنا ہی مال ہو، ایسے مسافر کو مال زکوٰۃ دیا جاسکتا ہے جس سے وہ اپنے سفر کی ضروریات پوری کر لے، اور وطن واپس جاسکے۔

یہاں تک ان آٹھ مصارف کا بیان پورا ہو گیا جو آیت مذکورہ میں صدقات زکوٰۃ کے لئے بیان فرمائے گئے ہیں، اب کچھ ایسے مسائل بیان کئے جاتے ہیں جن کا تعلق ان تمام مصارف سے یکساں ہے۔

مسئلہ تملیک | جمہور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ زکوٰۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے یہ شرط ہے کہ ان مصارف میں سے کسی متحی کو مال زکوٰۃ پر مالکانہ قبضہ دیدیا جائے، بغیر مالکانہ قبضہ دیئے اگر کوئی مال اپنی لوگوں کے فائدے کے لئے خرچ کر دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ رقم زکوٰۃ کو مساجد یا مدارس یا شفاخانے، یتیم خانے کی تعمیر میں یا ان کی دوسری ضروریات میں صرف کرنا جائز نہیں، اگرچہ ان تمام چیزوں سے فائدہ ان فقراء اور دوسرے حضرات کو پہنچتا ہے جو مصروف زکوٰۃ ہیں، مگر ان کا مالکانہ قبضہ ان چیزوں پر نہ ہونے کے سبب زکوٰۃ اس سے ادا نہیں ہوتی۔

البتہ یتیم خانوں میں اگر یتیموں کا کھانا کپڑا وغیرہ مالکانہ حیثیت سے دیا جاتا ہے تو صرف اس خرچ کی حد تک رقم زکوٰۃ صرف ہو سکتی ہے، اسی طرح شفاخانوں میں جو دوا حاجت مند غریب کو مالکانہ حیثیت سے دیدی جائے اس کی قیمت رقم زکوٰۃ میں محسوب ہو سکتی ہے، اسی طرح فقہاء امت کی تصریحات ہیں کہ لاوارث میت کا کفن رقم زکوٰۃ سے نہیں لگایا جاسکتا، کیونکہ میت میں مالک ہونے کی صلاحیت نہیں، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ رقم زکوٰۃ کسی غریب متحی کو دیدی جائے اور وہ اپنی خوشی سے اس رقم کو لاوارث میت

چیز کا مالک بنادیا جائے۔

اور علاوہ زکوٰۃ و صدقات کے بھی لفظ ایتار قرآن کریم میں مالک بنا دینے ہی کے لئے استعمال ہوا ہے، مثلاً اَلْاَوْثَرُ الْاِنْسَاءِ صَدَقَتْھُنَّ، یعنی دیر و عورتوں کو ان کے ہر ظاہر سے ہر کی ادائیگی جب ہی تسلیم ہوتی ہے جب رقیہ ہر پر عورت کو مالکانہ قبضہ دیدے۔ دوسرے یہ کہ قرآن کریم میں زکوٰۃ کو صدقہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، اِنَّمَا الصَّدَقَتُ لِلْفُقَرَاءِ اور صدقہ کے معنی حقیقی یہی ہیں کہ کسی فقیر حاجت مند کو اس کا مالک بنادیا جائے۔ کسی کو کھانا کھلا دینا یا رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کر دینا حقیقی معنی کے اعتبار سے صدقہ نہیں کہلاتا، شیخ ابن ہمام نے فتح القدیر میں فرمایا کہ حقیقت صدقہ کی بھی یہی ہے کہ کسی فقیر کو اس مال کا مالک بنادیا جائے اسی طرح امام جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ لفظ صدقہ تسلیم کا نام ہے (جصاص ص ۱۵۲ ج ۱۲)

ادائے زکوٰۃ کے متعلق مسئلہ صحیح حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بعض اہم مسائل معاذہ کو صدقات وصول کرنے کے بارے میں یہ ہدایت دی تھی کہ خُذْھَا مِنْ اَغْنِیَا یَھِمْ وَرُدَّھَا فِیْ فُقَرَا یَھِمْ، یعنی صدقات مسلمانوں کے اغنیاء سے لیکر انہی کے فقراء میں صرف کر دو، اس کی بناء پر فقہاء رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ بلا ضرورت ایک شہر یا بستی کی زکوٰۃ دوسرے شہر یا بستی میں نہ بھیجی جائے، بلکہ اسی شہر اور بستی کے فقراء اس کے زیادہ حق دار ہیں، البتہ اگر کسی شخص کے عزیز قریب غریب ہیں اور وہ کسی دوسرے شہر میں ہیں تو اپنی زکوٰۃ ان کو بھیج سکتا ہے، کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ نے اس میں دوسرے اجر و ثواب کی بشارت دی ہے۔

اسی طرح اگر کسی دوسری بستی کے لوگوں کا فقر و فاقہ اور اپنے شہر سے زیادہ ضرورت معلوم ہو تو بھی وہاں بھیجا جاسکتا ہے، کیونکہ مقصد صدقات دینے کا فقراء کی حاجت کو رفع کرنا ہے، اسی وجہ سے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے صدقات میں اکثر کپڑے لیا کرتے تھے تاکہ فقراء مہاجرین کے لئے مدینہ طیبہ بھیج دیں (قرطبی بحوالہ دارقطنی)

اگر ایک شخص خود کسی شہر میں رہتا ہے، مگر اس کا مال دوسرے شہر میں ہے تو جس شہر میں خود رہتا ہے اس کا اعتبار ہوگا کیونکہ ادائے زکوٰۃ کا مخاطب یہی شخص ہے (قرطبی) مسئلہ:۔ جس مال کی زکوٰۃ واجب ہو اس کی ادائیگی کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ اسی مال کا چالیسواں حصہ نکال کر مستحقین کو دیدے، جیسے تجارتی کپڑا، برتن، فرنیچر وغیرہ اور یہ بھی ہے کہ مقدار زکوٰۃ مال کی قیمت نکال کر وہ مستحقین میں تقسیم کرے، احادیث صحیحہ

سے ایسا کرنا ثابت ہے (قرطبی) اور بعض ائمہ فقہاء نے فرمایا کہ اس زمانہ میں نقد قیمت ہی دینا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ فقراء کی ضرورتیں مختلف اور کثیر ہیں، نقد پیسوں کو کسی بھی ضرورت کے کام میں لایا جاسکتا ہے۔

مَسْئَلَةٌ: اگر اپنے عزیز غریب لوگ مستحق زکوٰۃ ہوں تو ان کو زکوٰۃ و صدقات دینا زیادہ بہتر اور دوہرا ثواب ہے، ایک ثواب صدقہ کا دوسرا صلہ رحمی کا، اس میں یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو یہ جتلا کر دے کہ صدقہ یا زکوٰۃ دے رہا ہوں، کسی تحفہ یا ہدیہ کے عنوان سے بھی دیا جاسکتا ہے، تاکہ لینے والے شریف آدمی کو اپنی خفت محسوس نہ ہو۔

مَسْئَلَةٌ: جو شخص اپنے آپ کو اپنے قول یا عمل سے مستحق زکوٰۃ حاجت مند ظاہر کر دے اور صدقات وغیرہ کا سوال کرے، کیا دینے والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے حقیقی حالات کی تحقیق کریں، اور بغیر اس کے صدقہ نہ دیں، اس کے متعلق روایات حدیث اور اقوال فقہاء یہ ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے ظاہری حال سے اگر یہ گمان غالب ہو کہ یہ شخص حقیقت میں فقیر حاجت مند ہے تو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ لوگ نہایت مشکستہ حال آئے، آپ نے ان کے لئے لوگوں سے صدقات جمع کرنے کے لئے فرمایا کافی مقدار جمع ہو گئی تو وہ ان کو دیدی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ان لوگوں کے اندرونی حالات کی تحقیق فرماتے (قرطبی)۔

البتہ قرطبی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ مصارف صدقات میں سے ایک مریون بھی ہے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرے ذمہ اتنا قرض ہے اس کی ادائیگی کے لئے مجھے زکوٰۃ کی رقم دیدی جائے تو اس قرض کا ثبوت اس سے طلب کرنا چاہئے (قرطبی) اور ظاہر یہ ہے کہ غارم، فی سبیل اللہ، ابن سبیل وغیرہ میں بھی ایسی تحقیق کر لینا دشوار نہیں، ان مصارف میں حسب موقع تحقیق کر لینا چاہئے۔

مَسْئَلَةٌ: مال زکوٰۃ اپنے عزیز رشتہ داروں کو دینا زیادہ ثواب ہے، مگر میاں بی بی اور والدین و اولاد آپس میں ایک دوسرے کو نہیں دے سکتے، وجہ یہ ہے کہ ان کو دینا ایک حیثیت سے اپنی ہی پاس رکھنا ہے، کیونکہ ان لوگوں کے مصارف عموماً مشترک ہوتے ہیں شوہر نے اگر بیوی کو یا بیوی نے شوہر کو اپنی زکوٰۃ دیدی، تو درحقیقت وہ اپنے ہی استعمال میں رہی، اسی طرح والدین اور اولاد کا معاملہ ہے، اولاد کی اولاد اور دادا پر دادا کا بھی یہی حکم ہے کہ ان کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔

مَسْئَلَةٌ: اگر کسی شخص نے کسی شخص کو اپنے گمان کے مطابق مستحق اور مصرفِ زکوٰۃ سمجھ کر زکوٰۃ دیدی، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اسی کا غلام یا کافر تھا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، دوبارہ دینی جائے گی۔ کیونکہ غلام کی ملکیت تو آقا ہی کی ملکیت ہوتی ہے، وہ اس کی ملک سے نکلا ہی نہیں، اس لئے زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، اور کافر زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اگر بعد میں یہ ثابت ہو کہ جس کو زکوٰۃ دی گئی ہے وہ مال دار یا سید ہاشمی یا اپنا باپ یا بیٹا یا بیوی یا شوہر ہے تو زکوٰۃ کے اعادہ کی ضرورت نہیں، کیونکہ رقم زکوٰۃ اس کی ملک سے نکل کر محلِ ثواب میں پہنچ چکی ہے، اور تعینِ مصرف میں جو غلطی کسی اندھیرے یا مغالطہ کی وجہ سے ہو گئی وہ معاف ہے (درمختار) آیت صدقات کی تفسیر اور اس کے متعلقہ مسائل کی تفصیل بقدر ضرورت پوری ہو گئی۔

وَمِنْهُمْ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ قُلْ

اور بعضے ان میں بدگوئی کرتے ہیں نبیؐ کی اور کہتے ہیں یہ شخص تو کان ہے تو کہہ

أُذُنٌ خَيْرٌ لَّكُمْ يَوْمَ مَنَاسِكَتِمْ بِاللَّهِ وَيَوْمَ مَنَاسِكَتِمْ

کان ہر تمھارے بھلے کے واسطے یقین رکھتا ہے اللہ پر اور یقین کرتا ہر مسلمانوں کی بات کا اور رحمت پر

لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ

ایمان والوں کے حق میں تم میں سے اور جو لوگ بدگوئی کرتے ہیں اللہ کے رسول کی ان کے لئے

عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۶۱ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيَرْضَوْكُمْ وَاللَّهُ

عذاب ہے دردناک، قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی تمھارے آگے تاکہ تم کو راضی کریں، اور اللہ کو

وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْهُ إِنَّ كَانُوا مَوْمِنِينَ ۝۶۲ أَلَمْ

اور اس کے رسول کو بہت ضرور ہو راضی کرنا اگر وہ ایمان رکھتے ہیں، کیا وہ

يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحَادِثُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ

جان نہیں چکے کہ جو کوئی مقابلہ کرے اللہ سے اور اس کے رسول سے تو اس کی واسطے ہو دوزخ

خَالِدًا فِيهَا ذَلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ۝۶۳ يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ

کی آگ سر رہے اس میں، یہی ہے بڑی رسوائی، ڈرا کرتے ہیں منافق

أَنْ تَنْزِلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ قُلِ اسْتَغْفِرُوا

اس بات سے کہ نازل ہو مسلمانوں پر ایسی سورت کہ بتا دے ان کو جو ان کے دل میں ہے، تو کہہ دیجئے کہ تم گناہوں سے

إِنَّ اللَّهَ مَخْرُجٌ مَّا تَحْذَرُونَ ﴿٦٧﴾ وَلَئِنْ سَأَلْتُمْ لَيَقُولُنَّ

اللہ مہول کر رہے گا اس چیز کو جس کا تم کو ڈر ہے، اور اگر تو ان سے پوچھو تو وہ کہیں گے

إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ

ہم تو بات چیت کرتے تھے اور دل لگی، تو کہہ کیا اللہ سے اور اس کے حکموں سے اور اس کے رسول سے

تَسْتَهْزِءُونَ ﴿٦٨﴾ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ

تم ٹھٹھے کرتے تھے، بہانے مت بناؤ تم تو کافر ہو گئے اظہار ایمان کے پیچھے،

إِنْ نَعَفَ عَنْ طَائِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَةً أُخْرَىٰ إِنَّهُمْ

اگر ہم معاف کر دیں گے تم میں سے بعضوں کو تو ابلتہ عذاب بھی دیں گے بعضوں کو اس

كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿٦٩﴾

سبب سے کہ وہ گنہگار تھے۔

خلاصہ تفسیر

اور ان (منافقین) میں بعض ایسے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایذا نہیں پہنچاتے ہیں نہ اپنی آپ کی شان میں ایسی باتیں کہتے ہیں کہ سن کر آپ کو ایذا ہو (اور جب کوئی روکتا ہے تو) کہتے ہیں کہ آپ ہر بات کان دے کر سن لیتے ہیں آپ کو جھوٹ بول کر دھوکہ دیدینا آسان ہے، اس لڑکچہ فکر نہیں (آپ (جواب میں) فرمادیتے کہ (تم کو خود دھوکہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی بات کو سن لینا ڈو طور پر ہے، ایک تصدیق کے طور پر کہ دل سے بھی اس کو صحیح سمجھیں، دوسرا خوش خلقی اور کریم النفسی کے طور پر کہ باوجود یہ جان لینے کے کہ یہ بات محض غلط ہر شرافت نفس اور حسن خلق کی بناء پر اس کو ٹال دیں، اور کہنے والے پر دار و گیر یا اس کی صریح تکذیب نہ کریں سو) وہ نبی کان دے کر تو وہی بات سنتے ہیں جو تمھارے حق میں خیر (ہی) ہے، (جس کا حاصل اور نتیجہ یہ ہو) کہ وہ اللہ کی باتیں وحی سے معلوم کر کے ان پر ایمان لاتے ہیں (جن کی تصدیق کا خیر ہونا تمام عالم کے لئے ظاہر ہے، کیونکہ تعلیم اور عدل اسی

تصدیق پر موقوف ہے) اور مؤمنین (مخلصین کی باتوں) کا (جو بحیثیت ایمان و اخلاص ہوں) یقین کرتے ہیں اس کا خیر ہونا بھی ظاہر ہے کہ عدل عام موقوف ہوا حوال کی صحیح اطلاع پر اور اس کا ذریعہ ہی مؤمنین مخلصین ہیں، غرض کان دے کر اور سچا سمجھ کر تو صرف سچے اور مخلصین کی باتیں سنتے ہیں) اور باقی تمھاری شرارت آمیز باتیں جو سن لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کے حال پر مہربانی فرماتے ہیں جو تم میں ایمان کا اظہار کرتے ہیں رگ و دل میں ایمان نہ ہو، پس اس مہربانی اور خوش اخلاقی کی وجہ سے تمھاری باتیں سن لیتے ہیں اور باوجود اس کی حقیقت سمجھ جانے کے درگزر اور خاموشی برتتے ہیں، پس ان باتوں کا سننا دوسرے طور کا ہے، تم نے اپنی حماقت سے اس کو بھی اذل طور پر محمول کر لیا، خلاصہ یہ کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ حقیقت کو حضرت نہیں سمجھتے اور واقع میں حقیقت کو تم ہی نہیں سمجھتے) اور جو لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایذا میں پہنچاتے ہیں (خواہ ان باتوں سے جن کے کہنے کے بعد اذن کہا تھا یا خود اسی ہو اذن کے کہنے سے کیونکہ ان کا آپ کو اذن کہنا آپ کی تنقیص کے لئے تھا کہ معاذ اللہ آپ کو سمجھ نہیں جو کچھ سن لیتے ہیں اسکو مان لیتے ہیں) ان لوگوں کے لئے دردناک سزا ہوگی، یہ لوگ تمھارے (مسلمانوں کے) سامنے (جھوٹ) قسمیں کھاتے ہیں (کہ ہم نے فلاں بات نہیں کہی) یا ہم غزوہ میں فلاں عذر سے نہ جاسکے، تاکہ تم کو راضی کر لیں (جس سے ان کا جان و مال محفوظ رہے) حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ سچے مسلمان ہیں تو اس کو راضی کریں (جو کہ موقوف ہے اخلاص اور ایمان پر) کیا ان کو خبر نہیں کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا (جیسا یہ لوگ کر رہے ہیں) تو یہ بات طے ہو چکی ہے کہ ایسے شخص کو دوزخ کی آگ اس طور پر نصیب ہوگی کہ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا، (اور) یہ بڑی رسوائی (کی بات) ہے، منافق لوگ (طبعاً) اس سے اندیشہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں پر (بذریعہ وحی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی ایسی سورت (مثلاً یا آیت) نازل نہ ہو جو اذی ہو ان کو ان منافقین کے مافی الضمیر پر اطلاع دیدے (یعنی انھوں نے جو استہزاء کی باتیں خفیہ کی ہیں کہ مسلمانوں کے اعتبار سے وہ مثل ان اسرار کے ہیں جو دلوں میں پوشیدہ ہیں ان کی خبر نہ ہو جو اذی ہو، آپ فرمادے) کہ اچھا تم استہزاء کرتے رہو اس میں ان کے استہزاء پر مطلع ہو جائے کو جتلا دیا، چنانچہ آگے خود ارشاد ہو کہ) بیشک اللہ تعالیٰ اس چیز کو ظاہر کر کے رہے گا جس کے (اظہار) سے تم اندیشہ کرتے تھے (چنانچہ استھزؤ و اس ظاہر کر دیا کہ تم استہزاء کر رہے تھے) اور (ظاہر ہو جانے کے بعد) اگر آپ ان سے (اس استہزاء کی وجہ) پوچھیں تو کہہ دیں گے کہ ہم تو محض ہنسی اور خوش طبعی کر رہے تھے (اس کلام کے حقیقی معنی مقصود نہ تھے، محض جی خوش کرنے کو جس سے سفر آسانی سے قطع ہو ایسی باتیں زبانی کر رہے تھے) آپ (ان سے)

کہہ دیجئے کہ کیا اللہ کے ساتھ اور اس کی آیتوں کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ تم ہنسی کرتے تھو (یعنی خواہ غرض کچھ بھی ہو مگر یہ تو دیکھو کہ تم استہزاء کس کا کر رہے ہو جن کے ساتھ استہزاء کسی غرض سے بھی درست نہیں) تم اب دیہ بیہودہ (عذر مت کرو مطلب یہ ہو کہ عذر مقبول نہیں) اور اس عذر سے استہزاء جائز نہیں ہو جاتا) تم تو اپنے کو مؤمن کہہ کر کفر کرنے لگے دیکھو کہ دین کے ساتھ استہزاء مطلقاً کفر ہے، گو دل میں تو پہلے بھی ایمان نہ تھا، البتہ اگر کوئی دل سے توبہ کر لے اور مؤمن مخلص بن جائے تو البتہ کفر اور عذاب کفر سے چھوٹ جائے، لیکن اس کی بھی سب کو توفیق نہ ہوگی، ہاں بعض البتہ مسلمان ہو جاویں گے، اور وہ معاف کر دیئے جائیں گے، پس حاصل یہ ٹھہرا کہ اگر ہم تم میں سے بعض کو چھوڑ بھی دیں (اس لئے کہ وہ مسلمان ہو گئے) تو ہم بعض کو (ضروری) سزا دیں گے بسبب اس کے کہ وہ (علم ازلی میں) مجرم تھے (یعنی وہ مسلمان نہیں ہوئے)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں بھی سابقہ آیات کی طرح منافقین کے بیہودہ اعتراضات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی اور پھر جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے ایمان کا یقین دلانے کے واقعات اور ان پر تنبیہ ہے۔

پہلی آیت میں مذکور ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بطور استہزاء یہ کہتے ہیں کہ ”وہ تو بس کان ہیں“ یعنی جو کچھ کسی سے سُن لیتے ہیں اسی پر یقین کر لیتے ہیں، اس لئے ہمیں کچھ فکر نہیں، اگر ہماری سازش کھل بھی گئی تو ہم پھر قسم کھا کر آپ کو اپنی برابرت کا یقین دلادینگے جس کے جواب میں حق تعالیٰ نے ان کی حماقت کو واضح فرما دیا، کہ وہ جو منافقین اور مخالفین کی غلط باتوں کو سُن کر اپنے مکارم اخلاق کی بناء پر خاموش ہو رہتے ہیں اس سے یہ نہ سمجھو کہ آپ کو حقیقت حال کی سمجھ نہیں، صرف تمھارے کہنے پر یقین کرتے ہیں، بلکہ وہ سب کی پوری پوری حقیقت سے باخبر ہیں، تمھاری غلط باتیں سنکر وہ تمھاری سچائی کے قائل نہیں ہو جاتے، البتہ اپنی شرافت نفس اور کرم کی بناء پر تمھارے مُنہ پر تمھاری تردید نہیں کرتے۔

إِنَّ اللَّهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْضَنُ رُؤُوسَہُمْ، اس آیت میں یہ خبر دی گئی ہے کہ حق تعالیٰ منافقین کی خفیہ سازشوں اور شرارتوں کو ظاہر فرما دیں گے، جس کا ایک واقعہ غزوہ تبوک سے واپسی کا ہے جب کہ کچھ منافقین نے آپ کے قتل کی سازش کی تھی، حق تعالیٰ نے آپ کو اس پر بذریعہ جبریل مطلع کر کے اس راستہ سے ہٹا دیا جہاں یہ منافقین اس کام کے لئے جمع ہوئے تھے۔
(منظری عن ابیخوی)

اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے شر منافقین کے نام مع ان کی ولدیت اور پورے نشان پتے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلادیتے تھے، مگر رحمۃ اللعالمین نے ان کو لوگوں پر ظاہر نہیں فرمایا (منظری)

وَقَالُوا

الْمُفْسِقُونَ وَالْمُفْسِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ

منافق مرد اور منافق عورتیں سب کی ایک چال ہے سکھاتیں بات بُری،

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ طَسُوا اللّٰهَ

اور پھڑائیں بات بھلی اور بند رکھیں اپنی مٹھی، بھول گئے اللہ کو،

فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُفْسِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٦٤﴾ وَعَدَ اللّٰهُ

سو وہ بھول گیا اُن کو تحقیق منافق وہی ہیں ناسرمان ، وعدہ دیا ہے اللہ نے

الْمُفْسِقِينَ وَالْمُفْسِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ط

منافق مرد اور منافق عورتوں کو اور کافروں کو دوزخ کی آگ کا پڑی ہیں گے اسمیں

هِيَ حَسْبُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيمٌ ﴿٦٥﴾

وہی بس ہر ان کو اور اللہ تعالیٰ نے ان کو پھٹکار دیا، اور ان کے لئے عذاب ہے برقرار رہنے والا،

كَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَكَثْرًا مَّاوَالًا

جس طرح تم سے اگلے لوگ زیادہ تھے تم سے زور میں اور زیادہ رکھتے تھے مال

وَأَوْلَادًا فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ

اور اولاد پھر فائدہ اٹھا گئے اپنے حصّہ سے پھر فائدہ اٹھایا تم نے اپنے حصّہ سے

كَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُصُّصْتُمْ

جیسے فائدہ اٹھا گئے تم سے اگلے اپنے حصّہ سے اور تم بھی چلتے ہو

كَالَّذِينَ خَاصُّوْا وَلِيَّكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا

انہی کی سی چال ، وہ لوگ مٹ گئے اُن کے عمل دنیا میں

وَالْآخِرَةُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَيْرُونَ ﴿٦٩﴾ أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ

اور آخرت میں اور وہی لوگ بڑے نقصان میں ، کیا پہنچی نہیں ان کو خبر

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَثَمُودٌ وَقَوْمُ إِبْرَاهِيمَ

ان لوگوں کی جو اُن سے پہلے تھے قوم نوح کی اور عاد کی اور ثمود کی ، اور قوم ابراہیم کی

وَأَصْحَابُ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَتَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنَاتِ ۖ

اور مدین والوں کی اور ان بستیوں کی خبر جو اُلٹ دی گئیں تھیں پہنچے انکے پاس انکے رسول صاف حکم لے کر ،

فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٧٠﴾

سو اللہ تو ایسا نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرتا ، لیکن وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرتے تھے ۔

خلاصہ تفسیر

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں کہ بُری بات کی (یعنی کفر و مخالفت اسلام کی) تعلیم دیتے ہیں اور اچھی بات سے (یعنی ایمان اور اتباع نبوی سے) منع کرتے ہیں اور (خدا کی راہ میں حشر چ کرنے سے) اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں انھوں نے خدا کا خیال نہ کیا ، (یعنی اطاعت نہ کی) پس خدا نے ان کا خیال نہ کیا (یعنی ان پر رحمت خاصہ نہ کی) بلاشبہ یہ منافق بڑے ہی سرکش ہیں ، اللہ تعالیٰ نے منافق مردوں عورتوں اور (علانیہ) کفر کرنے والوں سے دوزخ کی آگ کا عہد کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے وہ ان کے لئے (سزائے) کافی ہو اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے دُور کر دے گا اور ان کو (حسب وعدہ مذکور) عذاب دائمی ہو گا (لے منافقو!) تمہاری حالت (کفر اور استحقاق جزائے کفر میں) ان لوگوں کی سی ہے جو تم سے پہلے (زمانہ میں) ہو چکے ہیں جو شدتِ قوت میں اور کثرتِ اولا د و اموال میں تم سے بھی زیادہ تھے تو انھوں نے اپنے (دنوی) حصے سے خوب فائدہ حاصل کیا سو تم نے بھی اپنے (دنوی) حصے سے خوب فائدہ حاصل کیا جیسا تم سے پہلے لوگوں نے اپنے (دنوی) حصے سے فائدہ حاصل کیا تھا ، اور تم بھی (بری باتوں میں) ایسے گھسے جیسے وہ لوگ (بری باتوں میں) گھسے تھے ، ان لوگوں کے اعمال (حسنہ دنیا اور آخرت (سب) میں ضائع ہو گئے کہ دنیا میں ان اعمال پر بشارتِ ثواب نہیں ، اور آخرت میں ثواب نہیں) اور اسی جبط فی الدنیا والآخرۃ کی وجہ سے) وہ لوگ بڑے نقصان میں ہیں (کہ دارین میں مسرت اور رحمت سے محروم ہیں ، پس اسی طرح تم بھی ان کی طرح کفر کرتے ہو تو انہی کی طرح خائب و خاسر ہو گے ،

اور جیسا ان کے اموال و اولاد ان کے کام نہ آئے تم تو ان چیزوں میں ان سے کم ہو، تمہارے بدرجہ ادنیٰ کام نہ آویں گے، یہ تو ضررِ آخرت کی وعید ہوئی، آگے احتمالِ ضررِ دنیا کے ذکر سے متنبہ فرماتے ہیں کہ) کیا ان لوگوں کو ان (کے عذاب و ہلاک) کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے ہوئے ہیں جیسے قوم نوح اور عاد اور ثمود اور قوم ابراہیم اور اہل مدین اور اُکٹی ہوئی بستیاں (یعنی قریٰ قوم لوط) کہ ان کے پاس ان کے پیغمبر صاف نشانیاں (حق کی) لے کر آئے (لیکن نہ ماننے سے برباد ہوئے) سو اس بربادی میں اللہ تعالیٰ نے تو ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے (اسی طرح ان منافقین کو بھی ڈرنا چاہئے) :

معارف و مسائل

مذکورہ صدر آیات میں سے پہلی آیت میں منافقین کا ایک حال یہ بتلایا کہ وہ اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں، یَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ، تفسیر قرطبی میں ہے کہ ہاتھ بند رکھنے سے مراد ترکِ جہاد اور حقوقِ واجبہ کا ادا نہ کرنا ہے، نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ، اس کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے ان کو بھلا دیا، اللہ تعالیٰ تو نسیان اور بھول سے پاک ہیں، مراد اس جگہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کے احکام کو اس طرح چھوڑ دیا جیسے بھول گئے ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے بھی ثوابِ آخرت کے معاملہ میں انکو ایسا ہی کر چھوڑا کہ نیکی اور ثواب میں کہیں ان کا ناک نہ رہا۔

آیت (۶۹) کَاذِبِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ میں ایک تفسیر یہ ہے کہ یہ خطاب منافقین کو ہے جیسا کہ خلا تفسیر میں آچکا، اور دوسری تفسیر یہ کہ خطاب مسلمانوں کو ہے یعنی رانم کاذبین من قبلکم، مراد یہ ہے کہ تم لوگ بھی اپنے سے پہلے لوگوں کی طرح ہو جس طرح وہ لوگ دنیا کی لذائذ میں نہم ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھے اور طرح طرح کے معاصی اور بد اخلاقیوں میں مبتلا ہو گئے تم بھی ایسے ہی لوگ ہوں گے۔

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہؓ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم بھی وہی طریقے اختیار کر دو گے جو تم سے پہلی امتیں کر چکی ہیں، ہاتھ در ہاتھ اور بالشت در بالشت یعنی جو بہوان کی نقل اتار دو گے، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی گاوہ کے بل میں گھسا ہے تو تم بھی گھسو گے، حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ روایت نقل کر کے فرمایا کہ اس حدیث کی تصدیق کے لئے تمہارا جی چاہے تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو، کَاذِبِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ سن کر فرمایا: مَا أَشْبَهَ النَّبِيَّةَ بِالنَّبَا رِحَةٍ، یعنی آج کی رات گذشتہ شب سے کیسی ملتی جلتی اور مشابہہ ہے، یہ بنی اسرائیل ہیں ہمیں ان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے (قرطبی)

حدیث کا مقصد واضح ہے کہ آخر زمانے میں مسلمان بھی یہود و نصاریٰ کے طریقوں پر چلیں گے اور منافقین کا عذاب بیان کرنے کے بعد اس کا بیان کرنا اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے طریقوں کا اتباع کرنے والے مسلمان وہی ہوں گے جن کے دلوں میں مکمل ایمان نہیں، اتفاق کے جراثیم ان میں پائے جاتے ہیں، صلحاء اُمت کو اس سے بچنے اور بچانے کی ہدایت اس آیت میں دی گئی ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ

اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں سکھاتے ہیں

بِالسَّعْيِ وَفَيُؤْمِنُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ

نیک بات اور منع کرتے ہیں بُری بات سے اور قائم رکھتے ہیں نماز اور دیتے ہیں

الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ

زکوٰۃ اور حکم پر چلتے ہیں اللہ کے اور اس کے رسول کے وہی لوگ ہیں جن پر رحم کرے گا اللہ

إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝۱۰ وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ

بیشک اللہ زبردست ہر حکمت والا، وعدہ دیا ہے اللہ نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو

جَنَّتِ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسْكِنٌ

باغوں کا کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں رہا کریں انہی میں اور ستھرے

طَيِّبَةً فِي جَنَّتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ذَٰلِكَ

مکانوں کا رہنے کے باغوں میں اور رضا مندی اللہ کی ان سب بڑی ہے یہی ہے

هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝۱۱ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ

بڑی کامیابی، اے نبیؐ لڑائی کر کافروں سے اور

الْمُنَافِقِينَ وَاعْلِظْ عَلَيْهِمْ وَمَا أَهْمُ جَهَنَّمَ ط

منافقوں سے اور تند خوئی کر ان پر اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور

يَسَّ الْمَصِيرُ ۝۱۲

وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے (دینی) رفیق ہیں، نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور بُری باتوں سے روکتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانتے ہیں ان لوگوں پر ضرور اللہ تعالیٰ رحمت کرے گا (جسکی تفصیل وَعَدَ اللّٰهُ مِیں عنقریب آتی ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ قادر (مطلق) ہے (جزائے تام دے سکتا ہے) حکمت والا ہے (جزائے مناسب دیتا ہے) اب اس رحمت کا بیان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور نفیس مکانوں کا وعدہ کر رکھا ہے، جو کہ ان ہمیشگی کے باغوں میں ہوں گے اور ان سب نعمتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی (جو اہل جنت سے ہمیشہ ہمیشہ رہے گی) ان سب نعمتوں سے بڑی چیز ہے یہ (جزائے مذکور) بڑی کامیابی ہے، اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کفار (سے بالسان) اور منافقین سے (باللسان) جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے (دنیا میں تو یہ اس کے مستحق ہیں) اور (آخرت میں) ان کا ٹھکانا دوزخ ہو اور وہ بُری جگہ ہے۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں منافقین کے حالات، ان کی سازشوں اور ایذاؤں اور ان کے عذاب کا بیان تھا، قرآنی اسلوب کے مطابق مناسب تھا کہ اس جگہ مؤمنین مخلصین کے حالات اور ان کے ثواب اور درجات کا بھی بیان آجائے، آیات مذکورہ میں اسی کا بیان ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ اس موقع پر منافقین اور مؤمنین مخلصین کے حالات کا تقابل ذکر کیا گیا، مگر ایک جگہ منافقین کے بارے میں تو یہ فرمایا کہ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ، اور اس کے مقابل مؤمنین کا ذکر آیا تو اس میں فرمایا بَعْضُهُمْ أَوْلٰی بِآءِ بَعْضٍ، اس میں اشارہ ہے کہ منافقین کے باہمی تعلقات اور روابط تو محض خاندانی اشتراک یا اغراض پر مبنی ہوتے ہیں نہ ان کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور نہ ان پر وہ ثمرات مرتب ہوتے ہیں جو دلی دوستی اور قلبی ہمدردی کے تعلق پر مرتب ہوتے ہیں، بخلاف مؤمنین کے کہ وہ ایک دوسرے کے مخلص دوست اور چکر ہمدرد ہوتے ہیں۔ (قرطبی)

اور چونکہ یہ دوستی اور ہمدردی خالص اللہ کے لئے ہوتی ہے وہ ظاہراً و باطناً اور حاکم

وغائب یکساں ہوتی ہے، اور ہمیشہ پائدار رہتی ہے، مؤمن مخلص کی یہی علامت ہے، ایمان اور عمل صالح کا خاصہ ہی یہ ہے کہ باہم دوستی اور محبت پیدا کرتا ہے، قرآن کریم کا ارشاد اسی کے متعلق ہے سَيَجْعَلُ اللَّهُ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا دُورًا، یعنی جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کے پابند ہوئے اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں قلبی اور گہری دوستی پیدا فرمادیتے ہیں، آجکل ہمارے ایمان و عمل صالح ہی کی کوتاہی ہے کہ مسلمانوں کے باہم تعلقات کبھی ایسے نظر نہیں آتے، بلکہ اغراض کے تابع ہیں۔

جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ، اس آیت میں کفار اور منافقین دونوں سے جہاد اور ان کے معاملہ میں شدت اختیار کرنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے، ظاہری کفار سے جہاد کا، حاملہ تو واضح ہے، لیکن منافقین سے جہاد کا مطلب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل سے یہ ثابت ہوا کہ ان کے ساتھ جہاد سے مراد زبانی جہاد ہے، کہ ان کو اسلام کی حقانیت سمجھنے کی طرف دعوت دیں تاکہ وہ اپنے دعوائی اسلام میں مخلص ہو جائیں (قرطبی و مظہری) وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ لفظ غلظ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ مخاطب جس طرز عمل کا سختی ہے اس میں کوئی رعایت اور نرمی نہ برتی جائے، یہ لفظ رافت کے مقابل استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی رحمت اور نرم دلی کے ہیں۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ اس جگہ غلظت استعمال کرنے سے عملی غلظت مراد ہے کہ ان پر احکام شرعیہ جاری کرنے میں کوئی رعایت اور نرمی نہ برتی جائے، زبان اور کلام میں غلظت اختیار کرنا مراد نہیں، کیونکہ وہ سنت انبیاء کے خلاف ہے، وہ کسی سے سخت کلامی اور سب و شتم نہیں کرتے، ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

| | |
|--|---|
| اِذَا زَنْتَ اُمَّةً اَحَدًا كُمْرًا فَلْيَجْلِدْهَا | ”اگر تمھاری کوئی کینیز زنا کی مرتکب ہو تو |
| الْحَدَّ وَلَا يُثْرِبْ عَلَيْهَا | اس کی سزا حد شرعی اس پر جاری کر دو مگر |
| (قرطبی) | زبانی علامت اور طعن نشین نہ کرو۔“ |

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال میں خود حق تعالیٰ نے فرمایا اِنْ كُنْتُمْ فُظًا عَلَيْهِ قَلْبًا لَا تَقْصُرُوا مِنْ حَوْلِهَا، یعنی اگر آپ سخت کلام سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل میں بھی کہیں یہ ثابت نہیں کہ کفار و منافقین سے گفتگو اور خطاب میں کبھی غلظت اختیار فرمائی ہو۔

تنبیہ | افسوس کہ خطاب اور کلام میں غلظت جس کو کفار کے تقابلاً میں بھی اسلام نے اختیار نہیں کیا آجکل کے مسلمان دوست مسلمانوں کے باہم میں بید تعزیر استعمال کرتے ہیں اور بہت سے لوگ تو اس کو دین کی خدمت سمجھ کر خوش ہوتے ہیں۔

يُحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةً الْكُفْرِ وَكَفَرُوا وَابْعَدُوا

قیس کھاتے ہیں اللہ کی کہ ہم نے نہیں کہا اور بیشک کہا، انہوں نے لفظ کفر کا اور منکر ہو گئے

اِسْلَامِهِمْ وَهُمْ اِيسَاءُ لِمَرْيَا لُوَاجٍ وَمَا نَقَمُوا اِلَّا اَنْ اَغْنَاهُمْ

مسلمان ہو کر اور قصد کیا تھا اس چیز کا جو ان کو نہ ملی، اور یہ سب کچھ اسی کا بدلہ تھا کہ دولت مند کر دیا

اللّٰهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ فَاِنْ يَتُوبُوْا اِلَيْكَ خَيْرًا لَّهُمْ جَ وَاِنْ

ان کو اللہ نے اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے سوا اگر توبہ کر لیں تو بھلا ہوا ان کے حق میں اور اگر

يَتَوَلَّوْا يَعْذِبْهُمْ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا اِنِّى الدُّنْيَا وَالْآٰخِرَةُ

نہ مانیں گے تو عذاب دیگا ان کو اللہ عذاب دردناک، دنیا اور آخرت میں

وَمَا لَهُمْ فِى الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝۴۳ وَمِنْهُمْ مَّنْ

اور نہیں ان کا روئے زمین پر کوئی حمایتی اور نہ مددگار، اور بعض ان میں وہ ہیں

عٰهَدَ اللّٰهُ لَنُبْنِىْ عَآثِنَا مِنْ فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ

کہ عہد کیا تھا اللہ سے اگر دیوے ہم کو اپنے فضل سے تو ہم ضرور خیرات کریں اور ہو رہیں ہم

الصّٰلِحِيْنَ ۝۴۴ فَلَمَّآ اَتَتْهُمْ مِّنْ فَضْلِهِ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا

نیکی والوں میں، پھر جب دیا ان کو اپنے فضل سے تو اس میں بخل کیا اور پھر گئے

وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۴۵ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمٍ

ٹلا کر، پھر اس کا اثر رکھ دیا نفاق ان کے دلوں میں جس دن تک کہ

يَلْقَوْنَهٗ بِمَا اَخْلَفُوا اللّٰهُ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْنُزُوْنَ ۝۴۶

وہ اس سے ملیں گے اس وجہ سے کہ انہوں نے خلاف کیا اللہ سے جو وعدہ اس سے کیا تھا اور وجہ کہ پورتھے جھوٹ

اَلَمْ يَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ وَاَنَّ

کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ جانتا ہے ان کا بھید اور ان کا مشورہ اور یہ کہ

اللّٰهُ عَلٰمُ الْغُیُوْبِ ۝۴۷

اللہ خوب جانتا ہے سب چھپی باتوں کو

خلاصہ تفسیر

وہ لوگ قہقہے کھا جاتے ہیں کہ ہم نے فلاںی بات دہرایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں (نہیں کہی حالانکہ یقیناً انھوں نے کفر کی بات کہی تھی) کیونکہ آپ کے قتل کے بارے میں گفتگو کرنے کا کفر ہونا ظاہر ہے) اور وہ بات کہہ کر اپنے اسلام (ظاہری) کے بعد (ظاہری بھی) کافر ہو گئے (گو اپنے ہی مجمع میں سہی جس کی خبر مسلمانوں کو بھی ہو گئی اور اس سے عام طور پر کفر کھل گیا) اور انھوں نے ایسی بات کا ارادہ کیا تھا جو ان کے ہاتھ نہ لگی (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا مگر ناکام رہی) اور یہ انھوں نے صرف اس بات کا بدلہ دیا ہے کہ ان کو اللہ نے اور اس کے رسول نے رزق خداوندی سے مال دار کر دیا (اس احسان کا بدلہ ان کے نزدیک یہی ہو گا کہ برائی کریں) سو اگر (اس کے بعد بھی) توبہ کریں تو ان کے لئے (دونوں جہان میں) بہتر (اور نافع) ہو گا (چنانچہ جلاس کو توبہ کی توفیق ہو گئی) اور اگر (توبہ سے) روگردانی کی (اور کفر و نفاق ہی پر جمے رہے) تو اللہ تعالیٰ ان کو دنیا اور آخرت (دونوں جگہ) میں دردناک سزا دے گا (چنانچہ عمر بھر بدنام اور پریشان اور خائف رہنا اور مرتے وقت مصیبت کا مشاہدہ کرنا یہ دنیوی عذاب ہے اور آخرت میں دوزخ میں جانا ظاہری ہے) اور ان کا دنیا میں نہ کوئی یار ہے اور نہ مددگار (کہ عذاب سے بچالے اور جب دنیا ہی میں کوئی یار مددگار نہیں جہاں اکثر مدد ہو جاتی ہے تو آخرت میں تو بدرجہ اولیٰ منفی ہو گا) اور ان (منافقین) میں بعض آدمی ایسے ہیں کہ خدا تعالیٰ سے عہد کرتے ہیں (کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد کرنا اور خدا سے عہد کرنا برابر ہے) اور وہ عہد یہ تھا کہ (اگر اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے فضل سے (بہت سامان) عطا فرمادے تو ہم (اس میں سے) خوب خیرات کریں اور ہم (اس کے ذریعہ سے) خوب نیک کام کیا کریں) سو جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے (بہت سامان) دیدیا تو اس میں بخل کرنے لگے (کہ زکوٰۃ نہ دی) اور (اطاعت سے) روگردانی کرنے لگے اور وہ توبہ روگردانی کے (پہلے ہی سے) عادی ہیں سو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل کی سزا میں ان کے دلوں میں نفاق (قائم) کر دیا جو خدا کے پاس جانے کے دن تک (یعنی دم مرگ تک) رہو گا اس سبب سے کہ انھوں نے خدا تعالیٰ سے اپنے وعدہ میں خلافت کیا اور اس سبب سے کہ وہ (اس وعدہ میں شروع ہی میں) جھوٹ بولتے تھے (یعنی نیت ایفاء کی اُس وقت بھی نہ تھی پس نفاق تو اس وقت بھی دل میں تھا جس کی قرعہ یہ کذب و اخلاف ہے) پھر اس کذب و اخلاف کے وقوع سے اور زیادہ مستحق غضب ہوئے اور اس زیادہ غضب کا اثر یہ ہوا کہ وہ نفاق سابقاً اب دائمی اور غیر زائل ہو گیا کہ توبہ بھی نصیب نہ ہو گی، اسی حالت پر مر کر ابداً لا باؤں جہنم میں

نصیب ہوگا، اور باوجود کفر مضمر کے جو اسلام اور طاعت کا اظہار کرتے ہیں تو (کیا ان منافقین) تو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے دل کا راز اور ان کی سرگوشی سب معلوم ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام غیب کی باتوں کو خوب جانتے ہیں اور اس لئے وہ ظاہری اسلام اور اطاعت ان کے کام نہیں آسکتے بالخصوص آخرت میں، پس سزائے جہنم ضروری ہے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت یَخْلِفُونَ بِاللَّهِ میں منافقین کا تذکرہ ہو گا وہ اپنی مجلسوں میں کلمات کفر کہتے رہتے ہیں، پھر اگر مسلمانوں کو اطلاع ہو گئی تو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنی برارت ثابت کرتے ہیں، اس آیت کے شان نزول میں بغویؒ نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک کے موقع پر ایک خطبہ دیا، جس میں منافقین کی بد حالی اور انجام بد کا ذکر فرمایا، حاضرین میں ایک منافق جُلاّس بھی موجود تھا، اس نے اپنی مجلس میں جا کر کہا کہ خُسمہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ سچ، تو ہم گدھوں سے بھی زیادہ بدتر ہیں، اس کا یہ کلمہ ایک صحابی عامر بن قیسؓ نے سُن لیا تو کہا بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا وہ سچ ہے اور تم واقعی گدھوں سے بھی زیادہ بدتر ہو۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر تبوک سے واپس مدینہ طیبہ پہنچے تو عامر بن قیسؓ نے یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا، اور جُلاّس اپنے کہے سے حکمر گیا، اور کہنے لگا کہ عامر بن قیسؓ نے مجھ پر تہمت باندھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو حکم دیا کہ منبر نبویؐ کے پاس کھڑے ہو کر قسم کھائیں، جُلاّس نے بیدھڑک جھوٹی قسم کھالی کہ میں نے ایسا نہیں کہا، عامر جھوٹ بول رہے ہیں، حضرت عامرؓ کا نمبر آیا تو انھوں نے بھی قسم کھائی، اور پھر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے کہ یا اللہ آپ اپنے رسول پر ہر رعبہ وحی اس معاملہ کی حقیقت روشن فرمادیں، ان کی دعا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں نے آمین کہی، ابھی یہ لوگ اس جگہ سے ہٹے بھی نہیں تھے، کہ جبریل امین وحی لے کر حاضر ہو گئے، جس میں آیت مذکورہ تھی۔ جُلاّس نے جب آیت سنی تو فوراً کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ یا رسول اللہ اب میں اقرار کرتا ہوں کہ یہ غلطی مجھ سے ہوئی تھی، اور عامر بن قیسؓ نے جو کچھ کہا وہ سچ تھا، مگر اسی آیت میں حق تعالیٰ نے مجھے توبہ کا بھی حق دیدیا ہے، میں اب اللہ سے مغفرت مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی توبہ قبول فرمائی، اور بعد میں یہ اپنی توبہ پر قائم رہے، ان کے حالات درست ہو گئے (منظری)

بعض حضرات مفسرین نے اسی طرح کے دوسرے واقعات اس کے شان نزول میں بیان فرمائے ہیں، خصوصاً اس لئے کہ اس آیت کا ایک جملہ یہ بھی ہے وَهَمَّوْا بِمَالِكٍ لَّنَا لَوْ اٰلِیْنِ اَنْھُوں نے ارادہ کیا ایک ایسے کام کا جس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت کسی ایسے واقعہ سے متعلق ہے جس میں منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش کی تھی، جس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے، جیسے اسی غزوہ تبوک سے واپسی کا واقعہ معروف ہے کہ بارہ آدمی منافقین میں سے پہاڑ کی ایک گھاٹی میں اس غرض سے چھپ کر بیٹھ گئے کہ جب آپ یہاں پہنچیں گے کیا رگ حملہ کر کے آپ کو قتل کر دیں، جبریل امین نے آپ کو خبر دیدی تو آپ اس رستہ سے ہٹ گئے، اور ان کی سازش خاک میں مل گئی۔

اور بعض دوسرے واقعات بھی منافقین کی طرف سے ایسے پیش آئے ہیں، مگر اس میں تضاد یا بُعد نہیں کہ وہ سب ہی واقعات اس آیت میں مراد ہوں۔

دوسری آیت وَمِنْهُمْ مَنْ عٰهَدَ اللّٰہَ بھی ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے، جو ابن جریر ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، طبرانی اور بیہقی نے حضرت ابو امامہ باہلی کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص ثعلبہ ابن حاطب انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ درخواست کی کہ آپ دعا کریں کہ میں مال دار ہو جاؤں، آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو میرا طریقہ پسند نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر میں چاہتا تو مدینہ کے پہاڑ سونا بن کر میرے ساتھ پھرا کرتے، مگر مجھے ایسی مال داری پسند نہیں، یہ شخص چلا گیا، مگر دوبارہ پھرا اور پھر یہی درخواست اس معاہدہ کے ساتھ پیش کی کہ اگر مجھے مال مل گیا تو میں ہر حق دالے کو اس کا حق پہنچاؤں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کر دی، جس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ اس کی بکریوں میں بے پناہ زیادتی شروع ہوئی، یہاں تک کہ مدینہ کی جگہ اس پر تنگ ہو گئی، تو بارہ چلا گیا، اور ظہر عصر کی دو نمازیں مدینہ میں آکر آپ کے ساتھ پڑھتا تھا، باقی نماز میں بھی جنگل میں جہاں اس کا یہ مال تھا وہیں ادا کرتا تھا۔

پھر انہی بکریوں میں اور زیادتی اتنی ہو گئی کہ یہ جگہ بھی تنگ ہو گئی، اور شہر مدینہ سے دور جا کر کوئی جگہ لی، وہاں سے صرف جمعہ کی نماز کے لئے مدینہ میں آتا اور پنجگانہ نمازیں وہیں پڑھنے لگا، پھر اس مال کی فراوانی اور بڑھتی ہوئی جگہ بھی چھوڑنا پڑی، اور مدینہ سے بہت دور چلا گیا، جہاں جمعہ اور جماعت سب سے محروم ہو گیا۔

کچھ عرصہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے اس کا حال دریافت کیا تو لوگوں نے بتلایا کہ اس کا مال اتنا زیادہ ہو گیا کہ شہر کے قریب میں اس کی گنجائش ہی نہیں،

اس لئے کسی دور جگہ پر جا کر اس نے قیام کیا ہی، اور اب یہاں نظر نہیں پڑتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر تین مرتبہ فرمایا **يَا وَيْحَ ثَعْلَبَةُ**، یعنی ثعلبہ پر افسوس ہی ثعلبہ پر افسوس ہے، ثعلبہ پر افسوس ہی اتفاق سے اسی زمانہ میں آیت صدقات نازل ہو گئی، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے صدقات وصول کرنے کا حکم دیا گیا ہے **(خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً)** آپ نے مویشی کے صدقات کا مکمل قانون لکھ کر دو شخصوں کو عاقل صدقہ کی حیثیت سے مسلمانوں کے مویشی کے صدقات وصول کرنے کے لئے بھیج دیا، اور ان کو حکم دیا کہ ثعلبہ بن حاطب کے پاس بھی پہنچیں، اور بنی سلیم کے ایک اور شخص کے پاس جانے کا بھی حکم دیا۔

یہ دونوں جب ثعلبہ کے پاس پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان دکھایا، تو ثعلبہ کہنے لگا کہ یہ تو جزیہ ہو گیا، جو غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے، اور پھر کہا کہ اچھا اب تو آپ جائیں جب واپس ہوں تو یہاں آجائیں، یہ دونوں چلے گئے۔

اور دوسرے شخص سلیمی نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سنا تو اپنے مویشی انڈے اور بکریوں میں جرجر سے بہتر جانور تھے، نصاب صدقہ کے مطابق وہ جانور لے کر خود ان دونوں قاصدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے، انھوں نے کہا کہ ہمیں تو حکم یہ ہے کہ جانوروں میں اعلیٰ چھاتٹ کرنے لیں، بلکہ متوسط وصول کریں، اس لئے ہم تو یہ نہیں لے سکتے، سلیمی نے اصرار کیا کہ میں اپنی خوشی سے یہی پیش کرنا چاہتا ہوں، یہی جانور قبول کر لیجئے۔

پھر یہ دونوں حضرات دوسرے مسلمانوں سے صدقات وصول کرتے ہوئے واپس آئے تو پھر ثعلبہ کے پاس پہنچے، تو اس نے کہا کہ لاؤ وہ قانون صدقات مجھے دکھلاؤ، پھر اس کو دیکھ کر یہی کہنے لگا کہ یہ تو ایک قسم کا جزیہ ہو گیا، جو مسلمانوں سے نہیں لینا چاہئے، اچھا اب تو آپ جائیں میں غور کروں گا پھر کوئی فیصلہ کروں گا۔

جب یہ دونوں حضرات واپس مدینہ طیبہ پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے حالات پوچھنے سے پہلے ہی پھر وہ کلمہ دہرایا جو پہلے فرمایا تھا **يَا وَيْحَ ثَعْلَبَةُ يَا وَيْحَ ثَعْلَبَةُ يَا وَيْحَ ثَعْلَبَةُ** (یعنی ثعلبہ پر سخت افسوس ہی) یہ جملہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا، پھر سلیمی کے معاملہ پر خوش ہو کر اس کے لئے دعا فرمائی، اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی، **وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ**، یعنی ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کو مال عطا فرمادیں گے تو وہ صدقہ خیرات کریں گے، اور صالحین امت کی طرح سب اہل حقوق، رشتہ داروں اور غریبوں کے حقوق ادا کریں گے، پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے ان کو دیا تو بخل کرنے لگے، اور اللہ اور رسول کی اطاعت سے بچ گئے۔

فَاعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بد عملی اور بد عہدی کے نتیجہ میں ان کے دلوں میں نفاق کو اور نچتہ کر دیا، کہ اب ان کو توبہ کی توفیق ہی نہ ہوگی۔
 فائدہ:۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض اعمالِ بد کی نحوست ایسی ہوتی ہے کہ توبہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے، نعوذ باللہ منہ

ابن جریر نے حضرت ابوامامہ کی تفصیلی روایت جو ابھی ذکر کی گئی ہے اس کے آخر میں لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثعلبہ کے لئے یا وَبِحِ ثَعْلَبَةٍ تین مرتبہ فرمایا تو اس مجلس میں ثعلبہ کے کچھ عزیز واقارب بھی موجود تھے، یہ سن کر ان میں سے ایک آدمی فوراً سفر کر کے ثعلبہ کے پاس پہنچا، اور اس کو ملامت کی، اور بتلایا کہ تمہارے بارے میں قرآن کی آیت نازل ہو گئی ہے، یہ سن کر ثعلبہ گھبرایا، اور مدینہ حاضر ہو کر درخواست کی کہ میرا صدقہ قبول کر لیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حق تعالیٰ نے تمہارا صدقہ قبول کرنے سے منع فرما دیا ہے، یہ سن کر ثعلبہ اپنے سر پر خاک ڈالنے لگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو تمہارا اپنا عمل ہے، میں نے تمہیں حکم دیا تم نے اطاعت نہ کی، اب تمہارا صدقہ قبول نہیں ہو سکتا، ثعلبہ ناکام واپس ہو گیا، اور اس کے کچھ دن بعد ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، اور صدیق اکبر خلیفہ ہوئے تو ثعلبہ صدیق اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہا کہ میرا صدقہ قبول کر لیجئے، صدیق اکبر نے فرمایا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہیں کیا تو میں کیسے قبول کر سکتا ہوں۔

پھر صدیق اکبر کی وفات کے بعد ثعلبہ فاروق اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور وہی درخواست کی اور وہی جواب ملا جو صدیق اکبر نے دیا تھا، پھر حضرت عثمان غنی کے زمانہ خلافت میں اُن سے درخواست کی انھوں نے بھی انکار کر دیا، اور خلافت عثمان کے زمانہ میں ثعلبہ مر گیا، (نعوذ باللہ من سنیات الاعمال) (مظہری)

مسئلہ: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ثعلبہ تائب ہو کر حاضر ہو گیا تو اس کی توبہ کیوں قبول نہ کی گئی، وجہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ اب بھی اخلاص کے ساتھ توبہ نہیں کر رہا ہے، اس کے دل میں نفاق موجود ہے، محض دُقی مصلحت سے مسلمانوں کو دھوکہ دے کر راضی کرنا چاہتا ہے، اس لئے قبول نہیں، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منافق قرار دیدیا تو بعد کے خلفاء کو اس کا صدقہ قبول کرنے کا حق نہیں رہا، کیونکہ زکوٰۃ کے لئے مسلمان ہونا شرط ہی، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ کسی شخص کے دل کا نفاق قطعی طور پر کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا، اس لئے آئندہ کا حکم یہی ہے کہ جو

شخص توبہ کر لے اور اسلام و ایمان کا اعتراف کر لے اس کے ساتھ مسلمانوں کا سامعہ کیا جائے
خواہ اس کے دل میں کچھ بھی ہو (بیان ہتھراں)

الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ

وہ لوگ جو طعن کرتے ہیں ان مسلمانوں پر جو دل کھول کر خیرات کرتے ہیں اور

أَنَّهُمْ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ

اُن پر جو نہیں رکھتے مگر اپنی محنت کا پھر اُن پر ٹھٹھے کرتے ہیں، اللہ نے ان

اللَّهُ مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۹۰ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ

سے ٹھٹھا کیا ہو، اور ان کے لئے عذاب دردناک ہو، تو ان کے لئے بخشش مانگ یا

لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ

نہ مانگ، اگر تو ان کے لئے ستر بار بخشش مانگے تو بھی ہرگز نہ بخشے گا

اللَّهُ لَهُمْ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي

ان کو اللہ یہ اس واسطے کہ وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اللہ رستہ

الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝۹۱

نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو

خلاصہ تفسیر

یہ منافقین، ایسے ہیں کہ نفل صدقہ دینے والے مسلمانوں پر صدقات کے بارے میں

دھوڑا ہونے پر طعن کرتے ہیں اور (بالخصوص) ان لوگوں پر (اور زیادہ) جن کو بجز محنت مزدوری

کی آمدنی کے اور کچھ میسر نہیں ہوتا (اور وہ بیچارے اسی مزدوری میں سے ہمت کر کے کچھ صدقہ

نکال دیتے ہیں) یعنی اُن سے تمسخر کرتے ہیں (یعنی مطلق طعن تو سب ہی پر کرتے ہیں کہ کیا تھوڑی سی چیز

صدقہ میں لائے، اور ان محنت کش غریبوں سے تمسخر بھی کرتے ہیں کہ لو یہ بھی صدقہ دینے کے قابل

ہو گئے) اللہ تعالیٰ ان کو تمسخر کا (تو خاص) بدلہ دے گا اور (وہی مطلق طعن کا یہ بدلہ ملے گا کہ)

ان کے لئے (آخرت میں) دردناک سزا ہوگی، آپ خواہ ان منافقین کے لئے استغفار کریں، یا

ان کے لئے استغفار نہ کریں (دونوں حال برابر ہیں کہ ان کو اس سے کوئی نفع نہیں ہوگا، انکی

مغفرت نہیں کی جائے گی) اگر آپ ان کے لئے ستر مرتبہ (یعنی بکثرت) بھی استغفار کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہ بخشے گا، یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کیا اور اللہ تعالیٰ ایسے سرکش لوگوں کو (جو کبھی ایمان اور حق کی طلب ہی نہ کریں) ہدایت نہیں کیا کرتا اس وجہ سے یہ عمر بھر کفر ہی پر قائم رہے، اسی پر مر گئے) :

معارف و مسائل

پہلی آیت میں نفلی صدقات دینے والے مسلمانوں پر منافقین کے طعن و تشنیع کا ذکر ہے، صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابو مسعودؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں صدقہ کا حکم دیا گیا، اور ہمارا حال یہ تھا کہ ہم محنت مزدوری کرتے تھے (کوئی مال ہمارے پاس نہ تھا، اسی مزدوری سے..... جو کچھ ہمیں ملتا تھا اسی میں سے صدقہ بھی نکالتے تھے) چنانچہ ابو عقیلؓ آدھا صاع (تقریباً پونے دو سیر) صدقہ پیش کیا، دوسرا آدمی آیا اس نے اس سے کچھ زیادہ صدقہ کیا، منافقین ان پر طعن و تشنیع کرنے لگے کہ کیا حقیر اور ذرا سی چیز صدقہ میں لائے، اللہ تعالیٰ کو ایسی چیز کی ضرورت نہیں، اور جس نے کچھ زیادہ صدقہ کیا اس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ریاء لوگوں کو دکھانے کے لئے صدقہ کیا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

سَخَّرَ اللَّهُ مِنْهُمْ فِي جَزَاءِ تَمْحُورٍ تَمْحُورٍ تَجْبِرُ كَيْفَ يَكُونُ۔

دوسری آیت میں جو منافقین کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرمایا گیا کہ آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں برابر ہے، اور کہنا ہی استغفار کریں ان کی مغفرت نہیں ہوگی، اس کا پورا بیان آگے آنے والی آیت لَا تَصِلُ عَلٰی أَحَدٍ مِنْهُمْ کے تحت آئے گا۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِ رَسُولِ اللَّهِ وَكَرِهُوا أَنْ

خوش ہو گئے پیچھے رہنے والے اپنے بیٹھ رہنے سے جدا ہو کر رسول اللہ سے اور گھبراتے اس

يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَالُوا

سے کہ لڑیں اپنے مال سے اور جان سے اللہ کی راہ میں اور بولے

لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوا

کہ مت کوچ کرو گرمی میں، تو کہہ دوزخ کی آگ سخت گرم ہے، اگر ان کو

يَفْقَهُونَ ۝۸۱ فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا جَزَاءً بِمَا

سمجھ ہوتی، سو وہ ہنس یوں تھوڑا اور روویں بہت ساء، بدلہ اس کا

كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝۸۲ فَإِنْ رَجَعَكَ اللَّهُ إِلَى طَائِفَةٍ مِّنْهُمْ

جو وہ کما تے تھے، سو اگر پھر لے جائے تجھ کو اللہ کسی فرقہ کی طرف ان میں سے

فَاسْتَأْذِنُوا لَكَ لِلْخُرُوجِ فَقُلْ لَنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَكِنْ

پھر اجازت چاہیں تجھ سے نکلنے کی تو تو کہہ دینا کہ تم ہرگز نہ نکلو گے میرے ساتھ کبھی اور

تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا إِنَّكُمْ رَضِيتُمْ بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ

نہ لڑو گے میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن، تم کو پسند آیا بیٹھ رہنا پہلی بار

فَاقْعُدُوا مَعَ الْخَلِيفِينَ ۝۸۳

سو بیٹھ رہو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ۔

خلاصہ تفسیر

یہ پیچھے رہ جانے والے خوش ہو گئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے (جانے کے)

بعد اپنے بیٹھے رہنے پر اور ان کو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کرنا ناگوار ہوا

(دو وجہ سے اول کفر و دوسرے آرام طلبی) اور (دوسروں کو بھی) کہنے لگے کہ تم (ایسی تیز گرمی

میں رگھر سے) مت نکلو آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ (اس سے بھی) زیادہ تیز اور

گرم ہے (سو تعجب ہو کہ اس گرمی سے تو بچتے ہو اور جہنم میں جانے کا خود سامان کر رہے ہو کہ

کفر و مخالفت کو نہیں چھوڑتے) کیا خوب ہوتا اگر وہ سمجھتے، سو ان امور مذکورہ کا نتیجہ یہ ہی

کہ دنیا میں (تھوڑے دنوں ہنس (کھیل) لیں اور (پھر آخرت میں) بہت دنوں (یعنی ہمیشہ)

روتے رہیں (یعنی ہنسنا تھوڑے دنوں کا ہے پھر رونا ہمیشہ ہمیشہ کا) ان کاموں کے

بدلہ میں جو کچھ (کفر و نفاق و خلافت وغیرہ) کیا کرتے تھے (جب ان کا حال معلوم ہو گیا) تو اگر

خدا تعالیٰ آپ (اس سفر سے مدینہ کو صحیح و سالم) ان کے کسی گروہ کی طرف واپس لائے (گروہ اس

لئے کہا کہ ممکن ہو کہ بعض اس وقت تک مرجائیں، یا کوئی کہیں چلا جائے اور) پھر یہ لوگ (براہِ خوشامد

و دفع الزام سابق کسی جہاد میں آپ کے ساتھ) چلنے کی اجازت مانگیں (اور دل میں اس وقت

بھی یہی ہو گا کہ عین وقت پر کچھ بہانہ کر دیں گے) تو آپ یوں کہہ دیجئے کہ (اگرچہ اس وقت نیازی

کے طور پر باتیں بنا رہے ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارا مافی الضمیر بتلادیا ہے، اس لئے نہایت وثوق سے کہتا ہوں کہ تم کبھی بھی میرے ساتھ (جہاد میں) نہ چلو گے اور نہ میرے ہمراہ ہو کر کسی دشمن (دین) سے لڑو گے (جو کہ اصلی مقصود ہے چلنے سے کیونکہ تم نے پہلے بھی بیٹھے رہنے کو پسند کیا تھا اور اب بھی عزم وہی ہے) تو (خواہ مخواہ جھوٹی باتیں کیوں بناتے ہو، بلکہ مثل سابق اب بھی) ان لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہو (جو واقعی) پیچھے رہ جانے کے لائق ہی ہیں (بوجہ عذر کے جلیے بوڑھے اور بچے اور عورتیں)

معارف و مسائل

ادھر سے سلسلہ منافقین کے حالات کا چل رہا ہے، جو غزوہ تبوک میں حکم عام کے باوجود شریک نہیں ہوئے، مذکورہ آیات میں بھی انہی کا ایک حال اور پھر اس کی مناسبت آخرت کی وعید اور دنیا میں آئندہ کے لئے ان کا نام مجاہدین اسلام کی فہرست سے خارج کر دینا اور آئندہ ان کو کسی جہاد میں شرکت کی اجازت نہ ہونا مذکور ہے۔

مُخَلَّفُونَ، مُخَلَّفٌ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں متروک، یعنی جس کو چھوڑ دیا گیا ہو، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ لوگ تو یہ سمجھ کر خوش ہو رہے ہیں کہ ہم نے اپنی جان کو مصیبت میں ڈالنے سے بچایا، اور جہاد میں شرکت نہیں کی، مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس قابل نہیں سمجھا کہ وہ اس فضیلت کو پاسکیں، اس لئے وہ تائب جہاد نہیں، بلکہ متروک ہیں، کہ اللہ و رسولؐ نے ہی ان کو چھوڑ دینے کے قابل سمجھا۔

خِلَافَ رَسُولِ اللَّهِ، لفظ خلافت کے معنی یہاں ”پیچھے“ اور ”بعد“ کے بھی ہو سکتے ہیں، ابو عبید نے یہی معنی لئے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاد پر چلے جانے کے بعد آپ کے پیچھے بجا پر خوش ہو رہے ہیں، جو درحقیقت خوشی کی چیز نہیں، بمَقَعِہِمُ یہ لفظ یہاں مصدری معنی میں مجھے قعود ہے۔

دوسرے معنی خلافت کے اس جگہ مخالفت کے بھی ہو سکتے ہیں، کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کر کے گھر میں بیٹھے رہے، اور صرف خود ہی نہیں بیٹھے، بلکہ دوسروں کو بھی یہ تلقین کی کہ لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ، یعنی گرمی کے زمانہ میں جہاد کے لئے نہ نکلو۔

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ غزوہ تبوک کا حکم اس وقت ہوا تھا جب کہ گرمی سخت پڑ رہی تھی حق تعالیٰ نے ان کی بات کا جواب یہ دیا قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا، یعنی یہ بد نصیب اس وقت کی گرمی کو تو دیکھ رہے ہیں اور اس سے بچنے کی فکر کر رہے ہیں، اس کے نتیجہ میں حکم خدا و رسولؐ

کی نافرمانی پر جو جہنم کی آگ سے سابقہ پڑنے والا ہے، اس کی فکر نہیں کرتے، کیا یہ موسم کی گرمی جہنم کی گرمی سے زیادہ ہے، اس کے بعد فرمایا:

فَلْيَصْحَكُوا قَلِيلًا ۝ الْآيَةُ جِسْمِ لَفْظِي مَعْنَى يَهْنَسُو تَهْوِثًا رَوِّدًا زِيَادَةً، يَهْنَسُو تَهْوِثًا رَوِّدًا زِيَادَةً، يَهْنَسُو تَهْوِثًا رَوِّدًا زِيَادَةً، يَهْنَسُو تَهْوِثًا رَوِّدًا زِيَادَةً، بَصِيغَةً، اَمْرًا لَا يَأْكُلُ لَكِنْ حَضَرَاتِ مُفَسِّرِينَ نَسَبُوا اس کو خبر کے معنی میں قرار دیا ہے، اور بَصِيغَةً اَمْرًا ذکر کرنے کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ ایسا ہونا حتمی اور یقینی ہے، یعنی یہ بات یقینی طور پر ہونے والی ہے کہ ان لوگوں کی یہ خوشی و ہنسی صرف چند روز کی ہے، اس کے بعد آخرت میں ہمیشہ کے لئے رونا ہی رونا ہوگا، ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ:

”دنیا چند روزہ ہے اس میں جتنا چاہو ہنس لو، پھر جب دنیا ختم ہوگی اور اللہ کے پاس حاضر ہو گے تو رونا شروع ہو جائے گا“

الدُّنْيَا قَلِيلٌ فَلْيَصْحَكُوا فِيهَا مَا شَاءُوا ۖ فَإِذَا تَقَطَّعَتِ الدُّنْيَا وَصَارُوا إِلَى اللَّهِ فَلْيَسْتَأْنِفُوا الْبُكَاءَ ۚ بَكَاءٌ لَا يَنْقَطِعُ أَبَدًا

(منظہری)

دوسری آیت میں لَنْ تَخْرُجُوا کا ارشاد ہے، اس کا مفہوم مذکور الصدر خلاصہ تفسیر میں تو یہ لیا گیا ہے کہ یہ لوگ اگر آئندہ کسی جہاد میں شرکت کا ارادہ بھی کریں تو چونکہ ان کے دلوں میں ایمان نہیں وہ ارادہ بھی احلاص سے نہ ہوگا، جب نکلنے کا وقت آئے گا اس وقت پہلے کی طرح جیلے بہانے کر کے ٹل جائیں گے، اس لئے آپؐ کو حکم ہوا کہ جب وہ کسی جہاد میں شریک ہونے کو خود بھی کہیں تو آپؐ یہ حقیقت حال ان کو بتلا دیں کہ تمہارے کسی قول و فعل پر اعتماد نہیں، تم نہ جہاد کو نکلو گے نہ کسی دشمن اسلام سے میرے ساتھ قتال کرو گے۔ اکثر حضرات مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ حکم ان کے لئے بطور دنیاوی سزا کے نافذ کیا گیا کہ اگر وہ سچ مچ کسی جہاد میں شرکت کو کہیں تو بھی انہیں شریک نہ کیا جائے۔

وَلَا تَصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّتَّ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ ۚ إِنَّهُمْ

اور نماز نہ پڑھ ان میں سے کسی پر جو مر جائے کبھی اور نہ کھڑا ہو اس کی قبر پر، وہ

كُفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَسِقُونَ ۝ (۸۴)

منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور وہ مر گئے نافرمان۔

خلاصہ تفسیر

اور ان میں کوئی مرجائے تو اس (کے جنازہ) پر کبھی نماز نہ پڑھے اور نہ (دفن وغیرہ کیواسطہ)
اس کی قبر پر کھڑے ہو جائے (کیونکہ) انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے، اور وہ
حالت کفر ہی میں مرے ہیں۔

معارف و مسائل

احادیث صحیحہ سے باتفاق امت ثابت ہے کہ یہ آیت عبداللہ ابن ابی منافق کی موت اور اس پر نماز جنازہ کے متعلق نازل ہوئی، اور صحیحین کی روایت سے ثابت ہے کہ اس کے جنازہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی، پڑھنے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی، اور اس کے بعد آپ نے کبھی کسی منافق کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے واقعہ نزول کی یہ تفصیل بیان کی گئی ہے کہ جب عبداللہ بن ابی اسلول مرگیا تو اس کے صاحبزادے عبداللہ جو مخلص مسلمان اور صحابی تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور درخواست کی کہ آپ اپنا قیص عطا فرمائیں تاکہ میں اپنے باپ کو اس کا کفن پہناؤں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قیص مبارک عطا فرمادیا، پھر حضرت عبداللہ نے یہ بھی درخواست کی کہ آپ اس کے جنازے کی نماز بھی پڑھائیں، آپ نے قبول فرمالیا، اور نماز جنازہ کے لئے کھڑے ہو گئے تو حضرت عمر بن خطابؓ نے آپ کا کپڑا اکڑ کر عرض کیا کہ آپ اس منافق کی نماز جنازہ پڑھتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی نماز جنازہ سے منع فرمادیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ میں دعا، مغفرت کروں یا نہ کروں، اور آیت میں جو سنتر مرتبہ استغفار پر بھی مغفرت نہ ہونے کا ذکر ہے تو میں سنتر مرتبہ سے زیادہ استغفار کر سکتا ہوں، آیت سے مراد سورہ توبہ کی وہی آیت ہے جو ابھی گزر چکی ہے، یعنی اَسْتَغْفِرُ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرُ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جنازہ کی نماز پڑھی، نماز کے بعد ہی یہ آیت نازل ہوئی، لَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُمْ الْخ رچنانچہ اس کے بعد آپ نے کبھی کسی منافق کے جنازے کی نماز نہیں پڑھی۔

واقعہ مذکور پر چند اشکالات اور ان کے جواب۔
یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبداللہ بن ابی ایک ایسا منافق تھا جس کا نفاق مختلف اوقات میں ظاہر بھی ہو چکا تھا، اور سب منافقوں کا سردار مانا جاتا تھا، اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ امتیازی سلوک کیسے ہوا کہ اس کے کفن کے لئے اپنا قمیص مبارک عطا فرما دیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں، اول اس کے صاحبزادے جو مخلص صحابی تھے، ان کی درخواست محض ان کی دلجوئی کے لئے ایسا کیا گیا، دوسرا سبب ایک اور بھی ہو سکتا ہے جو بخاری کی حدیث میں بروایت حضرت جابرؓ منقول ہے کہ غزوہ بدر کے موقع پر جب کچھ قریشی سردار گرفتار کئے گئے، تو ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس بھی تھے، آپؐ نے دیکھا کہ ان کے بدن پر کمرہ نہیں، تو صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ ان کو قمیص پہنا دیا جائے، حضرت عباسؓ دراز قد تھے، عبداللہ بن ابی کے سوا کسی کا قمیص ان کے بدن پر درست نہ آیا، تو عبداللہ بن ابی کا قمیص لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا عباس کو پہنا دیا تھا، اس کے اسی احسان کا بدلہ ادا کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قمیص ان کو عطا فرما دیا (قرطبی)۔

دوسرا سوال یہاں یہ ہو کہ فاروق اعظمؓ نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافق کے جنازہ کی نماز سے منع فرمایا ہے، یہ کس بناء پر کہا، کیونکہ اس سے پہلے کسی آیت میں صراحت آپ کو منافق کی نماز جنازہ سے منع نہیں فرمایا گیا، اس سے ظاہر یہی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ممانعت کا مضمون اسی سورۃ توبہ کی سابقہ آیت اَسْتَغْفِرُ لَهُمْ الْآیۃ سے سمجھا ہو گا، تو اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ آیت ممانعت نماز جنازہ پر دلالت کرتی ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ممانعت کیوں نہ قرار دی، بلکہ یہ فرمایا کہ اس آیت میں مجھے اختیار دیا گیا ہے۔

جواب یہ ہو کہ درحقیقت الفاظ آیت کا ظاہری مفہوم اختیار ہی دینا ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ نشر مرتبہ کا ذکر بھی اس جگہ تحدید کیلئے نہیں بلکہ کثرت بیان کرنے کے لئے ہے، تو اس آیت کا حاصل اس کے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے یہ ہو گیا کہ منافق کی مغفرت تو نہیں ہوگی، خواہ آپ کتنی ہی مرتبہ استغفار کر لیں، لیکن اس میں صراحت آپ کو استغفار کرنے سے روکا بھی نہیں گیا، اور قرآن کریم کی ایک دوسری آیت سورۃ یس کی اس کی نظیر ہے، جس میں فرمایا گیا کہ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنْزِلَتْ إِلَيْهِمْ آيَاتُ رَبِّهِمْ أَمْ لَمْ تُنْزِلْ إِلَيْهِمْ آيَاتُ رَبِّهِمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ جیسا اس آیت نے آپ کو انداز اور تبلیغ سے منع نہیں کیا بلکہ دوسری آیات سے تبلیغ و دعوت کا سلسلہ ان کے لئے بھی جاری رکھنا ثابت ہے، بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۚ وَإِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ لِّكُلِّ نَفْسٍ مِّنْهُم ۚ وَغَيْرِ

حاصل یہ ہو کہ آیت ۶ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنَبِّهْهُمْ سے تو آپ کو اختیار ہی دینا ثابت ہوا تھا، پھر مستقل دلیل سے انداز کو جاری رکھنا..... ثابت ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت مذکورہ سے بھی یہ تو سمجھ لیا تھا کہ اس کی مغفرت نہیں ہوگی، مگر کسی دوسری آیت کے ذریعہ اب تک آپ کو استغفار کرنے سے روکا بھی نہیں گیا تھا۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ میرے قبیص سے یا نماز پڑھانے سے اس کی تو مغفرت نہیں ہوگی، مگر اس سے دوسری مصالح اسلامیہ حاصل ہونے کی توقع تھی کہ اس کے خاندان کے لوگ اور دوسرے کفار جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاملہ اس کے ساتھ دیکھیں گے تو وہ اسلام کے قریب آجائیں گے، اور مسلمان ہو جائیں گے، اور ممانعت صریح نماز پڑھنے کی اس وقت تک موجود نہ تھی، اس لئے آپ نے نماز پڑھ لی۔

اس جواب کا شاید ایک تو وہ جملہ ہے جو صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے منقول ہے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ شتر مرتبہ سے زیادہ دعا مغفرت کرنے سے اس کی مغفرت ہو جائے گی تو میں یہ بھی کرتا۔ (قرطبی)

دوسرا شاہد وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا گرتہ اس کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا، مگر میں نے یہ کام اس لئے کیا کہ مجھے امید ہے کہ اس عمل سے اسکی قوم کے ہزار آدمی مسلمان ہو جائیں گے، چنانچہ مغازی ابن اسحاق اور بعض کتب تفسیر میں ہے کہ اس واقعہ کو دیکھ کر خزرج قبیلہ کے ایک ہزار آدمی مسلمان ہو گئے یہ

خلاصہ یہ ہے کہ آیت سابقہ سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ ہمارے کسی عمل سے اس منافق کی مغفرت نہیں ہوگی، مگر چونکہ ظاہر الفاظ آیت میں اختیار دیا گیا تھا، اور کسی دوسری آیت سے بھی اس کی ممانعت اب تک نہیں آئی تھی، دوسری طرف ایک کافر کے احسان سے دنیا میں نجات حاصل کرنے کا فائدہ بھی تھا، اور اس معاملہ میں دوسرے کافروں کے مسلمان ہونے کی توقع بھی، اس لئے آپ نے نماز پڑھنے کو ترجیح دی اور فاروق اعظمؓ نے یہ سمجھا کہ جب اس آیت سے یہ ثابت ہو گیا کہ مغفرت نہیں ہوگی تو اس کیلئے نماز جنازہ پڑھ کر دعا مغفرت کرنا ایک فعل عبث اور بے کار ہے، جو شان نبوت کے خلاف ہے، اسی کو انھوں نے ممانعت سے تعبیر فرمایا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ اس فعل کو فی نفسہ مفید نہ سمجھتے تھے مگر دوسروں کے اسلام لانے کا فائدہ پیش نظر تھا، اس لئے فعل عبث نہ رہا، اس طرح نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل پر کوئی اشکال رہتا ہی نہ فاروق اعظمؓ کے قول پر (بیان بقرآن)

البتہ جب صراحت یہ آیت نازل ہوگئی لَا تُصَلُّ، تو معلوم ہوا کہ اگرچہ نماز پڑھنے میں ایک دینی مصلحت آپ کے پیش نظر تھی، مگر اس میں ایک خرابی اور مفسدہ بھی تھا، جس کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دھیان نہیں ہوا، وہ یہ کہ خود مخلص مسلمانوں میں اس عمل سے ایک بے دلی پیدا ہونے کا خطرہ تھا کہ ان کے یہاں مخلص مسلمان اور منافق سب ایک پلے میں تولے جاتے ہیں، اس خطرہ کے پیش نظر قرآن میں یہ ممانعت نازل ہوگئی، اور پھر کبھی آپ نے کسی منافق کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔

مَسْئَلَةٌ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کافر کے جنازہ کی نماز اور اس کے لئے دعاء مغفرت جائز نہیں۔

مَسْئَلَةٌ: اسی آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کسی کافر کے اعزاء و اکرام کے لئے اس کی قبر پر کھڑا ہونا یا اس کی زیارت کے لئے جانا حرام ہے، عبرت حاصل کرنے کے لئے ہو یا کسی مجبوری کے لئے تو وہ اس کے منافی نہیں، جیسا کہ ہدایہ میں ہے کہ اگر کسی مسلمان کا کافر رشتہ دار مر جائے اور اس کا کوئی ولی وارث نہیں تو مسلمان رشتہ دار اس کو اسی طرح بغیر رعایت طریق مسنون کے گھر سے باہر دبا سکتا ہے (بیان ہفتہ قرآن)

وَلَا تُعْجِبُكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ

اور تعجب نہ کر ان کے مال اور اولاد سے اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ عذاب

يُعَذِّبَهُمْ بِهِمْ بِمَا فِي الدُّنْيَا وَتَرْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿٨٥﴾

میں رکھے ان کو ان چیزوں کے باعث دنیا میں اور بکھے ان کی جان اور وہ اس وقت تک کافر ہی رہیں،

وَإِذَا أَنْزَلْتُ سُورَةً أَنْ آمِنُوا بِهَا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ

اور جب نازل ہوتی ہو کوئی سورت کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور لڑائی کرو اس کے رسول کے ساتھ ہو کر

اسْتَأْذَنَكَ أَوْ لَوِ الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا اذْزَانُنَا مَعَ

تو تجھ سے رخصت مانگتے ہیں مقدور والے ان کے اور کہتے ہیں کہ ہم کو چھوڑ دے کہ رہ جاویں ساتھ

الْفُعْدَيْنِ ﴿٨٦﴾ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَى

بیٹھنے والوں کے، خوش ہوئے کہ رہ جائیں پیچھے رہنے والی عورتوں کیساتھ، اور مہر کر دی گئی ان کے

قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۸۹ لٰكِنَ الرَّسُوْلَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

دلوں پر سودہ نہیں سمجھتے، لیکن رسول اور جو لوگ ایمان لائے ہیں

مَعَهُ جُهْدٌ وَّ اِبَامٌ وَّ اِلَهُمَّ وَاَنْفُسِهِمْ ۝۹۰ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ

ساتھ اس کے وہ لڑے ہیں اپنے مال اور جان سے اور انہی کے لئے ہیں خوبیاں،

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۹۱ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنَّتٍ تَجْرِيْ

اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے، تیار کر رکھے ہیں اللہ نے ان کے واسطے باغ کہ بہتی

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا ۝۹۲ ذٰلِكَ الْمَوْزِعُ

ہیں نیچے ان کے نہریں رہا کریں اُن میں، یہی ہے بڑی

الْعَظِيْمُ ۝۹۳

کامیابی -

خلاصہ تفسیر

اور ان کے اموال اور اولاد آپ کو (اس) تعجب میں نہ ڈالیں کہ ایسے مبعوضین پر یہ نعمتیں کیسے ہوتیں، سو یہ واقع میں اُن کے لئے نعمتیں نہیں بلکہ آلات عذاب ہیں کیونکہ اللہ کو صرف یہ منظور ہے کہ ان (مذکورہ) چیزوں کی وجہ سے دنیا میں (بھی) ان کو گرفتار عذاب رکھے اور ان کا دم حالت کفر ہی میں نکل جائے (جس سے آخرت میں بھی مبتلائے عذاب رہیں) اور جب کبھی کوئی شکرِ اقرآن کا اس مضمون میں نازل کیا جاتا ہے کہ تم (مخلص دل سے) اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ہمراہ ہو کر جہاد کرو تو ان میں کے مقدور والے آپ سے رخصت مانگتے ہیں اور رخصت کا یہ مضمون ہوتا ہو کہ) کہتے ہیں کہ ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم بھی یہاں ٹھہرنے والوں کے ساتھ رہ جائیں (البتہ ایمان و اخلاص کے دعوے میں کچھ کرنا نہیں پڑتا اس کو کہہ دیا کہ ہم تو مخلص ہیں) وہ لوگ (غایت بے حمیت سے) خانہ نشین عورتوں کے ساتھ رہنے پر راضی ہو گئے، اور ان کے دلوں پر ہر لگ گئی جس سے وہ (حمیت و بے حمیتی کو) سمجھتے ہی نہیں، ہاں لیکن رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کی ہمراہی میں جو مسلمان ہیں انھوں نے (البتہ اس حکم کو مانا اور) اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے جہاد کیا اور انہی کے لئے ساری خوبیاں ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں، (اور وہ خوبی اور کامیابی یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسے باغ ہمایا کر رکھے ہیں جن کے نیچے سے نہریں

جاری ہیں (اور) وہ ان میں ہمیشہ گورہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں بھی اپنی منافقین کا حال بیان کیا گیا جو غزوہ تبوک میں شریک ہونے سے چلے بہانے کر کے رُک گئے تھے، ان منافقین میں بعض مال دار خوش حال لوگ بھی تھے، ان کے حال سے مسلمانوں کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ جب یہ لوگ اللہ کے نزدیک مردود و نامقبول ہیں تو ان کو دنیا میں ایسی نعمتیں کیوں ملیں۔

اس کے جواب میں پہلی آیت میں فرمایا کہ اگر غور کرو گے تو ان کے اموال و اولاد ان کے لئے رحمت و نعمت نہیں بلکہ دنیا میں بھی عذاب ہی ہیں، آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے، دنیا میں عذاب ہونا اس طرح ہے کہ مال کی محبت اس کی حفاظت کی اور پھر اس کے بڑھانے کی فکر یہ ان کو ایسی لگی رہتی ہیں کہ کسی وقت کسی حال چہن نہیں لینے دیتیں، ساز و سامان راحت کا ان کے پاس کتنا ہی ہو مگر راحت نہیں ہوتی، جو قلب کے سکون و اطمینان کا نام ہے، اس کے علاوہ یہ دنیا کا مال و متاع چونکہ ان کو آخرت سے غافل کر کے کفر و معاصی میں اتہماک کا سبب بھی بن رہا ہے اس لئے سبب عذاب ہونے کی وجہ سے بھی اس کو عذاب کہا جاسکتا ہے، اسی الفاظ قرآن میں یُحِذُّ بَعْثُهَا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان اموال ہی کے ذریعہ ان کو سزا دینا چاہتا ہے۔
اُولَٰئِیْنَ اَلطَّوْلِ کا لفظ تخصیص کے لئے نہیں بلکہ اس سے غیر اُولِی الطَّوْلِ یعنی غیر مستطیع لوگوں کا حال بدرجہ اولیٰ معلوم ہو گیا، کہ ان کے پاس تو ایک ظاہری عذر بھی تھا۔

وَجَاءَ الْمَعَذِّرُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِينَ

اور آئے بہانہ کرنے والے گنوار تاکہ ان کو رخصت مل جائے اور بیٹھ رہے جنہوں نے

كَذَّبُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ سَيُصِيبُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ

بھوٹ بولا تھا اللہ سے اور اس کے رسول سے اب پہنچے گا ان کو جو کافر ہیں ان میں

عَذَابٌ أَلِيمٌ ⑨

عذاب دردناک۔

خلاصہ تفسیر

اور کچھ بہانہ باز لوگ دیہاتیوں میں سے آئے تاکہ ان کو (گھر رہنے کی) اجازت مل جائے اور (ان دیہاتیوں میں سے) جنہوں نے خدا سے اور اس کے رسول سے (دعوائی ایمان میں) بالکل ہی جھوٹ بولا تھا وہ بالکل ہی بیٹھ رہے، (جھوٹے عذر کرنے بھی نہ آئے) ان میں جو (آخر تک) کافر رہیں گے ان کو (آخرت میں) دردناک عذاب ہوگا (اور جو توبہ کر لیں تو عذاب بچ جائیں گے)۔

معارف و مسائل

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان دیہاتیوں میں دو قسم کے لوگ تھے، ایک تو وہ جو حیلے بہانے پیش کرنے آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ان کو جہاد میں چلنے سے رخصت دیدی جائے، اور کچھ ایسے سرکش بھی تھے جنہوں نے اس کی بھی پروا نہیں کی کہ رخصت لے لیں وہ از خود ہی اپنے گھروں میں بیٹھ رہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جد بن قیس کو جہاد میں نہ جانے کی اجازت دیدی تو چند منافقین بھی خدمت میں حاضر خدمت ہوئے، اور کچھ حیلے بہانے پیش کر کے ترک جہاد کی اجازت مانگی، آپؐ نے اجازت تو دیدی، مگر یہ سمجھ لیا کہ یہ جھوٹے عذر کر رہے ہیں، اس لئے ان سے اعواض فرمایا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس نے بتلادیا کہ ان کا عذر قابل قبول نہیں، اس لئے ان کو عذاب الیم کی وعید سنائی گئی، البتہ اس کے ساتھ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ فَمَا كُنَّا بِمُحْسِنِينَ، ان میں سے بعض کا عذر کفر و نفاق کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ طبعی سستی کے سبب تھا، وہ ان کفار کے عذاب میں شامل نہیں۔

لَيْسَ عَلَى الضَّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَى وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ

نہیں ہے ضعیفوں پر اور نہ مریضوں پر اور نہ اُن لوگوں پر جن کے پاس نہیں ہو

مَا يُنْفِقُونَ خَرْجًا إِذْ نَصَحُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ

خرچ کرنے کو کچھ گناہ جبکہ دل سے صاف ہوں اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ نہیں ہر نیکی والوں

مِنْ سَبِيلٍ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۙ وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا

پر الزام کی کوئی راہ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور نہ ان لوگوں پر کہ جب تیرے پاس

أَتُوكَ لِتَحْبِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْبَبْتُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَ

اُسے تاکہ تو ان کو سواری دے تو نے کہا میرے پاس کوئی چیز نہیں کہ تم کو اس پر سوار کر دوں تو اٹھے پھر

أَعْيَبُهُمْ تَغِيْضُ مِنَ الدَّامِعِ حَزَنًا لَا يَجِدُ وَامَّا يَفْقَهُونَ ۙ

اور ان کی آنکھوں سے بہتے تھے آنسو اس غم میں کہ نہیں پاتے وہ چیز جو خرچ کریں

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنَاءُ بِرِضْوَانِ

راہ الزام کی تو ان پر ہی جو رخصت مانگتے ہیں تجھ سے اور وہ مالدار ہیں خوش ہوئے

بِأَن يَّكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ

اس بات سے کہ وہ رجائیں ساتھ پیچھے رہی والیوں کے اور مہر کردی اللہ نے ان کے دلوں پر

فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۙ

سو وہ نہیں جانتے ۔

خلاصہ تفسیر

کم طاقت لوگوں پر کوئی گناہ نہیں اور نہ بیماروں پر اور نہ ان لوگوں پر جن کو دشمنانِ جہاد کی تیاری میں خرچ کرنے کو میسر نہیں جبکہ یہ لوگ اللہ اور رسول کے ساتھ (اور احکام میں) خلوص رکھیں (اور دل سے اطاعت کرتے رہیں تو) ان تکوکاروں پر کسی قسم کا الزام (عائد) نہیں (کیونکہ لَا يَخْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَاسِعًا) اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں کہ اگر یہ لوگ اپنے علم میں معذور ہوں اور اپنی طرف سے خلوص و اطاعت میں کوشش کریں اور واقع میں کچھ کمی رہ جائے تو معاف کر دیں گے) اور نہ ان لوگوں پر کوئی گناہ اور الزام ہے کہ جس وقت وہ آپ کے پاس اس واسطے آتے ہیں کہ آپ ان کو کوئی سواری دیدیں اور آپ (ان سے) کہہ دیتے ہیں کہ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں جس پر میں تم کو سوار کر دوں تو وہ (ناکام) اس حالت سے واپس چلے جاتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں اس غم میں کہ (افسوس) انکو (دشمنانِ جہاد کی تیاری میں) خرچ کرنے کو کچھ میسر نہیں (نہ خود ہی اور نہ دوسری جگہ سے ملا) غرض ان معذورین مذکورین پر کوئی مواخذہ نہیں (بس الزام (اور مواخذہ) تو صرف ان لوگوں پر جو باوجود اہل سامان (قوت) ہونیکے (گھر پر رہنے کی) اجازت چاہتے ہیں وہ لوگ (غایت بے عملی سے) خائن ہیں عورتوں کے ساتھ رہنے پر راضی ہو گئے) اور اللہ نے انکے دلوں پر مہر کر دی جس سے وہ (گناہ و ثواب) جانتے ہی نہیں۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں ایسے لوگوں کے حالات بیان تھا جو درحقیقت جہاد میں شرکت سے معذور نہ تھے مگر سستی کے سبب عذر کر کے بیٹھ رہے، یا ایسے منافق جنہوں نے اپنے کفر و نفاق کی وجہ سے جیلے یہاں تراش کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے لی تھی، اور کچھ وہ سرکش بھی تھے جنہوں نے عذر کرنے اور اجازت لینے کی بھی ضرورت نہ سمجھی، ویسے ہی بیٹھ رہے، ان کا غیر معذور ہونا اور ان میں جو کفر و نفاق کے مرتکب تھے ان کی لعنہ و عذاب الیم ہونا سابقہ آیات میں بیان ہوا ہے۔

مذکورہ آیات میں ان مخلص مسلمانوں کا ذکر ہے جو حقیقتاً معذور ہونے کے سبب شرکت جہاد سے قاصر رہے، ان میں کچھ تو نابینا یا بیمار معذور تھے جن کا عذر رکھلا ہوا تھا، اور کچھ وہ لوگ بھی تھے جو جہاد میں شرکت کے لئے تیار تھے، بلکہ جہاد میں جانے کے لئے بے قرار تھے، مگر ان کے پاس سفر کے لئے سواری کا جانور نہ تھا، سفر طویل اور موسم گرمی کا تھا، انہوں نے اپنے جذبہ جہاد اور سواری نہ ہونے کی مجبوری کا ذکر کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ہمارے لئے سواری کا کوئی انتظام ہو جائے۔

کتب تفسیر و تاریخ میں اس قسم کے متعدد واقعات لکھے ہیں، بعض کا معاملہ تو یہ ہوا کہ شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عذر کر دیا کہ ہمارے پاس سواری کا کوئی انتظام نہیں، مگر یہ لوگ روتے ہوئے واپس ہوئے اور روتے رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسا سامان کر دیا کہ چھ اونٹ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اُسی وقت آگئے، آپ نے یہ ان کو دیدی، (منظری)، اور ان میں سے تین آدمیوں کے لئے سواری کا انتظام حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کر دیا حالانکہ وہ اس سے پہلے بہت بڑی تعداد کا انتظام اپنے خرچ سے کر چکے تھے۔

بعض وہ بھی رہے کہ جن کو آخر تک سواری نہ ملی، اور مجبور ہو کر رہ گئے، آیات مذکورہ میں انہی سب حضرات کا ذکر آیا ہے، جن کا عذر اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا، آخر میں پھر اس پر تنبیہ فرمادی کہ وبال تو صرف ان لوگوں پر ہے جنہوں نے قدرت کے باوجود جہاد سے غیر حاضر رہنا عورتوں کی طرح پسند کیا، اِنَّمَا النَّبِيْلُ عَلَى الدِّينِ يَسْتَاذِنُكَ وَهُمْ اَعْنِيَاءُ کا یہی مطلب ہے:

مَنْ مِّنْهُمْ مَّنْ يَسْتَاذِنُكَ وَهُمْ اَعْنِيَاءُ

يَعْتَذِرُونَ إِلَيْكُمْ إِذَا رَجَعْتُمْ إِلَيْهِمْ وَاللَّهُ

بہانے لائیں گے تمہارے پاس جب تم پھر کر جاؤ گے ان کی طرف ، تو کہہ

لَا تَعْتَذِرُوا لَنَا لَوْ كُنَّا نَبَاؤَ اللَّهِ مِنْ آخِبَارِكُمْ

بہانے مت بناؤ ہم ہرگز نہ مانیں گے تمہاری بات ہم کو بتا چکا ہو اللہ تمہارے احوال ،

وَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عِلْمِ الْغَيْبِ

اور ابھی دیکھے گا اللہ تمہارے کام اور اس کا رسول پھر تم لوٹائے جاؤ گے طرف اس جاننے والے

وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۹۴﴾ سَيَحْلِفُونَ

چھپے اور کھلے کی سہرہ بتلائے گا تم کو جو تم کر رہے تھے ، اب قسمیں کھائیں گے اللہ

بِاللَّهِ لَكُمْ إِذَا انْقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِنُعْرِضُوا عَنْهُمْ فَأَعْرِضُوا

کی تمہارے سامنے جب تم پھر کر جاؤ گے ان کی طرف تاکہ تم ان سے درگزر کرو سو تم درگزر کرو

عَنْهُمْ ط إِنَّهُمْ رَحِيمٌ زَوَّامٌ وَهُمْ جَهَنَّمُ جَزَاءُ بِمَا كَانُوا

ان سے بیشک وہ لوگ پلید ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ، بدلہ ان کے

يَكْسِبُونَ ﴿۹۵﴾ يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنْ تَرْضَوْا

کاموں کا ، وہ لوگ قسمیں کھائیں گے تمہارے سامنے تاکہ تم ان کو راضی ہو جاؤ سو اگر تم راضی

عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿۹۶﴾

ہو گئے ان سے تو اللہ راضی نہیں ہوتا ، نافرمان لوگوں سے ۔

خلاصہ تفسیر

یہ لوگ تمہارے (سب کے) سامنے عذر پیش کریں گے جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے ،
 (سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (سب کی طرف سے صاف) کہہ دیجئے کہ (بس رہنے دو) یہ عذر پیش
 مت کرو ہم کبھی تم کو سچا نہ سمجھیں گے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ ہم کو تمہاری (واقعی حالت کی) خبر دے چکے
 ہیں (کہ تم کو کوئی عذر صحیح نہ تھا) اور (خیر) آئندہ بھی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول تمہاری کارگزاری دیکھ
 لیں گے (معلوم ہو جائے گا کہ حسبِ زعم خود کتنے مطیع اور غلصہ ہو) پھر ایسے کے پاس لوٹائے جاؤ گے

جو پوشیدہ اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے (جس سے تمہارا کوئی اعتقاد کوئی عمل مخفی نہیں) پھر وہ تم کو بتا دے گا جو کچھ تم کرتے تھے (اور اس کا بدلہ دے گا) ہاں وہ اب تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھا جاویں گے (کہ ہم معذور تھے) جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے تاکہ تم ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو (اور ملامت وغیرہ نہ کرو) سو تم (ان کا مطلب پورا کر دو اور) ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو (اور اس غرض فانی کے حاصل ہونے سے ان کا کچھ بھلا نہ ہوگا، کیونکہ وہ لوگ بالکل گندے ہیں اور (انہیں) ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ان کاموں کے بدلہ میں جو کچھ وہ (نفاق و خلافت وغیرہ) کیا کرتے تھے (نیز اس کا بھی مقتضا ہے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاوے، کیونکہ تعرض سے مقصود ہے اصلاح اور اس کی ان کے خبثت سے امید نہیں اور نیز) یہ اس لئے قسمیں کھاویں گے کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ (سو) اول تو تم دشمنانِ خدا سے راضی ہی کیوں ہونے لگے لیکن بالفرض) اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو (ان کو کیا نفع کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو ایسے شریروں کو گوں سے راضی نہیں ہوتا (اور بدون رضائے خالق کے رضائے خلق محض بے سود ہے) :

معارف و مسائل

پہلی آیات میں اُن منافقین کا ذکر تھا جنہوں نے غزوہ تبوک میں نکلنے سے پہلے جھوٹے جیلے بہانے کر کے جہاد میں جانے سے عذر کر دیا تھا، مذکورہ آیت میں ان کا ذکر ہے، جنہوں نے جہاد سے واپسی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی جہاد سے غیر حاضری کے جھوٹے عذر پیش کئے، یہ آیات مدینہ طیبہ واپس آنے سے پہلے نازل ہو چکی تھیں جن میں اس آئندہ پیش آنے والے واقعہ کی خبر تھی کہ جب آپ مدینہ واپس پہنچیں گے تو منافقین عذر کرنے کے لئے آپ کے پاس آئیں گے، چنانچہ اسی طرح واقعہ پیش آیا۔

آیات مذکورہ میں ان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین حکم دیئے گئے: اول یہ کہ جب یہ عذر کرنے کے لئے آئیں تو آپ ان سے کہہ دیں کہ فضول جھوٹے عذر نہ کرو، ہم تمہاری بات کی تصدیق نہ کریں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ہمیں تمہارے سب حالات اور خیالات اور تمہاری شرارت اور دلوں میں چھپے ہوئے خفیہ ارادے سب بتلا دیئے ہیں، جس سے تمہارا جھوٹا ہونا ہم پر واضح ہو گیا، اس لئے عذر بیان کرنا فضول ہی، اس کے بعد فرمایا وَ سَيُؤَيُّ اللّٰهُ عَمَلَكُمْ الْآيَةِ اس میں ان کو مہلت دی گئی کہ اب بھی توبہ کریں نفاق چھوڑ کر سچے مسلمان ہو جائیں، کیونکہ اس میں یہ فرمایا کہ آئندہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول تمہارا عمل دیکھیں گے کہ وہ کیا اور کیسا رہتا ہے، اس کے مطابق عمل ہوگا، اگر تم توبہ کر کے سچے مسلمان ہو گے، تو تمہارے گناہ معاف ہو جاویں گے

ورنہ یہ جھوٹے چلے بہانے تمہیں کوئی فائدہ نہ دیں گے۔

دوسرا حکم دوسری آیت میں بیان ہوا ہے کہ یہ لوگ آپ کی واپسی کے بعد جھوٹی قسمیں کھا کر آپ کو مطمئن کرنا چاہیں گے، اور مقصد اس سے یہ ہوگا کہ لِنَعْرِضُوْا عَنْهُمْ، یعنی آپ ان کی اس غیر حاضری جہاد کو نظر انداز کر دیں، اس پر ملامت نہ کریں، اس پر یہ ارشاد ہوا کہ ان کی یہ خواہش آپ پوری کر دیں فَاعْرِضُوْا عَنْهُمْ، یعنی آپ ان سے اعراض کریں نہ تو ان پر ملامت و سرزنش کریں اور نہ شگفتہ تعلقات ان سے رکھیں، کیونکہ ملامت سے تو کوئی فائدہ نہیں، جب ان کے دل میں ایمان ہی نہیں اور اس کی طلب بھی نہیں تو ملامت کرنے سے کیا ہوگا، فضول اپنا وقت ضائع کیوں کیا جائے۔

تیسرا حکم تیسری آیت میں یہ ہے کہ یہ لوگ قسمیں کھا کر آپ کو اور مسلمانوں کو راضی کرنا چاہیں گے اس کے متعلق حق تعالیٰ نے یہ ہدایت فرمادی کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ کی جائے، آپ ان سے راضی نہ ہوں، اور یہ بھی فرمادیا کہ بالفرض اگر آپ راضی بھی ہو گئے تو ان کو کوئی فائدہ اس لئے نہیں پہنچے گا کہ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی نہیں ہے، اور اللہ کیلئے راضی ہو جبکہ یہ اپنے کفر و منافقت پر قائم ہیں۔

الْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَا

گنوار بہت سخت ہیں کفر میں اور نفاق میں اور اسی لائق ہیں کہ نہ سیکھیں وہ قاعدے

اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهِ وَاَللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ

جو نازل کئے اللہ نے اپنے رسول پر اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے، اور بعضے گنوار ایسے

مَنْ يَتَّخِذُ مَا يَنْفِقُ مَغْرًا وَيَتَرَبَّصُّ بِكُمُ الدَّوَابُّ عَلَيْهِمْ

ہیں کہ شمار کرتے ہیں اپنے خرچ کرنے کو تاوان اور انتظار کرتے ہیں تم پر زمانہ کی گردشوں کا اُن ہی پر

دَاۤئِرَةُ السَّوْءِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ

آئے گردش برسی، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے، اور بعضے گنوار وہ ہیں کہ

يُوْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يَنْفِقُ قُرْبًا عِنْدَ اللّٰهِ

ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور شمار کرتے ہیں اپنے خرچ کرنے کو نزدیک ہونا اللہ سے

وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ اِلَّا اَنَّهُمْ قُرْبَةً لَّهْمُ سَيِّدِ خَلْقِهِمُ اللّٰهُ

اور دعا یعنی رسول کی سنتا ہی! وہ ان کے حق میں نزوی کی ہے، داخل کرے گا ان کو اللہ

فِي رَحْمَتِهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۹۹﴾

اپنی رحمت میں، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر

ان منافقین میں جو ادھیاقی (میں وہ) لوگ (بوجہ سخت مزاجی گئے) کفر اور نفاق میں بہت ہی سخت ہیں اور (بوجہ بُعید علماء و عقلاء کے) ان کو ایسا ہونا ہی چاہئے کہ ان کو ان احکام کا علم نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمائے ہیں (کیونکہ جب جاننے والوں سے دور دور رہیں گے تو ان کا جاہل رہنا تو اس کا لازمی نتیجہ ہے، اور اسی وجہ سے مزاج میں سختی اور مجموعہ سے کفر و نفاق میں شدت ہوگی) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں، (وہ ان سب امور پر مطلع ہیں اور حکمت سے مناسب سزا دیں گے) اور ان (مذکورہ منافقین) دیہاتیوں میں سے بعض بعض ایسا ہے کہ (کفر و نفاق و جہل کے علاوہ بخل و عداوت کے ساتھ بھی موصوف ہے، حتیٰ کہ) جو کچھ (جہاد و زکوٰۃ وغیرہ کے مواقع میں مسلمانوں کی شرمائشی) خرچ کرتا ہے اس کو (مثلاً) جرمانہ سمجھتا ہے (یہ تو بخل ہوا) اور (عداوت یہ ہے کہ) تم مسلمانوں کے واسطے (زمانہ کی) گردشوں کا منتظر رہتا ہے کہ کہیں اُن پر کوئی حادثہ پڑ جائے تو ان کا خاتمہ ہو سو) بُرا وقت انہی (منافقین) پر پڑنے والا ہے (چنانچہ فتوحات کی وسعت ہوئی، کفار ذلیل ہوئے) ان کی ساری حسرتیں دل ہی میں رہ گئیں، اور تمام عمر رنج اور خوف میں کٹی) اور اللہ تعالیٰ (ان کے کفر و نفاق کی باتیں) سنتے ہیں (اور ان کے دلی خیالات اتخاذِ مغرم و ترہص و دوائر کو) جانتے ہیں (پس ان سب کی سزا دیں گے) اور بعضے اہل دیہات میں ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ (نیک کاموں میں) خرچ کرتے ہیں اس کو عند اللہ قرب حاصل ہونے کا ذریعہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعاء (یعنی) کا ذریعہ بناتے ہیں (کیونکہ آپ کی عادت شریفہ تھی کہ ایسے مواقع پر خرچ کرنے والے کو دعاء دیتے تھے جیسا کہ احادیث میں ہے) یاد رکھو کہ ان کا یہ خرچ کرنا بیشک ان لوگوں کے لئے موجب قربت (عند اللہ) ہے اور دعاء کا ہونا تو یہ خود دیکھ سُن لیتے ہیں، اس کی خبر دینے کی ضرورت نہ تھی اور وہ قرب یہ ہے کہ (ضرور اُن کو اللہ تعالیٰ اپنی (خاص) رحمت میں داخل کر لیں گے) (کیونکہ) اللہ تم بڑی مغفرت والے رحمت والے ہیں (پس ان کی لغزشیں معاف کر کے اپنی رحمت میں لے لیں گے) :

معارف ومسائل

آیات سابقہ میں منافقین مدینہ کا ذکر تھا ان آیات میں ان منافقین کا ذکر ہے جو مدینہ کے مضافات دیہات کے رہنے والے تھے۔

اَعْرَاب، یہ لفظ عَرَب کی جمع نہیں، بلکہ اسم جمع ہے، جو دیہات کے باشندوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس کا مفرد بنانا ہوتا ہے تو اَعْرَابِی کہتے ہیں، جیسے اَنْصَار کا مفرد اَنْصَارِی آتا ہے۔

ان کا حال آیت مذکورہ میں یہ بتلایا کہ یہ کفر و نفاق میں شہر والوں سے بھی زیادہ ہیں، جس کی وجہ یہ بتلائی کہ یہ لوگ علم اور علماء سے دور رہنے کے سبب عموماً جاہالت اور قساوت میں مبتلا ہوتے ہیں، سخت دل ہوتے ہیں (أَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ) یعنی ان لوگوں کا ماحول ہی ایسا ہو کہ وہ اللہ کی نازل کی ہوئی حدود سے بے خبر رہیں، کیونکہ نہ قرآن ان کے سامنے آتا ہے، نہ اس کے معانی و مطالب اور احکام سے ان کو واقفیت ہوتی ہے۔

دوسری آیت نیکی اہنی اعراب کا ایک حال یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ جو زکوٰۃ وغیرہ میں خرچ کرتے ہیں اس کو ایک تاوان سمجھ کر دیتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ دل میں ایمان تو ہے نہیں محض اپنے کفر کو چھپانے کے لئے نماز بھی پڑھ لیتے ہیں، اور زکوٰۃ فرض بھی دیدیتے ہیں، مگر دل میں گڑبٹتے ہیں، کہ یہ مال فضول گیا، اسی لئے اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں پر کوئی مصیبت پڑے اور ان کو شکست ہو جائے تو اس تاوان سے ہماری نجات ہو، اَللّٰہُ وَاٰوِیْہُ دَاوِرَہُ کی جمع ہے، عربی لغت کے اعتبار سے دَاوِرَہُ اُس بدلی ہوئی حالت کو کہتے ہیں جو پہلی اچھی حالت کے بعد بُری ہو جائے، اسی قرآن کریم نے اُن کے جواب میں فرمایا عَلَیْہِمْ ذَاوِرَہُ السُّعُوْرِ، یعنی اہنی پر بُری حالت آنے والی ہے، اور یہ اپنے ان افعال و اقوال کی بنا پر اور زیادہ ذلیل ہو گئے دیہاتی منافقین کے حالات کا ذکر کرنے کے بعد قرآنی اسلوب کے مطابق تیسری آیت میں ان دیہاتیوں کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھا گیا جو سچے اور پکے مسلمان ہیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ دیہات کے باشندے بھی سب ایکس نہیں ہوتے، ان میں مخلص مسلمان اور سمجھ دار لوگ بھی ہوتے ہیں، ان کا حال یہ ہو کہ وہ جو زکوٰۃ و صدقات دیتے ہیں تو اس کو اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ سمجھ کر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کی امید پر دیتے ہیں۔

صدقات کا اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ ہونا تو ظاہر ہی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی امید اس بنا پر ہے کہ قرآن حکیم نے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے

اموالِ زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم دیا ہے وہیں یہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے لئے آپ ﷺ دعا بھی کیا کریں جیسے آگے آنے والی آیت میں ارشاد ہے، **خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ** وَتُزَكِّيَهُمْ بِهَا وَصَلَّى عَلَيْهِمْ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صدقات وصول کرنے کے ساتھ یہ حکم بھی دیا ہے کہ ان کے لئے دعا کیا کریں، یہ حکم لفظ صلاۃ کے ساتھ آیا وَصَلَّى عَلَيْهِمْ، اسی لئے مذکورہ آیت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کو لفظ صَلَّات سے تعبیر کیا ہے۔

وَالشَّاقُونَ الْأُولُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ

اور جو لوگ قدیم ہیں سب پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور جو ان کے پیرو

اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ

ہوئے نیکی کے ساتھ اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے اور تیار کر رکھے ہیں

لَهُمْ جَنَّاتُ تَجْرِي تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ

واسطے ان کے باغ کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں رہا کریں ان میں ہمیشہ، یہی ہو

الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝۱۰۰

بڑی کامیابی۔

خلاصہ تفسیر

اور جو مہاجرین اور انصار (ایمان لانے میں سب امت سے) سابق اور مقدم ہیں اور (بقیہ امت میں) جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ (ایمان لانے میں) ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا کہ ان کا ایمان قبول فرمایا جس پر ان کو جزا ملے گی) اور وہ سب اللہ سے راضی ہو کر کہ اطاعت اختیار کی جسکی جزاء سے یہ رضا اور زیادہ ہوگی) اور اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) یہ بڑی کامیابی ہی

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیت میں دیہاتی مومنین مخلصین کا ذکر تھا، اس آیت میں تمام مومنین مخلصین کا ذکر ہے، جن میں ان کے درجاتِ فضیلت کا بھی بیان ہے۔

الشَّاقُونَ الْأُولُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ، اس جملہ میں اکثر حضرات

مفسرین نے حرف مین کو تبعیض کے لئے قرار دے کر مہاجرین و انصار، صحابہ کرام کے دو طبقے قائم کئے ہیں، ایک سابقین اولین کا دوسرا دوسرے درجے کے حضرات صحابہ کرام کا۔

پھر اس میں اقوال مختلف ہیں، بعض حضرات نے صحابہ کرام میں سے سابقین اولین ان کو قرار دیا ہے جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی ہے، یعنی تحویل قبلہ سے پہلے جو مسلمان ہو چکے تھے، وہ سابقین اولین ہیں، یہ قول سعید بن مسیب اور قتادہ کا ہے، حضرت عطاء بن ابی براح نے فرمایا کہ سابقین اولین وہ صحابہ ہیں جو غزوہ بدر میں شریک ہوئے، اور شعبی نے فرمایا کہ جو صحابہ حدیبیہ کی بیعت رضوان میں شریک ہوئے وہ سابقین اولین ہیں، اور ہر قول کے مطابق باقی صحابہ کرام مہاجرین یا انصار سابقین اولین کے بعد دوسرے درجے میں ہیں (منظہری - قرطبی)

اور تفسیر منظہری میں ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ حرف مین کو اس آیت میں تبعیض کے لئے نہ لیا جائے بلکہ بیان کے معنی میں ہو تو مفہوم اس جملے کا یہ ہوگا کہ تمام صحابہ کرام بہ نسبت باقی امت کے سابقین اولین ہیں، اور مِّنَ الْمُهَاجِرِیْنَ وَالْأَنْصَارِ اس کا بیان ہے، بیان القرآن کا خلاصہ تفسیر جو اوپر نقل کیا گیا اس میں اسی تفسیر کو اختیار کیا گیا ہے۔

پہلی تفسیر کے مطابق صحابہ کرام میں دو طبقے ہو جاتے ہیں، ایک سابقین اولین کا، دوسرا وہ جو تحویل قبلہ یا غزوہ بدر یا بیعت رضوان کے بعد مسلمان ہوئے اور آخری تفسیر کا حاصل یہ ہوگا کہ صحابہ کرام سب کے سب سابقین اولین ہی ہیں کیونکہ ان کا ایمان باقی امت سے اول اور سابق ہے۔

وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ یعنی جن لوگوں نے اعمال و اخلاق میں سابقین اولین کا اتباع مکمل طریقہ پر کیا، پہلے جملے کی پہلی تفسیر کے مطابق ان لوگوں میں درجہ اول ان مہاجرین و انصار صحابہ کا ہے جو تحویل قبلہ یا غزوہ بدر یا بیعت حدیبیہ کے بعد مسلمان ہو کر صحابہ کرام میں داخل ہوئے، دوسرا درجہ ان کے بعد کے مسلمانوں کا ہے، جو قیامت تک ایمان اور اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ میں صحابہ کرام کے اسوہ پر چلے، اور ان کا مکمل اتباع کیا۔

اور دوسری تفسیر کے مطابق الَّذِينَ اتَّبَعُوا میں صحابہ کرام کے بعد کے حضرات داخل ہیں جن کو اصطلاح میں تابعی کہا جاتا ہے، اور پھر ان اصطلاحی تابعین کے بعد قیامت تک آنے والے وہ سب مسلمان بھی اس میں شامل ہیں جو ایمان و عمل صالح میں صحابہ کرام کا مکمل اتباع کریں۔

صحابہ کرام سب کے سب بلا استثناء جنتی ہیں، محمد بن کعب قرظیؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے بارے میں آپ کیا

فسر ماتے ہیں، انھوں نے کہا کہ صحابہ کرام سب کے سب جنت میں ہیں اگرچہ وہ لوگ ہوں جن سے دنیا میں غلطیاں اور گناہ بھی ہوئے ہیں، اس شخص نے دریافت کیا کہ یہ بات آپ نے کہاں سے کہی، (اس کی کیا دلیل ہے) انھوں نے فرمایا کہ قرآن کریم کی یہ آیت پڑھو: الْأَسَافِقُونَ إِلَّا وَلُونَ اس میں تمام صحابہ کرام کے متعلق بلا کسی شرط کے رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ارشاد فرمایا کہ البتہ تابعین کے معاملہ میں اتباع یا احسان کی شرط لگائی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام بلا کسی قید و شرط کے سب کے سب بلا استثناء رضوان الہی سے سرفراز ہیں۔

تفسیر منطہری میں یہ قول نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ میرے نزدیک سب صحابہ کرام کے جنتی ہونے پر اس سے بھی زیادہ واضح استدلال اس آیت سے ہے لَا يَسْتَوِي مَن أَنْفَقَ مِن قَبْلِ نَفَقَةٍ وَقَتْلَ أَوْلَادِهِ أَكْثَرَ مِمَّا رَزَقَهُ مِنَ الدُّنْيَا إِن يَتْلُو صُحُفًا مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ أَوْ صُحُفًا مِّنْ خَلْفِهَا أَوْ يَحْكُمُ بَيْنَ النَّاسِ أَوْ يَنفِقُ مِمَّا رَزَقَهُ يَفْسُقُ فَنُفِقَتْ أَمْوَالُهُ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاكِبُونَ اس آیت میں پوری صراحت سے یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ صحابہ کرام اولین ہوں یا آخرین سب کے اللہ تعالیٰ نے حُسنِ جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔

اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جہنم کی آگ اُس مسلمان کو نہیں چھو سکتی جس نے مجھے دیکھا ہے یا میرے دیکھنے والوں کو دیکھا ہے (ترمذی عن جابرؓ) تنبیہ :- جو لوگ صحابہ کرام کے باہمی مشاجرات اور ان میں پیش آنے والے واقعات کی بناء پر بعض صحابہ کرام کے متعلق ایسی تنقیدات کرتے ہیں جن کو پڑھنے والوں کے قلوب اُن کی طرف سے بدگمانی میں مبتلا ہو سکیں وہ اپنے آپ کو ایک خطرناک راستہ پر ڈال رہے ہیں، نعوذ باللہ منہ

وَمِن مَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنْفِقُونَ ذُو مِنِّ أَهْلٍ

اور بعض تمھارے گرد کے گنوار منافق ہیں، اور بعض لوگ مدینہ

الْمَدِينَةِ قَدْ مَرَدُّوا عَلَى التِّفَاقِ قَدْ لَا تَعْلَمُهُمْ طَنَحُ

والے اڑ رہے ہیں تفاق پر تو ان کو نہیں جانتا ہم کو وہ

نَعْلَمُهُمْ سَنَعِدُ بِكُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يَرُدُّونَ إِلَى

معلوم ہیں ان کو ہم عذاب دیں گے دوبار پھر وہ لوٹائے جائیں گے

عَذَابٍ عَظِيمٍ ۝۱۰۱

بڑے عذاب کی طرف۔

مع غزواتہ
وقف منزل

خلاصہ تفسیر

اور کچھ تمھارے گرد و پیش والوں میں اور کچھ مدینہ والوں میں ایسے منافق ہیں کہ نفاق کی حد کمال پر (ایسے) پہنچے ہوئے ہیں (کہ) آپ (بھی) ان کو نہیں جانتے (کہ یہ منافق ہیں بس) ان کو ہم ہی جانتے ہیں ہم ان کو (دوسرے منافقین کی نسبت آخرت سے پہلے بھی) دوسری سزا دیں گے (ایک نفاق کی دوسرے کمال نفاق کی اور) پھر آخرت میں بھی (وہ بڑے بھاری عذاب (یعنی جہنم مع خلود و دائمی) کی طرف بھیجے جاویں گے۔

معارف و مسائل

سابقہ بہت سی آیات میں ان منافقین کا ذکر آیا ہے جن کا نفاق ان کے اقوال و افعال سے ظاہر ہو چکا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہچانتے تھے کہ یہ منافق ہیں، اس آیت میں ایسے منافقین کا ذکر ہے جن کا نفاق انتہائی کمال پر ہونے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اب تک مخفی رہا، اس آیت میں ایسے شدید منافقین پر آخرت سے پہلے ہی دو عذاب ہونے کا ذکر آیا ہے، ایک دنیا ہی میں کہ ہر وقت اپنے نفاق کو چھپانے کی فکر اور ظاہر ہونے کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں سے انتہائی بغض و عداوت رکھنے کے باوجود ظاہر میں ان کی تعظیم و تکریم اور ان کے اتباع پر مجبور ہونا بھی کچھ کم عذاب نہیں، اور دوسرا عذاب قبر و برزخ کا عذاب ہے، جو قیامت و آخرت سے پہلے ہی ان کو پہنچے گا۔

وَاٰخِرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَاٰخِرًا

اور بچنے لوگ ہیں کہ اقرار کیا انھوں نے اپنے گناہوں کا، ملایا انھوں نے ایک کام نیک اور دوسرا

سَيِّئًا طَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

بد قریب ہے کہ اللہ معاف کرے ان کو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

حُذِّمْنَ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَ

لے ان کے مال میں سے زکوٰۃ کہ پاک کرے تو ان کو اور بابرکت کرے تو ان کو اس کی وجہ سے

صَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوةَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

اور دعا دے ان کو بیشک تیری دعا ان کے لئے تسکین ہو اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَأْخُذُ

کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ آپ قبول کرتا ہے توبہ اپنے بندوں سے اور لیتا ہے

الصَّدَقَاتِ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۰۳﴾ وَقُلِ اعْمَلُوا

زکوٰتیں اور یہ کہ اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے ، اور کہہ کر عمل کئے جاؤ

فَسِيرَ إِلَى اللَّهِ عَمَلَكُمْ وَرَسُولَهُ وَالْمُؤْمِنُونَ وَسِرُّوْنَ

پھر آگے دیکھ لے گا اللہ تمہارے کام کو اور اس کا رسول اور مسلمان ، اور تم جلد لوٹائے جاؤ گے

إِلَىٰ عِلْمِ الْغَيْبِ وَالشَّيْءِ فَيَذَرُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۰۵﴾

اس کے پاس جو تمام چھپی اور کھلی چیزوں سے واقف ہو ، پھر وہ جتا دینگا تمکو جو کچھ تم کرتے تھے ،

وَالْآخِرُونَ مُرْجُونَ لِمَا رَأَىٰ اللَّهُ مِنْ أَعْمَالِهِمْ وَإِنَّمَا يَتُوبُ

اور بھنے وہ لوگ ہیں کہ ان کا کام ڈھیل میں ہو حکم پر اللہ کے یادہ ان کو عذاب دے اور یا ان کو

عَلَيْهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۱۰۶﴾

معاف کرے اور اللہ سب کچھ جانتے والا حکمت والا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور کچھ اور لوگ ہیں جو اپنی خطا کے معترف ہو گئے جنہوں نے ملے جلے عمل کئے تھے کچھ پہلے
 جیسے اعتراف جس کا منشاء ندامت ہے اور یہی توبہ ہے ، اور جیسے اور غزوات جو پہلے ہو چکے
 ہیں ، غرض یہ کام تو اچھے کئے اور کچھ بُرے (کئے جیسے تخلف بلا عذر سو) اللہ سے امید (یعنی ان کا
 وعدہ) ہے کہ ان کے حال پر رحمت کے ساتھ توجہ فرماویں (یعنی توبہ قبول کر لیں) بلاشبہ
 اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں جب اس آیت سے توبہ قبول ہو چکی اور وہ
 حضرات ستونوں سے کھل چکے تو اپنا مال آپ کی خدمت میں لے کر آئے اور درخواست کی کہ
 اس کو اللہ کی راہ میں صرف کیا جائے تو ارشاد ہوا کہ آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ (جس کو یہ
 لائے ہیں) لے لیجئے جس کے (لینے کے) ذریعہ سے آپ ان کو (گناہ کے آثار سے) پاک صاف
 کر دیں گے اور جب آپ لیں تو ان کے لئے دعا کیجئے بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لئے موجب
 اطمینان (قلب) ہے اور اللہ تعالیٰ (ان کے اعتراف کو) خوب سنتے ہیں (اور ان کی ندامت کو)

خوب جانتے ہیں اس لئے ان کے اخلاص کو دیکھ کر آپ کو یہ احکام دیئے گئے، ان اعمالِ صالحہ مذکورہ یعنی توبہ و ندامت و انفاق فی الخیر کی ترغیب... اور اعمالِ سیئہ مثل تخلف وغیرہ سے آئندہ کے لئے ترہیب ہی، پس اول ترغیب ہی یعنی (کیا ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہی صدقات کو قبول فرماتا ہے اور (کیا ان کو) یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی (اس) توبہ قبول کرنے (کی صفت) میں اور رحمت کرنے (کی صفت) میں کامل ہے اسی لئے ان کی توبہ قبول کی، اور اپنی رحمت سے مال قبول کرنے کا حکم اور ان کے لئے دعا کرنے کا حکم فرمایا، پس آئندہ بھی خطایا و ذنوب کے صدور پر توبہ کر لیا کریں، اور اگر توفیق ہو تو خیر خیرات کیا کریں) اور ترغیب کے بعد آگے ترہیب ہی یعنی (آپ (ان سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (جو چاہو) عمل کئے جاؤ سو (اول تو دنیا ہی میں) ابھی دیکھے لیتا ہے تمہارے عمل کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اور اہل ایمان (پس) بُرے عمل پر دنیا ہی میں ذلت اور خواری ہو جاتی ہے) اور (پھر آخرت میں) ضرور تم کو ایسے (اللہ) کے پاس جانا ہے جو تمام چھپی اور کھلی چیزوں کا جاننے والا ہے، سو وہ تم کو تمہارا سب کیا ہوا بتلا دے گا پس بُرے عمل سے مثل تخلف وغیرہ کے آئندہ سے احتیاط رکھو، یہ قسم اول کا بیان تھا، آگے قسم دوم کا ذکر ہے) اور کچھ اور لوگ ہیں جن کا معاملہ خدا کے حکم آنے تک ملتوی ہو کہ (عدم اخلاص توبہ کی وجہ سے) ان کو سزا دے گا یا (اخلاص کی وجہ سے) ان کی توبہ قبول کرے گا اور اللہ تعالیٰ (خلوص و عدم خلوص کا حال) خوب جاننے والا ہے (اور) بڑا حکمت والا ہے (پس بمقتضائے حکمت خلوص کی توبہ کو قبول کرتا ہے، اور بغیر خلوص کے قبول نہیں کرتا اور اگر کبھی بلا توبہ معاف کرنے میں حکمت ہو تو ایسا بھی کر دیتا ہے) :

معارف و مسائل

غزوہ تبوک کے لئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلانِ عامِ ادب سب مسلمانوں کو چلنے کا حکم ہوا تو زمانہ سخت گرمی کا تھا، مسافت دور دراز کی تھی، اور ایک باقاعدہ بڑی حکومت کی تربیت یافتہ فوج سے مقابلہ تھا، جو اسلام کی تاریخ میں پہلا ہی واقعہ تھا، یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے اس حکم کے متعلق لوگوں کے حالات مختلف ہو گئے، اور ان کی جماعتوں کی کئی قسمیں ہو گئیں۔

ایک قسم ان حضراتِ مخلصین کی تھی جو ازل حکم سنتے ہی بلا تردد جہاد کے لئے تیار ہو گئے، دوسری قسم وہ لوگ تھے جو ابتداءً کچھ تردد میں رہے پھر ساتھ ہو لئے، آیت

اَلَّذِينَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ فُلُوْهُمْ فَرَّقُوْا مِنْهُمْ

میں انہی حضرات کا ذکر ہے۔

تیسری قسم ان حضرات کی ہے جو واقعی طور پر معذور تھے، اس لئے نہ جاسکے، ان کا ذکر آیت لَيْسَ عَلَى الضَّعَفَاءِ میں آیا ہے، چوتھی قسم ان مؤمنین مخلصین کی ہے جو عذر نہ ہونے کے باوجود سستی کا ہلی کے سبب جہاد میں شریک نہیں ہوئے، ان کا ذکر مذکور الصدر آیت وَآخِرُونَ اعْتَرَفُوا اور آخِرُونَ مُؤْجُونَ میں آیا ہے، پانچویں قسم منافقین کی تھی جو نفاق کے سبب شریک جہاد نہیں ہوئے، ان کا ذکر گذشتہ بہت سی آیات میں آچکا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ آیات سابقہ میں بیشتر ذکر پانچویں قسم منافقین کا ہوا ہے، آیات مذکور الصدر میں چوتھی قسم کے حضرات کا ذکر ہے جو مؤمن ہونے کے باوجود سستی و کاہلی سے شریک جہاد نہیں ہوئے۔

پہلی آیت میں فرمایا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا، ان لوگوں کے اعمال ملے جلے ہیں، کچھ اچھے کچھ بُرے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ دشمن حضرات تھے جو بلا کسی صحیح عذر کے غزوہ تبوک میں نہ گئے تھے پھر ان کو اپنے فعل پر ندامت ہوئی، ان میں سے سات آدمیوں نے اپنے آپ کو مسجد نبویؐ کے ستونوں کے ساتھ باندھ لیا، اور یہ عہد کیا کہ جب تک ہماری توبہ قبول کر کے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نہ کھولیں گے ہم اسی طرح بندھے ہوئے قیدی رہیں گے، ان حضرات میں ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے نام پر سب روایتیں متفق ہیں، دوسرے اسماء میں مختلف روایتیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اُن کو بندھا ہوا دیکھا، اور معلوم ہوا کہ انہوں نے عہد یہ کیا ہے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کو نہ کھولیں گے اس وقت تک بندھے رہیں گے، تو آپؐ نے فرمایا کہ میں بھی اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ اُس وقت تک نہ کھولوں گا جب تک اللہ تعالیٰ مجھے ان کے کھولنے کا حکم نہ دے گا، کیونکہ جرم بڑا ہے، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کھولنے کا حکم دیدیا، اور وہ کھول دیئے گئے (قرطبی)

سعید بن مسیبؓ کی روایت میں ہے کہ جب ابولبابہ کو کھولنے کا ارادہ کیا گیا تو انہوں نے انکار کیا، اور کہا کہ جب تک خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو کر مجھے اپنے ہاتھ سے نہ کھولیں گے میں بندھا رہوں گا، چنانچہ صبح کی نماز میں جب آپؐ تشریف لاتے تو دست مبارک سے ان کو کھولا۔

نیک و بد ملے جلے | آیت میں فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے کچھ عمل نیک تھے، کچھ بُرے، اُن کے نیک عمل کیا تھے؟ | اعمال تو ان کا ایمان، نماز، روزہ کی پابندی اور اس جہاد سے پہلے غزوات

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکت اور خود اس واقعہ تبوک میں اپنے جرم کا اعتراف کر لینا اور نادوم ہو کر توبہ کرنا وغیرہ ہیں، اور بُرے عمل غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونا اور بُرے عمل سے منافقین کی موافقت کرنا ہے۔

جن مسلمانوں کے اعمال اچھے بُرے ملے جلے تفسیر قرطبی میں ہے کہ اگرچہ یہ آیت ایک خاص جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے، مگر حکم اس کا قیامت تک عام ہے، ان مسلمانوں کے لئے جن کے اعمال نیک و بد ملے جلے ہوں اگر وہ اپنے گناہوں سے تائب ہو جائیں تو ان کے لئے معافی اور مغفرت کی امید ہے۔

ابو عثمان نے فرمایا کہ قرآن کریم کی یہ آیت اس امت کے لئے بڑی امید دلانے والی ہے اور صحیح بخاری میں بردایت سمرو بن جندب معراج نبوی کی ایک تفصیلی حدیث میں ہے کہ ساتویں آسمان پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہوئی تو ان کے پاس کچھ لوگ دیکھے جن کے چہرے سفید تھے، اور کچھ ایسے کہ ان کے چہروں میں کچھ داغ دھبے تھے یہ دوسری قسم کے لوگ ایک نہر میں داخل ہوئے اور غسل کر کے واپس آئے تو ان کے چہرے بھی بالکل صاف سفید ہو گئے تھے، جبریل علیہ السلام نے آپ کو بتلایا کہ یہ سفید چہرے والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور پھر گناہوں سے پاک صاف رہے، الَّذِينَ آمَنُوا وَ تَلٰوْا تِلْكَ آٰیٰتِہُمْ یُظَلِّمُ، اور دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ملے جلے اچھے بُرے سب طرح کے کام کئے پھر توبہ کر لی، اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور گناہ معاف ہو گئے۔ (قرطبی)

خُذْ مِنْ أَمْوَالِہِم مَّذَقًا، واقعہ اس آیت کا یہ ہے کہ جن حضرات کا ذکر ہوا کہ بلا عذر غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے، پھر نادوم ہو کر اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ لیا پھر آیت مذکورہ سابقہ میں ان کی توبہ کی قبولیت نازل ہوئی اور قید سے کھولے گئے تو ان حضرات نے بطور شکرانہ اپنا سارا مال صدقہ کرنے کے لئے پیش کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کرنے سے انکار فرمایا کہ مجھے مال لینے کا حکم نہیں ہے، اس پر یہ آیت مذکورہ خُذْ مِنْ أَمْوَالِہِم مَّذَقًا نَّزَلَ، اور آپ نے پورے مال کے بجائے ایک تہائی مال کا صدقہ کرنا قبول فرمایا کیونکہ آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ پورا مال نہ لیا جائے بلکہ اس کا کوئی حصہ لیا جائے، حرف مِنْ اس پر شاہد ہے۔

مسلمانوں کے صدقات زکوٰۃ وغیرہ اس آیت میں اگرچہ شانِ نزول کے اعتبار سے ایک خاص جماعت سے صدقہ وصول کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن وہ اپنے مفہوم کے خراج کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اعتبار سے عام ہے۔

تفسیر قرطبی، احکام القرآن جہاں مظهری وغیرہ میں اسی کو ترجیح دی گئی ہے، اور قرطبی اور جصاص نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اگر اس آیت میں شان نزول وہی خاص واقعہ قرار دیا جائے جس کا ذکر اوپر آیا ہے تو پھر بھی اصولِ شرعی کی رو سے یہ حکم عام ہی رہے گا، اور قیامت تک کے مسلمانوں پر حاوی ہوگا، کیونکہ قرآن کریم کے بیشتر احکام خاص خاص واقعات میں نازل ہوئے، مگر ان کا دائرہ عمل کسی کے نزدیک اس خاص واقعہ تک محدود نہیں ہوتا بلکہ جب تک کوئی دلیل تخصیص کی نہ ہو یہ حکم تمام مسلمانوں کے لئے عام اور شامل ہی قرار دیا جاتا ہے۔

یہاں تک کہ پوری اُمتِ محمدیہ کا اس پر بھی اتفاق ہو کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب خاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، مگر یہ حکم نہ آپ کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ آپ کے زمانہ تک محدود بلکہ ہر وہ شخص جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام مسلمانوں کا امیر ہوگا وہ اس حکم کا مخاطب اور مامور ہوگا، اس کے فرائض میں داخل ہوگا کہ مسلمانوں کی زکوٰۃ، صدقات کے وصول کرنے اور مصرف پر خرچ کرنے کا انتظام کرے۔

صدیق اکبرؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں جو مانعین زکوٰۃ پر جہاد کرنے کا واقعہ پیش آیا اس میں بھی زکوٰۃ نہ دینے والے کچھ تھے تو وہ لوگ تھے جو کھلم کھلا اسلام سے باغی اور مرتد ہو گئے تھے اور کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے تھے مگر زکوٰۃ نہ دینے کا یہ بہانہ کرتے تھے کہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے کا حکم آپ کی حیات تک تھا، ہم نے اس کی تعمیل کی، آپ کی وفات کے بعد ابوبکرؓ کو کیا حق ہے کہ ہم سے زکوٰۃ و صدقات طلب کریں، اور شروع شروع میں حضرت عمرؓ کو ان پر جہاد کرنے سے اسی لئے تردد پیش آیا کہ یہ مسلمان ہیں ایک آیت کی آڑ لیکر زکوٰۃ سے بچنا چاہتے ہیں، اس لئے اُن کے ساتھ وہ معاملہ نہ کیا جاتا ہے جو عام مرتدین کے ساتھ کیا جاتا ہے، مگر صدیق اکبرؓ نے پورے عزم اور جزم کے ساتھ فرمایا کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا اس پر جہاد کریں گے۔

اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ جو لوگ حکم زکوٰۃ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص کرنے اور آپ کے بعد اس کے ساقط ہو جانے کے قائل ہوئے وہ کل کو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نماز بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھی، کیونکہ قرآن کریم میں یہ آیت بھی آئی ہے: **اقِمِ الصَّلَاةَ لِلَّهِ الْكُلِّ السَّمِیِّ**، جس میں اقامتِ صلوٰۃ کے مخاطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، مگر جس طرح آیت نماز کا حکم پوری اُمت کے لئے عام ہے اور اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہونے کی غلط تاویل کرنے والوں کو کفر سے نہیں بچا سکتی، اسی طرح آیت **مُحْسِنٌ مِّنْ أَمْرِ الْإِسْلَامِ** میں یہ تاویل ان کو کفر و ارتداد سے نہیں بچائے گی، اس پر

فاروق اعظمؓ کو بھی اطمینان ہو گیا اور باجماع صحابہ ان لوگوں کے خلاف جہاد کیا گیا۔
 زکوٰۃ حکومت کا ٹیکس نہیں | قرآن کریم نے آیت مذکورہ میں **خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ** کے بعد جو ارشاد فرمایا
بَلْكَ عِبَادَتِ ہے بلکہ عبادت ہے | حکومت کا ٹیکس نہیں، جو عام حکومتیں نظام حکومت چلانے کے لئے
 وصول کرتی ہیں، بلکہ اس کا مقصد خود اصحابِ اموال کو گناہوں سے پاک صاف کرنا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہو کہ زکوٰۃ صدقات کو وصول کرنے سے درحقیقت دو فائدے
 حاصل ہوتے ہیں، ایک فائدہ خود صاحبِ مال کا ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ گناہوں سے اور مال کی
 حرص و محبت سے پیدا ہونے والی اخلاقی بیماریوں کے جراثیم سے پاک و صاف ہو جاتا ہے، دوسرا
 فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ قوم کے اس ضعیف عنصر کی پرورش ہوتی ہے جو خود اپنی ضرورتیں
 مہیا کرنے سے مجبور یا قاصر ہے جیسے یتیم بچے، بیوہ عورتیں، یتیم خانے اور عوام فقراء
 و مساکین وغیرہ۔

لیکن قرآن حکیم نے اس جگہ صرف پہلا فائدہ بیان کرنے پر اکتفا کر کے اس طرف بھی
 اشارہ کر دیا کہ زکوٰۃ صدقات کا اصل مقصد پہلا ہی فائدہ ہے، دوسرا فائدہ اس سے ضمنی طور
 پر حاصل ہو جاتا ہے، اس لئے اگر بالفرض کسی جگہ یا کسی وقت کوئی یتیم، بیوہ، فقیر، مسکین
 موجود نہ ہو جب بھی اصحابِ اموال سے زکوٰۃ کا حکم ساقط نہ ہوگا۔

اس مضمون کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ پچھلی امتوں میں جو مال اللہ تعالیٰ کے لئے نکالا
 جاتا تھا اس کا استعمال کسی کے لئے جائز نہ تھا، بلکہ دستور یہ تھا کہ اس کو کسی علیحدہ جگہ پر رکھ دیا
 جاتا تھا اور آسمانی بجلی آ کر اس کو جلا دیتی تھی، یہی علامت تھی اس بات کی کہ صدقہ اللہ تعالیٰ نے
 قبول فرمایا، اور جہاں یہ آسمانی آگ نہ آتی تو صدقہ کے غیر مقبول ہونے کی علامت سمجھی جاتی تھی
 پھر اس منحوس مال کو کوئی ہاتھ نہ لگاتا تھا۔

اس سے واضح ہو گیا کہ زکوٰۃ صدقات کی اصل مشروعیت کسی کی حاجت روائی کے لئے
 نہیں، بلکہ وہ ایک مالی حق اور عبادت ہے، جیسے نماز روزہ جسمانی عبادات ہیں، یہ امتِ موحیہ
 کی خصوصیات میں سے ہے کہ یہ مال جو فی سبیل اللہ نکالا گیا ہے اس امت کے فقراء و مساکین کے
 لئے اس کا استعمال جائز کر دیا گیا، جیسا کہ مسلم کی حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
 اس کی تصریح منقول ہے۔

ایک سوال اور جواب | یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ واقعہ میں جب ان حضرات کی توبہ
 قبول کر لی گئی تو گناہ کی معافی اور تطہیر توبہ ہی کے ذریعہ ہو چکی، پھر مال لینے کو ذریعہ تطہیر

قرار دینے کے معنی کیا ہوں گے؟

جواب یہ ہے کہ اگرچہ توبہ سے گناہ معاف ہو گیا مگر گناہ معاف ہونے کے بعد اس کی کچھ ظلمت و کدورت باقی رہ سکتی ہے جو آئندہ ارتکاب گناہ کا سبب بن سکتی ہے، صدقہ کرنے سے وہ کدورت دور ہو کر تطہیر کا بل ہو جائے گی۔

رَّصَلٍ عَلَیْهِمْ، اس میں لفظ صلوة سے مراد ان کے لئے دعائے رحمت کرنا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول یہی ہے کہ بعض لوگوں کے لئے آپ نے لفظ صلوة ہی سے دعا فرمائی جیسے اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی اَبِیْ اَوْفٰی حدیث میں آیا ہے، لیکن بعد میں لفظ صلوة انبیاء علیہم السلام کی مخصوص علامت بن گئی، اس لئے اکثر فقہاء رحمہم اللہ کا یہ قول ہے کہ اب کسی شخص کے لئے دعا بہ لفظ صلوة نہ کی جائے، بلکہ اس لفظ کو صرف انبیاء علیہم السلام کے لئے مخصوص رکھا جائے، تاکہ تلبیس اور شبابہ نہ ہو (بیان القرآن وغیرہ)

یہاں آپ کو صدقہ دینے والوں کے لئے دعا کرنے کا حکم ہے، اس جیسے بعض حضرات فقہاء نے فرمایا کہ امام و امیر کو صدقہ ادا کرنے والوں کے لئے دعا کرنا واجب ہے، اور بعض حضرات نے اس کو امر استحباب قرار دیا ہے (قرطبی)

وَالْآخَرُونَ مُّرْجُونَ إِلَى اللَّهِ، دس حضرات مؤمنین جو بلا عذر کے غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے ان میں سے سات نے تو اپنی ندامت و افسوس کا پورا اظہار اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ کر دیا تھا اُن کا حکم پہلی آیت میں آچکا، وَالْآخَرُونَ اعْتَرَفُوا، اس آیت سے باقی وہ تین حضرات مراد ہیں جنہوں نے یہ عمل مسجد میں قید ہونے کا نہیں کیا تھا، اور اس طرح کھلے طور پر اعتراف نہیں کیا، اُن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیدیا کہ مسلمان ان کا مقاطعہ کریں، ان سے سلام کلام بند کر دیں، یہ معاملہ ہونے کے بعد ان کی حالت درست ہو گئی، اور اخلاص کے ساتھ اعتراف جرم کر کے تائب ہو گئے، تو ان کے لئے بھی معافی کے احکام دیدیئے گئے (صحیح بخاری و مسلم)

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ

اور جنہوں نے بنائی ہے ایک مسجد ضریح اور کفر اور کفر اور پھوٹ ڈالنے کو مسلمانوں

الْمُؤْمِنِينَ وَارْصَادًا لِّلَّذِينَ حَارَبَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ مِنْ قَبْلُ

میں اور گھات لگانے کو اس شخص کی جو لڑ رہا ہو اللہ سے اور اس کے رسول سے پہلے سے

وَلِيَحْلِفْنَ إِنْ أَرَادْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿١٠٤﴾

اور وہ قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی اور اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں ،

لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا لَمَْسْجِدٍ أُيَسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ

تو نہ کھڑا ہو اس میں کبھی البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد دھری گئی پر ہیزگاری پر اول دن سے

أَحْسَنَ أَنْ تَقُومَ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ

وہ لائق ہے کہ تو کھڑا ہو اس میں اس میں ایسے لوگ ہیں جو دوست رکھتے ہیں پاک رہنے کو ، اور اللہ

يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ ﴿١٠٥﴾ أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَىٰ مِنْ

دوست رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو ، بھلا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی اللہ سے ڈرنے

اللَّهُ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَمْ مَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى شَفَا جُرُفٍ

پر اور اس کی رضا مندی پر وہ بہتر یا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی کنارہ پر ایک کھائی کے جو

هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿١٠٦﴾

گمرنے کو ہر پھر اس کو لیکر ڈھے پڑا دوزخ کی آگ میں ، اور اللہ راہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا آتٍ

ہمیشہ رہے گا اس عمارت سے جو انھوں نے بنائی تھی شبہ اُن کے دلوں میں مگر جب ٹکڑے

تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٠٧﴾

ہو جائیں ان کے دل اور اللہ ہی سب کچھ جاننے والا حکمت والا

خلاصہ تفسیر

اور بعض ایسے ہیں جنھوں نے ان اغراض کے لئے مسجد بنائی ہے کہ اسلام کو ضرر پہنچاویں اور (اس میں بیٹھ بیٹھ کر) کفر (یعنی عداوت رسول) کی باتیں کریں اور (اس کی وجہ سے) ایمانداروں (کے مجمع) میں تفریق ڈالیں (کیونکہ جب دوسری مسجد بنائی جائے اور ظاہر کیا جائے کہ خوش نیتی سے بنی ہے تو ضرور ہے کہ پہلی مسجد کا مجمع کچھ نہ کچھ منتشر ہو ہی جاتا ہے) اور (یہ بھی غرض ہے کہ) اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس (مسجد بنانے) کے قبل سے خدا و رسول کا مخالف ہو (مراد ابو عامر

راہب ہی) اور (پوچھو تو) قسب کھاویں گے (جیسا ایک دفعہ پہلے بھی پوچھنے پر کھا چکے ہیں) کہ بجز بھلائی کے اور ہماری کچھ نیت نہیں (بھلائی سے مراد آسائش اور گنجائش ہے) اور اللہ گواہ ہے کہ وہ اس دعوے میں بالکل جھوٹے ہیں (جب اس مسجد کی یہ حالت ہو کہ وہ واقع میں مسجد ہی نہیں بلکہ مضر اسلام ہے تو) آپ اس میں کبھی (نماز کے لئے) کھڑے نہ ہوں، البتہ جس مسجد کی بنیاد ازل دن سے (یعنی روزِ تجویز سے) تقویٰ (اور اخلاص) پر رکھی گئی ہے (مراد مسجدِ قبا ہے) وہ (واقعی) اس لائق ہے کہ آپ اس میں (نماز کے لئے) کھڑے ہوں (چنانچہ گاہ بگاہ آپ وہاں تشریف لے جاتے اور نماز پڑھتے) اس (مسجدِ قبا) میں ایسے (اچھے) آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے (جب دونوں مسجدوں کے بائیسوں کا حال معلوم ہو گیا تو) پھر (سمجھ لو) آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت (یعنی مسجد) کی بنیاد خدا سے ڈرنے پر اور خدا کی خوشنودی پر رکھی ہو یا وہ شخص (بہتر ہوگا) جس نے اپنی عمارت (یعنی مسجد) کی بنیاد کسی گھائی (یعنی غار) کے کنارہ پر جو کہ گرنے ہی کو رہی ہو (مراد اس سے اغراضِ باطلہ کفریہ ہیں ناپائیداری میں اس کے ساتھ تشبیہ دی گئی) پھر وہ (عمارت) (اس ربانی) کو لے کر آتشِ دوزخ میں گر پڑے (یعنی وہ عمارت تو گری ہو جہ اس کے کہ کنارہ پر ہے، جب وہ کنارہ پانی سے کٹ کر گرے گا، وہ عمارت بھی گرے گی، اور بانی گرا اس لئے کہ اس عمارت میں رہتا تھا اور چونکہ مراد اس سے اغراضِ کفریہ ہیں جو موصل الی النار ہیں اس لئے یہ فرمایا کہ وہ اس کو لے کر جہنم میں جاگرمی) اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو (دین کی) سمجھ ہی نہیں دیتا، (کہ بنائی تو مسجد کے نام سے جو کہ دین کے شعائر میں سے ہے، اور غرضیں اس میں کیسی کیسی فاسد کر لیں) ان کی یہ عمارت (یعنی مسجد) جو انھوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں (کانٹا سا) کھٹکتی رہو گی، کیونکہ جس غرض سے بنائی تھی وہ پوری نہ ہوئی اور قلعی کھل گئی سو الگ اور پھر اوپر سے منہدم کر دی گئی، غرض کوئی ارمان نہ نکلا، اس لئے ساری عمر اس کا افسوس اور ارمان باقی رہے گا، ہاں مگر ان کے (وہ) دل ہی (جن میں وہ ارمان ہے) قنات ہو جائیں تو خیر (وہ ارمان بھی اس وقت ختم ہو جائے) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں (ان کی حالت کو جانتے ہیں اور اسی کے مناسب سزا دیں گے) :

معارف و مسائل

مناظمین کے حالات اور خلافتِ اسلام ان کی حرکتوں کا ذکر اور بہت سی آیات میں آچکا ہے کہ روئے الصدور آیات میں بھی ان کی ایک سازش کا ذکر ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ مدینہ طیبہ

میں ایک شخص ابو عامر نامی زمانہ جاہلیت میں نصرانی ہو گیا تھا، اور ابو عامر راہب کے نام سے مشہور تھا، یہ وہی شخص ہے جن کے لڑکے حنظلہ رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں جن کی لاش کو فرشتوں نے غسل دیا اس لئے غیل ملائکہ کے نام سے معروف ہوئے، مگر باپ اپنی مگر اسی اور نصرانیت پر قائم رہا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو ابو عامر راہب حاضر خدمت ہوا اور اسلام پر اعتراضات کئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب پر بھی اس بد نصیب کا اطمینان نہ ہوا، بلکہ یہ کہا کہ ہم دونوں میں جو جھوٹا ہودہ مرد و اور احباب واقارب سے دور ہو کر مسافرت میں مرے، اور کہا کہ آپ کے مقابلہ میں جو بھی دشمن آئے گا میں اس کی مدد کروں گا، چنانچہ غزوہ حنین تک تمام غزوات میں مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ قتال میں شرکت کی، جب ہوازن کا بڑا اور قوی قبیلہ بھی شکست کھا گیا تو یہ یایوس ہو کر ملک شام بھاگ گیا، کیونکہ یہی ملک نصرانیوں کا مرکز تھا وہیں جا کر اپنے احباب واقارب سے دور مر گیا، جو دعا کی تھی وہ اس کے سامنے آگئی، جب کسی شخص کی رسوائی مقدر ہوتی ہے تو وہ ایسے ہی کام کیا کرتا ہے، خود ہی اپنی دعا سے ذلیل بن جاتا ہوا۔ مگر جب تک زندہ رہا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں لگا رہا چنانچہ قیصر ملک روم کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے لشکر سے مدینہ پر چڑھائی کر دے، اور مسلمانوں کو یہاں سے نکال دے۔

اسی سازش کا ایک معاملہ یہ پیش آیا کہ اس نے منافقین مدینہ کو جن کے ساتھ اس کا ساز باز تھا خط لکھا کہ میں اس کی کوشش کر رہا ہوں کہ قیصر مدینہ پر چڑھائی کرے، مگر تم لوگوں کی کوئی اجتماعی طاقت ہونی چاہیے جو اس وقت قیصر کی مدد کرے، اس کی صورت یہ ہو کہ تم مدینہ ہی میں ایک مکان بناؤ، اور یہ ظاہر کرو کہ ہم مسجد بنارہے ہیں تاکہ مسلمانوں کو شبہ نہ ہو پھر اس مکان میں تم اپنے لوگوں کو جمع کرو، اور جس قدر اسلحہ اور سامان جمع کر سکتے ہو وہ بھی کرو، یہاں مسلمانوں کے خلاف آپس کے مشورہ سے معاملات طے کیا کرو۔

اس کے مشورہ پر بارہ منافقین نے مدینہ طیبہ کے محلہ قباء میں جہاں اول ہجرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا اور ایک مسجد بنائی تھی وہیں ایک دوسری مسجد کی بنیاد رکھی ان منافقین کے نام بھی ابن اسحاق وغیرہ نے نقل کئے ہیں، پھر مسلمانوں کو قریب دینے اور دھوکے میں رکھنے کے لئے یہ ارادہ کیا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک نماز اس جگہ پڑھوادیں، تاکہ سب مسلمان مطمئن ہو جائیں کہ یہ بھی ایک مسجد ہے جیسا کہ اس سے پہلے ایک مسجد یہاں بن چکی ہو۔ ان کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ قباء کی موجودہ مسجد بہت سے لوگوں سے دور ہے، ضعیف بیمار آدمیوں کو وہاں تک پہنچنا مشکل ہے،

اور خود مسجد قبا اتنی وسیع بھی نہیں کہ پوری بستی کے لوگ اس میں سما سکیں، اس لئے ہم نے ایک دوسری مسجد اس کام کے لئے بنائی ہے تاکہ ضعیف مسلمانوں کو فائدہ پہونچے، آپ اس مسجد میں ایک نماز پڑھ لیں تاکہ برکت ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت غزوہ تبوک کی تیاری میں مشغول تھے، آپ نے یہ وعدہ کر لیا کہ اس وقت تو ہمیں سفر درپیش ہے، واپسی کے بعد ہم اس میں نماز پڑھ لیں گے۔

لیکن غزوہ تبوک سے واپسی کے وقت جبکہ آپ مدینہ طیبہ کے قریب ایک مقام پر فروکش ہوئے تو آیات مذکورہ آپ پر نازل ہوئیں جن میں ان منافقین کی سازش کھول دی گئی تھی، آیات کے نازل ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چند اصحاب جس میں عامر بن سکن اور وحشی قاتل حمزہؓ وغیرہ شریک تھے، ان کو حکم دیا کہ ابھی جا کر اس مسجد کو ڈھا دو، اور اس میں آگ لگا دو، یہ سب حضرات اُسی وقت گئے اور حکم کی تعمیل کر کے اس کی عمارت کو ڈھا کر زمین برابر کر دی، یہ تمام واقعہ تفسیر قرطبی اور مظہری کی بیان کی ہوئی روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔

تفسیر مظہری میں محمد بن یوسف صالحی کے حوالہ سے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبا سے مدینہ منورہ میں پہنچ گئے تو مسجد ضرار کی جگہ خالی پڑی تھی، آپ نے عاصم ابن عدی کو اس کی اجازت دی کہ وہ اس جگہ میں اپنا گھر بنا لیں، انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ جس جگہ کے متعلق قرآن کریم کی یہ آیات نازل ہو چکی ہیں میں تو اس منحوس جگہ میں گھر بنانا پسند نہیں کرتا، البتہ ثابت بن اقرم ضرور تمند ہیں ان کے پاس کوئی گھر نہیں، ان کو اجازت دیدیجئے، کہ وہ یہاں مکان بنالیں، ان کے مشورہ کے مطابق آپ نے یہ جگہ ثابت بن اقرم کو دیدی، مگر ہوا یہ کہ جب سے ثابت اس مکان میں مقیم ہوئے ان کے کوئی بچہ نہیں ہوا یا زندہ نہیں رہا۔ اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ انسان تو کیا اس جگہ میں کوئی مرغی بھی انڈے بچے دینے کے قابل نہ رہی کوئی کبوتر اور جانور بھی اس میں پھلا پھولا نہیں، چنانچہ اس کے بعد سے یہ جگہ آج تک مسجد قبا کے کچھ فاصلہ پر دیران پڑی ہے۔

واقعہ کی تفصیل سننے کے بعد آیات مذکورہ کے متن کو دیکھئے، پہلی آیت میں فرمایا وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا، یعنی جس طرح اوپر دوسرے منافقین کے عذاب اور ذلت و رسوائی کا ذکر ہوا ہے یہ منافقین بھی ان میں شامل ہیں جنھوں نے مسجد کا نام رکھ کر ایک ایسی عمارت بنائی جس کا مقصد مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا۔

اس آیت میں مسجد مذکور کے بنانے کی تین غرضیں ذکر کی گئی ہیں، أَوَّلَ حَتَّىٰ أَرَأَ، یعنی مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کے لئے، لفظ ضرر اور ضرار دونوں عربی زبان میں نقصان پہنچانے

کے معنی میں مستعمل ہوتے ہیں، بعض حضرات نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ "ضرر" تو اس نقصان کو کہا جاتا ہے جس میں اس کے کرنے والے کا اپنا تو فائدہ ہو دوسروں کو نقصان پہنچے، اور "ضرار" دوسروں کو وہ نقصان پہنچانا ہے جس میں اس پہنچانے والے کا اپنا کوئی فائدہ بھی نہیں، چونکہ اس مسجد کا انجام ہی ہونے والا تھا کہ بنانے والوں کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچے، اس لئے یہاں لفظ ضرار استعمال کیا گیا۔

دوسری غرض اس مسجد کی تَقْرِیْبًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ بَتَلَانِی گئی ہے، یعنی ان کا مقصد اس مسجد کے بنانے سے یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کی جماعت کے دو ٹکڑے ہو جاویں، ایک ٹکڑا اس مسجد میں نماز پڑھنے والوں کا الگ ہو جائے اور یہ کہ قدیم مسجد قبارہ کے نمازی گھٹ جائیں اور کچھ لوگ یہاں نماز پڑھا کریں۔

تیسری غرض اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ بَتَلَانِی گئی جس کا حاصل یہ ہے کہ اس مسجد سے یہ کام بھی لینا تھا کہ یہاں اللہ اور رسول کے دشمنوں کو پناہ ملے اور وہ یہاں مسلمانوں کے خلاف سازش کیا کریں۔

اس مجموعہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ جس مسجد کو قرآن کریم نے مسجد ضرار قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اس کو ڈھایا گیا اور آگ لگائی گئی، درحقیقت نہ وہ مسجد تھی نہ اس کا مقصد نماز پڑھنے کے لئے تھا بلکہ مقاصد وہ تین تھے جن کا ذکر اوپر آیا ہے، اس سے معلوم ہو گیا کہ آجکل اگر کسی مسجد کے مقابلہ میں اس کے قریب کوئی دوسری مسجد کچھ مسلمان بنالیں، اور بنانے کا مقصد یہی باہمی تفرقہ اور پہلی مسجد کی جماعت توڑنا وغیرہ اغراض فاسدہ ہوں، تو اگرچہ ایسی مسجد بنانے والے کو ثواب تو نہ ملے گا بلکہ تفریق بین المؤمنین کی وجہ سے گناہگار ہوگا، لیکن بائیں ہمہ اس جگہ کو شرعی حیثیت سے مسجد ہی کہا جائے گا، اور تمام آداب اور احکام مساجد کے اس پر جاری ہوں گے، اس کا ڈھانا آگ لگانا جائز نہیں ہوگا، اور جو لوگ اس میں نماز پڑھیں گے ان کی نماز بھی ادا ہو جائے گی، اگرچہ ایسا کرنا فی نفسہ گناہ رہے گا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس طرح ریاہ و عنود کے لئے یا ضد و عناد کی وجہ سے جو مسلمان کوئی مسجد بنالے اگرچہ بنانے والے کو مسجد کا ثواب نہ ملے گا بلکہ گناہ ہوگا، مگر اس کو اصطلاح قرآن والی مسجد ضرار نہیں کہا جائے گا، بعض لوگ جو اس طرح کی مسجد کو مسجد ضرار کہہ دیتے ہیں یہ درست نہیں، البتہ اس کو مسجد ضرار کے مشابہ کہہ سکتے ہیں، اس لئے اس کے بنانے کو رد کا بھی جاسکتا ہے، جیسا کہ حضرت فاروق نے ایک فرمان جاری فرمایا تھا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ ایک مسجد کے قریب دوسری مسجد نہ بنائی جائے جس سے پہلی مسجد کی

جماعت اور رونق متاثر ہو (تفسیر کشاف)

اس مسجد ضرار کے متعلق دوسری آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا ہے،
لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا، اس میں قیام سے مراد نماز کے لئے قیام ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ اس نام کی
مسجد میں ہرگز نماز نہ پڑھیں۔

مسئلہ: اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی اگر کوئی نئی مسجد پہلی مسجد کے متصل
بلا کسی ضرورت کے محض ریاء و نمود کے لئے یا ضد و عناد کی وجہ سے بنائی جائے تو اس میں نماز پڑھنا بہتر
نہیں، اگرچہ نماز ہو جاتی ہے۔

اسی آیت میں آپ کو یہ بھی ہدایت دی گئی کہ آپ کا نماز پڑھنا اسی مسجد میں درست ہے جس کی
بنیاد اول سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اور اس میں ایسے لوگ نماز پڑھتے ہیں جن کو پاکی اور طہارت میں
پوری احتیاط محبوب ہے، اور اللہ بھی ایسے مطہرین کو پسند کرتا ہے۔

سیاق آیت سے ظاہر یہ ہے کہ مراد اس سے مسجد قبا ہے، جس میں اُس وقت رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا کرتے تھے، اور بعض روایات حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے،
دکھارواہ ابن مردودہ عن ابن عباس و عمر بن شیبہ عن سہل الانصاری و ابن خزیمہ فی صحیحہ عن عوفیر
بن ساعدہ، از منطری)

اور بعض روایات میں جو یہ آیا ہے کہ اس سے مراد مسجد نبویؐ ہے وہ اس کے منافی
نہیں، کیونکہ مسجد نبویؐ جس کی بنیاد وحی کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست
مبارک سے رکھی ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ
مطہر کون ہو سکتا ہے، اس لئے وہ بھی اس کی مصداق ضرور ہے، دکھارواہ الترمذی و صحیح عن
ابی سعید الخدری مرفوعاً، از قرطبی)

فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَخَفَّفُوا، آیت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی نماز کے لئے اس مسجد کو احق قرار دیا، جس کی بنیاد اول سے تقویٰ پر رکھی گئی جس کے مفہوم میں
مسجد قبا، اور مسجد نبویؐ دونوں داخل ہیں اس مسجد کی ایک فضیلت یہ بھی بتلائی گئی کہ اس مسجد کے
نمازی ایسے لوگ ہیں جو طہارت کا بہت زیادہ خیال اور اہتمام کرتے ہیں، طہارت کے مفہوم میں اس
جگہ عام نجاسات اور گندگیوں سے پاکی بھی.... داخل ہے، اور معاصی اور اخلاق رذیلہ سے
پاکی بھی مسجد قبا، اور مسجد نبویؐ کے نمازی عموماً ان سب اوصاف کے ساتھ متصف تھے۔

فائدہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی مسجد کی فضیلت کا اصل مدار تو اس پر ہے کہ وہ
اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے بنائی گئی ہو، اس میں کسی ریاء اور نام و نمود کا کسی اور غرض فاسد

کا کوئی دخل نہ ہو، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ نمازیوں کے نیک صالح، عالم، عابد ہونے سے بھی مسجد کی فضیلت بڑھ جاتی ہے، جس مسجد کے نمازی عام طور پر علماء، صلحاء، تقویٰ شعار ہوں اس میں نماز ادا کرنے کی فضیلت زیادہ ہے۔

تیسری اور چوتھی آیت میں اس مسجد مقبول کے مقابلہ میں منافقین کی بنائی ہوئی مسجد ضرار کی مذمت بیان کی گئی ہے، کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دریا کے کنارے بعض اوقات پانی زمین کے حصہ کو اندر سے کھالیتا ہو اور اوپر زمین کی سطح ہموار نظر آتی ہے، اس پر اگر کوئی تعمیر کرے تو ظاہر ہو کہ وہ فوراً گر جائے گی، اسی طرح اس مسجد ضرار کی بنیاد ناپائدار تھی، اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ گر پڑی، اور جہنم کی آگ میں گئی، جہنم کی آگ میں جانا مجازی معنی کے لئے بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے بنانے والوں کے لئے اس نے جہنم کا راستہ ہموار کر دیا، اور بعض حضرات نے اس کو حقیقت پر بھی محمول کیا، کہ حقیقتاً جب یہ مسجد گرائی گئی ہے، تو جہنم میں گئی، واللہ اعلم۔

آگے فرمایا کہ ان کی یہ تعمیر ہمیشہ ان کے شک اور نفاق کو بڑھاتی ہی رہے گی، جب تک کہ انکے قلب قطع نہ ہو جائیں یعنی جب تک انکی زندگی ختم نہ ہو جائے انکا شک نفاق اور حسد غیظ بڑھتا ہی رہے گا۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ

اللہ نے خرید لی مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال

بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَ

اس قیمت پر کہ ان کیلئے جنت ہو، لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں پھر مارتے ہیں اور

يُقْتَلُونَ وَعَدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَ

مرتے ہیں وعدہ ہو چکا اس کے ذمہ پر سچا توریت اور انجیل اور

الْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبِشِرُوا بَيْعِكُمْ

قرآن میں اور کون ہو قول کا پورا اللہ سے زیادہ سو خوشیاں کرو اس معاملہ پر

الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ التَّائِبُونَ

جو تم نے کیا ہو اس سے اور یہی ہے بڑی کامیابی، وہ توبہ کرنے والے ہیں

الْعَبِيدُونَ الْحَمْدُ وَالسَّائِحُونَ الرُّكْعُونَ السُّجْدُونَ

بندگی کرنیوالے شکر کرنیوالے بے تعلق رہنے والے رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے

الْأَمْرُ دُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهِي عَنْ الْمُنْكَرِ وَالْحَفِظُونَ

حکم کرنیوالے نیک بات کا اور منع کرنیوالے بُری بات سے اور حفاظت کرنے والے

لِحُدُودِ اللَّهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۳﴾

اُن حدّ کی جو باندھی اللہ نے اور خوش خبری سنائے ایمان والوں کو۔

خلاصہ تفسیر

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے، کہ ان کو جنت ملے گی (اور خدا کے ہاتھ مال و جان بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد میں) لڑتے ہیں جس میں (کبھی) قتل کرتے ہیں اور (کبھی) قتل کئے جاتے ہیں یعنی وہ بیع جہاد کرنا ہے خواہ اس میں قاتل ہونے کی نوبت آئے یا مقتول ہونے کی) اس (قتال) پر (ان سے جنت کا) سچا وعدہ کیا گیا ہے تو ریت میں (بھی) اور انجیل میں (بھی) اور قرآن میں (بھی) اور (یہ مسلم ہے کہ) اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو کون پورا کرنے والا ہے (اور اس نے اس بیع پر وعدہ جنت کا کیا ہے) تو (اس حالت میں) تم لوگ (جو کہ جہاد کر رہے ہو) اپنی اس بیع (مذکورہ) پر جس کا تم نے (اللہ تعالیٰ سے) معاملہ ٹھہرایا ہے خوشی مناؤ (کیونکہ اس بیع پر تم کو حسب وعدہ مذکورہ جنت ملے گی) اور یہ (جنت ملنا) بڑی کامیابی ہے (تو ضرور تم کو یہ سودا کرنا چاہئے) وہ (مجاہدین ایسے ہیں جو علاوہ جہاد کے ان اوصاف کمال کیساتھ بھی موصوف ہیں کہ گناہوں سے توبہ کرنے والے ہیں (اور اللہ کی) عبادت کرنے والے ہیں (اور اللہ کی) حمد کرنے والے ہیں اور) روزہ رکھنے والے (ہیں اور) رکوع اور سجدہ کرنے والے (ہیں یعنی نماز پڑھتے ہیں اور) نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے (ہیں) اور بُری باتوں سے باز رکھنے والے (ہیں) اور اللہ کی حدود کا (یعنی احکام کا) خیال رکھنے والے (ہیں) اور ایسے مؤمنین کو جن میں جہاد اور یہ صفات ہوں) آپ خوش خبری سنا دیجئے (کہ ان سے جنت کا وعدہ مذکورہ ہے) ۴

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں جہاد سے بلا عذر رکنے کی مذمت کا بیان تھا، ان آیات میں مجاہدین کی فضیلت کا بیان ہے۔

رابط آیات

حسب تصریح اکثر حضرات مفسرین یہ آیات بمعیت عقبہ کے شرکار کے متعلق

شان نزول

نازل ہوتی ہیں جو ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں انصارِ مدینہ سے لی گئی تھی اسی لئے پوری سورت کے مدنی ہونے کے باوجود ان آیات کو مکئی کہا گیا ہے۔

عقبہ، پہاڑ کے حصّہ کو کہا جاتا ہے اس جگہ وہ عقبہ مراد ہے جو منیٰ میں جبرہ عقبہ کے ساتھ پہاڑ کا حصّہ ہے، (آجکل حجاج کی کثرت کے سبب پہاڑ کا یہ حصّہ صاف کر کے میدان بنا دیا گیا ہے صرف جبرہ رہ گیا ہے) اس عقبہ پر مدینہ طیبہ کے حضرات سے تین مرتبہ بیعت لی گئی ہے، پہلی بیعت بعثتِ نبویؐ سے گیارہویں سال میں ہوئی، جس میں چھ حضرات مسلمان ہو کر بیعت کر کے مدینہ واپس ہوئے، تو مدینہ کے گھر گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کا چرچا ہونے لگا، اگلے سال موسم حج میں بارہ حضرات اسی جگہ جمع ہوئے، جن میں پانچ پہلے اور سات نئے تھے، سب بیعت کی، اب مدینہ میں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہو گئی، جو چالیس نفر سے زائد تھی، انھوں نے درخواست کی کہ ہمیں قرآن پڑھانے کے لئے کسی کو بھیج دیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو بھیج دیا، انھوں نے موجودہ مسلمانوں کو قرآن بھی پڑھایا، اور اسلام کی تبلیغ بھی کی، جس کے نتیجہ میں مدینہ کی بڑی جماعتیں اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئیں۔

اس کے بعد بعثتِ نبویؐ کے تیرہویں سال میں نثر مرد و عورتیں اسی جگہ جمع ہوئے، یہ تیسری بیعت عقبہ ہے جو آخری ہے، اور عموماً بیعت عقبہ سے یہی بیعت مراد ہوتی ہے، یہ بیعت اسلام کے اصولی عقائد و اعمال کے ساتھ خصوصی طور پر کفائے جہاد اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں، تو آپؐ کی حفاظت و حمایت پر لی گئی، اس میں حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس وقت معاہدہ ہو رہا ہے، آپ جو شرائط اپنے رب کے متعلق یا اپنے متعلق کرنا چاہیں وہ واضح کر دی جائیں، آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے تو یہ شرط رکھتا ہوں کہ آپؐ سب اس کی عبادت کریں گے، اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے، اور اپنے لئے یہ شرط ہے کہ میری حفاظت اس طرح کریں گے جیسے اپنی جانوں اور اپنے اموال و اولاد کی حفاظت کرتے ہو، ان لوگوں نے دریافت کیا کہ اگر ہم یہ دونوں شرطیں پوری کر دیں تو ہمیں اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا جنت ملے گی، ان سب حضرات نے خوش ہو کر کہا کہ ہم اس سودے پر راضی ہیں، اور ایسے راضی ہیں کہ اب اس کو نہ خود فسخ کرنے کی درخواست کریں گے، نہ اس کے فسخ کرنے کو پسند کریں گے۔

اس جگہ چونکہ اس بیعت میں ظاہراً صورت ... ایک لین دین کے معاملے کی بن گئی تو اس پر یہ آیت بہ لفظ بیع و شرائط نازل ہوئی، اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنْ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنْ لَّهْمُ الْجَنَّةُ، یہ آیت سن کر سب پہلے حضرت براہ بن معرورؓ اور ابوالہیثمؓ اور اسعدؓ

رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، کہ ہم اس معاملہ پر تیار ہیں، آپ کی حفاظت اپنی عورتوں بچوں کی طرح کریں گے، اور آپ کے مقابلہ پر اگر دنیا کے کالے اور گورے سب جمع ہو جائیں تو ہم سب کا مقابلہ کریں گے۔

جہاد کی سب سے پہلی ہی آیت ہے | مکہ معظمہ میں چہار و قتال کے احکام نہیں تھے، یہ سب پہلی آیت ہے جو مکہ مکرمہ ہی میں قتال کے متعلق نازل ہوئی، اور اس کا عمل ہجرت کے بعد شروع ہوا، اس کے بعد دوسری آیت نازل ہوئی، اِذْ نَ لِّلَّذِيْنَ يُقْتَلُوْنَ، جب یہ بیعت عقبہ کفار قریش مکہ سے خفیہ مکمل ہو گئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مکہ مکرمہ سے مدینہ کی ہجرت کا حکم دیدیا، اور تدبیرِ نبیؐ صحابہ کرام کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملنے کے منتظر رہے، صدیق اکبرؓ نے ہجرت کا قصد کیا تو آپؐ نے ان کو اپنے ساتھ کے لئے روک لیا یہ پورا واقعہ تفسیر مظہری میں حوالہ کے ساتھ مذکور ہے۔

يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ال) فِي التَّوْرَةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْآنِ، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ چہار و قتال کا حکم تمام پچھلی امتوں کے لئے بھی سب کتابوں میں نازل کیا گیا، اور یہ جو مشہور ہے کہ انجیل میں چہار کا حکم نہیں، ممکن ہے کہ بعد کے لوگوں نے جو تحریفاً اس میں کی ہیں اس میں احکام جہاد کو خارج کر دیا گیا ہو۔ واللہ اعلم

كَاسْتَبَشَّرُوْا بِبَيْعِكُمْ، اس واقعہ بیعت عقبہ میں جو معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا اس کی ظاہری صورت بیع و شراء کی بن گئی، اس لئے شروع آیت میں شراء کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا، اس جملہ میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ معاملہ بیع تھا ارے لئے نفع کا سودا اور مبارک ہے، کیونکہ ایک فانی چیز جان و مال دے کر ہمیشہ باقی رہنے والی چیز بدلے میں ملے گی اور غور کیا جائے تو خرچ صرف مال ہوا، جان تو یعنی رُوح تو مرنے کے بعد بھی باقی رہے گی اور ہمیشہ رہے گی، اور مال پر غور کیا جائے تو وہ بھی تو حق تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے، انسان تو اپنی پیدائش کے وقت خالی ہاتھ آیا تھا، اسی نے سب سامان اور مال و دولت کا اس کو مالک بنایا ہے، اپنے ہی عطیہ کو آخرت کی نعمتوں اور جنت کا معاوضہ بنا کر جنت دیدی، اسی لئے حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ یہ عجیب بیع ہے کہ مال اور قیمت دونوں تمہیں ہی دیدیتے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ سنو! یہ کیسی نفع کی تجارت ہے جو اللہ نے ہر مؤمن کیلئے کھول دی ہے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تمہیں مال بخشا ہے تم اس میں سے تھوڑا خرچ کر کے جنت خرید لو (مظہری)

اَللّٰهُ يَبُوْنُ الْخَبِيْرُوْنَ الْاٰیۃ، یہ صفات انہی مؤمنین کی ہیں جن کے بارے میں

اور پر یہ فرمایا کہ اللہ نے ان کی جان اور مال کو جنت کے بدلے خرید لیا ہے۔ نزول اس کا ایک خاص جماعت شرکاء بیعت عقبہ کے لئے ہوا، مگر مفہوم آیت تمام مجاہدین فی سبیل اللہ کو شامل ہے، اور جو اوصاف ان کے اَتَابَتُونَ الخ سے بیان کئے گئے، یہ بشرط کے طور پر نہیں، کیونکہ جنت کا وعدہ مطلقاً جہاد فی سبیل اللہ پر آیا ہے، ان اوصاف کے بیان سے مقصد یہ ہے کہ جو لوگ جنت کے اہل ہوتے ہیں ان کے ایسے اوصاف ہوا کرتے ہیں، خصوصاً بیعت عقبہ میں شریک ہونے والے صحابہ کا یہی حال تھا۔

اَتَابَتُونَ کے معنی جمہور مفسرین کے نزدیک صَائِمُونَ یعنی روزہ داروں کے ہیں، اصل میں یہ لفظ سیاحت سے ماخوذ ہے، اسلام سے پہلے دین نصرا میں سیاحت ایک عبادت سمجھی جاتی تھی کہ انسان اپنے گھر بار کو چھوڑ کر عبادت کے لئے نکل کھڑا ہوا، اسلام میں اس کو رہبانیت قرار دیا گیا، اور اس سے منع کیا۔ اسکے قائم مقام روزہ کی عبادت مقرر کی گئی، کیونکہ حیات کا مقصد ترک دنیا تھا، روزہ ایسی چیز ہے کہ اپنی گھر میں ہی ہو تو ایک معین وقت میں دنیا کی تمام خواہشات کو ترک کر دینا ہوتا ہے اور اسی بنا پر بعض روایا میں جہاد کو بھی حیات قرار دیا گیا ہے، ابن ماجہ، حاکم، بیہقی نے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بِسِيَاحَةٍ أُمَّتِي إِلَى الْجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، یعنی اس امت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں سَائِحِينَ کا لفظ آیا ہے اس سے مراد صَائِمِينَ ہیں، حضرت عکرمہؓ نے سَائِحِينَ کی تفسیر میں فرمایا کہ یہ طالب علم ہیں جو طلب علم کیلئے اپنے گھر بار کو چھوڑ کر نکلتے ہیں (مظہری)

اس جگہ مؤمنین مجاہدین کے اوصاف تَابَتُونَ، عَابَدُونَ، حَامِدُونَ، سَائِحُونَ، رَاكِعُونَ، سَاجِدُونَ، آمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ، شَات چیزیں بیان فرمانے کے بعد اَتَابَتُونَ وصف اَلْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللہ فرمایا، یہ درحقیقت تمام اوصاف مذکورہ سابقہ کا ایک جامع لفظ ہے، گویا سات اوصاف میں جو تفصیل بتلائی گئی اس کا اجمال یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے ہر کام اور کلام میں حدود اللہ یعنی احکام شرعیہ کے پابند ہیں، ان کی حفاظت کرتے ہیں۔

آخر آیت میں فرمایا وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ، یعنی جن مؤمنین کے یہ اوصاف ہوں جو اوپر بیان کئے گئے ان کو ایسی نعمتوں کی خوش خبری سنا دیجئے جن کو کسی کا وہم و خیال بھی نہیں پاسکتا، اور نہ کسی عبارت سے اس کو سمجھایا جاسکتا ہے، اور نہ کسی کے کانوں نے ان کا تذکرہ سنا ہے، مراد جنت کی نعمتیں ہیں۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ

لَا لِقَٰئِهِمْ هُنَا وَلَا فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُصَلُّونَ عَلَيْهِمْ

وَلَوْ كَانُوا أُولَىٰ قُرْبَىٰ مِنِّي بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ

اگرچہ وہ ہوں قرابت والے جبکہ کھل چکا اُن پر کہ وہ ہیں دوزخ

الْجَحِيمِ ۝۱۱۳ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن

والے، اور بخشش مانگنا ابراہیم کا اپنے باپ کے واسطے سو نہ تھا مگر وعدہ

مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ

کے سبب کہ وعدہ کر چکا تھا اس سے، پھر جب کھل گیا ابراہیم پر کہ وہ دشمن ہوا اللہ کا تو اس سے بیزاری ہو گیا

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ۝۱۱۴

بیشک ابراہیم بڑا نرم دل تھا تحمل کرنے والا

خلاصہ تفسیر

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کے لئے مغفرت کی دعا مانگیں اگرچہ وہ رشتہ دار ہی (کیوں نہ) ہوں اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں (اس وجہ سے کہ کافر ہو کر مرے ہیں) اور اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ سے شبہ ہو کہ انھوں نے اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت کی تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ (ابراہیم علیہ السلام) کا اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت مانگنا (وہ اس کے قبل تھا کہ اس کا دوزخی ہونا ظاہر ہو جاوے اور) وہ (بھی) صرف وعدہ کے سبب سے تھا جو انھوں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا (اس قول میں سَأَسْتَغْفِرُكَ ذَكَرْتَنِي، غرض جواز تو اس لئے تھا کہ اس کا دوزخی ہونا ظاہر نہ ہوا تھا، اور وقوع کو اس کے ترجیح ہو گئی تھی کہ وعدہ کر لیا تھا، ورنہ باوجود جواز کے بھی وقوع نہ ہوتا) پھر جب ان پر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ وہ خدا کا دشمن (یعنی کافر ہو کر مرا) ہے تو وہ اس سے محض بے تعلق ہو گئے (کہ استغفار بھی چھوڑ دیا، کیونکہ اس وقت دعائے مغفرت کرنا بے معنی ہے، کیونکہ کافر میں احتمال مغفرت کا ہی نہیں، بخلاف حالت حیات کے کہ دعا مغفرت کے معنی اس وقت طلب توفیق ہدایت ہو چکے ہیں کہ توفیق ہدایت کے لئے مغفرت لازم ہے، اور رہا یہ کہ وعدہ کیوں کر لیا تھا وجہ اس کی یہ ہے کہ واقعی ابراہیم (علیہ السلام) بڑے رحیم المزاج حلیم الطبع تھے (کہ باوجودیکہ باپ نے ان کو کیسی کیسی سخت باتیں کہیں، مگر حلم سے کام لیا، اور مزید براں یہ کہ شفقت کے جوش سے وعدہ کر لیا اور احتمال نفع تک اس وعدہ کو پورا فرمایا، جب یا اس ہو گیا بار کر چھوڑ دیا، بخلاف تمھارے استغفار کے کہ مشرکین کے مرنے

..... کے بعد ہو رہا ہے، جن کا حالتِ شرک پر مرنا ظاہر مشاہد سے معلوم ہو اور احکامِ شرعیہ میں ایسا ظاہر کافی ہے، پھر قیاس کب صحیح ہے، اور اس قیاس پر شبہ کب مبنی ہو سکتا ہے؟

معارف و مسائل

سورۃ توبہ پوری کفار و مشرکین سے تیرمی اور علیحدگی کے احکام پر مشتمل ہو، سورۃ کا شروع ہی بِرَآءَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ سے ہوا ہے، اور اسی لئے اس سورۃ کا ایک نام سورۃ برأت بھی معروف ہو اور جس قدر احکام آئے وہ دیہوی زندگی میں کفار و مشرکین سے برأت اور قطعِ تعلق کے متعلق ہیں، اس آیت میں یہی حکم برأت اور قطعِ تعلق کا اخروی زندگی کے لئے آیا ہے کہ مرنے کے بعد کافر و مشرک کے لئے دعا و مغفرت کرنا بھی جائز نہیں، جیسا کہ اس سے پہلے ایک آیت میں منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کیا گیا ہے۔

واقعہ نزول اس آیت کا صحیح بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب اگرچہ مسلمان نہ ہوئے تھے مگر عمر بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت و حفاظت کرتے رہے، اور اس معاملہ میں برادری کے کسی فرد کا کہنا نہیں مانا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا بڑا اہتمام تھا کہ کسی طرح یہ کلمہ اسلام پڑھ لیں، اور ایمان لے آئیں تو شفاعت کا موقع مل جائے گا اور یہ جہنم کے عذاب سے بچ جائیں گے، مرض و وفات میں جب ان کا آخری وقت ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی فکر تھی کہ اس وقت بھی کلمہ شریف پڑھ لیں تو کام ہو جائے، چنانچہ اس حالت میں آپ ان کے پاس پہنچے، مگر ابو جہل، عبداللہ بن امیہ پہلے سے وہاں موجود تھے، آپ نے فرمایا کہ میرے چچا! کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھ لیں تو میں آپ کی بخشش کے لئے کوشش کروں گا، مگر ابو جہل بول اٹھا کہ کیا آپ عبدالطلب کے دین کو چھوڑ دیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مرتبہ پھر اپنا کلام دہرایا، مگر ہر مرتبہ ابو جہل یہی بات کہہ دیتا، یہاں تک کہ آخری کلام میں ابوطالب نے ہی کہا کہ میں عبدالطلب کے دین پر ہوں، اسی حالت میں وفات ہو گئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی کہ میں آپ کے لئے برابر استغفار کرتا رہوں گا، جب تک مجھے اس سے منع نہ کر دیا جائے، اس پر یہ آیت ممانعت کی نازل ہوئی، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو کفار و مشرکین کے لئے دعا و مغفرت کرنے سے منع فرمادیا، اگرچہ وہ قریبی رشتہ دار ہی ہوں۔

اس پر بعض مسلمانوں کو یہ شبہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو اپنے کافر باپ کے لئے دعا کی تھی، اس کے جواب میں دوسری آیت نازل ہوئی، مَا كَانَ اسْتَغْفَارُ

اَبْرٰهٖمَ الْاَیُّہِیْمَؑ جس کا حاصل یہ ہر کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو اپنے والد کے لئے دعا کی تھی اس کا معاملہ یہ ہے کہ شروع میں جب تک ابراہیم علیہ السلام کو یہ معلوم نہ تھا کہ آخر تک کفر ہی پر قائم رہے گا، اسی پر مرے گا، تو اس کا دوزخی ہونا یقینی نہیں تھا، اس وقت انھوں نے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ میں آپ کے لئے دعا بر مغفرت کروں گا، مَا سْتَغْفِرُكَ رَبِّیْؑ، پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے یعنی کفر ہی پر اس کا خاتمہ ہوا ہے تو اس کے بے تعلقی اختیار کر لی اور استغفار کرنا چھوڑ دیا۔

قرآن مجید کے مختلف مواقع میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کے لئے دعا بر مغفرت کرنا منقول ہے وہ سب اسی پر محمول ہونا چاہئے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کو ایمان و اسلام کی توفیق دے تاکہ ان کی مغفرت ہو سکے۔

غزوہ احد میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کو کفار نے زخمی کر دیا تو آپ چہرہ سے خون صاف کرتے ہوئے یہ دعا فرما رہے تھے، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْؕ اِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَؕ ”یعنی یا اللہ میری قوم کی مغفرت فرما دے وہ نادان ہیں، کفار کے لئے اس دعا بر مغفرت کا حاصل بھی یہی ہر کہ ان کو ایمان و اسلام کی توفیق عطا فرما دے کہ یہ مغفرت کے قابل ہو جائیں۔
امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس سے ثابت ہوا کہ زندہ کافر کے لئے اس نیت سے دعا بر مغفرت کرنا جائز ہے کہ اس کو ایمان کی توفیق ہو اور یہ مستحق مغفرت ہو جائے۔

اِنَّ اَبْرٰهٖمَ لَا وَاٰلَہٗٓ حَلِیْمٌؑ لفظ آوَاہ بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، قرطبیؒ نے اس میں پندرہ قول نقل کئے ہیں، مگر سب معانی متقاربہ ہیں، کوئی اختلاف حقیقی نہیں، ان میں سے چند معانی یہ ہیں، بکثرت آہ کرنے والا، یا بکثرت دعا کرنے والا، اللہ کے بندوں پر رحم کرنے والا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہی معنی منقول ہیں۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًاۙ اٰبَعَدَ اِذْ هَدٰیہُمْ حَتّٰی یُبَيِّنَ لَہُمْؕ

اور اللہ ایسا نہیں کہ گمراہ کرے کسی قوم کو جبکہ ان کو راہ پر لا چکا جب تک کھول نہ دے ان پر

مَا یَتَّقُوْنَ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌؕ ۱۱۵ اِنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ

جس ان کو بچنا چاہئے بیشک اللہ ہر چیز سے واقف ہے، اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور

اَلْاَرْضِؕ یٰۤاٰیُّہِیْمَؑ وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرِ ۱۱۶

زمین میں جلاتا ہوا اور مارتا ہوا اور تمہارا کوئی نہیں اللہ کے سوا حمایتی اور نہ مددگار

مُحَلَّص تفسیر

اور اللہ ایسا نہیں کرتا کہ کسی قوم کو ہدایت کے پیچھے گمراہ کر دے جب تک کہ اُن چیزوں کو صاف صاف نہ بتلا دے جن سے وہ بچتے رہیں (پس جب ہم نے تم کو [مسلمانوں کو] ہدایت کی اور اس کے قبل استغفار و التماس کی ممانعت نہ بتلائی تھی تو اس کے کرنے سے تم کو یہ سزا نہیں دی جائے گی کہ تم میں گمراہی کا مادہ پیدا کر دیا جائے) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (سو وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بدون ہمارے بتلائے ہوئے ایسے احکام کو کوئی نہیں جان سکتا، اس لئے ان افعال سے مصرت بھی نہیں پہنچتے دیتے اور) بلاشبہ اللہ ہی کی سلطنت پر آسمانوں اور زمین میں وہی جلاتا اور مارتا ہے، (یعنی ہر طرح کی حکومت اور قدرت اسی کے لئے خاص ہے اس لئے جو چاہے حکم دے سکتا ہے، اور جس ضرر سے چاہے بچا سکتا ہے) اور تمھارا اللہ کے سوا نہ کوئی یار ہے نہ مددگار ہے (بلکہ وہی یار و مددگار ہے اس لئے قبل ہی تم کو ضرر سے بچاتا ہے، اور اگر تم نے بعد میں اطاعت نہ کی تو اور کوئی بچانے والا نہیں)؛

لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ

اللہ مہربان ہوا نبیؐ پر اور مہاجرین اور انصار پر جو

اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ فُلُوكُمْ

ساتھ رہے نبیؐ کے مشکل کی گھڑی میں بعد اس کے کہ قریب تھا کہ دل پھر جائیں

فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝۱۱۹

بعضوں کے ان میں سے پھر مہربان ہوا ان پر بیشک وہ ان پر مہربان ہے رحم کرنے والا

وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِقُوا حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ

اور ان تین شخصوں پر جن کو پیچھے رکھا تھا، یہاں تک کہ جب تنگ ہو گئی ان پر زمین

بِمَا رَجَبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمُ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَنَّهُ لَا مَلْجَأَ

باوجود کشادہ ہونے کے اور تنگ ہو گئیں اُن پر ان کی جانیں اور سمجھ گئے کہ کہیں پناہ نہیں

مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ

اللہ سے مگر اسی کی طرف، پھر مہربان ہوا اُن پر تاکہ وہ پھر آئیں، بیشک اللہ ہی ہے

التَّوَّابِ الرَّحِيمِ ۱۱۸) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا

مہربان رحم والا، اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور رہو

مَعَ الصَّادِقِينَ ۱۱۹)

ساتھ سچوں کے۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حال پر توجہ فرمائی کہ آپ کو نبوت اور امامت جہاد اور تمام خوبیاں عطا فرمائیں، اور مہاجرین اور انصار کے حال پر بھی (توجہ فرمائی کہ ان کو ایسی مشقت کے جہاد میں مستقیم رکھا) جنہوں نے ایسی تنگی کے وقت میں پیغمبر کا ساتھ دیا، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں تزلزل ہو چلا تھا اور جہاد میں جانے سے ہمت ہارنے کو تھے مگر پھر اللہ نے ان (گروہ) کے حال پر توجہ فرمائی کہ ان کو سنبھال لیا اور آخر ساتھ ہو ہی لئے پس بلاشبہ اللہ تعالیٰ سب پر بہت ہی شفیق مہربان ہے کہ اپنی مہربانی سے ہر ایک کے حال پر کس کس طرح توجہ فرمائی، اور ان تین شخصوں کے حال پر بھی (توجہ فرمائی) جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب (ان کی پریشانی کی یہ نوبت پہنچی کہ) زمین باد جو داپنی (اتنی بڑی) فراخی کے ان پر تنگی کرنے لگی اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا (کی گرفت) سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی بجز اس کے کہ اسی کی طرف رجوع کیا جائے (اس وقت وہ خاص توجہ کے قابل ہوئے) پھر ان کے حال پر (بھی خاص) توجہ فرمائی تاکہ وہ آئندہ بھی (ایسے مواقع مصیبت مصیبت میں اللہ کی طرف) رجوع رہا کریں بے شک اللہ تعالیٰ بہت توجہ فرمانے والے بڑے رحم کرنے والے ہیں، اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور (عمل میں) سچوں کے ساتھ رہو (یعنی جو نیت اور بات میں سچے ہیں ان کی راہ چلو کہ تم بھی صدق اختیار کرو) :

معارف و مسائل

یہاں سے چند آیات پہلے آیت وَ الْخُرُوجِ اَعْتَرَفُوا کے بیان میں یہ لکھا گیا تھا کہ غزوہ تبوک کے لئے سب مسلمانوں کو نکلنے کا حکم عام ہونے کے وقت اہل مدینہ کے لوگوں کی پانچ قسمیں ہو گئی تھیں، دو قسمیں مختلفین بغیر ذکر کی تھیں جن کا بیان سابقہ آیات میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے، مذکورہ الصدر آیات میں مؤمنین مخلصین کی تین قسموں کا ذکر ہے، اول وہ لوگ جو حکم جہاد پاتے ہی

فورا تیار ہو گئے، ان کا بیان آیت مذکورہ کے ابتدائی جملے میں اَتَّبِعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ میں ہوا ہے دوسرے وہ لوگ جو ابتداء کچھ تردد میں رہے، مگر پھر سنبھل گئے اور جہاد کے لئے سب کے ساتھ ہو گئے ان کا بیان اسی آیت کے اس جملے میں ہے، مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبَ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ۔ تیسرے وہ مومنین تھے جو اگرچہ وقتی کاہلی و سستی کی وجہ سے جہاد میں نہ گئے، مگر بعد میں نادم اور تائب ہوئے، اور بالآخر ان سب کی توبہ قبول ہو گئی، مگر ان میں پھر دو قسم ہو گئی تھیں یہ کھل دہل آدمی تھے جن میں سے سات آدمیوں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی کے بعد فوراً اپنی ندامت و توبہ کا اظہار اس شان سے کیا کہ اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا، کہ جب تک ہماری توبہ قبول نہ ہوگی بندھے رہیں گے، ان کی آیت توبہ تو اسی وقت نازل ہو گئی جس کا بیان پہلے ہو چکا ہے، تین آدمی وہ تھے جنہوں نے یہ عمل نہیں کیا، ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مقاطعہ کا حکم دیدیا کہ کوئی ان کے ساتھ سلام و کلام نہ کرے، جس سے یہ حضرات سخت پریشان ہو گئے، ان کا ذکر دوسری آیت وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خَلَفُوا میں ہوا ہے، جس میں بالآخر ان کی توبہ کے قبول ہونے کا بیان ہے، اور اس کے ساتھ ہی ان سے مقاطعہ کا حکم ختم کر دیا گیا، لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ، یعنی اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کر لی، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان مہاجرین و انصار کی جنہوں نے تنگی اور تکلیف کے وقت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع کیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ توبہ تو گناہ و معصیت کی وجہ سے ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے معصوم ہیں، ان کی توبہ قبول کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے علاوہ جو صحابہ مہاجرین و انصار اول ہی جہاد کے لئے تیار ہو گئے انہوں نے بھی کوئی قصور نہیں کیا تھا ان کی توبہ کس جبرم کی تھی جو قبول کی گئی۔

جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو گناہ سے بچا دیا، اسی کو توبہ کے نام سے تعبیر کیا گیا یا یہ کہ ان سب حضرات کو حق تعالیٰ نے تواب بنا دیا، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ توبہ کی حاجت و ضرورت سے کوئی شخص مستغنی نہیں، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخصوص صحابہ بھی، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے: وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا، یعنی توبہ کرو اللہ سے سب کے سب، وجہ یہ ہے کہ تقرب الی اللہ کے درجات غیر متناہی ہیں، جو شخص جس مقام پر پہنچا ہے اس سے آگے بھی اس سے بلند مقام ہے، جس کے مقابلہ میں موجودہ مقام پر رک جانا ایک نقص و کوتاہی ہے، مولانا رومیؒ نے اسی مضمون کو ایک شعر میں اس طرح بیان فرمایا ہے

اے برادر بے نہایت درگبی ست : ہرچہ بڑے ہی رسی بروے مایست

اس لحاظ سے موجودہ مقام پر ہونے سے توبہ کی ضرورت ہے، تاکہ اگلا مقام حاصل ہو۔

سَاعَةَ الْحَسْرَةِ، اسی جہاد کے موقع کو قرآن کریم نے سَاعَةَ الْحَسْرَةِ سے تعبیر کیا ہے کیونکہ مسلمان اس وقت افلاس اور تنگی میں تھے احسن بصری فرماتے ہیں کہ دشمن آدمیوں کے لئے ایک سواری تھی جس پر باری باری سوار ہوتے تھے، توشہ سفر بھی بہت کم اور معمولی تھا، دوسری طرف گرمی سخت و شدید تھی، پانی بھی راستہ میں کہیں کہیں اور تھوڑا تھا۔

مِنْ أَعْدٍ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبَ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ، اس میں جو بعض لوگوں کے قلوب کا زَیغ بیان کیا گیا ہے اس سے مراد دین سے انحراف نہیں، بلکہ سختی موسم اور قلتِ سامان کے سبب ہمت ہار دینا اور جہاد سے جان چرانا مراد ہے، روایات حدیث اس پر شاہد ہیں، اسی قصور ان کی توبہ قبول کی گئی۔

وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خَلَقُوا، اس میں خَلَقُوا کے لفظی معنی یہ ہیں کہ جو چھپے چھوڑ دیے گئے مراد یہ ہو کہ جنگی توبہ کا معاملہ تو ختم کیا گیا، یہ تین حضرات... حضرت کعب بن مالک شاعر، اور مرارہ بن ربیع اور بلال بن امیہ رضی اللہ عنہم، تینوں انصاری بزرگ تھے، جو اس سے پہلے بیعت عقبہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسرے غزوات میں شریک رہ چکے تھے، مگر اس وقت اتفاق طور سے اس لغزش میں مبتلا ہو گئے، اور منافقین جو اس جہاد میں اپنے نفاق کی وجہ سے شریک نہیں ہوئے تھے انھوں نے بھی ان کو ایسے ہی مشورے دیئے جس سے اُن کی ہمت ٹوٹ گئی، مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاد سے واپس آئے تو ان سب منافقین نے حاضر ہو کر جھوٹے اعذار پیش کر کے اور جھوٹی قسمیں کھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنا چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی باطنی حالت کو اللہ کے سپرد کیا، اور ظاہری قسموں کو قبول کر لیا، یہ لوگ آرام سے رہنے لگے، کچھ لوگوں نے ان تینوں انصاری بزرگوں کو بھی یہی مشورہ دیا کہ تم بھی جھوٹے عذر کر کے اپنی صفائی پیش کر دو، مگر ان کے دلوں نے ملامت کی کہ ایک گناہ تو جہاد سے تخلف کا کر چکے ہیں، اب دوسرا گناہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹ بولنے کا کریں، اس لئے صاف صاف اپنے قصور کا اعتراف کر لیا، جس کی سزا میں ان سے مقاطعہ سلام و کلام جاری کیا گیا، انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان سب کی حقیقت کھول دی، جھوٹی قسمیں کھا کر عذر کرنے والوں کا پردہ فاش کر دیا، جس کا ذکر اور ان کے انجام بد کا حال اس سے پہلے کئی آیات میں یَعْتَنِي رُؤُونَا لِيُكْمَدَ إِذًا رَجَعْتُمْ إِلَيْنَا سے عَلَيْنَا دَائِرَةُ السَّوْءِ تک بیان ہوا ہے، اور ان تین بزرگوں نے جو سچ بولا اور اعتراف کیا اُن کی توبہ

اس آیت میں نازل ہوئی، اور پچاس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعراض اور صحابہ کرام کے مقاطعہ سلام و کلام کی انتہائی سخت مصیبت بھیلنے کے بعد بڑی سُرخر دئی اور مبارکبادوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں میں مقبول ہوئے۔

الذین انصاری بزرگوں کے واقعہ صحیحین بخاری و مسلم اور اکثر کتب حدیث میں اس واقعہ کے کی تفصیل احادیث صحیحہ سے متعلق حضرت کعب بن مالکؓ کی ایک طویل حدیث لکھی گئی

جو جو بہت سے فوائد اور مسائل اور حقائق پر مشتمل ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس کا پورا ترجمہ یہاں نقل کر دیا جائے، ان تین بزرگوں میں سے ایک کعب بن مالک رضی اللہ عنہ تھے انھوں نے اپنے واقعہ کی تفصیل اس طرح بتلائی ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے غزوات میں شرکت کی میں اُن سب میں بجز غزوہ تبوک کے آپ کے ساتھ شریک رہا، البتہ غزوہ بدر کا واقعہ چونکہ اچانک پیش آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو اس میں شریک ہونے کا حکم بھی نہیں دیا تھا، اور شریک نہ ہونے والوں پر کوئی عتاب بھی نہیں فرمایا تھا اس میں بھی شریک نہ ہو سکا تھا، اور میں لیلۃ العقبہ کی بیعت میں بھی حاضر تھا، جس میں ہم نے اسلام کی حمایت و حفاظت کا معاہدہ کیا تھا، اور مجھے یہ بیعت عقبہ کی حاضری غزوہ بدر کی حاضری سے بھی زیادہ محبوب ہے، اگرچہ غزوہ بدر لوگوں میں زیادہ مشہور ہے، اور میرا واقعہ غزوہ تبوک میں غیر حاضری کا یہ ہر کہ میں کسی وقت بھی اُس وقت سے زیادہ خوش حال اور مالدار نہ تھا۔۔۔۔۔۔ بخدا میرے پاس کبھی اس سے پہلے دو سوار یا جمع نہیں ہوئی تھیں، جو اس وقت موجود تھیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ غزوات کے معاملہ میں یہ تھی کہ مدینہ سے نکلنے کے وقت اپنے ارادے کے اخفا کے لئے ایسا کرتے تھے کہ جس سمت میں جا کر جہاد کرنا ہوتا مدینہ سے اس کے خلاف سمت کو نکلتے تھے، تاکہ منافقین مخبری کر کے قرین مقابل کو آگاہ نہ کر دیں، اور فرمایا کرتے تھے کہ جنگ میں (اس طرح کا) خداع دھوکہ جائز ہے۔

یہاں تک کہ یہ غزوہ تبوک کا واقعہ پیش آیا، (یہ جہاد کئی وجہ سے ممتاز تھا، آپ نے سخت گرمی اور تنگدستی کی حالت میں اس جہاد کا قصد فرمایا، اور سفر بھی بڑی دُور کا تھا، مقابلہ پر دشمن کی قوت اور تعداد بہت زیادہ تھی، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہاد کا کھل کر اعلان کر دیا تاکہ مسلمان اس جہاد کے لئے پوری تیاری کر سکیں۔

اس جہاد میں شریک ہونے والوں کی تعداد صحیح مسلم کی روایت کے مطابق دس ہزار سے زائد تھی، اور حاکم کی روایت حضرت معاذؓ سے یہ ہے کہ ہم اس جہاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ نکلے تو ہماری تعداد تیس ہزار سے زائد تھی۔

اور اس جہاد میں نکلنے والوں کی کوئی ہزست نہیں لکھی گئی تھی اس لئے جو لوگ جہاد میں جانا نہیں چاہتے تھے ان کو یہ موقع مل گیا کہ ہم نہ گئے تو کسی کو خبر بھی نہ ہوگی، جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاد کے لئے نکلے تو وہ وقت تھا کہ کجوریں پک رہی تھیں، باغات والے انہیں مشغول تھے، اسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں نے سفر کی تیاری شروع کر دی، اور جمعرات کے روز آپ نے اس سفر کا آغاز کیا، اور سفر کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعرات کا دن پسند تھا، خواہ سفر جہاد کا ہو یا کسی دوسرے مقصد کا۔

میرا حال یہ تھا کہ میں روز صبح کو ارادہ کرتا کہ جہاد کی تیاری کر دوں مگر بغیر کسی تیاری کے واپس آجاتا، میں دل میں کہتا تھا کہ میں جہاد پر قادر ہوں مجھے نکلنا چاہیے، مگر یوں ہی امر و زور و فرا میں میرا ارادہ ٹلتا رہا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمان جہاد کے لئے روانہ ہو گئے، پھر بھی میرے دل میں یہ آثار رہا کہ میں بھی روانہ ہو جاؤں اور کہیں راستہ میں مل جاؤں اور کاش! کہ میں ایسا کر لیتا، مگر یہ کام (افسوس ہو کہ) نہ ہو سکا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد جب میں مدینہ میں کہیں جاتا تو یہ بات مجھے غمگین کرتی تھی کہ اس وقت پورے مدینہ میں یا تو وہ لوگ نظر پڑتے تھے جو نفاق میں ڈوبے ہوئے تھے، یا پھر ایسے بیمار معذور جو قطعاً سفر کے قابل نہ تھے دوسری طرف پورے راستہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا خیال کہیں نہیں آیا یہاں تک کہ تبوک پہنچ گئے، اس وقت آپ نے ایک مجلس میں ذکر کیا کہ کعب بن مالکؓ کو کیا ہوا (وہ کہاں ہیں)؟

بنو سلمہ کے لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا، یا رسول اللہ! ان کو جہاد سے ان کے عمدہ لباس اور اس پر نظر کرتے رہنے نے روکا ہے، حضرت معاذ بن جبلؓ نے عرض کیا کہ تم نے یہ بری بات کہی ہے، یا رسول اللہ! بخدا میں نے ان میں خیر کے سوا کچھ نہیں پایا، یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔

حضرت کعبؓ کا بیان ہے کہ جب مجھے یہ خبر ملی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لا رہے ہیں تو مجھے بڑی فکر ہوئی اور قریب تھا کہ میں اپنی غیر حاضری کا کوئی عذر گھبرا کر تیار کر لیتا اور ایسی باتیں پیش کر دیتا جس کے ذریعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی سے بھل جاتا اور اس کے لئے اپنے اہل اور دوستوں سے بھی مدد لیتا (میرے دل میں یہ خیالات، و وسوس گھومتے رہے) یہاں تک کہ جب یہ خبر ملی کہ حضور تشریف لے آئے ہیں تو خیالات فاسدہ میرے دل سے مٹ گئے اور میں نے سمجھ لیا کہ میں آپ کی ناراضی سے کسی ایسی بنیاد پر نہیں نکل سکتا جس میں جھوٹ

ہو، اس لئے میں بالکل سچ بولنے کا عزم کر لیا کہ مجھے صرف سچ ہی نجات دلا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو (حسب عادت) چاشت کے وقت یعنی صبح کو آفتاب کچھ بلند ہونے کے وقت مدینہ میں داخل ہوئے اور عادت شریفہ یہی تھی کہ سفر سے واپسی کا عموماً یہی وقت ہو کر تا تھا، اور عادت یہ تھی کہ پہلے مسجد میں تشریف لے جاتے، دو رکعتیں پڑھتے، پھر حضرت فاطمہؓ کے پاس جاتے، اس کے بعد ازواج مطہرات سے ملتے تھے۔

اسی عادت کے مطابق آپؐ ازل مسجد میں تشریف لے گئے، دو رکعت ادا کی، پھر مسجد میں بیٹھ گئے جب لوگوں نے یہ دیکھا تو غزوہ تبوک میں نہ جانے والے منافقین جن کی تعداد انہی سے کچھ اور تھی خدا میں حاضر ہو کر جھوٹے عذر پیش کر کے اس پر جھوٹی قسمیں کھانے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ظاہری قول و قرار اور قسموں کو قبول کر لیا، اور ان کو بیعت کر لیا، ان کے لئے دعا پر مغفرت فرمائی اور ان کے باطنی حالات کو اللہ کے سپرد کیا۔

اسی حال میں میں بھی حاضر خدمت ہو گیا، اور چلتے چلتے سامنے جا کر بیٹھ گیا، جب میں نے سلام کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا تبسم فرمایا جیسے ناراض آدمی کبھی کیا کرتا ہے اور بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا رخ پھیر لیا، تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ مجھ سے چہرہ مبارک کیوں پھیرتے ہیں، خدا کی قسم میں نے نفاق نہیں کیا، نہ دین کے معاملہ میں کسی شبہ و شک میں مبتلا ہوا، نہ اس میں کوئی تبدیلی کی آپ نے فرمایا کہ پھر جہاد میں کیوں نہیں گئے؟ کیا تم نے سواری نہیں خرید لی تھی؟

میں نے عرض کیا بیشک یا رسول اللہؐ اگر میں آپ کے سوا دنیا کے کسی دوسرے آدمی کے سامنے بیٹھتا تو مجھے یقین ہے کہ میں کوئی عذر گھڑ کر اس کی ناراضی سے بچ جاتا، کیونکہ مجھے جدال اور بات بنانے میں مہارت حاصل ہے، لیکن قسم ہے اللہ کی کہ میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اگر میں نے آپ سے کوئی جھوٹی بات کہی جس سے آپ وقتی طور پر راضی ہو جائیں تو کچھ دور نہیں کہ اللہ تعالیٰ..... حقیقت حال آپؐ پر کھول کر مجھ سے ناراض کر دیں گے، اور اگر میں نے سچی بات بتلا دی جس سے بالفعل آپ مجھ پر ناراض ہوں تو مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمادیں گے، صحیح بات یہ ہے کہ جہاد سے غائب رہنے میں میرا کوئی عذر نہیں تھا، میں کسی وقت بھی مالی اور جسمانی طور پر اتنا قوی اور پیسے والا نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص نے تو سچ بولا ہے، پھر فرمایا کہ اچھا جاؤ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق کوئی فیصلہ فرمادیں، میں یہاں سے اٹھ کر چلا تو نبی سلمہ کے چند آدمی میرے پیچھے لگے، اور کہنے لگے کہ اس سے پہلے تو ہمارے علم میں تم نے کوئی گناہ نہیں کیا

یہ تم نے کیا بے وقوفی کی کہ اس وقت کوئی عذر پیش کر دیتے جیسا دوسرے متخلفین نے پیش کیا، اور تمہارے گناہ کی معافی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار کرنا کافی ہو جاتا، بخدا یہ لوگ مجھے بار بار ملا کرتے رہے یہاں تک کہ میرے دل میں یہ خیال آ گیا کہ میں ٹوٹ جاؤں، اور پھر جا کر عرض کروں کہ میں جوبات پہلے کہی تھی وہ غلط تھی، میرا عذر صحیح موجود تھا۔

مگر پھر میں نے دل میں کہا کہ میں ایک گناہ کے دو گناہ نہ بناؤں، ایک گناہ تو تخلف کا سرزد ہو چکا ہے دوسرا گناہ جھوٹ بولنے کا کر گذروں، پھر میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ متخلفین میں کوئی اور بھی میرے ساتھ ہی جس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہو، ان لوگوں نے بتلایا کہ دو آدمی اور ہیں جنہوں نے تمہاری طرح اقرار جرم کر لیا، اور ان کو بھی وہی جواب دیا گیا جو تمہیں کہا گیا ہے، کہ اللہ کے فیصلہ کا انتظار کرو، میں نے پوچھا کہ وہ دو کون ہیں، انہوں نے بتلایا کہ ایک مرارہ ابن ربیع العمری دوسرے ہلال بن امیہ واقعی ہیں۔

ابن ابی حاتم کی روایت میں ہے کہ ان میں سے پہلے (یعنی مرارہؓ) کے تخلف کا تو سبب یہ ہوا کہ ان کا ایک باغ تھا جس کا پھل اس وقت پک رہا تھا، تو انہوں نے اپنے دل میں کہا کہ تم نے اس سے پہلے بہت سے غزوات میں حصہ لیا ہے، اگر اس سال جہاد میں نہ جاؤ تو کیا جرم ہے، اس کے بعد جب انہیں اپنے گناہ پر تنبہ ہوا تو انہوں نے اللہ سے عہد کر لیا کہ یہ باغ میں نے اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا۔

اور دوسرے بزرگ حضرت ہلال بن امیہؓ کا یہ واقعہ ہوا کہ اُن کے اہل و عیال عرصہ سے متفرق تھے، اس موقع پر سب جمع ہو گئے تو یہ خیال کیا کہ اس سال میں جہاد میں نہ جاؤں اپنی اہل و عیال میں بسر کروں، ان کو بھی جب اپنے گناہ کا خیال آیا تو انہوں نے یہ عہد کیا کہ اب میں اپنے اہل و عیال سے علیحدگی اختیار کر لوں گا۔

کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے ایسے دو بزرگوں کا ذکر کیا جو غزوہ بدر کے مجاہدین میں سے ہیں، تو میں نے کہا کہ بس میرے لئے انہی دونوں بزرگوں کا عمل قابل تقلید ہے، یہ کہہ کر میں اپنے گھر چلا گیا۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو ہم تینوں کے ساتھ سلام کلام کرنے سے منع فرمایا، اس وقت ہم تو سب مسلمانوں سے بدستور محبت کرتے تھے مگر اُن سب کا رخ ہم سے پھر گیا تھا۔

ابن ابی شیبہؓ کی روایت میں ہے کہ اب ہمارا حال یہ ہو گیا کہ ہم لوگوں کے پاس جاتے تو کوئی ہم سے کلام نہ کرتا نہ سلام کرتا نہ سلام کا جواب دیتا۔

مستعد عبدالرزاق میں ہے کہ اس وقت ہماری دنیا بالکل بد لگئی ایسا معلوم ہونے لگا کہ نہ وہ لوگ ہیں جو پہلے تھے نہ ہمارے باغ اور مکان ہیں جو پہلے تھے، سب حسبی نظر آنے لگے، مجھے سب بڑی فکر یہ تھی کہ اگر میں اس حال میں مر گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں گے، یا خدا نخواستہ اس عرصہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو میں عمر بھر اسی طرح سب لوگوں میں ذلیل و خوار پھرتا رہوں گا، اس کی وجہ میرے لئے ساری زمین بیگانہ ویرانہ نظر آنے لگی، اسی حال میں ہم پر پچاس راتیں گزر گئیں، اس زمانہ میں میرے دونوں ساتھی (مراہ اور ہلال) تو شکستہ دل ہو کر گھر میں بیٹھ رہے، اور رات دن روتے تھے، لیکن میں جوان آدمی تھا، باہر نکلتا اور چلتا پھرتا تھا اور نماز میں سب مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوتا تھا اور بازار دہنیں پھرتا تھا مگر نہ کوئی مجھ سے کلام کرتا نہ میرے سلام کا جواب دیتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں نماز کے بعد حاضر ہوتا اور سلام کرتا تو یہ دیکھا کرتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لب مبارک کو جواب سلام کیلئے حرکت ہوتی یا نہیں، پھر میں آپ کے قریب ہی نماز پڑھتا تو نظر چڑا کر آپ کی طرف دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ جب میں نماز میں مشغول ہو جاتا ہوں تو آپ میری طرف دیکھتے ہیں اور جب میں آپ کی طرف دیکھتا ہوں تو رخ پھیر لیتے ہیں۔

جب لوگوں کی یہ بیوفائی دراز ہوئی تو ایک وزیر میں اپنے چچا زاد بھائی قتادہ کے پاس گیا جو میرے سب سے زیادہ دوست تھے میں ان کے باغ میں دیوار بچاند کر داخل ہوا اور انکو سلام کیا، خدا کی قسم! انھوں نے بھی میرے سلام کا جواب نہ دیا، میں نے پوچھا کہ اے قتادہ! کیا تم نہیں جانتے کہ میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہوں، اس پر بھی قتادہ نے سکوت کیا، کوئی جواب نہیں دیا، جب میں نے بار بار یہ سوال دہرایا تو تیسری یا چوتھی مرتبہ میں انھوں نے صرف اتنا کہا کہ اللہ جانتا ہے اور اس کا رسول، میں رو پڑا اور اسی طرح دیوار بچاند کر باغ سے باہر آ گیا، اسی زمانہ میں ایک دہلیز میں مدینہ کے بازار میں چل رہا تھا کہ اچانک ملک شام کا ایک نسبی شخص جو غلہ فروخت کرنے کیلئے شام سے مدینہ میں آیا تھا اس کو دیکھا کہ لوگوں سے پوچھ رہا ہے کہ کیا کوئی مجھے کعب بن لکک کا پتہ بتا سکتا ہے؟ لوگوں نے مجھے دیکھ کر میری طرف اشارہ کیا، وہ آدمی میرے پاس آ گیا اور مجھے شاہ غسان کا ایک خط دیا جو ایک شہمی و مال پر لکھا ہوا تھا جس کا مضمون یہ تھا:

”اما بعد! مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ کے نبی نے آپ سے بیوفائی کی اور آپ کو دور کر رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے تمھیں فلت اور ہلاکت کی جگہ میں نہیں رکھا ہے، تم اگر ہمارے یہاں آنا پسند کرو تو آ جاؤ ہم تمھاری مدد کریں گے۔“

میں نے جب یہ خط پڑھا تو کہا کہ یہ اور ایک میرا امتحان اور آزمائش آئی کہ اہل کفر کو مجھ سے اس کی طمع اور توقع ہوگئی (کہ میں ان کے ساتھ مل جاؤں) میں یہ خط لے کر آگے بڑھا ایک دکان پر تنور لگا ہوا تھا اس میں جھونک دیا۔

حضرت کعب فرماتے ہیں کہ جب پچاس یوں سے پچاس راتیں گزر چکی تھیں تو اچانک دیکھا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قاصد خزیمہ بن ثابت میرے پاس آ رہے ہیں، آکر یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا کہ تم اپنی بیوی سے بھی علحدگی اختیار کر لو، میں نے یہ چھا کہ کیا طلاق دیدن یا کیا کروں انھوں نے بتلایا کہ نہیں عملاً اس سے الگ ہو کر بیٹھا جاؤ، اسی طرح کا حکم میرے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی پہنچا، میں نے بیوی سے کہہ دیا کہ تم اپنے میکہ میں چلی جاؤ اور وہیں رہو جب تک اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ فرمادیں۔

میں چلی جاؤ اور وہیں رہو جب تک اللہ تعالیٰ کوئی ایسا موقع نہ ملے۔

ہلال بن امیہؓ کی اہلیہ خولہ بنت عامر یہ حکم سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ ہلال بن امیہؓ ایک بوڑھے ضعیف آدمی ہیں اور کوئی ان کا خادم نہیں، ابن ابی شیبہؒ کی روایت یہ بھی ہے کہ وہ ضعیف البصر بھی ہیں کیا آپ یہ پسند نہیں فرمائیں گے کہ میں انکی خدمت کرتی رہوں، فرمایا کہ خدمت کرنیکی نعمت نہیں البتہ وہ تمھارے پاس شجائیں، انھوں نے عرض کیا کہ وہ تو بوڑھے لپے کی وجہ سے ایسے ہو گئے ہیں کہ انہیں کوئی حرکت ہی نہیں، اور واللہ ان پر تو مسلسل گرہ طاری ہے رات دن روتے رہتے ہیں۔

حرکت ہی نہیں، اور والدان پر مسلسل کر یہ ظاہری ہے رات دن رات ہے۔
 کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں مجھے بھی میرے بعض متعلقین نے مشورہ دیا کہ تم بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 سے بیوی کو ساتھ رکھنے کی اجازت لیں جیسا آپؐ نے ہلال کو اجازت دیدی ہے، میں نے کہا کہ میں ایسا نہیں کروں گا،
 معلوم نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا جواب دیں اس کے علاوہ میں جوان آدمی ہوں (بیوی کو ساتھ رکھنا)
 کے خلاف ہے چنانچہ اسی حال پر میں نے دن راتیں اور گزاریں یہاں تک کہ پچاس راتیں مکمل ہو گئیں، مسند عبد الرحمن
 کی روایت میں ہے کہ اس وقت ہماری تو بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ہتائی رات گزرنیکے وقت نازل
 ہوئی، اُمّ المؤمنین حضرت ام سلمہؓ جو اُس وقت حاضر تھیں انھوں نے عرض کیا کہ اجازت ہو تو کعب بن مالکؓ
 کو اسی وقت اس کی خبر کر دی جائے، آپؐ فرمایا کہ ایسا ہوا تو ابھی لوگوں کا ہجوم ہو جائیگا، رات کی نیند مشکل ہو جائیگی
 کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ پچاسویں رات کے بعد صبح کی نماز پڑھ کر میں اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا تھا اور حالت
 وہ تھی جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کیا ہے کہ مجھ پر میری جان اور زمین باوجود وسعت کے تنگ ہو چکی تھی، اچانک
 میں نے سلع پہاڑ کے اوپر سے کسی چٹانیا لے آدمی کی آواز سنی جو بلند آواز میں کہتا تھا کہ اے کعب بن مالکؓ بشارت ہو۔

میں نے صلح پہارے اوپر سے کی پائی اور اس پر بعد از صلح یہ آواز دی کہ اللہ نے محمد بن عمر کی روایت میں یہ کہ یہ بلند آواز سے کہنے والے ابو بکر تھے جنہوں نے جبل صلح پر چڑھ کر یہ آواز دی کہ اللہ نے کعب کی توبہ قبول فرمائی بشارت ہو اور عقبہ کی روایت میں یہ کہ یہ خوشخبری حضرت کعب کو سننے کے لئے آدمی دوڑے ان میں سے ایک آگے بڑھ گیا تو جو سمجھے رہ گیا تھا اس نے یہ کیا کہ صلح پہاڑ پر چڑھ کر آواز دیدی اور کہا جاتا ہے کہ یہ دوڑنے والے دو بزرگ حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما تھے۔

کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ یہ آواز سنکر میں سجدے میں گر گیا اور انتہائی فرحت سے رونے لگا، اور مجھے معلوم ہو گیا کہ اب کشاہ کی آگئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز کے بعد صحابہ کرام کو ہماری توبہ قبول ہونے کی خبر دی تھی، اب سب طرف کے لوگ ہم تمینوں کو مبارکباد دینے کیلئے دوڑ پڑے، بعض لوگ گھوڑے پر سوار ہو کر میرے پاس پہنچے مگر پہاڑ سے آواز دینے والے کی آواز سب سے پہلے پہنچ گئی۔

کعب بن مالک کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے نکلا تو لوگ جو حق درجہ مجھے مبارکباد دینے کیلئے آرہے تھے، کعبؓ فرماتے ہیں کہ میں مسجد نبویؐ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، آپؐ کے گرد صحابہ کرام کا مجمع ہے، مجھے دیکھ کر سب پہلے طلحہ بن عبید اللہ کھڑے ہو کر میری طرف لپکے اور مجھ سے مصافحہ کر کے قبول توبہ پر مبارکباد دی، طلحہؓ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولتا جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو آپؐ کا چہرہ مبارک خوشی کی وجہ سے چمک اُٹھا، آپؐ نے فرمایا کہ اے کعبؓ! بشارت ہو تمہیں ایسے مبارک دن کی جو تمہاری عمر میں پیدائش سے لیکر آج تک سب زیادہ بہتر دن ہے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ یہ حکم آپؐ کی طرف سے ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے؟ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں، یہ حکم اللہ تعالیٰ کا ہے، تم نے سچ بولا تھا اللہ تعالیٰ نے تمہاری سچائی کو ظاہر فرمادیا۔

جب میں آپؐ کے سامنے بیٹھا تو عرض کیا یا رسول اللہؐ میری توبہ یہ ہو کہ میں اپنے سب مال و متاع سے نکل جاؤں کہ سب کو اللہ کی راہ میں صدقہ کر دوں، آپؐ نے فرمایا نہیں کچھ مال اپنی ضرورت کیلئے رہنے دو یہ بہتر ہے، میں نے عرض کیا کہ اچھا آدھا مال صدقہ کر دوں، آپؐ نے اس سے بھی انکار فرمایا، میں نے پھر ایک تہائی مال کی اجازت مانگی، تو آپؐ نے اس کو قبول فرمایا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ مجھے اللہ نے سچ بولنے کی وجہ سے نجات دی ہے اس لئے میں عہد کرتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں کبھی سچ کے سوا کوئی کلمہ نہیں بولوں گا، پھر فرمایا کہ جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سچ بولنے کا عہد کیا تھا الحمد للہ کہ آج تک کوئی کلمہ جھوٹ کا میری زبان پر نہیں آیا، اور مجھ پر امید ہے کہ اللہ تعالیٰ باقی زندگی میں بھی مجھے اس سے محفوظ رکھیں گے، کعبؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اسلام کے بعد اس سے بڑی نعمت مجھے نہیں ملی کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سچ بولا، جھوٹ سے پرہیز کیا، کیونکہ اگر میں جھوٹ بولتا تو اسی طرح ہلاکت میں پڑ جاتا جس طرح دوسرے جھوٹی قسمیں کھانے والے ہلاک ہوئے، جن کے بارے میں قرآن میں یہ نازل ہوا: **مَنْ حَلَفُونَ بِاللّٰهِ نَكْمًا اِذَا اُنْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ سَلَّكَ اللّٰهُ لَكَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ** تک بعض حضرات نے فرمایا کہ ان تینوں حضرات کے مقاطعہ کا پچاس دن تک جاری رہا شاید اس حکمت پر مبنی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوہ تبوک میں پچاس دن ہی صرف ہوئے تھے (یہ پوری روایت اور تفصیلی واقعہ تفسیر منطوری سے لیا گیا ہے)۔

فوائد متعلقہ حدیث مذکور کعب بن مالکؓ

حضرت کعب بن مالکؓ نے اپنے واقعہ کو جس شرح و بسط اور تفصیل بیان فرمایا ہے اس میں مسلمانوں کے لئے بہت سے فوائد اور ہدایات ہیں، اسی لئے اس جگہ اس حدیث کو پورا لکھا گیا ہے وہ فوائد یہ ہیں:

۱۔ اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت عام غزوات میں یہ تھی کہ جس طرف جانا ہوتا اس کی مخالف سمت سے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوتے تاکہ مخالفین اسلام کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپؐ کس قوم

یا قبیلہ کے جہاد کے لئے جارہے ہیں، اسی کو آپؐ فرمایا اَلْحَرْبُ حُدُودٌ یعنی جنگ میں دھوکہ دینا جائز ہے، اس سے بعض لوگ اس مخالطہ میں پڑ جاتے ہیں کہ جنگ جہاد میں جھوٹ بول کر مخالف کو دھوکہ دینا جائز ہو یہ صحیح نہیں بلکہ مراد اس دھوکہ سے یہ ہے کہ اپنا عمل ایسا کرے جس سے مخالفین دھوکہ میں پڑ جائیں، جیسے جہاد کیلئے مخالف سمت سے نکلتا، صریح جھوٹ بول کر دھوکہ دینا مراد نہیں وہ جنگ میں بھی جائز نہیں، اسی طرح یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ یہ عمل دھوکہ جس کو جائز قرار دیا ہے اس کوئی تعلق عہد معاہدہ سے نہیں اور عہد شکنی صلح ہو یا جنگ کسی حال میں جائز نہیں۔

۳۔ سفر کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعرات کا دن پسند تھا خواہ سفر جہاد کا ہو یا کسی دوسری ضرورت کا۔
۴۔ اپنے کسی بزرگ، مرشد یا استاد یا باپ کو راضی کر نیکی کے لئے جھوٹ بولنا جائز بھی نہیں اور اس کا انجام بھی اچھا نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو حقیقت حال کا علم بذریعہ وحی ہو جاتا تھا، اس لئے جھوٹ بولنے کا انجام بُرا تھا جیسا کہ کعب بن مالکؓ اور دوسرے متخلفین کے واقعہ مذکورہ واضح ہوا، آپؐ کے بعد دوسرے بزرگوں کو وحی تو ہو نہیں سکتی البتہ کشفِ علم ہو جانا بھی ضروری نہیں لیکن تجربہ شاہد ہے کہ جھوٹ بولنے کی ایک نحوست ہوتی ہے کہ قدرتی طور پر ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں کہ بالآخر یہ بزرگ اس سے ناراض ہو ہی جاتا ہے۔

۵۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ کسی گناہ کی سزا میں مسلمانوں کے امیر کو یہ بھی حق ہے کہ کسی شخص سے سلام کلام قطع کر دینے کا حکم دیدے جیسے اس واقعہ میں ان تین بزرگوں کے متعلق پیش آیا۔

۵۔ اس واقعہ سے صحابہ کرام کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ انتہائی محبت معلوم ہوئی کہ اس ناراضی اور مقاطعہ سلام و کلام کے زمانہ میں بھی غایت محبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہی بھی نہیں چھوڑی اور کن انکجیوں سے بچ کر آپؐ کی توجہ اور تعلق کا حال معلوم کرنے کی فکر رہی۔

۶۔ کعب بن مالکؓ کے گہرے دوست قتادہ کا معاملہ، کہ ان کے سلام کا جواب دیا اور کوئی کلام نہ کیا، یہ ظاہر ہے کہ یہ کسی دشمنی یا مخالفت یا بغض سے نہیں بلکہ حکیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی وجہ سے تھا، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنایا ہوا قانون صرف لوگوں کے ظاہر پر نافذ نہ ہوتا تھا بلکہ دلوں پر بھی اس کی حکومت ہوتی تھی اور مفروضہ کسی حال میں اسکے خلاف نہ کرتے تھے اگرچہ سمیں کسی بڑے بڑے دوست و رفیق تھے۔
۷۔ حضرت کعبؓ کے پاس بادشاہِ غسان کا خط آنے اور اس کو تنور میں ڈالنے کے واقعہ صحابہ کرام کے ایمان کی انتہائی پختگی معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کے مقاطعہ سے سخت پریشان ہونیکے علم میں بھی ایک بڑے بادشاہ کے لالچ دلانے سے ان کے دل میں کوئی میلان پیدا نہیں ہوا۔

۸۔ قبولِ توبہ نازل ہونیکے بعد صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ اور عام صحابہ کرامؓ کا کعب بن مالکؓ کو بشارت دینے کیلئے دوڑنا اور اس سے پہلے سب کا سلام و کلام تک سخت پرہیز کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مقاطعہ کے زمانے میں بھی ان سب دلوں میں حضرت کعبؓ کی محبت اور تعلق تھا، مگر حکیم رسولؐ کے سامنے سب کچھ چھوڑا ہوا تھا، جب آیتِ توبہ نازل ہوئی تو ان کے گہرے تعلق کا انداز ہوا۔

۹۔ صحابہ کرام کا حضرت کو جب کو خوشخبری دینے اور مبارکباد کیلئے جانے سے معلوم ہوا کہ کسی خوشی کے موقع پر اپنے دوست احباب کو مبارکباد دینا سنت سے ثابت ہے۔

۱۰۔ کسی گناہ سے توبہ کے وقت مال کا صدقہ کرنا گناہ کے اثر کو زائل کرنے کے لئے بہتر ہے مگر تمام مال خیرات کر دینا اچھا نہیں ایک تہائی مال سے زائد صدقہ کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ، سابقہ آیات میں جو واقعہ تخلّف عن الجہاد کا بعض مخلصین پیش آیا پھر انکی توبہ قبول ہوئی یہ سب نتیجہ ان کے تقویٰ اور خوفِ خدا کا تھا، اس لئے اس آیت میں عام مسلمانوں کو تقویٰ کیلئے ہدایت فرمائی گئی، اور کونو اَمَعَ الصَّادِقِينَ میں اس طرت اشارہ فرمایا گیا کہ صفتِ تقویٰ حاصل ہونیکا طریقہ صالحینِ صادقین کی صحبت اور عمل میں انکی موافقت ہے، اس میں شاید یہ اشارہ بھی ہو کہ جن حضرات سے یہ غرض ہوئی اس میں منافقین کی صحبت مجالست اور انکے مشورہ کو بھی دخل تھا، اللہ کے نافرمانوں کی صحبت سے بچنا چاہئے اور صادقین کی صحبت اختیار کرنا چاہئے، اس جگہ قرآن حکیم نے علماءِ صلحاء کے سچے صادقین کا لفظ اختیار فرما کر عالم و صالح کی پہچان بھی بتلادی ہے کہ صالح صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جس کا ظاہر و باطن یکساں ہو، نیت و ارادے کا بھی سچا ہو قول کا بھی سچا ہو، عمل کا بھی سچا ہو۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا

نہ چاہئے مدینہ والوں کو اور ان کے گرد کے گنواروں کو کہ پیچھے رہ جائیں

عَنْ رَسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَفْسِهِ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ

رسول اللہ کے ساتھ سے اور نہ یہ کہ اپنی جان کو چاہیں زیادہ رسول کی جان سے، یہ اس واسطے کہ

لَا يَصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا

جہاد کرنیوالے نہیں پہنچیں ان کو پیاس اور نہ محنت اور نہ بھوک اللہ کی راہ میں اور نہیں

يَطْرُقُونَ مَوَاطِنًا يَغِيظُ الْكَفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نِيْلًا إِلَّا

قدم رکھتے کہیں جس سے کہ خفا ہوں کافر اور نہ چھیلتے ہیں دشمن سے کوئی چیز مگر لکھا

كُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۲۰﴾

جاتا ہے ان کے واسطے اس کے بدلے نیک عمل بیشک اللہ نہیں ضائع کرتا حق نیکو کرنیوالوں کا،

وَلَا يَنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا

اور نہ خرچ کرتے ہیں کوئی خرچ چھوٹا اور نہ بڑا، اور نہ طے کرتے ہیں کوئی میدان

إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۲۱﴾

مگر لکھ لیا جاتا ہے ان کے واسطے تاکہ بدلہ دے ان کو اللہ بہتر اس کام کا جو کرتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

مدینہ کے رہنماوں کو اور جو دیہاتی ان کے گرد و پیش میں (رہتے) ہیں انکو یہ زیادت تھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ نہ دیں اور نہ یہ (زیادت تھا) کہ اپنی جان کو انکی جان سے عزیز سمجھیں کہ آپ تو تکلیفیں سہیں اور یہ آرام سے بیٹھے رہیں، بلکہ آپ کے ہمراہ جانا ضروری تھا اور یہ (ساتھ جانا ضروری ہونا) اس سبب ہو کہ (علامہ) ادائے حق محبت رسول کے ان مجاہدین کو بات بات پر ثواب حاصل ہوا ہے اگر یہ اخلاص کے ساتھ جلتے انکو بھی یہ ملنا چاہیے انکو اللہ کی راہ ذیعنی جہاد میں جو پیاس لگی اور جو ماندگی پہنچی اور جو بھوک لگی اور جو چلنا چلے جو کفار کے لئے موجب غیظ ہوا ہو اور دشمنوں کی جو کچھ خبر لی ان سب پر ان کے نام ایک ایک نیک کام لکھا گیا (بارہ جہاد بعض امور افعال اختیار یہ نہیں، مگر یہ مقتضائے مقبولیت و محبوبیت ہو کہ امور ضروریہ بھی مثل اعمال غنیات کے موجب ثواب قرار دیے گئے، اور اس وعدہ میں حتمال تخلف کا نہیں کیونکہ) یقیناً اللہ تعالیٰ مخلصین کا اجر ضائع نہیں کرتے (پس وعدہ کر لیا تو ضائع نہ ہو گا) اور (نیز) جو کچھ چھوڑا یا بڑا انھوں نے خرچ کیا اور جتنے میدان انکو ملے کرنے پڑے یہ سب بھی ان کے نام (نیکوں میں) لکھا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے (ان سب کاموں کا) اچھے سے اچھا بدلہ دے (کیونکہ جب ثواب لکھا گیا تو بدلہ ملے گا)۔

معارف و مسائل

ان دونوں آیتوں میں متخلفین کو تخلف پر ملامت اور فہمائش اور شرکاء جہاد کے فضائل اور سلسلہ جہاد قدم قدم پر ہر قول و فعل اور ہر محنت و مشقت پر اجر عظیم کا ذکر ہے جس میں بوقت جہاد دشمن کو کوئی تکلیف پہنچا دینا اور ایسی چال چلنا جس سے ان کو غیظ ہو یہ سب اعمال صالحہ موجب ثواب ہیں۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ

اور ایسے تو نہیں مسلمان کہ کوچ کریں سارے سو کیوں نہ نکلا ہر فرقہ میں سے

فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ

ان کا ایک حصہ تاکہ سمجھ پیدا کریں دین میں اور تاکہ خبر پہنچائیں اپنی قوم کو

إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿۱۲۲﴾

جبکہ لوٹ کر آئیں ان کی طرف تاکہ وہ بچتے رہیں۔

خلاصہ تفسیر

اور ہمیشہ کیلئے (مسلمانوں کو یہ دیکھئے کہ (جہاد کی واسطے) سب کے سب (ہی) نکل کھڑے ہوں کہ اس میں دوسری اسلامی ضروریات معطل ہوتی ہیں) سوال کیا کہ کیا جائے کہ انکی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک ایک چھوٹی جماعت (جہاد میں) جایا کرے (اور کچھ اپنے وطن میں رہ جایا کریں) تاکہ باقی ماندہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں آسے اور آپ کے بعد علماء شہر سے (دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے ہیں اور تاکہ یہ لوگ اپنی قوم کو (جو کہ جہاد میں گئے ہوئے ہیں) جبکہ وہ انکے پاس واپس آویں (دین کی باتیں سن کر خدا کی نافرمانی سے) ڈراویں تاکہ وہ (ان سے دین کی باتیں سن کر بُرے کاموں سے) احتیاط رکھیں۔

معارف و مسائل

سورہ قوبہ میں بڑی اہمیت کیسا تھ غزوہ تبوک کا ذکر مسلسل چلا آیا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نغیر عام کا اعلان کیا گیا تھا کہ سب مسلمان اس میں شریک ہوں، اس حکم کی خلاف ورزی بلا غدر صحیح جائز نہ تھی جو لوگ خلاف ورزی میں مبتلا ہوئے انہیں زیادہ تو منافقین تھے جن کا ذکر بہت سی آیات میں ادھر آیا ہے، کچھ مخلص مؤمن بھی تھے جو وقتی کاہلی اور سستی کے سبب گئے تھے، انکی توبہ حق تعالیٰ نے قبول فرمائی ان سب واقعات بظاہر یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ ہر جہاد اور غزوہ میں سبھی مسلمانوں کو نکلنا فرض اور تخلف حرام ہی، حالانکہ حکم شرعی یہ نہیں بلکہ جہاد عام حالات میں فرض کفایہ ہی، جس کا حکم یہ ہے کہ مسلمانوں کی کچھ جماعت جو جہاد کے لئے کافی ہو جہاد میں مشغول رہے تو باقی مسلمان بھی فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں، ہاں اگر جہاد میں شریک ہونی والی جماعت کافی نہ ہو وہ مغلوب ہونے لگے تو اس پاس کے مسلمانوں پر انکی تقویت کیلئے نکلنا جہاد میں شریک ہونا فرض ہو جاتا ہے، وہ بھی کافی نہ ہو تو ان کے قریب کے لوگوں پر اور وہ بھی کافی نہ ہوں تو انکے متصل جو مسلمان ہیں ان پر یہاں تک کہ سارے عالم کے مسلمانوں پر ایسی حالت میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے جس سے تخلف حرام ہی، اسی طرح فرض ہو سکتی ایک صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا امیر ضرورت سمجھ کر نغیر عام کرے اور سب مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دے، تو اس وقت بھی جہاد کی شرکت فرض اور تخلف حرام ہو جاتا ہے جیسا واقعہ غزوہ تبوک میں نغیر عام کی وجہ پیش آیا، مذکورہ آیت میں اسی حکم کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ غزوہ تبوک میں نغیر عام کی وجہ خصوصی حکم تھا، عام حالات میں جہاد فرض عین نہیں کہ سب مسلمانوں پر جہاد میں جانا فرض ہو کیونکہ جہاد کی طرح اسلام اور مسلمانوں کے اجتماعی مسائل اور جہات بھی ہیں جو جہاد ہی کی طرح فرض کفایہ ہیں انکے لئے بھی مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تقسیم کار کے اصول پر کام کرنا ہی اس لئے سب مسلمانوں کو ہر جہاد میں نکلنا نہیں چاہئے، اسی مضمون کے فرض کفایہ کی حقیقت بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو کام شخصی نہیں اجتماعی ہیں اور سب مسلمانوں پر انکے پورا کرنا کی ذمہ داری ہے انکو شریعت میں فرض کفایہ قرار دیا گیا ہے، تاکہ تقسیم کار کے اصول

پر سب کام اپنی اپنی جگہ چلتے رہیں اور یہ اجتماعی فرائض سب ادا ہوتے رہیں، مسلمان مردوں پر نماز جنازہ اور اسکی تکفین، مساجد کی تعمیر و نگرانی، جہاد اسلامی، سرحدوں کی حفاظت یہ سب اسی فرض کفایہ کے افراد ہیں کہ انکی ذمہ داری تو پورے عالم کے مسلمانوں پر ہے مگر بقدر کفایت کچھ لوگ کر لیں تو دوسرے مسلمان بھی فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اسی فرض کفایہ کے سلسلہ کا ایک اہم کام دینی تعلیم ہے، اس آیت میں خصوصیت اس کے فرض ہونیکا اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ جہاد جیسے اہم فرض میں بھی اس فرض کو چھوڑنا نہیں جس کی صورت یہ ہے کہ ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جہاد کیلئے نکلے، اور باقی لوگ علم دین حاصل کرنے میں لگیں، پھر یہ علم دین حاصل کر کے جہاد میں جانیں والے مسلمانوں کو اور دوسرے لوگوں کو علم دین سکھائیں۔

طلب علم دین فرض ہونا اور اس کے آداب فرض

امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ یہ آیت طلب علم دین کی اصل اور بنیاد ہے، اور غور کیا جائے تو اس آیت میں علم دین کا اجمالی نصاب بھی بتلادیا گیا ہے اور علم حاصل کرنے کے بعد عالم کے فرائض بھی اس لئے اس مضمون کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے: **علم دین کے فضائل** | علم دین کے فضائل اور ثواب عظیم اور اس کے متعلقات پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں اس جگہ چند مختصر روایات نقل کی جاتی ہیں، ترمذی نے حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: جو شخص کسی راستے پر چلے جس کا مقصد علم حاصل کرنا ہو اللہ تعالیٰ اس چلنے کے ثواب میں اس کا راستہ جنت کی طرف کر دینگے، اور یہ کہ اللہ کے فرشتے طالب علم کیلئے اپنے پیر بچھاتے ہیں اور یہ کہ عالم کے لئے تمام آسمانوں اور زمین کی مخلوقات اور پانی کی مچھلیاں عابد استغفار کرتی ہیں، اور یہ کہ عالم کی فضیلت کثرت سے نقلی عبادت کر نیوالے پر ایسی ہے جیسے چودھویں اات کے چاند کی فضیلت باقی سب ستاروں پر، اور یہ کہ علماء، انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، اور یہ کہ انبیاء علیہم السلام سونے چاندی کی کوئی میراث نہیں چھوڑتے لیکن علم کی میراث چھوڑتے ہیں تو جس شخص نے یہ میراث علم حاصل کر لی اس نے بڑی دولت حاصل کر لی“ (از قرطبی) اور دارمی نے اپنے مسند میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ بنی اسرائیل میں دو آدمی تھے، ایک عالم تھا جو صرف نماز پڑھ لیتا اور پھر لوگوں کو دین کی تعلیم دینے میں مشغول ہو جاتا تھا، دوسرا دن بھر روزہ رکھتا، اور رات کو عبادت میں کھڑا رہتا تھا، ان دونوں میں کون افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ آدمی پر“ (یہ روایت امام عبد البر نے کتاب جامع بیان العلم میں سند کیساتھ حضرت ابو سعید خدریؓ سے نقل کی ہے (قرطبی) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک فقیہ شیطان کے مقابلہ میں ایک ہزار عبادت گزاروں سے زیادہ قوی ہے اور بھاری ہے، (ترمذی عن ابن عباسؓ، از مظہری) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے مگر تین عمل ایسے ہیں جن کا ثواب انسان کو مرنے کے بعد بھی پہنچتا رہتا ہے، ایک صدقہ جاریہ، جیسے مسجد یا دینی تعلیم کی عمارت یا رفاہ عام کے ادارے

دوسرے وہ علم جس سے اس کے بعد بھی لوگ نفع اٹھاتے رہیں مثلاً شاگرد عالم ہو گئے، ان سے آگے لوگوں کو علم دین سکھانے کا سلسلہ چلتا رہا، یا کوئی کتاب تصنیف کی جس سے اس کے بعد بھی لوگ فائدہ اٹھاتے رہے،
تیسرے اولاد صالح جو اس کیلئے دعا، اور ایصالِ ثواب کرتی رہے (از قرطبی)

علم دین کے فرض عین اور فرض کفایہ کی تفصیل | ابن عدی اور سیبوی نے بسند صحیح حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ (از مظہری)

”یعنی علم حاصل کرنا فرض ہے ہر ایک مسلمان پر“ یہ ظاہر ہے کہ اس حدیث اور مذکورہ سابقہ احادیث میں علم سے مراد علم دین ہی ہے، دنیوی علوم و فنون عام دنیا کے کاروبار کی طرح انسان کے لئے ضروری ہیں مگر ان کے وہ فضائل نہیں جو احادیث مذکورہ میں آئے ہیں پھر علم دین ایک علم نہیں بہت سے علوم پر مشتمل ایک جامع نظام ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر مسلمان مرد و عورت اس پر قادر نہیں کہ ان سب علوم کو پورا حاصل کر سکے، اس لئے حدیث مذکور میں جو ہر مسلمان پر فرض فرمایا ہے اس سے مراد علم دین کا صرف وہ حصہ ہے جس کے بغیر آدمی نہ فرض ادا کر سکتا ہو نہ حرام چیزوں سے بچ سکتا ہے جو ایمان اسلام کیلئے ضروری ہے، باقی علوم کی تفصیلات قرآن و حدیث کے تمام معارف و مسائل پھر ان سے نکلے ہوئے احکام و شرائع کی پوری تفصیل یہ نہ ہر مسلمان کی قدرت میں ہے نہ ہر ایک پر فرض عین ہے، البتہ پورے عالم اسلام کے ذمہ فرض کفایہ ہے ہر شہر میں ایک عالم ان تمام علوم و شرائع کا ماہر موجود ہو تو باقی مسلمان اس فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور جس شہر یا قصبہ میں ایک بھی عالم نہ ہو تو شہر والوں پر فرض ہے کہ اپنے میں سے کسی کو عالم بنائیں یا باہر سے کسی عالم کو بلا کر اپنے شہر میں رکھیں تاکہ ضرورت پیش آنے پر یا ایک مسائل کو اس عالم سے فتویٰ لے کر سمجھ سکیں، اور عمل کر سکیں اس لئے علم دین میں فرض عین اور فرض کفایہ کی تفصیل یہ ہے کہ :-

فرض عین | ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے کہ اسلام کے عقائد صحیحہ کا علم حاصل کرے اور طہارت، نجاست کے احکام سکھے، نماز روزہ اور تمام عبادات جو شریعت کے فرض و واجب قرار دی ہیں ان کا علم حاصل کرے، جن چیزوں کو حرام یا مکروہ قرار دیا ہو ان کا علم حاصل کرے جس شخص کے پاس بقدر نصاب مال ہو اس پر فرض ہے کہ زکوٰۃ کے مسائل و احکام معلوم کرے، جس کو حج پر قدرت ہو اس کیلئے فرض عین ہے کہ حج کے احکام و مسائل معلوم کرے، جس کو بیع و شراء کرنا پڑے یا تجارت و صنعت یا مزدوری و اجرت کے کام کرنے پڑیں اس پر فرض عین ہے کہ بیع و اجارہ وغیرہ کے مسائل و احکام سکھے، جب نکاح کرے تو نکاح کے احکام و مسائل اور طلاق کے احکام و مسائل معلوم کرے، غرض جو کام شریعت نے ہر انسان کے ذمہ فرض و واجب کیے ہیں ان کے احکام و مسائل کا علم حاصل کرنا بھی ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

علم تصوف بھی فرض عین | احکام ظاہرہ نماز، روزے کو تو سہی جانتے ہیں کہ فرض عین ہیں اور ان کا علم میں داخل ہے حاصل کرنا بھی فرض عین ہے، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے

تفسیر ظہری میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے کہ اعمال باطنہ اور محرمات باطنہ کا علم جو معرفت میں علم تصوف کہا جاتا ہے چونکہ یہ باطنی اعمال بھی ہر شخص پر فرض عین ہیں تو ان کا علم بھی سب پر فرض عین ہے۔

آجکل جس کو علم تصوف کہا جاتا ہے وہ بھی بہت علوم و معارف اور مکاشفات و واردات کا مجموعہ بن گیا ہے۔ اس جگہ فرض عین کے مراد اس کا صرف وہ حصہ ہے جس میں اعمال باطنہ فرض واجب کی تفصیل ہے، مثلاً عقائد صحیحہ جس کا تعلق باطن سے ہے یا صبر، شکر، توکل، قناعت وغیرہ ایک خاص درجے میں فرض ہیں، یا غرور و تکبر، حسد و بغض، بخل و حرص دنیا وغیرہ جو از روئے قرآن سنت حرام ہیں، انکی حقیقت اور اس کے حاصل کرنے یا حرام چیزوں سے بچنے کے طریقے معلوم کرنا بھی ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے، علم تصوف کی اصل بنیاد اتنی ہی ہے جو فرض عین ہے۔

فرض کفایہ | پورے قرآن مجید کے معانی و مسائل کو سمجھنا تمام احادیث کو سمجھنا اور ان میں معتبر اور غیر معتبر کی پہچان پیدا کرنا، قرآن سنت جو احکام و مسائل نکلتے ہیں ان سب کا علم حاصل کرنا، اس میں صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے اقوال و آثار سے واقف ہونا یا اتنا بڑا کام ہے کہ پوری عمر اور سارا وقت اس میں خرچ کر کے بھی پورا حاصل ہونا آسان نہیں اس لئے شریعت نے اس علم کو فرض کفایہ قرار دیا ہے، کہ بقدر ضرورت کچھ لوگ یہ سب علوم حاصل کر لیں تو باقی مسلمان سبکدوش ہو جائیں گے۔

علم دین کا نصاب | قرآن حکیم نے اس جگہ علم دین کی حقیقت اور اس کا نصاب بھی ایک ہی لفظ میں بتلایا ہے، وہ ہے **لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ**، یہ موقع بظاہر اس کا تھا کہ یہاں **يَتَعَلَّمُوْنَ الدِّيْنِ** کہا جاتا، یعنی علم دین حاصل کریں، مگر قرآن نے اس جگہ **تَعَلَّمَ** کا لفظ چھوڑ کر **تَفَقَّه** کا لفظ اختیار فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ علم دین کا محض پڑھ لینا کافی نہیں، وہ تو بہت کافر یہودی نصرانی بھی پڑھتے ہیں، اور شیطان کو سب سے زیادہ حاصل ہے، بلکہ علم دین سے مراد دین کی سمجھ پیدا کرنا ہے، یہی لفظ **تَفَقَّه** کا ترجمہ ہے، اور یہ فقہ سے مشتق ہے، فقہ کے معنی سمجھ بوجھ ہی کے ہیں، یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ قرآن کریم نے

اس جگہ مجرّد کے صیغے سے **لِيَتَفَقَّهُوْا الدِّيْنِ** یعنی تاکہ دین کو سمجھ لیں نہیں فرمایا بلکہ **لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ** فرمایا، جو باب **تَفَعَّلَ** سے اس کے معنی میں محنت و مشقت کا مفہوم شامل ہے مراد یہ ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ

پیدا کرنے میں پوری محنت و مشقت اٹھا کر مہارت حاصل کریں، یہ بھی ظاہر ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ صرف اتنی بات پیدا نہیں ہوتی کہ طہارت، نجاست یا نماز، روزے، زکوٰۃ حج کے مسائل معلوم کرے، بلکہ دین کی سمجھ بوجھ

یہ ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ اس کے ہر قول و فعل اور حرکت و سکون کا آخرت میں اس کا حساب لیا جائے گا، اس کو اس دنیا میں کس طرح رہنا چاہئے، دراصل اسی فکر کا نام دین کی سمجھ بوجھ ہے، اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ

رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی تعریف یہ کی ہے کہ انسان ان تمام کاموں کو سمجھ لے جن کا کرنا اس کے لئے ضروری ہے، اور ان تمام کاموں کو بھی سمجھ لے جن سے بچنا اس کے لئے ضروری ہے، آجکل جو علم فقہ مسائل

جزئیہ کے علم کو کہا جاتا ہے یہ بعد کی اصطلاح ہے، قرآن و سنت میں فقہ کی حقیقت وہی ہے جو

امام عظیمؒ نے بیان فرمائی ہے کہ جس شخص نے دین کی کتابیں سب پڑھ ڈالیں مگر یہ سمجھ بوجھ پیدا نہ کی وہ قرآن و سنت کی اصطلاح میں علم نہیں، اس تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ علم دین حاصل کرنے کا مفہوم قرآن کی اصطلاح میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہے وہ جن ذرائع سے حاصل ہو وہ ذرائع خواہ کتابیں ہوں یا اساتذہ کی صحبت، سب اس نصاب کے اجزاء ہیں۔

علم دین حاصل کرنے کے | اس جگہ قرآن کریم نے اس کو بھی ایک ہی جملہ میں پورا بیان فرمادیا ہے، وہ ہے **لِیَسْتَنیٰ ذُوَ اَقْوَمُ مَعَهُمْ** بعد علم کے فرائض یعنی تاکہ وہ اپنی قوم کو اللہ کی نافرمانی سے ڈرائیں۔ یہاں بھی یہ بات قابل نظر ہے کہ اس جملہ

میں علم کا فرض انذار قوم بتلایا ہے، انذار کا لفظی ترجمہ ہم اراد میں ڈرانے سے کرتے ہیں مگر یہ اس کا پورا ترجمہ نہیں اردو زبان کی تنگی کی وجہ سے کوئی ایک لفظ اس کے پورے ترجمہ کو ادا نہیں کرتا، حقیقت یہ ہے کہ ڈرانا کسی طرح کا ہوتا ہے، ایک ڈرانا دشمن چور ڈاکو یا کسی درندہ زہریلے جانور سے ہے، ایک ڈرانا وہ ہے جو باپ اپنی شفقت اولاد کو تکلیف دہ چیزوں جیسے آگ، زہریلے جانور، مضر غذا، سے ڈراتا ہے جس کا منشاء شفقت و محبت ہوتی ہے، اس کا لب لباب بھی کچھ اور ہی ہوتا ہے، انذار اسی قسم کے ڈرانے کا نام ہے اسی لئے پیغمبروں اور رسولوں کو نذیر کا لقب دیا گیا ہے اور علم کا یہ فرض انذار درحقیقت وراثت نبوت ہی کا جز ہے جو بنص حدیث علم کو حاصل ہوتی ہے۔

مگر یہاں قابل غور یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ذوق لب میں بشیر اور نذیر، نذیر کے معنی تو ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں بشیر کے معنی ہیں بشارت اور خوشخبری سنانیوالا، انبیاء علیہم السلام کا ایک کام یہ بھی ہے کہ نیک عمل کرنے والوں کو بشارت سنائیں، اس جگہ بھی اگرچہ صراحت ذکر انذار کا کیا گیا ہے، مگر دوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کا فرض یہ بھی ہے کہ نیک کام کرنے والوں کو بشارت بھی سنائے، لیکن اس جگہ صرف انذار کے ذکر پر اکتفاء کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے ذمے دو کام ہیں ایک یہ کہ جو عمل اس کے لئے دنیا و آخرت میں مفید ہیں انکو اختیار کرے دوسرے یہ کہ جو عمل اس کیلئے مضر ہیں ان سے بچے، باتفاق علماء و عقلاء ان دونوں کاموں میں سے دوسرا کام سب سے مقدم اور اہم ہے، اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں جلب منفعت اور دفع مضرت کے دو لفظوں کے تعبیر کر کے دفع مضرت کو جلب منفعت سے مقدم قرار دیا ہے، اس کے علاوہ دفع مضرت میں ایک حیثیت کے جلب منفعت کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے، کیونکہ جو کام انسان کیلئے مفید اور ضروری ہیں ان کا ترک بڑی مضرت ہے تو جو شخص مضرت اعمال سے بچنے کا اہتمام کرے گا وہ اعمال ضروریہ ترک بھی کرے گا بھی اہتمام کرے گا یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آجکل جو عموماً وعظ و تبلیغ بہت کم مؤثر ہوتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں انذار کے آداب نہیں ہوتے جس کے طرز بیان اور لب لہجے سے شفقت و رحمت اور خیر خواہی مترشح ہو، مخاطب کو یقین ہو کہ اس کے کلام کا مقصد مجھے رسوا کرنا ہے نہ بدنام کرنا نہ اپنے دل کا غبار نکالنا، بلکہ یہ جس چیز کو میرے لئے مفید اور ضروری سمجھتا ہے وہ محبت کی وجہ مجھے بتلا رہا ہے، اگر آج ہماری تبلیغ اور خلافت شرع امور کے مرتکب لوگوں کو اصلاح کی دعوت کا یہ طرز ہو جائے تو اس کا ایک نتیجہ تو قطعاً لازم ہی ہے کہ مخاطب کو ہماری گفتگو سے ضد پیدا نہیں ہوگی، وہ جواب دہی کی فکر میں پڑنے کے بجائے اپنے اعمال کا جائزہ لینے

اور انجام سوچنے کی طرف متوجہ ہو جائیگا اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو کبھی نہ کبھی اس کو قبول بھی کر لیا اور دوسرا نتیجہ یہ لازمی ہو کہ کم از کم اس باہمی منافرت اور لڑائی جھگڑا پسرا نہیں ہوگا جس میں آج کل ہماری پوری قوم مبتلا ہے۔

آخر میں لَعَلَّہُمْ یَحْذَرُونَ فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ عالم کا کام اتنا ہی نہیں کہ عذاب ڈرا دیا بلکہ اس پر نظر رکھنا بھی ہو کہ اس کی تبلیغ و دعوت کا اثر کتنا اور کیا ہوا، ایک دفعہ مؤثر نہیں ہوتی تو بار بار کرتا رہو، تاکہ اس کا نتیجہ یَحْذَرُونَ برآمد ہو سکے یعنی قوم کا گناہوں سے بچنا، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَكُونُكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلِيَجِدُوا فِيكُمْ

اے ایمان والو! لڑتے جاؤ اپنے نزدیک کے کافروں سے اور چاہئے کہ اُن پر معلوم ہو تمہارا

غِلظۃ وَاَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿۱۲۶﴾ وَإِذَا مَا أَنْزَلْتُ سُورَةً

اندر سختی اور جانو کہ اللہ ساتھ ہی ڈرنے والوں کے، اور جب نازل ہوتی ہی کوئی سورت

فَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَذِهِ إِيْمَانًا فَآمَنَ الَّذِينَ آمَنُوا

تو بعضے ان میں کہتے ہیں کس کا تم میں سے زیادہ کر دیا اس سورت نے ایمان سو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں

فَزَادَتْهُمْ إِيْمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿۱۲۷﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ

ان کا زیادہ کر دیا اس سورت نے ایمان اور وہ خوش وقت ہوتے ہیں، اور جن کے دل میں مرض ہے

مَرَضٌ فَزَادَ قُرْبَهُمُ إِلَىٰ رُجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿۱۲۸﴾

سو اُن کے لئے بڑھادی گندگی پر گندگی اور وہ مرنے تک کافر ہی رہے،

وَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ

کیا نہیں دیکھتے کہ وہ آزمائے جاتے ہیں ہر برس میں ایک بار یا دو بار پھر بھی توبہ نہیں کرتے

وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿۱۲۹﴾ وَإِذَا مَا أَنْزَلْتُ سُورَةً نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ

اور نہ وہ نصیحت پکڑتے ہیں، اور جب نازل ہوتی ہی کوئی سورت تو دیکھنے لگتا ہے ان میں ایک دوسرے

بَعْضُ طَهْلٍ يَرَاكُمْ مِّنْ أَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوا صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ

کی طرف کہ کیا دیکھتا ہے تم کو کوئی مسلمان پھر چل دیتے ہیں، پھر دیتے ہیں اللہ نے دل اُن کے

يَا أَيُّهَا قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿۱۳۰﴾

اے اس واسطے کہ وہ لوگ ہیں کہ سمجھ نہیں رکھتے۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمھارے آس پاس رہتے ہیں اور ان کو تمھارے اندر سختی پانا چاہتے (یعنی جہاد کے وقت بھی مضبوط رہنا چاہئے اور ویسے بھی غیر زمانہ صلح میں ان سے ڈھیلا پن نہ برتنا چاہئے) اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ (کی اعداد) متقی لوگوں کے ساتھ ہے (پس ان سے ڈرو و بومت) اور جب کوئی سورۃ (جدید) نازل کی جاتی ہے تو بعض منافقین و غر بار مسلمین سے بطور تمسخر کہتے ہیں کہ (کہو) اس سورت نے تم میں سے کس کے ایمان میں ترقی دی (آگے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم جو اب چاہتے ہو) سو (سنو) جو لوگ ایمان دار ہیں اس سورت نے ان کے (تو) ایمان میں ترقی دی ہے اور وہ (اس ترقی کے ادراک سے) خوش ہو رہے ہیں (مگر چونکہ وہ امر قلبی ہے اور تم کو نصیب نہیں اس لئے اس کا ادراک بھی نصیب نہیں اور تمسخر کرتے ہو) اور جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) آزار ہو اس سورت نے ان میں ان کی (پہلی) گندگی کیستھ اور (نئی) گندگی بڑھادی (کیونکہ پہلے ایک حصہ قرآن کا انکار تھا اب اس جدید حصہ کا انکار مزید ہوا) اور وہ حالت کفر ہی میں مر گئے (یعنی جو ان میں مر چکے ہیں وہ کافر مرے اور جو اسی اصرار پر رہیں گے وہ کافر مریں گے) حاصل جواب یہ ہوا کہ قرآن میں ایمان کو ترقی دینے کی بیشک خاصیت ہے لیکن محل میں قابلیت بھی تو ہو اور اگر پہلے سے خباثت مستحکم ہو تو اور بھی اس کو استحکام ہو جائے گا (در باغ لاله روید در شورہ بوم خس) اور کیا ان کو نہیں دکھائی دیتا کہ یہ لوگ ہر سال میں ایک بار یا دو بار کسی نہ کسی آفت میں پھنستے رہتے ہیں (مگر) پھر بھی (اپنی حرکات شنیعہ) باز نہیں آتے اور نہ وہ کچھ سمجھتے ہیں (جس سے باز آنی کی آئندہ امید ہو) یعنی ان حوادث سے انکو عبرت پکڑنا اور عبرت پکڑ کر اپنی اصلاح کر لینا چاہئے تھا یہ تو ان کے تمسخر کا بیان ہوا جو اپنی مجالس میں کرتے تھے، آگے تنفر کا بیان ہو جو مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ان سے صادر ہوتا تھا، چنانچہ ارشاد ہوا اور جب کوئی سورۃ (جدید) نازل کی جاتی ہے تو ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں (اور اشارہ سے باتیں کرتے ہیں) کہ تم کو کوئی (مسلمان) دیکھتا تو نہیں کہ اٹھتا ہوا دیکھ لے اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جا لگائے (پھر اشاروں ہی اشاروں میں باتیں کر کے وہاں سے اٹھ کر) چل دیتے ہیں (یہ لوگ مسجد نبوی سے کیا پھرے) خدا تعالیٰ نے ان کا دل (ہی ایمان سے) پھیر دیا ہے اس وجہ سے کہ وہ محض بے سمجھ لوگ ہیں (کہ اپنے نفع سے بھاگتے ہیں) ۛ

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں جہاد کی ترغیب تھی، آیت مذکورہ بالا یا ایہا الذین امنوا قاتلوا الایمیں یہ تفصیل بتلائی گئی ہے کہ کفار تو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں ان سے جہاد و قتال میں ترتیب

کیا ہونا چاہئے، اس آیت میں ارشاد یہ ہے کہ کفار میں سے جو لوگ تم سے قریب ہوں پہلے جہاد ان سے کیا جائے، قریب ہونا مقام کے اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے، کہ جائے سکونت کچھ قریب رہنے والے کفار ہیں وہ جہاد میں مقدم کئے جادیں اور رشتہ نسب اور تعلقات کے اعتبار سے بھی جو قریب ہوں وہ دوسروں کے مقدم کئے جادیں کیونکہ اسلامی جہاد درحقیقت اپنی کی خیر خواہی کے تقاضے سے ہے، اور خیر خواہی وہمدردی میں رشتہ دار و تعلقات والے مقدم ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے: **وَأَمَّا زُعَيْرٌ فَكَانَ الْقَرِيبَ بْنَ**، یعنی اپنے قریبی عزیزوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعمیل فرمائی، اور سب سے پہلے اپنے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے کلمہ حق پہونچایا، اسی طرح مقامی قرب بعد کا اعتبار کر کے مدینہ کے قرب جوار کے کفار بنو قریظہ، بنو نضیر، اہل خیبر کو دوسروں پر مقدم کیا گیا، اس کے بعد باقی عرب سے قتال ہوا، اس کا رخ ہونیکے بعد سب آخر میں کفار روم سے قتال کا حکم ہوا جس کے نتیجے میں غزوہ تبوک کا واقعہ پیش آیا۔ **وَلِيَجِدَنَّ أَفْئِدَةً مِّنْ غُلَظَّةٍ**، غلظت کے معنی شدت و قوت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ کفار کے ساتھ بڑاؤ میں ایسی صورت اختیار کر دے کہ وہ کسی حیثیت سے تمھاری کمزوری محسوس نہ کریں، **فَرَأَوْهُمُ آيْمَانًا**، اس آیت معلوم ہوا کہ آیات قرآنیہ کی تلاوت ان میں غور و فکر اور مقتضی پر عمل کرنے سے ایمان میں ترقی اور زیادتی پیدا ہوتی ہے، یہ زیادتی نور ایمان اور حلاوت ایمان کی ہوتی ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ و رسول کی اطاعت آسان نظر آنے لگتی ہے، عبادت میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے، گناہوں سے طبعی نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور ان سے کلفت محسوس ہونے لگتی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ایمان جب قلب میں آتا ہے تو ایک سفید نورانی نقطہ حبیب ہوتا ہے، پھر جوں جوں ایمان میں ترقی ہوتی ہے تو یہ سفیدی بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ سارا قلب نورانی ہو جاتا ہے، اسی طرح کفر و نفاق شروع میں ایک سیاہ داغ کی طرح قلب پر لگتا ہے، پھر جوں جوں معصی کا ارتکاب اور کفر کی شدت بڑھتی جاتی ہے یہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ پورا قلب سیاہ ہو جاتا ہے (منظری) اسی لئے صحابہ کرام ایک دوسرے کو کہا کرتے تھے کہ کچھ دیر مل کر بیٹھو، دین اور آخرت کی باتوں کا مذاکرہ کرو تاکہ ہمارا ایمان بڑھے۔

يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ، اس میں منافقین کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اپنی نفاق اور عہد شکنی وغیرہ معاصی کی وجہ سے ہر سال مختلف قسم کی مصیبتوں میں کبھی ایک بار کبھی دو بار مبتلا ہوتے رہتے ہیں، کبھی انکے دوست کفار مکہ مغلوب ہو گئے، کبھی انکے نفاق کی باتیں کھل گئیں، اس سے پریشانی میں مبتلا رہے، یہاں ایک دو کا عدد خاص مراد نہیں، بلکہ یہ بتلانا ہے کہ اس کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، کیا ان چیزوں کو دیکھ کر بھی انھیں عبرت نہیں ہوتی۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ

آیا ہر تمھارے پاس رسول تم میں سے ہے، تمھاری ہی اُمت پر جو تم کو تکلیف پہنچے حریص ہے

عَلَيْكُمْ بِالنَّوْمِ نِينَ رَوْفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲۹﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ

تمھاری بھلائی پر ایمان والوں پر نہایت شفیق مہربان ہے، پھر بھی اگر مٹ پھیریں تو کہہ دے

حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿۱۳۰﴾

کافی ہے مجھ کو اللہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی مالک ہر عرش عظیم کا

خلاصہ تفسیر

(اے لوگو! تمھارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمھاری جنس (بشر) سے ہیں رکھ تمکو

نفع حاصل کرنا آسان ہو) جن کو تمھاری مصرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے (چاہتے ہیں کہ تم کو کوئی

ضرر نہ پہنچے) جو تمھاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے پھر بالخصوص)

ایمانداروں کے ساتھ (تو) بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں (ایسے رسول سے مستفید نہ ہونا بڑی محرومی ہو)

پھر اگر اس پر بھی آپ کو رسول ماننے سے اور آپ کے اتباع کرنے سے (وگرنہ دینی کریں تو آپ کہہ دیجئے

(میرا کیا نقصان ہے) میرے لئے (تو) اللہ تعالیٰ (حافظ و ناصر) کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود ہونے

کے لائق نہیں (پس معبودیت اس کے ساتھ مختص ہے تو لامحالہ سارے کمالات علم و قدرت اس میں عیش

ہونگے، پھر مجھ کو کسی کی مخالفت سے کیا اندیشہ) میں نے اسی پر بھروسہ کر لیا اور وہ بڑے بھاری عرش

کا مالک ہے (تو اور چیزیں تو بدرجہ اولیٰ اس کی ملوک ہوں گی، پس اس پر بھروسہ کرنے کے بعد مجھ کو

کوئی اندیشہ نہیں البتہ تم اپنی فکر کر لو، حق کا انکار کر کے کہاں رہو گے) :

معارف و مسائل

یہ سورۃ توبہ کی آخری آیتیں ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پوری خلق خدا پر

خصوصاً مسلمانوں پر سید مہربان اور شفیق و ہمدرد ہونا بیان فرمایا ہے اور آخری آیت میں آپ کو یہ ہدایت

فرمائی ہے کہ آپ کی ساری کوششوں کے باوجود اگر کچھ بھی لوگ ایمان نہ لائیں تو آپ صبر کریں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کریں۔

سورۃ توبہ کے آخر میں مضمون اس لئے لانا مناسب ہوا کہ اس پوری سورت میں کفار سے برارت قطع

تعلق، قتال و جہاد کا ذکر تھا جو دعوت الی اللہ کی آخری صورت ہے، جبکہ زبانی دعوت و تبلیغ سے اصلاح

کی توقع نہ رہے، لیکن اصل کام انبیاء علیہم السلام کا یہی ہے کہ شفقت و رحمت اور ہمدردی و

خیر خواہی کے جذبے سے خلق خدا کو خدا کی طرف آئینی دعوت دیں، اور ان کی طرف سے اعراض یا کوئی تکلیف پیش آئے تو اس کو اللہ کے سپرد کر دیں اس پر توکل کریں، کیونکہ وہ رب عرش عظیم ہے، یہاں عرش عظیم کا رب کہہ کر یہ بتلانا منظور ہے کہ وہ کل کائناتِ عالم پر محیط ہے۔
آخری دو آیتیں حضرت ابی بن کعبؓ کے قول کے مطابق قرآن کی آخری آیتیں ہیں، ان کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، یہی قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے۔ (قرطبی)

ان دو آیتوں کے بڑے فضائل حدیث میں مذکور ہیں، حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص صبح و شام یہ آیتیں سات مرتبہ پڑھ لیا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام کام آسان فرمادیتے ہیں (قرطبی) واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، اللَّهُمَّ وَفِّقْنِي لِتَكْمِيلِهِ
كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضَىٰ وَالطُّفَّ بِنَا فِي تَسْيِيرِكِ عَسِيرٍ فَإِنْ تَسْيِيرُ كُلِّ
عَسِيرٍ عَلَيْكَ يَسِيرٌ ۝

سورۃ توبہ تمام شد

سورۃ یونس علیہ السلام

سُورَةُ يُوسُفَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَتِسْعٌ آيَاتٌ وَاحِدٌ عَشْرٌ مَرُكُوعًا

سورۃ یونس مکہ میں نازل ہوئی ہے اور اسکی ایک سو نو آیتیں ہیں اور گیارہ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ٥

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ۵

الَّذِي تِلْكَ آيَةُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ ① أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ

یہ آیتیں ہیں یہی کتاب کی ، کیا لوگوں کو تعجب ہوا کہ وحی بھیجی

أَوْحَيْنَا إِلَىٰ رَجُلٍ مِّنْهُمْ أَنْ أَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا

ہم نے ایک مرد پر ان میں سے یہ کہ ڈر سنا دے لوگوں کو اور خوشخبری سنا دے ایمان لانیوالوں کو

أَنْ لَهُمْ قَدَمٌ صَدَقَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ قَالَ الْكَافِرُونَ إِنَّ هَذَا

کہ ان کے لئے پایہ سچا ہے اپنے رب کے یہاں ، کہنے لگے مستکر بیشک یہ تو

لَسِحْرٌ مُّبِينٌ ② إِنَّ رَبَّكُمْ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَ

جادوگر ہے صریح ، تحقیق تمہارا رب اللہ ہے جس نے بنائے آسمان اور

الْأَرْضِ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۚ

زمین پچھ دن میں پھر قائم ہوا عرش پر تدبیر کرتا ہے کام کی

مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ ۚ ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ

کوئی سفارش نہیں کر سکتا مگر اس کی اجازت کے بعد ، وہ اللہ ہے رب تمہارا سو اس کی بندگی کرو

أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ③ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا إِنَّهُ

کیا تم دھیان نہیں کرتے ، اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے تم سب کو وعدہ ہے اللہ کا سچا ، وہی

يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

پیدا کرتا ہے اول بار پھر دوبارہ کرے گا اس کو تاکہ بدلہ دے ان کو جو ایمان لائے تھے اور کئے تھے

الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ

کام نیک انصاف کے ساتھ اور جو کافر ہوئے ان کو پینا ہے کھولتا پانی

وَعَذَابٌ أَلِيمٌ كَمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۴﴾

اور عذاب ہے دردناک اس لئے کہ کفر کرتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اللہ کا مطلب تو اللہ کو معلوم ہے، یہ (جو آگے آتی ہیں) پر حکمت کتاب (یعنی قرآن) کی آیتیں ہیں (جو بوجہ حق ہونے کے قابل جاننے کے اور ماننے کے ہیں اور چونکہ جن پر اس کا نزول ہوا ہے ان کی نبوت کا کفار انکار کرتے تھے اس لئے جواب فرماتے ہیں کہ کیا ان مکہ کے لوگوں کو اس بات سے تعجب ہوا کہ ہم نے ان میں سے ایک شخص کے پاس (جو کہ مثل ان کے بشر ہے) وحی بھیج دی (جس کا خلاصہ یہ ہے کہ) عام طور پر، سب آدمیوں کو (احکام خداوندی کے خلاف کرنے پر) ڈرائیے اور جو ایمان لے آئے ان کو یہ خوشخبری سنائیے کہ ان کے رب کے پاس (پہنچ کر) ان کو پورا مرتبہ ملے گا (یعنی اگر ایسا مضمون کسی بشر پر وحی کے ذریعہ سے نازل ہو جاوے تو کوئی تعجب کی وجہ نہیں مگر) کافر (اس قدر تعجب ہوئے کہ آپ کی نسبت کہنے لگے کہ) (نعوذ باللہ) یہ شخص تو بلاشبہ صریح جادوگر ہے (نبی نہیں ہے کیونکہ نبوت بشر کے لئے نہیں ہو سکتی) بلاشبہ تمہارا رب (حقیقی) اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ روز (کی مقدار) میں پیدا کر دیا (پس اعلیٰ درجہ کا قادر ہے) پھر عرش پر (جو مشابہ ہے تخت سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (کہ جو اس کی شان کے لائق ہے تاکہ عرش سے زمین و آسمان میں احکام جاری فرمائے، جیسا آگے ارشاد ہے کہ) وہ ہر کام کی (مناسب) تدبیر کرتا ہے، (پس حکیم بھی ہے، اس کے سامنے) کوئی سفارش کرنے والا (سفارش) نہیں (کر سکتا) بدون اس کی اجازت کے (پس عظیم بھی ہوا، پس) ایسا اللہ تمہارا رب (حقیقی) ہے سو تم اس کی عبادت کرو (اور شرک مت کرو) کیا تم (ان دلائل کے سننے کے بعد) پھر بھی نہیں سمجھتے، تم سب کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے اللہ نے (اس کا) سچا وعدہ کر رکھا ہے، بیشک وہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی (قیامت کو) پیدا کرے گا تاکہ ایسے لوگوں کو جو کہ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے (انصاف کے ساتھ (پوری پوری) جزا دے) اور اس میں ذرا کمی نہ کرے بلکہ بہت کچھ زیادہ دے دے، اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے واسطے (آخرت میں) کھولتا ہوا پانی پینے کو ملے گا، اور دردناک عذاب ہوگا ان کے کفر کی وجہ سے۔

مَعَارِف وَمَسَائِل

سورۃ یونس کی سورتوں میں سے ہے بعض حضرات نے اس کی تشریح آیتوں کو مدنی کہا ہے جو ہجرت مدینہ کے بعد نازل ہوئی ہیں۔

اس سورت میں بھی قرآن اور اسلام کے بنیادی مقاصد توحید، رسالت، آخرت وغیرہ کو کائناتِ عالم اور اس میں ہونے والے تغیرات و مشاہدات سے استدلال کر کے ذہن نشین کیا گیا ہے، اس کے ساتھ کچھ عبرت خیز تاریخی واقعات و قصص کے ذریعہ ان لوگوں کو ڈرایا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ان کھلی نشانیوں پر نظر نہیں کرتے اور اس کے ضمن میں شرک کا ابطال اور اس سے متعلق بعض شبہات کا جواب ارشاد ہوا ہے، یہ خلاصہ ہے مضامین سورت کا، سورت کے ان مضامین پر غور کرنے سے یہ بھی آسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ پچھلی سورت یعنی توبہ اور اس سورت میں باہمی کیا ربط ہے، سورۃ توبہ میں انہی مقاصد کے لئے متکین و کفار کے ساتھ جہاد اور کفر و شرک کی طاقت کو مادی اسباب کے ذریعہ توڑنے کا بیان تھا، اور یہ سورت چونکہ احکام جہاد کے نازل ہونے سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی اس میں مذکورہ مقاصد کو ملکی دور کے قانون کے مطابق صرف دلائل و براہین کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے۔

الذکر، یہ حروف مقطعہ کہلاتے ہیں جو قرآن مجید کی بہت سی سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔ اَللّٰہُ، اَحْمَدُ، عَسَقَ وغیرہ ان کے معانی کی تحقیق میں مفسرین کی بحثیں طویل ہیں، صحابہ و تابعین جمہور سلف کی تحقیق اس قسم کے تمام حروف مقطعہ کے متعلق یہ ہے کہ یہ خاص رموز ہیں ان کے معنی غالباً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلائے گئے ہیں مگر آپ نے عام امت کو صرف ان علوم و معارف سے آگاہ فرمایا جن کو ان کے ذہن برداشت کر سکیں اور جن کے معلوم نہ ہونے سے امت کے کاموں میں کوئی حرج واقع ہوتا ہے، حروف مقطعہ کے رموز ایسے نہیں جن پر امت کا کوئی کام موقوف ہو یا ان کے نہ جاننے سے ان کا کوئی حرج ہو، اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے معانی کو امت کے لئے غیر ضروری سمجھ کر بیان نہیں فرمایا اس لئے ہمیں بھی اس کی تفتیش میں نہ پڑنا چاہئے، کیونکہ یہ امر یقینی ہے کہ اگر ان کے معانی جانتے میں ہماری مصلحت ہوتی تو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بیان کرنے میں کوتاہی نہ فرماتے۔

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ میں لفظ تِلْكَ سے اشارہ اس سورت کی آیات کی طرف

ہے جن کا ذکر آگے آتا ہے اور کتاب سے مراد قرآن ہے اس کی صفت اس جگہ حکیم کے لفظ سے بیان فرمائی ہے جس کے معنی اس جگہ حکمت والی کتاب کے ہیں۔

دوسری آیت میں مشرکین کے ایک شبہ اور اعتراض کا جواب ہے، شبہ کا حاصل یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی جہالت سے یہ قرار دے رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو رسول یا پیغمبر آئے وہ بشر یعنی انسان نہیں ہونا چاہئے بلکہ کوئی فرشتہ ہونا چاہئے، قرآن کریم نے ان کے اس لغو خیال کا جواب کئی جگہ مختلف عنوانات سے دیا ہے، ایک آیت میں ارشاد فرمایا قُلْ لَوْ كَان فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَرْسَلُونَ مَطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا مَّرْسُومًا یعنی اگر زمیں پر بسنے والے فرشتے ہوتے تو ہم ان کے لئے رسول بھی کسی فرشتہ ہی کو بناتے، جس کا حاصل یہ ہے کہ رسالت کا مقصد بغیر اس کے پورا نہیں ہو سکتا کہ جن لوگوں کی طرف کوئی رسول بھیجا جائے ان لوگوں میں اور اس رسول میں باہمی مناسبت ہو، فرشتوں کی مناسبت فرشتوں سے اور انسان کی انسان سے ہوتی ہے، جب انسانوں کے لئے رسول بھیجنا مقصد ہے تو کسی بشر ہی کو رسول بنانا چاہئے۔

اس آیت میں ایک دوسرے انداز سے اسی مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ان لوگوں کا اس بات پر تعجب کرنا کہ بشر کو کیوں رسول بنایا گیا اور اس کو نافرمان انسانوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے اور فرماں برداروں کو اس کے ثواب کی خوشخبری سنانے کا کام کیوں سپرد کیا گیا، یہ تعجب خود قابل تعجب ہے کیونکہ جنس بشر کی طرف بشر کو رسول بنا کر بھیجنا عین مقتضائے عقل ہے۔

اس آیت میں ایمان والوں کو خوش خبری ان الفاظ میں دی گئی اِنَّ لَهُمْ قَدَمًا صَدَقًا عِنْدَ رَبِّهِمْ، اس لفظ قدم کے اصلی معنی تو وہی ہیں جو اردو میں سمجھے جاتے ہیں یعنی پاؤں، چونکہ انسان کی سعی و عمل اور اس کے سبب ترقی کا ذریعہ قدم ہوتا ہے، اس لئے مجازاً بلند مرتبہ کو قدم کہہ دیا جاتا ہے، اور لفظ قدم کی اضافت صدق کی طرف کر کے یہ بتلادیا کہ یہ بلند مرتبہ جو ان کو ملنے والا ہے وہ حق اور یقینی بھی ہے اور قائم و باقی رہنے والا لازوال بھی، دنیا کے منصبوں اور عہدوں کی طرح نہیں کہ کسی عمل کے نتیجہ میں اول تو ان کا حاصل ہونا ہی یقینی نہیں ہوتا اور حاصل بھی ہو جاتے تو ان کا باقی رہنا یقینی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا فانی اور زائل ہونا یقینی ہے، کبھی تو زندگی ہی میں زائل ہو جاتا ہے اور موت کے وقت تو دنیا کے ہر منصب و عہدہ اور دولت و نعمت سے انسان خالی ہاتھ ہو جاتا ہے، غرض لفظ صدق کے مفہوم میں اس کا یقینی ہونا بھی شامل ہے اور کامل مکمل

لازوال ہونا بھی، اس لئے معنی حُملہ کے یہ ہوئے کہ ایمان والوں کو یہ خوشخبری سنا دیجیے کہ ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑا درجہ ہے جو یقینی ملے گا اور لازوال دولت ہوگی۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ لفظ صدق لانے میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جنت کے یہ درجات عالیہ صرف صدق و سچائی اور اخلاص ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں، برا زبانی جمع خرچ اور صرف زبان سے کلمہ ایمان پڑھ لینا کافی نہیں جب تک دل اور زبان دونوں سے سچائی کے ساتھ ایمان اختیار نہ کر لیا جائے جس کا لازمی نتیجہ اعمال صالحہ کی پابندی اور برے اعمال سے پرہیز ہے۔

تیسری آیت میں توحید کو اس ناقابل انکار حقیقت کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے کہ آسمان اور زمین کو پیدا کرنے میں اور پھر پورے عالم کے کاموں کی تدبیر کرنے اور چلانے میں جب اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک اور سا بھی نہیں تو پھر عبادت و طاعت میں کوئی دوسرا کیسے شریک ہو سکتا ہے، بلکہ کسی دوسرے کو اس میں شریک کرنا بڑی بے انصافی اور ظلم عظیم ہے۔ اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا ہے، لیکن ہمارے عرف میں دن اس وقت کو کہا جاتا ہے جو آفتاب کے طلوع ہونے سے غروب ہونے تک ہوتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ آسمان و زمین اور ستاروں کے پیدا ہونے سے پہلے آفتاب ہی کا وجود نہیں تو طلوع و غروب کا حساب کیسے ہو اس لئے مراد یہاں وہ مقدار وقت ہے جو آفتاب کے طلوع و غروب کے درمیان اس جہان میں ہونے والی تھی۔ چھ دن کے تھوڑے سے وقت میں اتنے بڑے جہان کو جو آسمانوں اور زمین اور سیارات اور تمام کائنات عالم پر مشتمل ہے، بنا کر تیار کر دینا اسی ذات قدوس کا مقام ہے جو قادر مطلق ہے اس کی تخلیق کے لئے نہ پہلے سے خام اجناس کا موجود ہونا ضروری ہے اور نہ بنانے کے لئے کسی عملہ اور خدام کی ضرورت ہے بلکہ اس کی قدرت کاملہ کا یہ مقام ہے کہ جب وہ کسی چیز کو پیدا فرمانا چاہیں تو بغیر کسی سامان اور کسی کی امداد کے ایک آن میں پیدا فرمادیں، یہ چھ دن کی مہلت بھی خاص حکمت و مصلحت کی بنا پر اختیار کی گئی ہے ورنہ ان کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ تمام آسمان و زمین اور اس کی کائنات کو ایک آن میں پیدا فرما دیتے۔

اس کے بعد فرمایا لَشَدَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یعنی پھر قائم ہوا عرش پر۔ اتنی بات قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ عرش رحمن کوئی ایسی مخلوق ہے جو تمام آسمانوں اور زمین اور تمام کائنات عالم پر محیط ہے سارا جہاں اس کے اندر سمایا ہوا ہے، اس سے زائد اس کی حقیقت کا معلوم کرنا انسان کے بس کی بات نہیں، جو انسان اپنی سائنس کی انتہائی ترقی کے زمانہ

میں بھی صرف نیچے کے سیاروں تک پہنچنے کی تیاری میں ہے اور وہ بھی ابھی نصیب نہیں اور اس کا یہ اقرار ہے کہ اوپر کے سیارے ہم سے اتنے دور ہیں کہ آلات رصدیہ کے ذریعہ بھی ان کی معلومات تخمینہ اور اندازہ سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور بہت سے ستارے ایسے بھی ہیں جن کی شعاعیں ابھی تک زمین پر نہیں پہنچیں، حالانکہ شعاع نوری کی حرکت ایک منٹ میں لاکھوں میل بتائی جاتی ہے، جب سیاروں اور ستاروں تک انسان کی رسائی کا یہ حال ہے تو آسمان جو ان سب ستاروں اور سیاروں سے اوپر ہے اس کا یہ مسکین انسان کیا حال معلوم کر سکتا ہے، اور پھر جو ساتوں آسمانوں سے بھی اوپر اور سب پر حاوی اور محیط عرش رحمن ہے اس کی حقیقت تک انسان کی رسائی معلوم! آیت مذکورہ سے اتنا معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے چھ دن میں آسمان وزمین اور تمام کائنات بنائی اور اس کے بعد عرش پر قیام فرمایا۔

یہ یقینی اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جسم اور جسمانیت اور اس کی تمام صفات و خصوصیات سے بالا و برتر ہے نہ اس کا وجود کسی خاص سمت اور جہت سے تعلق رکھتا ہے نہ اس کا کسی مکان میں قیام اس طرح کا ہے جس طرح دنیا کی چیزوں کا قیام اپنی اپنی جگہ میں ہوتا ہے، پھر عرش پر قیام فرمانا کس طرح اور کس کیفیت کے ساتھ ہے، یہ ان متشابہات میں سے ہے جن کو انسان کی عقل و فہم نہیں پاسکتی اسی لئے قرآن حکیم کا ارشاد ان کے بارے میں یہ ہے کہ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالشَّيْخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ یعنی ان کو سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، اور مضبوط اور صحیح علم والے اس پر ایمان لانے کا اقرار کرتے ہیں مگر اس کی حقیقت جاننے کی فکر میں نہیں پڑتے، اس لئے اس قسم کے تمام معاملات میں جن میں حق تعالیٰ کی نسبت کسی مکان یا جہت کی طرف کی گئی ہے یا جن میں حق تعالیٰ کے لئے اعضاء، ید، وجہ، ساق وغیرہ کے الفاظ قرآن میں وارد ہوئے، عقیدہ جمہور علمائے امت کا یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لایا جائے کہ یہ کلمات اپنی جگہ پر حق ہیں اور ان سے جو مراد حق تعالیٰ کی ہے وہ صحیح ہے اور اس کی کیفیت و حقیقت کے جاننے کی فکر کو اپنی عقل سے بالاتر ہونے کی بنا پر چھوڑ دیا جائے۔

نہ ہر جائے مرکب توان تاختن کہ جاہا سپر باید انداختن

اور جن متاخرین علماء نے ان چیزوں کے کوئی معنی بیان فرمائے ہیں ان کے نزدیک بھی وہ محض ایک احتمال کے درجہ میں ہیں کہ شاید یہ معنی ہوں، اس معنی کو یقینی وہ نہیں فرماتے اور نہ اسے احتمالات ظاہر ہے کہ کسی حقیقت کا انکشاف نہیں کر سکتے، اس لئے صاف اور سیدھا

مسک سلف صالحین اور صحابہ و تابعین ہی کا ہے جنہوں نے ان چیزوں کی حقیقت کو علم الہی کے سپرد کرنے پر قناعت فرمائی، اس کے بعد فرمایا يُدَبِّرُ الْأَمْرَ یعنی عرش پر مستوی ہو کر وہ تمام عالموں کا انتظام خود دست قدرت سے انجام دیتا ہے۔

مَا مِنْ شَيْءٍ إِلَّا مِنْ عِنْدِ ذِيهِ، یعنی کسی نبی و رسول کو بھی اس کی بارگاہ میں سفارش کرنے کی بذات خود کوئی مجال نہیں، جب تک حق تعالیٰ ہی ان کو سفارش کرنے کی اجازت عطا نہ فرماویں وہ بھی کسی کی سفارش نہیں کر سکتے۔

چوتھی آیت میں عقیدہ آخرت کا بیان ہے إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا یعنی اسی کی طرف لوٹنا ہے تم سب کو، وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا یہ وعدہ، اللہ کا حق اور صحیح، إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ یعنی وہ اول پیدا کرتا ہے تمام مخلوق کو اور وہی اس کو قیامت میں دوبارہ زندہ فرمائے گا، اس جملہ میں بتلادیا کہ اس پر کوئی تعجب کرنے کی جگہ نہیں کہ یہ ساری کائنات فنا ہو جانے کے بعد پھر کیسے زندہ ہوگی کیونکہ جس ذات اقدس کے قبضہ میں یہ ہے کہ اول کسی چیز کو بغیر کسی مادہ کے اور بغیر کسی سابقہ شکل و صورت کے پیدا کر دے اُس کے لئے کیا مشکل ہے کہ پیدا شدہ مخلوق کو فنا کرنے کے بعد پھر دوبارہ پیدا کر دے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَرَهُ

وہی ہے جس نے بنایا سورج کو چمک اور چاند کو چاندنا اور مقرر کیا اس کے لئے

مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللَّهُ

منزلیں تاکہ پہچانو گنتی برسوں کی اور حساب، یوں ہی نہیں بنایا اللہ نے

ذَلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ⑤ إِنَّ فِي

یہ سب کچھ مگر تدبیر سے، ظاہر کرتا ہے نشانیاں ان لوگوں کے لئے جن کو سمجھ ہے، البتہ

اِخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

بدلتے ہیں رات اور دن کے اور جو کچھ پیدا کیا ہے اللہ نے آسمانوں اور زمین میں

لَايَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُونَ ⑥

نشانیاں ہیں ان لوگوں کو جو ڈرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

وہ اللہ ایسا ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو (بھی) نورانی بنایا اور اس

کی چال، کے لئے منزلیں مقرر کیں کہ ہر روز ایک منزل قطع کرتا ہے تاکہ ان اجرام کے ذریعہ سے، تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو، اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں بے فائدہ نہیں پیدا کیں، وہ یہ دلائل ان لوگوں کو صاف صاف بتلا رہے ہیں جو دانش رکھتے ہیں، بلاشبہ رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان سب میں ان لوگوں کے واسطے (توحید کے، دلائل ہیں جو خدا کا، ڈر مانتے ہیں۔

معارف و مسائل

ان آیتوں میں کائناتِ عالم کی بہت سی نشانیاں مذکور ہیں جو اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ پر شاہد اور اس کے دلائل ہیں کہ رب العزت اس پر پوری طرح قادر ہے کہ اس عالم کو فنا کرنے اور ذرہ ذرہ کر دینے کے بعد پھر ان ذرات کو جمع کر دے اور از سر نو ان سب کو زندہ کر دے اور حساب و کتاب کے بعد جزاء و مناز کا قانون نافذ کر دے اور یہ کہ یہی عقل و حکمت کا مقتضی ہے، اس طرح یہ آیتیں اس اجمال کی تفصیل ہیں جو گزشتہ تیسری آیت میں آسمان و زمین کی پھر دن میں پیدائش اور پھر استواء علی العرش کے بعد یَذْبُرُ الْأُمُور کے الفاظ میں بیان کیا تھا کہ اس نے عالم کو صرف پیدا کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ ہر وقت ہر آن میں ہر چیز کا نظام و انتظام بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اسی نظام و انتظام کا ایک جز یہ ہے **هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا** ضیاء اور نور دونوں کے معنی چمک اور روشنی کے ہیں اسی لئے بہت سے ائمہ لغت نے ان دونوں لفظوں کو مرادف کہا ہے، علامہ زنجشیری اور طبیبی وغیرہ نے فرمایا کہ اگرچہ روشنی کے معنی ان دونوں لفظوں میں مشترک ہیں مگر لفظ نور عام ہے، ہر قوی و ضعیف ہلکی اور تیز روشنی کو نور کہا جاتا ہے اور ضوء و ضیاء قوی اور تیز روشنی کو کہتے ہیں، انسان کو دونوں قسم کی روشنیوں کی ضرورت پڑتی ہے، عام کاروبار کے لئے دن کی تیز روشنی درکار ہے اور معمولی کاموں کے لئے رات کی ہلکی روشنی محبوب ہے، اگر دن کو بھی صرف چاند کی بھکی روشنی رہے تو کاروبار میں خلل آئے اور رات کو بھی آفتاب چمکتا رہے تو نیند اور رات کے مناسب کاموں میں خلل آئے، اس لئے قدرت نے دونوں طرح کی روشنی کا انتظام اس طرح فرمایا کہ آفتاب کی روشنی کو ضوء و ضیاء کا درجہ دیا اور کاروبار کے وقت اس کا ظہور فرمایا اور چاند کی روشنی کو ہلکی اور بھکی روشنی بنایا اور رات کو اس کا محل ظہور بنایا۔

قرآن کریم نے شمس و قمر کی روشنیوں میں فرق و امتیاز کو متعدد جگہ مختلف عنوانات سے

بیان فرمایا ہے، سورۃ نوح میں ہے وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا، سورۃ فرقان میں فرمایا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا، سراج کے معنی چراغ کے ہیں اور چونکہ چراغ کا نور ذاتی ہوتا ہے کسی دوسری چیز سے حاصل کردہ نہیں ہوتا اس لئے بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ ضیاء کسی چیز کی ذاتی روشنی کو کہتے ہیں اور نور اس کو جو دوسرے سے مستفاد اور حاصل کردہ ہو، مگر یہ بظاہر یونانی فلسفہ سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے ورنہ لغت میں اس کی کوئی اصل نہیں، اور قرآن کریم نے بھی اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا۔

زجاج نے لفظ ضیاء کو ضوء کی جمع قرار دیا ہے، اس کی رو سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ روشنی کے سات مشہور رنگ اور قسمیں جو دنیا میں پائی جاتی ہیں آفتاب ان تمام اقسام کا جامع ہے جو بارش کے بعد قوس قزح میں ظاہر ہوتے ہیں۔ (منار)

نظام شمس و قمر میں آیات قدرت کا ایک دوسرا مظاہرہ یہ ہے وَقَدَرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ، قَدَرُ لفظ تقدیر سے بنا ہے، تقدیر کے معنی کسی چیز کو زمانہ یا مکان یا صفات کے اعتبار سے ایک مخصوص مقدار اور پیمانہ پر رکھنے کے ہیں، رات اور دن کے اوقات کو ایک خاص پیمانہ پر رکھنے کے لئے قرآن کریم نے فرمایا وَاللَّيْلُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ، مکانی فاصلے اور مسافت کو ایک خاص پیمانہ پر رکھنے کے لئے دوسری جگہ ملک شام اور سبار کی درمیانی بستیوں کے متعلق فرمایا وَقَدَرْنَا فِيهَا السَّيْرَ، اور عام مقایسہ کے متعلق فرمایا وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا۔

لفظ مَنَازِلَ مَنَزِل کی جمع ہے جس کے اصلی معنی جائے نزول کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے شمس و قمر دونوں کی رفتار کے لئے خاص حدود مقرر فرمائی ہیں جن میں سے ہر ایک کو منزل کہا جاتا ہے، چاند چونکہ اپنا دورہ ہر مہینہ میں پورا کر لیتا ہے اس لئے اس کی منزلیں تیس یا اسی ہوتی ہیں مگر چونکہ ہر مہینہ میں چاند کم از کم ایک دن غائب رہتا ہے اس لئے عموماً چاند کی منزلیں اٹھائیس کہی جاتی ہیں، اور آفتاب کا دورہ سال بھر میں پورا ہوتا ہے اس کی منزلیں تین سو ساٹھ یا پینسٹھ ہوتی ہیں، قدیم جاہلیت عرب میں بھی اور اہل ہیئت و ریاضی کے نزدیک بھی ان منزلوں کے خاص خاص نام ان ستاروں کی مناسبت سے رکھ دیئے گئے ہیں جو ان منازل کی محاذات میں پائے جاتے ہیں، قرآن کریم ان اصطلاحی ناموں سے بالاتر ہے، اس کی مراد صرف وہ فاصلے ہیں جن کو شمس و قمر خاص خاص دنوں میں طے کرتے ہیں۔

آیت مذکورہ میں قَدَرَهُ مَنَازِلَ بضمیر مفرد استعمال کیا ہے، حالانکہ منزلیں شمس و قمر دونوں کی ہیں، اس لئے بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اگرچہ ذکر مفرد کا ہے مگر مراد ہر ہر واحد کے

اعتبار سے دونوں ہیں جس کی نظر قرآن اور عربی محاورات میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اگرچہ منزلیں اللہ تعالیٰ نے شمس و قمر دونوں ہی کے لئے قائم فرمادی ہیں مگر اس جگہ بیان صرف چاند کی منازل کا مقصود ہے اس لئے قَدَرُہ کی ضمیر قمر کی طرف راجع ہے، وجہ تخصیص کی یہ ہے کہ آفتاب کی منزلیں تو آلاتِ رصدیہ اور حسابات کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتیں اس کا طلوع و غروب ایک ہی ہیئت میں سال کے تمام ایام میں ہوتا رہتا ہے، مشاہدہ سے کسی کو یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ آج آفتاب کونسی منزل میں ہے، بخلاف چاند کے کہ اس کے حالات ہر روز مختلف ہوتے ہیں آخر ماہ میں بالکل نظر نہیں آتا، اس طرح کے تغیرات کے مشاہدہ سے بے علم لوگ بھی تاریخوں کا پتہ چلا سکتے ہیں، مثلاً آج مارچ کی آٹھ تاریخ ہے کوئی شخص آفتاب کو دیکھ کر یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ آٹھ ہے یا اکیس بخلاف چاند کے کہ اس کو دیکھ کر بھی تاریخ کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔

آیت مذکورہ میں چونکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان عظیم الشان نشانیوں سے انسان کا یہ فائدہ بھی وابستہ ہے کہ ان کے ذریعہ وہ سال اور مہینہ اور اسکی تاریخوں کا حساب معلوم کرے اور یہ حساب بھی اگرچہ شمس و قمر دونوں ہی سے معلوم ہو سکتا ہے اور دنیا میں دونوں طرح کے سال اور مہینے شمسی اور قمری قدیم زمانہ سے معروف بھی ہیں اور قرآن کریم نے بھی سورۃ اسرار کی آیت ۱۷ میں فرمایا وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ، اس میں آیت الیل سے مراد چاند اور آیت النہار سے مراد آفتاب ہے، اور دونوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ ان سے تم سالوں کا عدد اور مہینوں کی تاریخوں کا حساب معلوم کر سکتے ہو، اور سورۃ رحمن میں فرمایا الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ، جس میں بتلایا گیا ہے کہ شمس و قمر دونوں کے ذریعہ تاریخ مہینہ اور سال کا حساب معلوم کیا جاسکتا ہے۔

لیکن قمر کے ذریعہ مہینہ اور تاریخ کا حساب مشاہدہ اور تجربہ سے معلوم ہے بخلاف شمس کے کہ اس کے حسابات سوائے ریاضی والوں کے کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا، اس لئے اس آیت میں شمس و قمر دونوں کا ذکر کرنے کے بعد جب ان کی منازل مقرر کرنے کا ذکر فرمایا تو بضمیر مقررہ قَدَرُہ ارشاد فرما کر منازل صرف قمر کی بیان فرمائی گئیں۔

اور چونکہ احکام اسلام میں ہر جگہ ہر موقع پر اس کی رعایت رکھی گئی ہے کہ ان کی ادائیگی ہر شخص کے لئے آسان ہو خواہ وہ کوئی لکھا پڑھا آدمی ہو یا آن پڑھا، شہری ہو یا دیہاتی، اسی لئے عموماً احکام اسلام میں قمری سن اور مہینہ اور تاریخوں کا اعتبار کیا گیا ہے، نماز، روزہ،

حج، زکوٰۃ، عسرت وغیرہ اسلامی فرائض و احکام میں قمری حساب ہی رکھا گیا ہے۔
اس کے یہ معنی نہیں کہ شمسی حساب رکھنا یا استعمال کرنا ناجائز ہے بلکہ اس کا اختیار ہے کہ کوئی شخص نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور عسرت کے معاملہ میں تو قمری حساب شریعت کے مطابق استعمال کرے مگر اپنے کاروبار، تجارت وغیرہ میں شمسی استعمال کرے، شرط یہ ہے کہ مجموعی طور پر مسلمانوں میں قمری حساب جاری رہے تاکہ رمضان اور حج وغیرہ کے اوقات معلوم ہوتے رہیں، ایسا نہ ہو کہ اسے جنوری فروری وغیرہ کے سوا کوئی مہینے ہی معلوم نہ ہوں، فقہاء رحمہم اللہ نے قمری حساب باقی رکھنے کو مسلمانوں کے ذمہ فرض کفایہ قرار دیا ہے۔

اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ سنت انبیاء اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین میں قمری ہی حساب استعمال کیا گیا ہے اس کا اتباع موجب برکت و ثواب ہے۔

غرض آیت مذکورہ میں اللہ جل شانہ کی قدرت اور حکمت کاملہ کا بیان ہے کہ اس نے روشنی کے دو عظیم الشان خزانے مناسب حال پیدا فرمائے اور پھر ہر ایک کی رفتار کے لئے ایسے پیمانے مقرر فرمادیئے جن سے سال مہینہ تاریخ اور اوقات کے ایک ایک منٹ کا حساب معلوم کیا جاسکتا ہے، نہ کبھی ان کی رفتار میں فرق آتا ہے نہ کبھی آگے پیچھے ہوتے ہیں، نہ ان خدا ساز مشینوں میں کبھی مرمت کا وقفہ ہوتا ہے نہ ان کو گر لینگ کی ضرورت ہوتی ہے، نہ وہ کبھی گھسستی ٹوٹتی ہیں، جس شان سے ازل میں چلا دیا تھا چل رہی ہیں۔

اس کے بعد آخر آیت میں اسی پر مزید تنبیہ کے لئے فرمایا مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ، یعنی ان سب چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے بے فائدہ پیدا نہیں کیا بلکہ ان میں بڑی بڑی حکمتیں اور انسان کے لئے بے شمار فوائد مضمون ہیں، وہ یہ دلائل ان لوگوں کو صاف صاف بتلا رہے ہیں جو عقل و دانش رکھتے ہیں۔

اسی طرح دوسری آیت میں ارشاد فرمایا کہ رات دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے اُن سب میں اُن لوگوں کے واسطے (توحید و آخرت کے) دلائل ہیں جو خدا تعالیٰ کا ڈر مانتے ہیں۔

توحید کے دلائل تو قدرت و صنعت کی یکتائی اور بغیر کسی امداد کے ان تمام چیزوں کو پیدا کرنا اور ایسے نظام کے ساتھ چلانا ہے جو نہ کبھی ٹوٹتا ہے نہ بدلتا ہے۔

اور آخرت کے دلائل اس لئے ہیں کہ جس ذات حکیم نے ان تمام چیزوں کو انسانوں کے

فائدہ کے لئے بنایا اور ایک محکم نظام کا پابند کیا، اُس سے یہ ممکن نہیں کہ اس مخدوم کائنات کو اس نے بے فائدہ محض کھانے پینے کے لئے پیدا کیا ہو، اس کے ذمہ کچھ فرائض نہ لگائے ہوں، اور جب یہ لازم ہوا کہ اس مخدوم کائنات پر بھی کچھ پابندیاں ہونا ضروری ہے تو یہ بھی لازم ہوا کہ ان پابندیوں کو پورا کرنے والوں اور نہ کرنے والوں کا کبھی کہیں حساب ہو، کرنیوالوں کو اچھا بدلہ ملے اور نہ کرنے والوں کو سزا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس دنیا میں تو جزاء و سزا کا یہ دستور نہیں، یہاں تو مجرم بسا اوقات متقی پارسا سے زیادہ اچھی زندگی گزارتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ حساب اور جزاء و سزا کا کوئی دن مقرر ہو، اسی کا نام قیامت اور آخرت ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنَّنُوا

البتہ جو لوگ امید نہیں رکھتے ہمارے ملنے کی اور خوش ہوئے دنیا کی زندگی پر اور اسی پر مطمئن

بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ ﴿۷﴾ أُولَٰئِكَ مَا لَهُمْ النَّارُ

ہو گئے اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں، ایسوں کا ٹھکانہ ہے آگ

بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۸﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

بدلہ اس کا جو کھاتے تھے، البتہ جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے اچھے

يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِآيَاتِهِمْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي

ہدایت کرے گا ان کو رب ان کا ان کے ایمان سے، بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں

جَنَّاتٍ النَّعِيمِ ﴿۹﴾ دَعْوُهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ

باغوں میں آرام کے، ان کی دعا اس جگہ یہ کہ پاک ذات ہے تیری یا اللہ اور ملاقات ان کی

فِيهَا سَلَامٌ ۖ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۰﴾

سلام، اور خاتمہ ان کی دعا کا اس پر کہ سب خوبی اللہ کو جو پروردگار ہے سائے جہاں کا۔

خلاصہ تفسیر

جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں (آخرت کی طلب اصلاً نہیں کرتے) اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں (آئندہ کی کچھ خبر نہیں) اور جو لوگ ہماری آیتوں سے (جو کہ بعثت پر دلالت کرتی ہیں) بالکل غافل ہیں، ایسے لوگوں کا ٹھکانہ ان کے (ان) اعمال کی وجہ سے دوزخ ہے (اور) یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کا رب ان کو بوجہ ان کے مؤمن ہونے کے ان کے مقصد (یعنی جنت)

تک پہنچا دے گا، ان کے مسکن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی چین کے باغوں میں (اور جس وقت وہ جنت میں جاویں گے اور عجائبات کا دفعۃً معائنہ کریں گے تو اس وقت) ان کے منہ سے یہ بات نکلے گی کہ سبحان اللہ اور (پھر جب ایک دوسرے کو دیکھیں گے تو) اُن کا باہمی سلام یہ ہوگا السلام علیکم اور (جب اطمینان سے وہاں جا بیٹھیں گے اور اپنے پرانے مصائب اور متاعب اور اس وقت کے غیر مکرر دائمی عیش کا موازنہ کریں گے تو) ان کی (اس وقت کی باتوں میں) خیریات یہ ہوگی الحمد للہ رب العالمین (جیسا دوسری آیت میں ہے الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ اور حکمت کے خاص خاص مظاہر آسمان اور زمین، شمس و قمر وغیرہ کی تخلیق کا ذکر کر کے عقیدۂ توحید و آخرت کو ایک مبلغ انداز میں ثابت کیا گیا تھا، مذکورہ صدر آیات میں سے پہلی تین آیتوں میں یہ بتلایا گیا ہے کہ کائنات عالم کی ایسی کھلی کھلی نشانیوں اور شہادتوں کے باوجود، انسانوں کے دو طبقے ہو گئے، ایک وہ جس نے ان آیات قدرت کی طرف ذرا دھیان نہ دیا، نہ اپنے پیدا کرنے والے مالک کو پہچانا اور نہ اس پر غور کیا کہ ہم دنیا کے عام جانوروں کی طرح ایک جانور نہیں، رب العزت نے ہمیں ادراک و شعور، عقل و ہوش تمام جانوروں سے زیادہ دیا ہے اور ساری مخلوقات کو ہمارا خادم بنا دیا ہے تو ہمارے ذمہ بھی کوئی کام لگایا ہوگا اور اس کا ہمیں بھی حساب دینا ہوگا جس کے لئے ضروری ہے کہ کوئی روز حساب اور روز جزاء مقرر ہو جس کو قرآن کی اصطلاح میں قیامت اور حشر و نشر سے تعبیر کیا جاتا ہے، بلکہ انہوں نے اپنی زندگی کو عام جانوروں کی سطح پر رکھا، پہلی دو آیتوں میں اُن لوگوں کی خاص علامات بتلا کر ان کی سزائے آخرت کا ذکر کیا گیا ہے، فرمایا کہ ”جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور ان کی حالت یہ ہے کہ آخرت کی دائمی زندگی اور اس کی راحت و تکلیف کو بھلا کر صرف دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے۔“

دوسرے یہ کہ، ”اس دنیا میں ایسے مطمئن ہو کر بیٹھے ہیں کہ گویا یہاں سے کہیں جانا ہی نہیں ہمیشہ ہمیشہ یہیں رہنا ہے، ان کو کبھی یہ دھیان نہیں آتا کہ اس دنیا سے ہر شخص کو خست ہونا تو ایسا بدیہی مسئلہ ہے جس میں کبھی کسی کو شبہ ہی نہیں ہو سکتا، اور جب یہاں سے جانا یقینی ہے تو جہاں جانا ہے وہاں کی کچھ تیاری ہونا چاہئے۔“

تیسرے یہ کہ ”یہ لوگ ہماری آیتوں اور نشانیوں سے مسلسل غفلت ہی غفلت میں ہیں،

اگر وہ آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی عام مخلوقات میں اور خود اپنے نفس میں ذرا بھی غور کرتے تو حقیقت حال کا سمجھنا کچھ مشکل نہ ہوتا اور وہ اس احسان غفلت سے نکل سکتے تھے۔ ایسے لوگ جن کی یہ علامات بتلائی گئیں ان کی سزا آخرت میں یہ ہے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے اور یہ سزا خود ان کے اپنے عمل کا نتیجہ ہے۔

افسوس ہے کہ قرآن کریم نے جو علامات کفار و منکرین کی بتلائی ہیں آج ہم مسلمانوں کا حال ان سے کچھ ممتاز نہیں، ہماری زندگی اور ہمارے شب و روز کے اشغال و افکار کو دیکھ کر کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ ہمیں اس دنیا کے سوا اور بھی کوئی فکر لگی ہوئی ہے اور اس کے باوجود ہم اپنے آپ کو لپکا اور سچا مسلمان باور کئے ہوئے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ سچے اور پکے مسلمان، جیسے کہ ہمارے اسلاف تھے ان کے چہرے دیکھ کر خدا یاد آتا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ کسی ہستی کا خوف اور کسی حساب کی فکر دل میں رکھتے ہیں، اور تو اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی باوجود گناہوں سے معصوم ہونیکے یہی حال تھا، شمائل ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات غمگین اور متفکر نظر آتے تھے۔

تیسری آیت میں ان خوش نصیب انسانوں کا ذکر ہے جنہوں نے اللہ جل شانہ کی آیات قدرت میں غور کیا اور اس کو پہچانا، اس پر ایمان لائے اور ایمان کے مقتضی پر عمل کر کے اعمال صالحہ کے پابند ہو گئے۔

قرآن کریم نے ان حضرات کے لئے دنیا و آخرت میں جو اچھا صلہ اور جزا مقرر فرمائی ہے اس کا ذکر اس طرح فرمایا ہے أُولَٰئِكَ يَهْدِي اللَّهُ لِنُجَاتِهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ، یعنی ان کا رب ان کو ایمان کی وجہ سے منزل مقصود یعنی جنت دکھلائے گا، جس میں چین و آرام کے باغوں میں نہیں بہتی ہوں گی۔

اس میں لفظ ہدایت آیا ہے جس کے مشہور معنی راستہ بتلانے اور دکھلانے کے ہیں، اور کبھی منزل مقصود تک پہنچا دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس مقام پر یہی معنی مراد ہیں اور منزل مقصود سے مراد جنت ہے جس کی وضاحت بعد کے الفاظ میں ہو گئی ہے، جس طرح پہلے طبقہ کی سزا ان کے اپنے کربت کا نتیجہ تھی اسی طرح اس دوسرے مؤمن طبقہ کی جزا کے بارے میں فرمایا کہ یہ بہترین جزا ان کو ان کے ایمان کی وجہ سے ملی ہے اور چونکہ اوپر ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ذکر آچکا ہے اس لئے اس جگہ ایمان سے وہی ایمان مراد ہو گا جس کے ساتھ اعمال صالحہ بھی ہوں، ایمان اور عمل صالح کا بدلہ بے نظیر راحتوں اور نعمتوں کا مقام جنت ہے۔

جو تھی آیت میں جنت میں پہنچنے کے بعد اہل جنت کے چند مخصوص حالات بتلائے ہیں، اول یہ کہ **دَعَا لَهُمْ رَبُّهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ**، اس میں لفظ **دَعَا** اپنے مشہور معنی میں نہیں جو کوئی مدعی اپنے حریف کے مقابلہ میں کیا کرتا ہے، بلکہ اس جگہ لفظ **دَعَا** دعا کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اہل جنت کی دعا جنت میں پہنچنے کے بعد یہ ہوگی کہ وہ سبحانک اللہم کہتے رہیں گے یعنی اللہ جل شانہ کی تسبیح کیا کریں گے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دعا تو عرف عام میں کسی چیز کی درخواست اور کسی مقصد کے طلب کرنے کو کہا جاتا ہے، سبحانک اللہم میں نہ کوئی درخواست ہے نہ طلب، اس کو دعا کس حیثیت سے کہا گیا؟

جواب یہ ہے کہ اس کلمہ سے بتلانا یہ مقصود ہے کہ اہل جنت کو جنت میں ہر راحت ہر مطلب من مانے انداز سے خود بخود حاصل ہوگی، کسی چیز کو مانگنے اور درخواست کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی، اس لئے درخواست و طلب اور معروف دعا کے قائم مقام ان کی زبانوں پر صرف اللہ کی تسبیح ہوگی اور وہ بھی دنیا کی طرح کوئی فریضہ عبادت ادا کرنے کے لئے نہیں بلکہ وہ اس کلمہ تسبیح سے لذت محسوس کریں گے اور اپنی خوشی سے سبحانک اللہم کہا کریں گے، اس کے علاوہ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جو بندہ میری حمد و ثناء میں ہر وقت لگا رہے یہاں تک کہ اس کو اپنے مطلب کی دعا مانگنے کی بھی فرصت نہ رہے تو میں اس کو تمام مانگنے والوں سے بہتر چیز دوں گا یعنی بے مانگ اس کے سب کام پورے کر دوں گا، اس حیثیت سے بھی لفظ سبحانک اللہم کو دعا کہہ سکتے ہیں۔

اسی معنی کے اعتبار سے صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی تکلیف و بے چینی پیش آتی تو آپ یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْعَظِيمُ الْحَلِيمُ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَرَبُّ الْأَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَبِيرِ۔

اور امام طبری نے فرمایا کہ سلف صالحین اس کو دعا کر ب کہا کرتے تھے، اور مصیبت و پریشانی کے وقت یہ کلمات پڑھ کر دعا مانگا کرتے تھے۔ (تفسیر قرطبی)

اور امام ابن جریر، ابن منذر وغیرہ نے ایک یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ اہل جنت کو جب کسی چیز کی ضرورت اور خواہش ہوگی تو وہ سبحانک اللہم کہیں گے، یہ سنتے ہی فرشتے ان کے مطلب کی چیز حاضر کر دیں گے، گویا کلمہ سبحانک اللہم اہل جنت کی ایک خاص اصطلاح ہوگی جس کے ذریعہ وہ اپنی خواہش کا اظہار کریں گے اور ملائکہ ہر مرتبہ اس کو پورا کر دیں گے ہر معافی

و قرطبی، اس لحاظ سے بھی کلمہ سبحانک اللہم کو دُعا کہا جاسکتا ہے۔
 اہل جنت کا دوسرا حال یہ بتلایا کہ تَجِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ، تَجِيَّتُهُ عرف میں اس کلمہ کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ کسی آنے والے یا ملنے والے شخص کا استقبال کیا جاتا ہے جیسے سلام یا خوش آمدید یا اہلاً و سہلاً وغیرہ، اس آیت نے بتلایا کہ اللہ جل شانہ کی طرف سے یا فرشتوں کی طرف سے اہل جنت کا تَجِيَّة لفظ سَلَام سے ہوگا، یعنی یہ خوش خبری کہ تم ہر تکلیف اور ناگوار چیز سے سلامت رہو گے، یہ سلام خود حق تعالیٰ کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے جیسے سورہ یس میں ہے سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبِّ رَحِيمٍ، اور فرشتوں کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے وَالْمَلَائِكَةُ يَذْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ، سَلَامٌ عَلَيْكُمْ یعنی فرشتے اہل جنت کے پاس ہر دروازہ سے سلام علیکم کہتے ہوئے داخل ہوں گے۔ اور ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں کہ کسی وقت براہ راست اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچے اور کسی وقت فرشتوں کی طرف سے، اور سلام کا لفظ اگرچہ دنیا میں دُعا ہے لیکن جنت میں پہنچ کر تو ہر مطلب حاصل ہوگا اس لئے وہاں یہ لفظ دُعا کے بجائے خوش خبری کا کلمہ ہوگا (روح)
 تیسرا حال اہل جنت کا یہ بتلایا کہ اِيْحُدُّغُوْهُمْ اَنْ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، یعنی اہل جنت کی آخری دُعا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہوگی۔

مطلب یہ ہے کہ اہل جنت کو جنت میں پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی معرفت میں ترقی نصیب ہوگی جیسا کہ حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک رسالہ میں فرمایا کہ جنت میں پہنچ کر عام اہل جنت کو علم و معرفت کا وہ مقام حاصل ہو جائے گا جو دنیا میں علماء کا ہے، اور علماء کو وہ مقام حاصل ہو جائے گا جو یہاں انبیاء کا ہے، اور انبیاء کو وہ مقام حاصل ہو جائے گا جو دنیا میں سید الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں قرب خداوندی کا انتہائی مقام حاصل ہوگا، اور ممکن ہے کہ اسی مقام کا نام مقام محمود ہو جس کے لئے اذان کی دُعا میں آپ نے دُعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل جنت کی ابتدائی دُعا سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ اور آخری دُعا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہوگی، اس میں اللہ جل شانہ کی صفات کی دو قسموں کی طرف اشارہ ہے، ایک صفاتِ جلال جن میں اللہ جل شانہ کے ہر عیب اور ہر برائی سے پاک ہونے کا ذکر ہے دوسری صفاتِ اکرام جن میں اس کی بزرگی و برتری اور اعلیٰ کمال کا ذکر ہے، قرآن کریم کی آیت تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ میں ان دونوں قسموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ سبحانیت اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلال میں سے ہے اور حق حمد و ثنا

ہونا صفاتِ اکرام میں سے ہے اور ترتیبِ طبعی کے مطابق صفاتِ جلال صفاتِ اکرام سے مقدم ہیں، اس لئے اہل جنت شروع میں صفاتِ جلال کو بلفظِ سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ بیان کریں گے اور آخر میں صفاتِ اکرام کو بلفظِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ذکر کریں گے، یہی ان کا رات دن کا مشغلہ ہے۔

اور ان تینوں احوال کی ترتیب طبعی یہ ہے کہ اہل جنت جب سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ کہیں گے تو اس کے جواب میں ان کو حق تعالیٰ کی طرف سے سلام پہنچے گا، اس کے نتیجہ میں وہ اَلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ کہیں گے۔ (روح المعانی)

احکام و مسائل | قرطبی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ کھانے پینے اور تمام کاموں میں سنتِ اہل جنت کے اس عمل کے مطابق یہ ہے کہ بسم اللہ سے شروع کرے اور الحمد للہ پر ختم کرے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ بندہ جب کوئی چیز کھائے پئے تو بسم اللہ سے شروع کرے اور فارغ ہو کر الحمد للہ کہے۔

مستحب ہے کہ دعا کرنے والا آخر میں یہ کہہ کرے وَ اِخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ اور قرطبی نے فرمایا کہ اس کے ساتھ بہتر یہ ہے کہ سورہ طہ کی آخری آیتیں بھی پڑھے یعنی سُبْحَانَكَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

وَلَوْ يَعْلَمُ اللَّهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتَعَجَّلَ لَهُمْ بِاخْخِرِ لِقَاضِي إِلَيْهِمْ

اور اگر جلدی پہنچا دے اللہ لوگوں کو برائی جیسے کہ جلدی مانگتے ہیں وہ بھلائی تو ختم کر دی جائے

أَجَلُهُمْ فَتَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ

ان کی عمر، سو ہم چھوڑے رکھتے ہیں ان کو جن کو امید نہیں ہماری ملاقات کی ان کی شرارت میں

يَعْمَهُونَ ⑪ وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا كَجَنَّبِهِ أَوْ

سرگرداں ، اور جب پہنچے انسان کو تکلیف ، پکارے ہم کو پڑا ہوا یا

قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّكَانَ لِمَ يَدْعُنَا

بیٹھا یا کھڑا ، پھر جب ہم کھول دیں اس سے وہ تکلیف چلا جائے گویا کبھی نہ پکارا تھا ہم کو

إِلَى ضُرِّ مَسَّهُ ط كَذَلِكَ تَرِيْنُ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ⑫

کسی تکلیف پہنچنے پر ، اسی طرح پسند آیا بیباک لوگوں کو جو کچھ کر رہے ہیں ،

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَاءَتْهُمْ

اور البتہ ہم ہلاک کر چکے ہیں جماعتوں کو تم سے پہلے جب ظالم ہو گئے ، حالانکہ لائے تھے انکے پاس

رُسُلَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ط كَذَلِكَ نَجْزِي

رسول ان کے کھلی نشانیاں ، اور ہرگز نہ تھے ایمان لانے والے ، یوں ہی سزا دیتے ہیں ہم

الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ۱۳ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلِيفَ فِي الْأَرْضِ

قوم گنہگاروں کو ، پھر تم کو ہم نے نائب کیا زمین میں

مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۱۴ وَإِذَا تُثْلَىٰ عَلَيْهِمْ

ان کے بعد تاکہ دیکھیں تم کیا کرتے ہو ، اور جب پڑھی جاتی ہیں انکے سامنے

آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا أَتُتَبَّرُ بَقَرَانٍ غَيْرِ

آیتیں ہماری واضح ، کہتے ہیں وہ لوگ جن کو اُمید نہیں ہم سے ملاقات کی لے اُکوئی قرآن اس کے

هَذَا أَوْ بَدَّلَ لَهُ قُلُوبُ مَا يَكُونُونَ لِي أَنْ أَبَدِّلَ لَهُ مِنْ تِلْقَائِي نَفْسِي

ہوا یا اس کو بدل ڈال ، تو کہہ دے میرا کام نہیں کہ اس کو بدل ڈالوں اپنی طرف سے ،

إِنْ أَتَّبَعُ إِلَّا مَا يُوْحَىٰ إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابٌ

میں تابع داری کرتا ہوں اسی کی جو حکم آئے میری طرف ، میں ڈرتا ہوں اگر نافرمانی کروں اپنی رب کی بڑے دن

يَوْمٍ عَظِيمٍ ۱۵ قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ

عذاب سے ، کہہ دے اگر اللہ چاہتا تو میں نہ پڑھتا اس کو تمہارے سامنے اور نہ وہ کو خبر کرتا

بِهِ ط فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ ط أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۱۶

اس کی کیونکہ میں رہ چکا ہوں تم میں ایک عمر اس سے پہلے ، کیا پھر تم نہیں سوچتے ،

فَلَمَّا أَظْلَمَ مِنْهُمْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ط إِنَّهُ

پھر اس سے بڑا ظالم کون جو باندھے اللہ پر بہتان یا جھٹلائے اس کی آیتوں کو ، بیشک

لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ ۱۷

بھلا نہیں ہوتا گنہگاروں کا

خلاصہ تفسیر

اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر (ان کی جلدی مچانے کے موافق) جلدی سے نقصان واقع کر دیا کرتا جس طرح وہ فائدہ کے لئے جلدی مچاتے ہیں (اور اس کے موافق وہ فائدہ جلد واقع

کر دیتا ہے اسی طرح اگر نقصان بھی واقع کر دیا کرتا، تو ان کا وعدہ (عذاب) کبھی کا پورا ہو چکا ہوتا (لیکن ہماری حکمت جس کا بیان ابھی آتا ہے چونکہ اس کو مقتضی نہیں ہے) سو اس لئے ہم ان لوگوں کو جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے ان کے حال پر (بلا عذاب چند روز چھوڑے رکھتے ہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں) اور مستحق عذاب کے ہو جاویں اور وہ حکمت یہی ہے، اور جب انسان کو (یعنی ان میں سے بعض کو) کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے، لیٹے بھی، بیٹھے بھی، کھڑے بھی، (اور اس وقت کوئی بت وغیرہ یاد نہیں رہتا ضَلَّ مَنْ تَذَعُّونَ إِلَّا يَأْتَا) پھر جب (اس کی دعا و التجار کے بعد) ہم اس کی وہ تکلیف ہٹا دیتے ہیں تو پھر اپنی حالت پر آ جاتا ہے (اور ہم سے ایسا بے تعلق ہو جاتا ہے) کہ گویا ہو تکلیف اس کو پہنچی تھی اس کے ہٹانے کے لئے کبھی ہم کو پکارا ہی نہ تھا (اور پھر وہی بشرک کی باتیں کرنے لگتا ہے، نَسِيَ مَا كَانَتْ يَدْعُوْا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلْهِ اٰنْذًا) ان حد سے نکلنے والوں کے اعمال (بد) ان کو اسی طرح مستحسن معلوم ہوتے ہیں (جس طرح ہم نے ابھی بیان کیا ہے) اور ہم نے تم سے پہلے بہت سے گروہوں کو (انواع عذاب سے) ہلاک کر دیا ہے جب کہ انہوں نے ظلم (یعنی کفر و شرک) کیا حالانکہ ان کے پاس ان کے پیغمبر بھی دلائل لے کر آئے اور وہ (بوجہ غایت عناد کے) ایسے کب تھے کہ ایمان لے آتے، ہم مجرم لوگوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں (جیسا ہم نے ابھی بیان کیا ہے) پھر ان کے بعد ہم نے دنیا میں سچا ان کے تم کو آباد کیا تاکہ (ظاہری طور پر بھی) ہم دیکھ لیں کہ تم کس طرح کام کرتے ہو (آیا ویسا ہی بشرک و کفر کرتے ہو یا ایمان لاتے ہو) اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں جو بالکل صاف صاف ہیں تو یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے (آپ سے) یوں کہتے ہیں کہ (یا تو) اس کے سوا کوئی (پورا) دوسرا قرآن (ہی) لائے (جس میں ہمارے مسلک کے خلاف مضامین نہ ہوں) یا (کم از کم) اسی (قرآن) میں کچھ ترمیم کر دیجئے (کہ ہمارے مسلک کے خلاف مضامین اس سے حذف کر دیجئے اور اس منطوق سے یہ بھی مفہوم ہوا کہ وہ لوگ قرآن کو کلام محمدی سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ اسی بنا پر جو اب تعلیم فرماتے ہیں کہ، آپ یوں کہہ دیجئے کہ (قطع نظر اس سے کہ ایسے مضامین کا حذف کرنا فی نفسہ کیسا ہے خود) مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کر دوں (اور جب بعض کا حذف بھی ممکن نہیں تو کل کا حذف تو بدرجہ اولیٰ ناممکن ہے کیونکہ وہ میرا کلام تو ہے ہی نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے جو وحی کے ذریعہ سے آیا ہے، جب یہ ہے تو بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے پہنچا ہے (اور بالفرض خدا نخواستہ) اگر میں (وحی کا اتباع نہ کروں بلکہ، اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے بھاری دن کے

عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں (جو اہل عصیان کے لئے مخصوص ہے اور بوجہ عصیان کے تمہارے نصیب میں ہے سو میں تو اس عذاب یا اس کے سبب یعنی عصیان کی جرأت نہیں رکھتا اور اگر ان کو اس کے وحی ہونے میں کلام ہے اور یہ آپ ہی کا کلام سمجھے جاتے ہیں تو آپ یوں کہہ دیجئے کہ (یہ تو ظاہر ہے کہ یہ کلام معجز ہے کوئی بشر اس پر قادر نہیں ہو سکتا خواہ میں ہوں یا تم ہو) اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہوتا کہ میں یہ کلام معجز تم کو نہ سنا سکوں اور اللہ تعالیٰ میرے ذریعہ سے تم کو اس کی اطلاع نہ دے، تو مجھ پر اس کو نازل نہ فرماتا پس، نہ تو میں تم کو یہ (کلام) پڑھ کر سناتا اور نہ اللہ تعالیٰ تم کو اس کی اطلاع دیتا (پس جب میں تم کو سنارہا ہوں اور میرے ذریعہ سے تم کو اطلاع ہو رہی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کلام معجز کا سننا اور اطلاع کرنا منظور ہوا اور سننا اور اطلاع دینا بدون وحی کے بوجہ اس کے معجز ہونے کے ممکن نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ وہ وحی منزل اور کلام الہی ہے) کیونکہ (آخر) اس (کلام کے ظاہر کرنے) سے پہلے بھی تو ایک بڑے حصہ عمر تک تم میں رہ چکا ہوں (پھر اگر یہ میرا کلام ہے تو یا تو اتنی مدت تک ایک جملہ بھی اس طرز کا نہ نکلا اور یا دفعۃً اتنی بڑی بات بنائی یہ تو بالکل عقل کے خلاف ہے) پھر کیا تم اتنی عقل نہیں رکھتے ہو (جب اس کا کلام الہی اور حق ہونا ثابت ہو گیا اور پھر بھی مجھ سے درخواست ترمیم کی کرتے ہو اور اس کو نہیں مانتے تو سمجھ لو کہ اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے (جیسا میرے لئے تجویز کرتے ہو) یا اس کی آیتوں کو بھوٹا بتلاوے (جیسا اپنے لئے تجویز کر رکھا ہے) یقیناً ایسے مجرموں کو اصلاً فلاح نہ ہوگی (بلکہ مُعَذِّب ابدی ہوں گے)

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو آخرت کے منکر ہیں، اسی وجہ سے جب ان کو آخرت کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو وہ بطور استہزاء کہنے لگتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو یہ عذاب ابھی بلا لویا یہ کہ پھر یہ عذاب جلد کیوں نہیں آجاتا، جیسے نصر بن حارث نے کہا تھا "یا اللہ اگر یہ بات سچی ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسادیجئے یا اور کوئی سخت عذاب بھیج دیجئے"

پہلی آیت میں اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر قادر ہیں، یہ عذاب بخود فوراً اس وقت بھی نازل فرما سکتے ہیں مگر وہ اپنی حکمت بالغہ اور لطف و کرم سے ایسا نہیں کرتے یہ نادان جو اپنے حق میں بددعا کرتے اور مصیبت طلب کرتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ ان کی بددعا کو بھی اسی طرح جلد قبول فرمالیا کرتے جس طرح ان کی اچھی دعا کو اکثر کر لیتے ہیں تو یہ سب

ہلاک ہو جاتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دعائے خیر اور اچھی دعا کے متعلق توحید تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ اکثر جلد قبول کر لیتے ہیں اور کبھی کسی حکمت و مصلحت سے قبول نہ ہونا اس کے منافی نہیں، مگر جو انسان کبھی اپنی نادانی سے اور کبھی کسی غصہ اور رنج سے اپنے لئے یا اپنے اہل و عیال کے لئے بددعا کر بیٹھتا ہے یا انکارِ آخرت کی بنا پر عذاب کو کھیل سمجھ کر اپنے لئے دعوت دیتا ہے اُس کو فوراً قبول نہیں کرتے بلکہ مہلت دیتے ہیں تاکہ منکر کو غور و فکر کر کے اپنے انکار سے باز آنے کا موقع ملے اور اگر کسی وقتی رنج و غصہ یا دل تنگی کے سبب بددعا کر بیٹھا ہے تو اس کو اس کی مہلت مل جائے کہ اپنے بھلے بُرے کو دیکھے اور انجام پر نظر ڈال کر اس سے باز آجائے۔ امام ابن جریر طبری نے بروایت قتادہ اور بخاری و مسلم نے بروایت مجاہد نقل کیا ہے کہ اس جگہ بددعا سے مراد یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی انسان غصہ کی حالت میں اپنی اولاد یا مال و دولت کے تباہ ہونے کی بددعا کر بیٹھتا یا ان چیزوں پر لعنت کے الفاظ کہہ ڈالتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ایسی دعا قبول کرنے میں جلدی نہیں فرماتے، امام قرطبی نے اس جگہ ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اللہ جل شانہ سے دعا کی ہے کہ وہ کسی دوست عزیز کی بددعا اس کے دوست عزیز کے متعلق قبول نہ فرمادیں، اور شہر بن حوشب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ جو فرشتے انسانوں کی حاجت روائی پر مقرر ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کو یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ میرا بندہ جو رنج و غصہ میں کچھ بات کہے اس کو نہ لکھو۔ (قرطبی)

اس کے باوجود بعض اوقات کوئی قبولیت کی گھڑی آتی ہے جس میں انسان کی زبان سے جو بات نکلے وہ فوراً قبول ہو جاتی ہے اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی اولاد اور مال کے لئے کبھی بددعا نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ وہ وقت قبولیت دعا کا ہو، اور یہ بددعا فوراً قبول ہو جائے (اور تمہیں بعد میں پچھتا نا پڑے) صحیح مسلم میں یہ حدیث حضرت جابرؓ کی روایت سے غزوہ بواط کے واقعہ کے تحت نقل کی گئی ہے۔

ان سب روایات کا حاصل یہ ہے کہ آیت مذکورہ کا اصل خطاب اگرچہ منکرینِ آخرت اور ان کے فوری مطالبہ عذاب سے متعلق ہے لیکن اس کے عموم میں وہ مسلمان بھی داخل ہیں جو کسی رنج و غصہ کی وجہ سے اپنے یا اپنے مال و اولاد کے لئے بددعا کر بیٹھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عادت اُس کے فضل و کرم کی وجہ سے دونوں کے ساتھ یہی ہے کہ ایسی بددعاؤں کو فوراً نافذ نہیں فرماتے، تاکہ انسان کو سوچنے اور غور کرنے کا موقع مل جائے۔

دوسری آیت میں منکرینِ توحید و آخرت کو ایک دوسرے بلیغ انداز سے قائل کیا گیا ہے وہ یہ کہ لوگ عام حالاتِ راحت و اطمینان میں خدا و آخرت کے خلاف جھٹ بازی کرتے اور غیروں کو خدا تعالیٰ کا شریک قرار دیتے اور ان سے حاجت روائی کی امیدیں باندھے رکھتے ہیں، لیکن جب کوئی بڑی مصیبت آپڑتی ہے اس وقت یہ لوگ خود بھی اللہ تعالیٰ کے سوا اپنی ساری امید گاہوں سے مایوس ہو کر صرف اللہ ہی کو پکارتے ہیں، اور لیٹے بیٹھے کھڑے غرض ہر حال میں اسی کو پکارنے پر مجبور ہوتے ہیں، مگر اس کے ساتھ احسان فراموشی کا یہ عالم ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ان کی مصیبت دور کر دیتے ہیں تو خدا تعالیٰ سے ایسے آزاد و بے فکر ہو جاتے ہیں کہ گویا کبھی اس کو پکارا ہی نہ تھا اور اس سے کوئی حاجت مانگی ہی نہ تھی، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حاجت روائی میں کسی دوسرے کو شریک کرنے والے خود بھی اپنے اس عقیدہ کا بطلان مشاہدہ کر لیتے ہیں، مگر پھر عناد و ضد کی وجہ سے اُسی باطل عقیدہ پر جے رہتے ہیں۔

تیسری آیت میں اسی دوسری آیت کے مضمون کی مزید توضیح اور تاکید اس طرح کی گئی ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کے ڈھیل دینے سے یہ نہ سمجھے کہ دنیا میں عذاب آہی نہیں سکتا، پچھلی قوموں کی تاریخ اور ان کی سرکشی و نافرمانی کی سزا میں مختلف قسم کے عذاب اسی دنیا میں آچکے ہیں، اس امت میں اگرچہ اللہ تعالیٰ نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اکرام کی وجہ سے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ عذاب عام نہ آئے گا، اور اللہ تعالیٰ کے اسی لطف و کرم نے ان لوگوں کو ایسا بے باک کر دیا ہے کہ وہ بڑی جرأت سے عذابِ الہی کو دعوت دینے اور اس کا مطالبہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن یاد رہے کہ عذابِ الہی سے بے فکری ان کے لئے بھی کسی حال میں روا نہیں، کیونکہ پوری امت اور پوری دنیا پر عذاب عام نہ بھیجنے کا وعدہ ضرور ہے مگر خاص خاص افراد اور قوموں پر عذاب آجانا اب بھی ممکن ہے۔

چوتھی آیت میں فرمایا **ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ**، یعنی پھر پچھلی قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے تمہیں ان کا قائم مقام بنایا اور زمین کی خلافت تمہارے حوالہ کر دی مگر یہ نہ سمجھو کہ یہ زمین کی خلافت تمہارے عیش و آرام کے لئے تمہیں سپرد کی گئی ہے بلکہ اس اعزاز و اکرام کا اصل مقصد یہ ہے کہ تمہارا امتحان لیا جائے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو، پچھلی تاریخِ اہم سے متاثر ہو کر اپنے حالات کی اصلاح کرتے ہو یا حکومت و دولت کے نشہ میں سرشار ہو جاتے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی حکومت و اقتدار کوئی فخر و ناز کی چیز نہیں بلکہ ایک بھاری

بوجھ ہے جس کی بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔

پانچویں، پھٹی، ساتویں، آٹھویں چار آیتوں میں منکرینِ انہر کے ایک غلط خیال اور بے جا فرمائش کی تردید ہے، ان لوگوں کو نہ خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل تھی اور نہ وحی و رسالت کے سلسلہ سے واقف تھے، انبیاء علیہم السلام کو بھی عام انسانوں کی طرح جانتے تھے، قرآن کریم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا کو پہنچا اس کے متعلق بھی ان کا یہ خیال تھا کہ یہ خود آپ کا کلام اور آپ کی تصنیف ہے، اسی خیال کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا کہ یہ قرآن تو ہمارے اعتقادات و نظریات کے خلاف ہے، جن بتوں کی ہمارے باپ دادا ہمیشہ تعظیم کرتے آئے اور ان کو حاجت روا مانتے آئے ہیں قرآن ان سب کو باطل اور لغو قرار دیتا ہے، بہت سی چیزیں اور معاملات جو ہم برابر استعمال کرتے آئے ہیں قرآن ان سب کو حرام قرار دیتا ہے، اور پھر قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا اور حساب کتاب دینا ہوگا، یہ سب چیزیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، ہم ان کو ماننے کے لئے تیار نہیں، اس لئے آپ یا تو ایسا کریں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی دوسرا قرآن بنادیں جس میں یہ چیزیں نہ ہوں یا کم از کم اسی میں ترمیم کر کے ان چیزوں کو نکال دیں۔

قرآن کریم نے اول ان کے غلط اعتقاد کو رد کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ یہ نہ میرا کلام ہے، نہ اپنی طرف سے اس کو بدل سکتا ہوں میں تو صرف وحی الہی کا تابع ہوں، اگر میں ذرا بھی اُس میں اپنے اختیار سے کوئی تبدیلی کروں تو سخت گناہ کا مرتکب ہوں گا اور نافرمانی کرنے والوں پر جو عذاب مقرر ہے میں اس سے ڈرتا ہوں اس لئے ایسا نہیں کر سکتا۔

پھر فرمایا کہ میں جو کچھ کرتا ہوں فرمانِ خداوندی کے تابع کرتا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی کہ تمہیں یہ کلام نہ سنایا جائے تو نہ میں تمہیں سناتا اور نہ اللہ تعالیٰ تمہیں اُس سے باخبر کرتے، اور جب اللہ تعالیٰ کو یہی منظور ہے کہ تمہیں یہی کلام سنوایا جائے تو کس کی مجال ہے جو اس میں کوئی کمی بیشی کر سکے۔

اس کے بعد قرآن کے من جانب اللہ اور کلام الہی ہونے کو ایک واضح دلیل سے سمجھایا، فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فِيكُمْ مُحَمَّداً مِنْ قَبْلِهِ، یعنی تم ذرا یہ بھی تو سوچو کہ نزولِ قرآن سے پہلے میں نے تمہارے سامنے چالیس سال کی طویل مدت گزاری ہے، اس مدت میں تم نے کبھی مجھے شعر و سخن یا کوئی مقالہ لکھتے ہوئے نہیں سنا، اگر میں اپنی طرف سے ایسا کلام کہہ سکتا تو کچھ نہ کچھ اس چالیس سال کے عرصہ میں بھی کہا ہوتا، اس کے علاوہ اس چالیس سالہ طویل زندگی میں تم میرے

چال چلن میں صدق و دیانت کا تجربہ کر چکے ہو کہ عمر بھر کبھی بھوٹ نہیں بولا تو آج چالیس سال کے بعد آخر بھوٹ بولنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، اس سے بدیہی طور پر ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صادق امین ہیں، قرآن میں جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کلام اُسی کی طرف سے آیا ہوا ہے۔

اہم فائدہ | قرآن کریم کی اس دلیل نے صرف قرآن کے کلام حق ہونے پر ہی مکمل ثبوت پیش نہیں کیا بلکہ عام معاملات میں کھرے کھوٹے اور حق و باطل کی پہچان کا ایک اصول بھی بتا دیا کہ کسی شخص کو کوئی عہدہ یا منصب سپرد کرنا ہو تو اس کی قابلیت اور صلاحیت کو جانچنے کا بہترین اصول یہ ہے کہ اس کی پچھلی زندگی کا جائزہ لیا جائے، اگر اس میں صدق و امانت داری موجود ہے تو آئندہ بھی اس کی توقع کی جاسکتی ہے، اور اگر پچھلی زندگی میں اس کی دیانت و امانت اور صدق و سچائی کی شہادت موجود نہیں تو آئندہ کے لئے محض اس کے کہنے اور دعوے کی وجہ سے اس پر اعتماد کرنا کوئی دانشمندی نہیں، آج عہدوں کی تقسیم اور ذمہ داریوں کی سپردگی میں جس قدر غلطیاں اور ان کی وجہ سے عظیم مفسد پیدا ہو رہے ہیں ان سب کی اصلی وجہ اسی اصولِ فطرت کو چھوڑ کر رسمی چیزوں کے پیچھے پڑ جانا ہے۔

آٹھویں آیت میں اسی مضمون کی مزید تاکید وارد ہوئی ہے جس میں کسی کلام کو غلط طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کا عذاب شدید مذکور ہے۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَ

اور پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا اس چیز کی جو نہ نقصان پہنچا سکے ان کو اور نہ نفع اور

يَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ ط قُلْ أَتُنبِئُوكَ اللَّهُ

کہتے ہیں یہ تو ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس، تو کہہ کیا تم اللہ کو بتلاتے ہو

بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ط سُبْحَنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا

جو اس کو معلوم نہیں آسمانوں میں اور نہ زمین میں، وہ پاک ہے اور برتر ہے اس کے جسکو

يُشْرِكُونَ ۝۱۸ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ط

شریک کرتے ہیں، اور لوگ جو ہیں سو ایک ہی امت ہیں پیچھے جدا جدا ہو گئے،

وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِي مَا فِيهِ

اور اگر نہ ایک بات پہلے ہو چکی تیرے رب کی تو فیصلہ ہو جاتا ان میں جس بات میں کہ

يَخْتَلِفُونَ ۝ وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۚ

اختلاف کر رہے ہیں ، اور کہتے ہیں کیوں نہ اتری اس پر ایک نشانی اس کے رب کے ،

فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانْتَظِرُوا ۚ إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ۝

سو تو کہہ دے کہ غیب کی بات اللہ ہی جانے ، سو منتظر رہو ، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں ۔

خلاصہ تفسیر

اور یہ لوگ اللہ کی توحید کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو (عبادت نہ کرنے کی صورت میں) نہ ان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ (عبادت کرنے کی صورت میں) ان کو نفع پہنچا سکیں اور اپنی طرف سے بلا دلیل ایک نفع تراش کر کہتے ہیں کہ یہ (معبود) اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں (اس لئے ہم ان کی عبادت کرتے ہیں) آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم خدا تعالیٰ کو ایسی چیز بتلاتے ہو جو خدا تعالیٰ کو معلوم نہیں، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں (یعنی جو چیز اللہ کے علم میں نہ ہو) اس کا وجود اور وقوع محال ہے تو تم ایک محال چیز کے پیچھے لگے ہو، اللہ تعالیٰ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے اور (پہلے) تمام آدمی ایک ہی طریقہ کے تھے (یعنی سب موحد تھے، کیونکہ آدم علیہ السلام عقیدہ توحید لے کر آئے، ان کی اولاد بھی ایک زمانے تک انہیں کے عقیدہ اور طریقے پر رہی) پھر (اپنی کجرائی سے) انہوں نے (یعنی بعض نے) اختلاف پیدا کر لیا (یعنی توحید سے پھر گئے، مشرک ہو گئے اور یہ مشرک لوگ ایسے مستحق عذاب ہیں کہ) اگر ایک بات نہ ہوتی جو آپ کے رب کی طرف سے پہلے ٹھہر چکی ہے کہ پورا عذاب ان کو ابھی نہیں بلکہ آخرت میں دیا جائے گا، تو جس چیز میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کا قطعی فیصلہ (دنیا ہی میں) ہو چکا ہوتا اور یہ لوگ (براہِ عناد سینکڑوں معجزات ظاہر ہو جانے کے باوجود خصوصاً معجزہ قرآن دیکھنے اور اس کی مثال سے عاجز ہونے کے باوجود) یوں کہتے ہیں کہ ان پر (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارے فرمائشی معجزات میں سے) کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل ہوا؟ تو آپ فرمادیتے کہ (معجزہ کا اصل مقصد رسول کے صدق و حقانیت کو ثابت کرنا ہے، وہ تو بہت سے معجزات کے ذریعہ ہو چکا ہے، اب فرمائشی معجزات کی ضرورت تو ہے نہیں، ہاں امکان ہے کہ ظاہر ہوں یا نہ ہوں اس کا تعلق علم غیب سے ہے اور غیب کا علم صرف خدا کو ہے (مجھ کو نہیں) اس لئے تم بھی منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں (کہ تمہاری ہر فرمائش پوری ہوتی ہے یا نہیں، اور فرمائشی معجزات کے ظاہر نہ کرنے کی حکمت قرآن کریم میں کئی جگہ بتلا دی گئی ہے کہ ان کے ظہور کے بعد عادۃ اللہ یہ ہے کہ اگر کبھی ایمان نہ لائیں تو ساری قوم ہلاک کر دی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کو اس امت کے لئے ایسا عذاب

عام منظور نہیں بلکہ اس کو تا قیامت باقی رکھنا مقدر ہو چکا ہے،

معارف و مسائل

کافر و مسلم دو قومیں الگ الگ ہیں | کَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً، یعنی تمام اولادِ آدم شروع میں
فلسی اور وطنی قومیت لغو ہے | ایک ہی امت ایک ہی قوم موحدین کی تھی، شرک و کفر کا نام
نہیں تھا، پھر توحید میں اختلاف پیدا کر کے مختلف قومیں مختلف گروہ بن گئے۔

یہ زمانہ امت واحدہ اور سب کے مسلمان ہونے کا کتنا تھا اور کب تک رہا؟ روایات
حدیث و سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک یہی صورت تھی، نوح
علیہ السلام کے زمانے میں شرک و کفر ظاہر ہوا، حضرت نوح علیہ السلام کو اس کا مقابلہ
کرنا پڑا (تفسیر مظہری)،

یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام تک ایک طویل زمانہ ہے
دنیا میں انسانوں کی نسلیں اور آبادی کافی پھیل چکی تھی، ان تمام انسانوں میں رنگ و روپ
اور طرز معاشرت کا اختلاف ہونا بھی ایک طبعی امر ہے اور مختلف خطوں میں پھیل جانے کے
بعد وطن کا اختلاف بھی یقینی ہے اور ممکن ہے کہ بول چال میں زبانیں بھی کچھ مختلف ہو گئی
ہوں، مگر قرآن کریم نے اس نسب، قبائلی، لونی، وطنی اختلاف کو جو امور قطریہ ہیں، وحدت امت
میں خلل انداز قرار نہیں دیا، اور ان اختلافات کی وجہ سے اولادِ آدم کو مختلف قومیں مختلف امتیں
نہیں بلکہ امت واحدہ قرار دیا۔

ہاں جب ایمان کے خلاف کفر و شرک پھیلا تو کافر و مشرک کو الگ قوم الگ ملت قرار
دے کر فَاصْحَتَ لَقُؤًا ارشاد فرمایا، قرآن کریم کی آیت هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ
مُؤْمِنٌ نے اس مضمون کو اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ اللہ کی مخلوق اولادِ آدم کو مختلف قوموں میں
یا نسلوں والی چیز صرف ایمان و اسلام سے انحراف ہے، نسب و وطنی رشتوں سے قومیں الگ الگ
نہیں ہوتیں، زبان اور وطن یا رنگ و نسل کی بنا پر انسانوں کو مختلف گروہ قرار دینے کی جہالت
یہ نئی حماقت ہے جو نئی روشنی نے پیدا کی ہے اور آج کے بہت سے لکھے پڑھے اس نیشنلزم
کے پیچھے لگ گئے جو ہزاروں فتنے اور فساد اپنے دامن میں رکھتا ہے، اَعَاذَ اللہ
الْمُسْلِمِينَ مِنْهُ

وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِنَّا بَعْدَ ضَرَاءٍ مَسَّتْهُمْ إِذَا أَنَّهُمْ مَكْرُؤٌ

اور جب کچھ ہم لوگوں کو مزا اپنی رحمت کا بعد ایک تکلیف کے جو ان کو پہنچی تھی اسی وقت بنائے لگیں جیلے

فِي آيَاتِنَا قُلُوبٌ أَسْرَعُ مَكْرًا وَإِن مَّرْسَلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ﴿۲۱﴾

ہماری قدرتوں میں، کہہ دے کہ اللہ سب کا جلد بنا سکتا ہے جیسے، تحقیق ہمارے فرشتے لکھتے ہیں جیلہ بازی تمہاری

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِ

وہ ہی تم کو پھراتا ہے جنگل اور دریا میں، یہاں تک کہ جب تم بیٹھے کشتیوں میں،

وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رَاحَةٌ عَاصِفٌ وَ

اور لے کر چلیں وہ لوگوں کو اچھی ہوا سے اور خوش ہوئے اس سے، آئی کشتیوں پر ہوا تند اور

جَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا

آئی ان پر موج ہر جگہ سے اور جان لیا انہوں نے کہ وہ گھر گئے پکارنے لگے

اللَّهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ؕ لَئِنِ أَنْجَيْتَنَا مِنْ هَذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ

اللہ کو خالص ہو کر اس کی بندگی میں، اگر تو نے بچالیا ہم کو اس سے تو بیشک ہم رہیں گے

الشَّاكِرِينَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّا أَنْجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ

شکر گزار، پھر جب بچا دیا ان کو اللہ نے لگے شرارت کرنے اسی وقت زمین میں ناحق

الْحَقِّ ط يَأْتِيهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ مَتَاعَ الْحَيَاةِ

کی، سنو لوگو تمہاری شرارت ہے تمہی پر، نفع اٹھالو دنیا کی

الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۳﴾

زندگانی کا پھر ہمارے پاس ہے تم کو لوٹ کر آنا پھر ہم بتا دیں گے جو کچھ کہ تم کرتے تھے،

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ

دنیا کی زندگانی کی وہی مثل ہے جیسے ہم نے پانی اتارا آسمان سے پھر زلا بلا نکلا اس سے

نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ ط حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ

سبزہ زمین کا جو کہ کھائیں آدمی اور جانور، یہاں تک کہ جب پھوٹی

الْأَرْضُ نُرْخُفُفَهَا وَارْتَسَتِ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَدِ سُرُوا عَلَيْهِمْ

زمین نے رونق اور مزین ہو گئی اور خیال کیا زمین والوں نے کہ یہ ہمارے ہاتھ لگے گی

أَنَّهُمْ أَمْرٌ نَالٍ أَوْ نَهَارٌ فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَبْ بِالْأَرْضِ

تاگاہ پہنچا اس پر ہمارا حکم رات کو یا دن کو پھر کر ڈالا اس کو کاٹ کر ڈھیر گویا کل یہاں نہ تھی آبادی،

كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۴﴾

اسی طرح ہم کھول کر بیان کرتے ہیں نشانیوں کو ان لوگوں کے سامنے جو غور کرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

حل لغات | عَصَفٌ سخت تیز ہوا، حَصِيدًا کٹی ہوئی کھیتی، کَانَ لَمْ تَعْنِ یہ غنیٰ بالہنگام سے مشتق ہے جس کے معنی کسی جگہ قیام کرنے کے ہیں،

اور جب ہم لوگوں کو بعد اس کے کہ ان پر کوئی مصیبت پڑ چکی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو فوراً ہی ہماری آیتوں کے بارے میں شرارت کرنے لگتے ہیں (یعنی ان سے اعراض کرتے ہیں اور ان کے ساتھ تکذیب و استہزاء سے پیش آتے ہیں اور براہ اعتراض و عناد دوسرے معجزات کی فرمائشیں کرتے ہیں اور مصیبت گزشتہ سے عبرت نہیں پکڑتے پس معلوم ہوا کہ ان کے اعتراض کا اصل سبب اللہ کی نازل کردہ آیات و معجزات سے اعراض ہے اور یہ اعراض دنیا کی نعمتوں میں مست ہو جانے سے پیدا ہوا ہے، آگے و عید ہے کہ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس شرارت کی سزا بہت جلد دے گا، بالیقین ہمارے فرشتے تمہاری سب شرارتوں کو لکھ رہے ہیں (پس علاوہ علم الہی میں محفوظ ہونے کے دفتر میں بھی محفوظ ہیں) وہ (اللہ) ایسا ہے کہ تم کو تشکی اور دریا میں لئے لئے پھرتا ہے (یعنی جن آلات و اسباب سے تم چلتے پھرتے ہو وہ سب اللہ ہی کے دیئے ہوئے ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات) جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو، اور وہ کشتیاں لوگوں کو موافق ہوا کے ذریعہ سے لے کر چلتی ہیں اور وہ لوگ ان (کی رفتار) سے خوش ہوتے ہیں (اسی حالت میں دفعۃً) ان پر ایک جھونکا (مخالف) ہوا کا آنا ہے اور ہر طرف سے ان (لوگوں) پر موجیں اٹھی چلی آتی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ (بری طرح) گھر گئے، (اس وقت) سب خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں کہ اے اللہ، اگر آپ ہم کو اس (مصیبت) سے بچالیں تو ہم ضرور حق شناس (یعنی موحد) بن جاویں (یعنی اس وقت جیسا اعتقاد توحید کا ہو گیا ہے اس پر قائم رہیں) پھر جب اللہ تعالیٰ ان کو (اس مہلکے سے) بچالیتا ہے تو فوراً ہی وہ زمین (کے مختلف خطوں) میں ناسوت کی سرکشی کرنے لگتے ہیں (یعنی وہی شرک و معصیت) اے لوگو! سن لو، یہ تمہاری سرکشی تمہارے لئے وبال (جان) ہونے والی ہے (پس) دنیوی زندگی میں (چندے اس سے) فائدہ اٹھا رہے ہو پھر ہمارے پاس تم کو آنا ہے پھر ہم سب تمہارا کیا ہوا تم کو جتنا دیں گے (اور اس کی سزا دیں گے) پس دنیوی زندگی کی حالت تو ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس (پانی) سے زمین کے نباتات جن کو آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں خوب گنجان ہو کر نکلے یہاں تک کہ جب وہ زمین اپنی رونق کا پورا حصہ لے چکی اور اس کی خوب زینائش ہو گئی (یعنی سبزہ سے خوشنما معلوم ہونے لگی) اور اس (زمین) کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ اب ہم اس

(کے نباتات پھلوں) پر بالکل قابض ہو چکے تو (ایسی حالت میں) دن میں یا رات میں اس پر ہماری طرف سے کوئی حادثہ آپڑا جیسے پالا یا خشکی یا اور کچھ) سو ہم نے اس کو ایسا صاف کر دیا کہ گویا گل (دیہاں) وہ موجود ہی نہ تھی (پس اسی نباتات کے مثل دنیوی زندگی ہے، ہم اس طرح آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں ایسے لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے جو سوچتے ہیں۔

مَعَارِفُ وَمَسَائِلُ

قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا، عربی لغت کے اعتبار سے لفظ مکر خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں جو اچھی بھی ہو سکتی ہے بُری بھی، اردو زبان کے محاورہ سے دھوکہ نہ کھائیں کہ لفظ مکر اردو میں دھوکہ فریب کے لئے استعمال ہوتا ہے جس سے حق تعالیٰ بری ہے۔

اِنَّهَا بَغْيُكُمْ عَلٰی الْاَنْفُسِكُمْ یعنی تمہارے ظلم کا وبال تمہارے ہی اوپر پڑ رہا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ظلم کا وبال یقینی ہے اور آخرت سے پہلے دنیا میں بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صلہ رحمی اور لوگوں پر احسان کرنے کا بدلہ بھی جلد دیتا ہے (کہ آخرت سے پہلے دنیا میں اس کی برکات نظر آنے لگتی ہیں) اور ظلم اور قطع رحمی کا بدلہ بھی جلد دیتا ہے (کہ دنیا میں بھگتنا پڑتا ہے) (رواہ الترمذی و ابن ماجہ بسند حسن) اور ایک حدیث میں بروایت حضرت عائشہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین گناہ ایسے ہیں کہ ان کا وبال اپنے کرنے والے ہی پر پڑتا ہے ظلم، بد عہدی، اور دھوکہ فریب (رواہ ابوالشیخ وابن مردودہ فی التفسیر) (از مظہری)

وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰی دَاۤىِٕرَ السَّلٰمِ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰی صِرَاطٍ

اور اللہ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف، اور دکھاتا ہے جس کو چاہے راستہ

مُسْتَقِيْمٌ ۝۲۵ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا الْحُسْنٰی وَزِيَادَةٌ ۖ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهُهُمْ

سیدھا، جنہوں نے کی بھلائی ان کے لئے ہے بھلائی اور زیادتی، اور نہ چڑھے گی ان کے منہ پر

قَتْرٌ وَلَا ذِلَّةٌ ۚ اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۶

سیاہی اور نہ رسوائی، وہ ہیں جنت والے، وہ اسی میں رہا کریں گے،

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ يَّمِثْلُهَا لَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ

اور جنہوں نے کمائیں برائیاں بدلہ ملے برائی کا اس کے برابر اور ڈھانک لیگی آنکھ رسوائی

مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۖ كَاٰثِمًا اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطْعًا

کوئی نہیں ان کو اللہ سے بچانے والا، گویا کہ ڈھانک دیئے گئے ان کے چہرے

مِّنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۷﴾

اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ، وہ ہیں دوزخ والے ، وہ اسی میں رہا کریں گے

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ

اور جس دن جمع کریں گے ہم ان سب کو پھر کہیں گے شرک کرنے والوں کو کھڑے ہو اپنی اپنی جگہ تم

وَشُرَكَاءُكُمْ ۖ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاءُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِلَّا نَا

اور تمہارے شریک ، پھر ٹھانڈیں گے ہم آپس میں ان کو اور کہیں گے ان کے شریک تم ہماری تو

تَعْبُدُونَ ﴿۲۸﴾ فَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِنْ كُنَّا عَنْ

بندگی نہ کرتے تھے ، سو اللہ کافی ہے شاہد ہمارے اور تمہارے بیچ میں ، ہم کو

عِبَادَتِكُمْ لَغْفِيلِينَ ﴿۲۹﴾ هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ وَ

تمہاری بندگی کی خبر نہ تھی ، وہاں جانچ لے گا ہر کوئی جو اس نے پہلے کیا تھا اور

سُرُدُّوْا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقُّ ۖ وَصَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۳۰﴾

رجوع کریں گے اللہ کی طرف جو سچا مالک ہے ان کا اور جاتا رہے گا ان کے پاس سے جو بھوٹا باندھا کرتے تھے

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمْ مَنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ

تو پوچھ کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے اور زمین سے یا کون مالک ہے کان

وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ

اور آنکھوں کا اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ

الْحَيِّ وَمَنْ يُدِيرُ الْأَمْرَ ۚ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ ۚ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿۳۱﴾

سے اور کون تدبیر کرتا ہے کاموں کی سو بول اٹھیں گے کہ اللہ تو تو کہہ پھر ڈرتے نہیں ہو

فَذَرِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعَدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ ۚ

سو یہ اللہ ہے رب تمہارا سچا پھر کیا رہ گیا سچ کے پیچھے مگر بھٹکنا

فَإِنِّي تُصْرِفُونَ ﴿۳۲﴾

سو کہاں سے لوٹے جاتے ہو ۔

خلاصہ تفسیر

اور اللہ تعالیٰ دار البقار کی طرف تم کو بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے راہ راست پر چلنے کی توفیق دے دیتا ہے جس سے دار البقار تک رسائی ہو سکتی ہے ، آگے جزا و سزا کا بیان ہے کہ

جن لوگوں نے نیکی کی ہے (یعنی ایمان لائے ہیں) ان کے واسطے خوبی (یعنی جنت) ہے اور مزید براں (خدا کا دیدار) بھی اور ان کے چہروں پر نہ کدورت (غم کی) پھاوے گی اور نہ ذلت، یہ لوگ جنت میں رہنے والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور جن لوگوں نے بد کام کئے (یعنی کفر و شرک کیا)، ان کی بدی کی سزا اس کے برابر ملے گی (بدی سے زیادہ نہ ہوگی) اور ان کو ذلت چھالے گی، ان کو اللہ کے عذاب سے کوئی نہ بچا سکے گا (ان کی کدورت چہرہ کی ایسی حالت ہوگی کہ) گویا ان کے چہروں پر اندھیری رات کے پرت کے پرت (یعنی ٹکڑے) پیسٹ دیئے گئے ہیں، یہ لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور وہ دن بھی قابل ذکر ہے جس روز ہم ان سب (خلائق) کو (میدان قیامت میں) جمع کریں گے پھر منجملہ ان تمام خلائق کے (مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے (تجویز کئے ہوئے) مشرک (جن کو تم عبادت میں خدا کا شریک ٹھہراتے تھے ذرا) اپنی جگہ ٹھہرو (تاکہ تم کو حقیقت تمہارے عقیدہ کی معلوم کرائی جائے) پھر ہم ان (عابدین و معبودین) کے آپس میں پھوٹ ڈال دیں گے اور ان کے وہ شرکاء (ان سے خطاب کر کے) کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے (کیونکہ عبادت سے مقصود ہوتا ہے معبود کا راضی کرنا) سو ہمارے تمہارے درمیان خدا کافی گواہ ہے کہ ہم کو تمہاری عبادت کی خبر بھی نہ تھی (اور راضی ہونا تو درکنار البتہ شیاطین کی تعلیم تھی اور وہی راضی تھے، پس اس اعتبار سے ان کی پرستش کرتے تھے، اس مقام پر ہر شخص اپنے کئے ہوئے کا امتحان کر لے گا کہ آیا واقع میں یہ اعمال نافع تھے یا غیر نافع، چنانچہ ان مشرکین کو بھی حقیقت کھل جاوے گی کہ جن کی شفاعت کے بھروسے ہم ان کو پوجتے تھے انہوں نے اور ہمارے خلاف شہادت دی، نفع کی تو کیا امید کی جاوے، اور یہ لوگ اللہ کے عذاب کی طرف جو ان کا مالک حقیقی ہے لوٹائے جاویں گے، اور جو کچھ معبود تراش رکھے تھے سب ان سے غائب (اور گم) ہو جاویں گے (کوئی بھی تو کام نہ آوے گا) آپ (ان مشرکین سے) کہئے کہ (بتلاؤ) وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے (یعنی آسمان سے بارش کرتا ہے اور زمین سے نباتات پیدا کرتا ہے جس سے تمہارا رزق تیار ہوتا ہے) یا (یہ بتلاؤ کہ) وہ کون ہے جو (تمہارے) کانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے (کہ پیدا بھی اسی نے کیا، حفاظت بھی وہی کرتا ہے، اور اگر چاہتا ہے تو ان کو ماذف کر دیتا ہے، اور وہ کون ہے جو جاندار (چیز) کو بے جان (چیز) سے نکالتا ہے اور بے جان (چیز) کو جاندار (چیز) سے نکالتا ہے (جیسے نطفہ اور بیضہ کہ وہ جاندار سے نکلتا ہے اور اس سے جاندار پیدا ہوتا ہے، اور وہ کون ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے) (ان سے سوالات کیجئے) سو ضرور وہ (جواب میں) یہی کہیں گے کہ (ان سب

افعال کا فاعل، اللہ (ہے) تو ان سے کہتے کہ پھر (شرک سے) کیوں نہیں پرہیز کرتے سو (جس کے یہ افعال و اوصاف مذکور ہوئے) یہ ہے اللہ جو تمہارا رب حقیقی ہے اور جب امر حق ثابت ہو گیا، پھر (امر) حق کے بعد اور کیا رہ گیا۔ بجز گمراہی کے (یعنی جو امر حق کی ضد ہوگی وہ گمراہی ہے اور توحید کا حق ہونا ثابت ہو گیا، پس شرک یقیناً گمراہی ہے) پھر (حق کو چھوڑ کر) کہاں (باطل کی طرف) پھرے جاتے ہو۔

مَعَارِفُ وَمَسَائِلُ

پچھلی آیت میں دنیاوی زندگی اور اس کی ناپائیداری کی مثال اس کھیتی سے دی گئی تھی جو آسمانی پانی سے سیراب ہو کر اہلہا نے گی اور ہر طرح کے پھل پھول نکل آئے اور کھیتی والے خوش ہونے لگے کہ اب ہماری ساری ضرورتیں اس سے پوری ہوں گی، مگر ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے رات یا دن میں ہمارے عذاب کا کوئی حادثہ آپڑا جس نے اس کو ایسا صاف کر دیا کہ گویا یہاں کوئی چیز موجود ہی نہ تھی، یہ تو دنیا کی زندگی کا حال تھا، اس کے بعد آیت مذکورہ میں اس کے بالمقابل دارِ آخرت کا حال بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد فرمایا **وَاللّٰهُ يَتَنَبَّٰهُ اِلٰی دَاۤرِ السَّلَامِ**، یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو دارالسلام کی طرف دعوت دیتا ہے یعنی ایسے گھر کی طرف جس میں ہر طرح کی سلامتی ہی سلامتی ہے نہ اس میں کسی طرح کی کوئی تکلیف ہے نہ رنج و غم، نہ بیماری کا خطرہ، نہ فنا ہونے یا حالت بدل جانے کی فکر۔ دارالسلام سے مراد جنت ہے، اس کو دارالسلام کہنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس میں ہر طرح کی سلامتی اور امن و سکون ہر شخص کو حاصل ہوگا، دوسری وجہ بعض روایات میں ہے کہ جنت کا نام دارالسلام اس لئے بھی رکھا گیا ہے کہ اس میں بسنے والوں کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیز فرشتوں کی طرف سے سلام پہنچتا رہے گا، بلکہ لفظ سلام ہی اہل جنت کی اصطلاح ہوگی، جس کے ذریعہ وہ اپنی خواہشات کا اظہار کریں گے اور فرشتے ان کو مہیا کریں گے، جیسا کہ اس سے پہلی آیات میں گزر چکا ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے اس آیت کی تفسیر میں بطور نصیحت عوام کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے آدم کے بیٹے! تجھ کو اللہ تعالیٰ نے دارالسلام کی طرف بلایا، تو اس دعوتِ الہیہ کی طرف کب اور کہاں سے قدم اٹھائے گا، خوب سمجھ لے کہ اس دعوت کو قبول کرنے کے لئے اگر تو نے دنیا ہی سے کوشش شروع کر دی تو وہ کامیاب ہوگی اور تو دارالسلام میں پہنچ جائے گا اور اگر تو نے اس دنیا کی عمر کو ضائع کرنے کے بعد یہ چاہا کہ قبر میں پہنچ کر اس دعوت کی طرف چلوں گا

تو تیرا راستہ روک دیا جائے گا، تو وہاں ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے گا، کیونکہ وہ دارالعمل نہیں۔
حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ دارالسلام جنت کے سات ناموں میں سے ایک
نام ہے۔ (تفسیر قرطبی)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں کسی گھر کا نام دارالسلام رکھنا مناسب نہیں، جیسے جنت
یا فردوس وغیرہ نام رکھنا بھی درست نہیں۔

اس کے بعد آیت مذکورہ میں ارشاد فرمایا وَيَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ یعنی
پہنچا دیتا ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سیدھے راستہ پر۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دارالسلام کی دعوت تو سارے انسانوں کے
لئے عام ہے اور اسی معنی کے اعتبار سے سب کے لئے ہدایت بھی عام ہے لیکن ہدایت کی
خاص قسم کہ سیدھے راستہ پر کھڑا کر دیا جائے اور چلنے کی توفیق دی جائے یہ خاص خاص ہی
لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

مذکورہ دو آیتوں میں دار دنیا اور دار آخرت کا تقابل اور اہل دنیا اور اہل آخرت کے
احوال کا ذکر تھا، اگلی چار آیتوں میں دونوں فریق کی جزاء و سزا کا بیان ہے، پہلے اہل جنت
کا ذکر اس طرح فرمایا گیا کہ جن لوگوں نے نیکی اختیار کی یعنی سب سے بڑی نیکی ایمان اور پھر عمل
صالح پر قائم رہے ان کو ان کے عمل کا عمدہ اور بہت بدلہ ملے گا، اور صرف بدلہ ہی نہیں
بلکہ بدلہ سے کچھ زیادہ بھی۔

اس آیت کی تفسیر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائی وہ یہ ہے کہ اس جگہ اچھے بدلہ
سے مراد جنت ہے، اور زیادۃ سے مراد حق تعالیٰ سبحانہ کی زیارت ہے جو اہل جنت کو حاصل
ہوگی۔ (تفسیر قرطبی بروایت انسؓ)

جنت کی اتنی حقیقت سے تو ہر مسلمان واقف ہے کہ وہ ایسی راحتوں اور نعمتوں کا مرکز
ہے جن کو انسان اس وقت تصور میں نہیں لا سکتا، اور حق تعالیٰ کی زیارت ان سب نعمتوں پر
فائق ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت صہیبؓ کی روایت سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہو چکیں گے تو حق تعالیٰ اُن سے خطاب فرمائیں گے کہ
کیا تمہیں کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟ اگر ہو تو بتاؤ ہم اس کو پورا کریں گے، اہل جنت جواب
دیں گے کہ آپ نے ہمارے چہرے روشن کئے، ہمیں جنت میں داخل فرمایا، جہنم سے نجات
دی، اس سے زیادہ اور کیا چیز طلب کریں، اس وقت درمیان سے حجاب اٹھا دیا جائے گا اور

سب اہل جنت حق تعالیٰ کی زیارت کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت تھی جس کی طرف ان کا دھیان بھی نہ گیا تھا، جو رب العالمین نے محض اپنے کرم سے بے مانگے عطا فرمائی، بقول مولانا روٹیؒ ۵۔

ما بودیم و تقاضہ ما نمود لطف تو ناگفتہ ما می شنود
اور پھر انہیں اہل جنت کا یہ حال بیان فرمایا کہ نہ ان کے چہروں پر کبھی کدورت یا تکلیف و غم کا اثر پھلے گا اور نہ ذلت کا اثر ہوگا جو دنیا میں ہر شخص کو کبھی نہ کبھی پیش آیا کرتا ہے اور آخرت میں اہل جہنم کو پیش آئے گا۔

اس کے بالمقابل اہل جہنم کا یہ حال بیان فرمایا کہ جن لوگوں نے برے عمل کئے ان کو برائی کا بدلہ برابر سزا ملے گی اس میں کوئی زیادتی نہ ہوگی، ان کے چہروں پر ذلت چھائی ہوگی، کوئی شخص ان کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا نہ ہوگا، ان کے چہروں کی سیاہی کا یہ حال ہوگا کہ گویا اندھیری رات کے پرت کے پرت ان پر لپیٹ دیئے گئے ہیں۔

اس کے بعد کی دو آیتوں میں ایک مکالمہ مذکور ہے جو اہل جہنم میں اور ان کو گمراہ کرنے والے بتوں یا شیطانوں کے درمیان محشر میں ہوگا، ارشاد فرمایا کہ اس دن ہم سب کو جمع کریں گے پھر مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے تجویز کئے ہوئے معبود ذرا اپنی جگہ ٹھہرو تاکہ تمہیں اپنے عقیدہ کی حقیقت معلوم ہو جائے، اس کے بعد ان لوگوں میں اور ان کے معبودوں میں جو رشتہ اتحاد دنیا میں پایا جاتا تھا اس کو قطع کر دیا جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے بت خود بول اٹھیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کیا کرتے تھے، اور خدا کو گواہ بنا کر کہیں گے کہ ہم کو تمہاری مشرکانہ عبادت کی کچھ خبر بھی نہ تھی، کیونکہ نہ ہم میں حس و حرکت ہے اور نہ ان مسائل کو سمجھنے کے قابل عقل و شعور ہے۔

پھٹی آیت میں دونوں فریق اہل جنت اور اہل جہنم کا ایک مشترک حال بیان فرمایا ہے کہ اس مقام یعنی محشر میں ہر شخص اپنے اپنے ہوتے اعمال کو آزمائے گا کہ وہ نفع بخش تھے یا نقصان رسان، اور سب کے سب اپنے معبود حق کے پاس پہنچا دیتے جائیں گے، اور سارے بھروسے اور سہارے جو دنیا میں انسان ڈھونڈتا ہے ختم کر دیئے جائیں گے، اور مشرکین جن بتوں کو اپنا مددگار اور سفارشی سمجھا کرتے تھے وہ سب غائب ہو جائیں گے۔

ساتویں اور آٹھویں آیت میں قرآن حکیم نے اپنے حکیمانہ اور مہربانہ طریق پر مشرکین کی آنکھیں کھولنے کے لئے ان سے کچھ سوالات قائم کئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ ان لوگوں سے کہئے کہ آسمان اور زمین میں سے تمہیں رزق کون دیتا ہے؟ یا کان

اور آنکھوں کا کون مالک ہے کہ جب چاہے ان میں شنوائی اور بینائی پیدا کر دے اور جب چاہے سلب کر لے، اور کون ہے جو مردہ چیزیں سے زندہ کو پیدا کر دیتا ہے جیسے مٹی سے گھاس اور درخت، یا نطفہ سے انسان اور جانور یا بیضہ سے پرندہ، اور زندہ میں سے مردہ کو پیدا کر دیتا ہے، جیسے انسان اور جانور سے نطفہ بے جان، اور کون ہے جو تمام کائنات کے کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟

پھر فرمایا کہ جب آپ ان لوگوں سے یہ سوال کریں گے تو سب کے سب یہی کہیں گے کہ ان چیزوں کو پیدا کرنے والا ایک اللہ ہے! تو آپ ان سے فرماویں کہ پھر تم کیوں خدا سے نہیں ڈرتے؟ جب ان تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا اور باقی رکھنے والا اور ان سب کے کام میں لگانے کا انتظام کرنے والا صرف ایک اللہ ہی ہے تو پھر عبادت و اطاعت کا حق دار اس کے سوا کسی کو کیوں بناتے ہو۔

آخری آیت میں فرمایا قَدْ لَكُمْ اللَّهُ سَرَاجٌ حَقٌّ، فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ یعنی یہی ہے وہ ذات جس کی صفات کمال کا ذکر ابھی ابھی گزرا ہے، پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے، یعنی جب اللہ تعالیٰ کا معبود برحق ہونا ثابت ہو گیا تو پھر اس حق کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف رخ پھیرنا کس قدر نامعقول بات ہے۔

اس آیت کے مسائل و فوائد میں سے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آیت میں مَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حق اور ضلال کے درمیان کوئی واسطہ نہیں جو حق نہیں ہوگا وہ ضلال و گمراہی میں داخل ہوگا، ایسا کوئی کام نہیں ہو سکتا جو نہ حق ہو نہ گمراہی اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ دو متضاد چیزیں حق ہوں، تمام اصول عقائد میں یہ قاعدہ جمہور امت کے نزدیک مسلم ہے، البتہ جزئی مسائل اور جزئیات فقہیہ میں علماء کا اختلاف ہے، بعض حضرات کے نزدیک اجتہادی مسائل میں دونوں جانبوں کو حق کہا جائے گا اور جمہور اس پر متفق ہیں کہ اجتہادی مسائل میں جانب خلاف کو ضلال و گمراہی نہیں کہہ سکتے۔

كَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ فَسَقُوا أَنَّهُمْ

اسی طرح ٹھیک آئی بات تیرے رب کی ان نافرمانوں پر کر یہ

لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۳۳﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شَرِّكُمْ مَن يَبْدُوُا الْخَلْقَ

کہاں نہ لائیں گے، پوچھ کوئی ہے تمہارے مشرکوں میں جو پیدا کرے خلق کو

ثُمَّ يُعِيدُهُ ۖ قُلِ اللَّهُ يَبْدُوُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَنَاي

پھر دوبارہ زندہ کرے، تو کہہ اللہ پہلے پیدا کرتا ہے پھر اس کو دہراتے گا سو کہاں سے

تَوَفَّكُونَ ﴿۳۶﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شَرِكَايَ كُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ

پلٹے جاتے ہو ، پوچھ کوئی ہے تمہارے شریکوں میں جو راہ بتلائے صحیح

قُلْ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ

تو کہہ اللہ راہ بتلاتا ہے صحیح ، تو اب جو کوئی راہ بتلائے صحیح اس کی بات ماننی چاہئے

أَمْ مَنْ لَا يَهْدِي إِلَّا أَنْ يَهْدِيَٰ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿۳۷﴾

یا اس کی جو آپ نہ پائے راہ مگر جب کوئی اور اس کو راہ بتلائے ، سو کیا ہو گیا تم کو ، کیسا انصاف کرتے ہو

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي عَنْ الْحَقِّ شَيْئًا

اور وہ اکثر چلتے ہیں محض اٹکل پر ، سو اٹکل کام نہیں دیتی حق بات میں کچھ بھی

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿۳۸﴾

اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں ۔

خلاصہ تفسیر

حَلُّ لُغَتٍ | لَا يَهْدِيْ، یہ لفظ دراصل لَا يَهْدِيْ تہا، تسلیل کر کے لَا يَهْدِيْ بن گیا، معنی

لَا يَهْدِيْ کے ظاہر ہیں، یعنی وہ شخص جو ہدایت نہیں پاتا ۔

(آگے تسلی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کہ ان لوگوں کی باطل پرستی منعموم ہوا کرتے تھے،

ارشاد ہے کہ جس طرح یہ لوگ ایمان نہیں لاتے، اسی طرح آپ کے رب کی یہ (ازلی) بات کہ یہ ایمان نہ لاویں گے

تمام متمرد (کفر) لوگوں کے حق میں ثابت ہو چکی ہے (پھر آپ کیوں منعموم ہوں اور آپ (ان سے) یوں بھی،

کہنے کہ کیا تمہارے (تجویز کئے ہوئے) شرکار میں (عام اس کے ذوی العقول ہوں جیسے شیاطین یا غزوہ ذی العقول جیسے بت

کوئی ایسا ہے جو پہلی بار بھی (مخلوق کو) پیدا کرے پھر (قیامت میں) دوبارہ بھی پیدا کرے (اگر وہ

اس وجہ سے کہ اس میں توہین ہے شرکار کی، جواب میں تائید کریں تو) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی

پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی پیدا کرے گا سو (اس کی تحقیق کے بعد بھی) پھر تم

کہاں (حق سے) پھرے جاتے ہو (اور) آپ (ان سے) یوں بھی، کہنے کہ کیا تمہارے (تجویز کئے

ہوئے ذوی العقول، شرکار میں (جیسے شیاطین) کوئی ایسا ہے کہ امر حق کا راستہ بتلاتا ہو، آپ

کہہ دیجئے کہ اللہ ہی امر حق کا راستہ (بھی) بتلاتا ہے (چنانچہ اس نے عقل دی، (انبیاء بھیجے بخلان

شیاطین کے کہ اوّل وہ ان افعال پر قادر نہیں اور محض تعلیم جس کی قدرت ان کو دی گئی ہے وہ

اس کو اضلال و انحراف میں صرف کرتے ہیں، تو پھر (ان سے) کہنے کہ یہ بتلاؤ کہ آیا جو شخص امر حق

کا راستہ بتلاتا ہو وہ زیادہ اتباع کے لائق ہے یا وہ شخص جس کو بے بتلائے خود ہی راستہ نہ

سو مجھے (اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ سمجھانے پر بھی اس پر نہ چلے جیسے شیاطین، پھر جب یہ اتباع کے قابل نہ ہوں تو عبادت کے لائق تو کب ہو سکتے ہیں) تو (اے مشرکین) تم کو کیا ہو گیا تم کیسی تجویزیں کرتے ہو (کہ توحید کو چھوڑ کر شرک کو اختیار کرتے ہو) اور (تماشہ یہ ہے کہ اپنی اس تجویز اور عقیدہ پر یہ لوگ کوئی دلیل نہیں رکھتے بلکہ) ان میں سے اکثر لوگ صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں (اور) یقیناً بے اصل خیالات امر حق (کے اثبات) میں ذرا بھی مفید نہیں (خیر) یہ جو کچھ کر رہے ہیں یقیناً اللہ کو سب خبر ہے (وقت پر سزا دے گا)۔

وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ تَصْدِيقَ

اور وہ نہیں ہے قرآن کہ کوئی بنائے اللہ کے سوا اور لیکن تصدیق کرتا ہے

الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنَ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۸﴾

اگلے کلام کی اور بیان کرتا ہے ان چیزوں کو جو تم پر رکھی گئیں جس میں کوئی شبہ نہیں اور دیکھ کر عالم کی طرف سے

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَعْتَمَ

کیا لوگ کہتے ہیں کہ یہ بنا لایا ہے، تو کہہ دے تم لے آؤ ایک ہی سورت ایسی اور بلاؤ جس کو بلا سکو

مَنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۹﴾ بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا

اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو بات یہ ہے کہ جھٹلانے لگے جس کے سمجھنے پر

بِعِلْمِهِ وَلَكِنَّمَا يَأْتِيهِمْ تَأْوِيلُهُ ط كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ

انہوں نے قابو نہ پایا اور ابھی آئی نہیں اس کی حقیقت، اسی طرح جھٹلاتے رہے ان سے اگلے

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ﴿۴۰﴾ وَمِنْهُمْ مَنْ يُؤْمِنُ بِهِ وَ

سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام گنہگاروں کا اور بعضے ان میں یقین کریں گے قرآن کا اور

مِنْهُمْ مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهِ ط وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿۴۱﴾

بعضے یستین نہ کریں گے اور تیرا رب خوب جانتا ہے شرارت والوں کو

خلاصہ تفسیر

اور یہ قرآن افتراء کیا ہوا نہیں ہے کہ غیر اللہ سے صادر ہوا ہو بلکہ یہ تو ان کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس کے قبل (نازل) ہو چکی ہیں اور احکام ضروریہ (الہیہ) کی تفصیل بیان کرنے والا ہے (اور) اس میں کوئی بات شک (و شبہ) کی نہیں (اور وہ) رب العالمین کی طرف سے

(نازل ہوا) ہے، کیا (یا وجود اس کے انفراد نہ ہونے کے) یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ نے اس کو افتراء کر لیا ہے، آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ (اچھا) تو پھر تم (بھی تو عربی ہو اور اعلیٰ درجہ کے فصیح بلیغ بھی ہو) اس کی مثل ایک ہی سورت (بنا) لاؤ اور (ایکے نہیں) جن جن غیر اللہ کو بلا سکو ان کو (مرد کے لئے) بلاؤ اگر تم سچے ہو کہ (نعوذ باللہ) میں نے تصنیف کر لیا ہے تو تم بھی تصنیف کر لاؤ، مگر مشکل تو یہ ہے کہ اس قسم کے دلائل سے فائدہ اسی کو ہوتا ہے جو سمجھنا بھی چاہے سوا انہوں نے تو کبھی سمجھنا ہی نہ چاہا، بلکہ ایسی چیز کی تکذیب کرنے لگے جس (کے صحیح غلط ہونے) کو اپنے احاطہ علم میں نہیں لائے (اور اس کی حالت سمجھنے کا ارادہ نہیں کیا تو ایسوں سے کیا سمجھنے کی امید ہو سکتی ہے) اور (ان کی اس بے فکری اور بے پرواہی کی وجہ یہ ہے کہ) ہنوز ان کو اس (قرآن کی تکذیب) کا اخیر نتیجہ نہیں ملا (یعنی عذاب نہیں آیا ورنہ سارا نشہ ہرن ہو جاتا اور آنکھیں کھل جاتیں اور حق و باطل متمیز ہو جاتا لیکن آخر کبھی تو وہ نتیجہ پیش آنے والا ہے ہی، گو اس وقت ایمان نافع نہ ہو، چنانچہ جو کافر) لوگ ان سے پہلے ہوئے ہیں اسی طرح (جیسے بے تحقیق یہ جھٹلا رہے ہیں) انہوں نے بھی (حق کو) جھٹلایا تھا، سو دیکھ لیجئے ان ظالموں کا انجام کیسا (برا) ہوا، (اسی طرح ان کا ہوگا) اور (ہم جو ان کا انجام بدبتلا رہے ہیں سو سب مراد نہیں کیونکہ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اس (قرآن) پر ایمان لے آویں گے اور بعض ایسے ہیں کہ اس پر ایمان نہ لاویں گے اور آپ کا رب (ان) مفسدوں کو خوب جانتا ہے (جو ایمان نہ لاویں گے پس خالص ان کو وقت موعود پر سزا دے گا)۔

معارف و مسائل

وَلَمَّا يَأْتِيهِمْ تَأْوِيلُهُ ، تاویل سے مراد اس جگہ مال اور انجام ہے ، مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی غفلت اور بے فکری سے قرآن میں غور نہیں کیا اور اس کی تکذیب کے انجام بد کو نہیں پہچانا ، اس لئے تکذیب میں لگے ہوئے ہیں مگر موت کے بعد ہی سب حقائق کھل جاویں گے اور اپنے کئے کا مال بد ہمیشہ کے لئے لگے کا ہار ہو جائے گا ۔

وَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ إِنِّي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ أَنْتُمْ بَرِيئُونَ

اور اگر تجھ کو جھٹلائیں تو کہہ میرے لئے میرا کام اور تمہارے لئے تمہارا کام تم پر ذمہ نہیں

مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۴۴﴾ وَمِنْهُمْ مَنْ لَّيْسَ بِمُعِينٍ

میرے کام کا اور مجھ پر ذمہ نہیں جو تم کرتے ہو ، اور بعض ان میں کان رکھتے ہیں

إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ تَسْمِعُ الصَّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ﴿۴۲﴾ وَمِنْهُمْ

تیری طرف، کیا تو سنائے گا بہروں کو اگرچہ ان کو سمجھ نہ ہو، اور بعض ان میں

مَنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْى وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ﴿۴۳﴾

نگاہ کرتے ہیں تیری طرف، کیا تو راہ دکھائے گا اندھوں کو اگرچہ وہ سوچ نہ رکھتے ہوں،

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسُهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۴۴﴾

اللہ ظلم نہیں کرتا لوگوں پر کچھ بھی لیکن لوگ اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اور اگر ان دلائل کے بعد بھی، آپ کو جھٹلاتے رہیں تو بس خیر بات، یہ کہہ دیجئے کہ (اچھا صاحب) میرا کیا ہوا مجھ کو ملے گا اور تمہارا کیا ہوا تم کو ملے گا تم میرے عمل کے جواب دہ نہیں ہو، اور میں تمہارے عمل کا جواب دہ نہیں ہوں (جس طریقہ پر چاہو رہو آپ معلوم ہو جاوے گا) اور آپ ان کے ایمان کی توقع چھوڑ دیجئے کیونکہ ان میں (گو بعض ایسے) بھی ہیں جو ظاہر میں، آپ کی طرف کان لگا لگا کر بیٹھتے ہیں (لیکن دل میں ارادہ ایمان اور حق طلبی کا نہیں ہے پس اس اعتبار سے ان کا سننا نہ سننا برابر ہے پس ان کی حالت بہروں کی سی ہوتی تو پھر کیا آپ بہروں کو سنا کر ان سے ملنے کا انتظار کرتے ہیں گوان کو سمجھ بھی نہ ہو) ہاں اگر سمجھ ہوتی تو بہرے پن میں بھی کچھ کام چل سکتا، اور (اسی طرح) ان میں بعض ایسے ہیں کہ (ظاہراً) آپ کو (معجزات و کمالات) دیکھ رہے ہیں (لیکن طلب حق نہ ہونے سے ان کی حالت مثل اندھوں کے ہے تو پھر کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھانا چاہتے ہیں گوان کو بصیرت بھی نہ ہو) ہاں اگر بصیرت ہوتی تو اندھے پن میں بھی کچھ کام چل سکتا اور ان کی عقلیں جو اس طرح تباہ ہو گئیں تو یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا کہ ان کو قابلیت ہدایت کی نہ دے اور پھر مواخذہ فرماوے (لیکن لوگ خود ہی اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں) کہ قابلیت موہوبہ کو ضائع کر دیتے ہیں اور اس سے کام نہیں لیتے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَسُوا إِلَّا سَاعَةً مِنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ

اور جس دن ان کو جمع کرے گا گویا وہ نہ رہے تھے مگر ایک گھڑی دن، ایک دوسرے کو

بَيْنَهُمْ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۴۵﴾

پہچانیں گے، بیشک خسارے میں پڑے جنہوں نے جھٹلایا اللہ سے ملنے کو اور نہ آئے وہ راہ پر،

وَأَمَّا نُرِّيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ

اور اگر ہم دکھائیں گے تجھ کو کوئی چیز ان وعدوں میں سے جو کہے ہیں ہم نے ان سے یا وفات دیں تجھ کو سو ہماری ہی طرف سے

ثُمَّ اللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ ﴿۵۶﴾ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ فَإِذَا جَاءَ

ان کو لوٹنا، پھر اللہ شاہد ہے ان کاموں پر جو وہ کرتے ہیں ، اور ہر فرقہ کا ایک رسول ہے ، پھر جب پہنچا

رَسُولُهُمْ قَضَىٰ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۵۷﴾ وَيَقُولُونَ

ان کے پاس رسول ان کا فیصلہ ہوا ان میں انصاف سے اور ان پر ظلم نہیں ہوتا ، اور کہتے ہیں

مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۵۸﴾ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا

کب ہے یہ وعدہ اگر تم سچے ہو ، تو کہہ میں مالک نہیں اپنے واسطے برے کا

وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ إِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ فَلَا

نہ بھلے گا مگر جو چاہے اللہ ، ہر فرقہ کا ایک وعدہ ہے ، جب آ پہنچے گا ان کا وعدہ پھر نہ

يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿۵۹﴾ قُلْ أَسْرَأُ يَتُومَ إِن اتَّكُم

تیجھے سرک سکیں گے ایک گھڑی اور نہ آگے سرک سکیں گے ، تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر آ پہنچے تم پر

عَذَابُهُ بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا أَمْ آذَانُكُمْ غَائِبَةٌ ﴿۶۰﴾ أَمْ أَنْتُمْ

عذاب اس کا راتوں رات یا دن کو تو کیا کر لیں گے اس سے پہلے گنہ گار ، کیا پھر

إِذَا مَا وَقَعَ أَمَنْتُمْ بِهِ ؕ أَلَنْ يَكُنَّ لَكُم مِّنْهُ سَاعَةٌ ﴿۶۱﴾ ثُمَّ

جب عذاب واقع ہو چکے گا تب اس پر یقین کر دو گے ، اب تاویل ہوئے اور تم اسی کا تقاضہ کرتے تھے ، پھر

قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا

کہیں گے گنہ گاروں کو چکھتے رہو عذاب ہمیشگی کا ، وہی بدلہ ملتا ہے جو کچھ

كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿۶۲﴾ وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقُّ هُوَ قُلْ إِيَّيَّ وَرَبِّي إِنَّهُ

کہاتے تھے ، اور تجھ سے خبر پوچھتے ہیں کیا سچ ہے یہ بات ، تو کہہ البتہ قسم میرے رب کی یہ

أَحَقُّ هُوَ ؕ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۶۳﴾ وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ

سچ ہے ، اور تم تھکا نہ سکو گے ، اور اگر ہو ہر شخص گنہ گار کے پاس

مَا فِي الْأَرْضِ لَا فِتْنَةٌ يَهُوَ وَأَسْرُوا النَّدَامَةَ لَهُمْ أَوَّالِ الْعَذَابِ

جتنا کچھ ہے زمین میں البتہ دے ڈالے اپنے بدلے میں ، اور پچھے پچھے پچھتائیں گے جب آئیں گے عذاب

وَقَضَىٰ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۶۴﴾ أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي

اور ان میں فیصلہ ہوگا انصاف سے اور ان پر ظلم نہ ہوگا ، سن رکھو اللہ کا ہے جو کچھ ہے

وَقَالَ رَبِّي وَنَقَا لَبِي عَلَيْهِ السَّلَام

السَّابِقُونَ وَالْأَرْضِ إِلَّا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ

آسمان اور زمین میں، سُن رکھو وعدہ اللہ کا سچ ہے، پر بہت لوگ

لَا يَعْلَمُونَ ﴿۵۶﴾ هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَالْإِلَهِ سَرَجُون ﴿۵۷﴾

نہیں جانتے، وہی چلاتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف پھر جاؤ گے۔

خلاصہ تفسیر

اور ان کو وہ دن یاد دلائیے جس میں اللہ تعالیٰ ان کو اس کیفیت سے جمع کرے گا کہ وہ سمجھیں گے کہ، گویا وہ دنیا یا برزخ میں، سارے دن کی ایک ادھ گھڑی رہے ہوں گے (چونکہ وہ دن مدید بھی ہوگا اور شدید بھی ہوگا، اس لئے دنیا اور برزخ کی مدت اور تکلیف سب بھول کر ایسا سمجھیں گے کہ وہ زمانہ بہت جلد گزر گیا، اور آپس میں ایک دوسرے کو پہچانیں گے (بھی لیکن ایک دوسرے کی مدد نہ کر سکیں گے، اس سے اور رنج و صدمہ ہوگا، کیونکہ شناسا لوگوں سے توقع نفع کی ہوا کرتی ہے، واقعی (اس وقت سخت) خسارے میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے پاس جانے کو بھٹلایا اور وہ دنیا میں بھی) ہدایت پانے والے نہ تھے (اس لئے آج خسارہ میں پڑے، پس ان کے عذاب کا اصلی وقت تو یہ دن ہے، ان کو یاد دلا دیجئے) اور دنیا میں ان پر عذاب واقع ہونا یا نہ ہونا اس کی نسبت یہ بات ہے کہ جس (عذاب) کا ان سے ہم وعدہ کر رہے ہیں اس میں سے کچھ تھوڑا سا (عذاب) اگر ہم آپ کو دکھلا دیں (یعنی آپ کی حیات میں ان پر اس کا نزول ہو جائے) یا (اس کے نزول کے قبل ہی) ہم آپ کو وفات دے دیں (پھر خواہ بعد میں نزول ہو یا نہ ہو) دونوں احتمال ہیں، کوئی شق ضروری نہیں لیکن ہر حال اور ہر احتمال پر ہمارے پاس تو ان کو آنا ہی ہے پھر سب کو معلوم ہے کہ اللہ کے سب افعال کی اطلاع رکھتا ہی ہے پس ان پر سزا دے گا، غرض یہ کہ دنیا میں خواہ سزا ہو یا نہ ہو مگر اصلی موقعہ پر ضرور ہوگی، اور یہ سزا جو ان کے لئے تجویز ہوئی ہے، تو اتمام حجت و ازالہ عذر کے بعد ہوئی ہے، اور ان کی کیا تخصیص ہے بلکہ ہمیشہ سے ہماری عادت رہی ہے کہ جن امتوں کو ہم نے مکلف بنانا چاہا ہے ان میں سے ہر ہر امت کے لئے ایک حکم پہنچانے والا (ہوا) ہے سو جب ان کا وہ رسول (ان کے پاس) آچکta ہے (اور احکام پہنچا دیتا ہے اس کے بعد ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کیا جاتا ہے) وہ فیصلہ یہی ہے کہ نہ ماننے والوں کو عذاب ابدی میں مبتلا کیا جاتا ہے، اور ان پر (ذرا) ظلم نہیں کیا جاتا کیونکہ اتمام حجت کے بعد سزا دینا خلاف انصاف نہیں ہے، اور یہ لوگ (عذاب کی وعیدیں سن کر بقصد تکذیب یوں کہتے ہیں کہ اسے نبی اور اسے

مسلمانوں) یہ وعدہ (عذاب کا) کب (واقع) ہوگا، اگر تم سچے ہو (تو واقع کیوں نہیں کر دیتے) آپ (سب کی طرف سے جواب میں) فرمادیجئے کہ میں (خود) اپنی ذاتِ خاص کے لئے تو کسی نفع (کے) حاصل کرنے، کا اور کسی ضرر (کے) دفع کرنے، کا اختیار رکھتا ہی نہیں مگر جتنا (اختیار) خدا کو منظور ہو (اتنا اختیار البتہ حاصل ہے، پس جب خاص اپنے نفع و نقصان کا مالک نہیں تو دوسرے کے نفع و نقصان کا تو کیونکر مالک ہوں گا، پس عذاب واقع کرنا میرے اختیار میں نہیں، رہا یہ کہ کب واقع ہوگا، سو بات یہ ہے کہ ہر امت کے (عذاب کے) لئے (اللہ کے نزدیک) ایک معین وقت ہے (خواہ دنیا میں یا آخرت میں سو) جب ان کا وہ معین وقت آپہنچتا ہے تو اس وقت، ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے سرک سکتے ہیں (بلکہ فوراً عذاب واقع ہو جاتا ہے اسی طرح تمہارے عذاب کا بھی وقت معین ہے، اس وقت اس کا وقوع ہو جاوے گا اور وہ جو فرمائش کرتے ہیں کہ جو کچھ ہونا ہے جلدی ہو جاوے جیسا کہ آیت مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اور تَبٰیءَ عَجَلْ لَنَا قِطْنًا میں ان کی اس جلد بازی کا ذکر ہے، تو آپ (اس کے متعلق ان سے) فرمادیجئے کہ یہ تو بتلاؤ کہ اگر تم پر خدا کا عذاب رات کو آپڑے یا دن کو (آپڑے) تو یہ تو بتلاؤ کہ عذاب میں کون چیز ایسی ہے کہ مجرم لوگ اس کو جلدی مانگ رہے ہیں (یعنی عذاب تو سخت چیز اور پناہ مانگنے کی چیز ہے نہ کہ جلدی مانگنے کی اور چونکہ جلد بازی سے مقصود ان کا تکذیب ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ) کیا اب تو تکذیب کر رہے ہو جو کہ وقت ہے تصدیق کے نافع ہونے کا، پھر جب وہ (اصلی موعود) آہی پڑے گا (اس وقت) اس کی تصدیق کرو گے (جس وقت کہ تصدیق نافع نہ ہوگی اور اس وقت کہا جائے گا کہ) ہاں اب مانا حالانکہ (پہلے سے) تم (بقصد تکذیب) اس کی جلدی مچایا کرتے تھے پھر ظالموں (یعنی مشرکوں) سے کہا جاوے گا کہ ہمیشہ کا عذاب چکھو، تم کو تمہارے ہی کئے کا بدلہ ملا ہے اور وہ (غایت تعجب و انکار سے) آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا عذاب واقعی امر ہے؟ آپ فرمادیجئے کہ ہاں قسم میرے رب کی کہ وہ واقعی امر ہے، اور تم کسی طرح خدا کو عاجز نہیں کر سکتے (کہ وہ عذاب دینا چاہے اور تم بچ جاؤ) اور (اس عذاب کی یہ شدت ہوگی کہ) اگر ہر مشرک شخص کے پاس اتنا مال، ہو کہ ساری زمین میں بھر جاوے تب بھی اس کو دے کر اپنی جان بچانا چاہیں گے (اگرچہ نہ خزانہ ہوگا اور نہ لیا جاوے گا لیکن شدت اس درجہ کی ہوگی کہ مال ہونے کی تقدیر پر سب دینے پر راضی ہو جاویں گے) اور جب عذاب دیکھیں گے تو (مزید فصاحت کے خوف سے) پشیمانی کو اپنے دل ہی دل میں، پوشیدہ رکھیں گے (یعنی اس کے آثارِ قولیہ و فعلیہ کو ظاہر نہ ہونے دیں گے، تاکہ دیکھنے والے زیادہ نہ ہنسیں لیکن آخر میں یہ ضبط و تحمل بھی اس کی شدت

کے سامنے نہ چلے گا، اور ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ ہوگا اور ان پر ذرا ظلم نہ ہوگا، یاد رکھو کہ جتنی چیزیں آسمانوں میں اور زمین میں ہیں سب اللہ ہی کی ملک ہیں ان میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور ان میں یہ مجرم بھی داخل ہیں ان کا فیصلہ بھی بطریق مذکور کر سکتا ہے، یاد رکھو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، پس قیامت ضرور آئے گی، لیکن بہت سے آدمی یقین ہی نہیں کرتے، وہی جان ڈالتا ہے، وہی جان نکالتا ہے (پس دوبارہ پیدا کرنا اس کو کیا مشکل ہے)، اور تم سب اسی کے پاس لائے جاؤ گے اور حساب و کتاب اور پھر اس پر ثواب و عذاب ہوگا۔

مَعَارِفُ وَمَسَائِلُ

يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ یعنی جب قیامت میں مردے قبروں سے اٹھائے جاویں گے تو ایک دوسرے کو پہچانیں گے جیسے کوئی طویل مدت ملے ہوئے نہ گزری ہو۔

امام بغویؒ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ یہ پہچان شروع میں ہوگی بعد میں قیامت کے ہولناک واقعات سامنے آجائیں گے تو یہ پہچان منقطع ہو جائے گی اور بعض روایات میں ہے کہ پہچان تو پھر بھی رہے گی مگر ہیبت کے مارے بات نہ کر سکیں گے (منظہری)۔

اَشْهَرُ اِذَا مَا دَقَعَ اَمْنُكُمْ بِهٖ اَلْعَنَ یعنی کیا تم ایمان اس وقت لاؤ گے جب تم پر عذاب واقع ہو جائے گا خواہ موت کے وقت یا اس سے پہلے ہی، مگر اس وقت تمہارے ایمان کے جواب میں یہ کہا جائے گا اَلْعَنَ کیا اب ایمان لائے ہو، جب کہ ایمان کا وقت گزر چکا، جسے غرق ہونے کے وقت فرعون نے جب کہا اَمَنْتُ اِنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْ اَمَنْتُ بِهٖ بَنُوْا سُرًّا وَّ عَلٰنًا جواب میں کہا گیا تھا اَلْعَنَ، اور اس کا یہ ایمان قبول نہیں کیا گیا، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول کرتا ہی رہتا ہے جب تک کہ وہ غرغره موت میں گرفتار نہ ہو جائے یعنی غرغره موت کے وقت کا ایمان اور توبہ اللہ کے نزدیک معتبر نہیں، اسی طرح دنیا میں وقوع عذاب سے پہلے پہلے توبہ قبول ہو سکتی ہے، جب عذاب آپڑے پھر توبہ قبول نہیں ہوتی، آخر سورت میں قوم یونس علیہ السلام کا جو واقعہ آ رہا ہے کہ ان کی توبہ قبول کر لی گئی، وہ اسی ضابطے کے ماتحت ہے کہ انہوں نے عذاب کو دُور سے آتا ہوا دیکھ کر سچے دل سے الحاح و زاری کے ساتھ توبہ کر لی اس لئے عذاب ہٹا لیا گیا، اگر عذاب ان پر واقع ہو جاتا پھر توبہ قبول نہ ہوتی۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي

اے لوگو! تمہارے پاس آئی ہے نصیحت تمہارے رب سے اور شفا دلوں کے

الصُّدُورِ ۵۷ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ۵۸ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ

روگ کی اور ہدایت اور رحمت مسلمانوں کے واسطے کہہ اللہ کے فضل سے

وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا ۖ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ۵۹

اور اس کی مہربانی سے سو اسی پر ان کو خوش ہونا چاہئے ، یہ بہتر ہے ان چیزوں سے جو جمع کرتے ہیں

قُلْ أَسْرَأَيْتُمْ مَا أَنزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِّن رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا

تو کہہ بھلا دیکھو تو اللہ نے جو تمہاری تمہارے واسطے روزی بھیر تم نے ٹھہرائی اس میں سے کوئی حرام

وَحَلَالًا ۚ قُلْ أَلَا يَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ ۖ عَلَيَّ اللَّهُ تَفْتَرُونَ ۶۰ وَمَا ظَنُّ

اور کوئی حلال ، کہہ کیا اللہ نے حکم دیا تم کو یا اللہ پر افتراء کرتے ہو ، اور کیا خیال ہے

الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ

جھوٹ باندھنے والوں کا اللہ پر قیامت کے دن ، اللہ تو فضل کرتا ہے

عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ۶۱ وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ

لوگوں پر اور لیکن بہت لوگ حق نہیں مانتے ، اور نہیں ہوتا تو کسی حال میں

وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ

اور نہ پڑھتا ہے اس میں سے کچھ قرآن اور نہیں کرتے ہوتے لوگ کچھ کام کہ ہم نہیں ہوتے

شُهُودًا ۖ إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۖ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِّثْقَالٍ

حاضر تمہارے پاس جب تم مصروف ہوتے ہو اس میں ، اور غائب نہیں رہتا تیرے رب سے ایک

ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرَ

ذرہ بھر زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ چھوٹا اس سے اور نہ بڑا

إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۶۲

جو نہیں ہے کھلی ہوئی کتاب میں ۔

خلاصہ تفسیر

اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی جو بُرے کاموں سے روکنے کے لئے نصیحت ہے اور (اگر اس پر عمل کر کے بُرے کاموں سے بچیں تو) دلوں میں جو بُرے کاموں سے (روک دیا جائے) ان کے لئے شفاء ہے اور (نیک کاموں کے کرنے کے لئے) رہنمائی کرنے والی ہے اور (اگر اس پر عمل کر کے نیک کاموں کو اختیار کریں تو) رحمت

(اور ذریعہ ثواب) ہے (اور یہ سب برکات) ایمان والوں کے لئے (ہیں) کیونکہ عمل وہی کرتے ہیں، پس قرآن کے یہ برکات سن کر، آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ (جب قرآن ایسی چیز ہے، تو لوگوں کو خدا کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہئے) اور اس کو دولت عظیمہ سمجھ کر لینا چاہئے) وہ اس دنیا سے بدرجہا بہمتد ہے جس کو جمع کر رہے ہیں (کیونکہ دنیا کا نفع قلیل اور فانی ہے اور قرآن کا نفع کثیر اور باقی) آپ (ان سے) کہتے کہ یہ تو بتلاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے (انتفاع کے) لئے جو کچھ رزق بھیجا تھا پھر تم نے (اپنی گھڑت سے) اس کا کچھ حصہ حرام اور کچھ حلال قرار دے لیا (حالانکہ اس کی تحریم کی کوئی دلیل نہیں تو) آپ (ان سے) پوچھئے کہ کیا تم کو خدا نے حکم دیا ہے یا محض، اللہ پر (اپنی طرف سے) افتراء ہی کرتے ہو اور جو لوگ اللہ پر جھوٹ افتراء باندھتے ہیں ان کا قیامت کی نسبت کیا گمان ہے (جو بالکل ڈرتے نہیں کیا یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت نہیں آوے گی یا آوے گی مگر ہم سے باز پرس نہ ہوگی) واقعی لوگوں پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے (کہ ساتھ کے ساتھ سزا نہیں دیتا بلکہ توبہ کے لئے مہلت دے رکھی ہے) لیکن اکثر آدمی بے قدر ہیں (ورنہ توبہ کر لیتے) اور آپ (خواہ) کسی حال میں ہوں اور (منجملہ ان احوال کے) آپ کہیں سے قرآن پڑھتے ہوں اور اسی طرح اور لوگ بھی جتنے ہوں (تم جو کام بھی کرتے ہو ہم کو سب کی خبر رہتی ہے جب تم اس کام کو کرنا شروع کرتے ہو اور آپ کے رب (کے علم) سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں) بلکہ سب اس کے علم میں حاضر ہیں) اور نہ کوئی چیز اس (مقدار مذکور) سے چھوٹی اور نہ کوئی چیز اس سے بڑی مگر یہ سب (بوجہ احاطہ علم الہی کے) کتاب مبین (یعنی لوح محفوظ) میں (مرقوم) ہے۔

مَعَارِفُ وَمَسَائِلُ

پچھلی آیات میں کفار و مشرکین کی بد حالی اور آخرت میں ان پر طرح طرح کے عذابوں کا بیان تھا۔

مذکورہ آیات سے پہلی دو آیتوں میں ان کو اس بد حالی اور گمراہی سے نکلنے کا طریقہ اور عذاب آخرت سے نجات کا ذریعہ بتلایا گیا ہے اور وہ اللہ کی کتاب قرآن اور اس کے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اور انسان اور انسانیت کے لئے یہ دونوں ایسی عظیم نعمتیں ہیں کہ آسمان و زمین کی ساری نعمتوں سے اعلیٰ و افضل ہیں، احکام قرآن اور سنت رسول کی پیروی انسان کو صحیح معنی میں انسان بناتی ہے اور جب انسان صحیح معنی میں انسان کا بل بن جائے تو سارا جہان درست ہو جائے اور یہ

دنیا بھی جنت بن جائے۔

پہلی آیت میں قرآن کریم کی چار خصوصیات کا ذکر ہے :

اول مَوْعِظَةٌ لِّمَن تَشَاءُ ، مَوْعِظَةٌ اور وَعِظ کے اصلی معنی ایسی چیزوں کا بیان کرنا ہے جن کو سن کر انسان کا دل نرم ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے ، دنیا کی غفلت کا پردہ چاک ہو آخرت کی فکر سامنے آجائے۔ قرآن کریم اول سے آخر تک اسی موعظہ حسنہ کا نہایت مبلغ مبلغ ہے ، اس میں ہر جگہ وعدہ کے ساتھ وعید ، ثواب کے ساتھ عذاب ، دنیا و آخرت میں فلاح و کامیابی کے ساتھ ناکامی اور گمراہی وغیرہ کا ایسا ملاحظہ ملتا ہے جس کو سن کر سمجھ بھی پانی ہو جائے ، پھر اُس پر قرآن کریم کا اعجاز بیان جو دلوں کی کایا پلٹنے میں بے نظیر ہے۔

مَوْعِظَةٌ کے ساتھ مَن تَشَاءُ کی قید نے قرآنی وعظ کی حیثیت کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا کہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ وعظ کسی اپنے جیسے عاجز انسان کی طرف سے نہیں جس کے ہاتھ میں کسی کا نفع و نقصان یا عذاب و ثواب کچھ نہیں ، بلکہ رب کریم کی طرف سے ہے جس کے قول میں غلطی کا امکان نہیں ، اور جس کے وعدے اور وعیدیں کسی عجز و کمزوری یا عذر کا کوئی خطرہ نہیں۔

قرآن کریم کی دوسری صفت شِفَاءٌ لِّمَن يَّشَاءُ ارشاد فرمائی ، شِفَاء کے معنی بیماری دور ہونے کے ہیں ، اور شَفَوْر ، صدر کی جمع ہے جس کے معنی سینہ کے ہیں ، مراد اس سے قلب ہے۔

معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم دلوں کی بیماریوں کا کامیاب علاج اور صحت و شفاء کا نسخہ اکسیر ہے ، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ قرآن کی اس صفت سے معلوم ہوا کہ وہ خاص دلوں کی بیماری کے لئے شفاء ہے ، جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں (روح المعانی)

مگر دوسرے حضرات نے فرمایا کہ درحقیقت قرآن ہر بیماری کی شفاء ہے خواہ قلبی و روحانی ہو یا بدنی اور جسمانی ، مگر روحانی بیماریوں کی تباہی انسان کے لئے جسمانی بیماریوں سے زیادہ شدید ہے اور اس کا علاج بھی ہر شخص کے بس کا نہیں ، اس لئے اس جگہ ذکر صرف قلبی اور روحانی بیماریوں کا کیا گیا ہے ، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جسمانی بیماریوں کے لئے شفاء نہیں ہے۔

روایات حدیث اور علمائے امت کے بیشمار تجربات اس پر شاہد ہیں کہ قرآن کریم جیسے قلبی امراض کے لئے اکسیر عظیم ہے اسی طرح وہ جسمانی بیماریوں کا بھی بہترین علاج ہے۔
حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک

شخص حاضر ہوا اور عرض کی کہ میرے سینے میں تکلیف ہے، آپ نے فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے شِفَاءٌ لِّمَنۡ فِی الضُّرِّ یعنی قرآن شفا ہے ان تمام بیماریوں کی جو سینوں میں ہوتی ہیں (روح المعانی از ابن مردودیہ)

اسی طرح حضرت واثلہ بن اسقعؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیان کیا کہ میرے حلق میں تکلیف ہے، آپ نے اس کو بھی یہی فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو۔

علماء امت نے کچھ روایات و آثار سے اور کچھ اپنے تجربوں سے آیات قرآنی کے خواص و فوائد مستقل کتابوں میں جمع بھی کر دیئے ہیں، امام غزالیؒ کی کتاب خواص قرآنی اس کے بیان میں مشہور و معروف ہے جس کی تلخیص حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے اعمال قرآنی کے نام سے فرمائی ہے، اور مشاہدات و تجربات اتنے ہیں کہ ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کریم کی مختلف آیتیں مختلف امراض جسمانی کے لئے بھی شفا کلی ثابت ہوتی ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ نزول قرآن کا اصلی مقصد قلب و روح کی بیماریوں کو ہی دور کرنا ہے اور ضمنی طور پر جسمانی بیماریوں کا بھی بہترین علاج ہے۔

اس سے ان لوگوں کی بے وقوفی اور کجروی بھی ظاہر ہو گئی جو قرآن کریم کو صرف جسمانی بیماریوں کے علاج یا دنیوی حاجات ہی کے لئے پڑھتے پڑھاتے ہیں، نہ روحانی امراض کی اصلاح کی طرف دھیان دیتے ہیں نہ قرآن کی ہدایات پر عمل کرنے کی طرف توجہ کرتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے لئے علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا ہے

ترا حاصل زلیں اش جزین نیست کہ از ہم خواندش آسان بمیری

یعنی تم نے قرآن کی سورۃ یس سے صرف اتنا ہی فائدہ حاصل کیا کہ اس کے پڑھنے سے موت آسان ہو جائے، حالانکہ اس سورت کے معانی اور حقائق و معارف میں غور کرتے تو اس سے کہیں زیادہ فوائد و برکات حاصل کر سکتے تھے۔

بعض اہل تحقیق مفسرین نے فرمایا کہ قرآن کی پہلی صفت یعنی قَوِّعْظًا کا تعلق انسان کے ظاہری اعمال کے ساتھ ہے جن کو شریعت کہا جاتا ہے، قرآن کریم ان اعمال کی اصلاح کا بہترین ذریعہ ہے، اور شِفَاءٌ لِّمَنۡ فِی الضُّرِّ کا تعلق انسان کے اعمال باطنیہ کے ساتھ ہے، جس کو طریقت اور تصوف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس آیت میں تیسری صفت قرآن کریم کی هُدًی اور چوتھی سَرَحْمَہٗ بیان کی گئی ہے، هُدًی کے معنی ہدایت یعنی رہنمائی کے ہیں، قرآن کریم انسان کو طریق حق و یقین کی طرف دعوت

دیتا ہے، اور انسان کو بتلاتا ہے کہ آفاق عالم اور خود ان کے نفوس میں اللہ تعالیٰ نے جو اپنی عظیم نشانیاں رکھی ہیں، ان میں غور و فکر کرو تا کہ تم ان سب چیزوں کے خالق اور مالک کو پہچانو۔

دوسری آیت میں فرمایا قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا، هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ، یعنی لوگوں کو چاہئے کہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت ہی کو اصلی خوشی کی چیز سمجھیں اور صرف اسی چیز پر خوش ہوں، دنیا کے چند روزہ مال و متاع اور راحت و عزت درحقیقت خوش ہونے کی چیز ہی نہیں، کیونکہ اول تو وہ کتنی ہی زیادہ کسی کو حاصل ہو، ادھوری ہی ہوتی ہے مکمل نہیں ہوتی، دوسرے ہر وقت اس کے زوال کا خطرہ لاحق ہے، اس لئے آخر آیت میں فرمایا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ، یعنی اللہ کا فضل و رحمت ان تمام مال و دولت اور عزت و سلطنت سے بہتر ہے جن کو انسان اپنی زندگی بھر کا سرمایہ سمجھ کر جمع کرتا ہے۔ اس آیت میں دو چیزوں کو فرحت و مسرت کا سامان قرار دیا ہے ایک فضل دوسرے رحمت، ان دونوں سے مراد یہاں کیا ہے؟ اس بارے میں ایک حدیث حضرت انسؓ کی روایت سے یہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے فضل سے مراد قرآن ہے اور رحمت سے مراد یہ ہے کہ تم کو قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق بخشی (روح المعانی از ابن مردودہ)

یہی مضمون حضرت برابر بن عازبؓ اور ابو سعید خدریؓ سے بھی منقول ہے اور بہت سے حضرات مفسرین نے فرمایا کہ فضل سے مراد قرآن اور رحمت سے مراد اسلام ہے، اور مطلب اس کا بھی وہی ہے جو حدیث سابق سے معلوم ہوا کہ رحمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن سکھایا اور اس پر عمل کرنے کی توفیق بخشی، کیونکہ اسلام اسی حقیقت کا ایک عنوان ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ فضل سے مراد قرآن اور رحمت سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، قرآن کریم کی آیت وَمَا آتَيْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَلِتُبَيِّنَ لَنَا اس مضمون کی تائید ہوتی ہے، اور حاصل اس کا بھی پہلی تفسیر سے کچھ مختلف نہیں، کیونکہ عمل بالقرآن یا اسلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پیروی کے مختلف عنوانات ہیں۔

اس آیت میں مشہور قراءت کے مطابق فَلْيَفْرَحُوا بِصِفَةِ غَائِبِ آيَاہِ، حالانکہ اس کے اصل مخاطب اُس وقت کے موجودین، حاضرین تھے، جس کا مقتضی یہ تھا کہ اس جگہ صیغہ خطاب کا استعمال کیا جاتا، جیسا کہ بعض قراءتوں میں آیا بھی ہے، مگر مشہور قراءت میں صیغہ

غائب استعمال کرنے کی حکمت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا اسلام کی رحمت عامہ صرف اس وقت کے حاضرین و موجدین کے لئے مخصوص نہیں تھی بلکہ قیامت تک پیدا ہونے والی نسلوں کو بھی شامل ہے۔ (روح المعانی)

فائدہ | یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرح و خوشی کا اس دنیا میں کوئی مقام ہی نہیں، ارشاد

ہے لَا تَفْرَحُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ، یعنی خوشی میں مست نہ ہو، اللہ ایسے خوش ہونیوالوں کو پسند نہیں فرماتے۔ اور آیت مذکورہ میں بصیغہ امر خوش ہونے کا حکم دیا گیا ہے، اس ظاہری تعارض کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جہاں خوش ہونے کو منع فرمایا ہے وہاں خوشی کا تعلق متاع دنیا سے ہے، اور جہاں خوش ہونے کا حکم دیا ہے وہاں خوشی کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے، دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ ممانعت کی جگہ میں مطلق خوشی مراد نہیں بلکہ خوشی میں بدست ہو جانا مراد ہے، اور اجازت کی جگہ میں مطلق خوشی مراد ہے۔

تیسری آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو حلال و حرام کے معاملہ میں اپنی ذاتی رائے کو دخل دیتے ہیں، اور قرآن و سنت کی سند کے بغیر جس چیز کو چاہا حلال قرار دیدیا جس کو چاہا حرام کہہ دیا، اس پر قیامت کی شدید وعید ذکر کی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز یا کسی فعل کے حلال یا حرام ہونے کا اصل مدار انسانی رائے پر نہیں بلکہ وہ خالص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حق ہے ان کے احکام کے بغیر کسی چیز کو نہ حلال کہنا جائز ہے نہ حرام۔

چوتھی آیت میں اللہ جل شانہ کے علم محیط اور اس کی بے مثال وسعت کا ذکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کیا گیا ہے کہ آپ جس کام اور جس حال میں ہمیشہ ہوتے ہیں یا قرآن پڑھتے ہیں اس کا کوئی جز ہم سے مخفی نہیں اسی طرح تمام انسان جو کچھ عمل کرتے ہیں وہ ہماری نظروں کے سامنے ہیں اور آسمان و زمین میں کوئی ایک ذرہ بھی ہم سے بھپا ہوا نہیں ہے بلکہ ہر چیز کتب صبین یعنی لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے۔

بظاہر اس جگہ علم الہی کی وسعت اور ہر چیز کو محیط ہونے کے بیان میں حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جائے کہ اگرچہ مخالف اور دشمن آپ کے بہت ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت آپ کے ساتھ ہے آپ کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔

الْآيَاتُ أُولِيَاءُ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۴﴾

یاد رکھو جو لوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ

جو لوگ کہ ایمان لائے اور ڈرتے رہے ، ان کے لئے ہے خوش خبری دنیا کی

الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ

زندگانی میں اور آخرت میں ، بدلتی نہیں اللہ کی باتیں ، یہی ہے

الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٦٤﴾

بڑی کامیابی ۔

خلاصہ تفسیر

یہ تو علم الہی کا بیان ہوا آگے مخلصین و مطیعین کی محفوظیت کا بیان ہے کہ یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ناک واقعہ پڑنے والا ہے اور نہ وہ کسی مطلب کے قوت ہونے پر مغموم ہوتے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ ان کو خوف ناک اور غم ناک حوادث سے بچاتا ہے اور) وہ (اللہ کے دوست) وہ ہیں جو ایمان لائے اور (معاصی سے) پرہیز رکھتے ہیں (یعنی ایمان اور تقویٰ سے اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے اور خوف و حزن سے ان کے محفوظ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ) ان کے لئے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی (من جانب اللہ خوف و حزن سے بچنے کی) خوش خبری ہے (اور) اللہ کی باتوں میں (یعنی وعدوں میں) کچھ فرق ہوا نہیں کرتا (پس جب بشارت میں ان سے وعدہ کیا گیا اور وعدہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے، اس لئے عدم خوف و عدم حزن لازم ہے اور) یہ (بشارت جو مذکور ہوئی) بڑی کامیابی ہے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں اولیاء اللہ کے مخصوص فضائل اور ان کی تعریف اور پہچان پھر دنیا و آخرت میں ان کے لئے بشارت کا ذکر ہے ، ارشاد فرمایا کہ اولیاء اللہ کو نہ کسی ناگوار چیز کے پیش آنے کا خطرہ ہوگا اور نہ کسی مقصد کے قوت ہو جانے کا غم ، اور اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جہنم نے تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کی ، ان کے لئے دنیا میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی ۔

اس میں چند باتیں قابل غور ہیں : اول یہ کہ اولیاء اللہ پر خوف و غم نہ ہونے کے کیا معنی ہیں ؟

دوسرے یہ کہ اولیاء اللہ کی تعریف کیا ہے اور ان کی علامات کیا ہیں ؟ تیسرے یہ کہ

دنیا و آخرت میں ان کی بشارت سے کیا مراد ہے ؟

پہلی بات کہ اولیاء اللہ پر خوف و غم نہیں ہوتا، اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ آخرت میں حساب کتاب کے بعد جب ان کو ان کے مقام جنت میں داخل کر دیا جائے گا تو خوف و غم سے ان کو ہمیشہ کے لئے نجات ہو جائے گی، نہ کسی تکلیف و پریشانی کا خطرہ رہے گا نہ کسی محبوب و مطلوب چیز کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم ہوگا، بلکہ جنت کی نعمتیں دائمی اور لازوال ہوں گی، اس معنی کے اعتبار سے تو مضمون آیت پر کوئی اشکال نہیں لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس میں اولیاء اللہ کی کوئی خصوصیت نہ رہی بلکہ تمام اہل جنت جن کو جہنم سے نجات مل گئی وہ اسی حال میں ہوں گے، ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ انجام کار جنت میں پہنچ گئے وہ سب اولیاء اللہ ہی کہلائیں گے، دنیا میں ان کے اعمال کتنے ہی مختلف رہے ہوں مگر دخول جنت کے بعد سب کے سب اولیاء اللہ کی ہی فہرست میں شمار ہونگے۔ لیکن بہت سے مفسرین نے فرمایا کہ اولیاء اللہ پر خوف و غم نہ ہونا دنیا و آخرت دونوں کے لئے عام ہے اور اولیاء اللہ کی خصوصیت یہی ہے کہ دنیا میں بھی وہ خوف و غم سے محفوظ ہیں اور آخرت میں ان پر خوف و غم نہ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، اور اس میں سب اہل جنت داخل ہیں۔

مگر اس پر حالات و واقعات کے اعتبار سے یہ اشکال ہے کہ دنیا میں تو یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ اولیاء اللہ تو کیا انبیاء علیہم السلام بھی اس دنیا میں خوف و غم سے محفوظ نہیں بلکہ ان کا خوف و خشیت اوروں سے زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے إِنَّهَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ أَوَيْتُ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى سے پوری طرح علماء ہی ڈرتے ہیں، اور دوسری جگہ میں اولیاء اللہ ہی کا یہ حال بیان فرمایا ہے وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ عَذَابٍ مُّشْتَفِقُونَ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ یعنی یہ لوگ اللہ کے عذاب سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں جس سے کوئی بے فکر ہو کر بیٹھ سکے۔

اور واقعات بھی یہی ہیں جیسا کہ شمائل ترمذی کی حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر حالات میں متفکر و متکین نظر آتے تھے، اور آپ نے خود فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔

صحابہ کرام میں سب سے افضل حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما اور تمام صحابہ و تابعین اور اولیاء اللہ کی گریہ و زاری اور خوف آخرت کے واقعات بیشمار ہیں۔

اس لئے روح المعانی میں علامہ آلوسی نے یہ فرمایا کہ حضرات اولیاء اللہ کا دنیا میں خوف و غم

سے محفوظ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ جن چیزوں کے خوف و غم میں عام طور سے اہل دنیا مبتلا رہتے ہیں کہ دنیوی مقاصد آرام و راحت عزت و دولت میں ذرا سی کمی ہو جانے پر مرتے لگتے ہیں اور ذرا ذرا سی تکلیف و پریشانی کے خوف سے ان سے بچنے کی تدبیروں میں رات دن کھوتے رہتے ہیں، اولیاء اللہ کا مقام ان سب سے بالا و بلند ہوتا ہے، ان کی نظر میں نہ دنیا کی فانی عزت و دولت، راحت و آرام کوئی چیز ہے جس کے حاصل کرنے میں سرگرمی ہوں، اور نہ یہاں کی محنت و کلفت اور رنج کچھ قابل التفات ہے جس کی مدافعت میں پریشان ہوں بلکہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ

نہ شادی داد سامانے نہ نعم آورد نقصانے بہ پیش ہمت ماہر چہ آمد بود ہمانے
اللہ جل شانہ کی عظمت و محبت اور خوف و خشیت ان حضرات پر ایسی پھائی ہوتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی رنج و راحت، سود و زیاں پر گاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے، بقول بعض
یہ ننگ عاشقی ہیں سود و حاصل دیکھنے والے

یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منہ دل دیکھنے والے

دوسری بات اولیاء اللہ کی تعریف اور ان کی علامات سے متعلق ہے، اولیاء ولی کی جمع ہے، لفظ ولی عربی زبان میں قریب کے معنی میں بھی آتا ہے اور دوست و محب کے معنی میں بھی، اللہ تعالیٰ کے قرب و محبت کا ایک عام درجہ تو ایسا ہے کہ اس سے دنیا کا کوئی انسان و حیوان بلکہ کوئی چیز بھی مستثنیٰ نہیں، اگر یہ قرب نہ ہو تو سارے عالم میں کوئی چیز وجود ہی میں نہیں آسکتی، تمام عالم کے وجود کی اصلی علت وہی خاص رابطہ ہے جو اس کو حق تعالیٰ شانہ سے حاصل ہے گو اس رابطہ کی حقیقت کو نہ کسی نے سمجھا اور نہ سمجھ سکتا ہے مگر ایک بے کیف رابطہ کا ہونا یقینی ہے، مگر لفظ اولیاء اللہ میں یہ درجہ ولایت کا مراد نہیں بلکہ ولایت و محبت اور قرب کا ایک دوسرا درجہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے ساتھ خاص ہے یہ قرب محبت کہلاتا ہے جن لوگوں کو یہ قرب خاص حاصل ہو وہ اولیاء اللہ کہلاتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا بندہ نفلی عبادت کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو پھر میں ہی اسکے کان بن جاتا ہوں وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعہ سنتا ہے، میں ہی اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، وہ جو کچھ دیکھتا ہے مجھ سے دیکھتا ہے میں ہی اس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں وہ جو کچھ کرتا ہے مجھ سے کرتا ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کی کوئی حرکت و سکون اور کوئی کام میری رضا کے خلاف نہیں ہوتا۔

اور اس ولایت خاصہ کے درجات بشمار اور غیر متناہی ہیں، اس کا اعلیٰ درجہ انبیاء علیہم السلام کا حصہ ہے، کیونکہ ہر نبی کا ولی اللہ ہونا لازمی ہے، اور اس میں سب سے اونچا مقام سید الانبیاء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اور ادنیٰ درجہ اس ولایت کا وہ ہے جس کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں درجہ فناء کہا جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کا قلب اللہ تعالیٰ کی یاد میں ایسا مستغرق ہو کہ دنیا میں کسی کی محبت اس پر غالب نہ آئے، وہ جس سے محبت کرتا ہے تو اللہ کے لئے کرتا ہے، جس سے نفرت کرتا ہے تو اللہ کے لئے کرتا ہے، اُس کے حب و بغض اور محبت و عداوت میں اپنی ذات کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں مشغول رہتا ہے اور وہ ہر ایسی چیز سے پرہیز کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہو، اسی حالت کی علامت ہے کثرت ذکر اور دوام طاعت، یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا اور ہمیشہ ہر حال میں اس کے احکام کی اطاعت کرنا، یہ دو وصف جس شخص میں موجود ہوں وہ ولی اللہ کہلاتا ہے جس میں ان دونوں میں سے کوئی ایک نہ ہو وہ اس فہرست میں داخل نہیں، پھر جس میں یہ دونوں موجود ہوں اس کے درجات ادنیٰ و اعلیٰ کی کوئی حد نہیں، انہیں درجات کے اعتبار سے اولیاء اللہ کے درجات متفاضل اور کم و بیش ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ مذکور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اس آیت میں اولیاء اللہ سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو خالص اللہ کے لئے آپس میں محبت کرتے ہیں، کوئی دنیاوی غرض درمیان میں نہیں ہوتی، و منظر ہی از ابن مردویہ، اور ظاہر ہے کہ یہ حالت انہیں لوگوں کی ہو سکتی ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس درجہ ولایت کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ امت کے افراد کو یہ درجہ ولایت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فیض صحبت سے حاصل ہو سکتا ہے، اسی سے تعلق مع اللہ کا وہ رنگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا اپنے حوصلہ کے مطابق اس کا کوئی حصہ امت کے اولیاء کو ملتا ہے، پھر فیض صحبت صحابہ کرامؓ کو بلا واسطہ حاصل تھا، اسی وجہ سے ان کا درجہ ولایت تمام امت کے اولیاء و اقطاب سے بالاتر تھا، بعد کے لوگوں کو یہی فیض ایک واسطہ یا چند واسطوں سے حاصل ہوتا ہے جتنے

وسائط بڑھتے جاتے ہیں اتنا ہی اس میں فرق پڑتا جاتا ہے، یہ واسطہ صرف وہی لوگ بن سکتے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے ہوتے آپ کی سنت کے پیروں ایسے لوگوں کی کثرت سے مجالست اور صحبت جبکہ اس کے ساتھ ان کے ارشادات کی پیروی اور اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت بھی ہو، یہی نسخہ ہے درجہ ولایت حاصل کرنے کا، جو تین چیزوں سے مرکب ہے، کسی ولی اللہ کی صحبت، اس کی اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت، بشرطیکہ یہ کثرت ذکر مسنون طریقہ پر ہو، کیونکہ کثرت ذکر سے آئینہ قلب کو چلا ہوتی ہے تو وہ نور ولایت کے انعکاس کے قابل بن جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ ہر چیز کے لئے صیقل اور صفائی کا کوئی طریقہ ہوتا ہے، قلب کی صیقل ذکر اللہ سے ہوتی ہے، اس کو بیہقی نے بروایت ابن عمر نقل فرمایا ہے۔ (منظہری)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو کسی بزرگ سے محبت کرتا ہے مگر عمل کے اعتبار سے ان کے درجہ تک نہیں پہنچتا؟ آپ نے فرمایا اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ یعنی ہر شخص اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی محبت و صحبت انسان کے لئے حصول ولایت کا ذریعہ ہے، اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت زرینؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زرینؓ سے فرمایا کہ میں تمہیں دین کا ایسا اصول بتلاتا ہوں جس سے تم دنیا و آخرت کی فلاح و کامیابی حاصل کر سکتے ہو، وہ یہ ہے کہ اہل ذکر کی مجلس و صحبت کو لازم پکڑو اور جب تنہائی میں جاؤ تو جتنا زیادہ ہو سکے اللہ کے ذکر سے اپنی زبان کو حرکت دو، جس سے محبت کرو اللہ کے لئے کرو جس سے نفرت کرو اللہ کے لئے کرو۔ (منظہری)

مگر یہ صحبت و مجالست انہیں لوگوں کی مفید ہے جو خود ولی اللہ تبع سنت ہوں اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تابع نہیں وہ خود درجہ ولایت سے محروم ہیں، چاہے کشف و کرامات ان سے کتنے ہی صادر ہوں۔ اور جو شخص مذکورہ صفات کے اعتبار سے ولی ہو اگرچہ اس سے کبھی کوئی کشف و کرامت ظاہر نہ ہوئی ہو وہ اللہ کا ولی ہے۔ (منظہری)

اولیاء اللہ کی علامت اور پہچان تفسیر مظہری میں ایک حدیث قدسی کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے اولیاء میرے بندوں میں سے وہ لوگ ہیں جو میری یاد کے ساتھ یاد آویں اور جن کی یاد کے ساتھ میں یاد آؤں، اور ابن ماجہ میں بروایت حضرت اسماء بنت یزید مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیاء اللہ کی یہ پہچان بتلائی

الَّذِينَ إِذَا سُرُّوا ذَكَرُوا اللَّهَ، یعنی جن کو دیکھ کر خدا یاد آئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر انسان کو اللہ کے ذکر کی توفیق اور دنیاوی فکروں کی کمی محسوس ہو، یہ علامت اس کے دلی اللہ ہونے کی ہے۔

تفسیر مظہری میں فرمایا کہ عوام نے جو اولیاء اللہ کی علامت کشف و کرامت یا غیب کی چیزیں معلوم ہونے کو سمجھ رکھا ہے یہ غلط اور دھوکہ ہے، ہزاروں اولیاء اللہ ہیں جن سے اس طرح کی کوئی چیز ثابت نہیں اور اس کے خلاف ایسے لوگوں سے کشف اور غیب کی خبریں منقول ہیں جن کا ایمان بھی درست نہیں۔

آخر آیت میں جو یہ فرمایا گیا کہ اولیاء کے لئے دنیا میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی، آخرت کی خوش خبری تو یہ ہے کہ موت کے وقت جب اس کی روح کو اللہ کے پاس لے جایا جائے گا اس وقت اس کو خوش خبری جنت کی ملے گی پھر قیامت کے روز قبر سے اٹھنے کے وقت جنت کی خوش خبری دی جائے گی جیسا کہ طبرانی نے بروایت ابن عمر نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل لکالہ الا اللہ کو نہ موت کے وقت کوئی وحشت ہوگی نہ قبر میں اور نہ قبر سے اٹھنے کے وقت، گویا میری آنکھیں اس وقت کا حال دیکھ رہی ہیں جب یہ لوگ اپنی قبروں سے مٹی بھاڑتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اٹھیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہمارا غم دور کر دیا۔

اور دنیا کی بشارت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ سچی خوابیں، جو انسان خود دیکھے یا اس کے لئے کوئی دوسرا دیکھے جن میں ان کے لئے خوش خبری ہو۔ (رمضان البخاری عن ابی ہریرۃ رض)

اور دنیا کی دوسری بشارت یہ ہے کہ عام مسلمان بغیر کسی غرض کے اس سے محبت کریں اور اچھا سمجھیں، اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تِلْكَ عَاجِلُ بَشْرَى الْمُؤْمِنِ یعنی عام مسلمانوں کا اچھا سمجھنا اور تعریف کرنا مؤمن کے لئے نقد خوش خبری ہے۔ (مسلم و بغوی)

وَلَا يَحْزُنُكَ قَوْلُهُمْ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا هُوَ السَّمِيعُ

اور رنج مت کر ان کی بات سے، اصل میں سب زور اللہ کے لئے ہے، وہی ہے سننے والا

الْعَلِيمُ ﴿۹۵﴾ اَلَا اِنَّ لِلّٰہِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَمَا

جاننے والا، سنتا ہے اللہ کا ہے جو کوئی ہے آسمانوں میں اور جو کوئی ہے زمین میں، اور یہ

يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ شُرَكَاءَ اِنَّ يَتَّبِعُونَ

جو پیچھے پڑے ہیں اللہ کے سوا شریکوں کو پکارنے والے، سو یہ کچھ نہیں مگر

إِلَّا الظَّنُّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿٦٩﴾

تیجھے پڑے ہیں اپنے خیال کے اور کچھ نہیں مگر انکلیں دوڑاتے ہیں ۔

خلاصہ تفسیر

اور آپ کو ان کی باتیں نعم میں نہ ڈالیں (یعنی ان کے کفریات سے مغموم نہ ہوں) کیونکہ ظلم و حفاظت مذکورہ کے علاوہ تمام تر غلبہ (اور قدرت بھی) خدا ہی کے لئے (ثابت) ہے (وہ اپنی قدرت سے حسب وعدہ آپ کی حفاظت کرے گا) وہ (ان کی باتیں) سنتا ہے (اور ان کی حالت) جانتا ہے (وہ آپ کا بدلہ ان سے خود لے لے گا) یاد رکھو کہ جتنے کچھ آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں (یعنی فرشتے اور جن و انس) یہ سب اللہ ہی کے (مملوک) ہیں (اس کی حفاظت یا مکافات کو کوئی روک نہیں سکتا پس باہمہ وجہ تسلی رکھنا چاہئے) اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ شاید شرکار مزاحمت کر سکیں تو اس کی حقیقت سن لو کہ جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے شرکار کی عبادت کر رہے ہیں (خدا جانے) کس چیز کا اتباع کر رہے ہیں (یعنی ان کے اس عقیدہ کی کیا دلیل ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ کچھ بی دلیل نہیں) محض بے سند خیال کا اتباع کر رہے ہیں اور محض خیالی باتیں کر رہے ہیں (پس واقع میں ان میں صفات الوہیت کے مثل علم و قدرت و غیرہ نہیں ہیں پھر ان میں احتمال مزاحمت کی کب گنجائش ہے)

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ إِنَّ

وہی ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے رات کو کہ چین حاصل کرو اس میں اور دن دیا دکھلائیو لا، بیشک

فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿٧٠﴾ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا

اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں ، کہتے ہیں ٹھہرایا اللہ نے بیٹا

سُبْحَنَهُ ۚ هُوَ الْغَنِيُّ ۚ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ إِنَّ

وہ پاک ہے ، وہ بے نیاز ہے ، اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں ، نہیں

عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلٰطِيْنٍ ۚ بِهٰذَا اِذْ تَقُوْلُوْنَ عَلٰی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٧١﴾

تمہارے پاس کوئی سند اس کی ، کیوں بھوٹ کہتے ہو اللہ پر جس بات کی تم کو خبر نہیں ،

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلٰی اللّٰهِ الْكَذِبُ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿٧٢﴾ مَتَاعٌ

کہہ جو لوگ باندھتے ہیں اللہ پر بھوٹ بھلائی نہیں پاتے تھوڑا سا نفع

فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُنٰزِلُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ

اٹھا لینا دنیا میں پھر ہماری طرف ان کو لوٹنا ہے پھر پکھائیں گے ہم ان کو سخت عذاب

بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٤٣﴾

بدلہ ان کے کفر کا ۔

خلاصہ تفسیر

وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن بھی اس طور پر بنایا کہ (بوجہ روشن ہونے کے) دیکھنے بھالنے کا ذریعہ ہے، اس (بنانے) میں دلائل (توحید) ہیں ان لوگوں کے لئے جو (تدبیر کے ساتھ ان مضامین کو) سنتے ہیں، (مشرکین ان دلائل میں غور نہیں کرتے اور شرک کی باتیں کرتے ہیں چنانچہ) وہ کہتے ہیں (غور باللہ) اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے، سبحان اللہ (کیسی سخت بات کہی)، وہ تو کسی کا محتاج نہیں (اور سب اس کے محتاج ہیں)، اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (پس سب ملوک ہوتے اور وہ مالک ہوا پس ثابت ہوا کہ کمالات میں کوئی اس کا مشار و مجانس نہیں، پس اگر اولاد کو اللہ کا مجانس یعنی ہم جنس کہا جائے تو محانت باطل ہو چکی اور اگر غیر مجانس کہو تو ناجنس اولاد ہونا عیب ہے اور عیوب سے اللہ تعالیٰ پاک ہے، جیسا سُبْحَانَهُ میں اس طرف اشارہ بھی ہے، پس اولاد کا ہونا مطلقاً باطل ہو گیا، ہم نے جو نفی اولاد کا دعویٰ کیا تھا اس پر تو ہم نے دلیل قائم کر دی ہے، اب رہا تمہارا دعویٰ سو تمہارے پاس (بجز بیہودہ دعویٰ کے)، اس (دعویٰ) پر کوئی دلیل (بھی) نہیں (تو) کیا اللہ کے ذمے ایسی بات لگاتے ہو جس کا تم (کسی دلیل سے) علم نہیں رکھتے آپ (ان کا منقری ہونا ثابت کر کے اس افتراء کی وعید سنانے کے لئے) کہہ دیجئے کہ جو لوگ اللہ پر بھوٹ افتراء کرتے ہیں (جیسے مشرکین)، وہ (کبھی) کامیاب نہ ہوں گے (اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ ہم تو ایسوں کو دنیا میں خوب کامیاب اور آرام و راحت میں پاتے ہیں، تو جواب یہ ہے کہ) یہ دنیا میں (چند روزہ) تھوڑا سا عیش ہے (جو بہت جلد ختم ہوا جاتا ہے) پھر (مگر) ہمارے ہی پاس ان کو آنا ہے پھر (آخرت میں) ہم ان کو ان کے کفر کے بدلے سزائے سخت (کا مزا) چکھا دیں گے۔

وَأَنشَأْنَاهُمْ نَبَا نُوحٍ رَّاذَقَالَ لِقَوْمِهِ يَقَوْمِ إِنَّ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ

اور اُن کو حال نوح کا، جب کہا اپنی قوم کو اے قوم اگر بھاری ہوا ہے تم پر

مَقَامِي وَتَذَكِّرُنِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ

میرا کھڑا ہونا اور نصیحت کرنا اللہ کی آیتوں سے تو میں نے اللہ پر بھروسہ کیا اب تم سب مل کر مقرر کرو اپنا کام

وَشُرَكَاءَكُمُ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ

اور جمع کرو اپنے شرکیوں کو پھر نہ رہے تم کو اپنے کام میں شبہ پھر کر گزر دو میرے ساتھ

وَلَا تُنْظِرُونِ ۝۴۱ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ إِنْ

اور مجھ کو مہلت نہ دو ، پھر اگر منہ پھیر دو گے تو میں نے نہیں چاہی تم سے مزدوری ، میری

أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَأَمَرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝۴۲

مزدوری ہے اللہ پر ، اور مجھ کو حکم ہے ، کہ رہوں مسلمانوں میں ۔

فَكَذَّبُوهُ فَتَبَيَّنْهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنَاهُمْ خَلْفَ

پھر اس کو بھٹلایا سو ہم نے بچا لیا اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے کشتی میں اور ان کو قائم کر دیا جگہ پر

وَأَخَذْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَنَظَرُكَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

اور ڈبا دیا ان کو جو بھٹلاتے تھے ہماری باتوں کو ، سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام

الْمُنْذِرِينَ ۝۴۳

ان کا جن کو ڈرایا تھا ۔

خلاصہ تفسیر

اور آپ ان کو نوح (علیہ السلام) کا قصہ پڑھ کر سناتے (جو کہ اس وقت واقع ہوا تھا) جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم اگر تم کو میرا رہنا (یعنی وعظ گوئی کی حالت میں رہنا) اور احکامِ خداوندی کی نصیحت کرنا بھاری (اور ناگوار) معلوم ہوتا ہے تو (ہوا کرے میں کچھ پرواہ نہیں کرتا کیونکہ) میرا تو خدا ہی پر بھروسہ ہے سو تم (میرے ضرر پہنچانے کے متعلق) اپنی تدابیر (جو کچھ کر سکو) مع اپنے شرکا، (یعنی بتوں) کے پختہ کر لو (یعنی تم اور تمہارے معبود سب مل کر میری ضرورسانی میں اپنا ارمان نکال لو) پھر تمہاری وہ تدبیر تمہاری گھٹن (اور دل تنگی) کا باعث نہ ہونا چاہئے (یعنی اکثر نفسیہ تدبیر سے طبیعت گھٹا کرتی ہے، سو نفسیہ تدبیر کی ضرورت نہیں، جو کچھ تدبیر کرو دل کھول کر علانیہ کرو، میرا نہ لحاظ پاس کرو اور نہ میرے چلے جانے نکل جانے کا اندیشہ کرو کیونکہ اتنے آدمیوں کے پہرہ میں سے ایک آدمی کا نکل جانا بھی مستبعد ہے پھر انہماکی کیا ضرورت ہے، پھر میرے ساتھ (جو کچھ کرنا ہے) اگر گزر دو اور مجھ کو (ذرا) مہلت نہ دو (حاصل یہ کہ میں تمہاری ان باتوں سے نہ ڈرتا ہوں اور نہ تبلیغ سے رک سکتا ہوں یہاں تک تو نفی خوف کی فرمائی، آگے نفی طمع کی فرماتے ہیں، یعنی پھر بھی اگر تم

اعراض ہی کئے جاؤ تو (یہ سمجھو کہ) میں نے تم سے (اس تبلیغ پر) کوئی معاوضہ تو نہیں مانگا اور میں تم سے کیوں مانگتا کیونکہ، میرا معاوضہ تو صرف (حسب وعدہ کرم) اللہ ہی کے ذمے ہے ان عرض نہ تم سے ڈرتا ہوں نہ خواہش رکھتا ہوں، اور (چونکہ) مجھ کو حکم کیا گیا ہے کہ میں اطاعت کرنے والوں میں رہوں (اس لئے تبلیغ میں حکم کی تعمیل رکھتا ہوں اگر تم نہ مانو گے میرا کیا نقصان ہے) سو (باوجود اس موقعہ بلیغہ کے بھی) وہ لوگ ان کو جھٹلاتے رہے پس (اس پر عذاب طوفان کا مسلط ہوا اور) ہم نے (اس عذاب سے) ان کو اور جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے ان کو نجات دی اور ان کو (زمین) پر آباد کیا اور (باقی جو لوگ رہ گئے تھے) جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ان کو (اس طوفان میں) غرق کر دیا، سو دیکھنا چاہئے کیسا (برا) انجام ہوا ان لوگوں کا جو (عذاب الہی سے) ڈرائے جا چکے تھے (یعنی بے خبری میں ہلاک نہیں کئے گئے، پہلے کہہ دیا، سمجھا دیا، نہ مانا سزا پائی)۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَبَاءُوا بِآيَاتِنَا بِالْجَبَدِ

پھر بھیجے ہم نے بعد کتنے پیغمبر ان کی قوم کی طرف پھر لائے ان کے پاس کھلی دلیلیں
فَمَا كَانُوا إِلَٰهَ إِلَّا كَذَّابُونَ مِنْ قَبْلُ كَذَلِكَ نَطْبَعُ عَلَىٰ
سوان سے یہ نہ ہوا کہ ایمان لے آئیں اس بات پر جس کو جھٹلا چکے تھے پہلے سے، اسی طرح ہم مہر لگاتے ہیں

قُلُوبِ الْمُتَعَذِّبِينَ ﴿٧٢﴾

دلوں پر حد سے نکل جانے والوں کے۔

خلاصہ تفسیر

پھر نوح (علیہ السلام) کے بعد ہم نے اور رسولوں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا، سو وہ ان کے پاس معجزات لے کر آئے (مگر) پھر (بھی) ان کی ضد اور ہٹ کی یہ کیفیت تھی کہ جس چیز کو انہوں نے اول (دہلہ) میں (ایک بار) جھوٹا کہہ دیا یہ نہ ہوا کہ پھر اس کو مان لیتے اور جیسے یہ لوگ دل کے سخت تھے، اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کے دلوں پر بند لگا دیتے ہیں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِم مُّوسَىٰ وَهَارُونَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ

پھر بھیجا ہم نے ان کے پیچھے موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس
بِآيَاتِنَا فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ﴿٧٣﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ
اپنی نشانیاں دے کر پھر تکبر کرنے لگے اور وہ تھے لوگ گنہگار، پھر جب پہنچی ان کو سچی بات

مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا إِنَّ هَذَا السِّحْرُ مُبِينٌ ﴿۷۷﴾ قَالَ مُوسَى اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَدْعُونَ

ہمارے پاس سے کہنے لگے یہ تو جادو ہے کھلا ، کہا موسیٰ نے کیا تم یہ کہتے ہو

لِلْحَقِّ لَمْ يَأْجَأْكُمْ إِلَىٰ هَذَا السِّحْرِ هَذَا وَلَا يَفْلَحُ السَّاحِرُونَ ﴿۷۸﴾ قَالُوا

حق بات کو جب وہ پہنچے تمہارے پاس ، کیا یہ جادو ہے ، اور نجات نہیں پاتے جادو کر کے والے ، بولے

أَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَتَكُونَ لَكُمَا

کیا تو آیا ہے کہ ہم کو پھیر دے اس رستہ سے جس پر پایا ہم نے اپنے باپ داداؤں کو اور تم دونوں کو

الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِينَ ﴿۷۹﴾ وَقَالَ

سرداری مل جائے اس ملک میں ، اور ہم نہیں ہیں تم کو ماننے والے اور بولا

فِرْعَوْنُ أَتُؤْتِي بِكُلِّ سِحْرٍ عَلَيْهِمْ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ

فرعون لاؤ میرے پاس جو جادو گر ہو پڑھا ہوا ، پھر جب آئے جادو گر کہا ان کو

مُوسَى الْقُوا مَا أَنْتُمْ مُلْقُونَ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا الْقُوا قَالَ مُوسَى

موسیٰ نے ڈالو جو تم ڈالتے ہو ، پھر جب انہوں نے ڈالا موسیٰ بولا

مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ إِنَّ اللَّهَ سَابِطٌ إِنَّ اللَّهَ لَا يَصْلِحُ عَمَلُ

کہ جو تم لائے ہو سو جادو ہے ، اب اللہ اس کو بگاڑتا ہے ، بیشک اللہ نہیں سفارتا شریوں

الْمُفْسِدِينَ ﴿۸۲﴾ وَيُحَقِّقُ اللَّهُ الْحَقَّ يَكْلِمُتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿۸۳﴾

کے کام ، اور اللہ سچا کرتا ہے حق بات کو اپنے حکم سے اور پڑے برا مانیں گمنگار -

خلاصہ تفسیر

پھر ان (مذکور) پیغمبروں کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس اپنے معجزات (عصا اور ید بصریہ) دے کر بھیجا سوائے انہوں نے (دعو) کے ساتھ ہی ان کی تصدیق کرنے سے (تکبر کیا) اور طلب حق کے لئے غور بھی تو نہ کیا، اور وہ لوگ جرائم کے خوگر تھے (اس لئے اطاعت نہ کی) پھر جب (بعد دعویٰ کے) ان کو ہمارے پاس سے (نبوت موسویہ پر) صحیح دلیل پہنچی (مراد اس سے معجزہ ہے) تو وہ لوگ کہنے لگے کہ یقیناً یہ صریح جادو ہے، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم اس صحیح دلیل کی نسبت جب کہ وہ تمہارے پاس پہنچی ایسی بات کہتے ہو کہ یہ جادو ہے، کیا یہ جادو ہے، حالانکہ جادو گر (جب کہ دعویٰ نبوت کا کریں تو اظہار معجزہ میں کامیاب نہیں ہوا کرتے) اور میں کامیاب ہوا کہ اول دعویٰ کیا پھر معجزات ظاہر کر دیئے، وہ لوگ (اس تقریر کا کچھ جواب نہ دے سکے، ویسے ہی براہ جہالت،

کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ اس طریقہ سے ہٹا دو جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے اور اس لئے آئے ہو کہ تم دونوں کو دنیا میں ریاست (اور سرداری) مل جاوے اور (تم نبوب سمجھ لو کہ) ہم تو تم دونوں کو کبھی نہ مانیں گے، اور فرعون نے (اپنے سرداروں سے) کہا کہ میرے پاس تمام ماہر جادو گروں کو جو ہمارے قلمرو میں ہیں، حاضر کرو (چنانچہ جمع کئے گئے) سو جب وہ آئے (اور موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہوا تو) موسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کہ ڈالو جو کچھ تم کو (میدان میں) ڈالنا ہے، سو جب انہوں نے (اپنا جادو کا سامان) ڈالا تو موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ جو کچھ تم (بنا کر) لاتے ہو جادو یہ ہے نہ وہ جس کو فرعون والے جادو کہتے ہیں، یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس (جادو) کو ابھی درہم برہم کئے دیتا ہے (کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے فسادیوں کا کام بننے نہیں دیتا) جو معجزہ کے ساتھ مقابلہ سے پیش آویں، اور اللہ تعالیٰ جس طرح اہل باطل کے باطل کو بمقابلہ معجزات حق کے باطل کر دیتا ہے اسی طرح، دلیل صحیح (یعنی معجزہ) کو اپنے وعدوں کے موافق (کہ اثبات نبوت انبیاء کے متعلق ہیں) ثابت کر دیتا ہے گو مجرم (اور کافر) لوگ کیسا ہی ناگوار سمجھیں۔

فَمَا آمَنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّتَهُ مِّنْ قَوْمٍ عَلَىٰ خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ

پھر کوئی ایمان نہ لایا موسیٰ پر مگر کچھ بچے اس کی قوم کے ڈرتے ہوئے فرعون سے

وَمَلَأْنَاهُمْ أَنْ يَفْتِنَهُمْ وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّهُ

اور ان کے سرداروں سے کہ کہیں ان کو بھلا نہ دے، اور فرعون پر مہر رہا ہے ملک میں، اور اس نے

لَمِنَ الْمُسْرِفِينَ ۝۸۳ وَقَالَ مُوسَىٰ يَقَوْمِ إِن كُنتُمْ مَّا مَنَّا بِاللهِ

ہاتھ چھوڑ رکھا ہے، اور کہا موسیٰ نے اے میری قوم اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر

فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوا إِن كُنتُمْ مُّسْلِمِينَ ۝۸۴ فَقَالُوا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا

تو اسی پر بھروسہ کرو اگر ہو تم فرماں بردار، تب وہ بولے ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝۸۵ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ

اے رب ہمارے نہ آزمائے ہم پر زور اس ظالم قوم کا، اور بھڑا دے ہم کو مہربانی فرما کر

مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝۸۶

ان کا شر لوگوں سے۔

خلاصہ تفسیر

پس (جب عصا کا معجزہ ظاہر ہوا تو) موسیٰ (علیہ السلام) پر (شروع شروع میں) ان

کی قوم میں سے صرف قدرے قلیل آدمی ایمان لائے وہ بھی فرعون سے اور اپنے حکام سے ڈرتے ڈرتے کہہیں (ظاہر ہونے پر) ان کو تکلیف دہ پہنچا دے اور واقع میں (ڈرنا ان کا بے جا نہ تھا کیونکہ) فرعون اس ملک میں زور (سلطنت) رکھتا تھا اور یہ بھی بات تھی کہ وہ حد (انصاف) سے باہر ہو جاتا تھا (ظلم کرنے لگتا تھا پھر جو شخص حکومت کے ساتھ ظلم کرتا ہو اس سے تو ڈر لگتا ہی ہے) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (جب ان کو خائف دیکھا تو ان سے) فرمایا کہ اے میری قوم اگر تم (مجھے) دل سے (اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو) سچ بچا رمت کرو بلکہ اسی پر توکل کرو اگر تم (اس کی) اطاعت کرنے والے ہو، انہوں نے (جواب میں) عرض کیا کہ ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا (بعد اس کے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ظالم لوگوں کا تختہ مشق نہ بنا اور ہم کو اپنی رحمت کے صدقے ان کافروں سے نجات دے۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّآ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتًا

اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو کہ مقرر کرو اپنی قوم کے واسطے مصر میں سے گھر

وَجَعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۷﴾

اور بناؤ اپنے گھر قیدرو اور قائم کرو نماز اور خوش خبری دے ایمان والوں کو

وَقَالَ مُوسَىٰ رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَتْهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا

اور کہا موسیٰ نے اے رب ہمارے تو نے دی ہے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو رونق اور مال

فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَيَّ

دنیا کی زندگی میں اے رب اس واسطے کہ بہکائیں تیری راہ سے، اے رب مٹا دے

أَمْوَالَهُمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ

ان کے مال اور سخت کر دے ان کے دل کہ نہ ایمان لائیں جب تک دیکھ لیں عذاب

الْآلِيمِ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا وَلَا تَتَّبِعِنَّ

دردناک، فرمایا قبول ہو چکی دعا تمہاری سو تم دونوں ثابت رہو اور مت چلو

سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۸۹﴾ وَجَوْنُ نَايِبِنِي إِسْرَءِيلَ الْبَحْرَ

راہ ان کی جو ناواقف ہیں، اور پار کر دیا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے

فَاتَّبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَعَدُوًّا حَتَّىٰ إِذَا أَذْرَكَ الْفَرَقُ

پھر پیچھا کیا ان کا فرعون نے اور اس کے لشکر نے شہارت سے اور تعدی سے، یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا

قَالَ اٰمَنْتُ اَنْتَ لَا اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْ اٰمَنْتَ بِهٖ يٰنُوْحُ اٰسِرْ اَعْيُنَ

بولایا یقین کر لیا میں نے کہ کوئی معبود نہیں مگر جس پر ایمان لائے بنی اسرائیل

وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ ۹۱ اَلَّذِيْنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلَ وَكُنْتَ

اور میں ہوں فرمان برداروں میں ، اب یہ کہتا ہے اور تو نافرمانی کرتا رہا اس سے پہلے اور رہا

مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۙ ۹۱

گمراہوں میں -

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے اس دعا کے قبول کرنے کا سامان کیا کہ، موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے بھائی ہارون (علیہ السلام) کے پاس وحی بھیجی کہ تم دونوں اپنے ان لوگوں کے لئے (بدستور) مصر میں گھر برقرار رکھو (یعنی وہ ڈر کر گھر نہ چھوڑیں) ہم ان کے محافظ ہیں، اور نماز کے اوقات میں، تم سب اپنے انہی گھروں کو نماز پڑھنے کی جگہ قرار دے لو (مساجد کی حاضری خوف کی وجہ سے معاف ہے) اور یہ ضروری ہے کہ نماز کے پابند رہو (تاکہ نماز کی برکت سے اللہ تعالیٰ جلدی اس مصیبت سے چھڑا دے) اور (اے موسیٰ) آپ مسلمانوں کو بشارت دے دیں کہ اب جلدی یہ مصیبت ختم ہو جاوے گی، اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (دُعائیں) عرض کیا کہ اے ہمارے رب (ہم کو) بات معلوم ہو گئی کہ آپ نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو سامان تجل اور طرح طرح سے مال دنیوی زندگی میں اسے ہمارے رب اسی واسطے دیتے ہیں کہ وہ آپ کی راہ سے (لوگوں کو) گمراہ کریں (پس جب ہدایت ان کے مقدر میں ہے نہیں اور جو حکمت تھی وہ حاصل ہو چکی تو اب ان کے اموال اور نفوس کو کیوں باقی رکھا جاوے پس) اے ہمارے رب ان کے مالوں کو نیست نابود کر دیجئے اور ان کے نفوس کی ہلاکت کا سامان کر دیجئے اس طرح کہ ان کے دلوں کو (زیادہ) سخت کر دیجئے (جس سے ہلاکت کے مستحق ہو جاویں) سو یہ ایمان نہ لائے پاویں (بلکہ روز بروز ان کا کفر ہی بڑھتا رہے) یہاں تک کہ عذاب الیم (کے مستحق ہو کر اس) کو دیکھ لیں (سو اس وقت ایمان نافع نہیں ہوتا، موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا کی اور ہارون علیہ السلام آمین کہتے رہے۔ کذا فی الدر المنثور) حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی (کیونکہ آمین کہنا بھی دعا میں شریک ہونا ہے یعنی ہم ان کے اموال و نفوس اب ہلاک کرنے والے ہیں) سو تم (اپنے منصبی کام یعنی تبلیغ پر) مستقیم رہو (یعنی گو ہدایت ان کی تقدیر میں نہ ہو مگر تبلیغ میں تمہارا تو فائدہ ہے) اور ان لوگوں

کی راہ نہ چلنا جن کو ہمارے وعدے کے سچے ہونے کا یا توقف میں حکمت ہونے کا یا تسلیغ کے ضروری ہونے کا، علم نہیں (یعنی ہمارے وعدہ کو سچا سمجھو اور اگر ہلاکت میں دیر ہو جاوے اس میں حکمت سمجھو اور اپنے منصبی کام میں لگے رہو) اور جب ہم نے فرعون کو ہلاک کرنا چاہا تو موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے باہر نکال لے جائیے، چنانچہ وہ سب کو لے کر چلے اور رستہ میں دریا سے شور مچا رہا، اور موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اس میں راستہ ہو گیا اور ہم نے بنی اسرائیل کو (اس) دریا سے پار کر دیا پھر ان کے پیچھے فرعون مع اپنے لشکر کے ظلم اور زیادتی کے ارادہ سے (دریا میں) چلا کہ دریا سے مکمل کر ان سے قتل و قتال کرے لیکن وہ دریا سے پار نہ ہو سکا، یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا اور ملائکہ عذاب کے نظر آنے لگے، تو (سراسیمہ ہو کر) کہنے لگائیں ایمان لاتا ہوں کہ بجز اس کے کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں کوئی معبود نہیں اور میں مسلمانوں میں داخل ہوتا ہوں (سو مجھ کو اس عرق سے اور عذاب آخرت سے نجات دی جاوے فرشتہ کے ذریعہ سے) جواب دیا گیا کہ اب ایمان لاتا ہے (جبکہ معائنہ آخرت کا شروع ہو گیا) اور (معائنہ آخرت کے) پہلے سے کسریٰ کرتا رہا اور مفسدوں میں داخل رہا (اب نجات چاہتا ہے)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور بنی اسرائیل و قوم فرعون کے کچھ حالات اور ان سے متعلقہ احکام مذکور ہیں۔ پہلی آیت میں ایک خاص واقعہ سے متعلق حکم ہے وہ یہ کہ بنی اسرائیل جو دین موسوی پر عامل تھے یہ سب عام عادت کے مطابق نمازیں صرف اپنے صومعوں (عبادت گاہوں) میں ادا کرتے تھے، اور پچھلی امتوں کے لئے حکم بھی یہی تھا کہ ان کی نماز اپنے گھروں میں ادا نہیں ہوتی تھی، یہ خصوصی سہولت امت محمدیہ کو عطا ہوئی کہ ہر جگہ جہاں چاہیں نماز ادا کر لیں، صحیح مسلم کی ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چھ خصوصیات میں سے ایک یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ میرے لئے ساری زمین کو مسجد بنا دیا گیا ہے کہ نماز ہر جگہ ادا ہو جاتی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ فرض نمازوں کا مسجدوں میں ہی ادا کرنا جماعت کے ساتھ سنت مؤکدہ قرار دیا گیا۔ اور نفلی نمازوں کا گھروں میں ادا کرنا افضل ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اسی پر تھا کہ مسجد میں صرف فرض نماز پڑھتے تھے، سنن اور نوافل گھر میں جا کر ادا فرماتے تھے۔ بنی اسرائیل اپنے مذہب کے مطابق اس کے پابند تھے کہ نماز صرف اپنے عبادت خانوں میں ادا کریں، فرعون جو ان کو طرح طرح کی ایذا دیتا اور ان پر ظلم ڈھاتا تھا، اس نے یہ دیکھ کر ان کے تمام عبادت خانوں کو مسمار کر دیا تاکہ یہ اپنے

مذہب کے مطابق نماز نہ پڑھ سکیں، اس پر بھی تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے دونوں پیغمبروں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو وہ حکم دیا جو اس آیت میں مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کیلئے مصر میں مکان بنائے جائیں اور ان مکانات کا رخ قبلہ کی طرف ہو، تاکہ وہ انہیں کوئی مکانات میں نماز ادا کر سکیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ پچھلی امتوں میں اگرچہ عام حکم یہی تھا کہ نمازیں صرف عبادت خانوں میں پڑھی جائیں، لیکن اس خاص حادثہ کی وجہ سے بنی اسرائیل کے لئے اس کی عارضی اجازت دے دی گئی کہ گھروں ہی میں نماز ادا کر لیا کریں اور اپنے گھروں کا رخ قبلہ کی طرف سیدھا رکھیں، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس ضرورت کے وقت بھی ان کو مخصوص گھروں میں نماز پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی جن کا رخ قبلہ کی طرف کیا گیا تھا، عام گھروں اور عام مقامات پر نماز کی اجازت اس وقت بھی نہیں تھی، جس طرح امت محمدیہ کو شہر اور جنگل کے ہر مقام پر نماز ادا کرنے کی سہولت حاصل ہے (روح)

یہاں یہ سوال بھی قابل غور ہے کہ اس آیت میں بنی اسرائیل کو جس قبلہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اُس سے مراد کونسا قبلہ ہے، کعبہ یا بیت المقدس؟ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کعبہ ہے اور کعبہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے اصحاب کا قبلہ تھا، (تقریبی و روح) بلکہ بعض علماء نے فرمایا کہ تمام انبیاء سابقین کا قبلہ اصل میں کعبہ ہی تھا۔

اور جس حدیث میں یہ ارشاد ہے کہ یہود اپنی نمازوں میں صخرہ بیت المقدس کی طرف رخ کرتے ہیں اس کو اس زمانہ پر محمول کیا جائے گا جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر چھوڑ کر بیت المقدس کی طرف روانہ ہوئے، یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ قیام مصر کے زمانہ میں آپ کا قبلہ بیت الشریٰ ہو۔

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نماز کے لئے استقبال قبلہ کی شرط انبیاء سابقین کے زمانہ میں بھی تھی، اسی طرح طہارت اور ستر بخورت کا تمام انبیاء سابقین کی شریعتوں میں شرط نماز ہونا بھی معتبر روایات سے ثابت ہے۔

گھروں کو قبلہ رخ بنانے کا مقصد یہی ہے تھا کہ ان میں نمازیں ادا کی جائیں اس لئے اس کے بعد آفیموا الصلوٰۃ کا حکم دے کر یہ ہدایت کر دی گئی کہ اگر فرعون عبادت گاہوں میں نماز ادا کرنے سے روکتا ہے تو اس سے نماز ساقط نہیں ہوتی اپنے گھروں میں ادا کرو۔ آخر آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے حکم دیا گیا کہ مؤمنین کو آپ خوشخبری

سنادیں کہ ان کا مقصود پورا ہوگا، دشمن پر ان کو غلبہ نصیب ہوگا اور آخرت میں جنت ملے گی۔ (روح)

آیت کے شروع میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو بصیغہ تثنیہ خطاب کیا گیا کیونکہ مکانات قبلہ رخ کر کے انہیں نماز پڑھنے کی اجازت انہیں کا کام تھا، اُس کے بعد بصیغہ جمع سب بنی اسرائیل کو شامل کر کے اقامت نماز کا حکم دیا گیا کیونکہ اس حکم میں پیغمبر اور امت سب داخل ہیں، آخر میں بشارت دینے کا حکم خاص موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا کیونکہ اصل صاحب شریعت نبی آپ ہی تھے، بشارت جنت دینے کا آپ ہی کو حق تھا۔

دوسری آیت میں قوم فرعون کی اصلاح سے مایوس ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بددعا کا ذکر ہے جس کے شروع میں انہوں نے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ عرض کیا ہے کہ آپ نے قوم فرعون کو زینت دنیا کے ساز و سامان اور مال و دولت بہت عطا فرما رکھا ہے، مصر سے لے کر ارض حبشہ تک سونے چاندی اور زبرجد و زمرد یا قوت وغیرہ جواہرات کی کانیں عطا فرما رکھی ہیں (قرطبی) جس کا اثر یہ ہے کہ وہ لوگوں کو تیرے راستے سے گمراہ کرتے ہیں، کیونکہ عام لوگ ان کے ظاہری ساز و سامان اور عیش و راحت کو دیکھ کر اس شک میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر یہ گمراہی پر ہوتے تو ان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کیوں ملتیں، کیونکہ عام لوگوں کی نظریں اس حقیقت تک نہیں پہنچتیں کہ دنیا کا فروغ بغیر نیک عمل کے کسی انسان کے حق پر ہونے کی علامت نہیں ہو سکتی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم فرعون کی اصلاح سے مایوس ہونے کے بعد ان کے مال و دولت سے دوسروں کی گمراہی کا خطرہ محسوس کر کے بددعا کی، رَبَّنَا اَطْمِسْ عَلٰی اَمْوَالِهِمْ یعنی اے میرے پروردگار ان کے اموال کی صورت بدل کر مسخ و بیکار کر دے۔

حضرت قتادہ کا بیان ہے کہ اس دعا کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ قوم فرعون کے تمام زرد جواہرات اور نقد سگے اور بانٹوں کھیتوں کی سب پیداوار پتھروں کی شکل میں تبدیل ہو گئے، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں ایک تحصیلہ پایا گیا جس میں فرعون کے زمانہ کی چیزیں تھیں ان میں انڈے اور بادام بھی دیکھے گئے جو بالکل پتھر تھے۔

ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام پھلوں، ترکاریوں اور غلہ کو پتھر بنا دیا تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کی اُن نو آیات (معجزات) میں سے ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے، وَلَقَدْ اَتَيْنَا مُوسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ۔

دوسری بددعا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے یہ کی، وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰی يَسْرُوْا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ، یعنی اے پروردگار ان کے دلوں کو ایسا سخت

کر دے کہ ان میں ایمان اور کسی خیر کی صلاحیت ہی نہ رہے تاکہ وہ عذاب الیم آتے سے پہلے ایمان نہ لاسکیں۔

یہ بددعا بظاہر ایک رسول و پیغمبر کی زبان سے بہت بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ پیغمبر کا وظیفہ زندگی ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو ایمان و عمل صالح کی طرف دعوت دیں اور اس کے لئے تدبیریں کریں۔

مگر یہاں واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ساری تدبیریں کرنے کے بعد ان کی اصلاح سے مایوس ہو چکے تھے اور اب چاہتے تھے کہ یہ اپنے اعمال کی سزا دیکھیں، اس میں یہ احتمال تھا کہ کہیں یہ لوگ عذاب آتما دیکھ کر ایمان کا اقرار نہ کر لیں اور اس طرح عذاب ٹل جائے، اس لئے کفر سے بغض و نفرت اس دعا کا سبب بنی، جیسے فرعون غرق ہونے کے وقت ایمان کا اقرار کرنے لگا تو جبریل امین نے اس کا منہ بند کر دیا کہ کہیں رحمت الہی متوجہ ہو کر یہ عذاب سے نہ بچ جائے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بددعا درحقیقت بددعا نہ ہو بلکہ ایسی ہو جیسے شیطان پر لعنت کہ وہ تو بنص قرآن خود ہی ملعون ہے پھر اس پر لعنت کرنے کا منشا اس کے سوا نہیں کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت مسلط کر دی ہم بھی اس پر لعنت کرتے ہیں اس صورت میں مطلب اس کا یہ ہوگا کہ ان کے دلوں کا سخت اور ناقابل ایمان و اصلاح ہونا من جانب اللہ مقرر ہو چکا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بصورت بددعا اس کا اظہار فرمایا۔

تیسری آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کی قبولیت کو بیان فرمایا ہے مگر عنوان میں حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی شریک دعا قرار دے کر یہ خطاب کیا گیا قَدْ اٰجَبْتَنِي دَعْوَتُكُمَا یعنی تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی، وجہ یہ تھی کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ دعا کر رہے تھے تو حضرت ہارون امین کہتے جاتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی دعا پر آمین کہنا بھی دعا ہی میں داخل ہے، اور چونکہ دعا کا مسنون طریقہ قرآن کریم میں آہستہ آواز سے کرنے کا بتلایا گیا ہے تو اس سے آمین کو بھی آہستہ کہنے کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔

اس آیت میں قبولیت دعا کی اطلاع ان دونوں پیغمبروں کو دیدی گئی، مگر تھوڑا سا امتحان ان کا بھی لیا گیا کہ قبولیت دعا کا اثر بقول بغوی چالیس سال بعد ظاہر ہوا، اسی لئے اس آیت میں قبولیت دعا کے ذکر کے ساتھ ان دونوں حضرات کو یہ بھی ہدایت کر دی گئی کہ فَاَسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعَنَّ سَبِيلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْزِمُوْنَ، یعنی اپنے کارِ منصبی دعوت و تبلیغ میں لگے رہیں، قبولیت دعا کا اثر دیر میں ظاہر ہو تو جاہلوں کی طرح جلد بازی نہ کریں۔

پوچھی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشہور معجزہ عبور دریا کا اور فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے حَتَّىٰ إِذَا أَذْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ آمَنْتُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا الَّذِي آمَنْتُ بِهِ بَنُؤُا إِسْرَآءِیْلَ وَآنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ، یعنی جب اس کو غرقابی نے پکڑ لیا تو بول اٹھا کہ میں ایمان لاتا ہوں اس بات پر کہ جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اُس کے ہوا کوئی معبود نہیں اور میں اطاعت کرنے والوں میں سے ہوں۔

پانچویں آیت میں خود حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے اس کا یہ جواب آیا ہے الَّذِیْ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ، یعنی کیا اب تم مسلمان ہوتے ہو جب کہ ایمان و اسلام کا وقت گزر چکا۔

اس سے ثابت ہوا کہ عین موت کے وقت کا ایمان لانا شرعاً معتبر نہیں، اس کی مزید تشریح اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ قبول فرماتے رہتے ہیں جب تک غرغرة موت کا وقت نہ آجائے۔ (ترمذی)

غرغرة موت سے مراد وہ وقت ہے جب نزع روح کے وقت فرشتے سامنے آجاتے ہیں اس وقت دارالعمل دنیا کی زندگی ختم ہو کر آخرت کے احکام شروع ہو جاتے ہیں، اس لئے اس وقت کا کوئی عمل قابل قبول نہیں، نہ ایمان نہ کفر، ایسے وقت ہو ایمان لاتا ہے اس کو بھی مؤمن نہیں کہا جائے گا اور اس کے ساتھ کفن دفن میں مسلمانوں کا سا معاملہ نہ کیا جائے گا، جیسا کہ فرعون کے اس واقعہ سے ثابت ہے کہ بالاجماع فرعون کی موت کفر پر قرار دی گئی ہے نصوص قرآن سے بھی یہی واضح ہے اور جس کسی نے فرعون کے اس ایمان کو معتبر کہا ہے یا تو اس کی کوئی تاویل کی جائے ورنہ اسے غلط کہا جائے گا۔ (روح)

اسی طرح اگر خدا نخواستہ ایسی ہی نزع روح کی حالت میں کسی شخص کی زبان سے کلمہ کفر نکل جائے تو اس کو کافر بھی نہ کہا جائے گا بلکہ اس کے جنازہ کی نماز پڑھ کر مسلمانوں کی طرح دفن کیا جائے گا اور اس کے کلمہ کفر کی تاویل کی جائے گی جیسا کہ بعض اولیاء اللہ کے حالات سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ جو کلمہ ان کی زبان سے نکل رہا تھا لوگ اس کو کلمہ کفر سمجھ کر پریشان تھے بعد میں کچھ ہوش آیا اور اپنا مطلب بتلایا تو سب کو اطمینان ہو گیا کہ وہ عین ایمان کا کلمہ تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس وقت روح نکل رہی ہو اور نزع کا عالم ہو وہ وقت دنیا کی زندگی میں شمار نہیں، اس وقت کا کوئی عمل بھی شرعاً معتبر نہیں، اس سے پہلے پہلے ہر عمل معتبر ہے، مگر دیکھنے والوں کو اس میں بڑی احتیاط لازم ہے کیونکہ اس کا صحیح اندازہ کرنے میں غلطی ہو سکتی کہ یہ وقت نزع روح کا اور غرغرة موت کا ہے یا اس سے پہلے کا۔

قَالِیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِنَتَّكُونَ لِمَنْ خَلَقَ آیَۃٌ ۭ وَ اِنَّ

سو آج بچائے دیتے ہیں ہم تیرے بدن کو تاکہ ہوئے تو اپنے پھلوں کے واسطے نشانی ، اور بیشک

کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ آیَتِنَا الْغٰفِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِیَّ

بہت لوگ ہماری قدرتوں پر توجہ نہیں کرتے ، اور جگہ دی ہم نے

اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّأٍ صَدَقٍ ۭ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۭ فَمَا اخْتَلَفُوْا

بنی اسرائیل کو پسندیدہ جگہ اور کھانے کو دیں ستمری چیزیں سوان میں پھوٹ نہیں پڑی

حَتّٰی جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیَمَةِ فِیْمَا

یہاں تک کہ پہنچی ان کو خبر ، بیشک تیرا رب ان میں فیصلہ کرے گا قیامت کے دن جس

كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِّمَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْكَ

بات میں کہ ان میں پھوٹ پڑی ، سو اگر تو ہے شک میں اس چیز سے کہ اتاری ہم نے تیری طرف

فَسْئَلِ الَّذِیْنَ یَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبِ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ

تو پوچھ ان سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے بیشک آئی ہے تیرے پاس حق بات

رَبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۹۸﴾ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِیْنَ

تیرے رب سے سو تو ہرگز مت ہو شک کرنے والا ، اور مت ہو ان میں جنہوں نے

كَذَّبُوْا بِآیٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۹۹﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ

جھٹلایا اللہ کی باتوں کو پھر تو بھی ہو جائے خرابی میں پڑنے والا ، جن پر ثابت ہو چکی

كَلِمٰتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ آیَۃٍ حَتّٰی یَرَوْا الْعَذَابَ

بات تیرے رب کی وہ ایمان نہ لائیں گے ، اگرچہ پہنچیں ان کو ساری نشانیاں جب تک نہ دیکھ لیں عذاب

الْاَلِیْمَ ﴿۱۰۱﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرۡیَۃٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَا اَیْمَانُهَا اِلَّا

دردناک ، سو کیوں نہ ہوتی کوئی بستی کہ ایمان لاتی پھر کام آتا ان کو ایمان لانا مگر

قَوْمُ یُوْنُسَ ۭ لَمَّا اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزۡیِ فِی الْحَیٰوَةِ

یونس کی قوم جب وہ ایمان لائی اٹھالیا ہم نے ان پر سے ذلت کا عذاب دنیا کی

الدُّنۡیَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حَبۡطِ

﴿۱۰۲﴾ زندگی میں اور فائدہ پہنچایا ہم نے ان کو ایک وقت تک ۔

خلاصہ تفسیر

سو ابجائے نجات مطلوبہ کے ، آج ہم تیری لاش کو روپانی میں رہنشین ہونے سے ،

نجات دیں گے تاکہ تو ان کے لئے موجب عبرت ہو جو تیرے بعد (موجود) ہیں (کہ تیری بد حالی اور تباہی دیکھ کر مخالفتِ احکامِ الہیہ سے بچیں) اور حقیقت یہ ہے کہ (پھر بھی) بہت سے آدمی ہماری (ایسی ایسی) عبرتوں سے غافل ہیں (اور مخالفتِ احکام سے نہیں ڈرتے) اور ہم نے (غرقِ فرعون کے بعد) بنی اسرائیل کو بہت اچھا ٹھکانا رہنے کو دیا کہ اس وقت تو مصر کے مالک ہو گئے اور ان کی اول ہی نسل کو بیت المقدس اور ملکِ شام علاقہ پر فتح دے کر عطا فرمایا، اور ہم نے ان کو نفیس چیزیں کھانے کو دیں (مصر میں بھی جنت و عیون تھے اور شام کی نسبت بزرگتر تھا) (ایسا ہے) سو (چاہئے تھا کہ ہماری اطاعت میں زیادہ سرگرم رہتے لیکن انہوں نے اُلٹا دین میں اختلاف کرنا شروع کیا اور غضب یہ کہ انہوں نے جہل کی وجہ سے) اختلاف نہیں کیا یہاں تک کہ ان کے پاس (احکام کا) علم پہنچ گیا (تھا) اور پھر اختلاف کیا آگے اس اختلاف پر وعید ہے کہ (یقینی بات ہے کہ آپ کا رب ان (اختلاف کرنے والوں) کے درمیان قیامت کے دن ان امور میں فیصلہ دے گا) (عملی) کرے گا جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے، پھر اثباتِ حقیقت دین محمدی کے واسطے ہم ایک ایسا کافی طریقہ بتلاتے ہیں کہ غیر صاحبِ وحی کے لئے تو کیسے کافی نہ ہو گا وہ ایسا ہے کہ آپ صاحبِ وحی ہیں مگر آپ سے بھی اگر اس کا خطاب بطور قضیہ شرطیہ کے کیا جاوے تو ممکن ہے اس طرح سے کہ اگر بالفرض آپ اس (کتاب) کی طرف سے شک (و شبہ) میں ہوں جس کو ہم نے آپ کے پاس بھیجا ہے تو اس شک کے دفع کا ایک سہل طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ ان لوگوں سے پوچھ دیکھئے جو آپ سے پہلے کی کتابوں کو پڑھتے ہیں (مراد توریت و انجیل ہیں) وہ من حیث القراءۃ اس کی پیشین گوئیوں کی بناء پر اس قرآن کے صدق کو بتلا دیں گے، بیشک آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے سچی کتاب آئی ہے آپ ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہوں اور نہ شک کرنے والوں سے بڑھ کر، ان لوگوں میں ہوں جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا، کہیں آپ (نعوذ باللہ) تباہ نہ ہو جاویں یقیناً جن لوگوں کے حق میں آپ کے رب کی (یہ ازلی) بات (کہ یہ ایمان نہ لاویں گے) ثابت ہو چکی ہے وہ (کبھی) ایمان نہ لاویں گے گو ان کے پاس تمام دلائل (ثبوتِ حق کے) پہنچ جاویں، جب تک کہ عذابِ دردناک کو نہ دیکھ لیں (مگر اس وقت ایمان نافع نہیں ہوتا) چنانچہ (جن بستیوں پر عذاب آپکا ہے ان میں سے) کوئی بستی ایمان نہ لائی کہ ایمان لانا اس کو نافع ہوتا (کیونکہ ان کے ایمان کے ساتھ مشیت متعلق نہ ہوئی تھی) ہاں مگر یونس (علیہ السلام) کی قوم کہ ان کے ایمان کے ساتھ مشیت متعلق ہوئی تھی، اس لئے وہ عذابِ موعود کے آثار ابتداءً کو دیکھ کر ایمان لے آئے (اور) جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے رسوائی کے عذاب کو دنیوی زندگی

میں ان پر سے ٹال دیا اور ان کو ایک وقت خاص (یعنی وقت موت) تک (خیر خوبی کے ساتھ) عیش دیا پس اور قریوں کا ایمان نہ لانا اور قوم یونس علیہ السلام کا ایمان لانادونوں مشیت سے ہوئے

مَعَارِفُ وَمَسَائِلُ

پہلی آیت میں فرعون کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ غرقابی کے بعد ہم تیرے بدن کو پانی سے نکال دیں گے، تاکہ تیرا یہ بدن پچھلے لوگوں کے لئے قدرتِ خداوندی کی نشانی اور عبرت بن جائے۔

اس کا واقعہ یہ ہے کہ دریا سے عبور کرنے کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ہلاک ہونے کی خبر دی تو وہ لوگ فرعون سے کچھ اس قدر مرعوب مغلوب تھے کہ اس کا انکار کرنے لگے اور کہنے لگے کہ فرعون ہلاک نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کی رہنمائی اور دوسروں کی عبرت کے لئے دریا کی ایک موج کے ذریعہ فرعون کی مردہ لاش کو ساحل پر ڈال دیا جس کو سب نے دیکھا اور اس کے ہلاک ہونے کا یقین آیا، اور اس کی یہ لاش سب کے لئے نمونہ عبرت بن گئی، پھر معلوم نہیں کہ اس لاش کا کیا انجام ہوا، جس جگہ فرعون کی لاش پانی گئی تھی آج تک وہ جگہ جیل فرعون کے نام سے معروف ہے۔

کچھ عرصہ ہوا اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی کہ فرعون کی لاش صحیح سالم برآمد ہوئی اور عام لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا، اور وہ آج تک قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے، مگر یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ وہی فرعون ہے جس کا مقابلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوا تھا یا کوئی دوسرا فرعون ہے کیونکہ لفظ فرعون کسی ایک شخص کا نام نہیں، اس زمانے میں مصر کے ہر بادشاہ کو فرعون کا لقب دیا جاتا تھا۔

مگر کچھ عجب نہیں کہ قدرت نے جس طرح غرق شدہ لاش کو عبرت کے لئے کنارہ پر ڈال دیا تھا اسی طرح آئندہ نسلوں کی عبرت کے لئے اس کو گلے سڑنے سے بھی محفوظ رکھا ہو، اور اب تک موجود ہو۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا کہ بہت سے لوگ ہماری آیتوں اور نشانیوں سے غافل ہیں ان میں غور و فکر نہیں کرتے اور عبرت حاصل نہیں کرتے ورنہ عالم کے ہر ذرہ ذرہ میں ایسی نشانیاں موجود ہیں جن کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو اور اس کی قدرت کا ملکہ کو پہچانا جاسکتا ہے۔

دوسری آیت میں فرعون کے انجامِ بد کے بالمقابل اس قوم کا مستقبل دکھایا ہے جس کو فرعون نے حقیر و ذلیل بنا رکھا تھا، فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو اچھا ٹھکانہ عطا فرمایا کہ

پورا ملک مصر بھی ان کو مل گیا اور اردن و فلسطین کی ارض مقدسہ بھی ان کو مل گئی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذریت کے لئے میراث بنادیا تھا، اچھے ٹھکانے کو قرآن میں مَثْبُوتٌ اَصْدَقِ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، صِدَق کے معنی اس جگہ صلح اور مناسب کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ایسا ٹھکانا ان کو دیا جو ان کے لئے ہر اعتبار سے لائق اور مناسب تھا پھر فرمایا کہ ہم نے اُن کو حلال پاک چیزوں سے رزق دیا کہ دنیا کی تمام لذائذ اور راحتیں ان کو عطا فرمادیں۔

آخر آیت میں پھر ان کی کجروی اور غلط کاری کا ذکر ہے کہ ان میں بھی بہت سے لوگوں نے اقتدار پانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہ کی اور اس کی اطاعت سے پھر گئے، تورات میں جو نشانیاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لوگ پڑھتے تھے اس کا تقاضہ یہ تھا کہ آپ کے تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے یہی لوگ ایمان لاتے، مگر یہ عجیب اتفاق ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے تو یہ سب لوگ نبی آخر الزمان پر اعتقاد رکھتے اور ان کی نشانیوں اور ان کے ظہور کا وقت قریب ہونے کی خبریں لوگوں کو بتایا کرتے تھے اور اپنی دعاؤں میں نبی آخر الزمان کا وسیلہ دے کر دعا کیا کرتے تھے مگر جب نبی آخر الزمان اپنی پوری شہادتوں کے ساتھ اور تورات کی بتلائی ہوئی نشانیوں کے ساتھ تشریف لائے تو یہ لوگ آپس میں اختلاف کرنے لگے، کچھ لوگ ایمان لائے باقیوں نے انکار کیا، اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کو لفظ جَاءَهُمُ الْعِلْمُ سے تعبیر کیا ہے، یہاں عِلْم سے مراد یقین بھی ہو سکتا ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ جب مشاہدہ کے ساتھ یقین کے اسباب جمع ہو گئے تو یہ لوگ اختلاف کرنے لگے۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ علم سے مراد معلوم ہے یعنی جب وہ ہستی سامنے آگئی جو تورات کی پیشین گوئیوں کے ذریعہ پہلے سے معلوم تھی تو اب لگے اختلاف کرنے۔ آخر آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان کے اختلاف کا فیصلہ فرماویگے حق و باطل نکھر جائے گا، اہل حق جنت میں اور اہل باطل دوزخ میں بھیجے جائیں گے۔

تیسری آیت میں بظاہر خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ آپ کو وحی میں شک ہونے کا احتمال نہیں، اس لئے اس خطاب کے ذریعہ مقصود امت کو سنانا ہے خود آپ مقصود نہیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خطاب عام انسان کو ہو، کہ اسے انسان اگر تجھ کو اُس وحی الہی میں کوئی شک ہے جو بواسطہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تیری طرف بھی گئی تو تو اُن لوگوں سے دریافت کر جو تجھ سے پہلے اللہ کی کتاب تورات و انجیل پڑھتے تھے

وہ تجھے بتائیں گے کہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابیں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشخبری دیتی آئی ہیں، جس سے تیرے وساوس دور ہو جائیں گے۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو دین کے معاملہ میں کوئی شبہ پیش آجائے تو اس پر لازم ہے کہ علماء حق سے سوال کر کے اپنے شبہات دور کرے اُن کی پرورش نہ کرتا رہے۔

چوتھی، پانچویں اور چھٹی آیتوں میں اسی مضمون کی تائید و تاکید اور غفلت پر والوں کو تنبیہ ہے۔

ساتویں آیت میں غفلت شعار متکبرین کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ زندگی کی فرصت کو غنیمت جانو، انکار و سرکشی سے اب بھی باز آجاؤ، ورنہ ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب توبہ کرو گے تو توبہ قبول نہ ہوگی، ایمان لاؤ گے تو ایمان مقبول نہ ہوگا اور وہ وقت وہ ہوگا جبکہ موت کے وقت آخرت کا عذاب سامنے آجائے، اسی سلسلہ میں حضرت یونس علیہ السلام اور ان کی قوم کا ایک واقعہ ذکر فرمایا گیا جس میں بڑی عبرتیں اور نصیحتیں ہیں۔

اس آیت میں ارشاد ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ منکر قومیں ایسے وقت ایمان لائیں کہ ان کا ایمان ان کو نفع دیتا یعنی موت کے وقت یا وقوع عذاب اور مبتلا عذاب ہو چکنے کے بعد یا قیام قیامت کے وقت جب کہ توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا کسی کی توبہ اور ایمان مقبول نہ ہوگا، اُس سے پہلے پہلے اپنی سرکشی سے باز آجائیں اور ایمان لے آئیں، بجز قوم یونس علیہ السلام کے کہ انہوں نے ایسا وقت آنے سے پہلے ہی جب خدا تعالیٰ کا عذاب اُمتاد کیا تو فوراً توبہ کر لی اور ایمان لے آئے، جس کی وجہ سے ہم نے اُن سے رسوا کرنے والا عذاب ہٹالیا۔

اس تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کا عذاب سامنے آجانے پر بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوتا بلکہ توبہ قبول ہو سکتی ہے، البتہ آخرت کا عذاب سامنے آجانے کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی، اور عذاب آخرت کا سامنے آنا یا قیامت کے دن ہو گیا موت کے وقت، خواہ وہ طبعی موت ہو یا کسی دیموی عذاب میں مبتلا ہو کر ہو جیسے فرعون کو پیش آیا۔

اس لئے قوم یونس علیہ السلام کی توبہ قبول ہو جانا عام ضابطہ الہیہ کے خلاف نہیں بلکہ اس کے ماتحت ہے کیونکہ انہوں نے اگرچہ عذاب اُمتاد ہوا دیکھ کر توبہ کی مگر عذاب میں مبتلا ہونے اور موت سے پہلے کر لی، بخلاف فرعون اور دوسرے لوگوں کے جنہوں نے عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد اور غمرۃ موت کے وقت توبہ کی اور ایمان کا اقرار کیا اس لئے ان کا ایمان معتبر نہ ہوا اور توبہ قبول نہ ہوئی۔

قوم یونس علیہ السلام کے واقعہ کی ایک نظیر خود قرآن کریم میں بنی اسرائیل کا وہ واقعہ ہے جس میں کوہ طور کو ان کے سروں پر مُعلق کر کے انکو ڈرایا گیا اور توبہ کرنے کا حکم دیا گیا انہوں نے توبہ کر لی تو وہ توبہ قبول ہوئی، جس کا ذکر سورۃ بقرہ میں آیا ہے۔

سَرَقَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ ، ہم نے ان کے سروں پر کوہ طور کو مُعلق کر کے حکم دیا کہ جو احکام تمہیں دیئے گئے ہیں ان کو مضبوطی سے پکڑو۔

وجہ یہ تھی کہ انہوں نے عذاب کے واقع ہونے اور موت میں مبتلا ہونے سے پہلے محض عذاب کا اندیشہ دیکھ کر توبہ کر لی تھی، اسی طرح قوم یونس علیہ السلام نے عذاب کو آٹھا ہوا دیکھ کر اخلاص اور الحاح وزاری کے ساتھ توبہ کر لی جس کی تفصیل آگے آتی ہے تو اس توبہ کا قبول ہو جانا ضابطہ مذکورہ کے خلاف نہیں (قرطبی)

اس جگہ بعض معاصرین سے ایک سخت غلطی ہوئی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی طرف فریضہ رسالت ادا کرنے میں کوتاہیوں کی نسبت کر دی اور قوم سے عذاب ہٹ جانے کا سبب پیغمبر کی کوتاہی کو قرار دیا، اور اسی کوتاہی کو سبب عذاب بنایا جس کا ذکر سورۃ انبیاء اور سورۃ صافات میں آیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

”قرآن کے اشارات اور صحیفہ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے اتنی بات صاف

معلوم ہو جاتی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے فریضہ رسالت ادا کرنے میں کچھ کوتاہیاں

ہو گئی تھیں اور غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر چھوڑ دیا تھا اس لئے

جب آثار عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ واستغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف

کر دیا، قرآن میں خدائی دستور کے جو اصول و کلیات بیان کئے گئے ہیں ان میں ایک مستقل

دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حجت

پوری نہیں کر دیتا پس جب نبی اداۓ رسالت میں کوتاہی کر گیا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت

سے پہلے خود ہی اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس قوم کو عذاب دینا

گوارا نہ کیا: ۱۵ (تفہیم القرآن مولانا مودودی ص ۳۱۲ - طبع ۱۹۶۴ء)

یہاں سے پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا گناہوں سے معصوم ہونا تو ایک مسلمہ عقیدہ ہے جس پر تمام امت کا اجماع ہے، اسکی تفصیلات میں کچھ جزوی اختلاف بھی ہیں کہ یہ عصمت ہر قسم کے صغیرہ گناہوں سے یا صغیرہ کبیرہ سے اور

۱۰ تفہیم القرآن کے بعد کے اڈیشنوں میں اس عبارت کے کسی رجوع کے اعلان کے بغیر یہاں عبارت میں معمولی تبدیلی کی گئی ہے یعنی فریضہ

رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کے الفاظ نئی عبارت میں موجود نہیں ہیں، لیکن یہ بات اب بھی عبارت میں باقی ہے کہ جب نبی نے اس قوم

کی مہلت کے آخری لمحے تک نصیحت کا سلسلہ جاری نہ رکھا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود ہی وہ ہجرت کر گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے

اسکی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا، کیونکہ اس پر تمام حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں: ۱۱ (تفہیم القرآن کی عبارت میں تبدیلی کے باوجود "معارف القرآن" کا تبصرہ علیٰ حالہ برقرار ہے۔ ناشرین: اکتوبر ۱۹۹۱ء)

یہ کہ عصمت قبل از نبوت کے زمانے کو بھی شامل ہے یا نہیں، لیکن اس میں کسی فرقہ کشی شخص کا اختلاف نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب ادائے رسالت کے فریضہ میں کبھی کوتاہی نہیں کر سکتے، کیونکہ انبیاء کے لئے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہو سکتا کہ جس منصب کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کا انتخاب فرمایا ہے خود اسی میں کوتاہی کر بیٹھیں، یہ تو فرض منصبی میں کھلی ہوئی خیانت ہے جو عام شریف انسانوں سے بھی بعید ہے، اس کوتاہی سے بھی اگر پیغمبر معصوم نہ ہوا تو پھر دوسرے گناہوں سے عصمت بے فائدہ ہے۔

قرآن و سنت کے مسلمہ اصول اور اجماعی عقیدہ عصمت انبیاء کے بظاہر خلاف اگر کسی جگہ قرآن و حدیث میں بھی کوئی بات نظر آتی تو اصول مسلمہ کی رو سے ضروری تھا کہ اس کی تفسیر و معنی کی ایسی توجیہ تلاش کی جاتی، جس سے وہ قرآن و حدیث کے قطعی الثبوت اصول سے متصادم و مختلف نہ رہے۔

مگر یہاں تو عجیب بات یہ ہے کہ مصنف موصوف نے جس بات کو قرآنی اشارات اور صحیفہ یونس کی تفصیلات کے حوالہ سے پیش کیا ہے وہ صحیفہ یونس میں ہو تو ہو جس کا اہل اسلام میں کوئی اعتبار نہیں، قرآنی اشارہ تو ایک بھی نہیں، بلکہ ہوا یہ کہ کئی مقدمے جوڑ کر یہ نتیجہ زبردستی نکالا گیا ہے، پہلے تو یہ فرض کر لیا گیا کہ قوم یونس علیہ السلام سے عذاب کا ٹل جانا خدائی دستور کے خلاف واقع ہوا ہو خود اسی آیت کے سیاق و سباق کے بھی بالکل خلاف ہے اور اہل تحقیق ائمہ تفسیر کی تصریحات کے بھی خلاف ہے، اس کے ساتھ یہ فرض کر لیا گیا کہ خدائی قانون کو اس موقع پر اس لئے توڑا گیا تھا کہ خود پیغمبر سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہو گئی تھیں، اس کے ساتھ یہ بھی فرض کر لیا کہ پیغمبر کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص وقت نکلنے کا مقرر کر دیا گیا تھا، وہ اس وقت مقرر سے پہلے فریضہ دعوت کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، اگر ذرا بھی غور و انصاف سے کام لیا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ قرآن و حدیث کا کوئی اشارہ ان فرضی مقدمات کی طرف نہیں پایا جاتا۔

خود آیت قرآن کے سباق پر غور کیجئے تو الفاظ آیت کے یہ ہیں:

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ أَمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ -

جس کا مفہوم صاف یہ ہے کہ دنیا کے عام بستی والوں کے متعلق بطور اظہار افسوس یہ ارشاد ہے کہ وہ ایسے کیوں نہ ہو گئے کہ ایمان اس وقت لے آتے جس وقت تک ایمان مقبول اور نافع ہوتا ہے یعنی عذاب میں یا موت میں مبتلا ہونے سے پہلے پہلے ایمان لے آتے تو ان کا ایمان قبول ہو جاتا، مگر قوم یونس اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہ آثار عذاب دیکھ کر عذاب میں مبتلا ہونے سے

پہلے ہی ایمان لے آئی تو ان کا ایمان اور توبہ قبول ہو گئی۔

آیت کا یہ واضح مفہوم خود بتلا رہا ہے کہ یہاں کوئی خدائی قانون نہیں توڑا گیا بلکہ عین خدائی دستور کے مطابق ان کا ایمان اور توبہ قبول کر لی گئی ہے۔

اکثر مفسرین بحر محیط، قرطبی، زعزعی، مظہری، روح المعانی وغیرہ نے آیت کا یہی مفہوم لکھا ہے جس میں قوم یونس کی توبہ قبول ہونا عام قانون الہی کے تحت ہے، قرطبی کے الفاظ یہ ہیں :

وقال ابن جبیر غشيتهم العذاب كما يغشى الثوب القبر فلما صحت توبتهم رفع الله عنهم العذاب وقال الطبري خص قوم يونس من بين سائر الامم بان يتوب عليهم بعد معاينة العذاب وذكر ذلك عن جماعة من المفسرين وقال الزجاج انهم لم يقع بهم العذاب وانما مرأوا العلامة التي تدل على العذاب ولورأوا عين العذاب لما نفعهم ايمانهم قلت قول الزجاج حسن فان المعاينة التي لا تنفع التوبة معها هي التلبس بالعذاب كقصه فرعون ولهذا جاء بقصة قوم يونس على اشر قصة فرعون ويعضد هذا قوله عليه السلام ان الله يقبل توبة العبد ما لم يغتر والغرغرة الحشرة وذلك هو حال التلبس بالموت وقد روى معني ما قلناه عن ابن مسعود (الى) وهذا يدل على ان توبتهم قبل رؤية العذاب (الى) وعلى هذا فلا اشكال ولا تعارض ولا خصوص.

(ترجمہ) ابن جبیر کہتے ہیں کہ عذاب نے ان کو اس طرح ڈھانپ لیا تھا جیسے قبر پر چادر پھیر چو نکہ ان کی توبہ صحیح ہو گئی (کہ وقوع عذاب سے پہلے تھی) تو ان کا عذاب اٹھا دیا گیا، طبری فرماتے ہیں کہ قوم یونس کو تمام اقوام عالم سے یہ خصوصیت دی گئی ہے کہ معاینہ عذاب کے بعد ان کی توبہ قبول کر لی گئی، زجاج نے فرمایا کہ ان لوگوں پر ابھی عذاب پڑا نہیں تھا بلکہ علامات عذاب دیکھی تھیں اور اگر عذاب پڑ جاتا تو ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوتی، قرطبی فرماتے ہیں کہ زجاج کا قول اچھا اور بہتر ہے کیونکہ جس معاینہ عذاب کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی وہ وہ ہے کہ عذاب میں مبتلا ہو جیسا واقعہ فرعون میں پیش آیا، اسی اس سور میں قوم یونس کا واقعہ فرعون کے بعد منسلک فرمایا تاکہ فرق واضح ہو جائے کہ فرعون کا ایمان ابتلا عذاب کے بعد، بخلاف قوم یونس کے کہ وہ وقوع عذاب سے پہلے ہی ایمان لے آئی، اس بات کی تائید حضرت علیؑ علیہ وسلم کے اس ارشاد بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بند کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتا ہے جب تک وہ غرغہ کی حالت میں پہنچ جائے اور غرغہ موت کے وقت طاری ہونیوالے سکرات کو کہتے ہیں اور یہی تاحضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے معلوم ہوتی ہے جس میں بتلایا ہے کہ قوم یونس نے وقوع عذاب سے پہلے توبہ کر لی تھی، قرطبی فرماتے ہیں کہ اس تقریر و تفسیر پر نہ کوئی اشکال ہے نہ تعارض نہ قوم یونس کی تخصیص۔

اور طبری وغیرہ مفسرین نے بھی ہو اس واقعہ کو قوم یونس کی خصوصیت بتلایا ہے ان میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس خصوصیت کا سبب یونس علیہ السلام کی کوتاہیاں تھیں بلکہ اس قوم کا سچے دل سے توبہ کرنا اور علم الہی میں مخلص ہونا، وغیرہ وجوہات لکھی ہیں۔ اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ قوم یونس علیہ السلام کا عذاب ٹل جانا عام قانون قدرت کے خلاف ہی نہیں تھا بلکہ عین مطابق تھا تو اس کلام کی بنیاد ہی ختم ہو گئی۔

اسی طرح کسی قرآنی اشارے سے یہ ثابت نہیں کہ عذاب کی وعید سننے کے بعد یونس علیہ السلام بغیر اذن خداوندی اپنی قوم سے الگ ہو گئے بلکہ سیاق آیات اور تفسیری روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسا تمام سابق امتوں کے ساتھ معاملہ ہوتا آیا تھا کہ جب ان کی امت پر عذاب آنے کا فیصلہ کر لیا جاتا تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور ان کے ساتھیوں کو یہاں سے نکل جانے کا حکم دے دیتے تھے جیسا لوط علیہ السلام کا واقعہ بتصریح قرآن میں مذکور ہے، اسی طرح یہاں بھی جب اللہ کا یہ حکم یونس علیہ السلام کے ذریعہ ان لوگوں کو پہنچا دیا گیا کہ تین دن کے بعد عذاب آئے گا تو یونس علیہ السلام کا اس جگہ سے نکل جانا ظاہر یہی ہے کہ بامر خداوندی ہوا ہے۔

البتہ یونس علیہ السلام سے جو پیغمبرانہ شان کے اعتبار سے ایک لغزش ہوئی اور اس پر سورۃ انبیاء اور سورۃ طہ کی آیتوں میں عتاب کے الفاظ آئے اور اسی کے نتیجہ میں مچھلی کے پیٹ میں رہنے کا واقعہ پیش آیا، وہ یہ نہیں کہ انہوں نے فریضۂ رسالت میں کوتاہی کر دی تھی بلکہ واقعہ وہ ہے جو اوپر مستند تفسیروں کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ جب یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کے حکم کے مطابق تین دن کے بعد عذاب کے آنے کی وعید سنائی اور پھر باذن الہی اپنی جگہ کو چھوڑ کر باہر چلے گئے اور بعد میں یہ ثابت ہوا کہ عذاب نہیں آیا تو اب یونس علیہ السلام کو اس کی فکر لاحق ہوئی کہ میں اپنی قوم میں واپس جاؤں گا تو بھوٹا قرار دیا جاؤں گا اور اس قوم کا یہ دستور تھا کہ جس کا بھوٹ ثابت ہو جائے اس کو قتل کر دیں تو اب اپنی قوم کی طرف لوٹ کر جانے میں جان کا بھی اندیشہ ہوا، ایسے وقت بجز اس کے کوئی راستہ نہ تھا کہ اب اس وطن ہی سے ہجرت کر جائیں لیکن سنت انبیاء علیہم السلام کی یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کی اجازت نہ آجائے محض اپنی رائے سے ہجرت نہیں کرتے تو یونس علیہ السلام کی لغزش یہ تھی کہ اللہ کی اجازت آنے سے پہلے ہجرت کا قصد کر کے کشتی پر سوار ہو گئے جو اگرچہ اپنی ذات میں کوئی گناہ نہیں تھا مگر سنت انبیاء سے مختلف تھا، اگر آیات قرآن کے الفاظ میں غور کریں تو یونس علیہ السلام کی لغزش فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوئی

کو تا ہی نہیں بلکہ قوم کے ظلم و ستم سے بچنے کے لئے ہجرت قبل الاذن کے سوا اور کچھ نہیں ثابت ہوگی، سورۃ صافات کی آیت اس مضمون کے لئے تقریباً صریح ہے، جس میں فرمایا ہے اِذَا بَقِيَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ، اس میں بقصد ہجرت کشتی پر سوار ہونے کو اَبَقِيَ کے لفظ سے بطور عتاب کے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں کسی فلام کا اپنے آقا کی اجازت کے بغیر بھاگ جانا اور سورۃ انبیاء کی آیت میں ہے وَذَٰلِ النُّونِ اِذْ ذَهَبَ مُغَاصِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّجِدَ رَحْمَتَهُ جَسَاسًا جس میں طبعی خوف کی بنا پر قوم سے جان بچا کر ہجرت کرنے کو بطور عتاب کے اس شدید عذوان سے بیان فرمایا ہے، اور یہ سب فرائض رسالت کی مکمل ادائیگی کے بعد اس وقت پیش آیا جب کہ اپنی قوم میں واپس جانے سے جان کا خطرہ لاحق ہو گیا، تفسیر روح المعانی میں یہی مضمون بالفاظ ذیل لکھا ہے :

یعنی یونس علیہ السلام اپنی قوم سے ناراض ہو کر اس لئے چل دیئے کہ قوم کی شدید مخالفت اور اپنے کفر پر اصرار کا وجود زمانہ دراز تک دعوت رسالت پہنچاتے رہنے کا مشاہدہ کر چکے تھے اور ان کا یہ سفر ہجرت کے طور پر تھا مگر ابھی تک ان کو ہجرت کی اجازت نہیں ملی تھی۔

ای غصیان علی قومہ لشدة شکمتهم وتما دی اصرارهم مع طول دعوتہ ایاہم وکان ذہابہ ہذا سہم ہجرة عنہم لکنہ لم یومر بہ۔

اس میں واضح کر دیا ہے کہ دعوت و رسالت میں کوئی کوتاہی سبب عتاب نہیں تھی بلکہ قبل از اجازت ہجرت کرنا سبب عتاب بنا ہے جو فی نفسہ کوئی گناہ نہ تھا مگر سنت انبیاء کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس پر عتاب آیا ہے، معاصر موصوف کو بعض علماء نے اس غلطی پر متنبہ فرمایا تو سورۃ صافات کی تفسیر میں انہوں نے اپنے موقف کی حمایت و تائید میں بہت سے مفسرین کے اقوال بھی نقل فرمائے ہیں جن میں وہب بن منبہ وغیرہ کی بعض اسرائیلی روایتوں کے سوا کسی سے ان کا یہ موقف صحیح ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت یونس علیہ السلام سے معاذ اللہ فریضۃ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہو گئی تھیں۔

اور یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں کہ عام طور پر حضرات مفسرین اپنی تفسیروں میں اسرائیلی روایات بھی نقل کر دیتے ہیں جن کے بارے میں ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ روایات مستند و معتبر نہیں، کسی حکم شرعی کا ان پر مدار نہیں رکھا جاسکتا، اسرائیلی روایات خواہ مفسرین اسلام کی کتابوں میں ہوں یا صحیفہ یونس میں صرف انہیں کے سہارے حضرت یونس علیہ السلام پر یہ بہتان عظیم لگایا جاسکتا ہے کہ ان سے فریضۃ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہو گئی تھیں اور کسی مفسر اسلام نے اس کو قبول نہیں کیا، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم و بہ استغنیث ان یعیب منا من الخطایا والزلزلات،

حضرت یونس علیہ السلام کا مفصل واقعہ | حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ جس کا کچھ

بھٹہ تو خود قرآن میں مذکور ہے اور کچھ روایات

حدیث و تاریخ سے ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم عراق میں موصل کے مشہور مقام نینوی میں بستی تھی، ان کی تعداد قرآن کریم میں ایک لاکھ سے زیادہ بتلائی ہے ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو بھیجا، انہوں نے ایمان لانے سے انکار کیا، حق تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو آگاہ کر دو کہ تین دن کے اندر اندر تم پر عذاب آنے والا ہے، حضرت یونس نے قوم میں اس کا اعلان کر دیا، قوم یونس نے آپس میں مشورہ کیا تو اس پر سب کا اتفاق ہوا کہ ہم نے کبھی یونس علیہ السلام کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا اس لئے ان کی بات نظر انداز کرنے کے قابل نہیں، مشورہ میں یہ طے ہوا کہ یہ دیکھا جائے کہ یونس علیہ السلام رات کو ہمارے اندر اپنی جگہ مقیم رہتے ہیں تو سمجھ لو کہ کچھ نہیں ہوگا اور اگر وہ یہاں سے کہیں چلے گئے تو یقین کر لو کہ صبح کو ہم پر عذاب آئے گا، حضرت یونس بارشاد خداوندی رات کو اس بستی سے نکل گئے، صبح ہوئی تو عذاب الہی ایک سیاہ دھوئیں اور بادل کی شکل میں ان کے سروں پر منڈلانے لگا اور فضاء آسمانی سے نیچے ان کے قریب ہونے لگا تو ان کو یقین ہو گیا کہ اب ہم سب ہلاک ہونے والے ہیں، یہ دیکھ کر حضرت یونس کو تلاش کیا کہ ان کے ہاتھ پر شرف بایمان ہو جائیں اور پچھلے انکار سے توبہ کر لیں مگر یونس علیہ السلام کو نہ پایا تو خود ہی اخلاص نیت کے ساتھ توبہ و استغفار میں لگ گئے، بستی سے ایک میدان میں نکل آئے، عورتیں بچے اور جانور سب اس میدان میں جمع کر دیئے گئے، ٹاٹ کے کپڑے پہن کر عجز و زاری کے ساتھ اس میدان میں توبہ کرنے اور عذاب سے پناہ مانگنے میں اس طرح مشغول ہوئے کہ پورا میدان آہ و بکا سے گونجنے لگا، اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور عذاب ان سے ہٹا دیا جیسا کہ اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، روایات میں ہے کہ یہ عاشورا یعنی دسویں محرم کا دن تھا۔

ادھر حضرت یونس علیہ السلام بستی سے باہر اس انتظار میں تھے کہ اب اس قوم پر عذاب نازل ہوگا، ان کے توبہ و استغفار کا حال ان کو معلوم نہ تھا، جب عذاب ٹل گیا تو ان کو فکر ہوئی کہ مجھے جھوٹا قرار دیا جائے گا کیونکہ میں نے اعلان کیا تھا کہ تین دن کے اندر عذاب آجائے گا، اس قوم میں قانون یہ تھا کہ جس شخص کا جھوٹ معلوم ہو اور وہ اپنے کلام پر کوئی شہادت نہ پیش کرے تو اس کو قتل کر دیا جاتا تھا، یونس علیہ السلام کو فکر ہوئی کہ مجھے جھوٹا قرار دے کر قتل کر دیا جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام ہر گناہ و معصیت سے معصوم ہوتے ہیں مگر انسانی فطرت و طبیعت جدا نہیں ہوتے، اس وقت یونس علیہ السلام کو طبعی طور پر یہ ملال ہوا کہ میں نے بحکم الہی اعلان کیا تھا اور اب میں اعلان کی وجہ سے ٹھوٹا قرار دیا جاؤں گا، اپنی جگہ واپس جاؤں تو کس منہ سے جاؤں اور قوم کے قانون کے مطابق گردن زدنی بنوں، اس رنج و غم اور پریشانی کے عالم میں اس شہر سے نکل جانے کا ارادہ کر کے چل دیئے یہاں تک کہ بحر روم کے کنارہ پر پہنچ گئے وہاں ایک کشتی دیکھی جس میں لوگ سوار ہو رہے تھے، یونس علیہ السلام کو ان لوگوں نے پہچان لیا اور بغیر کرایہ کے سوار کر لیا، کشتی روانہ ہو کر جب وسط دریا میں پہنچ گئی تو دفعۃً ٹھہر گئی، نہ آگے بڑھتی ہے نہ پیچھے چلتی ہے، کشتی والوں نے منادی کی کہ ہماری اس کشتی کی من جانب اللہ یہی شان ہے کہ جب اس میں کوئی ظالم گناہگار یا بھگا ہوا غلام سوار ہو جاتا ہے تو یہ کشتی خود بخود رک جاتی ہے، اس آدمی کو ظاہر کر دینا چاہئے تاکہ ایک آدمی کی وجہ سے سب پر مصیبت نہ آئے۔

حضرت یونس علیہ السلام بول اٹھے کہ وہ بھگا ہوا غلام گناہگار میں ہوں، کیونکہ اپنے شہر سے غائب ہو کر کشتی میں سوار ہونا ایک طبعی خوف کی وجہ سے تھا باذن الہی نہ تھا، اس بغیر اذن کے اس طرف آنے کو حضرت یونس علیہ السلام کی پیغمبرانہ شان نے ایک گناہ قرار دیا کہ پیغمبر کی کوئی نقل و حرکت بلا اذن کے نہ ہونی چاہئے تھی اس لئے فرمایا کہ مجھے دریا میں ڈال دو تو تم سب اس عذاب سے بچ جاؤ گے کشتی والے اس پر تیار نہ ہوئے بلکہ انہوں نے قرعہ اندازی کی تاکہ قرعہ میں جس کا نام نکل آئے اس کو دریا میں ڈال جائے، اتفاقاً قرعہ میں حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکل آیا، ان لوگوں کو اس پر تعجب ہوا تو کئی مرتبہ قرعہ اندازی کی ہر مرتبہ بحکم قضاء و قدر حضرت یونس علیہ السلام کا ہی نام آتا رہا، قرآن کریم میں اس قرعہ اندازی اور اس میں یونس علیہ السلام کا نام نکلنے کا ذکر موجود ہے فَسَاهَقُمْ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ۔

یونس علیہ السلام کے ساتھ حق تعالیٰ کا یہ معاملہ ان کے مخصوص پیغمبرانہ مقام کی وجہ سے تھا کہ اگرچہ انہوں نے اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی جس کو گناہ اور معصیت کہا جاتا ہے اور کسی پیغمبر سے اس کا امکان نہیں، کیونکہ وہ معصوم ہوتے ہیں لیکن پیغمبر کے مقام بلند کے مناسب نہ تھا کہ محض خوف طبعی سے کسی جگہ بغیر اذن خداوندی منتقل ہو جاویں، اس خلاف شان عمل پر بطور عتاب یہ معاملہ کیا گیا۔

اس طرف قرعہ میں نام نکل کر دریا میں ڈالے جانے کا سامان ہو رہا تھا دوسری طرف ایک بہت بڑی مچلی بحکم خداوندی کشتی کے قریب منہ پھیلائے ہوئے لگی ہوئی تھی کہ یہ دریا میں

آئیں تو ان کو اپنے پیٹ میں جگہ دے، جس کو حق تعالیٰ نے پہلے سے حکم دے رکھا کہ یونس علیہ السلام کا جسم جو تیرے پیٹ کے اندر رکھا جائے گا یہ تیری غذا نہیں بلکہ ہم نے تیرے پیٹ کو ان کا مسکن بنایا ہے، یونس علیہ السلام دریا میں گئے تو فوراً اس مچھلی نے منہ میں لے لیا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ یونس علیہ السلام اس مچھلی کے پیٹ میں چالیس روز رہے یہ ان کو زمین کی تہ تک لے جاتی اور دور دراز کی مسافتوں میں پھرتی رہی، بعض حضرات نے سات، بعض نے پانچ دن اور بعض نے ایک دن کے چند گھنٹے مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی مدت بتلائی ہے (مظہری) حقیقت حال حق تعالیٰ کو معلوم ہے، اس حالت میں حضرت یونس علیہ السلام نے یہ دُعا کی لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ، اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمایا اور بالکل صحیح و سالم حضرت یونس علیہ السلام کو دریا کے کنارے پر ڈال دیا۔

مچھلی کے پیٹ کی گرمی سے ان کے بدن پر کوئی بال نہ رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے قریب ایک کدو روکی (کادخت) اگادیا، جس کے پتوں کا سایہ بھی حضرت یونس علیہ السلام کیلئے ایک راحت بن گئی، اور ایک جنگلی بکری کو اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمادیا کہ وہ صبح و شام ان کے پاس اکھڑی ہوتی اور وہ اس کا دودھ پنی لیتے تھے۔

اس طرح حضرت یونس علیہ السلام کو اس لغزش پر تنبیہ بھی ہو گئی، اور بعد میں ان کی قوم کو بھی پورا حال معلوم ہو گیا۔

اس قصہ میں جتنے اجزاء قرآن میں مذکور یا مستند روایات حدیث سے ثابت ہیں وہ تو یقینی ہیں باقی اجزاء تاریخی روایات کے ہیں جن پر کسی شرعی مسئلہ کا مدار نہیں رکھا جاسکتا۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مِنَ فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ

اور اگر تیرا رب چاہتا بیشک ایمان لے آتے جتنے لوگ کہ زمین میں ہیں سارے تمام، اب کیا تو

تُكْرَهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۙ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ

زبردستی کرے گا لوگوں پر کہ ہو جائیں یا ایمان اور کسی سے نہیں ہو سکتا

أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَجْعَلُ الرَّجْسَ عَلَى الَّذِينَ

کہ ایمان لائے مگر اللہ کے حکم سے، اور وہ ڈالتا ہے گندگی ان پر جو

لَا يَعْقِلُونَ ۙ

نہیں سوچتے۔

خلاصہ تفسیر

اور ان اقوام و قری کی کیا تخصیص ہے، اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے (مگر بعض حکمتوں کی وجہ سے یہ نہ چاہا اس لئے سب ایمان نہیں لاتے) سو (جب یہ بات ہے تو) کیا آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں جس میں وہ ایمان ہی لے آئیں حالانکہ کسی شخص کا ایمان لانا بدون خدا کے حکم (یعنی مشیت) کے ممکن نہیں اور اللہ تعالیٰ بے عقل لوگوں پر (کفر کی) گندگی واقع کر دیتا ہے۔

قُلْ اَنْظُرُوا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ

تو کہہ دیجو تو کیا کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور کچھ کام نہیں آتیں نشانیاں اور

النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۱ ۱۰۱) فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامٍ

ڈبا نولے ان لوگوں کو جو نہیں مانتے ، سو اب کچھ نہیں جس کا انتظار کریں مگر انہی کے سے دن

الَّذِيْنَ خَلَقُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ قُلْ فَانْتَظِرُوْا اِلَیَّ مَعَ كُمْ مِّنْ

جو گزر چکے ہیں ان سے پہلے ، تو کہہ اب راہ دیکھو میں بھی تمہارے ساتھ

الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝۱۰۲ ۱۰۲) ثُمَّ لَنَنْبِیْ رُسُلُنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ حَقًّا

راہ دیکھتا ہوں ، پھر ہم بھالیے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان کو جو ایمان لائے اسی طرح ذمہ ہے

عَلَيْنَا نُنَبِّیْ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰۳ ۱۰۳)

ہمارا بچالیں گے ایمان والوں کو ۔

خلاصہ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ تم غور کرو (اور دیکھو) کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمان میں اور زمین میں ، (آسمانوں میں ستارے وغیرہ اور زمین میں بنے انتہا مخلوق نظر آتی ہے یعنی ان میں غور کرنے سے توحید کی دلیل عقلی حاصل ہوگی ، یہ بیان ہوا ان کے مکلف ہونے کا ، اور جو لوگ (عناد) ایمان نہیں لاتے ان کو دلائل اور دھمکیاں کچھ فائدہ نہیں پہنچاتے (یہ بیان ہوا ان کے عناد کا) سو ان کی اس حالت (عناد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) وہ لوگ (بدالبت حال) صرف ان لوگوں کے سے واقعات کا انتظار کر رہے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں (یعنی باوجود دلائل

اور وعیدوں کے جو ایمان نہیں لاتے تو ان کی حالت اس شخص کے مشابہ ہے جو ایسے عذاب کا منتظر ہو جو کہ پہلی قوموں پر آیا تھا سو، آپ فرمادیجئے کہ اچھا تو تم (اس کے) انتظار میں رہو میں بھی تمہارے ساتھ (اس کے) انتظار کرنے والوں میں ہوں (جن گزشتہ قوموں کا اوپر ذکر تھا ہم ان پر تو عذاب واقع کرتے تھے) پھر ہم (اس عذاب سے) اپنے پیغمبروں کو اور ایمان والوں کو بچا لیتے تھے (جس طرح ان مؤمنین کو ہم نے نجات دی تھی) ہم اسی طرح سب ایمان والوں کو نجات دیا کرتے ہیں یہ (حسب وعدہ) ہمارے ذمہ ہے (پس اسی طرح اگر ان کفار پر کوئی افتاد پڑی تو مسلمان اس سے محفوظ رہیں گے خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں)۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِّنْ دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ

کہہ دے اے لوگو! اگر تم شک میں ہو میرے دین سے تو میں عبادت نہیں کرتا جسکی

تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَقَّعُكُمْ

تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا اور لیکن میں عبادت کرتا ہوں اللہ کی جو کھینچ لیتا ہے تم کو

وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٠٣﴾ وَأَنْ أَقِمَّ وَجْهَكَ

اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں ایمان والوں میں اور یہ کہ سیدھا کر منہ اپنا

لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٠٤﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ

دین پر حنیف ہو کر اور مت ہو شرک والوں میں اور مت پکار اللہ

دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذَا

کے سوا ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا اور نہ بُرا پھر اگر تو ایسا کرے تو تو بھی اسوقت

مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿١٠٥﴾ وَإِنْ يَسْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ

ہو ظالموں میں اور اگر پہنچا دیوے تجھ کو اللہ کچھ تکلیف تو کوئی نہیں اس کو ہٹا نہ والا

إِلَّا هُوَ ۚ وَإِنْ يَرِدْكَ بَخِيرٌ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ ۚ يُصِيبُ بِهِ مَنْ

اس کے سوا اور اگر پہنچا ناچا ہے تجھ کو کچھ بھلائی تو کوئی پھیرنے والا نہیں اس کے فضل کو پہنچائے اپنا فضل

يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿١٠٦﴾

جس پر چاہے اپنے بندوں میں اور وہی ہے بخشنے والا مہربان

خلاصہ تفسیر

آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ اے لوگو! اگر تم میرے دین کی طرف سے شک (اور تردد)

میں ہو تو (میں تم کو اس کی حقیقت بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ) میں ان معبودوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم خدا کو پھوڑ کر عبادت کرتے ہو، لیکن ہاں اس معبود کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری جان قبض کرتا ہے اور مجھ کو (منجانب اللہ) یہ حکم ہوا ہے کہ میں (ایسے معبود پر، ایمان لانیوالوں میں سے ہوں اور مجھ کو) یہ حکم ہوا ہے کہ اپنے آپ کو اس دین (مذکور توحید خالص) کی طرف اس طرح متوجہ رکھنا کہ اور سب طریقوں سے علیحدہ ہو جاؤ، اور کبھی مشرک مت بننا اور یہ حکم ہوا ہے کہ خدا کی توحید کو پھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت مت کرنا جو تجھ کو نہ (عبادت کرنے کی حالت میں) کوئی نفع پہنچا سکے اور نہ (ترک عبادت کی حالت میں) کوئی ضرر پہنچا سکے پھر اگر (بالفرض) ایسا کیا (یعنی غیر اللہ کی عبادت کی) تو اس حالت میں (اللہ کا) حق ضائع کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے اور مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم کو اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچا دے تو بجز اس کے اور کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں (بلکہ) وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں مبذول فرمائیں اور وہ بڑی مغفرت بڑی رحمت والے ہیں اور فضل کے تمام افراد مغفرت اور رحمت میں داخل ہیں اور وہ مغفرت اور رحمت عظیمہ کے ساتھ موصوف ہیں پس لامحالہ صاحب فضل بھی ہیں)۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى

کہہ دے اے لوگو! پہنچ چکا حق تم کو تمہارے رب سے، اب جو کوئی راہ پر آئے

فَاِنَّهٗمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖۙ وَمَنْ ضَلَّۙ فَاِنَّهٗمَا يَضِلُّ عَلٰیهَا وَمَاۤ اَنَا

سو وہ راہ پاتا ہے اپنے بھلے کو، اور جو کوئی بہکا پھرے سو بہکا پھرے گا اپنے بُرے کو، اور میں

عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝۱۰۸ وَاَتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ وَاَصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ

تم پر نہیں ہوں مختار، اور تو چل اسی پر جو حکم پہنچے تیری طرف اور صبر کر جب تک فیصلہ کرے اللہ

وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝۱۰۹

اور وہ ہے سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا۔

خلاصہ تفسیر

آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ اے لوگو! تمہارے پاس (دین) حق تمہارے رب کی طرف سے (بدلیل) پہنچ چکا ہے سو اس کے پہنچ جانے کے بعد، جو شخص راہ راست پر آ جاوے گا سو وہ اپنے نفع کے، واسطے راہ راست پر آوے گا، اور جو شخص (اب بھی) بے راہ رہے گا تو اس کا بے راہ ہونا (یعنی اس کا وبال بھی) اُسی پر پڑے گا اور میں تم پر کچھ بطور ذمہ داری

کے، مسلط نہیں کیا گیا (کہ تمہاری بے راہی کی باز پرس مجھ سے ہونے لگے تو میرا کیا نقصان ہے)، اور آپ اس کا اتباع کرتے رہئے جو کچھ آپ کے پاس وحی بھیجی جاتی ہے (اس میں سب اعمال کے ساتھ تبلیغ بھی آگئی)، اور (ان کے کفر و ایذا پر) صبر کیجئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ (ان کا) فیصلہ کر دیں گے (خواہ دنیا میں ہلاکت کے ساتھ خواہ آخرت میں عذاب کے ساتھ) مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے ذاتی اور منصبی کام میں لگے رہئے، ان کی فکر نہ کیجئے، اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں اچھا (فیصلہ کرنے والا) ہے۔

سورہ ہود

سُورَةُ هُودٍ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَثَلَاثٌ وَعِشْرُونَ آيَةً وَعَشْرُ كُوعًا

سورہ ہود مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو تین آیتیں ہیں اور دس کُوع ،

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ،

الْكَفِ كِتَابٌ أَحْكَمَتْ آيَتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ

یہ کتاب ہے کہ جانچ لیا ہے اس کی باتوں کو پھر کھولی گئی ہیں ایک حکمت والے خیردار کے

خَيْرٍ ۱) لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۚ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ ۚ

پاس سے ، کہ عبادت نہ کرو مگر اللہ کی ، میں تم کو اسی کی طرف سے ڈر اور خوشخبری سناتا ہوں

وَأَن اسْتَغْفِرُوا أَسْرَ بِكُمْ ثُمَّ تَوَلَّوْا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا

اور یہ کہ گناہ بخشاؤ اپنے رب سے پھر رجوع کرو اس کی طرف کہ فائدہ پہنچائے تم کو اچھا فائدہ

إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ ۚ وَإِن تَوَلَّوْا فَإِنِّي

ایک وقت مقرر تک اور دیوے ہر زیادتی والے کو زیادتی اپنی ، اور اگر تم پھر جاؤ گے تو میں

أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ ۚ ۳) إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ وَهُوَ

ڈرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ، اللہ کی طرف ہے تم کو لوٹ کر جانا اور وہ

عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۚ ۴) إِلَّا إِلَهُمُ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا

ہر چیز پر قادر ہے ، سنتا ہے وہ دوہرے کرتے ہیں اپنے سینے تاکہ چھپائیں

مِنْهُ ۚ ۵) لَا حِجْنَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ لَا يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا

اس سے ، سنتا ہے جس وقت اوڑھتے ہیں اپنے کپڑے جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو

يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

ظاہر کرتے ہیں ، وہ تو جاننے والا ہے دلوں کی بات ۔

خلاصہ تفسیر

اللہ کے معنی تو اللہ کو معلوم ، یہ (قرآن) ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں (دلائل سے) محکم کی گئی ہیں پھر اس کے ساتھ صاف صاف (بھی) بیان کی گئی ہیں (اور وہ کتاب ایسی ہے کہ) ایک حکیم باخبر (یعنی اللہ تعالیٰ) کی طرف سے (آئی ہے جس کا بڑا مقصد) یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو میں تم کو اللہ کی طرف سے (ایمان نہ لانے پر عذاب سے) ڈرانے والا اور (ایمان لانے پر ثواب کی) بشارت دینے والا ہوں اور اس کتاب کے مقاصد میں سے یہ (بھی ہے) کہ تم لوگ اپنے گناہ (شرک و کفر وغیرہ) اپنے رب سے معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ اور) پھر ایمان لا کر اس کی طرف (عبادت سے) متوجہ رہو (یعنی عمل صالح کرو) پس ایمان و عمل صالح کی برکت سے وہ تم کو وقت مقررہ (یعنی وقت موت) تک (دنیا میں) خوش فہشتی دے گا اور (آخرت میں) ہر زیادہ عمل کرنے والے کو زیادہ ثواب دے گا (یہ کہنا بھی بمنزلہ بشیر کے کہنے کے ہے) اور اگر ایمان لانے سے تم لوگ اعراض (ہی) کرتے رہے تو مجھ کو (اس صورت میں) تمہارے لئے ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (یہ کہنا بمنزلہ نذیر کے کہنے کے ہے) اور عذاب کو مستبعد مت سمجھو کیونکہ تم (سب) کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے اور وہ ہر شئی پر پوری قدرت رکھتا ہے (پھر استبعاد کی کوئی وجہ نہیں البتہ اگر وہاں تمہاری حاضری نہ ہوتی یا لغو ذبا اللہ اس کو قدرت نہ ہوتی تو عذاب واقع نہ ہوتا پس ایسی حالت میں ایمان اور توحید سے اعراض نہ کرنا چاہئے ، آگے علم الہی کا اثبات ہے ، اور ایسا علم و قدرت دونوں دلیل توحید ہیں) یاد رکھو وہ لوگ دوہرا کئے دیتے ہیں اپنے سینوں کو (اور اوپر سے کپڑا لپیٹ لیتے ہیں) تاکہ اپنی باتیں خدا سے چھپا سکیں (یعنی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف میں جو باتیں کرتے ہیں تو اس ہیئت سے کرتے ہیں تاکہ کسی کو خبر نہ ہو جاوے اور جس کو اعتقاد ہو گا کہ خدا کو ضرور خبر ہوتی ہے اور آپ کا صاحب وحی ہونا دلائل سے ثابت ہے پس وہ انشاء کی ایسی تدبیر بھی نہ کرے گا کیونکہ ایسی تدبیر کرنا گویا بدلائل حال اللہ سے پوشیدہ رہنے کی کوشش کرنا ہے سو یاد رکھو کہ وہ لوگ جس وقت (دوہرے ہو کر) اپنے کپڑے (اپنے اوپر لپیٹتے ہیں) وہ اس وقت بھی سب جانتا ہے جو کچھ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر باتیں کرتے ہیں (کیونکہ) بالیقین وہ (تو) دلوں کے اندر کی باتیں جانتا ہے (تو زبان سے کہی ہوئی تو کیوں نہ جانے گا)۔

معارف و مسائل

سورۃ ہود اُن سورتوں میں سے ہے جن میں پچھلی قوموں پر نازل ہونے والے قہر الہی اور مختلف قسم کے عذابوں کا اور پھر قیامت کے ہولناک واقعات اور جزاء و سزا کا ذکر خاص انداز میں آیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک میں کچھ بال سفید ہو گئے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے بطور اظہار رنج کے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ بوڑھے ہو گئے، تو آپ نے فرمایا کہ ہاں مجھے سورۃ ہود نے بوڑھا کر دیا، اور بعض روایات میں سورۃ ہود کے ساتھ سورۃ واقعہ اور مرسلات اور عم یتساءلون اور سورۃ تکویر کا بھی ذکر ہے۔ (رواۃ الحاکم والترمذی)

مطلب یہ تھا کہ ان واقعات کے خوف و دہشت کی وجہ سے بوڑھاپے کے آثار ظاہر ہو گئے، اس کی پہلی آیت کو اکثر سے شروع کیا گیا ہے، یہ ان حروف میں سے ہیں جن کی مراد اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کے درمیان راز ہے دوسروں کو اس پر مطلع نہیں کیا گیا، ان کو اس کی فکر میں پڑنے سے بھی روکا گیا ہے۔

اس کے بعد قرآن مجید کے متعلق فرمایا کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات کو محکم بنایا گیا ہے، لفظ محکم احکام سے بنا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کلام کو ایسا درست کیا جائے جس میں کسی لفظی اور معنوی غلطی یا فساد کا احتمال نہ رہے، اس بناء پر آیات کے محکم بنانے کا مطلب یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے ان آیات کو ایسا بنایا ہے کہ ان میں کسی لفظی غلطی یا معنوی فساد اور خلل یا باطل کا کوئی امکان و احتمال نہیں۔ (قرطبی)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ محکم اس جگہ منسوخ کے مقابلہ میں ہے اور مراد یہ ہے کہ اس کتاب یعنی قرآن کی آیات کو اللہ تعالیٰ نے مجموعی حیثیت سے محکم غیر منسوخ بنایا ہے یعنی جس طرح پچھلی کتابیں تورات و انجیل وغیرہ نزول قرآن کے بعد منسوخ ہو گئیں، اس کتاب کے نازل ہونے کے بعد چونکہ سلسلہ نبوت و وحی ہی ختم ہو گیا اس لئے یہ کتاب تا قیامت منسوخ نہ ہوگی۔ (قرطبی) اور قرآن کی بعض آیات کا خود قرآن ہی کے ذریعہ منسوخ ہو جانا اس کے منافی نہیں۔

اسی آیت میں قرآن کی دوسری شان یہ بتلائی گئی ثُمَّ فَصَّلَتْ یعنی پھر ان آیات کی تفصیل کی گئی، تفصیل کے اصلی معنی یہ ہیں کہ دو چیزوں کے درمیان فصل و امتیاز کیا جائے، اسی لئے عام کتابوں میں مختلف مضامین کو فصل فصل کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے، اس جگہ

تفصیل آیات سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق وغیرہ مضامین کی آیات کو جدا جدا کر کے واضح بیان فرمایا گیا ہے۔

اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو بیک وقت پورا کاپورا لوح محفوظ میں ثبت کر دیا گیا تھا مگر پھر مختلف قوموں اور ملکوں کے حالات و ضروریات کے تحت بہت سی قسطوں میں تھوڑا تھوڑا نازل فرمایا گیا تاکہ اس کا حفظ بھی آسان ہو اور ان پر تدریجی عمل بھی سہل ہو جائے۔

اس کے بعد فرمایا مِنْ لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ یعنی یہ سب آیات ایک ایسی ہستی کی طرف سے آئی ہیں جو حکیم بھی ہے اور باخبر بھی، یعنی جس کے ہر فعل میں اتنی حکمتیں مضمر ہوتی ہیں کہ انسان ان کا احاطہ نہیں کر سکتا اور وہ کائنات عالم کے ذرہ ذرہ موجودہ اور آئندہ سے پوری طرح یا خبر ہے، ان کے سب حالات موجودہ و آئندہ کو جانتا ہے ان سب پر نظر کر کے احکام نازل فرماتا ہے، انسانوں کی طرح نہیں کہ وہ کتنے ہی عقلمند، ہوشیار، تجربہ کار ہوں مگر ان کی عقل و دانش ایک محدود دائرہ میں گھری ہوئی اور ان کا تجربہ صرف اپنے گرد و پیش کی پیروی ہوتا ہے جو بسا اوقات آئندہ زمانہ اور آئندہ حالات میں ناکام و غلط ثابت ہوتا ہے۔

دوسری آیت میں متذکرہ آیات کا بیان ایک سب سے اہم اور مقدم چیز سے شروع ہوتا ہے یعنی حق تعالیٰ کی توحید، ارشاد ہوتا ہے أَلَّا تَعْبُدُوا لِلَّهِ یعنی ان آیات میں جو مضامین بیان کئے گئے ہیں ان میں سب سے اہم اور مقدم یہ ہے کہ ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت اور پرستش نہ کی جائے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا یعنی ان آیات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم فرمایا ہے کہ وہ سارے جہاں کے لوگوں سے کہہ دیں کہ میں اللہ کی طرف سے تم کو ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں، مراد یہ ہے کہ نافرمانی اور اپنی ناجائز خواہشات کا اتباع کرنے والوں کو اللہ کے عذاب سے ڈراتا ہوں اور اطاعت شعار نیک لوگوں کو آخرت کی نعمتوں اور دونوں عالم کی راحتوں کی خوش خبری دیتا ہوں۔

نَذِيرٍ کا ترجمہ ڈرانے والے کا کیا جاتا ہے لیکن یہ لفظ ڈرانے والے دشمن یا درندے یا دوسرے نقصان پہنچانے والوں کے لئے نہیں بولا جاتا، بلکہ نذیر اس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی اپنے عزیز کو شفقت و محبت کی بناء پر ایسی چیزوں سے ڈرائے اور بچائے جو اس کے لئے دنیا یا آخرت یا دونوں میں مصرت پہنچانے والی ہیں۔

تیسری آیت میں آیات قرآنی کی ہدایات میں سے ایک دوسری ہدایت کا بیان اس طرح

فرمایا ہے وَ اِنْ اسْتَغْفِرُوا سَرَّ بَكْمُمْ ثُمَّ تَوْبُوا اِلَيْهِ یعنی ان آیات محکمات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ وہ اپنے رب سے مغفرت اور معافی مانگا کریں اور توبہ کیا کریں، مغفرت کا تعلق پچھلے گناہوں سے ہے اور توبہ کا تعلق آئندہ ان کے پاس نہ جانے کے عہد سے ہے، اور درحقیقت صحیح توبہ یہی ہے کہ پچھلے گناہوں پر نادم ہو کر اللہ تعالیٰ سے ان کی معافی طلب کرے اور آئندہ ان کے نہ کرنے کا پختہ عزم و ارادہ کرے، اسی لئے بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ آئندہ کو گناہ سے بچنے کا پختہ عزم اور اہتمام کے بغیر محض زبان سے استغفار کرنا گڈا بیٹن یعنی جھوٹے لوگوں کی توبہ ہے، (قرطبی) اور ایسے ہی استغفار کے متعلق بھی بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ع

معصیت را خندہ می آید را استغفار را ما

یا یہ کہ ایسی توبہ خود قابل توبہ ہے۔

اس کے بعد صحیح طور پر استغفار و توبہ کرنے والوں کو دنیا و آخرت کی فلاح اور عیش و راحت کی خوشخبری اس طرح دی گئی ہے، يُمَتِّعُكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى یعنی جن لوگوں نے صحیح طور پر اپنے پچھلے گناہوں سے استغفار کیا اور آئندہ ان سے بچنے کا پختہ عزم اور پورا اہتمام کیا تو صرف یہی نہیں کہ ان کی خطا بخش دی جائے گی بلکہ ان کو اچھی زندگی عطا کی جائے گی، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ زندگی عام ہے دنیا کی زندگی اور آخرت کی دائمی زندگی دونوں کو شامل ہے، جیسے ایک دوسری آیت میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے لَنُخَيِّطَنَّاهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً یعنی ہم ضرور ان کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے، اس آیت کے متعلق بھی مجہور مفسرین کی تحقیق یہی ہے کہ دنیا و آخرت کی دونوں زندگیاں اس میں شامل ہیں، سورۃ نوح میں اس کی تصریح بھی اس طرح آگئی ہے کہ استغفار کرنے والوں کے متعلق یہ فرمایا ہے يُرْسِلِ السَّيِّئَاتِ عَلٰيْكُمْ مِقْدَارًا وَّ يَهْدِيْكُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ و وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهَارًا یعنی اگر تم نے صحیح طور سے اللہ سے مغفرت مانگی تو اللہ تعالیٰ تم پر بارانِ رحمت نازل فرمائے گا اور تم کو مال و اولاد سے بامراد کرے گا اور تمہارے لئے باغات اور نہریں عطا فرمائے گا، ظاہر ہے کہ بارانِ رحمت اور مال و اولاد کا تعلق اسی حیاتِ دنیا سے ہے۔

اسی لئے آیت مذکور میں متاعِ حسن کی تفسیر بھی اکثر مفسرین نے یہ کی ہے کہ استغفار و توبہ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ تم کو رزق کی وسعت اور عیش کی سہولتیں عطا فرمائے گا اور آفتوں اور عذابوں سے تمہاری حفاظت کرے گا، اور چونکہ حیاتِ دنیا کا ایک روز ختم ہو جانا لازمی ہے اور اس کی عیش و راحت قانونِ قدرت کے تحت دائمی نہیں ہو سکتی، اس لئے اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى فرما کر

ہدایت کر دی کہ دنیا میں پاکیزہ زندگی اور عیش کی سہولتیں ایک خاص میعاد یعنی موت تک حاصل رہیں گی، آخر کار موت ان سب چیزوں کا خاتمہ کر دے گی۔

مگر اس موت کے فوراً بعد ہی دوسرے عالم کی زندگی شروع ہو جائے گی اور اس میں بھی توبہ و استغفار کرنے والوں کے لئے دائمی راحتیں میسر ہوں گی۔

اور حضرت سہل بن عبداللہ نے فرمایا کہ متاعِ حسن سے مراد یہ ہے کہ انسان کی توجہ مخلوق سے ہٹ کر خالق پر جم جائے، اور بعض بزرگوں نے فرمایا کہ متاعِ حسن یہ ہے کہ انسان موجود پر قناعت کرے، مفقود کے غم میں نہ پڑے یعنی دنیا جس قدر میسر ہو اس پر مطمئن ہو جائے جو حاصل نہیں اس کے غم میں نہ پڑے۔

دوسری خوشخبری توبہ و استغفار کرنے والوں کو یہ دی گئی کہ دُیُوتِ کُلِّ ذی فَضْلٍ فَضْلُهُ، اس میں پہلے فضل سے مراد انسان کا عمل صالح اور دوسرے فضل سے فضلِ خداوندی یعنی جنت ہے، مطلب یہ ہے کہ ہر نیک عمل والے کو اللہ تعالیٰ اپنا فضل یعنی جنت عطا فرما دیں گے۔

پہلے جملہ میں دنیا و آخرت دونوں میں متاعِ حسن یعنی اچھی زندگی کا وعدہ فرمایا ہے اور دوسرے جملہ میں جنت کی لازوال نعمتوں کا، آخر آیت میں ارشاد فرمایا فَإِنْ تَوَلَّوْا فَعَرَضْتُمْ أَعْدَابُكُمْ عَذَابٌ يُّؤْتِيهِ الْكَبِيرُ، یعنی اگر اس نصیحت و خیر خواہی سے منہ موڑا اور پچھلے گناہوں سے استغفار اور آئندہ ان سے بچنے کا اہتمام نہ کیا تو یہ اندیشہ قوی ہے کہ تم ایک بڑے دن کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے، بڑے دن سے مراد قیامت کا دن ہے کیونکہ وہ اپنی وسعت کے اعتبار سے بھی ایک ہزار سال کا دن ہوگا اور اس میں پیش آنے والے حالات و واقعات کے اعتبار سے بھی وہ سب سے بڑا دن ہوگا۔

پانچویں آیت میں اسی مضمون کی مزید تاکید فرمائی گئی ہے کہ دنیا میں تم کچھ بھی کرو اور کسی طرح بھی بسر کرو مگر انجام کار مرنے کے بعد تمہیں خدا تعالیٰ ہی کی طرف لوٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اس کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ مرنے اور خاک ہو جانے کے بعد تمہارے سب ذرات کو جمع کر کے تم کو از سر نو انسان بنا کر کھڑا کر دے۔

پھٹی آیت میں منافقین کے ایک گمانِ بد اور خیالی فاسد کی تردید ہے کہ یہ لوگ اپنی عداوت اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کو اپنے نزدیک خوب چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے سینوں میں جو حسد و بغض کی آگ بھری ہوئی ہے اس پر ہر طرح کے پردے ڈالتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اس طرح ہمارا اصل حال کسی کو معلوم نہ ہوگا، مگر حقیقت یہ ہے کہ

وہ کپڑوں کی تہ میں پردوں کے پیچھے جو کچھ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ پر سب کچھ روشن ہے، اِنَّا عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ، کیونکہ وہ تو دلوں کے پوشیدہ اسرار کو بھی خوب جانتے ہیں۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ يَرْزُقُهَا وَيَعْلَمُ

اور کوئی نہیں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے اس کی روزی اور جانتا ہے

مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ⑥ وَهُوَ الَّذِي

جہاں وہ ٹھہرتا ہے اور جہاں سونپا جاتا ہے، سب کچھ موجود ہے کھلی کتاب میں، اور وہی ہے جس نے

خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى

بنائے آسمان اور زمین پھردن میں اور تھا اس کا تخت پانی

الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ آيَاتِهِ أَحْسَنُ عَمَلًا ⑦ وَلَئِنْ قُلْتُمْ لَتَكُنَّ

پر تاکہ آزمائے تم کو کہ کون تم میں اچھا کرتا ہے کام، اور اگر تو کہے کہ تم

مُبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا

اٹھو گے مرنے کے بعد تو البتہ کاذب کہنے لگیں یہ کچھ نہیں

إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ⑧ وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمْ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ

مگر جادو ہے کھلا ہوا، اور اگر ہم روکے رکھیں ان سے عذاب کو ایک مدت

مَعْدُودَةٍ لَيَقُولَنَّ مَا يَحْبِسُهُ ⑨ إِلَّا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا

معلوم تک تو کہنے لگیں کس چیز نے روک دیا عذاب کو، سنتا ہے جس دن آئے گا ان پر نہ پھیرا جائیگا

عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ⑩

ان سے اور گھیر لے گی ان کو وہ چیز جس پر ٹھٹھے کیا کرتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اور کوئی رزق کھانے والا جاندار روتے زمین پر چلتے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو اور رزق ربانی کے لئے علم کی ضرورت ہوتی ہے سو وہ ہر ایک کی زیادہ رہنے کی جگہ کو اور چند روز رہنے کی جگہ کو جانتا ہے اور ہر ایک کو وہاں ہی رزق پہنچاتا ہے، اور گو سب چیزیں علم الہی میں تو ہیں ہی مگر اس کے ساتھ ہی سب چیزیں کتاب مبین (یعنی لوح محفوظ) میں (بھی) منضبط و مندرج ہیں (غرض واقعات ہر طرح محفوظ ہیں، آگے تخلیق کا مع اس کی

بعض حکمتوں کے بیان ہے جس سے قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کی بھی تائید ہوتی ہے، کیونکہ ابتدائی تخلیق دلیل ہے اس پر کہ وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے، اور وہ (اللہ) ایسا ہے کہ سب آسمان اور زمین کو چھ دن (کی مقدار) میں پیدا کیا اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا (کہ یہ دونوں چیزیں پہلے سے پیدا ہو چکی تھیں اور یہ پیدا کرنا اس لئے ہے تاکہ تم کو آزمائے کہ (دیکھیں) تم میں اچھا عمل کرنے والا کون ہے) مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان کو پیدا کیا، تمہارے حوائج و منافع اس میں پیدا کئے تاکہ تم ان کو دیکھ کر توحید پر استدلال کرو اور ان سے منتفع ہو کر منعم کا شکر اور خدمت کر عبادت ہے عمل صالح سے، بحالاف، سو بعض نے ایسا کیا، بعض نے نہ کیا، اور اگر آپ (لوگوں سے) کہتے ہیں کہ یقیناً تم لوگ مرنے کے بعد (قیامت کے روز دوبارہ) زندہ کئے جاؤ گے تو (ان میں) جو لوگ کافر ہیں وہ (قرآن کی نسبت) کہتے ہیں کہ یہ تو بڑا صاف جادو ہے (جادو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ باطل ہوتا ہے مگر موثر، اسی طرح قرآن کو نعوذ باللہ باطل سمجھتے تھے لیکن اس کے مضامین کا موثر ہونا بھی مشاہدہ کرتے تھے، اس مجموعہ پر یہ حکم کیا، نعوذ باللہ منہ، مقصود اس سے آخرت کا انکار تھا، آگے ان کے منشاء انکار کا جواب ارشاد ہے، اور اگر تھوڑے دنوں تک (مراد دنیوی زندگی ہے) ہم ان سے عذاب (موعود) کو ملتوی رکھتے ہیں (کہ اس میں حکمتیں ہیں) تو (بطور انکار و استہزاء کے) کہنے لگتے ہیں کہ (جب ہم تمہارے نزدیک پہنچیں عذاب ہیں تو) اس عذاب کو کون چیز روک رہی ہے (یعنی اگر عذاب کوئی چیز ہوتی تو اب تک ہو چکتا جب نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں، حق تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ) یاد رکھو جس دن (وقت موعود پر) وہ (عذاب) ان پر آپڑے گا تو پھر کسی کے ٹالے نہ ٹلے گا اور جس (عذاب) کے ساتھ یہ استہزاء کر رہے تھے وہ ان کو آگھیرے گا (مطلب یہ کہ باوجود استحقاق کے یہ تاخیر اس لئے ہے کہ بعض حکمتوں سے اُس کا وقت معین ہے پھر اس وقت ساری کسر نکل جاوے گی،

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں حق تعالیٰ کے علم محیط کا ذکر تھا جس سے کائنات کا کوئی ذرہ اور دلوں کے چھپے ہوئے راز بھی مخفی نہیں، آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اس کی مناسبت سے انسان پر ایک عظیم الشان احسان کا ذکر کیا گیا ہے، وہ یہ کہ اس کے رزق کی کفالت حق تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی ہے اور نہ صرف انسان کی بلکہ زمین پر چلنے والے ہر جاندار کی، وہ جہاں کہیں رہتا ہے یا چلا جاتا ہے اس کی روزی اس کے پاس پہنچتی ہے، تو کفار کے یہ ارادے کہ اپنے کسی کام کو اللہ تعالیٰ سے چھپالیں جہالت اور بے وقوفی کے ہوا کچھ نہیں، پھر اس کے عموم میں

جنگل کے تمام درندے، پرندے اور حشرات الارض، دریا اور خشکی کے تمام جانور داخل ہیں اس عموم کی تاکید کے لئے لفظ مِنْ کا اضافہ کر کے وَمِمَّا مِنْ دَابَّةٍ فرمایا ہے، دَابَّة ہر اس جانور کو کہتے ہیں جو زمین پر چلے، پرندے جانور بھی اس میں داخل ہیں کیونکہ ان کا آشیانہ بھی کہیں زمین ہی پر ہوتا ہے، دریائی جانوروں کا بھی تعلق زمین سے ہونا کچھ مخفی نہیں، ان سب جانداروں کے رزق کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے کر ایسے الفاظ سے اس کو بیان کیا ہے جیسے کوئی فریضہ کسی کے ذمہ ہو، ارشاد فرمایا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا یعنی اللہ کے ذمہ ہے اس کا رزق، یہ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری حق تعالیٰ پر ڈالنے والی کوئی اور طاقت نہیں بجز اس کے کہ اسی نے اپنے فضل سے یہ وعدہ فرمایا، مگر وعدہ ایک صادق کریم کا ہے جس میں خلاف و رزی کا کوئی امکان نہیں، اسی یقین کو ظاہر کرنے کے لئے اس جگہ لفظ عَلَى لایا گیا ہے جو قرائن کے بیان کے لئے استعمال ہوتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نہ کسی حکم کا پابند ہے نہ اس کے ذمہ کوئی چیز فرض یا واجب ہے، رِزْقُ لغت میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے جاندار اپنی غذا حاصل کرے اور جس کے ذریعہ اس کی روح کی بقاء اور جسم میں نمایاں فریبی اور بڑھوتری ہوتی ہے۔

رِزْقُ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جس کا رزق ہے وہ اس کا مالک بھی ہو، کیونکہ تمام جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے مگر وہ اس کے مالک نہیں ہوتے ان میں مالکیت کی صلاحیت ہی نہیں، اسی طرح چھوٹے بچے اپنے رزق کے مالک نہیں ہوتے مگر رزق ان کو ملتا ہے۔

رزق کے اس عام معنی کے اعتبار سے علماء نے فرمایا کہ رزق حلال بھی ہو سکتا ہے حرام بھی کیونکہ جو شخص کسی دوسرے کا مال ناجائز طور پر لے کر کھالے تو یہ مال غذا تو اس شخص کی بن گیا مگر حرام طور پر بنا، اگر یہ اپنی حرص میں اندھا ہو کر ناجائز طریقے استعمال نہ کرتا تو جو رزق اس کے لئے مقرر تھا وہ جائز طور پر اس کو ملتا۔

رزق کی خدائی ذمہ داری پر یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر جاندار کا رزق اللہ تعالیٰ ایک سوال اور جواب نے اپنے ذمہ لے لیا ہے تو پھر ایسے واقعات کیوں پیش آتے ہیں کہ بہت سے جانور اور انسان غذا نہ ملنے کے سبب بھوکے پیاسے مر جاتے ہیں، اس کے جواب علماء نے متعدد لکھے ہیں۔

ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رزق کی ذمہ داری اسی وقت تک ہے جب تک اس کی اجل مقدر یعنی عمر پوری نہیں ہو جاتی، جب یہ عمر پوری ہو گئی تو اس کو ہر حال مرنا ہے اور اس جہان سے گزرنا ہے جس کا عام سبب امراض ہوتے ہیں کبھی جلنا یا غرق ہونا یا پوٹ اور زخم بھی سبب ہوتا ہے، اسی طرح ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا رزق بند کر دیا گیا، اس سے موت

واقع ہوئی۔

امام قرطبیؒ نے اس آیت کے تحت ابو موسیٰ اور ابو مالک وغیرہ قبیلہ اشعریین کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے تو جو کچھ تو شہ اور کھانے پینے کا سامان ان کے پاس تھا وہ ختم ہو گیا، انہوں نے اپنا ایک آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس غرض کے لئے بھیجا کہ ان کے کھانے وغیرہ کا کچھ انتظام فرمادیں، یہ شخص جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر پہنچا تو اندر سے آواز آئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت پڑھ رہے ہیں وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ يَرْزُقُهَا، اس شخص کو یہ آیت سن کر خیال آیا کہ جب اللہ نے سب جانداروں کا رزق اپنے ذمہ لے لیا ہے تو پھر ہم اشعری بھی اللہ کے نزدیک دوسرے جانوروں سے گئے گزرے نہیں وہ ضرور ہمیں بھی رزق دیں گے، یہ خیال کر کے وہیں سے واپس ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا کچھ حال نہیں بتلایا، واپس جا کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ خوش ہو جاؤ، تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد آ رہی ہے، اس کے اشعری ساتھیوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا کہ ان کے قاصد نے حسبِ قرارداد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی حاجت کا ذکر کیا ہے اور آپ نے انتظام کرنے کا وعدہ فرمایا ہے وہ یہ سمجھ کر مطمئن بیٹھ گئے، وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ دیکھا کہ دو آدمی ایک (قصبہ) گوشت اور روٹیوں سے بھرا ہوا اٹھائے لا رہے ہیں، قصبہ ایک بڑا برتن ہوتا ہے جیسے تشلہ یا سینی، لانے والوں نے یہ کھانا اشعریین کو دے دیا، انہوں نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا پھر بھی بچ رہا تو ان لوگوں نے یہ مناسب سمجھا کہ باقی کھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیں تاکہ اس کو آپ اپنی ضرورت میں صرف فرمادیں، اپنے دو آدمیوں کو یہ کھانا دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیا۔

اس کے بعد یہ سب حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کا بھیجا ہوا کھانا بہت زیادہ اور بہت نفیس و لذیذ تھا، آپ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی کھانا نہیں بھیجا۔

تب انہوں نے پورا واقعہ عرض کیا کہ ہم نے اپنے فلاں آدمی کو آپ کے پاس بھیجا تھا، اس نے یہ جواب دیا، جس سے ہم نے سمجھا کہ آپ نے کھانا بھیجا ہے، یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میں نے نہیں بلکہ اُس ذاتِ قدوس نے بھیجا ہے جس نے ہر جاندار کا رزق اپنے ذمہ لیا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کی تلاش میں کوہ طور پر پہنچے اور وہاں آگ کے بجائے تجلیاتِ الہی سامنے آئیں اور ان کو نبوت و رسالت عطا ہو کر

فرعون اور اس کی قوم کی ہدایت کے لئے مصر جانے کا حکم ملا تو خیال آیا کہ میں اپنی زوجہ کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر آیا ہوں اس کا کون متکفل ہوگا، اس خیال کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ سامنے پڑی ہوئی پتھر کی چٹان پر لکڑی ماریں، انہوں نے تمیل حکم کی تو یہ چٹان پھٹ کر اس کے اندر سے ایک دوسرا پتھر برآمد ہوا، حکم ہوا اس پر بھی لکڑی ماریں، ایسا کیا تو وہ پتھر پھٹا اور اندر سے تیسرا پتھر برآمد ہوا، اس پر بھی لکڑی مارنے کا حکم ہوا تو یہ شق ہوا اور اندر سے ایک جانور برآمد ہوا جس کے منہ میں ہر ایتہ تھا۔

حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا یقین تو موسیٰ علیہ السلام کو پہلے بھی تھا مگر مشاہدہ کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے، یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام وہیں سے سیدھے مصر کو روانہ ہو گئے، زوجہ محترمہ کو یہ بتلانے بھی نہ گئے کہ مجھے مصر جانے کا حکم ہوا ہے، وہاں جا رہا ہوں۔

ساری مخلوق کو رزق رسانی کا | اس آیت میں حق تعالیٰ نے صرف اس پر اکتفا نہیں فرمایا کہ ہر جاندار عجیب و غریب نظامِ قدرت کا رزق اپنے ذمہ لے لیا بلکہ انسان کے مزید اطمینان کے لئے فرمایا **وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا**۔ اس آیت میں مستقر اور مستودع کی مختلف تفسیریں منقول ہیں مگر لغت کے اعتبار سے وہ اقرب ہے جس کو کشاف نے اختیار کیا ہے کہ مستقر اُس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں کوئی شخص مستقل طور پر جائے قیام یا وطن بنالے اور مستودع اُس جگہ کو جہاں عارضی طور پر کسی ضرورت کے لئے ٹھہرے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری کو دنیا کے لوگوں اور حکومتوں کی ذمہ داری پر قیاس نہ کرو، دنیا میں اگر کوئی شخص یا کوئی ادارہ آپ کے رزق کی ذمہ داری لے لے تو اتنا کام بہر حال آپ کو کرنا پڑے گا کہ اگر اپنی مقررہ جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جانا ہو تو اس فرد یا ادارہ کو اطلاع دیں کہ میں فلاں تاریخ سے فلاں تک فلاں شہر یا گاؤں میں رہوں گا، رزق کے وہاں پہنچنے پہنچانے کا انتظام کیا جائے، مگر حق تعالیٰ کی ذمہ داری میں آپ پر اس کا بھی کوئی بار نہیں کیونکہ وہ آپ کی ہر نقل و حرکت سے باخبر ہے، آپ کے مستقل جائے قیام کو بھی جانتا ہے اور عارضی اقامت کی جگہ سے بھی واقف، بغیر کسی درخواست اور نشان دہی کے آپ کا راشن وہاں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے علم محیط اور قدرتِ مطلقہ کے پیشِ نظر صرف اس کا ارادہ فرمالینا تمام کاموں کے سرانجام ہونے کے لئے کافی تھا کسی کتاب یا رجسٹر میں لکھنے لکھانے کی کوئی ضرورت نہ تھی، مگر مسکین انسان جس نظام کا خوگر ہوتا ہے اس کو اس نظام پر قیاس کر کے بھول چوک کا کھٹکا ہو سکتا ہے اس لئے اس کے مزید اطمینان کے لئے فرمایا **كُلُّ نَفْسٍ مِّنْهُنَّ** یعنی یہ سب کچھ ایک

واضح کتاب میں لکھا ہوا ہے، اس واضح کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے جس میں تمام کائنات کی روزی، عمر، عمل وغیرہ کی پوری تفصیلات لکھی ہوئی ہیں جو حسب موقع و ضرورت متعلقہ فرشتوں کے سپرد کر دی جاتی ہیں۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی تقدیریں آسمان اور زمین کی پیدائش سے بھی بچاں ہزار سال پہلے لکھ دی تھیں۔

اور بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل حدیث میں فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنی پیدائش سے پہلے مختلف دور سے گزرتا ہے، جب اس کے اعضاء کی تکمیل ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو حکم کرتے ہیں جو اس کے متعلق چار چیزیں لکھ لیتا ہے، اول اس کا عمل جو کچھ وہ کرے گا، دوسرے اس کی عمر کے سال، مہینہ، دن اور منٹ اور سانس تک لکھ لئے جاتے ہیں، تیسرے اس کو کہاں مرنے اور کہاں دفن ہونا ہے، چوتھے اس کا رزق کتنا اور کس کس طریقے سے پہنچنا ہے، (اور لوح محفوظ میں آسمان زمین کی پیدائش سے بھی پہلے لکھا ہونا اس کے منافی نہیں)۔

دوسری آیت میں حق تعالیٰ کے علم محیط اور قدرت قاہرہ کا ایک اور منظر ذکر کیا گیا ہے کہ اس نے تمام آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا اور ان چیزوں کے پیدا کرنے سے پہلے عرشِ رحمن پانی پر تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین کی پیدائش سے پہلے پانی پیدا کیا گیا ہے اور آسمان و زمین کو چھ دن میں پیدا کرنے کی تفصیل سورۃ احقہ سجده کی آیت (۱۰، ۱۱) میں اس طرح آئی ہے کہ دو دن میں زمین بنائی گئی، دو دن میں زمین کے پہاڑ، دریا، درخت اور جانداروں کی غذا و بقا، کا سامان بنایا گیا، دو دن میں سات آسمان بنائے گئے۔

تفسیر منطہری میں ہے کہ آسمان سے مراد وہ تمام علویات ہیں جو اوپر کی سمت میں ہیں اور زمین سے مراد تمام سفلیات ہیں جو نیچے کی جہت میں ہیں، اور دن سے مراد وہ مقدار وقت ہے جو آسمان زمین کی پیدائش کے بعد آفتاب کے طلوع سے غروب تک ہوتا ہے اگرچہ آسمان زمین کی پیدائش کے وقت نہ آفتاب تھا نہ اس کا طلوع و غروب۔

حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ میں یہ بھی تھا کہ ان تمام چیزوں کو ایک آن میں پیدا فرمادیں مگر اس نے اپنی حکمت سے اس عالم کے نظام کو تدریجی بنایا ہے جو انسان کے مزاج کے مناسب ہے۔ آخر آیت میں آسمان و زمین کے پیدا کرنے کا مقصد یہ بتلایا ہے لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ

عَمَلًا، یعنی یہ سب چیزیں اس لئے پیدا کی گئیں کہ ہم تمہارا امتحان لیں کہ کون تم میں سے اچھا عمل کرنے والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آسمان وزمین کا پیدا کرنا خود کوئی مقصد نہ تھا بلکہ ان کو عمل کرنے والے انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے تاکہ وہ ان چیزوں سے اپنے معاش کا فائدہ بھی حاصل کریں اور ان میں غور کر کے اپنے مالک اور رب کو بھی پہچانیں۔

حاصل یہ ہوا کہ آسمان وزمین کی پیدائش سے اصل مقصود انسان ہے بلکہ انسان میں بھی اہل ایمان ہیں اور ان میں بھی وہ انسان جو سب سے اچھا عمل کرنے والا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ ہمارے بنی آدم میں سب سے اچھا عمل کرنے والے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لئے یہ کہنا صحیح ہوا کہ تمام کائنات کے پیدا کرنے کا اصل مقصد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باوجود ہے۔ (مظہری)

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حق تعالیٰ نے اس جگہ أَحْسَنَ عَمَلًا فرمایا ہے، یعنی کون اچھا عمل کرنے والا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ کون زیادہ عمل کرنے والا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اعمالِ صالحہ نماز، روزہ، تلاوت و ذکر کی عملی کثرت اور بہت بڑی مقدار سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی نظرِ حسنِ عمل پر ہے، اسی حُسنِ عمل کو ایک حدیث میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کی رضا ہوئی کے لئے ہو اور کوئی دنیوی غرض اس میں نہ ہو اور اُس عمل کی صورت بھی وہ اختیار کی جائے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے، جس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بتلایا اور امت کے لئے اتباعِ سنت کو لازم قرار دیا، خلاصہ یہ ہے کہ تھوڑا عمل جو پورے اخلاص کے ساتھ سنت کے مطابق ہو وہ اس زیادہ عمل سے بہتر ہے جس میں یہ چیزیں نہ ہوں یا کم ہوں۔

ساتویں آیت میں منکرینِ قیامت و آخرت کا حال بیان ہوا ہے کہ یہ لوگ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئے اُس کو جادو کہہ کر ٹال دینا چاہتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں ان لوگوں کے شبہ کا جواب ہے جو عذاب کی وعیدوں پر انبیاء علیہم السلام کا اعتبار نہ کر کے کہا کرتے تھے کہ اگر آپ سچے ہیں تو جس عذاب کی وعید تھی وہ کیوں نہیں آجاتا۔

وَلَكِنْ أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَكَفُورٌ

اور اگر ہم چکھادیں آدمی کو اپنی طرف سے رحمت پھر وہ چھین لیں اس سے، تو وہ ناامید

كَقُورٍ ۙ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ

ناشکر ہوتا ہے ، اور اگر ہم چکھا دیں اس کو آرام بعد تکلیف کے جو پہنچی تھی اسکو تو بول اٹھے

ذَهَبَ السَّيِّئَاتِ عَنِّي ۖ إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ ۝۱۰ إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا

دور ہوئیں برائیاں مجھ سے ، وہ تو اترانے والا شیخی خور ہے مگر جو لوگ صابر ہیں

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۖ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ ۖ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝۱۱ فَلَعَلَّكَ

اور کرتے ہیں نیکیاں ، ان کے واسطے بخشش ہے اور ثواب بڑا ، سو کہیں تو

تَأِيرُكَ ۖ بَعْضُ مَا يُوَلِّحِي إِلَيْكَ وَضَائِقٌ ۖ يَا صَدْرُكَ أَنْ يَقُولُوا

چھوڑ بیٹھے گا کچھ چیز اس میں سے جو وحی آتی تیری طرف ازنگ ہوگا اس سے تیرا جی اس بات پر کہ وہ کہتے ہیں

لَوْلَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكَ ۖ لَأَنَّمَا أَنْتَ نَذِيرٌ ۖ وَاللَّهُ

کیوں نہ اتراس پر خزانہ یا کیوں نہ آیا اس کے ساتھ فرشتہ ، تو تو ڈرانے والا ہے ، اور اللہ ہے

عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ۝۱۲ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ قَاتُوا بَعْشَرَ

ہر چیز کا ذمہ دار ، کیا کہتے ہیں کہ بنالایا ہے تو قرآن کو ، کہہ دے تم بھی لے آؤ ایک دن

سُورٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرِيَتٍ ۖ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ

سورے میں ایسی بنا کر اور بلاؤ جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر

كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝۱۳ فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّهُمَا أَنْزَلُوا

ہو تم سچے ، پھر اگر نہ پورا کریں تمہارا کہنا تو جان لو کہ قرآن تو اترتا ہے

بِعِلْمِ اللَّهِ ۖ إِنَّ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّسْلِمُونَ ۝۱۴

اللہ کی وحی سے اور یہ کہ کوئی حاکم نہیں اس کے سوا ، پھر اب تم حکم ماننے ہو ۔

خلاصہ تفسیر

اور اگر ہم انسان کو اپنی مہربانی کا مزہ چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکر ہو جاتا ہے اور اگر اس کو کسی تکلیف کے بعد جو کہ اس پر واقع ہوئی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھا دیں تو (ایسا اتراتا ہے کہ) کہنے لگتا ہے کہ میرا سب دکھ درد رخصت ہوا (اب کبھی نہ ہوگا پس) وہ اترانے لگتا ہے شیخی بگھارنے لگتا ہے مگر جو لوگ مستقل مزاج ہیں اور نیک کام کرتے ہیں (مراد اس سے مؤمنین ہیں کہ ان میں کم و بیش یہ خصال ہوتی ہیں سو) وہ ایسے نہیں ہوتے (بلکہ زوال نعمت کے وقت صبر سے کام لیتے ہیں اور عطا نعمت کے وقت شکر و طاعت بجالاتے ہیں پس) ایسے

لوگوں کے لئے بڑی مغفرت اور بڑا اجر ہے، خلاصہ یہ ہے کہ بجز مؤمنین کے اکثر آدمی ایسے ہی ہیں کہ ذرا سی دیر میں نڈر ہو جاویں ذرا سی دیر میں ناامید ہو جاویں اس لئے یہ لوگ تاخیر عذاب کے سبب بے خوف اور منکر ہو گئے، یہ لوگ جو انکار و استہزاء سے پیش آتے ہیں، سو شاید آپ تنگ ہو کر ان احکام میں سے جو کہ آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجے جاتے ہیں بعض کو (یعنی تبلیغ کو) چھوڑ دینا چاہتے ہیں (یعنی کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ تبلیغ ترک کر دیں سو ظاہر ہے کہ ایسا ارادہ تو آپ کر نہیں سکتے پھر تنگ ہونے سے کیا فائدہ، اور آپ کا دل اس بات سے تنگ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ نبی ہیں تو ان پر کوئی خزانہ کیوں نہیں نازل ہو یا ان کے ہمراہ کوئی فرشتہ (جو ہم سے بھی بولتا چلتا) کیوں نہیں آیا (یعنی ایسے معجزات کیوں نہیں دیئے گئے سو ایسی باتوں سے آپ تنگ نہ ہو جائے کیونکہ آپ تو ان کفار کے اعتبار سے، صرف ڈرانے والے ہیں (یعنی پیغمبر ہیں جس کے لئے دراصل کسی بھی معجزے کی ضرورت نہیں، اور پورا اختیار رکھنے والا ہر شے پر) تو صرف اللہ ہی ہے (آپ نہیں ہیں، جب یہ بات ہے تو ان معجزات کا ظاہر کرنا آپ کے اختیار سے باہر ہے پھر اس کی فکر اور اس فکر سے تنگی کیوں ہو اور چونکہ پیغمبر کے لئے مطلق معجزہ کی ضرورت ہے اور آپ کا بڑا معجزہ قرآن ہے تو اس کو نہ ماننے کی کیا وجہ) کیا (اس کی نسبت) یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ نے اس کو (اپنی طرف سے) خود بنالیا ہے، آپ جواب میں فرما دیجئے کہ اگر یہ میرا بنایا ہوا ہے، تو (اچھا) تم بھی اس جیسی دس سورتیں (جو تمہاری) بنائی ہوئی (ہوں) لے آؤ اور (اپنی مدد کے لئے) جن جن غیر اللہ کو بلا سکو بلا لو اگر تم سچے ہو پھر یہ کفار اگر تم لوگوں کا (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کا یہ) کہنا کہ اس کی مثل بنا لاؤ، نہ کر سکیں تو تم (ان سے کہہ دو کہ اب تو، یقین کر لو کہ یہ قرآن الہی کے علم اور قدرت) سے اترا ہے (اس میں اور کسی کے نہ علم کا دخل ہے اور نہ قدرت کا، اور یہ (بھی یقین کر لو کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں) کیونکہ معبود خدائی کی صفات میں کامل ہوتا ہے پھر اگر کوئی ہوتا تو اس کو قدرت بھی پوری ہوتی اور اس قدرت سے وہ تم لوگوں کی مدد کرتا کہ تم اس کی مثل لے آتے کیونکہ موقع تحقیق دین کا اس کو مقفی تھا پس اس کے مثل بنانے سے ان کے عاجز ہونے سے رسالت اور توحید دونوں ثابت ہو گئے جب دونوں ثابت ہو گئے، تو اب بھی مسلمان ہوتے ہو (یا نہیں)۔

مَعَارِفُ وَمَسَائِلُ

آیات مذکورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق اور اس میں شبہات نکالنے والوں کا جواب مذکور ہے، اور اس کے شروع یعنی پہلی تین آیتوں میں انسان کی ایک طبعی

عادتِ قبیحہ کا ذکر اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کی ہدایت ہے۔

پہلی دو آیتوں میں فطری طور پر انسان کا غیر مستقل مزاج، جلدی پسند ہوتا اور موجودہ حالت میں کھپ کر ماضی و مستقبل کو بھلا دینا بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے کہ اگر ہم انسان کو کوئی نعمت چکھاتے ہیں اور پھر اس سے واپس لے لیتے ہیں تو وہ بڑا ہمت ہارنا امید اور ناشکرا بن جاتا ہے، اور اگر اس کو کسی تکلیف کے بعد جو اس کو پیش آتی ہو کسی نعمت کا مزا چکھا دیں تو کہنے لگتا ہے کہ میرا سب دکھ درد رخصت ہوا اور وہ اترانے اور شکنی بگھارنے لگتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان فطرتاً عاجل و سداور موجودہ حالت کو سب کچھ سمجھنے کا عادی ہوتا، اگلے پچھلے حالات و واقعات میں غور و فکر اور ان کو یاد رکھنے کا غور نہیں ہوتا اسی لئے نعمت کے بعد تکلیف آجائے تو رحمت سے ناامید ہو کر ناشکری کرنے لگتا ہے، یہ خیال نہیں کرتا کہ جس نعمت حق نے پہلے نعمت دی تھی وہ پھر بھی دے سکتا ہے، اسی طرح اگر اس کو تکلیف و مصیبت کے بعد کوئی راحت و نعمت مل جائے تو بجائے اس کے کہ پچھلی حالت میں غور کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا اس کا شکر کرتا، اور زیادہ اگرنے اترانے لگتا ہے، اور پچھلی حالت کو بھول کر یوں سمجھنے لگتا ہے کہ یہ نعمت تو میرا حق ہے مجھے ملنا ہی چاہئے اور میں ہمیشہ اسی طرح رہوں گا۔ غافل یہ خیال نہیں کرتا کہ جس طرح پہلی حالت باقی نہیں رہی، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ نعمت و رحمت کی حالت بھی باقی نہ رہے۔

پہچان نہماند چنین نیست ہم نخواہد ماند

انسان کی موجود پرستی اور ماضی و مستقبل کو بھول جانے کا یہ عالم ہے کہ ایک صاحب اقتدار کے خاک و خون پر دوسرا شخص اپنے اقتدار کی بنیاد استوار کرتا ہے اور کبھی نیچے کی طرف نظر نہیں کرتا کہ اس سے پہلا صاحب اقتدار بھی اسی طرح رہا کرتا تھا، اس کے انجام سے بے خبر ہو کر نشہ اقتدار کے مزے لیتا ہے۔

اسی موجود پرستی اور حال مستی کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی کتابیں اور رسول آتے ہیں جو انسان کو ماضی کے عبرتناک واقعات یاد دلا کر مستقبل کی فکر سامنے کر دیتے ہیں اور یہ سبق سکھاتے ہیں کہ کائنات کے بدلتے ہوئے حالات و غیرات میں غور کرو کہ کونسی طاقت ان کے پردے میں کام کر رہی ہے، بقول حضرت شیخ الہندؒ

انقلابات جہان واضطرب ہیں دیکھو ہر تغیر صدا آتی ہے قافہم، قافہم

مؤمن کامل بلکہ انسان کامل وہی ہے جو ہر تغیر و انقلاب اور ہر رنج و راحت میں دستِ قدرت کی مستور طاقت کا مشاہدہ کرے، آنی فانی راحت و رنج اور اس کے صرف مادی اسباب پر دل نہ لگائے،

عقلمند کا کام یہ ہے کہ اسباب سے زیادہ مسبب الاسباب کی طرف نظر کرے، اُسی سے اپنا رشتہ مضبوط باندھے۔

تیسری آیت میں ایسے ہی کامل انسانوں کو عام انسانی فطرت سے مستثنیٰ اور ممتاز کرنے کے لئے فرمایا ہے إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ، یعنی اس عام انسانی کمزوری سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن میں دو صفتیں پائی جائیں، ایک صبر، دوسرے عمل صالح۔

لفظ صبر عربی زبان میں اردو محاورہ سے بہت عام معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اصلی معنی لفظ صبر کے باندھنے اور روکنے کے ہیں، قرآن و سنت کی اصطلاح میں نفس کو اس کی ناجائز خواہشات سے روکنے کا نام صبر ہے، اس لئے مفہوم صبر میں تمام گناہوں اور خلافِ شرع کاموں سے پرہیز آگیا، اور عمل صالح میں تمام فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات آگئے، معنی یہ ہو گئے کہ اس عام انسانی کمزوری سے وہ لوگ بچے رہیں گے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان اور حساب قیامت کے خوف کی وجہ سے ہر ایسی چیز سے پرہیز کرتے رہیں جو اللہ و رسول کو ناپسند ہے اور ہر ایسے عمل کی طرف دوڑیں جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوں۔

اسی آیت کے آخر میں ان کامل انسانوں کا جملہ اور جزاء بھی یہ بتلانی گئی ہے کہ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ یعنی ایسے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ان کی خطائیں بخشتی جائیں گی اور ان کے نیک عمل کا بہت بڑا بدلہ ان کو ملے گا۔

اس جگہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ دنیا کی نعمت اور کلفت دونوں کے بارے میں قرآن کریم نے اذقنا یعنی چکھانے کا لفظ استعمال کر کے اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اصل نعمت اور کلفت آخرت کی ہے، دنیا میں نہ راحت مکمل ہے نہ کلفت بلکہ جکھنے اور نمونہ کے درجہ میں ہے تاکہ انسان کو آخرت کی نعمتوں اور تکلیفوں کا کچھ اندازہ ہو سکے، اس لئے بھی دنیا کی نہ راحت کچھ زیادہ خوش ہونے کی چیز ہے نہ مصیبت کچھ زیادہ غم کرنے کی، اگر غور کرو تو آج کل کی اصطلاح میں یہ ساری دنیا آخرت کا شوروم ہے جس میں راحت و کلفت کے صرف نمونے رکھے ہیں۔

چوتھی آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، واقعہ یہ تھا کہ مشرکین مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مختلف قسم کی فرمائشیں پیش کیں ایک یہ کہ اس قرآن میں ہمارے بتوں کو بُرا کہا گیا ہے اس لئے ہم اس پر ایمان نہیں لا سکتے، اس لئے یا تو آپ کوئی دوسرا قرآن لائیں یا اسی میں بدل کر ترمیم کر دیں، اِنَّتَ بِقُرْآنٍ غَیْرِ هَٰذَا اَوْ بَدِّلْہُ (یعنی بظہری) دوسرے یہ کہ ہم آپ کے رسول ہونے پر حیب یقین کریں کہ یا تو دنیا کے بادشاہوں کی طرح آپ پر کوئی خزانہ نازل ہو جائے جس سے سب کو بخشش کریں، یا پھر کوئی فرشتہ آسمان سے

آجائے وہ آپ کے ساتھ یہ تصدیق کرتا پھرے کہ بیشک یہ اللہ کے رسول ہیں۔
 رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی لغو و بیہودہ فرمائشوں سے دل تنگ ہوتے، کیونکہ رحمۃ
 للعالمین سے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں، ان کے ایمان لانے کی فکر کو دل
 سے نکال دیں، اور نہ یہ ممکن تھا کہ ان کی بے ہودہ فرمائشوں کو پورا کریں، کیونکہ اول تو یہ فرمائشیں نری
 بے عقلی پر مبنی ہیں، بت اور بت پرستی اور دوسری بُری چیزوں کو برا نہ کہا جائے تو ہدایت کیسے ہو
 اور خزانہ کا نبوت کے ساتھ کیا ہوڑ، ان لوگوں نے نبوت کو بادشاہت پر تمیاس کر لیا، اسی طرح
 اللہ تعالیٰ کا یہ دستور نہیں کہ ایسی حالت پیدا کریں کہ لوگ ایمان لانے پر مادی طور سے مجبور
 ہو جائیں، ورنہ سارا جہاں اس کے قبضہ قدرت میں ہے کسی کی کیا مجال تھی کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی
 کے خلاف کوئی معقیدہ یا عمل رکھ سکتا، مگر اس نے اپنی حکمت بالغہ سے اس دنیا کو دارالامتحان
 بنایا ہے، یہاں کسی نیکی پر عمل یا بدی سے پرہیز پر مادی اسباب کے ذریعہ کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا
 البتہ آسمانی کتابوں اور رسولوں کے ذریعہ نیک و بد اور اچھے بُرے کا امتیاز اور ان کے نتائج بتلا کر
 نیکی پر عمل اور بدی سے پرہیز پر آمادہ کیا جاتا ہے، اگر رسول کے ساتھ معجزانہ طور پر کوئی فرشتہ اس
 کے قول کی تصدیق کے لئے مامور ہوتا اور جب کوئی نہ مانتا تو اسی وقت اس کو نقد عذاب کا
 سامنا ہوتا تو یہ ایمان پر مجبور کرنے کی ایک صورت ہوتی نہ اس میں ایمان بالغیب رہتا جو ایمان
 کی اصل رُوح ہے اور نہ انسان کا اپنا کوئی اختیار رہتا جو اس کے عمل کی روح ہے اور علاوہ اس
 کے کہ ان کی فرمائشیں لغو اور بے ہودہ تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی فرمائشیں
 کرنا خود اس کی دلیل تھی کہ یہ لوگ رسول و نبی کی حقیقت کو نہیں پہچانتے، رسول اور خدا میں کوئی
 فرق نہیں کرتے، رسول کو خدا تعالیٰ کی طرح قادر مطلق سمجھتے ہیں اسی لئے اُس سے ایسے کاموں
 کی فرمائش کرتے ہیں جو اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔

غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ایسی فرمائشوں سے سخت دلگیر اور دلتنگ ہو گئے
 تو آپ کی تسلی اور ان کے خیالات کی اصلاح کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، جس میں پہلے آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ کیا آپ ان کے کہنے سے مجبور ہو کر اللہ کے بھیجے ہوئے
 قرآن کا کوئی حصہ پھوڑ دیں گے جس سے یہ لوگ ناخوش ہوتے ہیں مثلاً جس میں بتوں کی مجبوری
 و بیکسی اور کسی چیز پر قادر نہ ہونے کا بیان ہے، اور کیا آپ ان کی ایسی فرمائشوں سے دلتنگ
 ہو جائیں گے، یہاں لفظ لَعَلَّتْ سے اس مضمون کو تعبیر کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ فی الواقع آپ
 کے بارے میں ایسا گمان ہو سکتا تھا، بلکہ مقصود آپ کا ان چیزوں سے بری ہونا بیان کرنا ہے،
 کہ آپ نہ قرآن کا کوئی حصہ ان کی رعایت سے پھوڑ سکتے ہیں اور نہ آپ کو ان کی فرمائشوں سے

دلتنگی ہوتی چاہئے، کیونکہ آپ تو اللہ کی طرف سے نذیر یعنی ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے ہیں اور سب کاموں کو سرانجام دینا تو اللہ ہی کی قدرت میں ہے، ڈرانے والے کی تخصیص مخاطب کی خصوصیت کی وجہ سے کی گئی کیونکہ یہ کافر تو ڈرانے ہی کے مستحق ہیں ورنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے نذیر یعنی ڈرانے والے ہیں ایسے ہی بشیر یعنی نیک لوگوں کو خوشخبری سنانے والے بھی ہیں، اس کے علاوہ نذیر درحقیقت اُس ڈرانے والے کو کہتے ہیں جو شفقت و محبت کی بناء پر خراب اور مضر چیزوں سے ڈرانے، اس لئے نذیر کے مفہوم میں بشیر کا مفہوم بھی ایک حیثیت سے شامل ہے۔

آیات مذکورہ میں مشرکین کی طرف سے خاص قسم کے معجزات کا مطالبہ تھا، اگلی آیتوں میں ان کو اس بات سے آگاہ کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرآن ایک ایسا معجزہ تمہارے سامنے آچکا ہے جس کے معجزہ ہونے کا تم بھی انکار نہیں کر سکتے، تو اگر یہ معجزات کا مطالبہ نیک نیتی سے رسول کی سچی حقانیت معلوم کرنے کے لئے ہے تو وہ پورا ہو چکا اور اگر محض عناد کے لئے ہے تو اگر تمہارے مطلوبہ معجزات بھی دکھلا دیئے جائیں تو اہل عناد سے کیا توقع ہے کہ اُن کو دیکھ کر بھی وہ اسلام قبول کریں گے، بہر حال قرآن کریم کا واضح معجزہ ہونا ناقابل انکار ہے۔ اس پر مشرکین و کفار کی طرف سے جو غلط شبہات پیدا کئے گئے ان کی تردید اگلی دو آیتوں میں اس طرح کی گئی ہے کہ یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ قرآن کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنالیا، اللہ کا کلام نہیں۔

اس کے جواب میں فرمایا کہ اگر تمہارا ایسا ہی خیال ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسا قرآن خود بنا سکتے ہیں تو تم بھی اُس جیسی صرف دس سورتیں ہی بنا کر دکھا دو، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ دس سورتیں کوئی ایک ہی آدمی بنائے بلکہ دنیا جہان کے لوگ سب مل کر بھی بنالائیں، اور جب وہ دس سورتیں بنانے سے بھی عاجز ہوں تو آپ فرما دیجئے کہ اب تو حقیقت واضح ہو گئی کیونکہ اگر یہ قرآن کسی انسان کا کلام ہوتا تو دوسرے انسان بھی اس جیسا کلام بنا سکتے، اور سب کا عاجز ہونا اس کی قوی دلیل ہے کہ یہ قرآن اللہ ہی کے علم سے نازل ہوا ہے جس میں کسی ادنیٰ کمی بیشی کی گنجائش نہیں اور انسانی طاقت سے برتر ہے۔

قرآن کریم نے اس جگہ دس سورتیں مقابلہ میں بنا کر لانے کا ارشاد فرمایا ہے اور دوسری ایک آیت میں یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ ایک ہی سورت اس جیسی بنالائے؛

وجہ یہ ہے کہ پہلے دس سورتیں بنانے کا حکم دیا گیا، جب وہ اس سے عاجز ہو گئے تو پھر اُن کے عاجز ہونے کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے سورۃ بقرہ کی آیت میں فرمایا کہ اگر تم قرآن کو کسی انسان

کلام سمجھتے ہو تو تم بھی زیادہ نہیں صرف ایک ہی سورت اس جیسی بنالاولہ، مگر وہ قرآن کریم کی اس تحدیٰ اور ان کے لئے انتہائی آسانی کر دینے کے باوجود کچھ نہ کر سکے تو قرآن کریم کا معجزہ ہونا اور بلاشبہ اللہ کا کلام ہونا ثابت ہو گیا، اسی لئے آخر میں فرمایا **فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ**، یعنی کیا تم اب بھی مسلمان اور اطاعت گزار ہو گے، یا اسی خواب غفلت میں رہو گے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزَيْنَتَهَا نُوفٍ اِلَيْهِمْ اَعْمَالُهُمْ

جو کوئی چاہے دنیا کی زندگانی اور اس کی زینت بھگتادیں گے ہم ان کو ان کے عمل

فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُنْجِسُونَ ۝۱۵ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي

دنیا میں اور ان کو اس میں کچھ نقصان نہیں ، یہی ہیں جن کے واسطے کچھ نہیں آخرت

الْآخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبِطُلُ مَا كَانُوا

میں آگ کے سوا ، اور برباد ہوا جو کچھ کیا تھا یہاں اور خراب گیا جو

يَعْمَلُونَ ۝۱۶ اَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ

کہا یا تھا ، بھلا ایک شخص جو ہے صاف رستہ پر اپنے رب کے اور اس کے ساتھ ساتھ ہے ایک گواہ

مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهِ كُتِبَ مُوسٰى اِمَامًا وَرَحْمَةً اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُونَ

اللہ کی طرف سے اور اس سے پہلے گواہ تھی موسیٰ کی کتاب رستہ بتاتی اور بخشواقی (اوروں کی برابر ہے)۔ یہی لوگ مانتے ہیں

يَهٗ ۖ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالْنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَلِكُ

قرآن کو ، اور جو کوئی منکر ہو اس سے سب فرقوں میں سے سودوزخ ہے ٹھکانہ اس کا ، سو تو مت رہ

فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ اِنَّهُ الْحَقُّ مِّنْ رَبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ

شہ میں اس سے ، بیشک وہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے اور پر بہت سے لوگ

لَا يُؤْمِنُونَ ۝۱۷

یقین نہیں کرتے۔

خلاصہ تفسیر

جو شخص (اپنے اعمال خیر سے محض حیاتِ دنیوی کی منفعت) اور اس کی رونق (حاصل کرنا، چاہتا ہے) جیسے شہرت و نیک نامی و جاہ اور ثوابِ آخرت حاصل کرنے کی اس کی نیت نہ ہو، تو ہم ان لوگوں کے (ان) اعمال کی جزاء ان کو دنیا ہی میں پورے طور سے بھگتادیتے ہیں اور ان

کے لئے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی یعنی دنیا ہی میں ان کے اعمال کے عوض ان کو نیک نامی اور صحت و قرآن عیش و کثرت اموال و اولاد غنایت کر دیا جاتا ہے جب کہ ان کے اعمال کا اثر ان کے اضرار پر غالب ہو اور اگر اضرار غالب ہوں تو پھر یہ اثر نہیں مرتب ہوتا، یہ تو دنیا میں ہوا رہا آخرت میں، سو یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ (ثواب وغیرہ) نہیں اور انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب (کا سب) ناکارہ (ثابت) ہو گا اور (واقع میں تو) جو کچھ کر رہے ہیں وہ (اب بھی) بے اثر ہے (بوجہ فساد نیت کے مگر صورت ظاہری کے اعتبار سے ثابت سمجھا جاتا ہے) آخرت میں یہ ثبوت بھی زائل ہو جاوے گا، کیا منکر قرآن ایسے شخص کی برابری کر سکتا ہے جو قرآن پر قائم ہو جو کہ اس کے رب کی طرف سے آیا ہے اور اس (قرآن) کے ساتھ ایک گواہ تو اسی میں موجود ہے یعنی اس کا معجز ہوتا ہو کہ دلیل عقلی ہے، اور (ایک) اس سے پہلے (یعنی) موسیٰ (علیہ السلام) کی کتاب (یعنی تورات) اس کے ساتھ شہادت کے لئے موجود ہے جو کہ (احکام بتلانے کے اعتبار سے) امام ہے اور (احکام پر جو ثمرہ و ثواب ملے گا اس کے اعتبار سے وہ کتاب سبب رحمت ہے) اور یہ دلیل نقلی ہے، غرض قرآن کے صدق و صحت کے لئے عقلی اور نقلی دونوں دلیلیں موجود ہیں پس ان ہی دلائل کے سبب، ایسے لوگ (جن کا ذکر ہوا کہ وہ صاحب بتینہ ہیں) اس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں اور (کافر کا یہ حال ہے کہ) جو شخص دوسرے فرقوں میں سے اس قرآن کا انکار کرے گا تو دوزخ اس کے وعدہ کی جگہ ہے (پھر منکر قرآن مصدق قرآن کے برابر کب ہوا، سو اے مخاطب، تم قرآن کی طرف سے شک میں مت پڑنا بلا شک و شبہ وہ سچی کتاب ہے تمہارے رب کے پاس سے (آئی ہے) لیکن (یا وجودان دلائل کے غضب ہے کہ بہت سے آدمی ایمان نہیں لاتے۔

معارف و مسائل

مخالفین اسلام کو جب عذاب کی وعیدیں سنائی جاتیں تو وہ اپنی خیرات و صدقات اور خدمت خلق و رفاہ عام کے کاموں کو سند میں پیش کرتے تھے کہ ہم ایسے نیک کام کرتے ہیں پھر ہم کو عذاب کیسا؟ اور آج تو بہت ناواقف مسلمان بھی اس شبہ میں گرفتار نظر آتے ہیں کہ جو کافر ظاہری اعمال و اخلاق درست رکھتے ہیں، خلق خدا کی خدمت اور خیرات و صدقات کرتے ہیں، سرکاری، پبلک شفا خانے، پانی کی سبیلیں بناتے اور چلاتے ہیں ان کو مسلمانوں سے اچھا جانتے ہیں، مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔

خلاصہ جواب کا یہ ہے کہ ہر عمل کے مقبول اور باعث نجات آخرت ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ عمل اللہ کے لئے کیا گیا ہو، اور اللہ کے لئے کرنا وہی معتبر ہے جو اس کے رسول کے بتلائے ہوئے

طریقہ پر کیا گیا ہو، جو شخص اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان ہی نہیں رکھتا اس کے تمام اعمال و اخلاق ایک بے روح ڈھانچہ ہے جس کی شکل و صورت تو اچھی بھلی ہے مگر روح نہ ہونے کی وجہ سے دائرِ آخرت میں اس کا کوئی وزن اور اثر نہیں، البتہ دنیا میں چونکہ اُس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور ظاہری صورت کے اعتبار سے وہ نیک عمل ہے اس لئے اللہ جل شانہ نے اپنے کمالِ عدل و انصاف کی بناء پر اس عمل کو بھی بالکل ضائع نہیں قرار دیا بلکہ اس کے کرنے والے کے پیش نظر جو مقصد تھا کہ دنیا میں اس کی عزت ہو لوگ اس کو سخی، کریم، بڑا آدمی سمجھیں، دنیا کی دولت، تندرستی اور راحت نصیب ہو، اللہ تعالیٰ اُس کو یہ سب کچھ دنیا میں دیدیتے ہیں، آخرت کا تصور اور وہاں کی نجات اس کے پیش نظر ہی نہ تھی اور نہ اس کا بے روح عمل وہاں کی نعمتوں کی قیمت بن سکتا تھا اس لئے ان اعمال کا وہاں کچھ عوض نہ ملے گا اور کفر و معصیت کی وجہ سے جہنم میں رہے گا، یہ خلاصہ مضمون ہے پہلی آیت کا، اب اس کے الفاظ کو دیکھئے۔

ارشاد ہے کہ جو شخص صرف دنیا کی زندگی اور اس کی رونق ہی کا ارادہ کرتا رہا تو ہم اس کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں پورا دیدیتے ہیں، اُن کے لئے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی، یہ ایسے لوگ ہیں کہ اُن کے لئے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ نہیں۔

یہاں یہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ قرآن میں اس جگہ صَنْ ارَادَ کا مختصر لفظ پھوڑ کر مَنَّ گانِ یُرِیدُ کا لفظ اختیار فرمایا ہے جو دوام و استمرار پر دلالت کرتا ہے جس کا ترجمہ ارادہ کرتا رہا، کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ حال صرف ایسے لوگوں کا ہے جو اپنے اعمال و حسنات سے صرف دنیا ہی کا فائدہ چاہتے رہے کبھی آخرت کی فکر ہی نہ ہوئی، اور جو شخص آخرت کی فکر اور وہاں کی نجات کے لئے عمل کرتا رہا پھر اس کے ساتھ کچھ دنیا کا بھی ارادہ کر لے تو وہ اس میں داخل نہیں۔

ائمہ تفسیر کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ آیت کفار کے حق میں آئی ہے یا مسلمانوں کے، یا مسلم و کافر دونوں سے متعلق ہے؟

آیت کے آخری جملہ میں جو الفاظ آئے ہیں کہ آخرت میں ان کے لئے بجز دوزخ کے کچھ نہیں، اس سے ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار ہی کے متعلق ہے کیونکہ مسلمان بکتنا ہی گناہگار ہو، گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد آخر کار جنت میں جائے گا، اسی لئے ضحاک وغیرہ مفسرین نے اس کو کفار ہی کے متعلق قرار دیا ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو اپنے نیک اعمال سے صرف دنیا کی بھلائی، راحت، دولت، عزت کے طلبکار ہیں، نیک عمل اسی نیت سے کرتے ہیں کہ دنیا میں عزت و راحت ملے، اور مذکورہ جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اپنے اعمال بد کی سزا نہ بھگت لیں گے

اس وقت تک ان کو بجز دوزخ کے کچھ نہ ملے گا۔

اور زیادہ راجح اور واضح بات یہ ہے کہ یہ آیت اُن لوگوں سے متعلق ہے جو اپنے اعمال صالحہ کو صرف دنیا کے فوائد دولت، عزت، صحت وغیرہ کی نیت سے کرتے ہیں خواہ ایسا کرنے والے کافر ہوں جو آخرت کے قائل ہی نہیں، یا مسلمان ہوں جو زبان سے آخرت کے قائل ہیں مگر عمل میں اس کی فکر نہیں رکھتے، بلکہ ساری فکر دنیا ہی کے فوائد سے وابستہ رکھتے ہیں، حضرات مفسرین میں سے مجاہد، میمون بن مہران، معاویہ رضی اللہ عنہم نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث **لَا تَمْنَا الْآعْمَالُ بِالْآخِرَاتِ** سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے کہ جو شخص اپنے عمل میں جس چیز کی نیت کرتا ہے، اس کو وہی ملتی ہے، جو دنیا کی نیت کرتا ہے اس کو دنیا ملتی ہے، جو آخرت کی نیت کرتا ہے آخرت ملتی ہے، جو دونوں کی نیت کرتا ہے اس کو دونوں ملتی ہیں، تمام اعمال کا مدار نیت پر ہونا ایک ایسا اصول ہے جو ہر ملت و مذہب میں تسلیم کیا گیا ہے۔ (قطبی)

اسی لئے ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز ان لوگوں کو لایا جائے گا جو دنیا میں عبادت اس لئے کرتے تھے کہ لوگوں کی نظر میں ان کی عزت ہو، ان سے کہا جائے گا کہ تم نے نماز پڑھی، صدقہ خیرات کیا، جہاد کیا، قرآن کی تلاوت کی مگر یہ سب اس نیت سے کیا کہ تم نمازی اور سخی اور غازی اور قاری کہلاؤ تو جو تم چاہتے تھے وہ تمہیں مل گیا، دنیا میں تمہیں یہ خطابات مل چکے اب یہاں تمہارے ان اعمال کا کوئی بدلہ نہیں اور سب سے پہلے جہنم میں ان لوگوں کو ڈالا جائے گا۔

حضرت ابو ہریرہؓ یہ حدیث نقل کر کے روپڑے اور فرمایا کہ قرآن کریم کی آیت **مَنْ كَانَ يُؤِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَنَسَى الْآخِرَةَ** سے اس حدیث کی تصدیق ہوتی ہے۔

صحیح مسلم میں بروایت انسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتے، مؤمن جو نیک کام کرتا ہے اُس کو دنیا میں بھی کچھ بدلہ ملتا ہے اور آخرت میں ثواب ملتا ہے، اور کافر چونکہ آخرت کی فکر ہی نہیں رکھتا اس لئے اُس کا حساب دنیا ہی میں بھگتا دیا جاتا ہے، اس کے نیک اعمال کے بدلہ میں دنیا کی دولت، عزت، صحت، راحت اس کو دیدی جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچتا ہے تو اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا جس کا معاوضہ وہاں پائے۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ مؤمن اگرچہ دنیا کی فلاح کا بھی خواہش مند ہوتا ہے مگر آخرت کا ارادہ غالب رہتا ہے اس لئے اس کو دنیا میں بقدر ضرورت ہی ملتا ہے اور بڑا معاوضہ آخرت میں پاتا ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر حاضر ہوئے تو

سارے گھر میں چنگنی چینی چیزوں کے ہوا کچھ نہ دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو بھی دنیا کی وسعت عطا فرمادیں، کیونکہ ہم فارس و روم کو دیکھتے ہیں وہ دنیا میں بڑی وسعت اور فراخی میں ہیں حالانکہ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر سے کمر لگائے ہوئے تھے، حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ سن کر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا، اے عمر! تم اب تک اسی خیال میں پڑے ہو، یہ تو وہ لوگ ہیں جن کی نیکیوں کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیا گیا ہے۔ (منظہری)

جامع ترمذی اور مسند احمد میں بروایت انسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی نیت اپنے اعمال میں طلب آخرت کی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ دنیا میں اس کے دل کو غنی کر دیتے ہیں اور اس کی ضروریات کو پورا فرمادیتے ہیں اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے، اور جس شخص کی نیت طلب دنیا کی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ محتاجی اس کے سامنے کر دیتے ہیں کہ اس کی حاجت کبھی پوری ہی نہیں ہوتی کیونکہ ہوس دنیا اس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی ایک حاجت پوری ہونے سے پہلے دوسری حاجت سامنے آ جاتی ہے اور بے شمار فکریں اس کو لگ جاتی ہیں اور ملتا صرف وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے لکھ دیا ہے۔

آیت مذکورہ میں جو یہ ارشاد ہوا ہے کہ دنیا کا ارادہ کرتے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دنیا ہی میں پورا دیدیا جاتا ہے، اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں کہ باوجود دنیا کا ارادہ کرنے اور کوشش کرنے کے دنیا میں بھی ان کا مطلب پورا نہیں ہوتا اور بعض دفعہ کچھ بھی نہیں ملتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت میں اس جگہ اجمال ہے اس کی پوری تفصیل سورۃ اشراء کی اس آیت میں ہے، جس میں فرمایا، مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِلْمَنْ يُرِيدُ، یعنی جو شخص دنیا ہی کا ارادہ کرتا رہتا ہے ہم اس کو دنیا ہی میں نقد دیدیتے ہیں مگر یہ دنیا دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے، اول یہ کہ جس قدر دینا چاہیں اتنا ہی دیتے ہیں ان کی مانگ طلب کے برابر دینا ضروری نہیں، دوسرے یہ کہ صرف اسی شخص کو دیتے ہیں جس کو دینا بتقاضا تے حکمت مناسب سمجھتے ہیں ہر ایک کو دینا ضروری نہیں۔

دوسری آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین مخلصین کا حال ان لوگوں کے مقابلہ میں پیش کیا گیا جن کا مبلغ علم اور منتہائے مقصود صرف دنیا ہے تاکہ دنیا دیکھ لے کہ یہ دو گروہ برابر نہیں ہو سکتے، پھر ان کا یہ حال بیان کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا تمام عالم انسان کے لئے قیامت تک عام ہوتا، اور جو شخص آپ پر ایمان نہ لائے خواہ اعمال کچھ بھی کرے اس کا گمراہ اور جہنمی ہونا بیان فرمایا ہے۔

پہلے جملہ میں فرمایا کہ کیا منکر قرآن ایسے شخص کی برابری کر سکتا ہے جو قرآن پر قائم ہو جو کہ اُس کے رب کی طرف سے آیا ہے اور اس کے ساتھ ایک گواہ تو اسی میں موجود ہے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب گواہ ہے، جو قابل اقتداء اور لوگوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجی گئی تھی۔

اس آیت میں بَیِّنۃ سے مراد قرآن ہے اور شاہد کے معنی میں ائمہ تفسیر کے مختلف اقوال ہیں، بیان القرآن میں حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس کو اختیار کیا ہے کہ شاہد سے مراد وہ اعجاز قرآنی ہے جو خود قرآن میں موجود ہے، تو معنی یہ ہو گئے کہ وہ لوگ جو قرآن پر قائم ہیں اور ان کے پاس قرآن کی حقانیت کا ایک گواہ تو خود قرآن میں موجود ہے یعنی اس کا اعجاز اور دوسرا گواہ اس سے پہلے بصورت تورات آپکا ہے جو موسیٰ علیہ السلام لوگوں کے لئے قابل اقتداء اور رحمت حق کی حیثیت سے لائے تھے کیونکہ تورات میں قرآن کریم کا حق ہونا واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

دوسرے جملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کو قیامت تک مدارِ نجات قرار دینے کا بیان اس طرح فرمایا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب اور ملتوں میں سے جو شخص بھی آپ کا انکار کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ جو یہودی یا نصرانی میری دعوت کو مسنے اور اس کے باوجود میری لائی ہوئی تعلیمات پر ایمان نہ لائے تو وہ اہل جہنم میں سے ہوگا۔ اس سے ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جانی چاہئے جو بہت سے یہود و نصاریٰ یا دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے بعض ظاہری اعمال کی بناء پر ان کو حق پر کہتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان کے بغیر صرف ظاہری اعمال کو نجات کے لئے کافی سمجھتے ہیں، یہ قرآن مجید کی آیت مذکورہ اور حدیث کی اس صحیح روایت سے کھلا تصادم ہے۔ وَالْعِيَاذُ بِاللّٰهِ

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۖ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو باندھے اللہ پر جھوٹ وہ لوگ روئے آئیں گے اپنے

سَرَبِّهِمْ وَيَقُولُ ۖ أَلَا شَٰهَدَةُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ؕ ۚ أَلَا

رب کے اور کہیں گے گواہی دینے والے یہی ہیں جنہوں نے جھوٹ کہا تھا اپنے رب پر سن لو

لَعَنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٨﴾ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ

پھٹکار ہے اللہ کی نا انصاف لوگوں پر جو کہ روکتے ہیں اللہ کی راہ سے

وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا ۖ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿١٩﴾ أُولَٰئِكَ

اور ڈھونڈتے ہیں اس میں کمی، اور وہی ہیں آخرت سے منکر وہ لوگ

لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ

نہیں تھکانے والے زمین میں بھاگ کر اور نہیں ان کے واسطے اللہ کے سوا

مِنْ أَوْلِيَاءَ مَيُضَعِفُ لَهُمُ الْعَذَابُ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ

کوئی حمایتی دوتا ہے ان کے لئے عذاب نہ طاقت رکھتے تھے

السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ۲۰ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ

سُننے کی اور نہ دیکھتے تھے ، وہی میں جو کھو بیٹھے اپنی جان

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۲۱ لَا جَزَاءَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ

اور کم ہو گیا ان سے جو بھوٹ باندھا تھا ، اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ آخرت میں

هُمْ الْآخِسِرُونَ ۲۲ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَ

بہی ہیں سب سے زیادہ نقصان میں ، البتہ جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے نیک اور

أَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ ۲۳ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۲۴

عاجزی کی اپنے رب کے سامنے وہ ہیں جنت کے رہنے والے وہ اسی میں رہا کریں گے ،

مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصْمَىٰ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ ۲۵ هَلْ

مثال ان دونوں فرقوں کی جیسے ایک تو اندھا اور بہرا اور دوسرا دیکھتا اور سُنتا ، کیا

يَسْتَوِينَ مَثَلًا ۲۶ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۲۷

برابر ہے دونوں کا حال ، پھر کیا تم غور نہیں کرتے ۔

خلاصہ تفسیر

اور ایسے شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے کہ اس کی توحید کا اسکے رسول کی رسالت کا اور اس کے کلام ہونے کا انکار کرے ، ایسے لوگ (قیامت کے روز) اپنے رب کے سامنے (مغتسری ہونے کی حیثیت سے) پیش کئے جائیں گے اور (اعمال کے) گواہ فرشتے (علی الاعلان) یوں کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اپنے رب کی نسبت جھوٹی باتیں لگائی تھیں ، سب سُن لو کہ ایسے ظالموں پر خدا کی (زیادہ) لعنت ہے جو کہ (اپنے کفر و ظلم کے ساتھ) دوسروں کو بھی خدا کی راہ (یعنی دین) سے روکتے تھے اور اس (راہ دین) میں کجی (اور شبہات) نکالنے کی تلاش (اور فکر) میں رہا کرتے تھے (تاکہ دوسروں کو گمراہ کریں) اور آخرت کے بھی منکر تھے (یہ فرشتوں کے اعلان کا مضمون تھا، آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ، یہ لوگ اتمام زمین

(کے تختہ پر ابھی) خدا تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے تھے (کہ کہیں جا چھپتے اور خدا تعالیٰ کے ہاتھ نہ آتے) اور نہ ان کا خدا کے سوا کوئی مددگار ہوا (کہ بعد گرفتاری کے چھڑا لیتا) ایسوں کو (اوروں سے) دونی سزا ہوگی (ایک کافر ہونے کی اور ایک دوسروں کو کافر بنانے کی کوشش کرنے کی یہ لوگ) (مارے نفرت کے احکام الہی کو) سن نہ سکتے تھے اور نہ (قایتِ عناد سے) راہ حق کو دیکھتے تھے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو برباد کر بیٹھے اور جو معبود انہوں نے تراش رکھے تھے (آج) ان سے سب غائب (اور کم) ہو گئے (کوئی بھی تو کام نہ آیا پس) (لازمی بات ہے کہ آخرت میں سب سے زیادہ خسارہ میں یہی لوگ ہوں گے) (یہ تو انجام ہوگا کافروں کا آگے مسلمانوں کا انجام مذکور ہے کہ) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کئے اور (دل سے) اپنے رب کی طرف بھکے (یعنی انقیاد اور خشوع دل میں پیدا کیا) ایسے لوگ اہل جنت ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ رہا کریں گے (یہ دونوں کے انجام کا تفاوت بیان ہو گیا، آگے تفاوت حال کی مثال ہے جس پر انجام کا تفاوت مرتب ہوتا ہے پس ارشاد ہے کہ) (دونوں فرق) (مذکورین یعنی مؤمن و کافر) کی حالت ایسی ہے جیسے ایک شخص ہوا اندھا بھی ہو اور بہرا بھی (جو نہ عبارت کو سنے نہ اشارہ کو دیکھے تو اسکے سمجھنے کی عادت کوئی صورت ہی نہیں) اور ایک شخص ہو جو دیکھتا بھی ہو اور سنتا بھی ہو (اُس کو سمجھنا بہت آسان ہو) کیا یہ دونوں شخص حالت میں برابر ہیں (ہرگز نہیں) یہی حالت کافر اور مسلمان کی ہے کہ وہ ہدایت سے بہت دُور ہے اور یہ ہدایت سے موصوف ہے (کیا تم (اس فرق کو) سمجھتے نہیں (ان دونوں میں فرق بدیہی ہے اس میں شبہ کی گنجائش نہیں)

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٣٥﴾ أَنْ لَا تَعْبُدُوا

اور ہم نے بھیجا نوع کو اس کی قوم کی طرف کہ میں تم کو ڈر کی بات سنانا ہوں کھول کر کہ نہ پرستش کرو

إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ إِلِيمٍ ﴿٣٦﴾ فَقَالَ الْمَلَأُ

اللہ کے سوا میں ڈرتا ہوں تم پر دردناک دن کے عذاب سے ، پھر بولے سردار

الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا تَرِكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا وَمَا تَرِكَ

جو کافر تھے اس کی قوم کے ہم کو تو تو نظر نہیں آتا مگر ایک آدمی ہم جیسا اور دیکھتے نہیں

اَتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُوا بِادِّی الرَّأْيِ وَمَا تَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا

کوئی تاج ہوا ہو تیرا مگر جو ہم میں نیچ قوم ہے بلا تامل اور ہم نہیں دیکھتے تم کو اوپر اپنے

مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَنْظُرُكُمْ كَذِبِينَ ﴿٣٧﴾ قَالَ يَقَوْمِ أَمْرٌ يُتِمُّ رَأْسَ

کچھ بڑائی بلکہ ہم کو تو خیال ہے کہ تم سب جھوٹے ہو بولا اے قوم دیکھو تو اگر

كُنْتُ عَلَىٰ بَيْتِنَا مِّنْ رَبِّي وَاسْتَدْنِي رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهِ فَعَمِيتُ

میں ہوں صاف راستہ پر اپنے رب کے اور اس نے بھیجی مجھ پر رحمت اپنے پاس سے پھر اسکو

عَلَيْكُمْ ۖ اَنْذَرْتُكُمْ مَوْتَهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كِرْهُوْنَ ۙ (۲۸) وَلَقَوْمٌ لَا

تمہاری آنکھ سے غشی رکھا، تو کیا تم تم کو مجبور کر سکتے ہیں اس پر اور تم اس سے بیزار ہو ، اور اسے میری قوم

اَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَا لَا طَانَ اَجْرِي اِلَّا عَلَى اللَّهِ وَمَا اَنَا بِطَارِدٍ

نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ مال ، میری مزدوری نہیں مگر اللہ پر اور میں نہیں ہانکنے والا

الَّذِينَ اٰمَنُوا اِنَّهُمْ مُّٰلِكُوْا اَسْرٰٓئِيْلِهِمْ وَلٰكِنِّي اَسْأَلُكُمْ قَوْمًا

ایمان والوں کو ان کو ملتا ہے اپنے رب سے لیکن میں دیکھتا ہوں تم لوگ

تَجْهَلُوْنَ ۙ (۲۹) وَلَقَوْمٌ مِّنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللَّهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۖ

جاہل ہو اور اسے قوم کون چھڑائے مجھ کو اللہ سے اگر ان کو ہانک دوں

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۙ (۳۰) وَلَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِندِيْ خَزَاۤئِنُ اللّٰهِ وَلَا

کیا تم دھیان نہیں کرتے اور میں نہیں کہتا تم کو کہ میرے پاس ہیں خزانے اللہ کے اور نہ

اَعْلَمُ الْغَيْبِ وَلَا اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ ۙ وَلَا اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ شَرَدَرُوْا

میں خبر رکھوں غیب کی اور نہ کہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ کہوں گا کہ جو لوگ تمہاری آنکھ میں

اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۙ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِىْ اَنْفُسِهِمْ ۖ

تھیریں نہ دے گا ان کو اللہ بھلائی ، اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے جی میں ہے

اِنِّيْٓ اِذَا لَمِيتُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ (۳۱) قَالُوْا يٰنُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَاكْثَرْتَ

یہ کہوں تو میں بے انصاف ہوں ، بولے اسے نوح تو نے ہم سے جھگڑایا اور بہت

جِدَّالْنَا فَاٰتِنَا بِمَا تَعِدُنَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۙ (۳۲) قَالَ

جھگڑ چکا اب لے آ جو تو وعدہ کرتا ہے ہم سے اگر تو سچا ہے ، کہا کہ

اِنَّهَا يٰۤاَيُّهَا اللّٰهُ اِنْ شَاءَ وَمَا اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۙ (۳۳) وَلَا

لائے گا تو اس کو اللہ ہی اگر چاہے گا اور تم نہ تمہکا سکو گے بھاگ کر ، اور نہ

يَنْفَعُكُمْ نَصِيْحَتِيْ اِنْ اَسْرَدْتُ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ

کارگر ہوگی تم کو میری نصیحت جو چاہوں کہ تم کو نصیحت کروں اگر اللہ چاہتا ہوگا

أَنْ يُغَوِّيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۳۳﴾ أَمْ يَقُولُونَ

کہ تم کو گمراہ کرے وہی ہے رب تمہارا اور اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے ، کیا کہتے ہیں کہ

افْتَرَيْنَاهُ قُلُوبًا إِنَّا افْتَرَيْنَاهُ فَعَلَىٰ حُبِّرَانِ وَأَنَا بَرِيءٌ وَمِمَّا

بتالایا قرآن کو کہہ دے اگر میں بتالایا ہوں تو مجھ پر ہے میرا گناہ اور میرا ذمہ نہیں ہو

تُجْرِمُونَ ﴿۳۴﴾

تم گناہ کرتے ہو ۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کے پاس رسول بنا کر دیہ پیغام دے کر بھیجا کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت مت کرو اور جو بت تم نے قرار دے رکھے ہیں، وڈ اور شواہ اور یغوث اور یعوق اور نسر کو چھوڑ دو، چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے جا کر ان سے فرمایا کہ میں تم کو (در صورت عبادت غیر اللہ کے) صاف صاف ڈراتا ہوں (اور اس ڈرانے کی تفصیل یہ ہے کہ) میں تمہارے حق میں ایک بڑے تکلیف دینے والے دن کے عذاب کا اندیشہ کرتا ہوں سو ان کی قوم میں جو کافر سردار تھے وہ (جواب میں) کہنے لگے کہ (تم جو نبوت کا دعویٰ کرتے ہو جیسا نذیر مبین سے معلوم ہوتا ہے تو ہمارے جی کو یہ بات نہیں لگتی کیونکہ) ہم تو تم کو اپنے ہی جیسا آدمی دیکھتے ہیں (اور بشر کا نبی ہونا دور از کار ہے) اور اگر بعض لوگوں کے اتباع کرنے سے استدلال کیا جاوے تو وہ قابل استدلال نہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمہارا اتباع انہیں لوگوں نے کیا ہے جو ہم میں بالکل رذیل ہیں (جن کی عقل اکثر خفیف ہوتی ہے پھر) وہ (اتباع) بھی محض سرسری رائے سے (ہوا ہے یعنی اول تو ان کی عقل ہی صائب نہیں غور کے بعد بھی غلطی کرتے دوسرے پھر غور بھی نہیں کیا، اس لئے ایسے لوگوں کا تم کو نبی سمجھ لینا یہ کوئی حجت نہیں بلکہ بالعکس ہمارے اتباع سے مانع ہے کیوں کہ شرفاء کو رذیلوں کی موافقت سے عار آتی ہے نیز اکثر ایسے کم حوصلہ لوگوں کے اغراض بھی حصول مال یا ترافع ہوا کرتا ہے، سو یہ لوگ بھی دل سے ایمان نہیں لاتے) اور اگر یہ کہا جائے کہ باوجود رذیل ہونے کے ان لوگوں کو کسی خاص امر کے اعتبار سے ہم فضیلت ہے جس کے اعتبار سے ان کی رائے اس باب میں صائب ہے سو ہم تم لوگوں میں (یعنی تم میں اور مسلمانوں میں) کوئی بات اپنے سے زیادہ نہیں پاتے (اس لئے تم مسلمانوں کی رائے کو صحیح نہیں سمجھتے بلکہ ہم تم کو بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں، نوح علیہ السلام) نے فرمایا کہ اے میری قوم (تم جو کہتے ہو کہ تمہاری نبوت جی کو نہیں لگتی تو بھلا یہ تو بھلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی جانب سے دلیل

پر قائم ہوں جس سے میری نبوت ثابت ہوتی ہو) اور اس نے مجھ کو اپنے پاس سے حجت (یعنی نبوت) عطا فرمائی ہو پھر وہ (نبوت یا اس کی حجت) تم کو نہ سوجھتی ہو تو (میں کیا کروں مجبور ہوں) کیا ہم اس (دعویٰ یا دلیل) کو تمہارے سر منڈھ دیں اور تم اس سے نفرت کئے چلے جاؤ، مطلب یہ ہے کہ تمہارا یہ کہنا کہ جی کو نہیں لگتی یہ محض اس وجہ سے ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ بشر رسول نہیں ہو سکتا جس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں، اور میرے پاس اس کے واقع اور صحیح ہونے کی دلیل موجود ہے یعنی معجزہ وغیرہ نہ کہ کسی کا اتباع، اس سے اس کا جواب بھی ہو گیا کہ ان کا اتباع حجت نہیں لیکن کسی دلیل کا فائدہ موقوف ہے غور و فکر پر وہ تم کرتے نہیں اور میرے بس سے باہر ہے) اور اتنی بات اور نازل فرمائی کہ، اے میری قوم (یہ تو سوچو کہ اگر میں نبوت کا غلط دعویٰ کرتا تو آخر اس میں میرا کچھ مطلب تو ہوتا مثلاً یہی ہوتا کہ اس کے ذریعہ سے خوب مال کماؤں گا تو تم کو معلوم ہے کہ) میں تم سے اس (تبلیغ) پر کچھ مال نہیں مانگتا، میرا معاوضہ تو صرف اللہ کے ذمہ ہے (اسی سے آخرت میں اس کا طالب ہوں اسی طرح اور انراض بھی اگر غور کرو تو متنی پاؤ گے پھر جب کوئی غرض نہیں پھر مجھ کو بھوٹ بولنے سے کیا فائدہ تھا خلاصہ یہ ہے کہ کذب دعویٰ کو کوئی امر مقتضی نہیں اور صدق دعویٰ پر دلیل قائم ہے پھر نبوت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے) اور تم جو اتباع اراذل کو اپنے اتباع سے مانع بتلاتے ہو اور صراحتاً یا دلالتاً یہ چاہتے ہو کہ میں ان کو اپنے پاس سے نکال دوں سو) میں تو ان ایمان والوں کو نکالتا نہیں (کیونکہ) یہ لوگ اپنے رب کے پاس (عزت و مقبولیت کے ساتھ) جانے والے ہیں (اور بھلا کوئی شخص مقربان شاہی کو نکالا کرتا ہے اور اس سے اس کا بھی جواب ہو گیا کہ یہ لوگ دل سے ایمان نہیں لائے) لیکن واقعی میں تم لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ (خواہ مخواہ کی) بے ہوشی کر رہے ہو اور بے دھنگی باتیں کر رہے ہو، اور (بالفرض والتقدیر) اگر میں ان کو نکال بھی دوں تو (یہ بتلاؤ کہ) مجھ کو خدا کی گرفت سے کون بچائے گا (کیا تم میں اتنی ہمت ہے جو ایسے بہودہ مشورے دے رہے ہو) کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے اور اس تقریر میں ان کے تمام شبہات کا جواب ہو گیا لیکن آگے ان سب جوابوں کا پھر تتمہ ہے یعنی جب میری نبوت دلیل سے ثابت ہے تو اول تو دلیل کے سامنے استبعاد کوئی چیز نہیں پھر یہ کہ وہ مستبعد بھی نہیں البتہ کسی امر عجیب و غریب کا اگر دعویٰ کرتا تو انکار و استبعاد چندانہ منکر و مستبعد نہ تھا گو دلیل کے بعد پھر وہ بھی مسموع نہیں البتہ اگر دلیل بھی مقتضی استبعاد کو ہو تو پھر واجب ہے لیکن میں تو کسی ایسے امر عجیب کا دعویٰ نہیں کرتا چنانچہ) میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ میں (یہ کہتا ہوں کہ میں) تمام غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتے ہوں اور

ایہ تو اپنی نبوت کے متعلق ارشاد فرمایا، آگے اپنے تابعین کے متعلق ارشاد ہے یعنی، جو لوگ تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں میں ان کی نسبت (تمہاری طرح) یہ نہیں کہہ سکتا کہ (یہ لوگ دل سے ایمان نہیں لائے اس لئے)، اللہ تعالیٰ ہرگز ان کو ثواب نہ دے گا ان کے دل میں جو کچھ ہو اس کو اللہ ہی خوب جانتا ہے، تو ممکن ہے کہ ان کے دلوں میں اخلاص ہو تو پھر میں ایسی بات کیونکر کہہ دوں، میں تو (اگر ایسی بات کہہ دوں تو) اس صورت میں ستم ہی کروں (کیونکہ بے دلیل دعویٰ کرنا گناہ ہے، جب نوح علیہ السلام نے سب باتوں کا پورا پورا جواب دے دیا جس کا جواب پھر ان سے کچھ بن نہ پڑا تو عاجز ہو کر، وہ لوگ کہنے لگے کہ اسے نوح تم، ہم سے بحث کر چکے پھر اس بحث کو بڑھا بھی چکے سو (اب بحث چھوڑو اور) جس چیز سے تم ہم کو دھمکایا کرتے ہو (کہ عذاب آجاو لگا) وہ ہمارے سامنے لے آؤ انہوں نے فرمایا کہ (اس کو لانے والا میں کون ہوں مجھ کو پہنچا دینے سنا دینے کا حکم تھا سو میں بجالا چکا، اس کو تو اللہ تعالیٰ بشرطیکہ اس کو منظور ہو تمہارے سامنے لا دے گا اور (اس وقت پھر) تم اس کو عاجز نہ کر سکو گے (کہ وہ عذاب واقع کرنا چاہے اور تم نہ ہونے دو) اور (جو میرا کام تھا پہنچا دینا اور سنا دینا اس میں میں نے تمہاری پوری خیر خواہی اور دلسوزی کی لیکن) میری خیر خواہی تمہارے کام نہیں آ سکتی گو میں تمہاری کیسی ہی خیر خواہی کرنا چاہوں جب کہ اللہ ہی کو تمہارا گمراہ کرنا منظور ہو (جس کی وجہ تمہارا عناد و استکبار ہے مطلب یہ کہ جب تم ہی اپنی بد قسمتی سے اپنے لئے نفع حاصل کرنا اور نقصان سے بچنا نہ چاہو تو میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے، وہی تمہارا مالک ہے (اور تم مملوک تو تم پر اس کے تمام حقوق واجب ہیں اور تم ان کو براہ عناد ضائع کر کے مجرم ہو رہے ہو) اور اسی کے پاس تم کو جانا ہے (وہ تمہارے اس سارے عناد و کفر کی کسر نکال دے گا) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ قرآن خود تراش لیا ہے آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ اگر (بالفرض) میں نے تراشا ہوگا تو میرا یہ جرم مجھ پر (عائد) ہوگا (اور تم میرے جرم سے بری الذمہ ہو گے) اور (اگر تم نے یہ دعویٰ تراشا ہوگا یعنی مجھ پر بہتان لگایا ہوگا تو تمہارا یہ جرم تم پر عائد ہوگا اور) میں تمہارے اس جرم سے بری الذمہ رہوں گا۔

معارف و مسائل

حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو ایمان کی دعوت دی تو قوم نے ان کی نبوت و رسالت پر چند شبہات و اعتراضات پیش کئے، حضرت نوح علیہ السلام نے پانچوں الشدائد کے جوابات دیئے جن کے ضمن میں بہت سے اصولی اور فروعی مسائل و بیانت اور

معاشرت کے بھی آگئے ہیں، آیات مذکورہ میں یہی مکالمہ بیان فرمایا گیا ہے۔
تیسری آیت میں مشرکین کی گفتگو ہے جس میں چند شبہات و اعتراضات کئے گئے ہیں، اس آیت کے حل طلب الفاظ کی تشریح یہ ہے:

لفظ مَلَّا عام طور پر جماعت کے لئے بولا جاتا ہے، بعض ائمہ لغت کا کہنا ہے کہ قوم کے سرداروں اور ذمہ داروں کی جماعت کو قَلَدًا کہتے ہیں، بَشَرًا کا ترجمہ ہے انسان یا آدمی أَسَافِلَ أُنْثٰى کی جمع ہے حقیر و ذلیل کو کہا جاتا ہے جس کی قوم میں کوئی حیثیت اور عزت نہ ہو، بَادِيَ الرَّأٰى کے معنی ہیں "ابتدائی اور سطحی رائے"

ان لوگوں کا پہلا اعتراض حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت و رسالت پر یہ تھا کہ مَا نُرٰى اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا، یعنی آپ تو ہمیں جیسے انسان اور آدمی ہو، ہماری ہی طرح کھاتے پیتے چلتے پھرتے اور سوتے جاگتے ہو پھر ہم آپ کا یہ فوق العادت امتیاز کیسے تسلیم کر لیں کہ آپ خدا کے رسول اور پیغمبر ہیں۔

ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ انسانوں کی طرف جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا جائے وہ جنس بشر سے نہ ہونا چاہئے بلکہ کوئی فرشتہ ہو جس کا امتیاز سارے انسانوں کو چار و ناچار تسلیم کرنا پڑے۔

اس کا جواب پچوتھی آیت میں یہ دیا گیا، يَقُوْمُ اَسْمَآءُ يَتَمَرَّنُ كُنْتُ عَلٰى بَيْتِنَا مِّنْ سَمٰوٰتِیْ وَ اَمْسٰنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِیْ فَعَصٰیْتَ عَلٰیكَمُ اَنْزَلْنٰكُمْ مِّنْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كِرْهُوْنَ، اس میں بتلایا گیا کہ رسول کا بشر یا آدمی ہونا تو نبوت و رسالت کے منافی نہیں بلکہ غور کرو تو یہی ضروری ہے کہ آدمیوں کا رسول آدمی ہونا چاہئے تاکہ آدمیوں کو اُس سے دین سیکھنا آسان ہو انسان اور فرشتہ کے مزاج میں زمین آسمان کا تفاوت ہے، اگر فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجا دیا جاتا تو انسانوں کو اس سے دین سیکھنا سخت مشکل ہو جاتا، کیونکہ فرشتہ کو تو نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس، نہ نیند آتی ہے نہ تکان ہوتا ہے، نہ اُس کو انسانی ضروریات و حوائج پیش آتی ہیں وہ انسانوں کی اس کمزوری کا احساس کیسے کرتا، اور بغیر اس احساس کے انسان عمل میں اس کا اتباع کیسے کر سکتے، یہ مضمون قرآن کی دوسری آیتوں میں صراحتاً اور اشارۃً کئی جگہ آچکا ہے یہاں اس کا ذکر کرنے کے بجائے یہ بتلایا کہ اگر عقل سے کام لو تو رسول و پیغمبر کے لئے یہ تو ضروری نہیں کہ وہ آدمی نہ ہو، ہاں یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بیئہ اور حجت اس کے ساتھ ہو جس کو دیکھ کر لوگوں کو یہ تسلیم کرنا آسان ہو جائے کہ یہ خدا ہی کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہے، وہ بیئہ اور حجت عام لوگوں کے لئے انبیاء علیہم السلام کے معجزات ہوتے ہیں، اسی لئے

نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اپنے ساتھ اللہ کی طرف سے بیعت اور حجت اور رحمت لیکر آیا ہوں تم اس کو دیکھتے اور غور کرتے تو انکار نہ کرتے، مگر تمہارے انکار و عناد نے تمہاری نگاہوں کو اُس سے اندھا کر دیا اور تم انکار کر بیٹھے اور اپنی ضد پر جم گئے۔

مگر خدا تعالیٰ کی یہ رحمت جو پیغمبر کے ذریعہ آتی ہے ایسی چیز نہیں کہ زبردستی لوگوں کے سر ڈال دی جائے، جب تک وہ خود اس کی طرف رغبت نہ کریں، اس میں اشارہ پایا گیا کہ دولت ایمان ہو میں لے کر آیا ہوں اگر میرا بس چلتا تو تمہارے انکار اور ضد کے باوجود تمہیں دے ہی دیتا، مگر یہ قانون قدرت کے خلاف ہے، یہ نعمت زبردستی کسی کے سر نہیں ڈالی جاسکتی، اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ زبردستی کسی کو مؤمن یا مسلمان بنانا کسی دور نبوت میں جائز نہیں رکھا گیا، بزورِ مشیر اسلام پھیلانے کا سفید بھوٹ گھڑنے والے خود بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں مگر ایک بات ہے جو ناواقفوں کے دلوں میں تردد پیدا کرنے کے لئے چلتی کی جاتی ہے۔

اس کے ضمن میں اس کی وجہ بھی سمجھی گئی کہ فرشتہ کو رسول کیوں نہیں بنایا گیا، وجہ یہ ہے کہ فرشتہ ہر مافوق العادت قوت و طاقت رکھتا ہے اور اپنے وجود کی ہر حیثیت میں انسان سے ممتاز ہے اُس کو دیکھ کر ایمان لانا تو ایک جبری عمل ہو جاتا جسکی مجال تھی کہ فرشتہ کے سامنے وہ ہٹ دھرمی کرتا جو انبیاء کے سامنے کی جاتی ہے اور شرعاً وہ ایمان مقبول نہیں ہو کسی قوتِ قاہرہ سے مجبور ہو کر اختیار کیا جائے، بلکہ مطلوبِ ایمان بالغیب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قوتِ قاہرہ کا پورا مشاہدہ کئے بغیر ایمان اختیار کیا جائے۔

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا وَمَا تَرْكُ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُوا بِادِّتِي الشَّامِي، یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ آپ پر ایمان لانے والے سب سرسری نظر میں حقیر و ذلیل کہنے لوگ ہیں، کوئی تشریف بڑا آدمی نہیں، اس اعتراض کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ تمہاری بات اگر حق اور صحیح ہوتی تو قوم کے بڑے لوگ اس کو قبول کرتے، ان چھوٹے اور ذلیل لوگوں کا قبول کرنا اس کی علامت ہے کہ آپ کی دعوت ہی قبول کرنے کے قابل نہیں، دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمارے لئے آپ کی دعوتِ ایمان قبول کرنے سے رکاوٹ یہ ہے کہ ہم ایمان لے آئیں تو بحیثیت مسلمان ہم بھی ان کے برابر سمجھے جائیں گے، نمازوں کی صفوف اور دوسری مجالس میں ہمیں ان کے ساتھ ان کے برابر بیٹھنا پڑے گا یہ ہم سے نہیں ہو سکتا۔

حقیقت سے دورانِ ناواقفوں نے غریب فقراء کو جن کے پاس مال کی بھتات نہیں اور دنیوی جاہ مال نہیں اُن کو اراذل قرار دے رکھا تھا، حالانکہ یہ خود ایک جاہلانہ خیال ہے ہمت و ذلت اور عقل و فہم مال و دولت کے تابع نہیں بلکہ تجربہ شہد ہے کہ جاہ و مال کا ایک نشہ ہوتا ہے

ہو انسان کو بہت سی معقول اور صحیح باتوں کے سمجھنے اور قبول کرنے سے روک دیتا ہے، کمزور و غریب آدمی کی نظر کے سامنے یہ رکاوٹیں نہیں ہوتیں وہ حق اور صحیح بات کو قبول کرنے میں مسابقت کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ زمان قدیم سے عادۃ اللہ ہی رہی ہے کہ پیغمبروں پر اول ایمان لانیوالے غریب، فقراء ہی ہوتے ہیں، اور پچھلی آسمانی کتابوں میں اس کی تصریحات بھی موجود ہیں، اسی وجہ سے جب ہرقل شاہ روم کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک دعوت ایمان کے لئے پہنچا اور اس کو یہ فکر ہوئی کہ معاملہ کی تحقیق کرے چونکہ اُس نے تورات و انجیل میں انبیاء علیہم السلام کی علامات پڑھی ہوئی تھیں اس لئے اُس وقت عرب کے جو لوگ ملک شام میں آئے ہوئے تھے ان کو جمع کر کے ان علامات کے متعلق چند سوالات کئے۔

ان سوالات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان کا اتباع کرنے والے قوم کے کمزور اور غریب لوگ ہیں یا وہ جو قوم کے بڑے کہلاتے ہیں؟ ان لوگوں نے بتلایا کہ کمزور اور غریب لوگ ہیں ! اس پر ہرقل نے اقرار کیا کہ یہ علامت تو سچے نبی ہونے کی ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا اول اول اتباع کرنے والے یہی کمزور غریب لوگ ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ غریب و فقراء کو رذیل سمجھنا ان کی جہالت تھی، حقیقت میں رذیل تو وہ ہے جو اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے مالک کو نہ پہچانے، اس کے احکام سے روگردانی کرے، اسی لئے سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کمینہ اور رذیل کون ہے؟ تو فرمایا وہ لوگ جو بادشاہوں اور افسروں کی خوشامد میں لگے رہیں، اور ابن الاسعابی نے فرمایا کہ کمینہ وہ آدمی ہے جو اپنا دین بیچ کر دنیا کمائے، کسی نے پوچھا کہ سب سے زیادہ کمینہ کون ہے تو فرمایا وہ شخص جو اپنا دین برباد کر کے کسی دوسرے کی دنیا سنوائے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کمینہ وہ شخص ہے جو صحابہ کرام کو برا کہے کیونکہ وہ پوری امت کے سب سے بڑے محسن ہیں جن کے ذریعہ دولت ایمان و شریعت اُن کو پہنچی ہے۔

بہر حال ان کے اس جاہلانہ خیال کی تردید تیسری آیت میں اول تو اس طرح کی گئی ہے کہ پیغمبر کی نظر کسی کے مال پر نہیں ہوتی وہ کسی سے اپنی خدمت و ہمدردی کا معاوضہ نہیں لیتا اُس کا معاوضہ تو صرف اللہ کے ذمہ ہوتا ہے اس لئے اس کی نظر میں امیر و غریب برابر ہوتے ہیں، تم اس سے نہ ڈرو کہ ہم مالدار ہیں، مسلمان ہو جائیں گے تو ہم سے مال کا مطالبہ کیا جائے گا۔

دوسرے یہ بتلایا گیا کہ تم جو ایمان قبول کرنے کے لئے یہ شرط پیش کرتے ہو کہ میں غریب لوگوں کو اپنے پاس سے نکال دوں تو سمجھ لو کہ یہ میں نہیں کر سکتا کیونکہ یہ لوگ اگرچہ غریب ہیں مگر بارگاہ رب العزت میں ان کی رسائی اور اعزاز ہے ایسے لوگوں کو نکالنا کوئی عقل کا کام نہیں،

اور مَلَقُوا امْرَأَتَهُمْ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر بالفرض میں ان کو نکال دوں تو قیامت کے روز یہ لوگ جب اپنے رب کے سامنے جائیں گے اور فریاد کریں گے تو میرے پاس کیا جواب ہوگا، چوتھی آیت کا یہی مضمون ہے کہ اگر میں ان کو نکال دوں تو مجھے خدا کے عذاب سے کون بچائے گا، آخر میں فرمایا کہ یہ سب تمہاری جہالت ہے کہ تم آدمیت کو نبوت کے منافی سمجھتے ہو یا غریب لوگوں کو نکال دینے کی فرمائش کرتے ہو۔

پانچویں آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی وہ تقریر نقل کی گئی ہے جو انہوں نے اپنی قوم کے سب اعتراضات سننے کے بعد ان کو کچھ اصولی ہدایات دینے کے لئے ارشاد فرمائی، جس میں بتلایا گیا ہے کہ نبوت و رسالت کیلئے وہ چیزیں ضروری نہیں جو تم نے سمجھ رکھی ہیں۔

مثلاً پہلے فرمایا وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ مَعْلَوَاتٍ یعنی میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ اللہ کے خزانے میرے ہاتھ میں ہیں، اس میں ان لوگوں کے اس خیال کی تردید ہے کہ جب اللہ کی طرف سے رسول ہو کر آئے ہیں تو ان کے ہاتھ میں خزانے ہونے چاہئیں جن سے لوگوں کو داد و بخش کرتے رہیں، نوح علیہ السلام نے بتلادیا کہ انبیاء کی بعثت کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کو متاع دنیا میں ابھھائیں، اس لئے خزانوں سے اُن کا کیا کام۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں ان لوگوں کے اُس خیال کی تردید ہو جو بعض لوگ سمجھا کرتے ہیں کہ اللہ نے انبیاء کو بلکہ اولیاء کو بھی مکمل اختیارات دے دیئے ہیں، اللہ کی قدرت کے خزانے ان کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جسکو چاہیں دیں جسکو چاہیں نہ دیں تو نوح علیہ السلام کے اس ارشاد سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے خزانوں کا مکمل اختیار کسی نبی کو بھی سپرد نہیں کیا، اولیاء کا تو کیا ذکر ہے، البتہ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں اور نواہشیں اپنی قدرت سے پوری فرماتے ہیں۔

دوسرے فرمایا وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ، ان جاہلوں کا یہ بھی خیال تھا کہ جو شخص خدا تعالیٰ کا رسول ہو وہ عالم الغیب بھی ہونا چاہئے، اس جملہ نے واضح کر دیا کہ نبوت و رسالت علم غیب کی مقتضی نہیں اور کیسے ہوتی جبکہ علم غیب حق تعالیٰ کی خصوصی صفت ہے جس میں کوئی نبی یا فرشتہ شریک نہیں ہو سکتا، ہاں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں میں سے جسکو چاہتے ہیں جتنا چاہتے ہیں غیب کے اسرار پر مطلع کر دیتے ہیں مگر اس کی وجہ سے ان کو عالم الغیب کہنا درست نہیں ہوتا کیونکہ ان کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ جس غیب کو چاہیں معلوم کر لیں۔

تیسری بات یہ فرمائی وَلَا أَقُولُ اِفْتٍ مَلَكٌ یعنی میں تم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، اس میں ان کے اس خیال کی تردید ہو گئی کہ رسول کوئی فرشتہ ہونا چاہئے۔

چوتھی بات یہ ارشاد فرمائی کہ تمہاری نظریں جن غریب بے سرمایہ لوگوں کو حقیر و ذلیل سمجھتی ہیں میں تمہاری طرح یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ ان کو کوئی خیر اور بھلائی نہ دیگا کیونکہ خیر اور بھلائی کا تعلق مال و دولت سے نہیں بلکہ انسان کے قلب سے ہے اور دلوں کا حال اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ کس کا قلب خیر و صلاح کے قابل ہے کس کا نہیں۔
پھر فرمایا کہ اگر میں بھی تمہاری طرح ان کو حقیر و ذلیل کہنے لگوں تو میں بھی ظالم ہو جاؤں گا۔

وَأَوْحَىٰ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّا لَنُؤْمِنُ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ

اور حکم ہوا طرف نوح کی کہ اب ایمان نہ لائے گا تیری قوم میں مگر جو ایمان لایا

فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۳۷﴾ وَاصْنَعِ الْفُلَكَ بِأَعْيُنِنَا

سو غمگین نہ رہ اُن کاموں پر جو کر رہے ہیں اور بنا کشتی روبرو ہمارے

وَحِينَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُمْ مُغْرَقُونَ ﴿۳۸﴾

اور ہمارے حکم سے اور نہ بات کر مجھ سے ظالموں کے حق میں یہ بیشک غرق ہوں گے،

وَيَصْنَعِ الْفُلَكَ وَكَلَّمَا مَرْءًا عَلَيْهِ مَلَأٌ مِنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ

اور وہ کشتی بناتا تھا اور جب گزرتے اس پر سردار اس کی قوم کے ہنسی کرتے اس سے

قَالَ إِن تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ ﴿۳۹﴾ فَسَوْفَ

بولا اگر تم ہنستے ہو ہم سے تو ہم ہنستے ہیں تم سے جیسے تم ہنستے ہو ، اب جلد

تَعْلَمُونَ ۚ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ

جان لوگے کہ کس پر آتا ہے عذاب کہ رسوا کرے اس کو اور اُترتا ہے اس پر عذاب

مُقِيمٌ ۚ ﴿۴۰﴾ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُورُ ۖ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا

دامنی یہاں تک کہ جب پہنچا حکم ہمارا اور جوش مارا تنور نے کہا ہم نے چڑھائے کشتی میں

مِنْ كُلِّ نَرٍ وَجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ

ہر قسم سے جوڑا دو عدد اور اپنے گھر کے لوگ مگر جس پر پہلے ہو چکا ہے حکم

وَمَنْ آمَنَ ۖ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿۴۱﴾

اور سب ایمان والوں کو اور ایمان نہ لائے تھے اس کے ساتھ مگر تھوڑے

خلاصہ تفسیر

اور جب نصیحت کرتے ہوئے ایک زمانہ دراز گزر گیا اور کچھ اثر نہ ہوا تو، نوح (علیہ السلام)

کے پاس وحی بھیجی گئی کہ ہوا ان کے جوہر اس وقت تک، ایمان لاچکے ہیں اور کوئی دنیا، شخص تمہاری قوم میں سے ایمان نہ لاوے گا سو جو کچھ یہ لوگ (کفر و ایذاء و استہزاء) کر رہے ہیں اس پر کچھ غم نہ کرو کیونکہ غم تو خلاف توقع سے ہوتا ہے جب ان سے مخالفت کے سوا کوئی اور توقع ہی نہیں پھر کیوں غم کیا جاوے، اور چونکہ ہمارا ارادہ اب ان کو غرق کرنے کا ہے اور اس لئے طوفان آنے کو ہے پس، تم اس طوفان سے بچنے کے لئے، ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے کشتی تیار کرو کہ اس کے ذریعہ سے طوفان سے تم اور مؤمنین محفوظ رہو گے، اور (یہ سن لو کہ) مجھ سے کافروں کی نجات، کے بارے میں کچھ گفت گو مت کرنا (کیونکہ، وہ سب غرق کئے جاویں گے) ان کے لئے یہ قطعی طور پر تجویز ہو چکا ہے تو ان کی سفارش بے کار ہوگی، غرض نوح علیہ السلام نے سامان کشتی کا جمع کیا، اور وہ کشتی تیار کرنے لگے (خواہ خود یا دوسرے کاریگروں کے ذریعہ سے) اور (اثنائے تیاری میں) جب کبھی ان کی قوم میں کسی رئیس گروہ کا ان پر گزر ہوتا تو (ان کو کشتی بنانا دیکھ کر اور یہ سن کر کہ طوفان آنے والا ہے، ان سے ہنسی کرتے کہ دیکھو پانی کا کہیں نام و نشان نہیں مفت مصیبت جھیل رہے ہیں، آپ فرماتے کہ اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم تم پر ہنستے ہیں جیسا تم ہم پر ہنستے ہو کہ عذاب ایسا نزدیک آپہنچا ہے اور تم کو ہنسی سوجھ رہی ہے ہم اس پر ہنستے ہیں) سو ابھی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر (دنیا میں) ایسا عذاب آیا جاتا ہے جو اس کو ہوا کر دے گا اور (بعد مرگ) اس پر دائمی عذاب نازل ہوتا ہے (غرض اسی طرح کے مکالمات اور معاملات ہوا کرتے، یہاں تک کہ جب ہمارا حکم (عذاب کا قریب) آپہنچا اور زمین سے پانی اُبلا تا شروع ہوا اور یہ علامت تھی طوفان شروع ہو جانے کی اور اوپر سے پانی برسنا شروع ہوا اس وقت، ہم نے (نوح علیہ السلام سے) فرمایا کہ ہر قسم (کے جانوروں) میں سے دو کہ انسان کے لئے کارآمد ہیں اور پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے، ایک ایک تر اور ایک ایک مادہ یعنی دو عدد اس (کشتی) میں چڑھا لو اور اپنے گھروالوں کو بھی (چڑھا لو) باستثناء اس کے جس پر (غرق ہونے کا) حکم نافذ ہو چکا ہے (یعنی ان میں جو کافر ہو جن کی نسبت اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ کہہ دیا گیا ہے، اس کو سوار مت کرنا اور گھروالوں کے علاوہ) دوسرے ایمان والوں کو بھی (سوار کرلو) اور بجز قلیل آدمیوں کے ان کے ساتھ کوئی ایمان نہ لایا تھا (بس ان ہی کے سوار کرنے کا حکم ہو گیا)۔

معارف و مسائل

حضرت نوح علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے تقریباً ایک ہزار سال کی عمر دراز عطا فرمائی، اس کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دینے اور قوم کی اصلاح کرنے کی فکر اور پیغمبرانہ جدوجہد کا بھی یہ درجہ عطا فرمایا کہ

اس طویل مدت عمر میں ہمیشہ اپنی قوم کو دین حق اور کلمہ توحید کی دعوت دیتے رہے، قوم کی طرف سے سخت سخت ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا ان کی قوم ان پر پتھراؤ کرتی یہاں تک کہ بے ہوش ہو جاتے پھر جب ہوش آتا تو دعا کرتے کہ یا اللہ میری قوم کو معاف کر دے یہ بے وقوف جاہل ہیں جانتے نہیں، قوم کی ایک نسل کے بعد دوسری کو اور دوسری کے بعد تیسری کو اس اُمید پر دعوت دیتے کہ شاید یہ حق کو قبول کر لیں۔

جب اس عمل پر صدیاں گزر گئیں تو رب العزت کے سامنے ان کی حالت زار کی شکایت کی جو سورۃ نوح میں مذکور ہے سَرَّيْنا اِيَّاهِ دَعْوَتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَ نَهَارًا ، فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاؤِيْ اِلَّا فِرَارًا ، اور اتنے طویل مصائب کے بعد اس مرد خدا کی زبان پر یہ دعا آئی ، سَرَّيْنا اِنْصُرُوْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ، یعنی اے میرے پروردگار ان کی تکذیب کے بالمقابل آپ میری مدد کیجئے۔

قوم نوح کا ظلم و جور حد سے گزر جانے کے بعد حق تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان آیات سے خطاب فرمایا جو اوپر مذکور ہیں (بغوی، مظہری)
ان میں اول تو حضرت نوح علیہ السلام کو یہ بتلایا گیا کہ آپ کی قوم میں جنکو ایمان لانا مقصود ہے اُن کے آئے اب کوئی اور شخص ایمان قبول نہ کرے گا ان کے دلوں پر انکی ہمت و دھرمی اور کشری کی بناء پر مہر لگ چکی ہے اس لئے اب آپ اس قوم کا نعم نہ کھائیں اور ان کے ایمان قبول نہ کرنے سے پریشان نہ ہوں۔

دوسری بات یہ بتلانی گئی کہ اب ہم اس قوم پر عذاب پانی کے طوفان کا بھیجنے والے ہیں اس لئے آپ ایک کشتی تیار کریں جس میں آپ کے اہل و عیال اور جتنے مسلمان ہیں مع اپنی ضروریات کے سما سکیں تاکہ طوفان کے وقت یہ سب اس میں سوار ہو کر نجات پاسکیں، حضرت نوح علیہ السلام نے حکم کے مطابق کشتی بنائی، پھر جب طوفان کی ابتداء کی علامات سامنے آگئیں کہ زمین سے پانی اُبلنے لگا تو نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ خود مع اپنے اہل و عیال کے اور اُن لوگوں کے جو آپ پر ایمان لائے ہیں اس کشتی میں سوار ہو جائیں، اور انسانوں کی ضروریات جن جانوروں سے متعلق ہیں جیسے گائے، بیل، بکری، گھوڑا، گدھا وغیرہ ان کا بھی ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کر لیں، حضرت نوح علیہ السلام نے حکم کے مطابق سب کو سوار کر لیا۔

آخر میں فرمایا کہ نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے اور کشتی میں سوار ہونے والے مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔

یہ خلاصہ مضمون ہے آیات متذکرہ کا، اب ہر ایک آیت کے مفہوم کی تشریح اور اُن سے متعلقہ مضامین و مسائل دیکھئے۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ نوح علیہ السلام پر یہ وحی بھیجی گئی کہ ان کی قوم میں سے جو ایمان لانے والے تھے لاپکے ہیں آئندہ اور کوئی ایمان نہ لائے گا اس لئے یہ لوگ جو کچھ معاملہ آپ کے ساتھ کرتے ہیں اُس سے آپ غلگین و پریشان نہ ہوں، کیونکہ نعم و پریشانی عموماً جب ہوتی ہے جب کسی سے صلاح و فلاح کی امید وابستہ ہو، مایوسی بھی ایک قسم کی راحت ہوتی ہے آپ ان سے مایوس ہو جائیے، اور جو تکلیف و صدمہ حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی اینڈاؤں سے پہنچ رہا تھا اُس کے انتظام کی طرف دوسری آیت میں اشارہ کیا گیا کہ ان کو پانی کے طوفان میں غرق کر دیا جائے گا، انہیں حالات میں حضرت نوح علیہ السلام کی زبان پر اپنی قوم کے لئے وہ بددعا آئی تھی جسکا ذکر سورۃ نوح میں کیا گیا ہے :

رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ ذَيَّارًا ، إِنَّكَ إِن تَذَرْنَهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۔

یعنی اے میرے پروردگار! اب ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑے، کیونکہ اگر یہ رہے تو ان کی آئندہ نسل بھی ایسی ہی سرکش اور فاجر و کافر ہوگی ۔
یہی دُعا قبول ہو کر پوری قوم نوح طوفان میں غرق کی گئی ۔

نوح علیہ السلام کو کشتی سازی کی تعلیم حضرت نوح علیہ السلام کو جب کشتی بنانے کا حکم ملا اُس وقت وہ نہ کشتی کو جانتے تھے نہ اس کے بنانے کو، اس لئے دوسری آیت میں انکی سفینہ سازی کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے فرمایا وَاصْنَعِ الْفُلَکَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحِّينَا یعنی آپ کشتی بنائیں ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ۔

روایات حدیث میں ہے کہ جبریل امین نے بذریعہ وحی الہی حضرت نوح علیہ السلام کو سفینہ سازی کی تمام ضروریات اور اس کا طریقہ بتلایا، انہوں نے سال کی لکڑی سے یہ کشتی تیار کی ۔
بعض تاریخی روایات میں اس کی پیمائش یہ بتلائی گئی ہے کہ یہ تین سو گز لانبا، پچاس گز چوڑا، تین گز اونچا سہ منزلہ جہاز تھا اور روشن دان مروجہ طریق کے مطابق دائیں بائیں کھلتے تھے اس طرح یہ جہاز سازی کی صنعت وحی خداوندی کے ذریعہ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کے ہاتھوں شروع ہوئی، پھر اس میں ترقیات ہوتی رہیں ۔

تمام ضروری صنعتوں کا قیام شمس الدین ذہبی کی الطب النبوی میں بعض سلف سے نقل کیا گیا ہے کہ انسان کے لئے جتنی صنعتوں کی ضرورت ہے ان سب کی ابتداء بذریعہ وحی الہی کسی پیغمبر کے ذریعہ عمل میں آئی ہے پھر حسب ضرورت اس میں اضافے اور سہولتیں مختلف زمانوں میں ہوتی رہیں، سب سے پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام

کی طرف ہوجی آئی ہے اس کا بیشتر حصہ زمین کی آباد کاری اور مختلف صنعتوں سے متعلق ہے،
بوجھ اٹھانے کے لئے پہیوں کے ذریعہ چلنے والی گاڑی کی ایجاد بھی اسی سلسلہ کی ایجادات
میں سے ہے۔

سر سید صاحب بانی علیگڑھ کالج نے خوب فرمایا ہے کہ زمانے نے طرح طرح کی گاڑیاں
ایجاد کر لیں لیکن مدار کار ہر قسم کی گاڑیوں کا ڈھری اور پہیے پہی رہا، وہ بیل گاڑی اور گدھا گاڑی
سے لیکر ریلوں اور بہترین قسم کی موٹر گاڑیوں تک سب میں مشترک ہے اس لئے سب سے
بڑا موجد گاڑیوں کا وہ شخص ہے جس نے پہلے ایجاد کیا کہ دنیا بھر کی ساری مشینری کی رُوح پہیہ ہی
ہے اور معلوم ہو چکا کہ یہ ایجاد پیغمبر اول حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں بذریعہ وحی الہی عمل
میں آئی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اشیاء ضرورت کی صنعت کاری اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ
بطور وحی انبیاء علیہم السلام کو سکھائی گئی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کو سفینہ سازی کی ہدایت دینے کے ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ انکی
قوم پطوفان آئے گا، وہ غرق ہوں گے، اُس وقت آپ اپنی شفقت کی بناء پر ان کے بارے
میں کوئی سفارش نہ کریں۔

تیسری آیت میں سفینہ سازی کے زمانہ میں قوم نوح علیہ السلام کی غفلت اور انجام بد
سے بے فکری کا حال ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام بحکم خداوندی کشتی بنانے میں مشغول
تھے انکی قوم کے سردار جب ان کو دیکھتے اور پوچھتے کہ کیا کر رہے ہو؟ تو یہ فرماتے کہ طوفان آنی والا
ہے اس لئے کشتی تیار کر رہا ہوں انکی قوم ان کا مذاق اڑاتی اور استہزاء کرتی تھی کہ یہاں پینے
کے لئے تو پانی کا قحط ہے، یہ بزرگ اس خشکی میں کشتی چلانے کی فکر میں ہیں، حضرت نوح
علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا کہ ”اگر آج تم ہم سے استہزاء کرتے ہو تو یاد رکھو کہ ایک
دن ایسا بھی آنے والا ہے جس میں ہم تم سے استہزاء کریں گے، مراد یہ ہے کہ حالات ایسے
پیش آئیں گے جو خود تمہارے استہزاء کے موجب ہوں گے، کیونکہ حقیقت استہزاء و تمسخر شانِ انبیاء
کے خلاف ہے وہ کسی کے لئے جائز نہیں بلکہ حرام ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے لَا تَسْتَحْزِرُوا قَوْمَ مِیْمُنٍ
قَوْمَ عَلٰی اَنْ یَّکُونُوا خَیْرًا مِّنْهُمْ، یعنی کوئی کسی کے ساتھ استہزاء نہ کرے، ہو سکتا ہے کہ وہ اس
استہزاء کو نیا لے سے بہتر ہو، اُس لئے یہاں استہزاء سے مراد اُن کے استہزاء کا عملی جواب ہے
کہ جب تم عذاب میں گرفتار ہو گے تو ہم تمہیں بتلائیں گے کہ یہ ہے تمہارے استہزاء کا انجام، جیسا کہ
اس کے بعد چوتھی آیت میں فرمایا ہے کہ ”عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر ایسا عذاب

آیا چاہتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا، اور کس پر دائمی عذاب ہوتا ہے۔ پہلے عذاب سے دنیا کا اور عذابِ مقیم سے آخرت کا دائمی عذاب مراد ہے۔

پانچویں آیت میں طوفان کی ابتدا، اور اس سے متعلقہ ہدایات اور واقعات کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اس میں ارشاد فرمایا حَتَّىٰ لَإِذَا جَاءَ أَهْرُونَكَ وَتَارَ التَّنْزُورُ یعنی جب ہمارا حکم آپہنچا اور تَنْزُور سے پانی اُبلنا شروع ہو گیا۔

لفظ تَنْزُور کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے، سطحِ زمین کو بھی تَنْزُور کہتے ہیں، روٹی پکانے کے تنور کو بھی تنور کہا جاتا ہے، زمین کے بلند حصہ کے لئے بھی لفظ تَنْزُور بولا جاتا ہے۔ اسی لئے ائمہ تفسیر میں سے بعض نے فرمایا کہ اس جگہ تنور سے مراد سطحِ زمین ہے کہ اُس سے پانی ابلنے لگا۔ بعض نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا تنور مقام "عَيْنِ وَرْدَه" ملکِ شام میں تھا وہ مراد ہے، اس سے پانی نکلنے لگا۔ بعض نے فرمایا حضرت نوح علیہ السلام کا اپنا تنور کوفہ میں تھا، وہ مراد ہے، اکثر مفسرین حضرت حَسَن، مجاہد، شعبی، حضرت عبداللہ بن عباس وغیرہم نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

اور شعبی تو قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ یہ تنور شہرِ کوفہ کے ایک گوشہ میں تھا اور یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی کشتی مسجدِ کوفہ کے اندر بنائی تھی، اسی مسجد کے دروازہ پر یہ تنور تھا، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ آپ یہ دیکھیں کہ آپ کے گھر کے تنور سے پانی ابلنے لگا تو سمجھ لیں کہ طوفان آگیا۔ (قرطبی و مظہری) مفسرِ قرطبی نے فرمایا کہ اگرچہ تنور کے معنی میں مفسرین کے اقوال مختلف نظر آتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی اختلاف نہیں، جب طوفان کا پانی ابلنا شروع ہوا تو روٹی پکانے کے تنور سے بھی نکلا، سطحِ زمین سے بھی اُبلنا، ملکِ شام عَيْنِ وَرْدَه کے تنور سے بھی نکلا، جیسا کہ قرآن کریم نے خود تصریح فرماتی ہے فَقَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا یعنی ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش کے لئے کھول دیئے اور زمین سے چشمے ہی چشمے پھوٹ پڑے۔

شعبی نے اپنے بیان میں یہ بھی فرمایا کہ یہ کوفہ کی جامع مسجد، مسجدِ حرام اور مسجدِ نبوی اور مسجدِ اقصیٰ کے بعد چوتھی مسجد ہے جو ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔

آیت میں آگے یہ بیان فرمایا کہ جب طوفان شروع ہو گیا تو حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا اِخْلُصْ فِيهَا مِنْ كُلِّ صَوْغَةٍ اثْنَيْنِ یعنی سوار کر لیجئے اس کشتی میں ہر جوڑے والے جانوروں کا ایک ایک جوڑا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کشتی توح میں ساری دنیا بھر کے جانور جمع نہیں کئے گئے تھے بلکہ صرف وہ جانور جو نروادہ کے جوڑے سے پیدا ہوتے ہیں اور پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے، اس لئے تمام دریائی جانور اس سے نکل گئے اور خشکی کے جانوروں میں بھی بغیر نروادہ کے پیدا ہونے والے حشرات الارض سب نکل گئے صرف پالتو جانور گائے، بیل، بھینس، بکری وغیرہ رہ گئے۔

اس سے وہ شبہ دور ہو گیا جو سطحی نظر میں پیدا ہو سکتا ہے کہ کشتی میں اتنی وسعت کیسے ہو گئی کہ دنیا بھر کے جانور سما گئے۔

اور پھر نوح علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ آپ اپنے اہل و عیال کو بجز ان کے جو کفر پر ہیں کشتی میں سوار کر لیں اور ان سب لوگوں کو بھی جو آپ پر ایمان لائے ہیں، مگر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔

کشتی والوں کی صحیح تعداد قرآن و حدیث میں متعین نہیں کی گئی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ تعداد کل انبیاء آدمیوں کی تھی جن میں حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے سام، حام، یافث اور ان کی تین بیبیاں تھیں، چوتھا بیٹا کفار کے ساتھ رہ کر طوفان میں غرق ہوا۔

وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرِمًا وَمُرْسِيًا إِنَّ رَبِّي

اور بولا سوار ہو جاؤ اس میں اللہ کے نام سے ہے اس کا چلنا اور ٹھہرنا بیشک میرا رب

لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۴۱﴾ وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ تَفَوْ

بخشنے والا مہربان اور وہ لیے جارہی تھی ان کو لہروں میں جیسے پہاڑ اور

نَادَى نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يُبْنِيْ اَرْكَبْ مَعَنَا وَلَا تَكُنْ

پکارا نوح نے اپنے بیٹے کو اور وہ ہو رہا تھا کنارے اسے بیٹے سوار ہو جا ساتھ ہمارے اور مت رہ

مَعَ الْكَافِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاوِيْ اِلَى جَبَلٍ يَّعَصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ط

ساتھ کافروں کے بولا جا لوں گا کسی پہاڑ کو جو بچالے گا مجھ کو پانی سے

قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللَّهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ

کہا کوئی بچانے والا نہیں آج اللہ کے حکم سے مگر جس پر وہی رحم کرے اور حائل ہو گئی دونوں میں موج

فَكَانَ مِنَ الْمَغْرِقِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَقِيلَ يَا اَرْضُ ابْلَعِيْ مَاءَكَ وَاسْتَمِاءُ

پھر ہو گیا ڈوبنے والوں میں اور حکم آیا اے زمین نگل جا اپنا پانی اور اے آسمان

أَقْلَبِي وَغِيْضَ الْمَاءِ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ

ختم جا اور سوکھا دیا گیا پانی اور ہو چکا کام اور کشتی ٹھہری جودی پہاڑ پر

وَقِيلَ بَعْدَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۴۴﴾

اور حکم ہوا کہ دُور ہو قوم ظالم

خلاصہ تفسیر

اور نوح (علیہ السلام) نے سب جانوروں کو سوار کر کے اپنے متبعین سے، فرمایا کہ (اُو) اس کشتی میں سوار ہو جاؤ (اور غرق سے کچھ اندیشہ مت کرنا کیونکہ) اس کا چلنا اور ٹھہرنا (سب) اللہ ہی کے نام سے ہے (اور وہی اس کے محافظ ہیں پھر اندیشہ کیوں کیا جاوے اور گوبندوں کے گناہ مقتضی غرق کو ہیں مگر بالیقین میرا رب غفور ہے رحیم ہے (وہ اپنی رحمت سے گناہ بخش دیتا ہے اور حفاظت بھی کرتا ہے، غرض سب کشتی پر سوار ہو گئے اور اس اثنائے پانی بڑھ گیا، اور وہ کشتی ان کو لے کر پہاڑ جیسی موجوں میں چلنے لگی اور نوح (علیہ السلام) نے اپنے (ایک سگے یا سوتیلے) بیٹے کو (جس کا نام کنعان تھا اور وہ باوجود فہمائش کے ایمان نہ لایا تھا اور بوجہ ایمان نہ لانے کے کشتی میں سوار نہ کیا گیا تھا اور اس وقت کشتی کنارے کے قریب ہی تھی اور وہ کنارہ پر موجود تھا بطور آخری دعوت کے) پکارا اور وہ (کشتی سے) علیحدہ مقام پر تھا کہ اے میرے پیارے بیٹے (کشتی میں سوار ہونے کی شرط کہ ایمان ہے بجا لا کر جلدی) ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور (عقیدہ میں) کافروں کے ساتھ مت ہو (یعنی کفر کو چھوڑ دے کہ غرق سے بچ جاؤ) وہ کہنے لگا کہ میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھ کو پانی (میں غرق ہونے سے بچالے گا) کیونکہ وہ وقت ابتداء طوفان کا تھا پہاڑوں کے اوپر پانی نہ پہنچا تھا، نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ آج اللہ کے قہر سے کوئی بچانے والا نہیں (نہ پہاڑ اور نہ اور کوئی چیز) لیکن جس پر وہی رحم کرے (تو اس کو خود ہی بچالے، غرض کنعان اس وقت بھی ایمان نہ لایا اور پانی زور شور کے ساتھ اس طرف سے بڑھ گیا، اور دونوں (باپ بیٹوں) کے بیچ میں ایک موج حائل ہو گئی پس وہ (بھی مثل دوسرے کافروں کے) غرق ہو گیا اور (جب کفار سب غرق ہو چکے تو) حکم ہو گیا کہ اے زمین اپنا پانی (جو کہ تیری سطح پر موجود ہے) نکل جا، اور اے آسمان (برسنے سے) ختم جا (چنانچہ دونوں امر واقع ہو گئے) اور پانی گھٹ گیا اور قصہ ختم ہوا اور کشتی (کوہ) جودی پر اٹھ رہی اور کہہ دیا گیا کہ کافر لوگ رحمت سے دُور۔

مَعَارِفُ وَمَسَائِلُ

کشتیوں اور دوسری سواریوں پر | آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں کشتی اور سواری پر سوار ہونے کے آداب کی تعلیم ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ مَجِدِّهَا وَمُزْسِكِهَا

کعبہ کر سوار ہوں، مَجْرَسَ کے معنی جاری ہونا اور چلنا اور مُزْسِی کے معنی رکنا اور ٹھہرنا ہیں معنی یہ ہیں کہ اس کشتی اور سواری کا چلنا بھی اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور اس کے نام سے ہے اور رکنا اور ٹھہرنا بھی اسی کی قدرت کے تابع ہے۔

ہر سواری کا چلنا اور ٹھہرنا | انسان اگر ذرا بھی غور سے کام لے تو اسے معلوم ہوگا کہ کشتی ہو یا خشکی پر چلنے والی کوئی سواری، نہ اس کا پیدا کرنا بنانا اس کی قدرت میں ہے نہ چلانا اور ٹھہرانا اس کے بس کا ہے، انسان اپنی سطحی اور سرسری نظر کی

بنیاد پر سمجھتا ہے کہ میں نے اس کو بنایا اور چلایا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ اس نے وہ لوہا لکری پیتل، المنیم وغیرہ پیدا کئے ہیں جو ان تمام سواریوں کا خام مادہ ہے اور نہ اس کے بس میں ہر کہ ایک تولہ لوہا یا ایک فٹ لکڑی پیدا کر سکے، پھر ان خام اجناس (مٹیریل) سے طرح طرح کے کل پُرزے بنانے کی عقل و فہم کس نے دی؟ کیا یہ عقل و فہم انسان نے خود پیدا کر لی ہے؟ اگر خود پیدا کر لیتا انسان کے بس میں ہوتا تو دنیا میں کوئی بے وقوف کم عقل نہ رہتا، ہر شخص افلاطون و ارسطو ہی بن کر رہتا، کہیں کی لکڑی، کہیں کا لوہا، کہیں کے آلات و اوزار استعمال کر کے سواری کا ڈھانچہ بھی بن گیا، اب اس منوں اور ٹٹوں کے بھاری بوجھ کو لے کر زمین پر دوڑنے یا ہوا پر اڑنے کے لئے جس طاقت (پاور) کی ضرورت ہے وہ خواہ پیٹرول سے حاصل کی جائے یا ہوا اور پانی کے ٹکراؤ سے برقی صورت میں حاصل کی جائے، بہر حال سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے انسان نے کس چیز کو پیدا کیا ہے، پیٹرول اس نے پیدا کیا یا ہوا، پانی اس نے بنایا، انہیں آکسیجن، ہائیڈروجن کی طاقتیں اس نے پیدا کیں؟

اگر انسان ذرا بھی عقل سے کام لے تو اسکو سائنس کی اُچھو بہ کاری اور غوج کے اس زمانہ میں بھی اپنی بے بسی اور عاجزی ہی کا مشاہدہ ہوگا، اور اس اقرار کے بغیر نہ رہ سکے گا کہ ہر سواری کا چلنا اور رکنا سب خالق کائنات حق تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہے۔

غافل انسان اپنے ظاہری بوڑھو توڑ کے تصرفات جنکا دوسرا نام سائنسی ایجادات ہے ان پر فخر و غور کے نشہ میں ایسا مست ہو جاتا ہے کہ اصل حقیقت نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اس غفلت کا پردہ چاک کرتے ہیں اور بِسْمِ اللّٰهِ مَجِدِّهَا وَمُزْسِكِهَا

کی اصل حقیقت سامنے کر دیتے ہیں، دیکھنے میں تو یہ ایک دو لفظی فقرہ ہے مگر غور کیجئے تو یہ کلید اور کنجی ہے ایک ایسے دروازہ کی جہاں سے انسان اس مادی دنیا میں رہتے ہوئے روحانی عالم کا باشندہ بن جاتا ہے، اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں جمال حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔

یہیں سے مؤمن کی دنیا اور کافر کی دنیا میں فرق نمایاں ہو جاتا ہے، سواری پر دونوں سوار ہوتے ہیں لیکن مؤمن کا قدم جو سواری پر آتا ہے وہ اُس کو صرف زمین کی مسافت قطع نہیں کرتا بلکہ عالم بالا سے بھی روشناس کر دیتا ہے۔

دوسری اور تیسری آیت میں بتلایا کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کے سب اہل و عیال کشتی میں سوار ہو گئے مگر ایک لڑکا جس کا نام کنعان بتلایا جاتا ہے سوار ہونے سے رہ گیا تو پیرانہ شفقت سے حضرت نوح علیہ السلام نے اس کو پکارا کہ ہمارے ساتھ کشتی میں آ جاؤ، کافروں کے ساتھ نہ رہو کہ غرق ہو جاؤ گے، یہ لڑکا کافروں و دشمنوں کے ساتھ ساز باز رکھتا تھا اور حقیقت میں کافر تھا مگر غالباً حضرت نوح علیہ السلام کو اس کے کافر ہونے کا یقینی طور پر علم نہ تھا اور اگر علم تھا تو کفر سے توبہ کر کے ایمان لانے کی دعوت کے طور پر اس کو کشتی میں سوار ہونے اور کافروں کا ساتھ چھوڑنے کی نصیحت فرمائی، مگر اس بد بخت نے اس وقت بھی طوفان کو سرسری سمجھا اور کہنے لگا کہ آپ فکر نہ کریں، میں پہاڑ پر چڑھ کر طوفان سے بچ جاؤں گا، حضرت نوح علیہ السلام نے پھر متنبہ کیا کہ ظالم کس خیال میں ہے آج کوئی اونچی عمارت یا پہاڑ کسی کو اللہ کے عذاب سے بچا نہ والا نہیں اور بچنے کی کوئی صورت بجز اس کے نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی اس پر رحم فرما دیں، باپ بیٹے کی یہ گفتگو دور سے چل ہی رہی تھی کہ ایک موج اس طوفان کی آئی اور بیٹے کو بہا لے گئی، تاریخی روایت میں ہے کہ طوفان نوح علیہ السلام کا پانی بڑے سے بڑے پہاڑ کی چوٹی سے پندرہ گز اور بعض روایات کے لحاظ سے چالیس گز اونچائی پر تھا۔

چوتھی آیت میں طوفان کے ختم ہونے اور حالات کے ہموار ہونے کا بیان اس طرح کیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے زمین کو خطاب کر کے حکم دیا يَا اَرْضُ ابْلُغِي مَآئِكَ اے زمین تو اپنا پانی نکل لے، مراد یہ تھی کہ جس قدر پانی زمین سے اُبلتا تھا اس کے لئے یہ حکم دے دیا کہ اس کو پھر زمین اپنے اندر اتار لے، آسمان کو حکم دیا گیا کہ اب پانی برسنا بند کر دے، اس طرح زمین سے نکلا ہوا پانی پھر زمین میں چلا گیا اور آسمان سے آئندہ پانی برستا بند ہو گیا، آسمان سے برسا ہوا جتنا پانی زمین پر موجود تھا اس کو قدرت نے دریاؤں اور نہروں کی شکل دیدی جس سے انسان فائدہ اٹھائے (تفسیر قرطبی و مظہری)

اس آیت میں حق تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو خطاب کر کے احکام دیئے ہیں، حالانکہ

ظاہر نظر میں وہ کوئی ذی شعور چیزیں نہیں ہیں، اسی لئے بعض حضرات نے اس کو مجاز و استعارہ پر محمول کیا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ہماری نظر اور ہمارے اعتبار سے دنیا کی جتنی چیزیں بے شعور، بے حس، بے جان ہیں، حقیقت میں وہ سب ذی روح ذی شعور چیزیں ہیں البتہ ان کا شعور و ادراک اس درجہ کا نہیں جس درجہ کا انسان وغیرہ کو حاصل ہے اسی لئے ان کو غیر ذی شعور قرار دے کر احکام شرعیہ کا مکلف نہیں بنایا گیا، قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اس پر شاہد ہیں جیسے **وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا لَیْسَ لَہُ یَحْیِیْہُ** یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح نہ پڑھتی ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اس کی معرفت پر موقوف ہے اور معرفت عقل و شعور پر، اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں عقل و شعور اپنے اپنے موصلاً کے مطابق موجود ہے اسی عقل و شعور سے وہ اپنے خالق کو پہچانتی ہے اور جس کام پر اس کو اس کے پیدا کرنے والے نے لگا دیا ہے اس کام کو ہر چیز خوب سمجھتی ہے اور اس کی ادائیگی میں بڑی مضبوطی سے لگی ہوتی ہے، آیت قرآن **أَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقًا ثُمَّ ھَدٰی** کا یہی مطلب ہے، اس لئے اس آیت میں اگر آسمان و زمین کے خطاب کو حقیقی معنی میں خطاب قرار دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ بقول روحیؑ

خاک و باد و آب و آتش زندہ اند بامن و تو مردہ با حق زندہ اند

پو تھی آیت کے آخر میں فرمایا کہ زمین و آسمان نے احکام کی تعمیل کی تو طوفان کا قصہ ختم ہو گیا، اور سفینہ نوح علیہ السلام بؤدی پہاڑ پر ٹھہر گیا، اور ظالموں کو ہمیشہ کے لئے رحمت سے دور کہہ دیا گیا۔

جودی پہاڑ آج بھی اس نام سے قائم ہے اس کا محل وقوع حضرت نوح علیہ السلام کے وطن اصلی عراق، موصل کے شمال میں جزیرہ ابن عمر کے قریب آرمینیا کی سرحد پر ہے، یہ ایک کوہستانی سلسلہ ہے جس کے ایک حصہ کا نام بؤدی ہے، اسی کے ایک حصہ کو اراراط کہا جاتا ہے، موجودہ تورات میں کشتی ٹھہرنے کا مقام کوہ اراراط کو بتلایا ہے، ان دونوں روایتوں میں کوئی ایسا تضاد نہیں، مگر مشہور قدیم تاریخوں میں بھی یہی ہے کہ نوح علیہ السلام کی کشتی بؤدی پہاڑ پر آکر ٹھہری تھی۔

قدیم تاریخوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ عراق کے بہت سے مقامات میں اس کشتی کے ٹکڑے اب تک موجود ہیں جنکو تبرک کے طور پر رکھا اور استعمال کیا جاتا ہے۔

تفسیر طبری اور بغوی میں ہے کہ نوح علیہ السلام ۱۰ ماہ رجب کو کشتی میں سوار ہوئے تھے، چھ مہینہ تک یہ کشتی طوفان کے اوپر چلتی رہی، جب بیت اللہ شریف کے مقام پر پہنچی تو سب مرتبہ طواف کیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے بیت کو بلند کر کے غرق سے بچا لیا تھا، پھر احرار یوم عاشوراً

میں طوفان ختم ہو کر کشتی جبل بُجودی پر ٹھہری، حضرت نوح علیہ السلام نے اس روز شکرانہ کے طور پر روزہ رکھا اور کشتی میں جتنے آدمی ساتھ تھے سب کو روزہ رکھنے کا حکم دیا، بعض روایتوں میں ہے کہ کشتی کے شریک سب جانوروں نے بھی اس دن روزہ رکھا۔ (منظہری و قرطبی)

روزِ عاشوراء یعنی محرم کی دسویں تاریخ کی اہمیت تمام شرائع انبیاء میں قدیم سے چلی آتی ہے ابتداء اسلام میں رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے عاشوراء کا روزہ فرض تھا، رمضان کی فرضیت نازل ہونے کے بعد فرض نہیں، مگر سنت اور ثوابِ عظیم ہمیشہ کے لئے ہے۔

وَنَادَى نُوحٌ رَبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ

اور پکارا نوح نے اپنے رب کو کہا اے رب میرا بیٹا ہے میرے گھروالوں میں اور بیشک تیرا وعدہ

الْحَقُّ وَأَنْتَ أَحْكَمُ الْحَكَمِينَ ﴿۳۵﴾ قَالَ يُنُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ

سچا ہے اور تو سب سے بڑا حاکم ہے فرمایا اے نوح وہ نہیں تیرے گھروالوں میں

إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنِّي أَعِظُكَ

اس کے کام میں خراب سو مت پوچھ مجھ سے جو تجھ کو معلوم نہیں، میں نصیحت کرتا ہوں تجھ کو

أَنْ تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿۳۶﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي آعُوذُ بِكَ أَنْ

کہ نہ ہو جائے تو جاہلوں میں بولا اے رب میں پناہ لیتا ہوں تیری اس سے کہ

أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُنْ

پوچھوں تجھ سے جو معلوم نہ ہو مجھ کو اور اگر تو نہ بخشے مجھ کو اور رحم نہ کرے تو میں ہوں

مِّنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۳۷﴾ قِيلَ يُنُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِنَّا وَبَرَكَاتٍ

لقصان والوں میں، حکم ہوا اے نوح اتر سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے اور برکتوں

عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أَهْلِ مِّمَّن مَّعَكَ وَأَمَّهُمْ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَنَسِفُهُمُ

کے ساتھ تجھ پر اور ان فرقوں پر جو تیرے ساتھ ہیں، اور دوسرے فرقے ہیں کہ ہم فائدہ دیں گے ان کو پھر مٹا دیں گے

مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۳۸﴾ تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ

ان کو ہماری طرف سے عذاب دردناک یہ باتیں منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں کہ ہم بھیجتے ہیں تیری طرف

مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا فَاصْبِرْ

نہ تجھ کو ان کی خبر تھی اور نہ تیری قوم کو اس سے پہلے سو تو صبر کر

إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۳۹﴾

البتہ انجام بھلا ہے ڈرنے والوں کا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿۴۰﴾

خلاصہ تفسیر

اور جب، نوح علیہ السلام نے کنعان کو ایمان لانے کے لئے فرمایا اور اس نے نہ مانا تو اس کے غرق ہونے کے قبل انہوں نے اس امید پر کہ شاید حق تعالیٰ اپنی قدرت سے اس کے دل میں ایمان، القاء فرما دے اور ایمان لے آوے، اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا کہ اے میرے رب میرا یہ بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور آپ کا (یہ) وعدہ بالکل سچا ہے کہ گھر والوں میں جو ایمان والے ہیں ان کو بچالوں گا، اور (گو یہ سر دست ایمان والا اور مستحق نجات نہیں ہے لیکن) آپ احکم الحاکمین (اور بڑی قدرت والے) ہیں اگر آپ چاہیں تو اس کو ٹھون بنا دیں تاکہ یہ بھی اس وعدہ حقہ کا محل بن جائے، خلاصہ معروض کا دُعا یہ تھی اس کے مؤمن ہوجانے کے لئے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے نوح یہ شخص (ہمارے علم ازلی میں) تمہارے (ان) گھر والوں میں نہیں (جو ایمان لا کر نجات پاویں گے یعنی اس کی قسمت میں ایمان نہیں بلکہ یہ دُعا تک) تباہ کار (یعنی کافر رہنے والا) ہے سو مجھ سے ایسی چیز کی درخواست مت کرو جسکی تم کو خبر نہیں (یعنی ایسے امر محتمل کی دعا مت کرو) میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم نادانوں میں داخل نہ ہو جاؤ، نوح نے عرض کیا کہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ (آئندہ) آپ سے ایسے امر کی درخواست کروں جس کی مجھ کو خبر نہ ہو اور اگر ششہ معاف کر دیجئے کیونکہ اگر آپ میری مغفرت نہ فرماویں گے اور مجھ پر رحم نہ فرماویں گے تو میں تو بالکل تباہ ہی ہو جاؤں گا جب ہودی پرکشتی ٹھہرنے کے چند روز بعد پانی بالکل اتر گیا اس وقت نوح علیہ السلام سے کہا گیا (یعنی اللہ تعالیٰ نے خود یا کسی فرشتہ کے ذریعہ سے ارشاد فرمایا) کہ اے نوح اب ہودی پر سے زمین پر اترو ہماری طرف سے سلام اور برکتیں لیکر جو تم پر نازل ہوں گی اور ان جماعتوں پر کہ تمہارے ساتھ ہیں (کیونکہ ساتھ والے سب مسلمان تھے اور اس علت کے اشتراک سے قیامت تک کے مسلمانوں پر بھی سلام و برکات کا نزول معلوم ہو گیا) اور (چونکہ یہ کلام بعد والے مسلمانوں پر بھی برکات کے نازل ہونے پر دلالت کرتا ہے، اور بعد والوں میں بعضے کافر بھی ہوں گے اس لئے اُن کا حال بھی بیان فرماتے ہیں کہ) بہت سی ایسی جماعتیں بھی ہوں گی کہ ہم ان کو (دنیا میں) چند روز عیش دیں گے پھر (آخرت میں) ان پر ہماری طرف سے سزا سخت واقع ہوگی، یہ قصہ (آپ کے اعتبار سے) منجملہ اخبایہ غیب کے ہے جسکو ہم وحی کے ذریعہ سے آپ کو پہنچاتے ہیں اس (قصہ) کو اس (ہمارے بتلانے) کے قبل نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم (جانتی تھی) اس اعتبار سے غیب تھا اور بجز وحی کے دوسرے سب اسباب علم کے یقیناً مفقود ہیں پس ثابت ہو گیا

کہ آپ کو وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے اور یہی نبوت ہے لیکن یہ لوگ بعد ثبوت نبوت کے بھی آپ کی مخالفت کرتے ہیں، سو صبر کیجئے (جیسا اس قصہ میں نوح علیہ السلام کا صبر آپ کو معلوم ہوا ہے، یقیناً نیک انجامی متقیوں ہی کے لئے ہے) جیسا نوح علیہ السلام کے قصہ میں معلوم ہوا کہ کفار کا انجام بُرا اور مسلمانوں کا انجام اچھا ہوا اسی طرح ان کفار کا چند روزہ زور شور ہے پھر اخیر میں غلبہ حق ہی کو ہوگا۔

معارف و مسائل

سورہ ہود کی مذکورہ پانچ آیتوں میں طوفان نوح علیہ السلام کا باقی قصہ اور اس سے متعلق ہدایات مذکور ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کنعان جب والد بزرگوار کی نصیحت اور دعوت کے باوجود کشتی میں سوار نہ ہوا تو اس کو موج طوفان میں مبتلا دیکھ کر شفقت پدیری نے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا کہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں عرض کیا کہ آپ تے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میرے گھر والوں کو طوفان سے بچائیں گے اور بلاشبہ آپ کا وعدہ حق و صحیح ہے، مگر صورت حال یہ ہے کہ میرا بیٹا جو میرے گھر والوں میں داخل ہے وہ طوفان کی نذر ہو رہا ہے اور آپ تو احکم الحاکمین ہیں ہر چیز آپ کی قدرت میں ہے، اب بھی اسکو طوفان سے بچا سکتے ہیں۔

دوسری آیت میں حق تعالیٰ کی طرف سے اس کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام کو تنبیہ کی گئی کہ یہ لڑکا آپ کے اہل و عیال میں داخل نہیں رہا کیونکہ اُس کا عمل اچھا نہیں بلکہ تباہ کار ہے اس لئے آپ کو نہیں چاہئے کہ اس حقیقت حال سے بے خبر رہ کر مجھ سے کوئی سوال کریں، ہم تمہیں نصیحت کرتے ہیں کہ نادانوں میں داخل نہ ہو جاؤ۔

حق تعالیٰ کے اس ارشاد سے دو باتیں معلوم ہوئیں، اول یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اس بیٹے کے کفر کا پورا حال معلوم نہ تھا اس کے نفاق کی وجہ سے وہ اس کو مسلمان ہی جانتے تھے، اسی لئے اس کو اپنے اہل کا ایک فرد قرار دیکر طوفان سے بچانے کی دعا کر بیٹھے ورنہ اگر ان کو حقیقت حال معلوم ہوتی تو ایسی دُعا نہ کرتے، کیونکہ اُن کو صریح طور پر پہلے ہی یہ ہدایت دیدی گئی تھی کہ جب طوفان آجائے تو پھر آپ ان سرکشوں میں سے کسی کے متعلق کوئی سفارش کی گفتگو نہ فرمائیں، جیسا کہ پچھلی آیات میں گزر چکا ہے وَلَا تُخَاطِبُنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُمْ مُّغْرَقُونَ، اس صاف و صریح حکم کے بعد ناممکن تھا کہ پیغمبر خدا اس کی خلاف ورزی کی جرأت کرتے، بجز اس احتمال کے جسکو اوپر خلاصہ تفسیر میں لیا گیا ہے کہ اس دعا کا حاصل اس بیٹے کے

مؤمن ہو جانے کی دُعا ہے یہ نہیں کہ اس کے موجودہ حال میں اس کو طوفان سے بچایا جائے، لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی اس کے کفر سے لاعلمی اور اُس کی بنائے ہوئے دُعا نجات کو بھی حق تعالیٰ نے عذرِ صحیح قرار نہیں دیا اور اسی لئے تنبیہ کی گئی کہ بغیر علم کے ایسی دُعا کیوں کی، اور یہ بغیر اہل شان کی ایک ایسی لغزش ہے جسکو حضرت نوح علیہ السلام اُس وقت بھی اپنے عذر میں پیش کریں گے جب محشر میں پوری مخلوق خدا آپ سے شفاعت کرنے کی درخواست کریگی تو وہ فرمائیں گے کہ مجھ سے ایسی لغزش ہو چکی ہے اس لئے میں شفاعت کی جرات نہیں کر سکتا۔

کافر اور ظالم کے لئے اس سے ایک مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ دُعا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے دُعا جائز نہیں کہ دُعا کرنے والا پہلے یہ معلوم کر لے کہ جس کام کی دُعا کر رہا ہے وہ جائز و حلال ہے یا نہیں، مشتبہ حالت میں دُعا کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، تفسیر رُوح المعانی میں بحوالہ قاضی بیضاوی نقل کیا ہے کہ جب اس آیت سے مشتبہ الحال کے لئے دُعا کرنے کی ممانعت معلوم ہوئی تو جس معاملہ کا ناجائز و حرام ہونا معلوم ہو اُس کے لئے دُعا کا ناجائز ہونا بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گیا۔

(اس سے معلوم ہوا کہ اسجمل کے مشارح میں جو یہ عام رواج ہو گیا ہے کہ جو شخص کسی دُعا کے لئے آیا اُس کے واسطے ہاتھ اٹھا دیئے اور دُعا کر دی حالانکہ اکثر ان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس مقدمہ کے لئے یہ دُعا کر رہا ہے اُس میں یہ خود ناحق پر ہے یا ظالم ہے، یا کسی ایسے مقصد کے لئے دُعا کر رہا ہے جو اس کے لئے حلال نہیں، کوئی ایسی ملازمت اور منصب ہے جس میں یہ حرام میں مبتلا ہوگا یا کسی کی حق تلفی کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے گا۔

ایسی دُعائیں حالت معلوم ہونے کی صورت میں تو حرام و ناجائز ہیں ہی، اگر حالت اشتباہ کی حالت بھی ہو تو حقیقت حال اور معاملہ کے جائز ہونے کا علم حاصل کئے بغیر دُعا کیلئے اقدام کرنا بھی مناسب نہیں۔

دوسرا مسئلہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مؤمن اور کافر کے درمیان اگرچہ رشتہ قرابت کا ہو، مگر دینی اور اجتماعی معاملات میں اس رشتہ داری کا کوئی اثر نہیں ہوگا، کوئی شخص کتنا

مؤمن و کافر میں رشتہ اخوت نہیں ہو سکتا وطنی یا نسبی بنیاد پر قومیت کی تعمیر اصول اسلام سے بغاوت ہے

ہی عالی نسب ہو، کتنے ہی بڑے بزرگ کی اولاد ہو یہاں تک کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں داخل ہونے کا شرف رکھتا ہو، اگر وہ مؤمن نہیں ہے تو دینی معاملات میں اُس کے اس نسب عالی اور قرابت نبوی کا بھی کوئی لحاظ نہ کیا جائے گا، تمام دینی معاملات میں تو مدارِ کار ایمان اور صلاح و تقویٰ پر ہے، جو صلاح و تقویٰ ہے وہ اپنا ہے جو ایسا نہیں وہ بیگانہ ہے،

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد فدائے یک تن بیگانہ کا شنا باشد
اگر دینی معاملات بھی ان رشتہ داروں کی رعایت ہوتی تو بدر و احد کے میدانوں میں
بھائی کی تلوار بھائی پر نہ چلتی ، بدر و احد اور احزاب کے معرکے تو سب کے سب ایک ہی
خاندانوں کے افراد کے درمیان پیش آتے ہیں ، جس نے واضح کر دیا کہ اسلامی قومیت اور برادری
نسبی تعلقات یا وطنی اور لسانی وحدتوں پر دائر نہیں ہوتی بلکہ ایمان و عمل پر دائر ہے ، ایمان والے
خواہ کسی ملک کے باشندے اور کسی خاندان کے افراد اور کوئی زبان بولنے والے ہوں سب
ایک قوم اور ایک برادری ہیں **إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ** کا یہی مطلب ہے ، اور جو ایمان و عمل
صالح سے محروم ہیں وہ اسلامی برادری کے فرد نہیں ، قرآن کریم نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی
زبانی اس حقیقت کو بہت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے **إِنَّا بَنَوْا ذَا مِنْكَ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ**
مِنْ دُونِ اللَّهِ ، یعنی ہم تم سے بھی بری ہیں اور تمہارے معبودوں سے بھی ۔

اس مسئلہ میں اہقر نے دینی معاملات کی قید اس لئے لگائی ہے کہ دنیوی معاملات میں
حسین معاشرت ، حسن اخلاق اور احسان و کرم کا سلوک کرنا الگ چیز ہے وہ غیر صالح سے بھی
جائز بلکہ مستحسن اور ثواب ہے ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا تعامل غیر مسلموں کے
ساتھ احسان و سلوک کے بشمار واقعات اس پر شاہد ہیں ۔

آج کل جو وطنی اور لسانی یا لٹونی بنیادوں پر قومیت کی تعمیر کی جاتی ہے ، عرب برادری
ایک قوم ، ہندی ، سندھی دوسری قوم قرار دی جاتی ہے ، یہ قرآن و سنت کے خلاف اور رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے اصول سیاست سے بغاوت کے مرادف ہے ۔

تیسری آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے جو معذرت پیش ہوئی اس کا ذکر
ہے ، جس کا خلاصہ اللہ جل شانہ کی طرف رجوع والتجاء اور غلط کاموں سے بچنے کے لئے اللہ
تعالیٰ ہی کی پناہ لینے کی دعا اور پھر گزشتہ لغزش کی معافی اور مغفرت و رحمت کی درخواست ہے ۔
اس سے معلوم ہوا کہ انسان سے اگر کوئی خطا سرزد ہو جائے تو آئندہ اُس سے بچنے کیلئے
تنہا اپنے عزم و ارادہ پر بھروسہ نہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ سے پناہ اور یہ دعا مانگے کہ یا اللہ آپ
ہی مجھے خطاؤں اور گناہوں سے بچا سکتے ہیں ۔

چوتھی آیت میں قصہ طوفان کا خاتمہ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جب طوفان ختم ہو چکا اور
حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی بخودی پہاڑ پر ٹھہر گئی ، اور زمین کا پانی زمین نے نگل لیا ، اور آسمان
کا باقیماندہ پانی نہروں ، دریاؤں کی شکل میں محفوظ ہو گیا ، جس کے نتیجے میں زمین انسانی رہائش
کے قابل ہو گئی تو حضرت نوح علیہ السلام سے کہا گیا کہ اب آپ پہاڑ سے زمین پر اترئیے ، اور کوئی

فکر نہ کیجئے کیونکہ آپ کے ساتھ ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہوں گی، یعنی آفات اور مصائب سے سلامتی اور مال و اولاد میں وسعت و برکت ہوگی۔

اس ارشاد کے مطابق طوفان کے بعد دنیا میں ساری انسانی آبادی حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہے، قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمایا ہے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمُ الْبَاقِينَ، یعنی اس واقعہ کے بعد دنیا میں باقی رہنے والی سب قومیں صرف نوح علیہ السلام ہی کی ذریت و اولاد ہونگی، اسی لئے حضرت نوح علیہ السلام کو اہل تاریخ آدم ثانی کا نام دیتے ہیں۔

پھر یہ سلامت و برکت کا وعدہ جو حضرت نوح علیہ السلام سے کیا گیا ہے صرف اُن کی ذات تک محدود نہیں بلکہ فرمایا گیا وَعَلَىٰ أَهْلِ مِثْلِي مِثْلُ مَا مَلَكَتْ يَمِينُ یعنی جو امتیں اور جماعتیں آپ کے ساتھ کشتی میں سوار ہیں ان پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی اور برکت نازل ہوگی، حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والوں کو آیت میں أَهْلُ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو أُمَّة کی جمع ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ کشتی میں سوار ہونے والے مختلف قوموں اور امتوں پر مشتمل تھے حالانکہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ کشتی میں سوار ہونے والے زیادہ تر حضرت نوح علیہ السلام کے خاندان کے لوگ تھے اور محدودے چند دوسرے مؤمن بھی تھے، تو ان لوگوں کو مختلف امتیں اور قومیں اس لحاظ سے فرمایا گیا ہے کہ انکی آنے والی نسلوں میں مختلف امتیں اور قومیں ہونگی، اس سے معلوم ہوا کہ أَهْلُ مِثْلِي مِثْلُ مَا مَلَكَتْ يَمِينُ کے الفاظ میں وہ تمام نسل انسانی داخل ہے جو قیامت تک پیدا ہوگی۔

اسی لئے اس کی ضرورت پڑی کہ سلامت و برکت کے مضمون میں تفصیل کی جائے کیونکہ قیامت تک آنے والی نسل انسانی میں تو مؤمن بھی ہوں گے کافر بھی، مؤمن کے لئے تو سلامت و برکت اپنے عام مفہوم کے اعتبار سے درست ہے کہ دنیا میں بھی ان کو سلامت و برکت نصیب ہوگی آخرت میں بھی، لیکن اسی نسل میں جو کفار ہوں گے وہ تو جہنم کے دائمی عذاب میں مبتلا ہوں گے، ان کو سلامت و برکت کا محل قرار دینا کس طرح صحیح ہوگا اس لئے آخر آیت میں فرمایا وَأَهْلُ مِثْلِي مِثْلُ مَا مَلَكَتْ يَمِينُ یعنی دنیا کی سلامت و برکت تو اللہ تعالیٰ کا خواہن تھا ہے جس سے دوست دشمن سمجھی کھاتے پیتے ہیں اس میں وہ لوگ بھی شریک ہونگے جو نوح علیہ السلام کی اولاد میں کافر اختیار کریں گے لیکن آخرت کی نجات و فلاح یہ صرف مؤمنین کے لئے مخصوص ہوگی، کافر کو اس کے نیک اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں دے دلا کر فارغ کر دیا جائے گا، آخرت میں اُس کے لئے بجز عذاب کے کچھ نہ ہوگا۔

طوفانِ نوح کی یہ تفصیلی خبریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعہ وحی معذکر کے اپنی قوم کو

سنائیں تو یہ واقعہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی برحق ہونے کی ایک شہادت بن گیا اس پر متنبہ کرنے کے لئے پانچویں آیت میں ارشاد فرمایا کہ نوح علیہ السلام اور اُن کے طوفان کے واقعات یہ غیب کی خبریں ہیں جنکو نہ آپ پہلے سے جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم، عرب ہی اس سے واقف تھے، آپ نے اُن کو بتلایا تو اس کا راستہ بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے بذریعہ وحی آپ کو بتلایا ہے، کیونکہ اگر آپ کی قوم کے لوگ لکھے پڑھے اور تاریخ عالم سے واقفیت رکھنے والے ہوتے تو یہ خیال بھی ہو سکتا تھا کہ آپ نے ان لوگوں سے سنکر یہ واقعات بیان کر دیئے ہیں، لیکن جبکہ پوری قوم بھی ان واقعات سے بے خبر تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی دوسرے ملک میں تشریف نہیں لے گئے تو اس خبر کا راستہ صرف وحی متعین ہو گیا جو نبی کے پیغمبر برحق ہونے کی واضح دلیل ہے۔

آخر آیت میں رسول کریم کی تسلی دینے کے لئے فرمایا کہ آپ کی نبوت و رسالت پر آفتاب سے زیادہ روشن دلائل کے ہوتے ہوئے بھی اگر کچھ بدبخت نہیں مانتے اور آپ سے جھگڑا کرتے ہیں تو آپ کو اپنے پہلے پیغمبر نوح علیہ السلام کا اسوہ دیکھنا چاہئے کہ اُنہوں نے ایک ہزار سال کی طویل عمر ساری انہیں اذیتوں میں گزار دی، تو جس طرح اُنہوں نے صبر کیا آپ بھی ایسا ہی صبر سے کام لیں، کیونکہ یہ متعین ہے کہ انجام کار کامیابی متقی لوگوں کو ہی ملے گی۔

وَالِی عَادِ أَخَاهُمْ هُودٌ ۱۱ قَالَ یَقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ

اور عاد کی طرف ہم نے بھیجا ان کے بھائی ہود کو بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی تمہارا حاکم نہیں

غَیْرُہٗ ۱۲ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۱۳ ۱۴ یَقَوْمِ لَا اَسْأَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا ۱۵

سوائے اسکے تم سب بھوٹ کہتے ہو ، اے قوم میں تم سے نہیں مانگتا اس پر مزدوری

اِنْ اَجْرِیْ اِلَّا عَلٰی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ۱۶ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۱۷ ۱۸ وَ یَقَوْمِ

میری مزدوری اسی پر ہے جس نے بھوکو پیدا کیا پھر کیا تم نہیں سمجھتے ، اور اے قوم

اَسْتَغْفِرُ وَاَرْبَابُکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْہِ ۱۹ یُرْسِلُ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرًا رَّاوَدَ

گناہ بخشاؤ اپنے رب سے پھر رجوع کرو اسی کی طرف چھوڑ دینا تم پر آسمان سے دھاریں اور

یَزِدْکُمْ قُوَّةً ۲۰ اِلٰی قُوَّتِکُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ۲۱ ۲۲ قَالُوْا یٰھُوْدُ

زیادہ دے گا تم کو زور پر زور اور روگردانی نہ کرو گنہگار ہو کر بولے اے ہود

مَا جِئْنَا بِبَیِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِکِیْ ۲۳ اِلٰہِیْنَا عَنْ قَوْلِکَ وَمَا نَحْنُ

تو ہمارے پاس کوئی سند نیکر نہیں آیا اور ہم نہیں چھوڑنے والے اپنے ٹھکانوں (مبودوں) کو تیرے کہنے سے اور ہم نہیں

لَكَ يٰمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۴ اِنْ تَقُوْلُ اِلَّا اَعْتَرٰكَ بَعْضُ اِلٰهِنَا بِسُوْٓءٍ

تجھ کو ماننے والے ، ہم تو یہ ہی کہتے ہیں کہ تجھ کو آسیب پہنچایا ہے کسی ہمارے ٹھاکروں (موجودوں) نے

قَالَ اِنِّیْۤ اَشْهَدُ اللّٰہَ وَاَشْهَدُۤ اَآئِیْۤ اِنِّیْۤ اَتِّیْتُ بِرِجۡلِیْ عَرۡمَہَا تَشْرِکُوْنَ ۝۵۵ مِنْ

بُری طرح ، بولا میں گواہ کرتا ہوں اللہ کو اور تم گواہ رہو کہ میں بیزار ہوں اُن سے جو کون تم شریک کرتے ہو اس کے

دُوْنِہَا فَاَکِیۡدُوْنِیْ جَمِیۡعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنَ ۝۵۶ اِنِّیْۤ اَتَّوَكَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ

سوا سو بُرائی کرو میرے حق میں تم سب ملکر پھر مجھ کو مہلت نہ دو ، میں نے بھروسہ کیا اللہ پر

رَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مَّآ مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ہُوَ اَخِذْنَا بِصَدِیۡتِہَا اِنَّ سَرِیۡتَ

جو رب ہے میرا اور تمہارا ، کوئی نہیں زمین پر پاؤں دھرنے والا مگر اللہ کے ہاتھ میں ہے چوٹی اُسکی ، بیشک میرا رب ہے

عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیۡمٍ ۝۵۷ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاَفْقَدُۢ بَلٰغَتِکُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ

سیدھی راہ پر ، پھر اگر تم منہ پھیرو گے تو میں پہنچا چکا تم کو جو میرے ہاتھ بھیجا تھا

بِہَاۤ اِلَیۡکُمْ وَاَسْتَخْلِیۡفُ رَبِّیْۤ اَوْ مَا غَیۡرَکُمْ ؕ وَلَا تَضُرُّوۡنَہٗ شَیۡءًا ط

تمہاری طرف ، اور قائم مقام کرے گا میرا رب کوئی اور لوگ ، اور نہ بگاڑ سکو گے اللہ کا کچھ ،

اِنَّ رَبِّیْۤ اَعْلٰی کُلِّ شَیۡءٍ حَفِیۡظٌ ۝۵۸ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیۡنَا ہُوۡدًا وَّ

تحقیق میرا رب ہے ہر چیز پر نگہبان اور جب پہنچا ہمارا حکم ، بچا دیا ہم نے ہود کو اور

الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعًا بِرَحْمَۃٍ مِنَّا وَنَجَّیۡنَہُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ عَلِیۡظٍ ۝۵۹

جو لوگ ایمان لائے تھے اسکے ساتھ اپنی رحمت سے اور بچا دیا انکو ایک بھاری عذاب سے ،

وَتِلْکَ عَادٌ قَدْ جَآءَہُمۡ رَّسُوْلٌۭ مِّنۡہُمْ وَعَصَوْا رُسُلَہٗ وَاتَّبَعُوۡا اَمْرَ

اور یہ تھے عَاد کہ منکر ہوئے اپنے رب کی باتوں سے اور نہ مانا اس کے رسولوں کو اور مانا حکم ان کا

کُلِّ جَبَّارٍ عَنِیۡدٍ ۝۶۰ وَاتَّبَعُوۡا فِیۡ ہٰذِہِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ط

جو سرکش تھے مخالف ، اور پیچھے سے آئی انکو اس دنیا میں پھٹکار اور قیامت کے دن بھی

اَلَا اِنَّ عَادًا کَفَرُوۡۤا رَبَّہُمۡ ط اَلَا یُعَدُّۤ اِلَآءَ قَوْمِ ہٰٓؤُۡلَآءِ ۝۶۱ وَ اِلٰی ثَمُوۡدَ

سن لو عَاد منکر ہوئے اپنے رب سے سن لو پھٹکار ہے عَاد کو جو قوم تھی ہود کی اور ثمود کی طرف بھیجا

اٰخَاہُمۡ ضَلٰحًا مَّ قَالَ لِقَوْمِہٖۤ اَعْبُدُوۡا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ط ہُوَ

ان کا بھائی صالح ، بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی حاکم نہیں تمہارا اس کے سوا ، اسی نے

اَنْشَاَکُمْ مِّنۡ الْاَرْضِ وَاسْتَغْمَرَکُمْ فِیۡہَا فَاسْتَغْفِرُوۡہُ ثُمَّ تَوَلَّوۡا الْاٰیٰتِ

بنایا تم کو زمین سے اور بسایا تم کو اس میں سو گناہ بخشاؤ اس سے اور رجوع کرو اسکی طرف

إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ۖ ۶۱ قَالُوا يَصْلِحْ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا

تحقیق میرا رب نزدیک ہے قبول کرنے والا بولے اے صالح تمہارے توہم کو امید تھی

قَبْلَ هَذَا أَتَنهَنَّا أَنْ نَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّآ لَفِي شَكٍّ مِّمَّا

اس سے پہلے کیا تو ہم کو منع کرتا ہے کہ پرستش کریں جنکی پرستش کرتے رہے ہمارے باپ دادا ، اور ہم کو تنبیہ

تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ۖ ۶۲ قَالَ يَقَوْمِ أَمْرٌ يُتِمُّهُ إِن كُنْتُمْ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ

اس میں جس کی طرف تو بلاتا ہے ایسا کہ دل نہیں مانتا ، بولا اے قوم بھلا دیکھو تو اگر مجھ کو سمجھ میں گئی

مِّن رَّبِّي وَأَشْنِئْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ

اپنے رب کی طرف سے اور اس نے مجھ کو دی رحمت اپنی طرف سے پھر کون بچائے مجھ کو اس سے اگر اس کی نافرمانی کروں

فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ ۖ ۶۳ وَلَيَقَوْمُ هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ

سو تم کچھ نہیں بڑھاتے میرا سوائے نقصان کے اور اے قوم یہ اونٹنی ہے اللہ کی تمہارے لئے نشانی

فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أََرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابُ

سو چھوڑ دو اس کو کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں اور مت ہاتھ لگاؤ بری طرح پھر آپکڑے گا تم کو عذاب

قَرِيبٍ ۖ ۶۴ فَعَقَرُوهَا فَقَالَ تَلَمَّسُعُوآفِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ط ذَلِكَ

بہت جلد پھر اس کے پاؤں کاٹے تب کہا فائدہ اٹھا لو اپنے گھروں میں تین دن ، یہ

وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ ۖ ۶۵ فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا طَلْحًا وَالَّذِينَ

وعدہ ہے جو بھٹوانہ ہوگا پھر جب پہنچا حکم ہمارا بچا دیا ہم نے صالح کو اور جو

آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَمِنْ خِزْيِ ط يَوْمَئِذٍ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ

ایمان لائے اسکے ساتھ اپنی رحمت سے اور اس دن کی رسوائی سے بیشک تیرا رب وہی ہے

الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ۖ ۶۶ وَآخِذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ فَأَصْبَحُوا

زور والا زبردست ، اور پکڑ لیا اُن ظالموں کو ہولناک آواز نے پھر صبح کو رہ گئے

فِي دِيَارِهِمْ جَثِيمِينَ ۖ ۶۷ كَانَتْ لَهُمْ يَغْنَوُ فِيهَا ط

اپنے گھروں میں اندھے پڑے ہوئے جیسے کبھی رہے ہی نہ تھے وہاں ، سن لو

إِنَّ تَهُودَ أَكْفَرُوا سَرَبَّهُمْ ط لَا بُدَّ

مشرک ہو گئے اپنے رب سے ، سن لو پھٹکار ہے

لِتَهُودَ ۖ ۶۸

تہود کو

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف ان کے (برادری یا وطن کے) بھائی (حضرت) ہود (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا، انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا اے میری قوم تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہ ہونے کے قابل، نہیں تم (اس بت پرستی کے اعتقاد میں) محض مُفتری ہو (کیونکہ اس کا باطل ہونا دلیل سے ثابت ہے) اے میری قوم (میری نبوت جو دلائل سے ثابت ہے اس کی مزید تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ) میں تم سے (تبلیغ) پر کچھ معاوضہ نہیں مانگتا میرا معاوضہ تو صرف اس (اللہ) کے ذمہ ہے جس نے مجھ کو (عدم محض سے) پیدا کیا پھر کیا تم (اس کو) نہیں سمجھتے کہ دلیل نبوت موجود ہے اور اس کے خلاف کوئی وجہ شبہ کی نہیں پھر نبوت میں شبہ کی کیا وجہ، اور اے میری قوم تم اپنے گناہ (کفر و شرک وغیرہ) اپنے رب سے معاف کرو (یعنی ایمان لاؤ اور) پھر (ایمان لا کر) اس کی طرف (عبادت سے) متوجہ رہو یعنی عمل صالح کر دے ایمان و عمل صالح کی برکت سے، وہ تم پر خوب بارش برسا دیگا (در منثور میں ہے کہ قوم عاد پین سال متواتر قحط پڑا تھا اور ویسے بارش خود بھی مطلوب ہے) اور (ایمان) عمل کی برکت سے، تم کو قوت دیکر تمہاری قوت (موجودہ) میں ترقی کر دے گا پس ایمان لے آؤ اور مجرم رہ کر (ایمان سے) اعراض مت کرو، ان لوگوں نے جواب دیا کہ اے ہود آپ نے ہمارے سامنے (اپنے رسول بن اللہ ہونے کی) کوئی دلیل تو پیش نہیں کی (یہ قول ان کا عناد تھا) اور ہم آپ کے (صرف) کہنے سے تو اپنے معبودوں کی عبادت، کو چھوڑنے والے ہیں نہیں اور ہم کسی طرح آپ کا یقین کرنے والے نہیں (اور) ہمارا قول تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے آپ کو کسی خرابی میں (مثل جنون وغیرہ کے) مبتلا کر دیا ہے (چونکہ آپ نے انکی شان میں گستاخی کی انہوں نے باؤ لا کر دیا اس لئے ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو کہ خدا ایک ہے میں نبی ہوں) ہود (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (تم جو کہتے ہو کہ کسی بت نے مجھ کو باؤ لا کر دیا ہے تو میں (علی الاعلان) اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی (سُن لو اور) گواہ رہو کہ میں ان چیزوں سے (بالکل) بیزار ہوں جن کو تم خدا کے سوا شریک (عبادت) قرار دیتے ہو، سو (میری عداوت اول تو پہلے سے ظاہر ہے اور اب اس اعلان براءت سے اور زیادہ مؤکد ہو گئی تو اگر ان بتوں میں کچھ قوت ہے تو) تم (اور وہ) سب ملکر میرے ساتھ ہر طرح کا، داؤ گھات کر لو (اور) پھر مجھ کو ذرا مہلت نہ دو (اور کوئی گتہ نہ چھوڑو، دیکھو تو سہی میرا کیا کر لیں گے اور جب وہ مع تمہارے کچھ نہیں کر سکتے تو اکیلے تو کیا خاک کر سکتے ہیں اور میں یہ دعویٰ اس لئے دل کھول کر کر رہا ہوں کہ بت تو محض عاجز ترین ہیں

ان سے تو اس لئے نہیں ڈرتا، رہ گئے تم، سو گو تم کو کچھ قدرت طاقت حاصل ہے لیکن میں تم سے اس لئے نہیں ڈرتا کہ میں نے اللہ پر توکل کر لیا ہے جو میرا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک ہے جتنے روئے زمین پر چلنے والے ہیں سب کی چوٹی اس نے پکڑ رکھی ہے (یعنی سب اس کے قبضے میں ہیں، بے اس کے حکم کے کوئی کان نہیں ہلا سکتا اس لئے میں تم سے بھی نہیں ڈرتا اور اس قدر سے ایک نیا معجزہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ایک شخص تنہا ایسے بڑے بڑے زور آور لوگوں سے ایسی مخالفانہ باتیں کرے اور وہ اس کا کچھ نہ کر سکیں پس وہ جو کہتے تھے مَا جِئْنَا بِبَيِّنَةٍ اس سے اس کا بھی ایک جواب ہو گیا کہ اگر معجزہ سابقہ سے قطع نظر کی جاوے تو لوہہ دوسرا معجزہ ہے پس نبوت پر دلیل قائم ہو گئی اور اس میں جو منشاء اشتباہ تھا لَا غَيْرَ لَكَ بَعْضُ الْهَيْئَاتِ سَوَاءٌ اس کا بھی جواب ہو گیا پس نبوت ثابت ہو گئی، اس سے توحید کا وجوب بھی ثابت ہو گیا جسکی طرف میں دعویٰ کرتا ہوں اور تمہارا کہنا مَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا اِنْ هُوَ اِلَّا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ یہی ہے اور یقیناً میرا رب صراطِ مستقیم پر (چلنے سے ملتا) ہے (پس تم بھی اس صراطِ مستقیم کو اختیار کرو تاکہ مقبول و مقرب ہو جاؤ) پھر اگر اس بیان بلیغ کے بعد بھی (تم در راہ حق سے) پھرے رہو گے تو میں تو (مغذور سمجھا جاؤں گا کیونکہ) جو پیغام دیکر مجھ کو بھیجا گیا تھا وہ تم کو پہنچا چکا ہوں (لیکن تمہاری کبھتی آوے گی کہ تم کو اللہ تعالیٰ ہلاک کر دیگا، اور تمہاری جگہ میرا رب دوسرے لوگوں کو اس زمین میں آباد کر دیگا) سو تم اس اعراض و کفر میں اپنا ہی نقصان کر رہے ہو، اور اس کا تم کچھ نقصان نہیں کر رہے (اور اگر اس ہلاک میں کسی کو پریشانی ہو کہ خدا کو کیا خبر کہ کون کیا کر رہا ہے تو خوب سمجھ لو کہ) بالیقین میرا رب ہر شے کی نگہداشت کرتا ہے (اس کو سب خبر رہتی ہے، عرض ان تمام جھٹوں پر بھی ان لوگوں نے نہ مانا، اور سامان عذاب شروع ہوا سو) جب ہمارا حکم (عذاب کے لئے) پہنچا (اور ہوا کے طوفان کا عذاب نازل ہوا تو) ہم نے ہود (علیہ السلام) کو اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے ان کو اپنی عنایت سے (اس عذاب سے بچالیا) اور ان کو ہم نے ایک بہت ہی سخت عذاب سے بچالیا (آگے آوروں کو عبرت دلانے کے لئے فرماتے ہیں) اور یہ (جن کا ذکر ہوا) قوم عاد تھی جنہوں نے اپنے رب کی آیات (یعنی دلائل اور احکام) کا انکار کیا اور اسکے رسولوں کا کہنا نہ مانا اور تمام تر ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم (اور) ضدی تھے اور (ان افعال کا یہ نتیجہ ہوا کہ) اس دنیا میں بھی لعنت ان کے ساتھ ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی (ان کے ساتھ ساتھ رہے گی چنانچہ دنیا میں اسکا اثر عذاب طوفان سے ہلاک ہونا تھا اور آخرت میں دائمی عذاب ہوگا، خوب سن لو، قوم عاد نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، خوب سن لو اس کفر کا یہ خمیازہ ہوا کہ) رحمت سے دوری ہوئی (دونوں جہاں میں) عاد کو جو کہ ہود (علیہ السلام) کی قوم تھی، اور ہم نے (قوم) ثود کے پاس ان کے

بھائی صالح (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا اسے میری قوم (صاف) اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اس کا تم پر یہ انعام ہے کہ) اس نے تم کو زمین (کے مادہ سے) پیدا کیا اور تم کو اس (زمین) میں آباد کیا (یعنی ایجاد و بقا و دو نسل نعمتیں عطا فرمائیں جس میں سب نعمتیں آگئیں؛ جب وہ ایسا منعم ہے) تو تم اپنے گناہ (شرک و کفر وغیرہ) اس سے معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ اور) پھر (ایمان لا کر) اسکی طرف (عبادت سے) متوجہ رہو (یعنی عمل صالح کرو) بیشک میرا رب (اس شخص سے) قریب ہے (جو اس کی طرف متوجہ ہو اور اس شخص کی عرض) قبول کرنے والا ہے (جو اس سے گناہ معاف کراتا ہے) وہ لوگ کہنے لگے اے صالح تم تو اسکے قبل ہم میں ہونہار (معلوم ہوتے) تھے (یعنی ہم کو تم سے امید تھی کہ اپنی لیاقت و جاہت کے فخر قوم اور ہمارے لیے ناز اور ہمارے سر پرست بنو گے) افسوس اس وقت جو باتیں کر رہے ہو اس سے تو ساری امیدیں خاک میں ملتی نظر آتی ہیں کیا تم ہم کو ان چیزوں کی عبادت سے منع کرتے ہو جنکی عبادت ہمارے بڑے کرتے آئے ہیں (یعنی تم ان سے منع مت کرو) اور جس دین کی طرف تم ہم کو بلا رہے ہو (یعنی توحید) واقعی تم تو اسکی طرف بڑی (بھائی) خبریں ہیں جس نے ہم کو رد دین میں ڈال رکھا ہے کہ مسئلہ توحید ہمارے خیال ہی میں نہیں آتا (آپ نے جواب میں) فرمایا اے میری قوم (تم جو کہتے ہو کہ تم توحید کی دعا اور بہتری سے نہایت کر دو) بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی جانب سے دلیل پر (قائم) ہوں (جس سے توحید ثابت ہے) اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے رحمت (یعنی نبوت) عطا فرمائی ہو (جس سے اس توحید کی دعوت کا میں مامور ہوں) سو (اس حالت میں) اگر میں خدا کا کہنا نہ مانوں (اور دعوت توحید کو ترک کر دوں جیسا تم کہتے ہو) تو یہ بتلاؤ کہ (پھر مجھ کو خدا (کے عذاب) سے کون بچالے گا تو تم تو (ایسا بڑا مشورہ دیکر) سر اسر میرا نقصان ہی کر رہے ہو یعنی اگر خدا نخواستہ قبول کر لوں تو بجز نقصان کے اور کیا ہاتھ آوے گا اور چونکہ انہوں نے معجزہ کی بھی شہادت رسالت کے لئے درخواست کی تھی اس لئے آپ نے فرمایا) اور اے میری قوم (تم جو معجزہ چاہتے ہو سو) یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل (بنا کر ظاہر کی گئی) ہے (اور اسی لئے اللہ کی اونٹنی کہلاتی کہ اللہ کی دلیل ہے) سو (علاوہ اس کے یہ بوجہ معجزہ ہونے کے میری رسالت پر دلیل ہے خود اس کے بھی کچھ حقوق ہیں) مثلاً ان کے یہ ہے کہ اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں (گھاس چارہ) کھاتی پھر اگرے (اسی طرح اپنی باری کے دن پانی پیتی رہے جیسا دوسری آیت میں ہے) اور اس کو برائی (اور تکلیف دہی) کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کبھی تم کو توری عذاب آپکڑے (یعنی دیر نہ لگے) سو انہوں نے (باوجود اس اتمام حجت کے) اس (اونٹنی) کو مار ڈالا تو صالح (علیہ السلام) نے فرمایا (خیر) تم اپنے گھروں میں تین دن اور بسر کرو (تین دن کے بعد عذاب آتا ہے اور) یہ ایسا وعدہ ہے جس میں ذرا جھوٹ نہیں (کیونکہ من جانتہا ہے) سو (تین دن گزرنے کے بعد) جب ہمارا حکم (عذاب کے لئے) پہنچا ہم نے صالح (علیہ السلام) کو اور جو ان کے ہمراہ

اہل ایمان تھے ان کو اپنی عنایت سے (اس عذاب سے) بچالیا اور (ان کو کیسی چیز سے بچالیا) اس دن کی بڑی رسوائی سے بچالیا (کیونکہ قہر الہی میں مبتلا ہونے سے بڑھ کر کیا رسوائی ہوگی) بیشک آپ کا رب ہی قوت والا غلبہ والا ہے جس کو چاہے مزا دیدے جسکو چاہے بچالے اور ان ظالموں کو ایک لغو نے آدبایا (کہ وہ آواز تھی جبیل علیہ السلام کی) جس سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے اور ان کی یہ حالت ہو گئی، جیسے ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے، خوب سن لو (قوم) تمہود نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، خوب سن لو (اس کفر کا یہ خمیازہ ہوا کہ) رحمت سے تمہود کو دوری ہوئی۔

معارف و مسائل

سورۃ ہود کی مذکورہ پہلی گیارہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کا ذکر ہے جنکے نام سے یہ سورت موسوم ہے، اس سورت میں نوح علیہ السلام سے لیکر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک قرآن کریم کے خاص طرز میں سات انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے واقعات مذکور ہیں، جن میں عبرت و موعظت کے ایسے مظاہر موجود ہیں کہ جس دل میں ذرا بھی حیات اور شعور باقی ہو وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، عبرت کے علاوہ ایمان اور عمل صالح کے بہت سے اصول و فروع اور انسان کے لئے بہترین ہدایات موجود ہیں۔

قصص و واقعات تو اس میں سات پیغمبروں کے درج ہیں مگر سورت کا نام حضرت ہود علیہ السلام کے نام سے منسوب کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حضرت ہود علیہ السلام کے قصہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ہود علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے قوم عاد میں مبعوث فرمایا، یہ قوم اپنے ڈیل ڈول اور قوت و شجاعت کے اعتبار سے پورے عالم میں ممتاز سمجھی جاتی تھی، حضرت ہود علیہ السلام بھی اسی قوم کے فرد تھے، لفظ **آخَاهُمْ هُودًا** میں اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، مگر یہ اتنی قوی اور بہادر قوم افسوس کہ اپنے عقل و فکر کو کھو بیٹھی تھی اور اپنے ہاتھوں سے تراشی ہوئی پتھروں کی مورتیوں کو اپنا خدا و معبود بنا رکھا تھا۔

حضرت ہود علیہ السلام نے جو دعوت دین اپنی قوم کے سامنے پیش کی اُس کی تین اُصولی باتیں ابتدائی تین آیتوں میں مذکور ہیں:۔ اول دعوت توحید اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو لائق عبادت سمجھنا جھوٹ اور افتراء ہے، دوسرے یہ کہ میں جو یہ دعوت توحید لیکر آیا ہوں اور اُس کیلئے اپنی زندگی کو وقف کر رکھا ہے تم یہ تو سوچو سمجھو کہ میں نے یہ مشقت و محنت کیوں اختیار کر رکھی ہے، نہ میں

تم سے اس خدمت کا کوئی معاوضہ مانگتا ہوں نہ مجھے تمہاری طرف سے کوئی مادی فائدہ پہنچتا ہے اگر میں اس کو اللہ تعالیٰ کا فرمان اور حق نہ سمجھتا تو آخر ضرورت کیا تھی کہ تمہیں دعوت دینے اور تمہاری اصلاح کرنے میں اتنی محنت برداشت کرتا۔

وَعظ و نصیحت اور دعوت دین پر ابھرت

قرآن کریم نے یہ بات تقریباً سب ہی انبیاء کی زبان سے نقل کی ہے کہ ہم تم سے اپنی دعوت و محنت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا اگر معاوضہ لیا جائے تو دعوت مؤثر نہیں رہتی، جس پر تجربہ شاہد ہے کہ وعظ و نصیحت پر ابھرت لینے والوں کی بات سامعین پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

تیسری بات یہ فرمائی کہ اپنی پچھلی زندگی میں جو کفر و گناہ تم کر چکے ہو، اللہ تعالیٰ سے اُن کی مغفرت مانگو اور اگلی زندگی میں ان سب گناہوں سے توبہ یعنی اس کا پختہ ارادہ اور معاہدہ کرو کہ اب اُن کے پاس نہ جائیں گے، اگر تم نے یہ استغفار و توبہ کا عمل کر لیا تو اس کے نتیجہ میں آخرت کی دائمی فلاح تو ملے ہی گی، دنیا میں بھی اُس کے بڑے فوائد کا مشاہدہ کرو گے، ایک یہ کہ توبہ و استغفار کرنے سے تمہاری قحط سالی دور ہو جائے گی، وقت پر خوب بارش ہوگی جس سے تمہارے رزق میں وسعت پیدا ہوگی، دوسرے یہ کہ تمہاری طاقت و قوت بڑھ جائے گی۔

یہاں طاقت و قوت کا لفظ عام ہے جس میں بدنی صحت و قوت بھی داخل ہے اور وہ طاقت بھی جو مال اور اولاد کی بہتات سے انسان کو حاصل ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ گناہوں سے توبہ و استغفار کا خاصہ یہ ہے کہ دنیا میں بھی رزق میں وسعت اور مال و اولاد میں برکت ہوتی ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام کی قوم نے ان کی دعوت کا جواب وہی اپنی جاہلانہ روش سے دیا کہ آپ نے ہمیں کوئی معجزہ تو دکھلایا نہیں صرف زبانی بات ہے اس لئے ہم آپ کے کہنے سے اپنے معبودوں کو نہ چھوڑیں گے اور آپ پر ایمان نہ لائیں گے، بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ ہمارے معبود بتوں کو بڑا کہنے کی وجہ سے آپ کسی دماغی خرابی میں مبتلا ہو گئے اس لئے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں ہود علیہ السلام نے پیغمبرانہ جرأت کے ساتھ فرمایا کہ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو سن لو کہ میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں اللہ کے سوا تمہارے سب معبودوں سے بیزار ہوں اب تم اور تمہارے بت سب ملکر میرے خلاف جو کچھ داؤ گھات کر سکتے ہو کر لو اور اگر میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو تو بگاڑ لو اور مجھے ذرا مہلت بھی نہ دو۔

اور فرمایا کہ اتنی بڑی بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں نے اللہ پر توکل اور بھروسہ کر لیا ہے جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، جتنے روئے زمین پر چلنے والے ہیں سب کی چوٹی اُس نے پکڑ رکھی ہے

کسی کی مجال نہیں کہ اُس کے اذن و مشیت کے بغیر کسی کو ذرہ برابر نقصان یا تکلیف پہنچا سکے، یقیناً میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے، یعنی جو صراطِ مستقیم پر چلتا ہے، رب اُس کو ملتا ہے، اُس کی مدد کرتا ہے۔

پوری قوم کے مقابلہ میں ایسا بلند بانگ دھواں اور ان کو خیرت دلانا اور پھر پوری بہادر قوم میں سے کسی کی مجال نہ ہونا کہ اُن کے مقابلہ میں کوئی حرکت کرے، یہ سب ایک مستقل معجزہ تھا ہود علیہ السلام کا، جس سے ان کی اس بات کا بھی جواب ہو گیا کہ آپ نے ہمیں کوئی معجزہ نہیں دکھلایا، اور اسکا بھی جواب ہو گیا کہ ہمارے بتوں نے آپ کو دماغی خرابی میں مبتلا کر دیا ہے کیونکہ اگر بتوں میں یہ طاقت ہوتی تو اس وقت ان کو زندہ نہ پھوڑتے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر تم اسی طرح حق سے برگشتہ رہو گے تو سمجھ لو کہ جو پیغام دیکر مجھے بھیجا گیا ہے میں تمہارے سامنے پہنچا چکا ہوں تو اب اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہے کہ تم پر خدا کا قہر و غضب آجائے اور تم سب نیست و نابود ہو جاؤ، اور میرا رب تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو اس زمین پر آباد کر دے، اور اس معاملہ میں جو کچھ کر رہے ہو اپنا ہی نقصان کر رہے ہو، اللہ تعالیٰ کا کچھ نقصان نہیں کر رہے، یقیناً میرا رب ہر چیز کی نگہداشت کرتا ہے وہ تمہارے ہر کام اور خیال سے باخبر ہے۔ ان لوگوں نے ان باتوں میں سے کسی چیز پر کان نہ دھرا اور اپنی سرکشی پر قائم رہے تو خدا تعالیٰ کا عذاب ہوا کہ طوفان کی صورت میں ان پر نازل ہوا جس نے مکانات اور درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ دیا، آدمی اور جانور ہوا میں اڑ کر آسمانی فضا تک جاتے اور وہاں سے اوندھے گرتے تھے آسمان کی طرف سے انسانوں کی چیخ پکار سنائی دیتی تھی، یہاں تک کہ یہ میثاق قوت اور ڈیل ڈول رکھنے والی قوم پوری کی پوری ہلاک و بہاد ہو گئی۔

جب اس قوم پر عذاب الہی کا حکم نافذ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے سنتِ الہیہ کے مطابق اپنے پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کو اس سخت عذاب سے بچالیا کہ عذاب آنے سے پہلے اُن کو اس جگہ سے نکل جانے کا حکم دیدیا گیا۔

قوم عاد کے واقعہ اور عذاب کا ذکر کرنے کے بعد دوسروں کو عبرت حاصل کرنے کی تلقین کرنے کے لئے ارشاد فرمایا کہ یہ ہے وہ قوم عاد جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کو جھٹلایا اور اپنے رسولوں کی نافرمانی کی اور ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم اور ضدی تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں بھی لعنت یعنی رحمت سے دوری ان کے ساتھ ساتھ لگی رہی اور قیامت میں بھی اسی طرح ساتھ لگی رہے گی۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ قوم عاد پر ہوا کا طوفان مسلط ہوا تھا، مگر سورہ مؤمنون میں یہ مذکور ہے کہ ان کو ایک سخت آواز کے ذریعہ ہلاک کیا گیا، ہو سکتا ہے کہ قوم ہود علیہ السلام پر دونوں قسم

کے عذاب نازل ہوئے ہوں۔

قوم عاد اور ہود علیہ السلام کا واقعہ تمام ہوا۔

اس کے بعد آٹھ آیتوں میں حضرت صالح علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے جو قوم عاد کی دوسری شاخ یعنی قوم ثمود کی طرف مبعوث ہوئے تھے، انہوں نے بھی اپنی قوم کو سب سے پہلے توحید کی دعوت دی، قوم نے حسبِ عادت ان کو بھٹلایا اور یہ ضد کی کہ آپ کا نبی برحق ہونا ہم جب تسلیم کریں جب کہ ہمارے سامنے اس پہاڑ کی چٹان میں سے ایک اونٹنی ایسی ایسی نکل آئے۔

صالح علیہ السلام نے ان کو ڈرایا کہ تمہارا منہ مانگا معجزہ اگر اللہ تعالیٰ نے ظاہر کر دیا اور پھر بھی تم نے ایمان لانے میں کوئی کوتاہی کی تو عاقبت اللہ کے مطابق تم پر عذاب آجائے گا اور سب ہلاک و برباد ہو جاؤ گے، مگر وہ اپنی ضد سے باز نہ آئے اللہ تعالیٰ نے ان کا مطلوبہ معجزہ اپنی قدرتِ کاملہ سے ظاہر فرمادیا، پہاڑ کی چٹان شق ہو کر ان کے بتائے ہوئے اوصاف کی اونٹنی برآمد ہو گئی، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس اونٹنی کو کوئی تکلیف نہ پہنچائیں ورنہ تم پر عذاب آجائے گا مگر وہ اس پر بھی قائم نہ رہے، اونٹنی کو ہلاک کر ڈالا، بالآخر خدا تعالیٰ نے ان کو پکڑ لیا، حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے مؤمن ساتھی عذاب سے بچائے گئے باقی پوری قوم ایک سخت ہیبت ناک آواز کے ذریعہ ہلاک کر دی گئی۔

اس واقعہ میں حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَذَا، یعنی آپ کے دعوائے نبوت اور بت پرستی کو منع کرنے سے پہلے ہم کو آپ سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں کہ آپ ہماری قوم کے لئے بڑے مصلح اور رہنما ثابت ہوں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے انبیاء کی پرورش بچپن ہی سے نہایت پاکیزہ اخلاق و عادات میں کرتے ہیں جسکو دیکھ کر بھی ان سے محبت کرتے اور عظمت سے پیش آتے ہیں جیسا کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اعلانِ نبوت سے پہلے سارا عرب امین کا خطاب دیتا اور سچا اور صالح اعتقاد رکھتا تھا، نبوت کے دعویٰ اور بت پرستی سے مخالفت کرنے پر یہ سب مخالف ہو گئے۔

تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ یعنی جب "لوگوں نے حکم خداوندی کی خلاف ورزی کر کے اس معجزہ والی اونٹنی کو مار ڈالا تو جیسا پہلے ان کو متنبہ کر دیا گیا تھا کہ ایسا کر دگے تو اللہ کا عذاب تم پر آئے گا، اب وہ عذاب اس طرح آیا کہ ان کو تین روز کی مہلت دی گئی اور بتلا دیا گیا کہ چوتھے روز تم سب ہلاک کئے جاؤ گے۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ تین روز جمعرات، جمعہ اور ہفتہ تھے، اتوار کے روز ان پر عذاب نازل ہوا وَ اخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ یعنی ان ظالموں کو پکڑ لیا ایک سخت آواز نے، یہ سخت آواز

حضرت جبریل علیہ السلام کی تھی جس میں ساری دنیا کی بچیوں کی کڑک سے زیادہ ہیبت ناک آواز تھی جسکو انسانی قلب و دماغ برداشت نہیں کر سکا، ہیبت سے سب کے دل پھٹ گئے اور سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قوم صالح سخت آواز کے ذریعہ ہلاک کی گئی ہے لیکن سورہ اعراف میں ان کے متعلق یہ آیا ہے فَآخَذَ اللَّهُ الرِّجْفَةَ یعنی پکڑ لیا اُن کو زلزلہ نے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر عذاب زلزلہ کا آیا تھا، قرطبی نے فرمایا کہ اس میں کوئی تضاد نہیں، ہو سکتا ہے کہ پہلے زلزلہ آیا ہو پھر سخت آواز سے سب ہلاک کر دیئے گئے ہوں۔ واللہ اعلم

وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَى قَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ

اور البتہ آپکے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لیکر بولے سلام وہ بولا سلام ہے

فَمَا لَبِثَ أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِئِدٍ ۝۶۹ فَلَمَّا رَأَىٰ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ

پھر دیر نہ کی کہ لے آیا ایک بھڑا تھلا ہوا ۔ پھر جب دیکھا ان کے ہاتھ نہیں آتے

إِلَيْهِ تَكْرِهُهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أَتَيْنَا بِسَلَامٍ

کھانے پر تو کھٹکا اور دل میں ان سے ڈرا ، وہ بولے مت ڈر ہم بھیجے ہوئے آتے ہیں

إِلَىٰ قَوْمِ لُوطٍ ۝۷۰ وَامْرَأَتُ قَائِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَلْيَسَّرْنَا لَهَا تِلْكَ

طرف قوم لوط کی ، اور اس کی عورت کھڑی تھی تب وہ ہنس پڑی پھر ہم نے خوشخبری دی اسکو اسکی

وَمِنْ وَرَاءِهَا سُلَاقٌ يَعْقُوبُ ۝۷۱ قَالَتْ يُوْثِلُنِي آلِدٌ وَأَنَا عَجُوزٌ

کے پیدا ہونے کی ، اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی ، بولی اے خرابی کیا میں بچہ جنوں گی اور میں بڑھیا ہوں

وَهَذَا ابْنُكِ شَيْخًا طَالَانَ هَذَا الشَّيْءُ عَجِيبٌ ۝۷۲ قَالُوا أَتَعْجَبِينَ

اور یہ خاوند میرا ہے بوڑھا ، یہ تو ایک عجیب بات ہے ، وہ بولے کیا تو تعجب کرتی ہے

مِنْ أَمْرِ اللَّهِ سَرَحَمَتُ اللَّهِ وَبَرَكَتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ

اللہ کے حکم سے اللہ کی رحمت ہے اور برکتیں تم پر اے گھر والو ! تحقیق اللہ ہے

حَمِيدٌ مُّجِيدٌ ۝۷۳

تعریف کیا گیا بڑائیوں والا ۔

مُخَلَّصَةٌ تَفْسِير

اور ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے (بشکل بشر) ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس (اُن کے فرزند

اسحاق علیہ السلام کی، بشارت لیکر آئے (گو مقصود اعظم ان کے آنے کا قوم نوط پر غذاب واقع کرنا تھا، لِقَوْلِهِ تَعَالٰی فَمَا خَطْبُكُمْ اَیْنَ) اور (آنے کے وقت) انہوں نے سلام کیا، ابراہیم علیہ السلام نے بھی سلام کیا (اور پہچانا نہیں کہ یہ فرشتے ہیں معمولی مہمان سمجھے، پھر دیر نہیں لگائی کہ ایک تلا ہوا (قریہ) لِقَوْلِهِ تَعَالٰی سَمِیْنِ) پھر الائے (اور ان کے سامنے رکھ دیا، یہ تو فرشتے تھے کیوں کھانے لگے تھے) سو جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کھانے تک نہیں بڑھتے تو ان سے متوش ہوئے اور ان سے دل میں خوف زدہ ہوئے (کہ یہ مہمان تو نہیں کوئی مخالف نہ ہوں کہ بارودہ فاسد آئے ہوں اور میں گھر میں ہوں احباب و اصحاب پاس نہیں یہاں تک کہ تے تکلفی سے اس کو زبان سے بھی ظاہر کر دیا، لِقَوْلِهِ تَعَالٰی قَالَ اَقَامْتُكُمْ وَجِلْدُونَ) وہ فرشتے کہنے لگے ڈرو مت (ہم آدمی نہیں ہیں فرشتے ہیں آپ کے پاس بشارت لیکر آئے ہیں کہ آپ کے ایک فرزند پیدا ہوگا اسحاق اور اس کے پیچھے ایک فرزند ہوگا یعقوب، اور بشارت اس لئے کہا کہ اول تو اولاد خوشی کی چیز ہے، پھر ابراہیم علیہ السلام بوڑھے ہو گئے تھے بی بی بھی بہت بوڑھی تھیں امید اولاد کی نہ رہی تھی، آپ نے نوزبت سے توجہ کر کے پہچان لیا کہ واقعی فرشتے ہیں، لیکن فراست نبوت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کے سوا اور بھی کسی بڑے کام کے لئے آئے ہیں اس لئے اس کی تعین کے ساتھ سوال کیا فَمَا خَطْبُكُمْ یعنی کس کام کے لئے آئے ہیں؟ اس وقت انہوں نے کہا کہ، ہم قوم نوط کی طرف بھیجے گئے ہیں کہ ان کو مترا کفر میں ہلاک کریں، ان میں تو یہ گفتگو ہو رہی تھی، اور ابراہیم علیہ السلام کی بی بی (حضرت سارہ کہیں) کھڑی (شن رہی) تھیں پس (اولاد کی خبر سن کر جس کی ان کو بعد اس کے کہ اسمعیل علیہ السلام بطن ہاجرہ سے متولد ہوئے تمنا بھی تھی، خوشی سے) ہنسیں (اور بولتی پکارتی آئیں اور تعجب سے ماتھے پر ہاتھ مارا، لِقَوْلِهِ تَعَالٰی فَاَقْبَلَتْ اَمْرًا ثُمَّ فِيْ صَوْرَةٍ فَصَبَّغَتْ وَجْهَهَا، سو ہم نے یعنی ہمارے فرشتوں نے، ان کو (مکرر) بشارت دی اسحاق کے پیدا ہونے کی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی (جو کہ اسحاق کے فرزند ہوں گے جس سے معلوم ہو گیا کہ تمہارے ہاں فرزند ہوگا اور زندہ رہے گا یہاں تک کہ وہ بھی صاحب اولاد ہوگا، اس وقت کہنے لگیں کہ ہائے خاک پڑے اب میں بچہ جنوں کی بڑھیا ہو کر اور یہ میرے میاں (بیٹھے) ہیں بالکل بوڑھے، واقعی یہ بھی عجیب بات ہے، فرشتوں نے کہا کہ کیا (خاندان نبوت میں رہ کر اور ہمیشہ معجزات و معاملات عجیبہ دیکھ دیکھ کر، تم خدا کے کاموں میں تعجب کرتی ہو اور خصوصاً) اس خاندان کے لوگوں پر تو اللہ تعالیٰ کی (خاص) رحمت اور اس کی (انواع و اقسام) برکتیں (نازل ہوتی رہتی) ہیں بیشک وہ (اللہ تعالیٰ) تعریف کے لائق (اور) بڑی شان والا ہے (وہ بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے، پس بجائے تعجب کے اس کی تعریف اور شکر میں مشغول ہو)۔

معارف و مسائل

ان پانچ آیتوں میں حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہم السلام کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چند فرشتوں کو ان کے پاس اولاد کی بشارت دینے کے لئے بھیجا کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ سے کوئی اولاد نہ تھی اور ان کو اولاد کی تمنا تھی مگر دونوں کا بڑھاپا تھا بظاہر کوئی امید نہ تھی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ خوشخبری بھیجی اور وہ بھی اس شان کی کہ نرینہ اولاد ہوگی اور ان کا نام بھی اسحاق تجویز فرمادیا اور پھر یہ بھی بتلادیا کہ وہ زندہ رہیں گے اور وہ بھی صاحب اولاد ہوں گے، ان کے لڑکے کا نام یعقوب ہوگا اور دونوں اللہ تعالیٰ کے رسول و پیغمبر ہوں گے، یہ فرشتے چونکہ بشکل انسانی آئے تھے اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے ان کو عام مہمان سمجھ کر مہمان نوازی شروع کی، بھونا ہوا گوشت لاکر سامنے رکھا، مگر وہ تو حقیقتہً فرشتے تھے کھانے پینے سے پاک، اس لئے کھانا سامنے ہونیکے باوجود اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا، ابراہیم علیہ السلام کو یہ دیکھ کر اندیشہ لاحق ہوا کہ یہ مہمان نہیں معلوم ہوتے ممکن ہے کسی فساد کی نیت سے آئے ہوں، فرشتوں نے ان کا یہ اندیشہ معلوم کر کے بات کھول دی اور بتلادیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں آپ گھبرائیں نہیں، ہم آپ کو اولاد کی بشارت دینے کے علاوہ ایک اور کام کے لئے بھی بھیجے گئے ہیں کہ قوم کو طہر عذاب نازل کریں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ پس پردہ یہ گفتگو سن رہی تھیں، جب معلوم ہو گیا کہ یہ انسان نہیں فرشتے ہیں تو پردہ کی ضرورت نہ رہی، بڑھاپے میں اولاد کی خوشخبری سن کر ہنس پڑیں اور کہنے لگیں کہ کیا میں بڑھیا ہو کر اولاد جنوں گی، اور یہ میرے شوہر بھی بوڑھے ہیں، فرشتوں نے جواب دیا کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کے حکم پر تعجب کرتی ہو جس کی قدرت میں سب کچھ ہے، خصوصاً تم خاندان نبوت میں رہ کر اس کا مشاہدہ بھی کرتی رہتی ہو کہ اس خاندان پر اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی رحمت و برکت نازل ہوتی رہتی ہے جو اکثر سلسلہ اسباب ظاہری سے بالاتر ہوتی ہے پھر تعجب کی کیا بات ہے۔ یہ اس واقعہ کا خلاصہ ہے آگے آیات مذکورہ کی پوری تفصیل دیکھئے، پہلی آیت میں بتلایا ہے کہ یہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس کوئی خوشخبری لے کر آئے تھے اس خوشخبری کا ذکر آگے تیسری آیت میں ہے، فَبَشِّرْهُمَا بِإِسْحَاقَ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ تین فرشتے، جبریل، میکائیل، اور اسرافیل تھے (قرطبی)، انہوں نے بشکل انسانی آکر ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سلام کا جواب دیا اور ان کو انسان سمجھ کر مہمان نوازی شروع کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے وہ انسان ہیں جنہوں نے دنیا میں مہمان نوازی کی رسم جاری

فرمائی (قرطبی) ان کا معمول یہ تھا کہ کبھی تنہا کھانا نہ کھاتے بلکہ ہر کھانے کے وقت تلاش کرتے تھے کہ کوئی مہمان آجائے تو اس کے ساتھ کھائیں۔

قرطبی نے بعض اسرائیلی روایات سے نقل کیا ہے کہ ایک روز کھانے کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہمان کی تلاش شروع کی تو ایک اجنبی آدمی ملا جب وہ کھانے پر بیٹھا تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ یشیم اللہا کہو، اس نے کہا کہ میں جانتا نہیں اللہ کون اور کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے اسکو دسترخوان سے اٹھا دیا، جب وہ باہر چلا گیا تو جبریل امین آئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم نے تو اس کے کفر کے باوجود ساری عمر اس کو رزق دیا اور آپ نے ایک نقرہ دینے میں بھی غل کیا یہ سنتے ہی ابراہیم علیہ السلام اس کے پیچھے دوڑے اور اس کو واپس بلایا، اس نے کہا کہ جب تک آپ اس کی وجہ نہ بتلائیں کہ پہلے کیوں مجھے نکالا تھا اور اب پھر کیوں بلارہے ہیں میں اس وقت تک آپ کے ساتھ نہ جاؤں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے واقعہ بتلادیا تو یہی واقعہ اس کے مسلمان ہونے کا سبب بن گیا، اس نے کہا کہ وہ رب جس نے یہ حکم بھیجا ہے بڑا کریم ہے میں اس پر ایمان لاتا ہوں، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ گیا اور مومن ہو کر باقاعدہ یشیم اللہا پڑھ کر کھانا کھایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی عادت مہمان نوازی کے مطابق بشکل انسانی آتیوالے فرشتوں کو انسان اور مہمان سمجھ کر مہمان نوازی شروع کی اور فوراً ہی ایک تہا ہوا بچہ اسامنے لا کر رکھ دیا۔ دوسری آیت میں بتلایا گیا کہ آنے والے فرشتے اگرچہ بشکل انسانی آئے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس وقت ان کو بشری خواص کھانے پینے کے بھی عطا کر دیئے جاتے مگر حکمت اسی میں تھی کہ یہ کھانا نہ کھائیں تاکہ ان کے فرشتے ہونے کا راز کھلے اس لئے شکل انسانی میں بھی ان کے منہ کی خواص کو باقی رکھا گیا جس کی وجہ سے انہوں نے کھانے پر ہاتھ نہ بڑھایا۔

بعض روایات میں ہے کہ ان کے ہاتھ میں کچھ تیر تھے ان کی نوک اس تلے ہوئے گوشت میں لگانے لگے، ان کے اس عمل سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے عرف کے مطابق یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ شاید یہ کوئی دشمن ہوں کیونکہ ان کے عرف میں کسی مہمان کا کھانے سے انکار کرنا ایسے ہی شر و فساد کی علامت ہوتا تھا، (قرطبی) فرشتوں نے بات کھول دی کہ ہم فرشتے ہیں اس لئے نہیں کھاتے، آپ کوئی خطرہ محسوس نہ کریں۔

آیات مذکورہ میں معاشرت سے متعلق بہت سے احکام اور اہم ہدایات آئی ہیں جنکو امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں تفصیل سے

احکام و مسائل

لکھا ہے۔

سنت سلام | قَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے سنت ہے کہ جب آپس میں ملیں تو سلام کریں، آنے والے مہمان کو اس میں پیشقدمی کرنا چاہئے اور دوسروں کو جواب دینا چاہئے۔

یہ رسم تو ہر قوم و ملت میں پائی جاتی ہے کہ ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو خوش کرنے کیلئے کچھ کلمات بولتے ہیں مگر اسلام کی تعلیم اس معاملہ میں بھی بے نظیر اور بہترین ہے کیونکہ سلام کا مسنون لفظ اَلْسَلَامُ عَلَيْكُمْ اللہ کے نام پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ذکر اللہ بھی ہے اور مخاطب کے لئے اللہ تعالیٰ سے سلامتی کی دعاء بھی اور اپنی طرف سے اُس کی جان و مال و آبرو کیلئے سلامتی کی ضمانت بھی۔

قرآن کریم میں اس جگہ فرشتوں کی طرف سے صرف سَلَامًا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے جواب میں سَلَامٌ ذکر کیا گیا ہے بظاہر یہاں پورے الفاظ سلام کے ذکر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی، جیسے عرف و محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ فلاں نے فلاں کو سلام کیا، مراد یہ ہوتی ہے کہ پورا کلمہ اَلْسَلَامُ عَلَيْكُمْ کہا، اسی طرح یہاں لفظ سلام سے پورا کلمہ مستونہ سلام کا مراد ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے لوگوں کو بتلایا ہے، یعنی ابتداءً سلام میں اَلْسَلَامُ عَلَيْكُمْ اور جواب سلام وَعَلَيْكُمْ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللہ

مہمانی اور مہمان داری | فَمَا لَبِثَ أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِيذٍ یعنی نہیں ٹھہرے ابراہیم علیہ السلام مگر کے چند اُصول صرف اس قدر کہ لے آئے تھلا ہوا بچھڑا۔

اس سے چند باتیں معلوم ہوتیں، اول یہ کہ مہمان نوازی کے آداب میں سے یہ ہے کہ مہمان کے آتے ہی جو کچھ کھانے پینے کی چیز میسر ہو اور جلدی سے مہیا ہو سکے وہ لارکھے، پھر اگر صاحب وسعت ہے تو مزید مہمانی کا انتظام بعد میں کرے (قرطبی)

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مہمان کے لئے بہت زیادہ تکلفات کی فکریں نہ پڑے، آسانی سے جو اچھی چیز میسر ہو جائے وہ مہمان کی خدمت میں پیش کر دے، حضرت ابراہیم کے یہاں گائے بیل رہتے تھے، اس لئے بچھڑا ذبح کر کے فوری طور پر اُس کا گوشت تلکر سامنے لارکھا (قرطبی) تیسرے یہ کہ آنے والوں کی مہمانی کرنا آداب اسلام اور مکارم اخلاق میں سے ہے۔ انبیاء و صلحاء کی عادت ہے، اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ مہمانی کرنا واجب ہے یا نہیں؟ جمہور علماء اس پر ہیں کہ واجب نہیں، سنت اور مستحسن ہے۔ بعض نے فرمایا کہ گاؤں والوں پر واجب ہے کہ جو شخص ان کے گاؤں میں ٹھہرے اس کی مہمانی کریں کیونکہ وہاں کھانے کا کوئی دوسرا انتظام نہیں ہو سکتا اور شہر میں ہوٹل وغیرہ سے اس کا انتظام ہو سکتا ہے، اس لئے شہر والوں پر واجب نہیں۔ قرطبی

نے اپنی تفسیر میں یہ مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔

فَلَمَّا سَأَا أَيْدِيَهُمْ لَاتَّصِلُ إِلَيْهِمْ نَكِرَهُمْ یعنی جب دیکھا ابراہیم علیہ السلام نے کہ انکے ہاتھ کھانے تک نہیں پہنچتے تو متوشش ہو گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مہمان کے آداب میں سے یہ ہے کہ مہمان کے سامنے جو چیز پیش کی جائے اُس کو قبول کرے، (کھانے کو دل نہ چاہے یا مضر سمجھیں تو معمولی سی شرکت و لچوئی کے لئے کر لیں)۔ اسی جملہ سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ میزبان کو چاہئے کہ صرف کھانا سامنے رکھ کر فارغ نہ ہو جائے بلکہ اس پر نظر رکھے کہ مہمان کھا رہا ہے یا نہیں، جیسا ابراہیم علیہ السلام نے کیا کہ فرشتوں کے کھانا نہ کھانے کو محسوس کیا۔

مگر یہ نظر رکھنا اس طرح ہو کہ مہمان کے کھانے کو تکتا نہ رہے، سرسری نظر سے دیکھ لے، کیونکہ مہمان کے لقموں کو دیکھنا آداب ضیافت کے خلاف اور مدعو کے لئے باعث شرمندگی ہوتا ہے جیسا ہشام بن عبد الملک کے دسترخوان پر ایک روز ایک اعرابی کو یہ واقعہ پیش آیا کہ اعرابی کے لقمہ میں بال تھا، امیر المؤمنین ہشام نے دیکھا تو بتلایا، اعرابی فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ ہم ایسے شخص کے پاس کھانا نہیں کھاتے جو ہمارے لقموں کو دیکھتا ہے۔

امام طبری نے اس جگہ نقل کیا ہے کہ اول جب فرشتوں نے کھانے سے انکار کیا تو یہ کہا تھا کہ ہم مفت کا کھانا نہیں کھاتے اگر آپ قیمت لے لیں تو کھائیں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ ہاں اس کھانے کی ایک قیمت ہے وہ ادا کرو، وہ قیمت یہ ہے کہ شریعہ میں اللہ کا نام لو اور آخر میں اس کی حمد کرو، جبریل امین نے یہ سن کر اپنے ساتھیوں کو بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو خلیل بنایا ہے یہ اسی کے مستحق ہیں۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ کھانے کے شروع میں بِسْمِ اللہ اور آخر میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہنا سنت ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَىٰ يُجَادِلُنَا فِ

پھر جب جاتا رہا ابراہیم سے ڈر اور آئی اُسکو خوشخبری بھگڑنے لگا، ہم سے

قَوْمِ لُوطٍ ۝ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ ۝ يٰ إِبْرَاهِيمُ اَعْرِضْ

قوم لوط کے حق میں البتہ ابراہیم تحمل والا نرم دل ہے رجوع رہنے والا اے ابراہیم چھوڑ

عَنْ هَٰذَا إِنَّكَ قَدْ جَاءَكَ أَمْرٌ رَّبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ أَتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ ۝

یہ خیال وہ تو آچکا حکم تیرے رب کا اور ان پر آتا ہے عذاب جو لوٹایا نہیں جاتا۔

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِئًا بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ

اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس غمگین ہوا انکے آنے سے اور تنگ ہوا دل میں اور بولا

هَذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ۝ وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ وَمِنْ قَبْلُ

آج دن بڑا سخت ہے اور آئی اس کے پاس قوم اسکی دوڑتی بے اختیار، اور آگے سے

كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ط قَالَ يَقَوْمِ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ

کر رہے تھے برے کام بولا اے قوم یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں یہ پاک ہیں تم کو

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تَخْزُونِ فِي ضَيْفِي ط أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَشِيدٌ ۝۸

سو ڈرو اللہ سے اور مت رسوا کرو مجھ کو میرے مہمانوں میں کیا تم میں ایک مرد بھی نہیں نیک چلن

قَالُوا الْقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ۝۹

بولے تو تو جانتا ہے ہم کو تیری بیٹیوں سے کچھ غرض نہیں اور تجھ کو تو معلوم ہے جو ہم چاہتے ہیں

قَالَ لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةٌ أَوْ آوِي إِلَى رُكْنٍ شَدِيدٍ ۝۱۰ قَالُوا يَلُوطُ

کہنے لگا کاش مجھ کو تمہارے مقابل میں زور ہوتا یا جا بیٹھتا کسی مستحکم پناہ میں مہمان بولے لے لوط

إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَصِلُوا إِلَيْكَ فَأَسِرْ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ

ہم بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے ہرگز نہ پہنچ سکیں گے تجھ تک سوئے نکل اپنے لوگوں کو کچھ رات سے

وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا أَمْرَاتَكَ ط إِنَّهُ مُصِيبُهَا مَا أَصَابَهُمْ ط

اور مڑ کر نہ دیکھے تم میں کوئی مگر عورت تیری کہ اس کو پہنچ کر رہے گا جو اُن کو پہنچے گا

إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ط أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ ۝۱۱ فَلَمَّا جَاءَ

ان کے وعدہ کا وقت ہے صبح ، کیا صبح نہیں ہے نزدیک پھر جب پہنچا

أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَابًا مِّنْ سِجِّيلٍ ۝۱۲

حکم ہمارا کر ڈالی ہم وہ بستی اوپر نیچے اور برسائے ہم نے اس پر پتھر کنکر کے

مَنْضُودٍ ۝۱۳ مَسْوَمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ط وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ ۝۱۴

تہ بہ تہ نشان کئے ہوئے تیرے رب کے پاس اور نہیں ہے وہ بستی ان ظالموں کے کچھ دور

خلاصہ تفسیر

پھر جب ابراہیم (علیہ السلام) کا وہ خوف زائل ہو گیا جب فرشتوں نے لا تخف کہا اور ان کا فرشتہ ہونا معلوم ہو گیا، اور ان کو خوشی کی خبر ملی (کہ اولاد پیدا ہوگی) تو (ادھر سے بے فکر ہو کر دوسری طرف

متوجہ ہوئے کہ قوم لوط ہلاک کی جاوے گی اور ہم سے لوط (علیہ السلام) کی قوم کے بارے میں
 (سفارش جو باعتبار مبالغہ و اصرار کے صورت) ہڈال (تھا) کرنا شروع کیا جس کی تفصیل دوسری آیت
 میں ہے کہ وہاں تو لوط علیہ السلام بھی موجود ہیں اس لئے عذاب نہ بھیجا جاوے کہ انکو گزند پہنچے گا،
 مطلب یہ ہوگا کہ اس بہانے سے قوم نوح جاوے جیسا فی قوم لوط سے ظاہر معلوم ہوتا ہے اور
 شاید ابراہیم علیہ السلام کو انکے مؤمن ہونے کی امید ہو، واقعی ابراہیم بڑے حلیم الطبع رحیم المزاج،
 رقیق القلب تھے (اس لئے سفارش میں مبالغہ کیا، ارشاد ہوا کہ) اے ابراہیم (گو بہانہ لوط علیہ السلام
 کا ہے مگر اصلی مطلب معلوم ہو گیا کہ قوم کی سفارش ہے سو اس بات کو جانے دو یہ ایمان نہ
 لاویں گے اسی لئے تمہارے رب کا حکم (اس کے متعلق) اچکا ہے اور اس کے سبب سے ان پر
 ضرور ایسا عذاب آنے والا ہے جو کسی طرح مٹنے والا نہیں (اس لئے اس باب میں کچھ کہنا سُننا بیگا
 ہے، رہا لوط علیہ السلام کا دیا ہوا سوا انکو اور سب ایمان والوں کو وہاں سے علیحدہ کر دیا جاوے گا
 اسکے بعد عذاب آوے گا تاکہ انکو گزند نہ پہنچے، چنانچہ اس پر بات ختم ہو گئی) اور ابراہیم علیہ السلام
 کے پاس سے فارغ ہو کر جب ہمارے وہ فرشتے لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو لوط علیہ السلام
 ان کے (آنے کی) وجہ سے (اس لئے) مغموم ہوئے (کہ وہ بہت حسین نوجوانوں کی شکل میں آئے
 تھے اور لوط علیہ السلام نے ان کو آدمی سمجھا اور اپنی قوم کی نامعقول حرکت کا خیال آیا، اور اس وجہ سے
 انکے (آنے کے) سبب بہت تنگدل ہوئے (اور غایت تنگدلی سے) کہنے لگے کہ آج کا دن بہت
 بھاری ہے (کہ ان کی تو ایسی صورتیں اور قوم کی یہ حرکتیں اور میں تنہا، دیکھنے کیا ہوتا ہے؟) اور
 ان کی قوم نے جو یہ خبر سنی تو انکے (یعنی لوط علیہ السلام کے) پاس دوڑے ہوئے آئے اور پہلے
 سے نامعقول حرکتیں کیا ہی کرتے تھے (اسی خیال سے اب بھی آئے) لوط علیہ السلام بڑے گھبرائے
 اور براہ تعلق، فرمانے لگے کہ اے میری قوم یہ میری (ہو) بیٹیاں (جو تمہارے گھروں میں ہیں) موجود
 ہیں وہ تمہارے (نفس کی کامرانی کے) لئے (اچھی) خاصی ہیں سودا مردوں پر نگاہ کرنے کے باب
 میں (اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں میں مجھ کو فضیحت مت کرو (یعنی ان مہمانوں کو کچھ کہنا مجھ کو
 شرمندہ اور رسوا کرنا ہے، اگر ان کی رعایت نہیں کرتے کہ مسافر ہیں تو میرا خیال کرو کہ تم میں رہتا سہتا
 ہوں، افسوس اور تعجب ہے) کیا تم میں کوئی بھی (معقول آدمی اور) بھلا مانس نہیں (کہ اس بات کو
 سمجھے اور اوروں کو سمجھائے) وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم کو آپ کی ان (بیٹیوں کی
 کوئی ضرورت نہیں (کیونکہ عورتوں سے ہم کو رغبت ہی نہیں) اور آپ کو تو معلوم ہے (یہاں آنے سے)
 جو ہمارا مطلب ہے، لوط علیہ السلام نہایت عاجز اور زچ ہو کر فرمانے لگے کیا خوب ہوتا اگر میرا تم
 پر کچھ زور چلتا کہ خود تمہارے شر کو دفع کرتا، یا کسی مضبوط پایہ کی پناہ پکڑتا دُمراد یہ کہ میرا کوئی کُن قبیلہ

ہوتا کہ میری مدد کرتا، لوط علیہ السلام کا جو اس قدر اضطراب دیکھا تو فرشتے کہنے لگے کہ اے لوط (ہم آدمی نہیں جو آپ اس قدر گھبراتے ہیں، ہم تو آپ کے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے) ہیں (تو ہمارا تو کیا کر سکتے ہیں اور آپ اپنے لئے بھی اندیشہ نہ کریں، آپ تک (بھی) ہرگز انکی رسائی نہیں ہوگی) کہ آپ کو کچھ تکلیف پہنچا سکیں اور ہم ان پر عذاب نازل کرنے آئے ہیں) سو آپ رات کے کسی حصہ میں اپنے گھر والوں کو لے کر یہاں سے باہر چلے جائیے اور تم میں سے کوئی پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھے (یعنی سب جلدی چلے جائیں) ہاں مگر آپ کی بیوی (بوجہ مسلمان نہ ہونے کے نہ جاوے گی) اس پر بھی وہی آفت آنیوالی ہے جو اور لوگوں پر آوے گی (اور ہم رات کے وقت نکل جاتے کو اس لئے کہتے ہیں کہ) انکے (عذاب کے) وعدہ کا وقت صبح کا وقت ہے (لوط علیہ السلام بہت وق ہو گئے تھے فرمانے لگے کہ جو کچھ ہو ابھی ہو جاوے کذا فی الدر المنثور، فرشتوں نے کہا) کیا صبح کا وقت قریب نہیں (نوح لوط علیہ السلام شب شب دور نکل گئے اور صبح ہوئی اور عذاب کا سامان شروع ہوا) سو جب ہمارا حکم (عذاب کے لئے) آپہنچا تو ہم نے اس زمین (کو الٹ کر اس) کا اوپر کا تختہ تو نیچے کر دیا (اور نیچے کا تختہ اوپر کر دیا) اور اس سرزمین پر کھنگر کے پتھر (مرد بھانوا جو پک کر مثل پتھر کے ہو جاتا ہے) برسانا شروع کئے بولگاتا کر رہے تھے جن پر آپ کے رب کے پاس (یعنی عالم غیب میں) خاص نشان بھی تھا (جس سے اور پتھروں سے وہ پتھر ممتاز تھے) اور اہل مکہ کو چاہئے کہ اس قصہ سے عبرت لیں کیونکہ یہ بستی (قوم لوط کی) ان ظالموں سے کچھ دور نہیں ہیں (ہمیشہ شام کو آتے جاتے انکی بربادی کے آثار دیکھتے ہیں پس ان کو اللہ اور رسول کی مخالفت سے ڈرنا چاہئے)۔

مَعَارِفُ وَمَسَائِلُ

سورۃ ہود میں اکثر انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کے حالات اور انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کی بنا پر مختلف قسم کے آسمانی عذابوں کا بیان آیا ہے، آیات مذکورہ میں حضرت لوط علیہ السلام اور انکی قوم کا حال اور قوم لوط پر عذاب شدید کا بیان ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا فرہونے کے علاوہ ایک ایسی خبیث بدکاری اور بیچاری میں مبتلا تھی جو دنیا میں کبھی پہلے نہ پائی گئی تھی جس سے جنگل کے جانور بھی نفرت کرتے ہیں کہ مرد کیساتھ منہ الا کرے جسکا وبال و عذاب عام بدکاری سے بدرجہا زیادہ ہے، اسی لئے اس قوم پر ایسا شدید عذاب آیا جو عام بے حیائی اور بدکاری کرنے والوں پر کبھی نہیں آیا۔

حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ جو ان آیات میں مذکور ہے اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے چند فرشتے جن میں جبریل امین بھی شامل تھے اس قوم پر عذاب نازل کرنے کے لئے بھیجے، جو پہلے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں فلسطین پہنچے جسکا واقعہ پچھلی آیات میں بیان ہو چکا ہے، اُسکے بعد حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے جنکا مقام وہاں سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر تھا اللہ تعالیٰ شانہ جس قوم کو عذاب میں پکڑتے ہیں اُس پر اُن کے عمل کے مناسب ہی عذاب مسلط فرماتے ہیں، اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ کے یہ فرشتے حسین لڑکوں کی شکل میں بھیجے گئے جب وہ حضرت لوط علیہ السلام کے گھر پہنچے تو ان کو بشکل انسانی دیکھ کر اُنہوں نے بھی مہمان سمجھا اور اسوقت وہ سخت فکر و غم میں مبتلا ہو گئے کہ مہمانوں کی مہمانی نہ کی جائے تو یہ شانِ پیغمبری کے خلاف ہے اور اگر ان کو مہمان بنایا جاتا ہے تو اپنی قوم کی نباشت معلوم ہے، اسکا خطرہ ہے کہ وہ مکان پر چڑھ آئیں اور ان مہمانوں کو اذیت پہنچائیں اور وہ اُن کی مدافعت نہ کر سکیں، اور دل میں کہنے لگے کہ آج بڑی سخت مُصیبت کا دن ہے۔

اللہ جل شانہ نے اس عالم کو عجیب عبرت کی جگہ بنایا ہے جس میں اُسکی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کے بیشمار مظاہر ہوتے ہیں، آذر بُت پرست کے گھر میں اپنا خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا کر دیا، حضرت لوط علیہ السلام جیسے مقبول و برگزیدہ پیغمبر کے گھر میں ان کی بیوی کافروں سے ملتی اور حضرت لوط علیہ السلام کی مخالفت کرتی تھی، جب یہ محترم مہمان حسین لڑکوں کی شکل میں حضرت لوط علیہ السلام کے گھر میں مقیم ہو گئے تو ان کی بیوی نے ان کی قوم کے اڈباش لوگوں کو خبر کر دی کہ آج ہمارے گھر میں اس طرح کے مہمان آئے ہیں (قرطبی و مظہری)۔

حضرت لوط علیہ السلام کا سابقہ اندیشہ سامنے آگیا، جسکا بیان دوسری آیت میں ہے وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ أُنْكَيْتُمْ آلَ قَوْمٍ دَوْرِي هَوْنًا، اور وہ پہلے سے نامعقول حرکتیں کیا ہی کرتے تھے۔

اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ اپنے خبیث عمل کی نحوست سے اس قدر بے حیا ہو چکے تھے کہ علانیہ حضرت لوط علیہ السلام کے مکان پر چڑھ دوڑے۔

حضرت لوط علیہ السلام نے جب دیکھا کہ انکی مدافعت مشکل ہے تو ان کو شر سے باز رکھنے کے لئے فرمایا کہ تم اس شر و فساد سے باز آ جاؤ تو میں اپنی لڑکیاں تمہارے سرداروں کے نکاح میں دیدوں گا، اُس زمانہ میں مسلمان لڑکی کا نکاح کافر سے جائز تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ تک یہی حکم جاری تھا اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو صاحبزادیوں کا نکاح عتبنہ بن ابی لہب اور ابوالعاص بن زبیع سے کر دیا تھا حالانکہ یہ دونوں کفر پر تھے، بعد میں وہ آیات نازل ہوئیں جن میں مسلمان عورت کا نکاح کافر مرد سے حرام قرار پایا (قرطبی)۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ اپنی لڑکیوں سے مراد اپنی پوری قوم کی لڑکیاں ہیں کیونکہ

ہر پیغمبر اپنی قوم کیلئے مثل باپ کے ہوتا ہے اور پوری امت اُس کی روحانی اولاد ہوتی ہے جیسا کہ آیت کریمہ **النَّبِيُّ أَوْلىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ** کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت میں **وَهُوَ آبُكُمْ** کے الفاظ بھی آئے ہیں، جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تمام امت کا باپ قرار دیا ہے، اس تفسیر کے مطابق حضرت لوط علیہ السلام کے اس قول کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اپنی خبیث عادت سے باز آؤ، شرافت کے ساتھ قوم کی لڑکیوں سے نکاح کرو، اُنکو بیبیاں بناؤ۔

پھر لوط علیہ السلام نے اُنکو خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے کے لئے فرمایا **فَاتَّقُوا اللَّهَ** اور پھر عاجزانہ درخواست کی **وَلَا تَخْزُونِ فِي ضَعِيفٍ** یعنی مجھ کو میرے مہانوں کے متعلق رسوا نہ کرو، اور فرمایا **اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ تَرَاهُمْ** یعنی کیا تم میں کوئی ایک بھی بھلا مانس اور شریف آدمی نہیں ہو میری فریاد سنے۔

مگر وہاں شرافت و انسانیت کا کوئی اثر کسی میں باقی نہ تھا، سب نے جواب میں کہا **لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَالَنَا فِي بَنَاتِكُمْ مِنْ حَيْثُ وَارَدْتُمْ لَتَعْلَمُنَّ مَا نُرِيدُ**، یعنی آپ جانتے ہیں کہ ہمیں آپکی لڑکیوں کی کوئی ضرورت نہیں، ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ آپ کو معلوم ہے۔ اس وقت ہر طرح سے عاجز ہو کر لوط علیہ السلام کی زبان پر یہ کلمہ آیا **لَوْ اَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةٌ** اڈاؤں کی اشد شہید یعنی کاش مجھ میں اتنی قوت ہوتی کہ میں اس پوری قوم کا خود مقابلہ کر سکتا یا پھر کوئی جتھہ اور جماعت ہوتی جو مجھے ان ظالموں کے ہاتھ سے نجات دلاتی۔ فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کا یہ اضطراب دیکھ کر بات کھول دی اور کہا کہ گھبرائیے نہیں آپ کی جماعت بڑی قوی اور مضبوط ہے، ہم اللہ کے فرشتے ہیں ان کے قابو میں آنے والے نہیں، ان پر عذاب واقع کرنے کے لئے آئے ہیں۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لوط پر رحم فرماویں وہ کسی مضبوط جماعت کی پتاہ لینے پر مجبور ہو گئے، اور ترمذی میں اس کے ساتھ یہ مجملہ بھی ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کا کذب قبیلہ اُس کا حمایتی نہ ہو (قرطبی) خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کفار قریش نے ہزار طرح کی تدبیریں کیں لیکن آپ کے پورے خاندان نے آپ کی حمایت کی، اگرچہ مذہب یہ ہے کہ وہ سب آپ کے موافق نہ تھے، اسی وجہ سے پورے بنی ہاشم اُس مقاطعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے جس میں کفار قریش نے ان پر دانا پانی بند کر دیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ اس واقعہ میں جب قوم لوط ان کے گھر پر پڑھائی تو

لوط علیہ السلام نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا تھا اور یہ گفتگو اس شری قوم سے پس پردہ ہو رہی تھی فرشتے بھی مکان کے اندر تھے، ان لوگوں نے دیوار پھانسی کر اندر گھسنے کا اور دروازہ توڑنے کا ارادہ کیا اُس پر حضرت لوط علیہ السلام کی زبان پر یہ کلمات آئے، جب فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کا یہ اضطراب دیکھا تو حقیقت کھول دی اور کہہ دیا کہ آپ دروازہ کھول دیں، اب ہم ان کو عذاب کا مزہ چکھاتے ہیں، دروازہ کھولا تو جبریل امین نے اپنے پر کا اشارہ انکی آنکھوں کی طرف کیا جس سے سب اندھے ہو گئے اور بھاگنے لگے۔

اس وقت فرشتوں نے حکم ربانی حضرت لوط علیہ السلام کو کہا فَاسْرِبْ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ یعنی آپ رات کے آخری حصہ میں اپنے اہل و عیال کو لیکر یہاں سے نکل جائیے۔ اور یہ ہدایت کر دیجئے کہ ان میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے، بجز آپکی بیوی کے کیونکہ اُس پر تو وہی عذاب پڑیوالا ہے جو قوم پر پڑیگا۔

اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بیوی کو ساتھ نہ لیں، اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ بیوی ہونے کی حیثیت سے وہ آپ کے اہل میں داخل ہو کر ساتھ چلے گی مگر وہ آپ کے اس حکم پر عمل نہ کرے گی جو آپ اپنے اہل و عیال کو دیں گے کہ کوئی مڑ کر نہ دیکھے، بعض روایات میں ہے کہ یوں ہی ہوا کہ یہ بیوی بھی ساتھ چلی مگر جب قوم پر عذاب آنے کا دھماکہ سنا تو پیچھے مڑ کر دیکھا اور قوم کی تباہی پر اظہارِ افسوس کرنے لگی، اسی وقت ایک پتھر آیا جس نے اسکا بھی خاتمہ کر دیا۔ (قرطبی و مظہری) فرشتوں نے یہ بھی بتلادیا کہ لَوْ أَنفَكْنَا هُمُ النَّاصِيحِينَ یعنی ان پر صبح ہوتے ہی عذاب آجائیگا حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ اور بھی جلد عذاب آجائے، اس پر فرشتوں نے کہا أَلَيْسَ النَّاصِيحِينَ بِقَرِيبٍ یعنی صبح تو کچھ دور نہیں ہوا چاہتی ہے۔

پھر اس عذاب کا واقعہ قرآن نے اس طرح بیان فرمایا کہ جب ہمارا عذاب آگیا تو ہم نے ان بستیوں کے اوپر کا حصہ نیچے کر دیا اور ان پر ایسے پتھر برسائے جن پر ہر ایک کے نام کی علامت لگی ہوئی تھی۔

روایات میں ہے کہ یہ چار بڑے بڑے شہر تھے جن میں یہ لوگ بستے تھے، انہیں بستیوں کو قرآن کریم میں دوسری جگہ ”مُؤْتَفِكَات“ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا تو جبریل امین نے اپنا پر ان سب شہروں کی زمین کے نیچے پہنچا کر سب کو اس طرح اوپر اٹھالیا کہ ہر چیز اپنی جگہ رہی، پانی کے برتن سے پانی بھی نہیں گرا، آسمان کی طرف سے کتوں اور جانوروں اور انسانوں کی آوازیں آرہی تھیں ان سب بستیوں کو آسمان کی طرف سیدھا اٹھانے کے بعد اونڈھا کر کے پلٹ دیا، جو ان کے عملِ خبیث کے مناسب حال تھا۔

آخر آیت میں قوم لوط کا عذاب ذکر کرنے کے بعد موجودہ اقوام دنیا کو متنبہ کرنے کے لئے ارشاد فرمایا وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ یعنی پتھر اور کا عذاب آج بھی ظالموں سے کچھ دور نہیں، جو لوگ اس قوم کی طرح ظلم و بے حیائی پر جمے رہیں وہ اپنے آپ کو اس عذاب سے دور نہ سمجھیں آج بھی یہ عذاب آسکتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں بھی کچھ لوگ وہ عمل کریں گے جو قوم لوط کرتی تھی، جب ایسا ہونے لگے تو انتظار کرو کہ اُن پر بھی وہی عذاب آئے گا جو قوم لوط پر آیا ہے۔

وَالِیٰ مَدَیْنٍ اَخَاهُمْ شَعِیْبًا قَالَ لِقَوْمٍ اَعْبَدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ

اور مدین کی طرف بھیجا ان کے بھائی شعیب کو بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود

غَيْرُهُ ط وَلَا تَنْقُصُوا الْيَمِّيَّالَ وَالْيَمِيزَانَ اِنِّیْ اَرْکُم بِخَيْرٍ وَّاِنِّیْ

اس کے سوا اور نہ گھٹاؤ باپ اور تول کو میں دیکھتا ہوں تم کو اُسودہ حال اور

اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ ۝۴۳ وَلِقَوْمٍ اَوْفُوا الْيَمِّيَّالَ وَ

ڈرتا ہوں تم پر عذاب سے ایک گیمہ لینے والے دن کے، اور اے قوم پورا کرو باپ اور

الْيَمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخُسُوا النَّاسَ اَشْیَاءَهُمْ وَلَا تَعْتُوا فِی

تول کو انصاف سے اور نہ گھٹاؤ لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت مچاؤ زمین

الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۝۴۵ بَقِیَّتُ اللّٰهِ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝

میں فساد جو بچ رہے اللہ کا دیا وہ بہتر ہے تم کو اگر ہو تم ایمان والے

وَمَا اَنَا عَلَیْكُمْ بِخَفِیْظٍ ۝۴۶ قَالُوا اِلِشْعِیْبُ اَصْلَوْتُكَ تَأْمُرُكَ اَنْ

اور میں نہیں ہوں تم پر نگہبان بولے اے شعیب تیرے نماز پڑھنے نے تجھ کو سکھایا کہ

تَتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اَبَاؤُنَا اَوْ اَنْ تَفْعَلَ فِیْ اَمْوَالِنَا مَا نَشَآءُ اِنَّكَ لَکَذَّ

ہم چھوڑ دیں جنکو پوجتے رہے ہمارے باپ دادا یا چھوڑ دیں کرنا جو کچھ کرتے ہیں اپنے مالوں میں، تو ہی

الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ ۝۴۷ قَالَ لِقَوْمٍ اَرَاَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ

بڑا باوقار ہے نیک چلن بولا اے قوم دیکھو تو اگر مجھ کو سمجھ آگئی اپنے رب

رَبِّیْ وَرَزَقْنِیْ مِنْ رِّزْقٍ حَسَنًا ط وَمَا اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفْکُمْ اِلٰی مَا اَنْهَیْکُمْ

کی طرف سے اور اس نے روزی دی مجھ کو نیک روزی، اور میں نہیں چاہتا کہ بعد کو خود کروں وہ کام جو تم سے

عَنْهُ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ط وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ ط

پھڑپڑوں، میں تو چاہتا ہوں سنوارنا جہاں تک ہو سکے اور بنانا ہے اللہ کی مدد سے

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَالْيَئْسُ أُنِيبُ ۝۸۸ وَيَقَوْمٌ لَا يَجْرِمُكُمْ شِقَاقِي أَنْ

اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے ، اور اے میری قوم نہ کہو میری ضد کر کے یہ کہ

يُصِيبُكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ وَمَا

پڑے تم پر جیسا کچھ کہ نوح پر یا قوم ہود پر یا قوم صالح پر اور

قَوْمُ لُوطٍ مِّنْكُمْ يَبْعِدُ ۝۸۹ وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ط

قوم لوط تم سے کچھ دور ہی نہیں اور گناہ بخشو اور اپنے رب سے اور رجوع کرو اس کی طرف

إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ ۝۹۰ قَالُوا لَشُعَيْبٌ مَّا نَفَقَهُ كَثِيرٌ أَمْ مَّا تَقُولُ

البتہ میرا رب ہے مہربان محبت والا بولے اے شعیب ہم نہیں سمجھتے بہت باتیں ہو تو کہتا ہے

وَإِنَّا لَنَرِيكَ فِتْنًا ضَعِيفًا وَلَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ وَمَا أَنْتَ

اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تو ہم میں کمزور ہے اور اگر نہ ہوتے تیرے بھائی بند تو تجھ کو ہم سنگسار کر دالتے ، اور

عَلَيْنَا بَعِزٌّ ۝۹۱ قَالَ يَقَوْمِ أَرَهَيْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ ط

ہماری نگاہ میں تیری کچھ عزت نہیں ، بولا اے قوم کیا میرے بھائی بندوں کا دباؤ تم پر زیادہ ہے اللہ سے اور

اتَّخَذْتُمُوهُ وَرَاءَكُمْ ظَهْرِيًّا إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝۹۲ وَ

اس کو ڈال رکھا تم نے پیٹھ پیچھے بھلا کر ، تحقیق میرے رب کے قابو میں ہے جو کچھ تم کرتے ہو ، اور

يَقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَى مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ط سَوْفَ تَعْلَمُونَ لَا مَرَجَ

اے میری قوم کام کئے جاؤ اپنی جگہ میں بھی کام کرتا ہوں ، آگے معلوم کر لو گے کس پر

يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ط وَارْتَقِبُوا إِلَيَّ مَعَكُمْ رَقِيبٌ ۝۹۳

آتا ہے عذاب رسوا کر نیوالا اور کون ہے بھوٹا ، اور تاکتے رہو میں بھی تمہارے ساتھ تاک رہا ہوں

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا ط

اور جب پہنچا ہمارا حکم ، بچا دیا ہم نے شعیب کو اور جو ایمان لائے تھے اسکے ساتھ اپنی مہربانی سے اور

أَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جثثٍ ۝۹۴

آپکڑا ان ظالموں کو کڑک نے ، پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے ،

كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ط الْأَعْدَاءُ لِمَدِينٍ كَمَا بَعْدَتْ شُعُودُ ۝۹۵

گویا کبھی وہاں بسے ہی نہ تھے ، دشمن لو پھٹکار ہے مدین کو جیسے پھٹکار ہوئی تھی شہر کو ۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے مدین (والوں) کی طرف ان کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو بھیجا انہوں نے اہل مدین سے فرمایا کہ اے میری قوم تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اسکے سوا کوئی تمہارا معبود (بننے کے قابل) نہیں (یہ حکم تو دیانات و عقائد کے متعلق ان کے مناسب حال تھا، اور دوسرا محکم معاملہ کے متعلق ان کے مناسب یہ فرمایا کہ تم ناپ تول میں کمی مت کیا کرو (کیونکہ) میں تم کو فراغت کی حالت میں دیکھتا ہوں پھر تم کو ناپ تول میں کمی کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے اور حقیقت تو کسی بھی ضرورت نہیں ہوتی) اور علاوہ اس کے کہ ناپ تول میں کمی نہ کرنا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تقاضا ہے خود خوف ضرر بھی اس کو مقتضی ہے کیونکہ اس میں) مجھ کو تم پر اندیشہ ہے ایسے دن کے عذاب کا جو انواع عذاب کا جامع ہوگا اور ہر چند کہ کمی نہ کرنا مستلزم ہے پورا کرنے کو مگر تاکید کے لئے اسکی ممانعت کے بعد اس امر کی تصریح بھی فرمائی کہ) اے میری قوم تم ناپ اور تول پوری پوری طرح کیا کرو اور لوگوں کا ان چیزوں میں نقصان مت کیا کرو (جیسا تمہاری عادت ہے) اور (شرک اور لوگوں کے حقوق میں کمی کر کے زمین میں فساد کرتے ہوئے حد (توحید و عدل) سے مت نکلو) لوگوں کے حقوق ادا کرنے کے بعد) اللہ کا دیا ہوا جو کچھ (حلال مال) بیچ جائے وہ تمہارے لئے (اس حرام کمائی سے) بدرجہا بہتر ہے (کیونکہ حرام میں گو وہ کثیر ہو برکت نہیں اور انجام اسکا جہنم ہے اور حلال میں گو وہ قلیل ہو برکت ہوتی ہے اور انجام اسکا رضائے حق ہے) اگر تم کو یقین آوے (تو مان لو) اور (اگر یقین نہ آوے تو تم جانو) میں تمہارا پہرہ دینے والا تو ہوں نہیں (کہ تم سے جبراً یہ افعال پھڑا دوں جیسا کرو گے بھگتو گے) وہ لوگ (یہ تمام مواعظ و نصائح سنکر کہنے لگے اے شعیب! کیا تمہارا (مصنوعی اور وہمی) تقدس تم کو (ایسی ایسی باتوں کی) تعلیم کر رہا ہے کہ تم ہم سے کہتے ہو کہ ہم ان چیزوں (کی پرستش) کو چھوڑ دیں جنکی پرستش ہمارے بڑے کرتے آئے ہیں اور اس بات کو چھوڑ دیں کہ ہم اپنے مال میں جو چاہیں تصرف کریں واقعی آپ بڑے عقلمند دین پر چلنے والے ہیں (یعنی جن باتوں سے ہم کو منع کرتے ہو دونوں میں سے کوئی بُرا نہیں کیونکہ ایک کی دلیل تو نقلی ہے کہ ہمارے بڑوں سے بُت پرستی ہوتی آئی ہے، دوسرے کی دلیل عقلی ہے کہ اپنا مال ہے اس میں ہر طرح کا اختیار ہے پس ہم کو منع نہ کرنا چاہئے، اور حلیم رشید مفسر سے کہا، جیسا بدویوں کی عادت ہوتی ہے دین داروں کے ساتھ تمسخر کرنے کی اور انکی نقلی و عقلی، دونوں دلیلوں کا فساد بدیہی ہے) شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا اے میری قوم (تم جو مجھ سے چاہتے ہو کہ میں توحید و عدل کی نصیحت نہ کروں تو) بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی جانب

سے دلیل پر قائم ہوں جس سے توحید و عدل ثابت ہے، اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے ایک عمدہ دولت (یعنی نبوت) دی ہو جس سے مجھ پر تبلیغ ان احکام کی واجب ہو، یعنی توحید و عدل کا حق ہونا بھی ثابت اور ان کی تبلیغ بھی واجب، تو پھر کیسے تبلیغ نہ کروں اور میں جس طرح ان باتوں کی تم کو تعلیم کرتا ہوں خود بھی تو اس پر عمل کرتا ہوں، یہ نہیں چاہتا ہوں کہ تمہارے برخلاف ان کاموں کو کروں جن سے تم کو منع کرتا ہوں (برخلاف سے یہی مراد ہے کہ تم کو اور راہ بتلاؤں اور خود اور راہ پر چلوں، مطلب یہ ہے کہ میری نصیحت محض خیر خواہی و دلسوزی سے ہے جس کا قرینہ یہ ہے کہ میں وہی باتیں بتلاتا ہوں جو اپنے نفس کے لئے بھی پسند کرتا ہوں غرض میں تو اصلاح چاہتا ہوں جہاں تک میرے امکان میں ہے اور مجھ کو جو کچھ (عمل و اصلاح) کی توفیق ہو جاتی ہے

صرف اللہ ہی کی مدد سے ہے (ورنہ کیا میں اور کیا میرا ارادہ) اسی پر میں بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف تمام امور میں رجوع کرتا ہوں (خلاصہ یہ کہ توحید و عدل کے محبوب پر دلائل بھی قائم، اور بامر خداوندی اسکی تبلیغ، اور ناصح ایسا دلسوز اور مصلح، پھر بھی نہیں مانتے بلکہ اُلٹی جھ سے امید رکھتے ہو کہ میں کہنا چھوڑ دوں چونکہ اس تقریر میں دلسوزی اور اصلاح کی اپنی طرف نسبت کی ہے، اس لئے مَا تَوْفِیْقِیَّ لَیْ قَرَادِیَا، یہاں تک تو ان کے قول کا جواب ہو گیا، آگے ترہیب و ترغیب فرماتے ہیں، اور اے میری قوم میری ضد (اور عداوت) تمہارے لئے اسکا باعث نہ ہو جاوے کہ تم پر بھی اسی طرح کی مصیبتیں آپڑیں جیسے قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر پڑی تھیں اور اگر ان قوموں کا قصہ پرانا ہو چکا ہے اور اس لئے اس سے متاثر نہیں ہوتے تو قوم لوط تو (ابھی) تم سے (بہت) دور (زمانہ میں) نہیں ہوئی (یعنی ان قوموں کی نسبت ان کا زمانہ نزدیک ہے، یہ تو ترہیب کا مضمون ہو گیا، آگے ترغیب ہے) اور تم اپنے رب سے اپنے گناہ یعنی شرک و ظلم، معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ کیونکہ ایمان سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں، گو حقوق ادا کرنے پڑیں، پھر طاعت عبادت کے ساتھ) اسکی طرف متوجہ ہو بلا شک میرا رب بڑا مہربان بڑی محبت والا ہے (وہ گناہ کو معاف کر دیتا ہے اور طاعت کو قبول کرتا ہے) وہ لوگ (یہ لا جواب) دل آویز تقریر سن کر جواب معقول سے عاجز ہو کر براہ جہالت (کہنے لگے کہ شعیب! بہت سی باتیں تمہاری کہی ہوئی ہماری سمجھ میں نہیں آتیں) یہ بات یا تو اس وجہ سے کہی ہو کہ اچھی طرح توجہ سے آپ کی باتیں نہ سنی ہوں یا تحقیر اکہا ہو کہ نعوذ باللہ یہ ہذیان ہے سمجھنے کے قابل نہیں، چنانچہ بددینوں سے یہ سب امور واقع ہوتے ہیں، اور ہم تم کو اپنے (جمع) میں کمزور دیکھ رہے ہیں اور اگر تمہارے خاندان کا (کہ ہمارے ہم مذہب ہیں ہم کو) پاس نہ ہوتا تو ہم تم کو (کبھی) کا سنگسار کر چکے ہوتے اور ہماری نظر میں تمہاری کچھ توقیر ہی نہیں (لیکن جسکا لحاظ ہوتا ہے اُس کے سبب

اس کے رشتہ دار کی بھی رعایت ہوتی ہے، مطلب انکا یہ تھا کہ تم ہم کو یہ مضامین مت سناؤ ورنہ تمہاری جان کا خطرہ ہے، پہلے تسخیر کے طور پر تبلیغ سے روکا تھا، اَصْلُوْثُکَ تَاْمُوْکَ الخ اور اب دھمکی دیکر روکا، شعیب (علیہ السلام) نے جواب میں، فرمایا اے میری قوم (افسوس اور تعجب ہے کہ میری جو نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے کہ میں اسکا نبی ہوں وہ تو میرے اہلک سے مانع نہ ہوئی اور جو میری نسبت خاندان کے ساتھ ہے کہ انکا رشتہ دار ہوں وہ اس سے مانع ہوئی تو اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ تم خاندان کا لحاظ اللہ سے بھی زیادہ کرتے ہو تو) کیا میرا خاندان تمہارے نزدیک (نعوذ باللہ) اللہ سے بھی زیادہ باوقیر ہے (کہ خاندان کا تو پاس کیا) اور اس کو (یعنی اللہ تعالیٰ کو) تم نے پس پشت ڈال دیا (یعنی اس کا پاس نہ کیا، سو اس کا خمیازہ عنقریب بھگتو گے کیونکہ) یقیناً میرا رب تمہارے سب اعمال کو (اپنے علم میں) احاطہ کئے ہوئے ہے اور اے میری قوم (اگر تم کو عذاب کا بھی یقین نہیں آتا تو خیر بات یہ ہے کہ تم جانو بہتر ہے تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو میں بھی (اپنے طور پر) عمل کر رہا ہوں) سو اب جلدی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر ایسا عذاب آیا چاہتا ہے جو اس کو رسوا کر دیگا اور وہ کون شخص ہے جو جھوٹا تھا (یعنی تم مجھ کو دعویٰ نبوت میں جھوٹا کہتے ہو اور حقیر سمجھتے ہو تو اب معلوم ہو چکا کہ مجرم کذب کا مرتکب اور نزلے ذلت کا مستوجب کون تھا تم یا میں) اور تم بھی منتظر ہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں (کہ دیکھیں عذاب کا وقوع ہوتا ہے جیسا میں کہتا ہوں یا عدم وقوع جیسا تمہارا گمان ہے، غرض ایک زمانہ کے بعد عذاب کا سامان شروع ہوا اور جب ہمارا حکم (عذاب کیلئے) آپہنچا (تو) ہم نے (اس عذاب سے) شعیب (علیہ السلام) کو اور جو انکی ہمراہی میں اہل ایمان تھے انکو اپنی عنایت (خاص) سے بچالیا اور ان ظالموں کو ایک سخت آواز دے دی (کہ نعرۂ جہر مل گیا تھا) آپکڑا سو اپنے گھروں کے اندر اوندھے گرے رہ گئے (اور مر گئے) جیسے کبھی ان گھروں میں بے ہی نہ تھے، خوب سن لو (اور عبرت پکڑو) مَذِیْن کو رحمت سے دُوری ہوئی جیسا ثمود رحمت سے دُور ہوئے تھے۔

مَعَارِفُ وَمَسَائِلُ

مذکورہ صدر آیات میں حضرت شعیب علیہ السلام اور انکی قوم کا واقعہ مذکور ہے، اُن کی قوم کفر و شرک کے علاوہ ناپ تول میں کمی بھی کرتی تھی، حضرت شعیب علیہ السلام نے اُن کو ایمان کی دعوت دی اور ناپ تول میں کمی کرنے سے منع کیا اور اس کے خلاف کرنے پر عذاب الہی سے ڈرایا مگر یہ اپنے انکار اور سرکشی پر قائم رہے تو پوری قوم ایک سخت عذاب کے ذریعہ ہلاک کر دی گئی۔ جسکی

تفصیل اس طرح ہے -

وَالَّذِي مَدَّ يَدَيْهِ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا، یعنی ہم نے بھیجا مَدَّیْن کی طرف اُنکے بھائی شُعَيْب کو -
مَدَّیْن اصل میں ایک شہر کا نام تھا جسکو مَدَّیْن بن ابراہیم نے بسایا تھا اس کا محل وقوع ملک شام کے موجودہ مقام "معان" کو بتلایا جاتا ہے، اس شہر کے باشندوں کو بھی بجائے اہل مدین کے مدین کہہ دیا جاتا ہے، شعیب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں جو اسی قوم مدین میں سے ہیں اسی لئے اُن کو مَدَّیْن کا بھائی فرما کر اس نعت کی طرف اشارہ کر دیا کہ اس قوم کے رسول کو اللہ تعالیٰ نے اسی قوم سے بنایا تاکہ ان سے مانوس ہو کر اُنکی ہدایات کو یا سانی قبول کر سکیں۔
قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ،

اس میں حضرت شعیب علیہ السلام نے پہلے تو اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی کیونکہ یہ لوگ مُشرک تھے، درختوں کی پوجا پاٹ کیا کرتے تھے، جسکو قرآن میں لفظ اَیْکَہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی کی نسبت سے اہل مدین کو أَصْحَابُ الْاَیْکَہ کا بھی لقب دیا گیا ہے، اس کُفر و شرک کے ساتھ ان میں ایک اور عیب و گناہ نہایت سخت یہ تھا کہ بیوپار اور لین دین کے وقت ناپ تول میں کمی کر کے لوگوں کا حق مار لیتے تھے، حضرت شعیب علیہ السلام نے انکو اس سے منع فرمایا۔
فائدہ یہاں یہ بات خاص طور سے قابل غور ہے کہ کُفر و شرک سب گناہوں کی بڑھاپہ ہے جو

قوم اس میں مبتلا ہے اُس کو پہلے ایمان ہی کی دعوت دی جاتی ہے، ایمان سے پہلے دوسرے معاملات اور اعمال پر توجہ نہیں دی جاتی، دُنیا میں اُن کی نجات یا عذاب بھی اسی ایمان و کُفر کی بنیاد پر ہوتا ہے، تمام انبیاء سابقین اور انکی قوموں کے واقعات جو قرآن میں مذکور ہیں اسی طرز عمل کے شاہد ہیں، صرف دو قومیں ایسی ہیں جن پر عذاب نازل ہونے میں کُفر کے ساتھ اُن کے اعمالِ خبیثہ کو بھی دخل رہا ہے، ایک لوط علیہ السلام کی قوم جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے کہ اُن پر جو عذاب پوری بستی اُلٹ دینے کا واقع ہوا اُس کا سبب اُنکے عملِ خبیث کو بتلایا گیا ہے، دوسری قوم شعیب علیہ السلام کی ہے جنکے عذاب کا سبب کُفر و شرک کے علاوہ ناپ تول میں کمی کرنے کو بھی قرار دیا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں کام اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب گناہوں سے زیادہ مغضوب اور شدید ہیں، بظاہر وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں کام ایسے ہیں کہ پوری نسلِ انسانی کو اس سے شدید نقصان پہنچتا ہے اور پورے عالم میں اس سے فسادِ عظیم پھیل جاتا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو ناپ تول میں کمی کرنے کے خبیث عمل سے روکنے کیلئے پیغمبرانہ شفقت کے ساتھ اول تو یہ فرمایا:

تمہیں (معاذ اللہ) ایسی غلط باتیں بتاتی ہے، اُن کے اس کلام سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی یوں سمجھتے تھے کہ دین و شریعت کا کام صرف عبادات تک محدود ہے معاملات میں اس کا کیا دخل ہے، ہر شخص اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرے، اُس پر کوئی پابندی لگانا دین کا کام نہیں جیسے اس زمانہ میں بھی بہت سے بے سمجھ لوگ ایسا خیال رکھتے ہیں۔

قوم نے خالص ہمدردی، دل موزی انصیحت کا جواب اس قدر تلخ دیا مگر حضرت شعیب علیہ السلام شانِ پیغمبری رکھتے ہیں، یہ سب کچھ سُنانے کے بعد بھی اُسی ہمدردی کے ساتھ مخاطب ہو کر مزید فہمائش کے لئے فرمانے لگے :

يَقَوْمِ اَسْمِعُوْنِيْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنٰتٍ مِّنْ شَرٰٓئِفٍ وَمَا زِدْنِيْ مِنْ رِّزْقٍ اَحْسَنًا، یعنی اے میری قوم مجھے بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے اپنی بات کے حق ہونے پر دلیل اور کافی شہادت رکھتا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے بہترین رزق بھی عطا فرمایا ہو، کہ ظاہری رزق جس پر معاش کا مدار ہے وہ بھی عطا فرمایا اور باطنی رزق فہم و عقل اور اس پر وحی و نبوت کا انعام گراںمایہ بھی عطا فرمایا تو پھر کیا تمہاری رائے یہ ہے کہ ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے میں بھی تمہاری طرح گمراہی اور ظلم کو اختیار کر لوں اور حق بات تمہیں نہ پہنچاؤں، اس کے بعد فرمایا :

وَمَا اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَا اَنْهٰكُمْ عَنْهُ، یعنی یہ بھی تو سمجھو کہ میں جس چیز سے تمہیں روکتا ہوں خود بھی تو اس کے پاس نہیں جاتا، اگر میں تمہیں منع کرتا اور خود اس کا ارتکاب کرتا تو تمہارے لئے کہنے کی گنجائش تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ داعی اور واعظ و مبلغ کے عمل کو اسکی وعظ و نصیحت میں بڑا دخل ہوتا ہے جس چیز پر واعظ خود عامل نہ ہو اُسکی بات کا دوسروں پر کوئی اثر نہیں ہوتا، پھر فرمایا :

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ، یعنی میرا مقصد اس ساری جدوجہد اور تمہیں بار بار کی فہمائش سے بجز اس کے کچھ نہیں کہ مقدور بھر اصلاح کی کوشش کروں، اور پھر فرمایا کہ یہ کوشش بھی درحقیقت میرے اپنے اختیار سے نہیں بلکہ وَمَا تَوْفِيقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ، عَلَيَّهٖ تَوَكَّلْتُ وَالاٰیٰتُ اٰیٰتُہٗ یعنی میں جو کچھ کرتا ہوں وہ سب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے کرتا ہوں، ورنہ میرے بس میں کچھ نہ تھا، اُسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف ہر کام میں، میں رجوع کرتا ہوں۔

اس پسند و نصیحت کے بعد پھر اُن کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا، وَيَقَوْمِ لَا يَجْنِيْ مِنْكُمْ شِقَاقِيْ اَنْ يُصِيبَكُمْ مِّثْلُ مَا اَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ اَوْ قَوْمَ هٰوٰدٍ اَوْ قَوْمَ طٰرُوتَ وَمَا قَوْمٌ لَّوْ طٰقْتُمْ بِبَعْدِي، یعنی تم سوچو سمجھو، ایسا نہ ہو کہ میری مخالفت اور عداوت تم پر کوئی ایسا عذاب لا ڈالے جیسا تم سے پہلے قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح علیہم السلام پر آچکا ہے، اور لوط علیہ السلام کی قوم اور اُن کا

عبرتِ ناک عذابِ قوم سے کچھ دُور بھی نہیں، یعنی مقامِ اعتبار سے بھی قومِ لوط کی اُلٹی ہوئی بستیِ مذہب کے قریب ہی ہیں اور زمانہ کے اعتبار سے بھی تم سے بہت قریب زمانہ میں ان پر عذاب آیا ہے اس سے عبرت حاصل کرو اور اپنی ضد سے باز آ جاؤ۔

اُن کی قوم اس کو سُن کر اور بھی زیادہ اشتعال میں آگئی اور کہنے لگی کہ اگر آپکے خاندان کی حمایت آپکو حاصل نہ ہوتی تو ہم آپکو سنگسار کر دیتے، حضرت شعیب علیہ السلام نے اس پر بھی ان کو نصیحت فرمائی کہ تم کو میرے خاندان کا تو خوف ہو مگر خدا تعالیٰ کا کچھ خوف نہ آیا جسکے قبضہ میں سب کچھ ہے۔

بالآخر جب قوم نے کوئی بات نہ مانی تو شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ اچھا تم اب عذاب کا انتظار کرو، اس کے بعد حق تعالیٰ نے شعیب علیہ السلام اور اُن پر ایمان لانے والوں کو حسبِ دستور اس بستی سے نکال لیا اور باقی سب کے سب جبریل علیہ السلام کی ایک سخت آواز سے یکدم ہلاک ہو گئے۔

اِحْکَامٌ وَمَسَائِلُ

ناپ تول کی کمی کا مسئلہ | مذکورہ آیات میں قومِ شعیب علیہ السلام پر عذاب آنیکا ایک سبب اُنکا ناپ تول میں کمی کرنا تھا جسکو تَطْفِيفُ کہا جاتا ہے، اور قرآن کریم نے ذیلُ لِّلْمُطَفِّفِینَ میں اُنکے عذابِ شدید کا بیان فرمایا ہے اور باجماع امت ایسا کرنا سخت حرام ہے، حضرت فاروقِ عظیم کے ایک ارشاد کے ماتحت حضرت امام مالکؒ نے مؤطا میں فرمایا کہ ناپ تول کی کمی سے اصل مرد یہ ہے کہ کسی کا جو حق کسی کے ذمہ ہو اُسکو پورا ادا نہ کرے بلکہ اس میں کمی کرے خواہ وہ تاپنے تولنے کی چیز ہو یا دوسری طرح کی، اگر کوئی ملازم اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، کسی دفتر کا ملازم یا کوئی مزدور اپنے کام کے وقت مقرر میں کمی کرتا ہے یا مقررہ کام کرنے میں کوتاہی کرتا ہے وہ بھی اسی فہرست میں داخل ہے، کوئی شخص نماز کے آداب و سنن پورے بجا نہیں لاتا وہ بھی اسی تطفیف کا مجرم ہے، نعوذ باللہ منہ

مسئلہ | تفسیرِ قرطبی میں ہے کہ قومِ شعیب کی ایک عادت یہ تھی کہ ملک کے رائج سگون دھم و دینار میں سے کنارے کاٹ کر سونا چاندی بچا لیتے اور یہ کٹے ہوئے سگے پوری قیمت سے چلتے کر دیتے تھے، حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو اس سے منع فرمایا۔

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسلامی سلطنت کے سگوں کا توڑنا حرام قرار دیا ہے، اور آیت تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ کی تفسیر میں امام تفسیر حضرت زبید بن اسلم نے یہی فرمایا ہے کہ یہ لوگ دھم و دینار کو توڑ کر اپنا فائدہ حاصل کر لیا کرتے تھے جسکو قرآن نے فسادِ عظیم قرار دیا ہے۔

حضرت عمران عبدالعزیز کی خلافت کے زمانہ میں ایک شخص کو اس جرم میں گرفتار کیا گیا کہ وہ درہم کو کاٹ رہا تھا، موصوف نے اُس کو کوڑوں کی سزا دی اور سر مونڈھوا کر شہر میں گشت کرایا۔ (تفسیر قرطبی)

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٩٦﴾ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَ

اور البتہ بھیج چکے ہیں ہم موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور واضح سند دیکھ

مَلَأِيْهِ فَاتَّبَعُوْا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَا اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِشَيْءٍ ﴿٩٧﴾ يَقْدُرُ

اس کے سرداروں کے پاس پھر وہ چلے حکم پر فرعون کے، اور نہیں بات فرعون کی کچھ کام کی، آگے ہوگا

قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۚ وَيَسْأَلُ الْوَسْوَ الْوَسْوَ ﴿٩٨﴾

اپنی قوم کے قیامت کے دن پھر پہنچائے گا ان کو آگ پر، اور بڑا گھاٹ ہے جس پر پہنچے،

وَاتَّبَعُوْا فِيْ هٰذِهِ لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُسْأَلُ السِّرْفُ السِّرْفُ ﴿٩٩﴾

اور پیچھے سے ملتی رہی اس جہاں میں لعنت اور دن قیامت کے بھی، بُرا انعام ہے جو ان کو ملا

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْهَا قَائِمٌ وَحَصِيْدٌ ﴿١٠٠﴾

یہ تھوڑے سے حالات ہیں بستیوں کے ہم سناتے ہیں تجھ کو بعض انیس سے ایک قائم ہیں اور بے کی بڑک گئی،

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَمَا اَغْنَتْ عَنْهُمْ اِلٰهَتُهُمْ

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن ظلم کر گئے وہی اپنی جان پر پھر کچھ کام نہ آئے ان کے ٹھاکر (معبود)

الَّتِي يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَاءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَمَا

جن کو پکارتے تھے سوائے اللہ کے کسی چیز میں جس وقت پہنچا حکم تیرے رب کا اور نہیں

شَرَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتٰبٍ ﴿١٠١﴾

بڑھایا ان کے حق میں سوائے ہلاک کرنے کے۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (بھی) اپنے معجزات اور دلیل روشن دیکر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا سو نہ فرعون نے مانا اور نہ ان کے سرداروں نے مانا بلکہ فرعون بھی اپنے کفر پر رہا اور وہ لوگ بھی (فرعون رہی) کی رائے پر چلتے رہے اور فرعون کی رائے کچھ صحیح نہ تھی وہ (فرعون) قیامت کے دن اپنی قوم سے آگے آگے ہوگا پھر ان (سب) کو دوزخ میں جا اتارے گا، اور وہ (دوزخ) بہت ہی بُری جگہ ہے اُترنے کی جس میں یہ لوگ اتارے جاویں گے اور اس دنیا میں بھی

لعنت ان کے ساتھ ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی (ان کے ساتھ رہے گی، چنانچہ یہاں قہر سے غرق ہوئے اور وہاں دوزخ نصیب ہوگا) برا انعام ہے جو ان کو دیا گیا، یہ (جو کچھ اقصیٰ میں مذکور ہوا) ان (غار شدہ) بستیوں کے بعض حالات تھے جنکو ہم آپ سے بیان کرتے ہیں (سو) بعضی بستیاں تو ان میں (اب بھی) قائم ہیں (مثلاً مصر کہ آل فرعون کے ہلاک ہونے کے بعد بھی آباد رہا) اور بعض کا بالکل خاتمہ ہو گیا اور (ہم نے جو ان مذکورہ بستی والوں کو سزائیں دیں سو ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا کہ بلا تصور سزا دی ہو جو کہ صورتہ ظلم ہے) لیکن انہوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا (کہ ایسی حرکتیں کیں جن سے مستوجب سزا ہوئے) سوائے وہ معبود جنکو وہ خدا کو چھوڑ کر پوجتے تھے انکو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکے جب آپ کے رب کا حکم (عذاب کے لئے) آپہنچا (کہ ان کو عذاب سے بچالیتے) اور فائدہ تو کیا پہنچا اور (الٹا انکو نقصان پہنچایا) (یعنی سبب نقصان کے ہوئے کہ انکی پرستش کی بدولت سزایاب ہوئے)

وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقَرْيَ وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهُ

اور ایسی ہی ہے پکڑ تیرے رب کی جب پکڑتا ہے بستیوں کو اور وہ ظلم کرتے ہوئے ہیں، بیشک اسکی پکڑ

أَلَيْسَ شَدِيدٌ ۝۱۰۳ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ ط

دشمنانہ شدت کی ، اس بات میں نشانی ہے اسکو جو ڈرتا ہے آخرت کے عذاب سے ،

ذَلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذَلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ ۝۱۰۴ وَمَا تُؤْخِرُ

وہ ایک دن ہے جس میں جمع ہونگے سب لوگ اور وہ دن ہے سب کے پیش ہونے کا، اور اسکو ہم دیر جو کرتے ہیں

إِلَّا لِأَجَلٍ مُّعَدُّودٍ ط ۝۱۰۵ يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِمْ فَبِمَنْهُمْ

سوائے وعدہ کیلئے جو مقرر ہے ، ، جس دن وہ آئیں گے بات نہ کر سکے گا کوئی جاندار مگر اس کے حکم سے ، سوائے بعض

شَقِيقٌ وَسَعِيدٌ ۝۱۰۶ فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَيُنَادُونَ فِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زُفِيرٌ وَ

بدبخت ہیں اور بعض نیک بخت ، سو جو لوگ بدبخت ہیں وہ تو آگ میں ہیں ان کو وہاں چیخنا ہے اور

شَهِيقٌ ط ۝۱۰۷ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ

دھاڑنا ، ہمیشہ رہیں گے اس میں جب تک رہے آسمان اور زمین مگر جو چاہے

رَبُّكَ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ۝۱۰۸ وَأَمَّا الَّذِينَ سَعِدُوا فَيُ

تیرا رب ، بیشک تیرا رب کرڈالتا ہے جو چاہے ، اور جو لوگ نیک بخت ہیں سو بخت

الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ط

میں ہیں ہمیشہ رہیں گے اس میں جب تک رہے آسمان اور زمین مگر جو چاہے تیرا رب ،

عَطَاءٌ غَيْرَ مَجْذُوذٍ ۝۹۸ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هَؤُلَاءِ

بخشش ہے بے انتہا سو تو نہ رہ دھوکے میں ان چیزوں سے جنکو پوجتے ہیں یہ لوگ

مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاؤُهُمْ مِنْ قَبْلُ ۖ وَإِنَّا لَمُوقُّوهُمْ

کچھ نہیں پوجتے مگر ویسا ہی جیسا کہ پوجتے تھے انکے باپ دادا اس سے پہلے، اور ہم دینے والے ہیں انکو

نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنقُوصٍ ۝۹۹ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَخُتِلِفَ

ان کا حصہ یعنی عذاب کا بلا نقصان، اور البتہ ہم نے دی تھی موسیٰ کو کتاب پھر اس میں پھوٹ

فِيهِ ۖ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۖ وَإِنَّهُمْ لَفِي

پڑگئی اور اگر نہ ہوتا ایک لفظ کہ پہلے فرما چکا تھا تیرا رب تو فیصلہ ہو جاتا ان میں اور ان کو اس میں

شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ۝۱۰۰ وَإِنْ كُنَّا لَمَّا لِيُؤْفِقِيَهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ ۖ

شہ ہے کہ مطمئن نہیں ہونے دیتا، اور جتنے لوگ ہیں جب وقت آیا پورا دیگا رب تیرا ان کو ان کے اعمال،

إِنَّهُمْ يَمَّا يَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝۱۰۱

اس کو سب خبر ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اور آپ کے رب کی دار و گیر ایسی ہی (سخت) ہے جب وہ کسی بستی والوں پر دار و گیر کرتا ہے جبکہ وہ ظلم و کفر کیا کرتے ہوں، بلاشبہ اس کی دار و گیر بڑی اتم رساں (اور سخت ہے کہ اس سے سخت تکلیف پہنچتی ہے اور اس سے کوئی بچ نہیں سکتا) ان واقعات میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہو (وہ عبرت ظاہر ہے کہ جب دنیا کا عذاب (سخت) ہے حالانکہ یہ دارالجزا نہیں تو آخرت کا ہو کہ دارالجزا ہے کیسا سخت عذاب ہوگا) وہ (یعنی آخرت کا دن) ایسا دن ہوگا کہ اس میں تمام آدمی جمع کئے جاویں گے اور وہ سب کی حاضری کا دن ہے اور (وہ دن گواہ تک آیا نہیں لیکن اس سے کوئی اس کے آنے میں شک نہ کرے آدے گا ضرور) ہم اسکو صرف تھوڑی مدت کے لئے (بعض مصلحتوں سے) ملتوی کئے ہوئے ہیں (پھر جس وقت وہ دن آوے گا) (مارے مہیت کے لوگوں کا یہ حال ہوگا کہ) کوئی شخص بدون خدا کی اجازت کے یا تک (بھی) نہ کرے گا (وہاں جب حساب کتاب کیلئے حاضری ہوگی اور ان کے اعمال پر جواب طلب کیا جاوے گا اس وقت البتہ منہ سے بات نکلے گی خواہ وہ بات مقبول ہو یا مقبول نہ ہو سو اس حالت میں تو سب اہل موقف شریک ہونگے، پھر آگے) ان میں (یہ فرق ہوگا کہ بعض توشقی (یعنی کافر) ہوں گے اور بعض سعید (یعنی مؤمن) ہونگے

سو جو لوگ شقی ہیں وہ تو دوزخ میں ایسے حال سے ہوں گے کہ اس میں ان کی چیخ و پکار پڑی ہوگی (اور) ہمیشہ ہمیش کو اس میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم ہیں (یہ محاورہ ہے ابدیت کیلئے) اور کوئی نکلنے کی سبیل نہ ہوگی ہاں اگر خدا ہی کو (نکالنا) منظور ہو تو دوسری بات ہے (کیونکہ) آپ کا رب جو کچھ چاہے اسکو پورے طور سے کر سکتا ہے (مگر باوجود قدرت کے یہ یقینی ہے کہ خدا یہ بات نہ چاہے گا اس لئے نکلنا نصیب نہ ہوگا) اور رہ گئے وہ لوگ جو سعید ہیں سو وہ جنت میں ہونگے (اور) وہ اس میں داخل ہونیکے بعد ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم ہیں (گو جانیکے قبل کچھ سزا بھگتی ہو) ہاں اگر خدا ہی کو (نکالنا) منظور ہو تو دوسری بات ہے (مگر یہ یقینی ہے کہ خدا یہ بات کبھی چاہیگا پس نکلنا بھی کبھی ہوگا بلکہ) وہ غیر منقطع عطیہ ہوگا (اور جب کفر کا وبال اوپر کی آیتوں سے معلوم ہو چکا) سو اے مخاطب! جس چیز کی یہ پرستش کرتے ہیں اسکے بارے میں ذرا شبہ کرنا (بلکہ یقین رکھنا کہ انکا یہ عمل موجب سزا ہے بوجہ باطل ہونیکے) اور باطل ہونے کی دلیل یہ کہ یہ لوگ بھی اسی طرح (بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل) عبادت (تغیر اللہ کی) کر رہے ہیں جس طرح اسکے قبل ان کے باپ دادا عبادت کرتے تھے (امر خلاف دلیل باطل اور موجب سزا ہوتا ہے) اور ہم یقیناً (قیامت کو) ان کا حصہ (عذاب کا) ان کو پورا پورا بے کم و کاست پہنچا دیں گے، اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (یعنی توریت) دی تھی سو اس میں (بھی مثل قرآن کے) اختلاف کیا گیا (کہ کسی نے مانا کسی نے نہ مانا، یہ کوئی آپ کے لئے نئی بات نہیں ہوئی پس آپ معوم نہیں اور) یہ منکرین ایسے مستحق عذاب ہیں کہ اگر ایک بات نہ ہوتی جو آپ کے رب کی طرف سے پہلے ٹھہر چکی ہے کہ پورا عذاب انکو آخرت میں دو لگا (تو جس چیز میں یہ اختلاف کر رہے ہیں) انکا (قطعی) فیصلہ (دنیا ہی میں) ہو چکا ہوتا (یعنی وہ عذاب موعود واقع ہو جاتا) اور یہ لوگ (باوجود قیام براہین کے ابھی تک) اس (فیصلہ یعنی عذاب موعود) کی طرف سے ایسے شک میں (پڑے) ہیں جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے (کہ ان کو عذاب کا یقین ہی نہیں آتا، شک کا مطلب یہی ہے) اور (کسی کے شک و انکار سے یہ عذاب ٹلے گا نہیں بلکہ) بالیقین سب کے سب ایسے ہی ہیں کہ آپ کا رب ان کو ان کے اعمال (کی جزا) کا پورا پورا حصہ دیگا، بالیقین وہ ان کے سب اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے (جب ان کی سزا کا معاملہ آپ سے کچھ سروکار نہیں رکھتا تو آپ اور مسلمان اپنے کام میں لگے رہیں، وہ کام یہ ہیں جو اگلی آیات میں مذکور ہیں)۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ

سو تو سیدھا چلا جا جیسا تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ اور ہلکے نہ بڑھو، بیشک وہ دیکھتا ہے

بَصِيرًا ۝ وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَيَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّنْ

جو کچھ تم کرتے ہو، اور مت جھکو ان کی طرف جو ظالم ہیں پھر تم کو لگے گی آگ اور کوئی نہیں تمہارا

دُونِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاءٍ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوتُ ۝۱۱۳

اللہ کے سوا مددگار پھر کہیں مدد نہ پاؤ گے ۔

خلاصہ تفسیر

جس طرح کہ آپ کو حکم ہوا ہے (راہ دین پر) مستقیم رہئے اور وہ لوگ بھی (مستقیم رہیں) جو کفر سے توبہ کر کے آپ کے ساتھ ہیں اور دائرۃ (دین) سے ذرا مت نکلویقیناً وہ تم سب کے اعمال کو خوب دیکھتا ہے اور (اے مسلمانو! ان) ظالموں کی طرف (یا جو انکی مثل ہوں انکی طرف دلی ہمتی سے یا اعمال و احوال میں مشارکت و مشابہت سے) مت جھکو، کبھی تمکو دوزخ کی آگ لگ جائے اور (اس وقت) خدا کے سوا تمہارا کوئی رفاقت کرنے والا نہ ہو پھر تمہاری حمایت کسی طرف سے بھی نہ ہو (کیونکہ رفاقت تو حمایت سے سہل ہے جب رفاقت کرتے والا بھی کوئی نہیں تو حمایت کرنے والا کون ہوتا) ۔

مَعَارِفٌ وَمَسَائِلُ

سورہ ہود میں انبیاء سابقین اور انکی قوموں کے واقعات نوح علیہ السلام سے شروع کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام تک خاصی ترتیب و تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں، جن میں سینکڑوں مواضع و حکم اور احکام و ہدایات ہیں، ان واقعات کے ختم پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے امت محمدیہ کو اُن سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی، فرمایا ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغٰیِیْ نَقُصُّهُ عَلَیْكَ مِنْهَا قَابِلٌمْ وَحَصِیْدٌ، یعنی یہ ہیں پہلے شہروں اور بستیوں کے واقعات جو ہم نے آپ کو سنائے ہیں، یہ بستیاں جن پر اللہ تعالیٰ کے عذاب آئے ان میں سے بعض کے تو ابھی کچھ عمارات یا کھنڈرات موجود ہیں اور بعض بستیاں ایسی کر دی گئی ہیں جیسے کھیتی بکاٹنے کے بعد زمین ہموار کر دی جائے، پچھلی کھیتی کا نشان تک نہیں رہتا۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ خود اُنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا کہ اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کو چھوڑ کر بتوں اور دوسری چیزوں کو اپنا خدا بنا بیٹھے، جسکا انجام یہ ہوا کہ جب خدا تعالیٰ کا عذاب آیا تو ان خود ساختہ خداؤں نے انکی کوئی مدد نہ کی، اور اللہ تعالیٰ جب بستیوں کو عذاب میں پکڑتے ہیں تو انکی گرفت ایسی ہی سخت اور دردناک ہو ا کرتی ہے۔

اس کے بعد انکو آخرت کی فکر میں مشغول کرنے کے لئے فرمایا کہ ان واقعات میں اُن لوگوں کیلئے بڑی عبرت اور نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں، جس دن تمام اولاد آدم ایک جگہ جمع اور

موجود ہوگی، اُس دن کا حال یہ ہوگا کہ کسی شخص کی مجال نہ ہوگی کہ بغیر اجازتِ خداوندی ایک حرف بھی زبان سے بول سکے۔

اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکرر خطاب کر کے ارشاد فرمایا فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهَا تُعْمَلُونَ بِصُورٍ، یعنی آپ دین کے راستہ پر اُسی طرح مستقیم رہئے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی مستقیم رہیں جو کفر سے توبہ کر کے آپ کے ساتھ ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود سے نہ نکلے کیونکہ وہ تمہارے سب اعمال کو دیکھ رہے ہیں۔

استقامت کا مفہوم | استقامت کے معنی سیدھا کھڑا رہنے کے ہیں جس میں کسی طرف ذرا سا جھکاؤ اور اہم فوائد و مسائل نہ ہو، ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں، کسی لوہے، پتھر وغیرہ کے عمود کو باہر نچنچر ایک مرتبہ اس طرح کھڑا کر سکتے ہیں کہ اس کے ہر طرف زاویہ قائمہ ہی رہے کسی طرف ادنیٰ میلان نہ ہو لیکن کسی متحرک چیز کا ہر وقت ہر حال میں اس حالت پر قائم رہنا کس قدر مشکل ہے وہ اہل بصیرت سے مخفی نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کو اس آیت میں اپنے ہر کام میں ہر حال میں استقامت پر رہنے کا حکم فرمایا گیا ہے، استقامت لفظ تو چھوٹا سا ہے مگر مفہوم اس کا ایک عظیم الشان وسعت رکھتا ہے کیونکہ معنی اسکے یہ ہیں کہ انسان اپنے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، کسب معاش اور اُسکی آمد و صرف کے تمام ابواب میں اللہ جلّ شانہ کی قائم کردہ حدود کے اندر اُسکے بتلائے ہوئے راستہ پر سیدھا چلتا رہے، ان میں سے کسی باب کے کسی عمل اور کسی حال میں کسی ایک طرف جھکاؤ یا کمی، زیادتی ہو جائے تو استقامت باقی نہیں رہتی۔

دُنیا میں جتنی گمراہیاں اور عملی خرابیاں آتی ہیں وہ سب اسی استقامت سے ہٹ جانے کا نتیجہ ہوتی ہیں، عقائد میں استقامت نہ رہے تو بدعات سے شروع ہو کر کفر و شرک تک نوبت پہنچتی ہے، اللہ تعالیٰ کی توحید اور اُسکی ذات و صفات کے متعلق جو معتدل اور صحیح اصول رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے اس میں افراط و تفریط یا کمی بیشی کرنے والے خواہ نیک نیتی ہی سے اس میں مبتلا ہوں گمراہ کہلائیں گے، انبیاء علیہم السلام کی عظمت و محبت کی جو حدود مقرر کر دی گئی ہیں ان میں کمی کرتے ہوئے گمراہ و گستاخ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، ان میں زیادتی اور غلو کر کے رسول کو خدائی صفات و اختیارات کا مالک بنا دینا بھی اسی طرح کی گمراہی ہے، یہود و نصاریٰ اسی گمراہی میں کھوئے گئے، عبادات اور تقرب الی اللہ کے لئے جو طریقے قرآن عظیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمادیئے ہیں ان میں ذرا سی کمی کوتاہی جس طرح انسان کو استقامت سے گمراہ دیتی ہے اسی طرح ان میں اپنی طرف سے کوئی زیادتی بھی استقامت کو برباد کر کے انسان کو بدعات میں مبتلا کر دیتی ہے، وہ بڑی نیک نیتی سے

یہ سمجھتا رہتا ہے کہ میں اپنے رب کو راضی کر رہا ہوں اور وہ عین ناراضگی کا سبب ہوتا ہے اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو بدعات و محدثات سے بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے اور اسکو شدید گمراہی قرار دیا ہے، اس لئے انسان پر لازم ہے کہ جب وہ کوئی کام عبادت اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا و خیر کے لئے کرے تو کرنے سے پہلے اسکی پوری تحقیق کر لے کہ یہ کام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے اس کیفیت و صورت کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں، اگر ثابت نہیں تو اس میں اپنا وقت اور توانائی ضائع نہ کرے۔ اسی طرح معاملات اور اخلاق و معاشرت کے تمام ابواب میں قرآن کریم کے بتائے ہوئے اصول پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی تعلیم کے ذریعہ ایک معتدل اور صحیح راستہ قائم کر دیا ہے جس میں دوستی، دشمنی، نرمی، گرمی، غصہ اور برباری، کنجوسی اور سخاوت، کسب معاش اور ترک دنیا، اللہ پر توکل اور امکانی تدبیر، اسباب ضروریہ کی فراہمی اور مسبب الاسباب پر نظر، ان سب چیزوں میں ایک ایسا معتدل صراطِ مستقیم مسلمانوں کو دیا ہے کہ اس کی نظیر عالم میں نہیں مل سکتی، انکو اختیار کرنے سے ہی انسان، انسان کامل بنتا، اُس میں استقامت سے ذرا گرنے ہی کے نتیجے میں معاشرہ کے اندر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ استقامت ایک ایسا جامع لفظ ہے کہ دین کے تمام اجزاء و ارکان اور ان پر صحیح عمل اس کی تفسیر ہے۔

سفیان بن عبد اللہ ثقفیؒ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے اسلام کے معاملہ میں کوئی ایسی جامع بات بتلا دیجئے کہ آپ کے بعد مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے، آپ نے فرمایا: قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ اِنَّكُمْ اَسْتَقِمْ، یعنی اللہ پر ایمان لاؤ اور پھر اُس پر مستقیم رہو، (رواہ مسلم - از قرطبی) اور عثمان بن حاضِر ازدیؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے کوئی وصیت فرما دیجئے، آپ نے فرمایا عَلَيْكَ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالاَمْتِنَاقَةِ لِشَيْعٍ وَلَا تَبْتَدِيعٍ (رواہ الدہلی فی سند ۴ - از قرطبی) یعنی تم تقویٰ اور خوفِ خدا کو لازم پکڑو اور استقامت کو بھی جسکا طریقہ یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں شریعت کا اتباع کرو، اپنی طرف سے کوئی بدعت ایجاد نہ کرو۔ اس دنیا میں سب سے زیادہ دشوار کام استقامت ہی ہے اسی لئے محققین صوفیاء نے فرمایا کہ استقامت کا مقام کرامت سے بالاتر ہے، یعنی جو شخص دین کے کاموں میں استقامت اختیار کئے ہوئے ہے اگرچہ عمر بھر اُس سے کوئی کرامت صادر نہ ہو، وہ اعلیٰ درجہ کا ولی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ پورے قرآن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس آیت سے زیادہ سخت اور شاق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، اور فرمایا کہ جب صحابہ کرامؓ نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لجنیہ مبارک میں کچھ سفید بال دیکھ کر بطور حسرت و افسوس کے عرض کیا کہ اب تیزی سے بڑھاپا آپکی طرف آرہا ہے تو فرمایا کہ مجھے سورۃ ہودؑ نے بوڑھا کر دیا، سورۃ ہودؑ میں جو پھلی قوموں پر

سخت و شدید عذاب کے واقعات مذکور ہیں وہ بھی اس کا سبب ہو سکتے ہیں مگر ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہی اُس کا سبب ہے۔

تفسیر قرطبی میں ابو علی مسری سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے خواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تو عرض کیا کہ کیا آپ نے ایسا فرمایا ہے کہ مجھے سورہ ہودؑ نے بوڑھا کر دیا؟ آپ نے فرمایا ہاں! انہوں نے پھر دریافت کیا کہ اس سورت میں جو انبیاء علیہم السلام کے واقعات اور انکی قوموں کے عذاب کا ذکر ہے اس نے آپکو بوڑھا کیا؟ تو فرمایا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ! یہ ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو انسان کامل کی مثالی صورت بنکر اس دُنیا میں تشریف لائے تھے اور فطری طور پر استقامت آپکی عادت تھی مگر پھر اس قدر بار بار یا تو اس لئے محسوس فرمایا کہ آیت میں مطلق استقامت کا حکم نہیں بلکہ حکم یہ ہے کہ امر الہی کے مطابق استقامت ہونا چاہئے، انبیاء علیہم السلام پر جس قدر خوف و خشیت الہی کا غلبہ ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے، اس خشیت ہی کا یہ اثر تھا کہ باوجود کامل استقامت کے یہ فکر لگ گئی کہ اللہ جل شانہ کو جیسی استقامت مطلوب ہے وہ پوری ہوئی یا نہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو اپنی استقامت کی تو زیادہ فکر نہ تھی کیونکہ وہ بحمد اللہ حاصل تھی مگر اس آیت میں پوری امت کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے، امت کا استقامت پر قائم رہنا دشوار دیکھ کر یہ فکر و غم طاری ہوا۔

حکم استقامت کے بعد فرمایا وَلَا تَطْغَوْا، یہ لفظ مصدر "طغیان" سے بنا ہے، اس کے معنی حد سے نکل جانے کے ہیں جو ضد ہے استقامت کی، آیت میں استقامت کا حکم مثبت انداز میں صادر فرمانے پر کفایت نہیں فرمائی بلکہ اُسکے منفی پہلو کی ممانعت بھی صراحت ذکر کر دی کہ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق وغیرہ میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کی مقرر کردہ حدود سے باہر نہ نکلو کہ یہ ہر فساد اور دینی و دنیوی خرابی کا راستہ ہے۔

دوسری آیت میں انسان کو خرابی اور بربادی سے بچانے کے لئے ایک اور اہم ہدایت نامہ دیا گیا ہے وَلَا تَزْكُتُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ، یعنی ظالموں کی طرف ادنیٰ میلان بھی نہ رکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ انکے ساتھ تمہیں بھی جہنم کی آگ لگ جائے۔ لَا تَزْكُتُوا مصدر سرکون سے بنا ہے جسکے معنی کسی طرف خفیف سے میلان اور جھکاؤ اور اس پر اعتماد و رضا کے ہیں، اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ ظلم و جور میں خود مبتلا ہونے کو تو دین و دنیا کی تباہی سمجھی جانتے ہیں مگر ظالموں کی طرف ادنیٰ سا جھکاؤ اور میلان، اُن سے راضی ہونا، اُن پر اعتماد کرنا بھی انسان کو اُسی بربادی کے کنارے لگا دیتا ہے۔ اس جھکاؤ اور میلان سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق صحابہ و تابعین کے چند اقوال منقول ہیں، جن میں کوئی تعارض و اختلاف نہیں، سب اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں:

حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ ظالموں سے دوستی نہ کرو اور ان کا کہنا نہ مانو، ابن جریرؒ نے فرمایا کہ ظالموں کی طرف کسی طرح کا بھی میلان نہ رکھو، ابو العالیہؒ نے فرمایا کہ ان کے اعمال و افعال کو پسند نہ کرو (قرطبی) سدی نے فرمایا کہ ظالموں سے مَدَامَنْت نہ کرو یعنی ان کے بُرے اعمال پر سکوت یا رضا کا اظہار نہ کرو، عکرمہؒ نے فرمایا کہ ظالموں کی صحبت میں نہ بیٹھو، قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ شکل و صورت اور فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے۔ قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ ظلم و جور کی ممانعت اور حرمت کے لئے اس آیت میں وہ انتہائی شدت ہے جو زیادہ سے زیادہ تصور میں لائی جاسکتی ہے کیونکہ ظالموں کے ساتھ دوستی اور گہرے تعلق ہی کو نہیں بلکہ انکی طرف ادنیٰ درجہ کے میلان اور جھکاؤ اور انکے پاس بیٹھنے کو بھی اس میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ امام اوزاعیؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی شخص اُس عالم سے زیادہ مغرض نہیں جو اپنے دنیوی مفاد کی خاطر کسی ظالم سے ملنے کے لئے جائے (منظہری)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہل کفر اور اہل معصیت اور اہل بدعت کی صحبت سے اجتناب اور پرہیز واجب ہے، بجز اس کے کہ کسی مجبوری سے اُن سے ملنا پڑے، اور حقیقت یہی ہے کہ انسان کی صلاح و فساد میں سب سے بڑا دخل صحبت اور ماحول کا ہوتا ہے، اسی لئے حضرت حسن بصریؒ نے ان دونوں آیتوں کے دو لفظوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے دین کو دو حرف لاکے اندر جمع کر دیا ہے، ایک پہلی آیت میں لَا تَطْعَمُوا اور دوسرا دوسری آیت میں لَا تَزْكُمُوا، پہلے لفظ میں حدودِ شرعیہ سے نکلنے کی اور دوسرے لفظ میں بُرے لوگوں کی صحبت کی ممانعت ہے اور یہی سارے دین کا خلاصہ ہے۔

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَرُفُقًا مِّنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبُنَّ

اور قائم کر نماز کو دونوں طرف دن کے اور کچھ ٹکڑوں میں رات کے، البتہ نیکیاں دُور کرتی ہیں

السَّيِّئَاتِ ط ذَلِكَ ذِكْرِي لِلذَّاكِرِينَ ۝۱۱۳ وَأَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ

برائیوں کو، یہ یادگاری ہے یاد رکھنے والوں کو، اور صبر کر البتہ اللہ ضائع نہیں کرتا ثواب

الْمُحْسِنِينَ ۝۱۱۴ فَلَولاَ كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِن قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةَ تَنَاهَوْنَ

نیکی کرنے والوں کا، سو کیوں نہ ہوئے ان جماعتوں میں جو تم سے پہلے تھیں ایسے لوگ جن میں اثر خیر رہا ہو کہ

عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ

منع کرتے رہتے بگاڑ کرنے سے ملک میں مگر تھوڑے کہ جن کو ہم نے بچا لیا ان میں سے اور چلے وہ لوگ جو

ظَلَمُوا مَا أَتَوْا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ۝۱۱۵ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ

ظالم تھے وہی راہ جس میں عیش سے رہے تھے اور تھے گنہگار، اور تیرا رب ہرگز ایسا نہیں کہ ہلاک کرے

يُظْلِمُ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ۝۱۱۷ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً

بستیوں کو زبردستی سے اور لوگ وہاں کے نیک ہوں ، اور اگر چاہتا تیرا رب کر ڈالتا لوگوں کو ایک رستہ پر

وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ۝۱۱۸ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ ۝۱۱۹ وَتَمَّتْ

اور ہمیشہ رستے میں اختلاف میں ، مگر میں پر رحم کیا تیرے رب نے اور اسی واسطے انکو پیدا کیا ہے اور پوری

كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝۱۱۹ وَكُلًّا

ہوئی بات تیرے رب کی کہ البتہ بھڑوں گادرنخ جنوں سے اور آدمیوں سے اکٹھے ، اور سب چیز

تَقْصُصُ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نَشِئْتُ بِهِ فُؤَادَكَ وَجَاءَكَ فِي

بیان کرتے ہیں ہم تیرے پاس رسولوں کے احوال سے جس سے تسلی دیں تیرے دل کو اور آئی تیرے پاس

هَذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ۝۱۲۰ وَقُلْ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ

اس سورت میں تحقیق بات اور نصیحت اور یادداشت ایمان والوں کو اور کہہ دے انکو جو ایمان نہیں لاتے

اعْمَلُوا عَلَى مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَمِلُونَ ۝۱۲۱ وَانْتَظِرُوا إِنَّا مُنْتَظِرُونَ ۝۱۲۲

کام کئے جاؤ اپنی جگہ پر ہم بھی کام کرتے ہیں اور انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں

وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَالْيَمْرِ رُجْعٌ فَأَعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ

اور اللہ کے پاس ہے چھپی بات آسمانوں کی اور زمین کی اور اسی کی طرف رجوع ہے سب کام کا ، سو اسی

عَلَيْهِ ۝ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝۱۲۳

کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ رکھ اور تیرا رب بے خبر نہیں جو کام تم کرتے ہو ۔

خلاصہ تفسیر

اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نماز کی پابندی رکھتے دن کے دونوں سروں پر (یعنی اول اور

آخر میں) اور رات کے کچھ حصوں میں بیشک نیک کام (نامہ اعمال سے) مٹا دیتے ہیں بُرے کاموں کو

یہ بات (کہ نیکیوں سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں) ایک (جامع نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کیلئے

(کیونکہ ہر نیکی اس قاعدہ کلیہ میں داخل ہے پس اس سے ہر نیکی کی رحمت ہونا چاہئے) اور (ان منکرین کی طرف

سے جو معاملات پیش آتے ہیں ان پر صبر کیا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ انکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے (صبر

بھی اعلیٰ درجہ کی نیکو کاری ہے اس کا پورا اجر ملیگا اور اوپر جو سابقہ اقوام کی ہلاکت کے واقعات مذکور ہوئے تو

(وجہ اسکی یہ ہوئی کہ) جو امتیں تم سے پہلے گزری ہیں ان میں ایسے سمجھ دار لوگ نہ ہوئے جو کہ (دوسروں کو) ملک

میں فساد (یعنی کفر و شرک) پھیلانے سے منع کرتے بجز چند آدمیوں کے کہ جن کو ان میں سے ہم نے (عذاب سے)

بچالیا تھا کہ وہ تو البتہ جیسے خود کفر و شرک سے تائب ہو گئے تھے اور وہ کو بھی منع کرتے رہتے تھے اور ان ہی

دونوں عمل کی برکت سے وہ عذاب سے بچ گئے تھے باقی اور لوگ چونکہ خود ہی کفر میں مبتلا تھے انہوں نے
 اوروں کو بھی منع نہ کیا اور جو لوگ نافرمان تھے وہ جس ناز و نعمت میں تھے اسی کے پیچھے پیسے رہے اور
 جرائم کے خوگر ہو گئے کہ اس سے باز ہی نہ آئے، خلاصہ یہ کہ نافرمانی تو ان میں عام طور پر رہی اور منع کرنے والا
 کوئی ہوا نہیں اس لئے سب ایک ہی عذاب میں مبتلا ہوئے ورنہ کفر کا عذاب عام ہوتا اور فساد کا خاص،
 اب بوجہ منع نہ کرنے کے غیر مفسد بھی مفسد ہونے میں شریک قرار دیئے گئے اس لئے جو عذاب مجموعہ کفر و
 فساد پر نازل ہوا وہ بھی عام رہا اور (اس سے ثابت ہو گیا کہ) آپ کا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو کفر کے سبب
 ہلاک کر دے اور ان کے رہنے والے (اپنی اور دوسروں کی) اصلاح میں لگے ہوں (بلکہ جب بجائے اصلاح
 کے فساد کریں اور فساد کرنے والوں کو منع نہ کریں اس وقت عذاب خاص کے مستحق ہو جاتے ہیں) اور اگر
 اللہ کو منظور ہوتا تو سب آدمیوں کو ایک ہی طریقہ کا بنا دیتا یعنی سب کو مؤمن کر دیتا لیکن بعض حکمتوں سے
 ایسا منظور نہ ہوا، اس لئے دین کے خلاف مختلف طریقوں پر ہو گئے اور (آئندہ بھی) ہمیشہ اختلاف (ہی) کرتے
 رہیں گے مگر جس پر آپ کے رب کی رحمت ہو وہ دین کے خلاف طریقہ اختیار نہ کرے گا اور (اس اختلاف
 پر غم یا تأسف یا تعجب نہ کیجئے کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ ان میں اختلاف
 رہے اور اختلاف کیلئے پیدا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے رب کی یہ بات پوری ہوگی کہ میں جہنم کو جنت
 سے اور انسانوں سے دونوں سے بھر دوں گا (اور خود اسکی حکمت یہ ہے کہ جس طرح مہر و مین میں صفتِ حمت
 کا ظہور ہو مغضوبین میں صفتِ غضب کی ظاہر ہو پھر اس ظہور کی حکمت یا اس حکمت کی حکمت اللہ ہی کو
 معلوم، غرض اس ظہور کی حکمت سے جہنم میں جانا بعضوں کا ضرور اور جہنم میں جانے کیلئے وجود کفار کا گویا
 ضروری اور وجود کفار کے لئے اختلاف لازم، یہ وجہ ہے سب کے مسلمان نہ ہونے کی، اور پیغمبروں کے قصوں
 میں سے ہم یہ سائے (مذکورہ) قصے آپ سے بیان کرتے ہیں جنکے ذریعہ سے ہم آپ کے دل کو تقویت
 دیتے ہیں (ایک فائدہ بیان قصص کا تو یہ ہوا جسکا حاصل آپ کی تسلی دینا ہے) اور ان قصوں میں آپ کے
 پاس ایسا مضمون پہنچا ہے جو خود بھی راست (اور قطعی) ہے اور مسلمانوں کیلئے (برے کاموں سے روکنے
 کیلئے) نصیحت ہے اور (اچھے کام کرنے کیلئے) یاد دہانی ہے (یہ دوسرا فائدہ بیان قصص کا ہوا، ایک
 فائدہ نبی کیلئے، دوسرا امت کیلئے) اور جو لوگ باوجود ان حجج قاطعہ کے بھی ایمان نہیں لاتے ان سے
 کہہ دیجئے کہ (میں تم سے الجھتا نہیں، تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو ہم بھی اپنے طور پر عمل کر رہے ہیں
 اور ان اعمال کے نتیجہ کے تم بھی منتظر ہو، ہم بھی منتظر ہیں (سو عنقریب باطل کھل جاوے گا) اور آسمانوں
 اور زمین میں جتنی غیب کی باتیں ہیں ان کا علم خدا ہی کو ہے، تو بندوں کے اعمال تو غیب بھی نہیں ان کا علم
 تو بدرجہ اولیٰ حق تعالیٰ کو ہے) اور سب امور اسی کی طرف رجوع ہونگے (یعنی علم و اختیار دونوں اللہ ہی کے
 ہیں پھر اس کو کیا مشکل ہے اگر اعمال کی جزا و سزا دیدے اور جب وہ ایسا علم و اختیار رکھتا ہے، تو اسے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اُسی کی عبادت کیجئے (جس میں تبلیغ بھی داخل ہے) اور اُسی پر بھروسہ رکھئے (اگر تبلیغ میں کسی اذیت کا احتمال ہو، نیز بیچ میں بطور جذبہ معترضہ کے آپ سے خطاب فرمادیا، آگے پھر وہی مضمون ہے یعنی) اور آپ کا رب ان باتوں سے بے خبر نہیں جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو جیسا کہ اوپر علم غیب سے اعمال کا علم بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گیا،

معارف و مسائل

اُسلوب قرآنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورۃ ہود میں انبیاء سابقین اور انکی قوموں کے عبرتناک حالات کی عظمتِ شان کی طرف اشارہ واقعات ذکر کرنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور امت محمدیہ کو چند ہدایات دیکھتی ہیں جنکا سلسلہ پچھلی آیت فَاَسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ سے شروع ہوا ہے، ان ہدایات میں قرآن کریم کا یہ حسن بیان کس قدر دلکش اور ادب آموز ہے کہ جس کام کا حکم مثبت انداز میں دیا گیا اس میں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنایا گیا ہے اور امت محمدیہ کو تبعاً اُس میں شامل کیا گیا ہے، جیسے فَاَسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ اور مذکورہ صدر آیت میں اَقِمْ الصَّلَاةَ اور اسکے بعد وَاصْبِرْ۔ اور جس کام سے روکا گیا اور اس سے بچنے کی ہدایت کی گئی تو اس میں براہِ راست امت کو مخاطب کیا گیا، جیسے پچھلی آیتوں میں لَا تَطْغَوْا اور لَا تَرْکُوزُوا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوا۔

اور غور کیا جائے تو پورے قرآن میں عام طور پر یہی طرز استعمال ہوا ہے کہ امر کا مخاطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا گیا ہے اور نہی و ممانعت کا مخاطب امت کو، جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان کا اظہار ہے کہ جو کام قابلِ ترک ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی ان سے پرہیز کرتے ہیں، آپ کی فطرتِ سلیمہ اور طبیعت ہی اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی تھی کہ کسی بُری خواہش اور بُری چیز کی طرف میلان ہی نہ ہوتا تھا، یہاں تک کہ ایسی چیزیں جو ابتداءً اسلام میں جائز و حلال تھیں مگر انجام کار ان کا حرام ہونا اللہ تعالیٰ کے علم میں طے شد تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انکے حلال ہونے کے زمانہ میں کبھی انکے پاس نہیں آگئے، جیسے شراب یا سود اور ہوا وغیرہ اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے آپ کو اور آپ کی پوری امت کو اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے، علماء تفسیر صحابہ و تابعین کا اس پر اتفاق ہے کہ ”صلوٰۃ“ سے مراد اس جگہ فرض نمازیں ہیں (بحر محیط، قرطبی)، اور ”صلوٰۃ کی اقامت“ سے مراد اُسکی پوری پابندی اور مداومت ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ نماز کو اُسکے تمام آداب کے ساتھ ادا کرنا مراد ہے بعض نے فرمایا کہ نماز کو اُسکے افضل وقت میں ادا کرنا مراد ہے یہی تین قول آیت اَقِمْ الصَّلَاةَ کی تفسیر میں منقول ہیں اور حقیقت یہ کوئی اختلاف نہیں یہ سبھی چیزیں ”اقامتِ صلوٰۃ“ کے مفہوم میں شامل ہیں۔

اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دینے کے بعد نماز کے اوقات کا اجمالی بیان یہ ہے کہ ”دن کے دنوں میں یعنی شروع اور آخر میں اور رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کرو۔“ کیونکہ زُلْفَا، زُلْفَا کی جمع ہے جسکے معنی ایک حصہ اور

قطع کے ہیں، دن کے دونوں سروں کی نماز کے متعلق اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ پہلے سرے کی نماز نماز فجر ہے، آخری سرے کی نماز بعض حضرات نے مغرب کو قرار دیا ہے کہ دن کے بالکل ختم پر ہے اور بعض حضرات نے عصر کی نماز کو دن کے آخری سرے کی نماز قرار دیا ہے کیونکہ دن کی آخری نماز وہی ہے، وقت مغرب دن کا جز نہیں بلکہ دن گزرنے کے بعد آتا ہے، اور مُكَفِّرَاتِ اللَّيْلِ یعنی رات کے حصوں کی نماز سے مراد مجہور مفسرین حسن البصری، مجاہد، محمد بن کعب، قتادہ، ضحاک وغیرہم نے مغرب و عشاء کی نماز کو قرار دیا ہے اور ایک حدیث سے ایسی تائید ہوتی ہے جس میں ارشاد فرمایا ہے کہ مُكَفِّرَاتِ اللَّيْلِ مغرب و عشاء ہیں، تفسیر ابن کثیر، جبکہ طَرَفِ النَّهَارِ سے مراد صبح اور عصر کی نماز ہوئی اور مُكَفِّرَاتِ اللَّيْلِ سے مغرب و عشاء کی تو اس آیت میں چار نمازوں کے اوقات کا بیان آگیا صرف ظہر کی نماز کا بیان رہ گیا جو دوسری آیت اَقِمْ الصَّلَاةَ لِلدُّلُوکِ الشَّمْسِ میں آیا ہے۔

اس آیت میں اوقات مذکورہ میں "اقامت صلوٰۃ" کے حکم کے بعد ان کا ایک عظیم فائدہ بھی بتلایا گیا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ، یعنی نیک کام مٹا دیتے ہیں بُرے کاموں کو، حضرات مفسرین نے فرمایا کہ "نیک کام" سے تمام نیک کام مراد ہیں جن میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، صدقات، حسن خلق، حسن معاملہ وغیرہ سب داخل ہیں مگر نماز کو ان سب میں اولیت حاصل ہے، اسی طرح "سَيِّئَاتِ" کا لفظ تمام بُرے کاموں کو حاوی اور شامل ہے خواہ وہ کبیرہ گناہ ہوں یا صغیرہ، لیکن قرآن مجید کی ایک دوسری آیت نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات نے اسکو صغیرہ گناہوں کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے، معنی یہ ہیں کہ نیک کام جن میں نماز سب افضل ہے صغیرہ گناہوں کا کفارہ کر دیتے ہیں اور ان کے گناہ کو مٹا دیتے ہیں، قرآن کریم میں ہے، اِنَّ تَجْتَنِبُوا الْكَبَاۡرَ مَا تُشْهُوْنَ عَنْهُ مُكْفَرَاتُكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ یعنی اگر تم بڑے گناہوں سے بچتے رہو تو ہم تمہارے چھوٹے گناہوں کا خود کفارہ کر دیں گے۔

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانچ نمازیں اور ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان دوسرے رمضان تک ان تمام گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں جو ان کے درمیان صادر ہوں، جبکہ یہ شخص کبائر یعنی بڑے گناہوں سے بچا رہا ہو، مطلب یہ ہے کہ بڑے گناہ تو بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے مگر چھوٹے گناہ دوسرے نیک کام نماز، روزہ، صدقہ وغیرہ کرنے سے خود بھی معاف ہو جاتے ہیں، مگر تفسیر بحر محیط میں محققین علماء اصول کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صغیرہ گناہ بھی نیک کام کرنے سے بھی مُعَاف ہوتے ہیں جبکہ آدمی اُن کے کرنے پر نادم ہو اور آئندہ کیلئے نہ کرنے کا ارادہ کرے، اُن پر اصرار نہ کرے، روایات حدیث میں جتنے واقعات کفارہ ہو جانے کے منقول ہیں ان سب میں یہ تصریح بھی ہے کہ اُن کا کر نیوالا جب اپنے فعل پر نادم ہو اور آئندہ کیلئے توبہ کرے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو گناہ معاف ہو جانے کی بشارت سنائی۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

مشہور معروف روایات حدیث میں کیا یعنی بڑے گناہ ان چیزوں کو بتلایا ہے: اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات میں کسی کو شریک یا برابر قرار دینا، قصداً کسی فرض نماز کا پھوڑنا، کسی کو ناحق قتل کرنا، حرام کاری پوری شراب نوشی، ماں باپ کی نافرمانی، جھوٹی قسم، جھوٹی گواہی، جادو کرنا، سوڈ کھانا، قسیم کا مال ناجائز طور پر لینا، میدان جہاد سے بھاگنا، پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانا، کسی کا مال ناجائز طور پر غصب کرنا، عہد شکنی کرنا، امانت میں خیانت کرنا، کسی کو گالی دینا، کسی شخص کو ناحق مجرم قرار دیدینا، وغیرہ — کبیرہ اور صغیرہ یعنی بڑے اور چھوٹے گناہوں کی تفصیل مستقل رسالوں میں علماء نے لکھ دی ہیں، میرے رسالہ گناہ بے لذت میں بھی مذکور ہے وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

بہر حال آیت مذکورہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ نیک کام کرنے سے بھی گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بُرے کام کے بعد نیک کام کر لو تو وہ اسکی برائی کو مٹا دیگا، اور فرمایا کہ لوگوں سے خوش خلقی کے ساتھ معاملہ کرو (ابن کثیر بحوالہ مسند احمد) حضرت ابوذر غفاریؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی وصیت فرمائیے آپ نے فرمایا کہ ”اگر تم سے کوئی گناہ ہو جائے تو اُس کے بعد کوئی نیک کام کر دو تا کہ وہ اُسکو مٹا دے۔“

درحقیقت ان احادیث میں گناہ سے توبہ کرنے کا مسنون و محمود طریقہ بتلایا گیا ہے جیسا کہ مسند احمد میں بروایت صدیق اکبرؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی مسلمان سے کوئی گناہ مسزود ہو جائے تو اسکو چاہئے کہ وضو کر کے دو رکعت نماز نفل ادا کر لے تو اس گناہ کی معافی ہو جائے گی (الروایات کلہا من ابن کثیر) اس نماز کو نماز توبہ ہی کہا جاتا ہے۔

ذَٰلِكَ ذِكْرُی لِلذَّکَرِیْنَ، یعنی یہ ایک نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کے لئے، اس میں ذَٰلِكَ کا اشارہ قرآن کریم کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور احکام امر و نہی کی طرف بھی، جنکا ذکر اس سے پہلے آیا ہے، مراد یہ ہے کہ یہ قرآن یا اسکے مذکورہ احکام اُن لوگوں کیلئے ہدایت و نصیحت ہیں جو نصیحت سننے اور ماننے کے عادی ہیں اس میں اشارہ یہ ہے کہ ہٹ دھرم ہندی آدمی ہو کسی چیز پر غور ہی نہ کرے وہ ہر ہدایت سے محروم رہتا ہے۔ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللہَ لَا یُضِیْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِ یعنی آپ صبر و ثابت قدمی کے ساتھ رہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نیک عمل کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔

”صبر“ کے لفظی معنی باندھنے کے ہیں اسی لئے اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کیلئے بھی ”صبر“ بولا جاتا ہے جسکے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ نیک کاموں کے کرنے پر اپنے نفس کو ثابت قدم رکھے اور یہ بھی کہ بُرے کاموں میں مبتلا ہونے سے اُس کو روکے، اس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کا حکم دینے سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ جو احکام آیات مذکورہ میں آپ کو دیئے گئے ہیں مثلاً استقامت، اقامت صلوٰۃ وغیرہ ان پر آپ مضبوطی سے قائم رہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مخالفین کی مخالفت اور ایذاؤں پر صبر کی تلقین مقصود ہو، اور اسکے بعد جو یہ ارشاد فرمایا کہ

اللہ تعالیٰ محسنین یعنی نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے، اس میں بظاہر محسنین سے مراد وہ لوگ ہیں جو آیات مذکورہ کے احکام امر و نہی کے پابند ہوں، یعنی دین میں استقامت کا مقام انکو حاصل ہو، حدود و شرعیہ کی پوری رعایت کرتے ہوں، ظالموں کے ساتھ دوستی اور بے ضرورت تعلق نہ رکھتے ہوں، نماز کو آداب کے ساتھ افضل وقت میں ادا کرنے کے پابند ہوں، تمام احکام دین پر ثابت قدم ہوں۔

اور خلاصہ ان سب کا وہی ہے جو احسان کی تعریف میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو یا کم از کم یہ کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں، جب انسان کو حق تعالیٰ کی ذات و صفات کے یقین کا یہ درجہ حاصل ہو جائے تو اسکے تمام اقوال و افعال خود بخود درست ہو جاتے ہیں، علماء سلف میں تین کلمے ایسے معروف تھے جو باہم ایک دوسرے کو لکھا کرتے تھے، وہ یاد رکھنے کے قابل ہیں اول یہ کہ جو شخص آخرت کیلئے کام میں مشغول ہو جائے اللہ تعالیٰ اُسکے دنیا کے کاموں کو خود بخود درست فرما دیتے ہیں اور انکی ذمہ داری خود لے لیتے ہیں، دوسرے یہ کہ جو شخص اپنی باطنی حالت کو درست کر لے کہ قلب کا رخ سب سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دے تو اللہ تعالیٰ اُسکی ظاہری حالت کو خود بخود درست فرما دیتے ہیں، تیسرے یہ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے معاملہ کو صحیح و درست کر لے تو اللہ تعالیٰ اُس کے اور تمام لوگوں کے درمیان کے معاملات کو خود درست فرما دیتے ہیں، اصل عبارت ان تین کلمات کی یہ ہے: وَكَانَ أَهْلُ الْخَيْرِ يَكْتُبُ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ بِثَلَاثٍ كَلِمَاتٍ، مَنْ عَمِلَ لِآخِرَتِهِ كَفَاهُ اللَّهُ أَمْرَ دُنْيَاهُ، وَمَنْ أَصْلَحَ سِرِّهِ، أَصْلَحَ اللَّهُ عَمَلَهُ وَمَنْ أَصْلَحَ فِيمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللَّهِ أَصْلَحَ اللَّهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّاسِ، (تفسیر روح البیان ج ۱۳)

تیسری اور چوتھی آیتوں میں پچھلی اقوام پر عذاب الہی نازل ہونے کی وجہ اور لوگوں کو اُس سے بچنے کی ہدایت اس طرح دی گئی ہے کہ فرمایا:

”ان پچھلی قوموں میں افسوس ہے کہ ایسا نہ ہوا کہ ان میں کچھ بھی سمجھ دار نیک لوگ ہوتے جو اپنی قوم کو فساد کرنے سے باز رکھتے، بجز تھوڑے سے لوگوں کے جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کا اتباع کیا، اور وہی عذاب سے محفوظ رہے، اور باقی پوری قوم دنیا کی لذتوں میں پھنس کر جہنم پیشہ بن گئی۔“

اس آیت میں اہل الرائے اور سمجھ دار لوگوں کو لفظ اَوْكُوا يَقِيَّتَ سے تعبیر کیا ہے، يَقِيَّتَ کا لفظ باقیا چیز کیلئے بولا جاتا ہے، اور انسان کی عادت یہ ہے کہ جو چیز سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہوتی ہے اُسکو ہر حال میں اپنے لئے محفوظ اور باقی رکھنے کا اہتمام کرتا ہے، ضرورت پڑنے پر دوسری ساری چیزیں قربان کر دیتا ہے مگر اُسکو نہیں دیتا، اسی لئے عقل و بصیرت کو ”بقیہ“ کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ عزیز و محبوب چیز ہے۔ پچوتھی آیت میں فرمایا کہ آپ کا رب شہروں اور بستیوں کو ظلم سے ہلاک نہیں کرتا جبکہ ان کے بسنے والے نیکو کار یعنی مسلمان ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں ظلم و جور کا کوئی امکان نہیں جنکو

ہلاک کیا جاتا ہے وہ اسی کے مستحق ہوتے ہیں، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے اور مُضِلُّوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو باوجود شرک کافر ہونے کے معاملات اور اخلاق اچھے رکھتے ہیں، کسی کو نقصان و ایذا نہیں پہنچاتے، جھوٹ نہیں بولتے، دھوکہ نہیں دیتے، اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ دنیا کا عذاب کسی قوم پر محض اُنکے شرک کافر ہونے کی وجہ سے نہیں آتا جب تک کہ وہ اعمال و اخلاق میں بھی ایسے کام نہ کرنے لگیں جن سے زمین میں فساد پھیلتا ہے، پھپھلی جتنی قوموں پر عذاب آئے اُن کے خاص خاص اعمالِ بد اُس کا سبب بنے، نوح علیہ السلام کی قوم نے حضرت نوح علیہ السلام کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں، قوم شعیب علیہ السلام نے ناپ تول میں کمی کر کے فساد پھیلایا، قوم لوط علیہ السلام نے بدترین قسم کی بدکاری کو شیوہ بنایا، قوم موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام نے اپنے پیغمبروں پر ظلم ڈھائے، قرآن کریم نے دنیا میں ان پر عذاب آنیکا سبب انہی اعمال و افعال کو بتلایا ہے، نہرے کفر و شرک کی وجہ سے دنیا میں عذاب نہیں آتا اُسکی سزا تو جہنم کی دائمی آگ ہے، اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ ملک و سلطنت کفر و شرک کے ساتھ تو چل سکتے ہیں مگر ظلم و جور کے ساتھ نہیں چل سکتے۔

اختلافِ مذہب اور محمود | پانچویں آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب انسانوں کو ایک ہی امت و ملت بنا دیتا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے تو تمام انسانوں کو زبردستی قبولِ اسلام پر مجبور کر ڈالتے، سب کے سب مسلمان ہی ہو جاتے ان میں کوئی اختلاف نہ رہتا مگر بقضائے حکمت اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کسی کو کسی عمل پر مجبور نہیں کرتے بلکہ اس نے انسان کو ایک قسم کا اختیار سپرد کر دیا ہے اُسکے ماتحت وہ اچھایا بُرا جو چاہے عمل کر سکتا ہے، اور انسان کی طبائع مختلف ہیں اس لئے راہیں مختلف ہوتی ہیں اور عمل مختلف ہوتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ ہمیشہ دینِ حق سے اختلاف کرتے ہی رہیں گے مجرآن لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمائی، یعنی انبیاء علیہم السلام کا اتباع کرنے والے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف سے مراد اس جگہ دینِ حق اور تعلیمِ انبیاء کی مخالفت ہے، اجتہادی اختلاف جو ائمہ دین اور فقہاء اسلام میں ہونا ناگزیر ہے اور عہدِ صحابہؓ سے ہوتا چلا آیا ہے، وہ اس میں داخل نہیں، نہ وہ رحمتِ الہی کے خلاف ہے بلکہ مقتضائے حکمت و رحمت ہے، جن حضرات نے ائمہ مجتہدین کے اختلافات کو اس آیت کی رو سے غلط، خلافِ رحمت قرار دیا ہے، یہ خود سیاقِ آیت کے بھی خلاف ہے اور صحابہ و تابعین کے تعامل کے بھی۔ وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ۔